وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ (الحجر: ۲۲)

تفسیرِ کبیر

مصنفہ

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

جلد یازدہم

سورتہائے النبا، النازعات، عبس، التکویر، الانفطار، التطفیف، الانشقاق، البروج

تفسیرِ کبیر

از حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ
(جلد یازدہم۔ مشتمل بر سورتہائے النبا، النازعات، عبس، التکویر،
الانفطار، التطفیف، الانشقاق، البروج)

Tafsir-e-Kabir (**The Grand Exegesis**)
by Hazrat Mirza Bashir-ud-Deen Mahmood Ahmad,
Khalifatul-Masih II, al-Muslih al-Mauood (1889-1965),
may Allah be pleased with him.
Volume 11
(Sūrah an-Naba', an-Nāzi'āt, 'Abasa, at-Takwīr, al-Infiṭār,
at-Taṭfīf, al-Inshiqāq, al-Burūj)

(Complete Set – Volumes 1-15)

First published in India and Pakistan between 1940-1962 (11 Volume Set)
Second edition printed in Pakistan and the UK between 1986-1994 (10 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2004 (5 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2010 (10 Volume Set)
Digitally typeset edition published in UK, 2023 (15 Volume Set)

Published by:
Islam International Publications Limited
Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, Surrey UK, GU9 9PS

Printed in the UK at:

For further information, please visit www.alislam.org

ISBN: 978-1-84880-274-2 (Set Vol. 1-15)
10 9 8 7 6 5 4 3 2 1

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مامور حضرت اقدس مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عظیم الشان رحمت کے نشان کے طور پر پسر موعود کی بشارت عطا فرمائی جو حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کے وجود میں پوری ہوئی اور کلمات الہامیہ آپ کے وجود مسعود میں جلوہ گر ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ 'اسے علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا۔' قرآن مجید فرقانِ حمید کے وہ علوم و معارف بھی آپ کو سکھائے گئے جو اس سے پہلے منکشف نہ تھے۔ چنانچہ آپؓ نے تحریر فرمایا ہے کہ 'اس تفسیر کا بہت سا مضمون غور کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔' آپؓ نے قرآن کریم کی تفسیر تحریر فرمائی اور اس کے مطالب و معانی اور نکاتِ عجیبہ کو ظاہر و باطن میں پھر زندہ فرمادیا۔ یہ تصنیف لطیف موسوم بہ تفسیرِ کبیر اس مذکورہ بالا بشارت کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت اور شاہد ناطق ہے اور لاریب قرآنی علوم و معارف کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جو خدا تعالیٰ نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ظاہر فرمایا ہے۔

تفسیر کبیر کی پہلی جلد ۱۹۴۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ بعدہٗ مختلف وقتوں میں اس کی کل ۱۱ جلدیں شائع ہوئی تھیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اوائل خلافت میں ہی ارشاد فرمایا کہ تفسیر کبیر کی صد سالہ جوبلی کے تحت دوبارہ اشاعت کی جائے۔ چنانچہ اس کے پازیٹو بنوا کر گیارہ کی بجائے دس جلدوں میں شائع کیا گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اس علمی خزینہ کی اشاعت کا تازہ ایڈیشن طبع کروانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ پہلی طباعت کتابت ہو کر شائع ہوئی تھی اور باریک قلم سے لکھائی کی وجہ سے پڑھنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ ہر صفحہ پر دو کالم تھے۔ چنانچہ یہ نیا ایڈیشن حسب ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کمپوز کروایا گیا ہے، اس کا فونٹ سائز ۱۴ مقرر کیا گیا ہے اور دو کالموں کی بجائے عبارت کو ایک ہی سطر میں مسلسل کر دیا گیا ہے۔ نیز حضور انور کی ہدایت تھی کہ جلدوں کی ضخامت کو بھی متوازن اور ہلکا

رکھا جائے تا کہ پڑھتے ہوئے ہاتھوں میں پکڑ کر سنبھالنے میں دقت نہ ہو۔ اس ہدایت پر عملدرآمد کے نتیجہ میں تفسیر کبیر کی جلدوں کی تعداد دس سے بڑھ کر پندرہ ہوگئی ہے۔ اس وجہ سے حلِ لغات کے مقامات میں بھی ادل بدل کرنا پڑا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی ہدایت کے مطابق تفسیرِ کبیر عربی ایڈیشن کی طرز پر حوالہ جات کی تخریج کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں تفسیرِ کبیر عربی ترجمہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ عربی عبارات بالخصوص حلِ لغات کے مواقع پر عربی عبارات جہاں اعراب کا اہتمام نہ تھا وہاں اعراب لگائے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ دعا ہے کہ اس تفسیر کی اشاعت کو 'دینِ اسلام کا شرف اور کلام اللہ کا مرتبہ لوگوں پر ظاہر کرنے کا موجب بنائے۔'

اس ترتیب وطباعت کے مختلف مراحل پر جن احباب کو خدمت قرآن کا موقع نصیب ہوا، ان کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی توفیق میں برکت بخشے۔ آمین

خاکسار

منیر الدین شمس

ایڈیشنل وکیل التصنیف

اپریل ۲۰۲۳ء

سُوْرَۃُ النَّبَاِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ نبا۔ یہ سورۃ مکی ہے

وَھِیَ اَرْبَعُوْنَ اٰیَۃً دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَفِیْھَا رُکُوْعَانِ

اور بسم اللہ کے علاوہ اس کی چالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع ہیں

سورۃ النبا کی وجہ تسمیہ یہ سورۃ النَّبَا کہلاتی ہے کیونکہ اس میں اصل ذکر ایک نبأ عظیم کا ہے۔اس سورۃ میں بعث بعد الموت، قرآن کریم یا غلبۂ اسلام کا ذکر ہے یا یوں کہو کہ ان تینوں کا ذکر ہے۔اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں یومِ فصل کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی گئی ہے چنانچہ سورۃ الْمُرْسَلٰت کے پہلے رکوع میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ۔ لِیَوْمِ الْفَصْلِ۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ (المرسلت: ۱۳ تا ۱۵) یعنے کس دن کے لئے وعدہ دیئے گئے ہیں فیصلے کے دن کے واسطے اور تُو کیا جانے کہ وہ فیصلے کا دن کیا ہے۔اسی طرح فرماتا ہے ھٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِیْنَ (المرسلت: ۳۹) یعنے یہ فیصلے کا دن ہے کہ جس کے لئے ہم نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو جمع کیا ہے۔گویا ایک یومِ فصل کا اس جگہ پر ذکر تھا۔اس سورۃ میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِیْقَاتًا۔ یعنی یقیناً یہ فیصلے کا دن ایک مقرر وقت پر آنے والا ہے۔تو گویا سورۃ الْمُرْسَلَات اور سورۃ النَّبَا دونوں کا باہمی تعلق یومِ فصل کے ذریعہ سے ہے پہلی سورۃ میں دو دفعہ یومِ فصل کا بیان ہے اور اس سورۃ میں ایک دفعہ یومِ فصل کے ذکر کو دہرایا گیا ہے یہ بتانے کے لئے کہ ان دونوں میں اشتراکِ مضمون پایا جاتا ہے۔ اُس سورۃ میں بھی یومِ فصل کا بیان تھا اور اِس سورۃ میں بھی یومِ فصل کا بیان ہے۔

سورۃ نباء کا پہلی سورۃ سے تعلق سورۃ النَّبَا ابتدائی مکّی سورتوں میں سے ہے (فتح البیان سورۃ النبا ابتدائیہ)۔ اس کی ترتیب کے متعلق نولڈک Noldeke جو مشرقی علوم کے متعلق جرمنی کا مشہور پروفیسر ہے لکھتا ہے کہ اس سورۃ کے مضمون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورۃ الْمُرْسَلَات کے ساتھ ہی اُتری ہے (تفسیر القرآن از وہیری تعارف سورۃ النباء) یہ ردّ ہے اُن مستشرقین یورپ کا جو کہا کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی سورتوں میں کوئی خاص ترتیب نہیں۔لمبی سورتیں پہلے رکھ دی گئی ہیں اور چھوٹی سورتیں آخر میں رکھ دی گئی ہیں (The Koran by J.M Rodwell pg.2 preface)۔ اِن لوگوں کی سمجھ میں بھی جہاں جہاں کوئی بات آجاتی ہے وہاں انہیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ

سو

تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ سورتوں کا جوڑ ایک دوسری سے ملتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۲﴾

یہ (لوگ) کس (چیز) کے بارے میں ایک دوسرے سے (بطریق انکار) سوال کر رہے ہیں

حل لغات۔عَمَّ اصل میں عَنۡ مَا ہے نونؔ چونکہ میمؔ میں مدغم ہو جاتا ہے اس لئے عَمَّا ہو گیا۔عربی زبان کا یہ محاورہ ہے کہ حروف جارہ کے بعد بالعموم مَا استفہامیہ کے الف کو حذف کر دیتے ہیں اور آخر مِیم پر فتحہ بطور علامت کے رکھ دیتے ہیں (اقرب زیر حرف ''م'') مثلاً کہتے ہیں ۔فِیۡمَ ۔ لِمَ ۔ بِمَا ۔اِلَامَ ۔ عَلٰی مَ ۔ عَمَّ۔ بلکہ عام قاعدہ یہ ہے کہ وزن کے لحاظ سے جہاں الف ظاہر کرنے کا فائدہ ہو وہاں الف لاتے ہیں ورنہ بالعموم اس کو حذف کر دیتے ہیں۔یعنی جہاں توازن میں یا بولنے میں زیادہ سہولت الف کے لانے میں ہو اُسی جگہ الف ظاہر کرتے ہیں ورنہ نہیں۔

یَتَسَآءَلُوۡنَ اَلتَّسَاءُلُ کے معنے ہوتے ہیں ایک دوسرے سے پوچھنا۔اور جب تَسَأَلَ الْقَوْمُ کہیں تو معنے ہوں گے سَأَلَ بَعۡضُھُمۡ بَعۡضًا (اقرب) یعنی آپس میں ایک دوسرے سے انہوں نے پوچھا۔ اور یَتَسَآءَلُوۡنَ کے معنے ہوں گے آپس میں وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔پس عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ کے معنے ہوں گے آپس میں ایک دوسرے سے وہ کس کے بارے میں پوچھتے ہیں یا کس کے بارے میں وہ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں۔

تفسیر۔سوال کی مختلف اغراض ایک دوسرے سے سوال مختلف وجوہ کی بنا پر کئے جاتے ہیں۔ کبھی سوال زیادتیٔ علم کے لئے ہوا کرتا ہے یعنی ایک انسان دوسرے انسان سے علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔مثلاً کسی کو راستہ معلوم نہیں تو وہ دوسرے سے پوچھتا ہے فلاں رستہ کدھر کو جاتا ہے یا پوچھتا ہے فلاں شہر کی طرف کون سا رستہ جاتا ہے۔ یا کسی لفظ کے معنے معلوم نہ ہوں تو وہ دوسرے سے پوچھتا ہے فلاں لفظ کے کیا معنے ہیں۔اور یا پھر سوال امتحان کے لئے ہوا کرتا ہے یعنی سوال کرنے والا جانتا تو ہے کہ جس لفظ کے متعلق وہ پوچھ رہا ہے اس کے کیا معنے ہیں

مگر وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آیا دوسرے کو بھی وہ معنے معلوم ہیں یا نہیں۔ یہ سوال بھی بلاواسطہ عدمِ علم پر ہی دلالت کرتا ہے کیونکہ گو اس کو ان معنوں کا علم تو ہوتا ہے مگر اُسے یہ علم نہیں ہوتا کہ دوسرے کو بھی اس کا علم ہے یا نہیں۔ لیکن کبھی سوال اظہارِ تعجب کے لئے بھی ہوا کرتا ہے جیسے بعض دفعہ بیٹا اپنے باپ کی گستاخی کرے تو باپ اُسے کہتا ہے تمہیں پتہ ہے میں کون ہوں؟ یعنی تمہیں اتنی سمجھ تو ہونی چاہیے کہ میں تمھارا باپ ہوں اور باپ کا ادب کرنا ضروری ہوتا ہے یا آقا اپنے غلام کو یا افسر اپنے ماتحت کو کہتا ہے تم جانتے ہو مَیں کون ہوں؟ اب اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اُسے علم نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے۔ پھر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہوتا کہ تم نہیں جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ بلکہ اس موقع پر سوال کرنے والا یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کون ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ جس سے سوال کیا گیا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ جس سے سوال کیا جاتا ہے وہ بھی جانتا ہے اور باوجود اس کے کہ جو سوال کرنے والا ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میرا مخاطب اس سوال کا جواب جانتا ہے پھر بھی وہ سوال کرتا ہے۔ تو درحقیقت یہ سوال ایک قسم کے تعجب کے اظہار کے لئے ہوتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم کو پتہ ہے کہ حقیقت کیا ہے پھر باوجود علم ہونے کے تم کیوں غفلت کر رہے ہو یا باوجود پتہ ہونے کے تم پوچھ کیوں رہے ہو یا اختلاف کیوں کر رہے ہو۔ اور کبھی اسی تعجب کی صورت میں تفخیم کے لئے یعنی اس چیز کی عظمت کے اظہار کے لئے بھی سوال کیا جاتا ہے۔

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ کے فقرہ میں سوال کی وجہ

یہاں بھی درحقیقت مخفی معنے تعجب کے ہی ہیں گو یہاں تفخیم کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ جیسے میں نے ابھی ایک مثال دی ہے کہ بعض دفعہ سوال کرتے ہوئے کہا جاتا ہے تم جانتے ہو میں کون ہوں اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ میری جو کچھ شان اور عظمت ہے اُس سے تم بخوبی واقف ہو۔

قرآن کریم چونکہ خدا کا کلام ہے اس لئے یہاں نہ تو یہ معنے ہو سکتے ہیں کہ خدا نہیں جانتا۔ نہ دوسرے معنے ہو سکتے ہیں کہ خدا کو یہ شک ہے کہ میرا مخاطب جانتا ہے یا نہیں جانتا پس تیسرے ہی معنے ہیں جو خدا کے متعلق چسپاں ہو سکتے ہیں اور وہی معنی اس جگہ پر لئے جائیں گے جیسا کہ اگلی آیت نے اس کو ظاہر بھی کر دیا ہے۔ پس عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ کے یہ معنے ہیں کہ ہمیں تعجب ہے کہ بغیر کافی غور اور فکر کے یہ لوگ ایک ایسے امر کے متعلق سوال کرتے ہیں جس کے حقائق ظاہر ہیں۔ گویا ایک طرف تو اس سوال میں مسئلہ کی بڑائی پر زور ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ مسئلہ بہت ہی اہم ہے اور اس کے حقائق بالکل ظاہر ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ جن کے متعلق یہ فقرہ کہا گیا ہے اُن کی عقل پر اظہارِ تعجب کیا گیا ہے کہ باجود اس مسئلہ کے دلائل موجود ہونے کے پھر بھی وہ شبہات میں پڑے ہوئے ہیں۔

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝۳

اس (مذکورہ بالا يَوْمُ الْفَصْلِ [۱] والی) عظیم (الشان) خبر کے متعلق (سوال کر رہے ہیں)

حل لغات۔ نَبَأٌ کے معنے خبر کے ہوتے ہیں لیکن علّامہ ابوالبقاء اپنی کتاب کلیات میں لکھتے ہیں کہ اَلنَّبَأُ وَالْاِنْبَاءُ لَمْ يَرِدَا فِي الْقُرْاٰنِ اِلَّا لِمَا لَهٗ وَقْعٌ وَشَاْنٌ عَظِيْمٌ (بحوالہ اقرب) یعنی نَبأ اور اِنْبَاء کے الفاظ قرآن کریم میں کسی جگہ بھی سوائے ایسے امر کے جس کی بہت بڑی شان اور اہمیت ہو استعمال نہیں ہوتے۔ وَقْعٌ تاثیر اور اہمیت کو کہتے ہیں۔

امام راغب اپنی کتاب مفردات میں لکھتے ہیں اَلنَّبَأُ خَبَرٌ ذُوْ فَائِدَةٍ عَظِيْمَةٍ يَحْصُلُ بِهٖ عِلْمٌ اَوْ غَلَبَةُ ظَنٍّ وَّلَا يُقَالُ لِلْخَبَرِ فِي الْاَصْلِ نَبَأٌ حَتّٰى يَتَضَمَّنَ هٰذِهِ الْاَشْيَاءَ الثَّلٰثَةَ یعنی نبأ اس خبر کو کہتے ہیں جس میں اوّل فائدہ ہو۔ دوسرے بڑا فائدہ ہو۔ تیسرے اُس کے ذریعہ سے یا تو علم یقین حاصل ہوتا ہو یا علم غیب حاصل ہوتا ہو۔ پھر وہ کہتے ہیں خبر کو کبھی اس کے حقیقی معنوں میں نبأ نہیں کہتے جب تک یہ تینوں باتیں اُس میں نہ پائی جاتی ہوں۔ گویا اس طرح انہوں نے مزید زور اس بات پر دیا کہ نبأ کے یہ تین معنے ہیں اور جب تک یہ تینوں معنے کسی خبر میں نہ پائے جائیں ہم اسے نبأ نہیں کہہ سکتے سوائے اس کے کہ کوئی سرسری طور پر اس لفظ کا استعمال کر دے یا غلط طور پر استعمال کر دے۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کسی لفظ کا غلط استعمال نہیں ہوسکتا اس لئے ابوالبقاء نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں ان معنوں کے سوا کہیں بھی نبأ کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ جب بھی قرآن کریم میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وَقْعٌ وَشَاْنٌ عَظِيْمٌ کے الفاظ بھی درحقیقت یہی تینوں معنے ظاہر کرتے ہیں کیونکہ وَقْعٌ کے معنے وہی ہیں جو امام راغب نے خَبَرٌ ذُوْ فَائِدَةٍ کے الفاظ میں بیان کئے ہیں۔ اور عظیمٌ کا لفظ فَائِدَة عَظِيْمَة کی طرف اشارہ کرتا ہے اور شَاْنٌ کے معنے وہی ہیں جو يَحْصُلُ بِهٖ عِلْمٌ اَوْ غَلَبَةُ ظَنٍّ کے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (الرحمٰن:۳۰) پس وَقْعٌ وَشَاْنٌ عَظِيْمٌ کے الفاظ میں درحقیقت وہی مضمون پایا جاتا ہے جو مفردات والے نے بیان کیا۔ مفردات والے نے بتا دیا کہ نبأ کا لفظ جب بھی صحیح طور پر استعمال کیا جائے گا اُس میں یہ تین باتیں ضرور پائی جائیں گی اور ابوالبقاء نے کہہ دیا کہ اَلنَّبَأُ وَالْاِنْبَاءُ لَمْ يَرِدَا فِي الْقُرْاٰنِ اِلَّا لِمَا لَهٗ وَقْعٌ وَشَاْنٌ عَظِيْمٌ قرآن کریم میں نبأ اور انباء کا لفظ کہیں

---

[۱] اس یوم الفصل سے مراد وہ یوم الفصل ہے جس کا ذکر سورۃ النبا سے پہلی سورۃ المرسلات میں آچکا ہے۔

بھی استعمال نہیں ہوا مگر اسی صورت میں جب اُس خبر کی بہت بڑی شان اور اہمیت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن چونکہ الفاظ کا صحیح استعمال کرتا ہے۔ اس لئے جب بھی قرآن کریم میں یہ لفظ استعمال ہوگا ان تینوں معنوں پر مشتمل ہوگا۔ اسی بنا پر میں غیر مبایعین کے مقابلہ میں کہا کرتا ہوں کہ تم جو کہتے ہو کہ ہر وہ شخص جس پر الہام الٰہی نازل ہوا سے لغوی طور پر ہم نبی کہہ سکتے ہیں یہ بالکل غلط ہے۔

نبی کے لغوی معنی لغوی طور پر نبوت کے معنوں میں صرف الہام کے نزول کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔ بلکہ لغت کے لحاظ سے نبی وہ ہوتا ہے جس پر خدا تعالیٰ کا کلام نازل ہوتا ہو اور اُس کلام میں یہ تین شرطیں پائی جاتی ہوں۔ اوّل وہ ذُوْفَائِدَۃٍ ہو دوم وہ ذُوْفَائِدَۃٍ عَظِیْمَۃٍ ہو۔ سوم وہ ایسا الہام ہو یَحْصُلُ بِہٖ عِلْمٌ اَوْ غَلَبَۃُ ظَنٍّ اور پھر زائد بات بوجہ نبی کے صیغہ کے یہ پائی جائے گی کہ اُس پر کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہوتا ہو۔ گویا نبأ کو جب ہم نبی کے صیغہ میں تبدیل کر دیں تو اس کے معنے ہوں گے ایسا شخص جس پر کثرت سے کلام الٰہی نازل ہوتا ہے اور پھر وہ کلام ایسا ہوتا ہے جو ذُوْفَائِدَۃٍ عَظِیْمَۃٍ یَحْصُلُ بِہٖ عِلْمٌ اَوْ غَلَبَۃُ ظَنٍّ کا مصداق ہوتا ہے۔ گویا نبی وہ ہے جو اللہ کی طرف سے کثرت کے ساتھ لوگوں کو خبریں دیتا ہے اور ایسی خبریں دیتا ہے جو فائدہ پر مشتمل ہوتی ہیں اور نہ صرف فائدہ پر بلکہ فائدہ عظیمہ پر مشتمل ہوتی ہیں اور یَحْصُلُ بِہٖ عِلْمٌ اُن سے زائد علم حاصل ہوتا ہے پس جب ہم کسی کو نبی اللہ کہتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ نبی اللہ وہ ہے (۱) جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سن کر لوگوں کو کثرت سے خبریں دیتا ہے (۲) ایسی خبریں دیتا ہے جن میں فائدہ ہوتا ہے اور فائدہ بھی عظیم الشان ہوتا ہے اور (۳) پھر اُن سے علم زائد حاصل ہوتا ہے۔ ان معنوں کے رُو سے کسی صورت میں بھی غیر مبایعین یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ اس پہلو میں اُمت محمدؐیہ کا کوئی اور فرد بھی شریک ہے اور نہ درحقیقت وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ان معنوں کے رُو سے کوئی غیر نبی کسی نبی کا شریک ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ باتیں کسی غیر نبی میں پائی ہی نہیں جاتیں۔

تفسیر۔ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ کا تعلق پہلی آیت سے عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ جملہ مستانفہ بھی ہوسکتا ہے اور عَنْ عَمَّ کا بدل بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی یہ بھی اس کے معنے ہو سکتے ہیں کہ کس بارے میں سوال کر رہے ہیں۔ کیا اس عظیم الشان نبأ کے متعلق جس کا آگے ذکر ہوگا اور یا پھر یہ جملہ مستانفہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ پہلی آیت میں تو یہ کہا گیا تھا کہ کس بارے میں یہ لوگ آپس میں سوال کر رہے ہیں۔ اب اس کا خود ہی جواب دیتا ہے کہ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ یہ لوگ سوال کر رہے ہیں ایک عظیم الشان نبأ کے متعلق۔ اس دوسری آیت نے بتا دیا کہ عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ

میں جو عَمَّہ تھا وہ سوال جہالت کی وجہ سے نہیں تھا یا عدم علم کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ کہنے والی ہستی جانتی تھی کہ وہ کس چیز کے بارے میں آپس میں بحث کر رہے ہیں کیونکہ وہ خود بتاتی ہے کہ اُن کا آپس میں تَسَآءُل نبأ عظیم کے متعلق تھا۔

اس جگہ پر اللہ تعالیٰ نے ایک زائد بات بیان فرمائی ہے جو نہایت غور کے قابل ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ یہ لوگ کس کے بارے میں سوال کر رہے ہیں آیا ایک عظیم الشان نبأ کے متعلق یا جملہ مستانفہ کی صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ یہ لوگ سوال کر رہے ہیں ایک عظیم الشان نبأ کے متعلق۔ جیسا کہ لغت سے ظاہر ہے نَبَأ کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اَلنَّبَأُ خَبَرٌ ذُوْفَائِدَۃٍ عَظِیْمَۃٍ اور بقول کلیات کے نبأ وہ ہے مَالَہٗ وَقْعٌ وَشَأْنٌ عَظِیْمٌ گویا عَظِیْمٌ کا لفظ خود نبأ میں شامل ہے۔ مگر یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ۔ یعنی نَبَأ کی حیثیت اور شان والی جو خبریں ہیں اُن میں سے بھی یہ عظیم الشان خبر ہے گویا بڑیوں میں سے بڑی اور عظیموں میں سے عظیم ہے۔ جب نَبَأ خود اپنے اندر ایک عظمت اور شان رکھتی ہے تو اُس کے ساتھ عظیم کے لفظ کا لایا جانا بتاتا ہے کہ اس کے معنے یہی ہیں کہ بڑیوں میں سے بڑی، عظیموں میں سے عظیم اور شانداروں میں سے شاندار خبر۔ اب نَبَأ کے اصل معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم اس آیت کا تفسیری طور پر ترجمہ کریں تو وہ یوں ہوگا کہ کیا یہ لوگ سوال کرتے ہیں اُس خبر کے متعلق جو شاندار خبروں میں سے بھی بڑی شاندار خبر ہے۔

النَّبَاِ الْعَظِیْمِ سے مراد تین امور اس جگہ نَبَأ سے مراد بعض نے قرآن کریم لیا ہے اور بعض نے بعث بعد الموت چنانچہ ابن کثیر میں ہے کہ قتادہ اور ابن زید کہتے ہیں اَلنَّبَأُ الْعَظِیْمُ: اَلْبَعْثُ بَعْدَ الْمَوْتِ کہ نَبَأ عظیم سے مراد مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا ہے۔ پھر ابن کثیر میں ہی لکھا ہے کہ مجاہد کہتے ہیں ھُوَ الْقُرْاٰنُ یعنی نبأ عظیم سے مراد قرآن ہے (تفسیر ابن کثیر زیر آیت ھذا) لیکن اس سے پہلی سورۃ یعنی سورۃ المرسلات میں صرف قرآن کا ہی ذکر نہیں بلکہ قرآن کے غلبہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے چنانچہ قرآن کا تو سورۃ المرسلات کی اس آخری آیت میں ذکر ہے کہ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ (المرسلت:۵۱)۔ اور غلبۂ قرآن کا اس آیت میں ذکر ہے کہ کُلُوْا وَ تَمَتَّعُوْا قَلِیْلًا اِنَّکُمْ مُّجْرِمُوْنَ۔ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ (المرسلت:۴۷، ۴۸) اور پھر یوم الفصل کا جو ذکر کیا گیا ہے اُس میں بھی غلبۂ اسلام کی پیشگوئی ہے پس صرف قرآن کا ہی نہیں بلکہ غلبۂ اسلام کا بھی اس سورۃ میں ذکر ہے اور یہ دونوں ذکر اس سورۃ نبأ سے بھی ظاہر ہیں اور اس سے پہلی سورۃ سے بھی۔

نبأ عظیم سے تین امور مراد لئے جانے کے متعلق ایک شبہ کا ازالہ اس موقع پر یہ شبہ دل میں

پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ ان تین چیزوں میں سے کون سی چیز یہاں مراد ہے کیونکہ قرآن کریم کے کئی بطن ہوتے ہیں اور قرآن کریم بعض دفعہ ایک ہی دلیل سے کئی کئی مضمون ثابت کرتا ہے۔ مثلاً اگر کسی جگہ یہ ذکر ہو کہ زید فلاں ملک میں گیا ہے یا نہیں اور دوسری جماعت میں یہ بحث ہو کہ زید ایک مغلوب شخص تھا یا غالب۔ تو اگر ہم یہ فقرہ کہہ دیں کہ زید اس ملک میں گیا اور اُس نے فتح پائی۔ تو یہ فقرہ ان دونوں سوالوں کو حل کر دے گا۔ اس فقرہ میں اس پارٹی کا بھی جواب آجائے گا جو یہ بحث کرتی تھی کہ زید اس ملک میں گیا تھا یا نہیں اور اُس پارٹی کا بھی جواب آجائے گا جو یہ بحث کرتی تھی کہ زید مغلوب شخص تھا یا غالب۔ اسی طرح بعض دلائل کا مجموعہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک نتیجہ پیدا نہیں کرتا بلکہ کئی نتائج اُس سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس جب ہم کوئی دلیل بیان کریں تو جتنے پہلو اس دلیل میں سے نکل سکتے ہوں وہ سارے ہی ثابت ہو جائیں گے۔

بعث بعد الموت اور احیاءِ روحانی کا آپس میں لازم وملزوم ہونا بعث بعد الموت درحقیقت اُس بعثِ روحانی کے مشابہ چیز ہے جو اس دنیا میں ہوتی ہے۔ اس لئے ایک دلیل دوسری دلیل کو ثابت کر دیتی ہے۔ بعثِ روحانی اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ بعث بعد الموت بھی ہوگی اور بعث بعد الموت اس بات کا ثبوت ہے کہ بعثِ روحانی بھی ضرور ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی روح کو مدارجِ عالیہ پر پہنچاتا ہے تو ایسی روح کا کوئی عظیم الشان مقصد اور مدعا ہونا چاہیے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مدارجِ عالیہ پر پہنچا کر اللہ تعالیٰ روح کو فنا کر دے گا اور آگے اس کا کوئی کام نہیں ہوگا۔ اور اگر مرنے کے بعد انسان کے لئے کوئی زندگی ہے تو پھر لازماً اس دُنیا میں احیاءِ روح بھی ہونا چاہیے کیونکہ ایک انسان کو دائمی چکر میں ڈال دینا اور اس ابدی زندگی میں جو خلود والی ہے اللہ تعالیٰ کے انعامات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ بتانا یہ بھی ایک ظلم ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو مرنے کے بعد خلود والی زندگی بخشے گا تو لازماً اس زندگی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کا سامان بھی اس دُنیا میں ہونا چاہیے۔ گویا ان دونوں سوالوں کا انحصار ایک دوسرے پر ہے اگر ایک ہے تو لازماً دوسری بھی ہے اور اگر دوسری ہے تو لازماً پہلی بھی ہے۔ اور چونکہ وہ روحانی زندگی جو اس دنیا میں حاصل ہوتی ہے اُس کے متعلق قرآن کریم یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس زمانہ میں روحانی زندگی بخشنے والا میں ہی ہوں اس لئے یہ بھی پہلے دونوں سوالوں کے ساتھ شریک ہو گیا۔ یعنی جس دلیل سے یہ ثابت ہوگا کہ اس دنیا میں احیاءِ روح کے کوئی سامان ہونے چاہئیں وہ قرآن کریم کے دعویٰ کے مطابق یہ بھی ثابت کرے گی کہ قرآن کریم سچا ہے کیونکہ قرآن کریم ہی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس زمانہ میں روحانی زندگی بخشنے کے لئے وہ مقرر ہے۔ پس ایک ہی دلیل سے یہ تینوں امر ثابت ہو جائیں گے۔ اگر کسی دلیل سے یہ ثابت ہوگا کہ مرنے کے بعد کی زندگی ایک یقینی چیز ہے اور

وہ ضرور آنے والی ہے تو اُسی دلیل سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ اس دنیا میں احیاءِ روح کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سامان رکھے گئے ہیں اور پھر ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ کہ میں ہی اس کام کو سرانجام دیتا ہوں بالکل صحیح اور درست ہے۔ کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے گا کہ روحانی مدارج جو نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں انسان کو اس دنیا میں ملتے ہیں تو ساتھ ہی یہ ثابت ہو جائے گا کہ قرآن کریم ہی یہ درجے دینے والا ہے۔ اس لئے کہ یہ درجے قرآن کریم کو ماننے والوں کو ہی حاصل ہوتے ہیں اَور لوگوں کو حاصل نہیں ہوتے۔ اسی طرح جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ قرآن کریم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں بڑے سے بڑے روحانی مدارج انسان کو اس دنیا میں حاصل ہو سکتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ مرنے کے بعد بھی زندگی ہے کیونکہ ان مدارجِ روحانیہ کے حصول کو ہم لغو اور فضول نہیں کہہ سکتے۔ گویا اگر یہ ثابت ہوگا کہ قرآن کریم روحانی مدارج عطا کرتا ہے تو اس کے لازماً یہ معنے ہوں گے کہ قرآن کریم پر عمل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے بڑے بڑے مدارج عطا ہوں گے۔ اور اگر یہ ثابت ہوگا کہ قرآن کریم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں انسان کو روحانی مدارج حاصل ہوتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ مرنے کے بعد ضرور کوئی زندگی ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ انسان کو اعلیٰ قابلیتیں دے کر اُن کے ظہور کا موقع ملنے سے پہلے اُسے فنا کر دیا جائے۔ پس یہ تینوں چیزیں آپس میں لازم ملزوم ہیں اور ان میں سے ایک کے ثابت ہونے سے باقی دو چیزیں خود بخود ثابت ہو جاتی ہیں۔

غرض اگر ہم نبأ عظیم کے معنے قرآن کریم کے لیں اور پھر ساتھ ہی بعث بعد الموت اور غلبۂ اسلام کے بھی تو یہ کوئی شبہ والی بات نہیں ہوگی بلکہ تینوں معنے آپس میں لازم ملزوم ہوں گے۔ بعض چیزوں کا تعدد شک پر دلالت کرتا ہے اور بعض چیزوں کا تعدد لزوم پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں تعددِ لزومی ہے تعددِ شکی نہیں۔ نبأ عظیم کا لفظ جو اس موقع پر استعمال ہوا ہے وہ درحقیقت ان تین معنوں پر ہی استعمال ہو سکتا ہے کیونکہ مرنے کے بعد کی جو زندگی ہے وہ بھی ایک ایسی خبر ہے جو بڑی خبروں کی سرتاج ہے۔ یہ کہہ دینا کہ فلاں کے ہاں بیٹا پیدا ہو جائے گا یا فلاں ملک میں لڑائی ہو جائے گی اس خبر کے مقابلہ میں بہت ہی ادنیٰ اور معمولی ہیں۔ بے شک یہ خبریں بھی اپنی ذات میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں مگر یہ خبریں اُس قدر اہمیت نہیں رکھتیں جتنا یہ کہنا کہ ایک زمانہ میں ساری دنیا زندہ کی جائے گی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوگی۔ پس نبأ عظیم کا لفظ قیامت کے بالکل مطابق ہے اور یہ لفظ اُس پر بخوبی چسپاں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نبأ عظیم کا لفظ قرآن کریم پر بھی چسپاں ہو جاتا ہے اس لئے کہ قرآن کریم یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں ساری خوبیوں کا جامع ہوں بلکہ گزشتہ تمام انبیاء کی کتابیں میرے اندر جمع ہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البیّنۃ:۴)

پس اگر نوحؑ کے صحف نَبَأٌ تھے۔ اگر ابراھیمؑ کے صحف نَبَأٌ تھے۔ اگر موسیٰؑ کے صحف نبأ تھا۔ اسی طرح اگر عیسیٰؑ کا کلام نَبَأٌ تھا۔ اگر کریشنؑ کا کلام نَبَأٌ تھا اگر رام چندرؑ کا کلام نَبَأٌ تھا۔ اگر زرتشتؑ کا کلام نَبَأٌ تھا تو جس کلام میں یہ سارے ہی جمع کر لئے گئے ہوں وہ یقیناً نَبَأٌ عظیم کہلائے گا۔

اس طرح غلبۂ اسلام بھی ایک ایسی چیز ہے جو تمام انبیاء کے غلبوں میں سے عظیم الشان رنگ رکھتی ہے اور درحقیقت یہ غلبہ ایسا ہے جس نے تمام انبیاء کے غلبوں کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کا طوفان لے لو۔ نوحؑ کی قوم نے غرق ہو کر نوحؑ کی صداقت کا ثبوت دیا اور نوحؑ اپنی قوم پر غالب آ گیا۔ مگر اس کا کیا نتیجہ ہوا یہی کہ قوم غرق ہو گئی اور وہ نوح پر ایمان لانے سے محروم رہی۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قوم اس طرح غرق کی گئی کہ وہ پھر آپ پر ایمان بھی لے آئی۔ موسیٰؑ کو اپنے دشمنوں پر اس طرح غلبہ دیا گیا کہ موسیٰؑ کا دشمن سمندر میں ڈبو دیا گیا مگر محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دشمن سمندر کی بجائے خشکی میں ڈبو دیا گیا اور پھر خدا نے یہ سامان کئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس ملک کا وعدہ دیا گیا تھا اُس ملک پر غلبہ دیئے جانے کا وعدہ ان کی زندگی میں پورا نہ ہوا۔ اس کے مقابلہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح غلبہ کا وعدہ دیا گیا مگر انہوں نے اپنی زندگی میں ہی مکّہ کو فتح کر لیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے اس طرح غلبہ دیا کہ وہ اپنے دشمن سے بھاگے اور ایک غیر ملک میں اُس کے حملہ سے محفوظ ہو گئے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس رنگ میں غلبہ دیا کہ آپ دشمن سے بھاگے اور ایک دوسرے شہر میں جا کر اُس کے حملہ سے محفوظ ہو گئے۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر اپنے ملک میں واپس نہیں آئے اور نہ انہوں نے اپنی قوم کو مغلوب کیا مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پھر مکّہ میں واپس آئے اور انہوں نے اپنی قوم کو مغلوب کر لیا۔ غرض جس جس رنگ میں پہلے انبیاء کو غلبہ ملا اُن میں سے ہر رنگ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو غلبہ حاصل ہوا اور نہ صرف غلبہ حاصل ہوا بلکہ اُن سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اُس کی تائید آپؐ کے شامل حال رہی۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کو تین سو سال میں غلبہ حاصل ہوا مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنی زندگی میں ہی غلبہ مل گیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسے ساتھی ملے جنہوں نے قربانی کے موقع پر کمزوری دکھائی اور وہ ثابت قدم ثابت نہ ہوئے۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وہ ساتھی عطا فرمائے جنہوں نے نہ موسیٰؑ کے ساتھیوں جیسی کمزوری دکھائی اور نہ عیسیٰؑ کے ساتھیوں جیسی کمزوری دکھائی۔ موسیٰؑ کے ساتھیوں نے جنگ کے موقع پر کمزوری دکھائی تھی اور عیسیٰؑ کے ساتھیوں نے اُس وقت کمزوری دکھائی جب ان کی اپنی جان خطرے میں تھی۔

غلبہ اسلام کے مختلف نظارے درحقیقت دنیا میں دو قسم کے جذبات لوگوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قوم کی خاطر قربانی کرنے کے لئے تو تیار رہتے ہیں لیکن اپنے لیڈر کے لئے قربانی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو اپنے لیڈر کی خاطر تو ہر وقت قربانی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں لیکن اپنی قوم کے لئے قربانی کرنے کی روح اُن میں موجود نہیں ہوتی۔ اُنہیں صرف عشق ذاتی ہوتا ہے عشق قومی نہیں ہوتا۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وہ ساتھی عطا فرمائے جو یہ دونوں جذبات اپنے دلوں میں رکھتے تھے جہاں قوم کے لئے انہیں قربانی کرنی پڑی وہاں آپ کے صحابہؓ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں جیسا نمونہ نہ دکھایا بلکہ اپنی قوم کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور جہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات کا سوال پیدا ہوا وہاں انہوں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اُس عشق کا ثبوت دیا جو اُن کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات کے ساتھ تھا اور حضرت مسیحؑ کے حواریوں کی طرح بزدلی نہیں دکھائی۔ چنانچہ مکہ کے لوگ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو قتل کرنے کے ارادہ سے ایک دفعہ رات کو آپؐ کے مکان کے اردگرد اکٹھے ہو گئے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہجرت کے ارادہ سے گھر سے نکل پڑے تو اُس وقت آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹا دیا (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام زیر عنوان خروج النبی و استخلافہ علیا علی فراشہ)۔ اور اس طرح حضرت علیؓ نے اس امر کا ثبوت دے دیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ آپ کی جگہ خود صلیب پر لٹکنے کو تیار رہتے تھے تو عشق ذاتی میں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قوم دوسرے نبیوں کی قوموں سے بڑھ گئی اور عشقِ قومی میں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم دوسرے نبیوں کی قوموں سے بڑھ گئی۔ اس لئے آپ کا جو غلبہ تھا یعنی غلبۂ اسلام وہ بھی نبأ عظیم تھا کیونکہ یہ غلبہ پہلے انبیاء کے غلبوں کے مقابلہ میں نہایت ہی شاندار تھا اور آپ کی جو کتاب تھی وہ بھی نبأ عظیم تھی کیونکہ وہ گزشتہ تمام الہامی کتابوں سے بہت زیادہ شاندار تھی۔ اور قیامت بھی نبأ عظیم ہے کیونکہ وہ اور تمام خبروں سے بہت زیادہ شان اور عظمت اپنے اندر رکھتی ہے۔

اَلَّذِیۡ ہُمۡ فِیۡہِ مُخۡتَلِفُوۡنَ ؕ﴿۴﴾

جس کے بارے میں یہ لوگ (قرآن کی بتائی ہوئی حقیقت سے) اختلاف رکھتے ہیں۔

حل لغات۔ مُخْتَلِفُوْنَ مُخْتَلِفُوْنَ مُخْتَلِفٌ کی جمع ہے اور مُخْتَلِفٌ اِخْتَلَفَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے جس کے معنے آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف کرنے کے ہیں (اقرب) پس مُخْتَلِفُوْنَ کے معنے ہوں گے اختلاف کرنے والے۔ اور اَلَّذِیْ ھُمْ فِیْہِ مُخْتَلِفُوْنَ کے معنے ہوں گے جس میں وہ اختلاف ظاہر کر رہے ہیں۔

تفسیر۔ یہاں تفخیم اور استعجاب کا پہلو زیادہ نمایاں ہے کیوں کہ پہلے ایک خبر کو نبأ عظیم قرار دیتا ہے۔ اور پھر فرماتا ہے اَلَّذِیْ فِیْہِ مُخْتَلِفُوْنَ یعنی وہ نبأ عظیم جس میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں گویا اول تو نبأ میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے تھا اور پھر نبأ عظیم میں تو کسی صورت میں بھی اختلاف نہیں ہوسکتا تھا مگر یہ وہ لوگ ہیں جو نبأ عظیم میں بھی اختلاف کر رہے ہیں۔ گویا ادھر ایک ایسی عظیم الشان خبر موجود ہے اور اُدھر یہ لوگ ایسے ذلیل ہیں کہ اس عظیم الشان خبر میں بھی اختلاف کرتے ہیں۔

بعث بعد الموت قرآن اور غلبہ اسلام کے متعلق کفار کا اختلاف اور اس کا مطلب بعض لوگوں نے اس موقع پر اعتراض کیا ہے کہ الَّذِیْ ھُمْ فِیْہِ مُخْتَلِفُوْنَ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس جگہ نبأ عظیم سے مراد قرآن نہیں اور نہ بعث بعد الموت مراد ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفّار ان امور میں اختلاف کرتے تھے حالانکہ وہ بعث بعد الموت کے منکر تھے اور وہ تسلیم ہی نہیں کرتے تھے کہ مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ پس جب وہ اس عقیدہ کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے تو اس میں وہ اختلاف کیونکر کر سکتے تھے۔ اسی طرح قرآن کریم پر بھی وہ ایمان نہیں رکھتے تھے پس قرآن کریم کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کفّار اس کے متعلق اختلاف کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ اعتراض درست نہیں۔ اس لئے کہ سب کے سب کفّار بعث بعد الموت کے منکر نہیں تھے بلکہ اُن میں بھی اس بارہ میں اختلاف تھا گو وہ اس بعث کی شکل اَور سمجھتے ہوں۔ گویا اوّل تو سب کفّار اس عقیدہ کے منکر نہیں تھے اور پھر جو لوگ اسکے قائل تھے اُن میں سے بعض کو صرف بعث کی شکل میں اختلاف تھا اسی وجہ سے عربوں میں یہ روایات پائی جاتی تھیں کہ جب کوئی شخص مارا جاتا ہے اور پھر اس مقتول کا بدلہ نہیں لیا جاتا تو اُس کی رُوح اُلّو کی شکل میں آ کر چیختی چلّاتی ہے (لسان العرب زیر مادہ ھوم)۔ اگر وہ مرنے کے بعد کسی حیات کے قائل نہیں تھے تو اُلّو کی شکل میں مقتول کی روح کے آنے کے وہ کس طرح قائل ہو سکتے تھے۔ پس درحقیقت وہ کسی حقیقی علم پر قائم نہیں تھے بلکہ خود اِس بارہ میں اُن

میں اختلاف موجود تھا کوئی کچھ کہتا تھا اور کوئی کچھ کہتا تھا۔

قرآن کریم کی صورت میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ الَّذِیْ ھُمْ فِیْہِ مُخْتَلِفُوْنَ اس پر کس طرح چسپاں ہوسکتا ہے اور وہ اس بارہ میں کیا اختلاف کیا کرتے تھے وہ تو قرآن کریم کی صداقت کے قائل ہی نہیں تھے بلکہ کہتے تھے کہ یہ محض جھوٹ ہے اس میں سچائی کا کوئی شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ مگر میرے نزدیک یہ سوال بھی درست نہیں اس لئے کہ قرآن کریم کے متعلق بھی ان کو اختلاف تھا۔ بعض اس کا نام سحر رکھتے تھے۔ بعض اُسے کذب قرار دیتے تھے (المدثر:۲۵) اور بعض اس کا نام اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (الانفال:۳۲) رکھتے تھے یہ سیدھی بات ہے کہ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ کہنے والوں کے نزدیک قرآن کریم جھوٹا نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ اگر قرآن کریم اُن کے نزدیک جھوٹا ہوتا تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ وہ اپنے باپ دادا کو بھی جھوٹا قرار دیا کرتے تھے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ پس ان کا قرآن کریم کو اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ قرار دینا ہی بتا رہا ہے کہ اُن میں سے بعض کو قرآن کریم کے متعلق یہ اعتراض نہیں تھا کہ یہ کلام جھوٹا ہے بلکہ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اس میں اُن کے باپ دادا کی باتوں کو ہی نقل کر دیا گیا ہے اس لئے ہم اس کو بطور خدا کی کلام کے نہیں مان سکتے۔ پس عربوں میں قرآن کریم کو اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ کہنے والے بھی موجود تھے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں قرآن کریم کے متعلق اختلاف تھا۔ اسی طرح قرآن کریم کو سحر کہنے والے بھی اُن میں موجود تھے اور قرآن کریم کو جھوٹا قرار دینے والے بھی ان میں موجود تھے۔ پس قرآن کریم کی صورت میں بھی یہ آیت پوری طرح چسپاں ہوجاتی ہے کہ الَّذِیْ ھُمْ فِیْہِ مُخْتَلِفُوْنَ یعنی وہ نبأ عظیم ہے جس میں کفّار اختلاف کرتے ہیں۔ تیسرا پہلو غلبۂ اسلام کا ہے ممکن ہے کوئی شخص کہہ دے کہ اس کے متعلق ان کو کہاں اختلاف تھا تو اس کے متعلق بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ غلبۂ اسلام کے متعلق بھی کفار میں اختلاف موجود تھا کفّار جانتے تھے کہ مسلمانوں کے اندر ایک ایسی روح کام کر رہی ہے جو ایک دن اُن کو ہم پر غالب کر دے گی۔ چنانچہ اُن کا اسلام کی شدید ترین مخالفت کرنا اور اس کی ترقی کو روکنے کے لئے اپنی انتہائی کوشش صرف کرنا خود اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ وہ ڈرتے تھے کہ اسلام اُن پر غالب آجائے گا اور وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے اندر ایسی چیز موجود ہے جو اُن کے مقابلہ میں ہم کو مغلوب کر دے گی۔ اور یہی سچے نبی کی علامت ہوا کرتی ہے کہ مخالفوں کے دلوں میں پہلے سے یہ ڈر پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے کہ ایک دن یہ لوگ ہم کو کھا جائیں گے اور ہماری طاقت کو توڑ کر رکھ دیں گے۔ وہ ایک طرف یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ ہم ان کو ماردیں گے۔ ہم ان کو تباہ کر دیں گے۔ ہم ان کو دنیا سے مٹا دیں گے۔ مگر ساتھ ہی ان کے دلوں میں یہ خطرہ بھی موجود ہوتا ہے کہ یہ شخص ہم کو کھا جائے گا یہی وجہ ہے کہ نبیوں کی دنیا میں شدید مخالفت ہوتی ہے ورنہ سب

جانتے ہیں کہ وہ اکیلے ہوتے ہیں نہ اُن کے پاس جتھہ ہوتا ہے نہ اُن کے پاس طاقت ہوتی ہے نہ اُن کے پاس مال ہوتا ہے نہ اُن کے پاس ظاہری شان وشوکت کا کوئی اور سامان ہوتا ہے۔ وہ اکیلے اُٹھتے اور بے سروسامانی کی حالت میں دنیا کے مقابلے میں کھڑے ہوتے ہیں مگر پھر ساری دنیا اُن کی مخالفت کرنے لگ جاتی ہے اور وہ پورا زور اس بات پر صرف کر دیتی ہے کہ اُن کو کچل دے اُن کے نام کو مٹا دے اور ان کو اپنے مشن میں کامیاب نہ ہونے دے کیونکہ ان کے دلوں میں یہ خیال موجود ہوتا ہے کہ یہ شخص گو اکیلا ہے مگر اس میں ایسی ترقی کی قابلیت پائی جاتی ہے اور ایسی رُوح اس کے اندر نظر آتی ہے جو ایک دن ہم کو کھا جائے گی اور ہمیں اس کے مقابلہ میں پسپا کر دے گی۔ ہمارے اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد بھی کئی لوگوں نے دعوے کئے مگر لوگ اُن کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتے جس پر وہ چڑتے ہیں کہ ہماری مخالفت کیوں نہیں کی جاتی۔ بلکہ بعض اُن میں سے ہمیں گالیاں دیتے ہیں کہ ہم اُن کی باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ مگر باوجود اس کے کہ اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اُن کی مخالفت کریں۔ اُن کی باتوں کی طرف توجہ کریں پھر بھی کوئی شخص اُن کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اسی لئے کہ اُن میں وہ کوئی ایسی چیز نہیں دیکھتے جس سے اُن کے دلوں میں ڈر محسوس ہو اور وہ یہ خیال کرنے لگ جائیں کہ یہ ایک دن ہم پر غالب آ جائیں گے۔ لوگ اُن کی باتوں کو سنتے ہیں تو ہنس کر گذر جاتے ہیں کوئی مخالفت نہیں کرتے یا معتدبہ مخالفت نہیں کرتے۔ اتفاقیہ طور پر اُن کے متعلق منہ سے کچھ نکل جائے تو اور بات ہے ورنہ یُوں سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ آپ ہی تباہ ہو جائیں گے ہمیں ان کی مخالفت کرنے کی ضرورت نہیں۔ تو اَلَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ میں غلبہ اسلام کے معنوں کی طرف بھی اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کفّار میں سے جو سمجھدار لوگ ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ چیز ایک دن غالب آنے والی ہے۔ عوام الناس بے شک اپنے علماء کی باتیں سُن کر کہتے ہیں کہ یہ لوگ ہمارے مقابلہ میں فنا ہو جائیں گے مگر اُن کے علماء جانتے ہیں کہ آخر اسلام ہی جیتے گا اور وُہی اس میدان میں شکست کھائیں گے بلکہ اُنہیں اپنی شکست کے ابھی سے آثار نظر آنے شروع ہو گئے ہیں۔ گویا پہلے دن سے ہی اسلام کی برتری اور اُس کے غلبہ کا اقرار ان لوگوں کو تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اس مذہب کے مقابلہ میں ہم ٹھہر نہیں سکیں گے۔ اس زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں جماعت احمدیہ کی برتری کا احساس لوگوں کے قلوب میں موجود ہے اور وہ ڈرتے ہیں کہ اگر جماعت احمدیہ اسی طرح بڑھتی چلی گئی تو معلوم نہیں کہ کیا ہو جائے گا۔ اس لئے وہ مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کر دیتے ہیں اور اس شدید مخالفت کی وجہ سے کسی کسی وقت یہ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ لوگ تباہ ہو جائیں گے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ اتنی مخالفتوں کے بعد بھلا یہ کہاں پنپ سکیں گے۔ پس هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ کے اس صورت میں یہ معنے

نہیں ہوں گے کہ وہ آپس میں اختلاف رکھتے ہیں بلکہ جب ہم غلبۂ اسلام کے معنے لیں گے تو اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان لوگوں کی حالتیں مختلف وقتوں میں مختلف ہوتی ہیں گو یا اس صورت میں اختلاف یا تو عوام الناس اور اُن کے علماء میں سمجھا جائے گا اور یا پھر علماء کا آپس میں اختلاف اس سے مراد لیا جائے گا یعنی یا تو اس کا یہ مفہوم ہوگا کہ اس بارہ میں عوام الناس اور ان کے علماء اور لیڈروں میں اختلاف ہے عوام الناس یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان تباہ ہو جائیں گے مگر علماء اور لیڈر یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان تباہ نہیں ہو سکتے اور یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بارہ میں علماء کی حالتیں بدلتی رہتی ہیں ایک حالت پر وہ قائم نہیں رہتے۔ کبھی وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو مار لیں گے اور کبھی یہ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہم ان کو کہاں مار سکتے ہیں ہم خود ہی ان کے مقابلہ میں پس جائیں گے جب وہ مسلمانوں کی اندرونی خوبیوں اور اُن کی اعلیٰ درجہ کی صفات پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ ان مسلمانوں کے مقابلہ میں ہم مارے جائیں گے اور جب وہ اپنے جتھوں اور اپنی قوتوں پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو سمجھتے ہیں ہم مسلمانوں کو مار لیں گے۔

هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ کی دوسری تشریح اسی طرح هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مومن اور کافر آپس میں اختلاف رکھتے ہیں اور مومنوں اور کافروں کا یہ اختلاف بھی تین چیزوں کے متعلق سمجھا جائے گا۔ بعث بعد الموت کے متعلق غلبۂ قرآن کے متعلق اور غلبۂ اسلام کے متعلق یعنی بعث بعد الموت کے متعلق مومن کچھ کہتے ہیں اور کافر کچھ کہتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کے متعلق مومن کچھ کہتے ہیں اور کافر کچھ کہتے ہیں اور غلبۂ اسلام کے متعلق بھی مومنوں کا کچھ قول ہے اور کافروں کا کچھ قول ہے۔

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۵﴾ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾

(خوب یاد رکھو کہ بات) یوں نہیں (جس طرح یہ کہتے ہیں بلکہ) یہ لوگ (قرآن کریم کی بتائی ہوئی حقیقت کو) عنقریب جان لیں گے۔ پھر (ہم کہتے ہیں کہ بات) یوں نہیں (جس طرح یہ کہتے ہیں بلکہ) یہ لوگ (قرآن کریم کی بتائی ہوئی حقیقت کو) عنقریب جان لیں گے۔

حل لغات۔ كَلَّا كَلَّا حرف ہے جو بات غلط ہو اُس سے ہوشیار کرنے کے لئے تنبیہ کے طور پر اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی یوں بات نہیں جس طرح کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ علّامہ ابوالبقاء اپنی کتاب کلیات میں لکھتے ہیں

قَدْ تَجِیُٔ بَعْدَ الطَّلَبِ لِنَفْیِ اِجَابَۃِ الطَّالِبِ کَقَوْلِكَ لِمَنْ قَالَ لَكَ اِفْعَلْ کَذَا - کَلَّا - اَیْ لَا یُجَابُ اِلٰی ذَالِكَ یعنی لفظ کَلَّا کسی مطالبہ کے جواب میں آتا ہے یہ بتانے کے لئے کہ مطالبہ کرنے والے کی بات ماننے کے لئے ہم تیار نہیں۔ چنانچہ جب ہمیں کوئی کسی امر کے کرنے کے لئے کہے اور ہم سمجھیں کہ یہ بات ایسی نہیں کہ کوئی مان سکے تو ہم کہیں گے کَلَّا پھر علّامہ ابوالبقاء لکھتے ہیں وَقَدْ جَاءَ بِمَعْنیٰ حَقًّا۔ یعنی کبھی لفظ کَلَّا، حَقًّا کے معنے میں آتا ہے یعنی اس کے بعد بیان کی جانے والی بات کی تاکید کرتا ہے کہ یہ بات درست ہے جیسے قرآن مجید میں ہے کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی یعنی یہ بات درست ہے کہ انسان سرکشی کرتا ہے۔ (اقرب)

سَیَعْلَمُوْنَ وہ ضرور جان لیں گے۔ سؔ تو کید کے معنوں میں یہاں آیا ہے ثُمَّ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ یہاں ثُمَّ کا لفظ تکرار مضمون کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی پھر ہم کہتے ہیں کہ وہ بات اُس طرح ہرگز نہیں جس طرح وہ خیال کرتے ہیں۔

تفسیر ۔ سَیَعْلَمُوْنَ وہ ضرور جان لیں گے یعنی قیامت کے دن ان کے یہ خیالات بالکل غلط ثابت ہوں گے اور اُن پر واضح ہو جائے گا کہ وہ کیسی کھلی غلطی میں مبتلا رہے۔ یا قرآن کریم مراد لیتے ہوئے اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ایک دن آئے گا جب قرآن کریم کی صداقت اُن پر کُھل جائے گی۔ اور غلبۂ اسلام پر جب ان آیات کو چسپاں کیا جائے گا تو مفہوم یہ ہوگا کہ آخر اسلام ایک دن غالب آجائے گا اور وہ سمجھ لیں گے کہ اسلام کی مخالفت کر کے انہوں نے کیسا غلط طریق اختیار کیا تھا۔

اب اگلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ اپنے اس دعوے کی دلیل دیتا ہے اور وہ دلیل ایسی ہے جو مذکورہ بالا تینوں معنوں پر چسپاں ہو سکتی ہے۔ یعنی اس دلیل سے نہ صرف قیامت کا وجود ثابت ہوتا ہے بلکہ غلبۂ قرآن اور غلبۂ اسلام کا بھی اسی سے ثبوت مل جاتا ہے۔ (اس آیت اور اگلی آیات کی تفسیر یکجائی طور پر آیت نمبر ۸ یعنی وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا کی آیت کے نیچے دی گئی ہے کیونکہ ان آیات کا مضمون اکٹھا ہے)

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ﴿۷﴾

(سوچیں تو سہی کہ) کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا۔

حل لغات ۔ اَلْمِهَادُ اَلْفِرَاشُ وَالْاَرْضُ (اقرب) یعنی مِهَاد کا لفظ فراش کے معنوں میں

بھی استعمال ہوتا ہے اور زمین کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ زمین کو جو مِهَاد کہتے ہیں اس کا بھی درحقیقت یہی مفہوم ہے کہ اُس میں فراش والی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

تفسیر ۔ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا کے معنے یہ ہیں کہ کیا ہم نے زمین کو ایسا نہیں بنایا جیسے فراش ہوا کرتا ہے۔ فراش پر انسان کیا کرتا ہے۔ یہی کہ لیٹتا ہے آرام کرتا ہے۔ سوتا ہے اور اس طرح اُسے راحت حاصل ہوتی ہے۔ فرماتا ہے ہم نے زمین کو تمھارے لئے ایسا ہی بنایا ہے کہ تم اس میں ہر قسم کے آرام پاتے ہو۔ ہر قسم کی سہولتیں اس سے حاصل کرتے ہو اور تمھاری راحت کے تمام سامان اس میں موجود ہیں۔ فرماتا ہے تم زمین کی اس حالت پر غور کرو اور سوچو کہ کیا واقع میں ہم نے زمین کو تمھارے لئے ایسا بنایا ہے یا نہیں بنایا۔

وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۞ ۸

اور پہاڑوں کو میخوں کے طور پر۔

حلِّ لغات ۔ اَوْتَادٌ اَوْتَادٌ وَتَدٌ کی جمع ہے اور وَتَدٌ کے معنے اُس چیز کے ہوتے ہیں جسے زمین یا مکان کی دیوار میں گاڑا جائے۔ گویا یہ لفظ کیل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لغت میں بھی پہاڑوں کو اَوْتَادُ الْاَرْضِ کہتے ہیں چنانچہ لکھا ہے اَوْتَادُ الْاَرْضِ جِبَالُهَا وَاَوْتَادُ الْبِلَادِ رُءُوْسَاءُهَا وَاَوْتَادُ الْفَمِ اَسْنَانُهٗ (اقرب) یعنی جب اَوْتَادُ الْاَرْضِ کہا جائے تو اس سے مراد پہاڑ ہوں گے جب اَوْتَادُ الْبِلَادِ کہا جائے تو اس سے مراد مختلف ممالک کے رؤسا ہوں گے اور جب اَوْتَادُ الْفَمِ کہا جائے یعنی منہ کے اوتاد۔ تو اس سے مراد دانت ہوں گے کیونکہ جس طرح رؤسا سے ملکی نظام قائم ہوتا ہے اسی طرح دانتوں سے منہ کا نظام قائم ہے۔ دانتوں سے انسان کھانا کھاتا ہے اور دانتوں سے ہی چہرے کا حُسن قائم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ دانتوں کو اَوْتَادُ الْفَمِ قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح پہاڑوں سے چونکہ زمین میں حسن پیدا ہوتا ہے اور اس کی مضبوطی اور پختگی کا بھی وہ باعث ہوتے ہیں اس لئے پہاڑوں کو اَوْتَادُ الْاَرْضِ کہا جاتا ہے۔ کیل کی بھی یہی غرض ہوتی ہے کہ وہ ایک طرف مضبوطی کا باعث ہوتا ہے اور دوسری طرف بعض چیزوں کے لئے سہارے کا موجب ہوتا ہے۔ مثلاً دیوار میں اگر کوئی کیل گاڑا جائے تو اس کی غرض کسی چیز کو وہاں لٹکانا ہوگی۔ گویا وہ کیل دوسرے کے لئے سہارے کا موجب ہوگا۔ اسی طرح زمین میں جو کیلے گاڑے جاتے ہیں اُن کی غرض اس کیلے سے کسی دوسری چیز کو باندھنا ہوتی ہے جیسے کسی جگہ خیمہ نصب کرنا ہو تو زمین

میں کیلے گاڑ دیتے ہیں تا کہ اس کے ساتھ خیمے کی رسیاں مضبوطی سے باندھ دی جائیں اور خیمہ کھڑا ہو جائے۔ یا بعض دفعہ گھوڑا یا کوئی اور جانور بھی اُس سے باندھ دیتے ہیں۔ گویا وَتَدٌ کا لفظ کسی چیز کو محفوظ کرنے یا سہارا دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پس جب خدا نے کہا کہ ہم نے جِبَال کو اَوْتَاد بنایا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے جبال کو ایسا بنایا ہے کہ وہ سہارے کا بھی موجب ہیں اور جِبَال زمین کی حرکتِ مُضرہ کو بھی روکنے کا موجب ہیں اور درحقیقت یہی دونوں چیزیں جِبَال کی اغراض میں شامل ہیں۔

تفسیر۔ پہاڑوں کے فوائد جہاں تک جِبَال کے فوائد کا سوال ہے یہ امر علوم موجودہ کی رو سے مسلم ہے کہ جِبَال کی وجہ سے ہی زلازل کا آنا بند ہوا۔ علوم موجودہ کا فیصلہ ہے کہ ہماری زمین کے نیچے بہت بڑی آگ ہے۔ جب زمین کا چھلکا ابھی پتلا تھا جب بھی اس آگ میں جوش پیدا ہوتا تھا زمین میں سے لاوا نکلنا شروع ہو جاتا۔ جب وہ لاوا ٹھنڈا ہو جاتا تو پہاڑی کی صورت میں قائم ہو جاتا۔ پھر اور لاوا نکلتا اور وہ بھی ٹھنڈا ہو کر پہاڑی بن جاتا۔ اسی طرح لاوا زمین کے نیچے سے نکلتا چلا گیا اور ٹھنڈا ہو کر بڑے بڑے پہاڑوں کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ جب زمین کا جوش کافی حد تک نکل گیا تو زمین کا چھلکا موٹا ہو گیا اور زمین آبادی کے قابل ہوئی۔ پس جبال کیا ہیں وہ زمین کی حرکت مضرہ کو روکنے کا ایک ذریعہ ہیں جیسے گھوڑے کو کیلے کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور وہ ادھر ادھر دوڑ نہیں سکتا اسی طرح پہاڑوں کی وجہ سے زمین کی حرکت مضرہ بند ہوئی اور زلازل کا کثرت کے ساتھ آنا دور ہوا۔ اسی طرح پہاڑ لوگوں کے لئے سہارے کا بھی موجب ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملک انہی پہاڑوں کے سہارے پر لٹکے ہوئے ہیں۔ پہاڑوں پر برف پڑتی ہے اور لوگوں کے لئے بڑے بڑے فوائد کا موجب ہوتی ہے جب برف پگھلتی ہے تو زمین میں نالے بہ نکلتے ہیں۔ دریا جاری ہو جاتے ہیں اور پھر ان دریاؤں میں سے نہریں نکالی جاتی ہیں اور اس طرح تمام ملک سیراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پہاڑی چشمے لوگوں کی سیرابی کا موجب بنتے ہیں۔ گویا پہاڑ ان دونوں اغراض کو پورا کرتے ہیں وہ زمین کی حرکت مضرہ کو بھی روکتے ہیں اور ان کے ذریعہ تمام ملکوں کو ایک سہارا بھی مل جاتا ہے چنانچہ پہاڑوں سے ہی پانی میسر آتا ہے جو ملکوں کی سیرابی اور بنی نوع انسان کی زندگی کے کام آتا ہے۔

وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ﴿۹﴾

اور (پھر) ہم نے تم (سب لوگوں) کو جوڑا (جوڑا) بنایا ہے۔

حل لغات۔ اَزْوَاجًا اَزْوَاجٌ زَوْجٌ کی جمع ہے اور زَوْجٌ کے معنے ہیں کُلّ وَاحِدٍ مَعَہٗ اٰخَرُ مِنْ جِنْسِہٖ۔ ہر ایک وہ چیز جس کے ساتھ اس کی جنس میں سے ایک اور وجود بھی ہو۔ اَلصِّنْفُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ۔ ہر چیز کی قسم۔ صنف۔ اَلْبَعْلُ۔ خاوند۔ اَلزَّوْجَۃُ۔ بیوی۔ (اقرب)

تفسیر۔ وَ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا کی پہلی تشریح فرماتا ہے اِدھر ہم نے یہ سامان پیدا کر دیا کہ زمین کو ہم نے ایسا بنایا جسے تم بستر کے طور پر استعمال کرتے ہو۔ پھر ہم نے پہاڑوں کو بنایا جو تمہارے لئے سہارے کا بھی موجب ہیں اور وہ زمین کی حرکت مُضِرہ کو بھی روکنے کا ذریعہ ہیں دوسری طرف ہم نے تمھارے اندر یہ بات رکھ دی ہے کہ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا۔ ہم نے تم کو زَوْج بنایا ہے۔ زَوْجٌ کے معنے جوڑے کے ہوتے ہیں چنانچہ نر کو بھی زوج کہتے ہیں اور مادہ کو بھی زوج کہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جس کو زوجہ کہتے ہیں عربی زبان میں اُسے زَوْج بھی کہہ سکتے ہیں اور زَوْجَۃ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک انسان اپنی بیوی کے متعلق یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ھِیَ زَوْجِیْ یہ میری بیوی ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ ھِیَ زَوْجَتِیْ کہے۔ اسی طرح زوج کا لفظ مرد کے لئے بھی استعمال ہوسکتا ہے چنانچہ ایک عورت اپنے خاوند کے متعلق بھی کہہ سکتی ہے کہ ھُوَ زَوْجِیْ پس خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا کے معنے یہ ہوئے کہ خدا نے تم کو جوڑا بنایا ہے یعنی نر و مادہ کی صورت میں اس نے تم کو پیدا کیا ہے گویا ایک طرف زمین میں یہ قابلیت رکھی ہے کہ تم اس کی طرف اُسی طرح لوٹتے ہو جیسے بستر کی طرف جس طرح انسانی جسم میں جب تھکان پیدا ہو جائے تو وہ آرام کے لئے اپنے بستر کی طرف جاتا ہے اسی طرح جب بھی تمہیں کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے یا تمہیں کسی تکلیف کا احساس ہوتا ہے تم زمین کی طرف توجہ کرتے ہو اور تمہیں اپنی تمام ضروریات زمین میں سے حاصل ہو جاتی ہیں مثلاً غذا ہے انسان کو کھانے کے لئے جس چیز کی بھی ضرورت ہو زمین سے وہ مہیا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح لباس ہے اللہ تعالیٰ انسان کی اس ضرورت کو بھی زمین سے ہی پورا کرتا ہے غرض انسان جب بھی کوئی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ زمین سے اللہ تعالیٰ اس کی وہ ضرورت پوری کر دیتا ہے اور وہ اسی طرح زمین سے آرام حاصل کرتا ہے جس طرح بستر سے انسانی جسم راحت حاصل کرتا ہے۔ پھر جِبَال بھی زمین کے لئے تقویّت اور سہارے کا موجب ہیں۔ درحقیقت زمین میں بعض نقائص ایسے تھے جن کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین

کئی فوائد سے محروم رہ جاتے۔ مثلاً پہاڑوں کا یہ بہت بڑا فائدہ ہے کہ وہ اس پانی کو جو زمین کی زندگی کا ذریعہ ہے جمع رکھتے ہیں کیونکہ برف پہاڑ کی چوٹیوں پر ہی پڑتی ہے اور پھر وہ برف پگھل کر زمین کے لئے سال بھر کے لئے پانی مہیا کر دیتی ہے۔ اسی طرح قسم قسم کی بُوٹیاں ہیں جو پہاڑوں پر پیدا ہوتی اور بنی نوع انسان کے کام آتی ہیں۔ زمین کو انسان چونکہ اپنی رہائش کے لئے آباد کرتا ہے اس لئے وہ پروا نہیں کرتا کہ زمین کو قابل رہائش بنانے کے لئے وہ کون کون سی چیزیں تلف کر رہا ہے جب بھی اُسے اپنی رہائش کے لئے یا اپنے اور کاموں کے لئے زمین کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ بلا دریغ اُن سب چیزوں کو تلف کر دیتا ہے جو زمین پر موجود ہوتی ہیں۔ اگر درخت اُگے ہوئے ہوں تو ان کو کاٹ دیتا ہے بوٹیاں موجود ہوں تو اُن کو اُکھیڑ دیتا ہے کیونکہ اُسے ضرورت ہوتی ہے کہ اپنی رہائش کے لئے زمین کو صاف کرے۔ پس چونکہ زمین کو انسان نے آباد کرنا تھا اس میں اپنی رہائش کے لئے اُس نے مکان بنانے تھے۔ سڑکیں بنانی تھیں۔ کھیت بونے تھے۔ رستے تیار کرنے تھے اور یہ چیزیں تقاضا کرتی تھیں کہ زمین صاف ہو اس لئے انسانی عادت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ زمین کو بالکل صاف کر دیتا ہے اور تمام روئیدگیوں وغیرہ کو لغو سمجھ کر کاٹ دیتا ہے۔ حالانکہ ان بوٹیوں میں جن کو کاٹ رہا ہوتا ہے اور جن کو وہ بالکل لغو اور بیکار سمجھ رہا ہوتا ہے ہزاروں بوٹیاں ایسی ہوتی ہیں جو نہایت ہی مفید ہوتی ہیں اور کئی قسم کی بیماریوں کو دُور کرنے کا ذریعہ ہوتی ہیں پس اگر میدان ہی میدان ہوتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ انسان ساری چیزیں اُکھیڑ دیتا۔ حالانکہ اُن میں بیسیوں چیزیں ایسی ہوسکتی تھیں جو اس کے لئے نہایت مفید ہوتیں۔ اس نقص کو دُور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہاڑ بنا دیئے ہیں۔ وہاں جس طرح پانی محفوظ ہوتا ہے (کیونکہ برف پہاڑوں پر ہی پڑتی ہے) اسی طرح ہزاروں قسم کی بوٹیاں جو انسانی صحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں اور جو اگر ہموار زمین پر ہوتیں تو انسان اُن کو کاٹ کر فنا کر چکا ہوتا وہاں محفوظ رہتی ہیں اس طرح پہاڑ زمین کے لئے سہارے کا موجب بن جاتے ہیں۔ ان امور کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا۔ ہم نے تمہیں نر اور مادہ بنایا ہے جس کی وجہ سے تمہاری نسل چلتی ہے۔ یعنی ایک طرف زمین میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے بے انتہا فوائد جو زمینی قوتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہ ختم ہونے والے ہیں رکھے ہیں اور دُوسری طرف اُس نے جِبَال بنائے ہیں جن سے یہ فوائد عملی صورت میں بھی مستقل ہو جاتے ہیں۔ گویا زمین بھی فائدے کا موجب ہے اور جِبَال بھی فائدے کا موجب ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جِبَال زمین کے فوائد کو مستقل حیثیت دے دیتے ہیں پس ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم الشان سلسلہ تمہارے لئے جاری کیا ہوا ہے دوسری طرف تمھاری نسل قائم کرنے کے لئے اس نے تمہیں اَزْوَاج یعنی نر و مادہ بنا دیا ہے۔ اب کیا

یہ عجیب بات نہیں کہ خدا نے تمہارے لئے ایک طرف تو زمین کو پیدا کیا جس سے تم اپنے کھانے کا سامان حاصل کرتے ہو اپنے پینے کا سامان حاصل کرتے ہو۔ اپنے لباس کا سامان حاصل کرتے ہو۔ اپنی رہائش کا سامان حاصل کرتے ہو۔ اور دُوسری طرف اُس نے پہاڑ بنا دیئے جن سے یہ فوائد ایک مستقل صورت اختیار کر گئے ہیں تیسری طرف اُس نے تمہیں نر و مادہ بنا دیا تا کہ تمہاری نسل قائم رہے اور مستقل صورت اختیار کرے اور تم ان چیزوں سے ہمیشہ فائدہ اُٹھاتے رہو۔ مگر تمہاری یہ حالت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس لمبے سلسلۂ پیدائش کے متعلق تم یہ کہہ رہے ہو کہ یہ سب لغو اور فضول ہے ان کی پیدائش کسی حکمت پر مبنی نہیں۔

خَلَقْنٰکُمْ اَزْوَاجًا کی دوسری تشریح زَوْج کے ایک معنے صِنف کے بھی ہوتے ہیں اس لحاظ سے خَلَقْنٰکُمْ اَزْوَاجًا کا یہ مفہوم ہوگا کہ ہم نے تم کو مختلف اقسام میں پیدا کیا ہے یعنی کوئی شخص تم میں سے ایسا ہے جو تصویر کشی کی رغبت رکھتا ہے۔ کوئی ایسا ہے جو تجّار بننے کی قابلیت رکھتا ہے۔ کوئی ایسا ہے جسے سائنس میں انہماک ہے۔ کوئی ایسا ہے جو حساب سے دلچسپی لیتا ہے کوئی ایسا ہے جو تاریخ کی طرف مائل ہے۔ غرض ہم نے تم کو مختلف اقسام میں تقسیم کر دیا ہے۔ اگر سب طبائع یکساں ہوتیں تو دنیا ایک ہی حالت میں چلتی چلی جاتی اور اُس میں کسی قسم کی ترقی نہ ہوتی۔ مگر ہم نے انسانی دماغ کو اتنا متنوّع بنایا ہے اور اس قدر اقسام در اقسام صورت میں ترقیات کا میدان اس کے لئے کھولا ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے مذاق اور اپنی اپنی طبیعت کے مطابق جس لائن کو چاہتا ہے اختیار کر لیتا ہے۔ کوئی دنیا میں مشغول ہے کوئی دین میں مشغول ہے کوئی سائنس کی طرف توجہ کر رہا ہے۔ کوئی علم الاخلاق میں ترقی کر رہا ہے۔ کوئی علم ہندسہ میں سبقت لے جانا چاہتا ہے کوئی تاریخ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کر رہا ہے۔ غرض اپنے اپنے رنگ میں انسانی فطرت اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ تنوّع اس بات کی دلیل ہے کہ انسان میں خدا تعالیٰ نے کسی غیر مرئی چیز کو پا لینے کی رغبت پیدا کی ہے اور اس کے اندر یہ تڑپ رکھی ہے کہ وہ اس مخفی اور غیر مرئی چیز کو حاصل کرنے کی جدّ و جہد کرے۔ چنانچہ اس کوشش اور تلاش میں کوئی کسی طرف دوڑ رہا ہے اور کوئی کسی طرف دوڑ رہا ہے جیسے پانی جب بہایا جاتا ہے تو وہ نشیب کی طرف بہہ پڑتا ہے اسی طرح انسانی طبیعت اپنے اپنے مذاق کے مطابق مختلف رستوں پر دوڑ رہی ہے۔ کوئی کسی رستہ سے اس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور کوئی کسی رستہ سے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کسی خاندان کا بچہ کھو یا جائے تو اس خاندان کے کچھ افراد مشرق کو چل پڑیں گے کچھ مغرب کی طرف چلے جائیں گے۔ کچھ شمال کی طرف دوڑ پڑیں گے اور کچھ جنوب کی سمت اختیار کر لیں گے مگر مقصد سب کا ایک ہی ہوگا کہ کسی طرح اس بچہ کو ڈھونڈا جائے۔ اسی طرح انسانی فطرت مختلف رستوں پر مختلف جہات کی طرف بھاگ

رہی ہے جو ثبوت ہے اس بات کا کہ کوئی چیز ایسی ہے جس کے متعلق فطرت یہ محسوس کرتی ہے کہ اُسے حاصل کرنا چاہیے۔ مگر چونکہ اُسے علم نہیں کہ وہ کہاں ہے اس لئے مختلف جہات سے وہ اس چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہے یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ انسانی فطرت اپنے لئے کسی ایسے مقصود کی طالب ہے جس کے مقام کا علم خود اُسے اپنی ذات کے اندر سے نہیں حاصل ہوتا اور چونکہ اُسے اپنی ذات سے اُس کے مقام کا علم حاصل نہیں ہوتا اس لئے وہ مختلف جہات سے اس کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے اور یہ حالت چلتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ خدا تعالیٰ اپنا کلام نازل کر کے اس مقصد کو ظاہر کر دیتا ہے پھر انسان کی تسلی ہو جاتی ہے اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ مقصد میں نے پا لیا جس کے لئے میں کوشش کر رہا تھا اور جس کے لئے خدا نے مختلف قسم کے مادے انسانی فطرت میں پیدا کئے تھے۔

انسانوں کو مختلف الطبائع پیدا کرنا بعث بعد الموت پر دال ہے گویا ایک طرف زمین اور جبال کی پیدائش کا سلسلہ اور دوسری طرف انسانی فطرت میں تنوّع کا پایا جانا اور مختلف الطبائع انسانوں کا مختلف جہات کی طرف اپنے مقصد کے حصول کے لئے دوڑنا یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ انسان کے سامنے کوئی بہت بڑا مقصد ہے جس کے حصول کے لئے اُس نے کوشش کرنی ہے پس انسانی فطرت کی یہ کشمکش ایک طرف کلام الٰہی کی ضرورت پر دلالت کرتی ہے دوسری طرف بعث بعد الموت پر دلالت کرتی ہے اور تیسری طرف کلام الٰہی کے نزول کے بعد اس کے غلبہ پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ اگر کلامِ الٰہی کا غلبہ نہیں ہونا تھا تو پھر اُس کے نزول کا کوئی فائدہ نہ تھا پس یہ امر کلام الٰہی کے غالب آنے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ زمین جس پر انسان بستا ہے اس میں بے انتہاء اشیاء اور قوتیں پیدا کر کے اور پہاڑوں کے ذریعہ سے خورونوش اور سائنٹفک ترقیات کے سامانوں کو مستقل رنگ دے کر اور انسانوں کو اس صورت میں پیدا کر کے کہ وہ مختلف مزاجوں کے مطابق زمین کی مختلف قابلیتوں کو ترقی دیں اور اُن سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور پھر انسان کو بھی مرد و زن بنا کر اور ایک مستقل قائم رہنے والے وجود کی شکل دے کر اللہ تعالیٰ نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان غیر محدود ترقیات کے لئے اور دائمی زندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اگر یہ بات ثابت ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس دنیا میں فنا ہونے والے انسان کے لئے کسی اور دنیا میں دائمی زندگی کا سامان مہیا ہونا چاہیے اور اس دائمی زندگی کے لئے کوئی ہدایت نامہ اور اس ہدایت نامہ پر چلنے والوں کے لئے کامیابی کی ضمانت بھی ہونی چاہیے۔ ورنہ کارخانۂ عالم بیکار محض ثابت ہوتا ہے۔

وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۱۰

اور ہم نے تمھاری نیند کو موجب راحت بنایا ہے۔

حل لغات ۔سُبَات سُبَاتٌ سَبْتٌ سے ہے اور سَبْتٌ کے اصل معنے کسی چیز کو کاٹنے کے ہیں چنانچہ کہتے ہیں سَبَتَ السَّیْرَ چمڑے کے ٹکڑے کو لمبے رنگ میں کاٹا۔وَسَبَتَ شَعْرَہٗ: حَلَقَہٗ اُس نے بالوں کو کاٹا۔اور ہفتہ کو یومِ سبت اس لئے کہا گیا کہ اُس دن یہودی اپنے کام کاج چھوڑ دیتے تھے (مفردات) انہی معنوں کے پیش نظر وَ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا کے معنے صاحب مفردات نے کئے ہیں قَطْعًا لِلْعَمَلِ کہ ہم نے تمھاری نیند کو ایسا بنایا ہے کہ اُس سے تم اپنے کاموں سے کٹ جاتے ہو اور پھر تازہ دم ہو جاتے ہو (مفردات)

اقرب الموارد میں ہے اَلسُّبَاتُ: الدَّهْرُ یعنی زمانہ اَلدَّاهِیَةُ مِنَ الرِّجَالِ۔آدمیوں میں سے بڑا لائق آدمی۔اَلنَّوْمُ۔نیند۔وَقِیْلَ خِفَّتُهٗ وَقِیْلَ اِبْتِدَاءُہٗ فِی الرَّاسِ حَتّٰی یَبْلُغَ الْقَلْبَ بعض کے نزدیک سُبَات کے معنے ہلکی سی نیند کے ہیں اور بعض نے اس کے معنے اُونگھ کے کئے ہیں لیکن اقرب الموارد کے مصنف لکھتے ہیں وَاَصْلُهُ الرَّاحَةُ کہ اس کے اصل معنے آرام اور راحت کے ہیں (اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے ہم نے تمھاری نیند کو سُبَات بنایا یعنی اگر کوئی شخص کہے کہ اسلام کے ذریعہ کُفر پر ایک نئے غلبہ کی کیا ضرورت ہے اگر کفر پر غلبہ ہی منشاء ہے تو آدمؑ کے وقت یہ غلبہ ہو گیا۔نوحؑ کے وقت یہ غلبہ ہو گیا۔اب کسی نئے غلبہ کی کیا ضرورت ہے؟ تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا کیا زندگی میں تم دیکھتے نہیں کہ ایک جاگنے کا وقت ہوتا ہے اور ایک سونے کا وقت ہوتا ہے۔اسی طرح قوموں میں بیداری اور نیند کا ایک تسلسل چلا جاتا ہے تا کہ نئی قوتیں لے کر انسان اُٹھے اور کفر کو شکست دینے کے لئے کھڑا ہو جائے۔اس طرح لوگ ایک لمبے عرصہ تک کوشش کرتے چلے جاتے ہیں۔مگر جب وہ اپنی ان کوششوں میں تھک جاتے ہیں جب ان کی تمام رغبتیں دنیا میں محدود ہو جاتی ہیں جب دین کی طرف سے وہ بے رغبتی کا اظہار کرنے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو چھوڑ دیتا ہے اُن کی حالت بدل جاتی ہے اور وہ خرابیوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں تب اللہ تعالیٰ ایک نیا فضل نازل کرتا اور لوگوں کی ہدایت کے لئے ایک نئے رُوحانی سورج کا طلوع کرتا ہے۔

جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا کے معنے اس آیت میں چونکہ نَوْم کا لفظ مذکور ہے اس لئے سُبَاتًا سے مراد نیند تو نہیں ہو سکتی جو اس کے معروف معنے ہیں اور حل لغات میں بیان ہو چکے ہیں۔پس لازماً اس کے کوئی اور معنے ہوں گے اور

وہ معنے یہی ہیں کہ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ رَاحَةً ہم نے تمہاری نیند کو ایک راحت کا ذریعہ بنایا ہے اور چونکہ سُبَات کے ایک معنے دَهْر کے بھی ہوتے ہیں اس لئے جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا کے معنے جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ دَهْرًا کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی تمہاری نیند کے زمانہ کو ایک لمبا زمانہ بنایا ہے۔ اس صورت میں نیند سے مراد وہ زمانہ ہوگا جب روحانی سورج کا طلوع نہیں ہوتا اور قوم غفلت کی حالت میں سو رہی ہوتی ہے گویا مراد یہ ہے کہ جب کوئی قوم سوتی ہے تو پھر ایک لمبے عرصہ تک سوتی چلی جاتی ہے۔

وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ﴿۱۱﴾

اور ہم نے رات کو پردہ پوش بنایا ہے۔

حل لغات۔ لِبَاس لِبَاسٌ کے معنے مفردات میں یوں لکھے ہیں وَجُعِلَ اللِّبَاسُ لِكُلِّ مَا يُغَطِّي مِنَ الْاِنْسَانِ عَنْ قَبِيْحٍ یعنی لباس کا لفظ ہر ایسی چیز پر بولا جاتا ہے جو انسانی عیوب اور نقائص کو چھپا دیتی ہے پس جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے رات کو تمہارا ننگ ڈھانکنے والی چیز بنایا ہے اور اسی لحاظ سے رات کو لباس قرار دیا گیا ہے کیونکہ عربی زبان میں ہر وہ چیز جو عیوب ڈھانکنے کا کام دے وہ لباس کہلاتی ہے جیسے قرآن کریم میں ہی ایک دوسرے مقام پر لِبَاسُ التَّقْوٰى (الاعراف: ۲۷) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ تقویٰ کو بھی لباس انہی معنوں میں کہا گیا ہے کہ تقویٰ انسانی عیوب کو ڈھانکتا ہے پس اللہ فرماتا ہے ہم نے رات کو تمہارے عیوب ڈھانکنے والی چیز بنایا ہے۔

اقرب میں ہے اَللِّبَاسُ: اَلْاِخْتِلَاطُ وَالْاِجْتِمَاعُ يُقَالُ ''بَيْنَهُمْ لِبَاسٌ'' اَيْ اِخْتِلَاطٌ وَاِجْتِمَاعٌ (اقرب) یعنی اختلاط اور اجتماع کو بھی لباس سے تعبیر کرتے ہیں چنانچہ عرب کہتے ہیں بَيْنَهُمْ لِبَاسٌ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اُن کے درمیان اختلاط اور اجتماع ہے۔

لسان میں ہے لِبَاسُ كُلِّ شَيْءٍ غِشَاءُهٗ۔ ہر چیز کا پردہ اُس کا لباس کہلاتا ہے۔

تفسیر۔ **رات کو لباس بنانے کا مطلب** اگر رات نہ آئے اور انسان ہر وقت جاگتا رہے تو دو چار دن میں ہی وہ پاگل ہو جائے مگر رات آنے کی وجہ سے انسان کا یہ نقص ظاہر نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رات کو بنی نوع انسان کا لباس بنایا ہے اور وہ انسان کی محدود طاقت کے نقائص کو چھپا دیتی ہے۔ اس طرح رات کے

اندھیرے میں جب کوئی شخص سویا ہوا ہو تو اس کے سوتے وقت کے نقائص دوسروں کو معلوم نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ بھی سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور کوئی دوسرا شخص ان نقائص کو دیکھ نہیں سکتا لیکن اگر دن کے وقت کوئی شخص سوئے تو دوسرے شخص کو فوراً اس قسم کے عیوب نظر آجائیں۔ سوتے وقت انسان کی عجیب عجیب حالتیں ہوتی ہیں اور بعض تو یقیناً ایسی ہوتی ہیں جن کو اگر دوسرا شخص دیکھ لے تو اُسے سخت کراہت آئے بعض دفعہ ایک بڑا شخص ہوتا ہے لیکن اُس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ سوتا ہے تو اُس کا منہ کُھلا رہتا ہے اور اُس پر مکھیاں بیٹھتی ہیں۔ لیکن اگر وہ رات کو سوتا ہے تو اس کا یہ نقص پوشیدہ رہتا ہے اسی طرح بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ سوتے وقت خراٹے شروع کر دیتے ہیں۔ بعض نہایت قابلِ نفرت طریق پر سوتے ہیں۔ کوئی بلّی کی طرح سوتا ہے کوئی مچھلی کی طرح سوتا ہے اور کوئی کسی طرح سوتا ہے۔ غرض سونے کی ایسی ایسی حالتیں ہوتی ہیں جن کو دیکھ کر گھِن پیدا ہوتی ہے۔

رات عیوب کے ڈھک جانے کا ایک ذریعہ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ہم نے رات کو لباس بنایا ہے یعنی سونے کا عام وقت رات ہوتا ہے اور رات میں سونے والوں کے جسمانی عیوب ڈھک جاتے ہیں۔ اگر انسان عام طور پر دن کو سوتا تو اس کے عیب ظاہر ہو جاتے لیکن چونکہ وہ رات کے اندھیرے میں سوتا ہے اس لئے اُس کے سوتے وقت کے عیوب کا پتہ نہیں لگتا اور رات اُن پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

روحانی لیل لوگوں کے لئے بطور لباس کے اسی طرح روحانی لَیل بھی ایک لباس ہوتی ہے کیونکہ رات اسی کو کہتے ہیں جب سارے لوگ سوئے ہوئے ہوں جس طرح جسمانی لَیل لباس کا کام دیتی ہے۔ اسی طرح روحانی لَیل بھی لباس کا کام دیتی ہے کیونکہ ساری قوم مُردہ ہوتی ہے کوئی شخص کسی دوسرے کا کوئی عیب نہیں دیکھتا جیسے کہتے ہیں حمام میں سارے ننگے۔ اُس زمانہ میں بھی روحانی لحاظ سے سب ننگے ہوتے ہیں۔ ہر شخص میں بدی ہوتی ہے۔ ہر شخص میں عیب ہوتا ہے اور چونکہ ہر شخص گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے اس لئے کسی دوسرے کا گناہ اُسے نظر نہیں آتا۔ جیسے اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں ہر شخص شرک میں مبتلا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کوئی بڑا مشرک تھا اور کوئی چھوٹا مشرک تھا لیکن باوجود اس کے کہ ہر شخص شرک میں مبتلا تھا کوئی شخص دوسرے کے نقص کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ جب نبی آتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے روحانی سورج کا طلوع کر دیتا ہے تو پھر لوگوں کو ایک دوسرے کے نقائص نظر آنے لگ جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں فلاں ایسا ہے اور فلاں ایسا ہے مگر جب تک سب قوم سوئی ہوئی ہو کوئی شخص دوسرے کے عیب کو نہیں دیکھ سکتا۔ جیسے یورپ میں ننگے ناچ ہوتے ہیں مگر کسی کے دل میں یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ یہ بھی کوئی گندی چیز ہے کیونکہ روحانی لَیل اُن پر چھائی ہوئی ہے اور رات کی تاریکی کی وجہ سے اُنہیں یہ نقائص نظر نہیں

آتے۔ بڑے سے بڑا آدمی بھی ان نظاروں کو دیکھے گا تو خاموشی سے گذر جائے گا اور اُسے یہ خیال نہیں آئے گا کہ ان باتوں کے خلاف نفرت کا اظہار کرے۔ مگر جب نبی کا زمانہ آتا ہے تو پھر لوگ شرمانے لگتے ہیں اور وہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ یہ بھی بُری بات ہے اور وہ بھی بُری بات ہے۔

پھر لباس زینت کا موجب بھی ہوتا ہے اور کام کرنے والوں کے لئے ایک رنگ میں رات ہی زینت کا باعث ہوتی ہے۔ عرب میں رواج ہے کہ غریب سے غریب آدمی بھی روزانہ اپنے کپڑے دھوتا ہے یا بعض امیر لوگ رات کو اور کپڑے پہنتے ہیں اور دن کو اَور۔ دن میں تو کام کاج کرنے کی وجہ سے لباس خراب ہو جاتا ہے لوگ اچھا لباس نہیں پہن سکتے مگر رات کو فارغ ہو کر پہنتے ہیں اور آرام سے بیٹھتے ہیں۔ بعض ممالک یعنی یورپ وغیرہ میں جا کر دیکھ لو امیر سے امیر آدمی دن کے وقت کارخانوں وغیرہ میں کام کر رہے ہوتے ہیں اور چار چار سو پانچ پانچ سو تنخواہ پر ملازم ہوتے ہیں لیکن لباس خراب ہوتا ہے۔ لیکن جہاں چار بجے اور کام سے فارغ ہوئے غسل کر کے صاف ستھرے کپڑے پہن لیتے اور آرام سے اپنے گھر بچوں اور بیوی کے پاس بیٹھتے ہیں۔

وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۲

اور ہم نے دن کو زندگی (کے اظہار) کا ذریعہ بنایا ہے۔

حل لغات۔ مَعَاشًا مَعَاشٌ عَاشَ کا مصدر ہے اور عَاشَ يَعِيْشُ مَعَاشًا کے معنے ہوتے ہیں صَارَ ذَا حَيَاةٍ (اقرب) یعنی وہ زندہ ہوا۔ پس مَعَاش کے معنے ہوئے زندگی والا ہونا۔ اور جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا کا یہ مطلب ہوا۔ کہ ہم نے دن کو حیات کے اظہار کا ایک موقع بنایا ہے۔ اسی طرح لغت میں مَعَاشًا کے ایک معنے یہ بھی لکھے ہیں کہ مُلْتَمَسًا لِلْعَيْشِ (اقرب) اس صورت میں جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے دن کو ایسا بنایا ہے کہ اُس میں انسان اپنے عیش کے سامان تلاش کرتا ہے گویا جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا کے ایک معنے ہوئے دن کو ذوحیات بنایا ہے اور دوسرے معنے ہوئے مُلْتَمَسًا لِلْعَيْشِ یعنی دن ایک ذریعہ سامانِ معیشت کے تلاش کا ہوتا ہے۔

نہار کو معاش بنانے کا مطلب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرماتا ہے کہ ہم نے دن کو ایک حیات کی چیز بنایا ہے یعنی دن اپنی ذات میں حیات کو ظاہر کرنے والا اور وہ زندہ چیز نظر آتی ہے۔ دوسرے معنے یہ ہوں گے کہ

ہم نے نہار کو ذریعہ عیش بنایا ہے یعنی وہ انسان کے لئے زندگی کے سامان تلاش کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ اگر مَعَاشًا کو مبالغہ کے معنوں میں لیا جائے تو یہ جَعَلَ کا مفعول بہ بن جاتا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہوگی جیسے کہتے ہیں زَيْدٌ عَدْلٌ پس علاوہ مفعول فیہ ہونے کے یہ اس کے مفعول بہ کے طور پر بھی استعمال ہوسکتا ہے کہ ہم نے نہار کو معاش بنا دیا یعنی نہار اور معاش کا آپس میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ معاش نہار ہے اور نہار معاش ہے تو یہ بالکل جائز ہے جیسے کہتے ہیں زَيْدٌ عَدْلٌ یعنی زید کا عدل سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ زید عدل ہے اور عدل زید ہے تو یہ جائز ہوگا۔ قرآن کریم میں بھی اس کی مثال پائی جاتی ہے سورۂ عنکبوت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (العنکبوت:۶۵) حَيَوَان کا لفظ یہاں حیات کے مبالغہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور مطلب یہ ہے کہ دارِ آخرت ہی اصل زندگی ہے۔ اب دارِ آخرت ایک جگہ کا نام ہے اور کوئی خاص جگہ زندگی نہیں کہلا سکتی مگر چونکہ انسان دارِ آخرت میں ہی حقیقی طور پر زندہ ہوگا اور اصل زندگی وہی ہے جو انسان کو اگلے جہان میں حاصل ہوگی اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ دارِ آخرت ہی زندگی ہے۔ یعنی اگر ہم یہ کہیں کہ دارِ آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے تو یہ بالکل جائز ہے۔

نہار اور معاش کا گہرا تعلق پس جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا کے یہ معنے ہوں گے کہ معاش کا دن کے ساتھ اتنا بھاری تعلق ہے اور رات کے ساتھ معاش کا اتنا کم تعلق ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ خدا تعالیٰ نے دن کو معاش بنا دیا ہے یعنی دن میں اُس نے اتنے سامان معاش کمانے کے پیدا کر دیئے ہیں کہ اور کسی وقت وہ سامان میسّر نہیں آسکتے تو یہ بالکل درست ہوگا۔ یہ معنے مَعَاشًا کے مفعول بہ ہونے کی صورت میں ہیں لیکن اگر اسے مفعول فیہ سمجھا جائے تو اس کے معنے وقتِ معاش کے ہوں گے یعنی دن کو ہم نے ایک ذریعۂ معاش بنا دیا ہے۔ دوسرے اوقات میں انسان معاش کو تلاش نہیں کر سکتا لیکن دن اُس کے حصولِ معاش کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔

مَعَاشًا کے دو معنے مَعَاشًا درحقیقت عَاشَ کا مصدر ہے اور مَعَاش کے معنے ایک تو محض حیاۃٌ کے ہوتے ہیں اور دوسرے معنے حیوانی حیات کے ہوتے ہیں۔ عام معنے اس کے حیوانی حیات کے ہی ہوتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کے کوئی بُرے معنے ہیں بلکہ حیوانی حیات سے مراد صرف وہ زندگی ہے جو کھانے پینے سے تعلق رکھتی ہے۔

تفسیر ۔ اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ جس طرح دن کے بعد رات آتی ہے اسی طرح قوموں پر بھی بعض دفعہ تاریکی کا دَور آجاتا ہے اور وہ تاریکی کا دَور اُن کے لئے ایسا ہی ہوتا ہے جیسے نہار کے بعد لیل کی ظلمت دنیا پر چھا جاتی ہے۔

آیت جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا سے بعث بعد الموت پر ثبوت میں نے بتایا تھا کہ اس سورۃ میں تین مضامین کا ذکر ہو رہا ہے قیامت کا۔ غلبۂ قرآن کا اور غلبۂ اسلام کا۔ پس اگر یہاں بعث بعد الموت مراد ہو تو اس صورت میں وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے رات کو تمہارے نقائص دور کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ تمہاری روح میں یہ قابلیت نہیں تھی کہ وہ ہمیشہ نہار سے فائدہ حاصل کر سکتی بلکہ ضروری تھا کہ اُس پر رات بھی آتی تا کہ دن سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اُس میں نئی طاقتیں پیدا ہو جاتیں یہی تمہارا روحانی حال ہے جس طرح خدا نے تمہارے لئے رات کو لباس اور نیند کو سُبَات بنایا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے دنیا کی پیدائش کا سلسلہ جو لَیل اور سُبَات کا قائم مقام ہے اس لئے جاری کیا ہے تا کہ تم اس جہان میں رہ کر اپنے اندر وہ نئی طاقتیں پیدا کرو جن سے اگلے جہان میں تمہیں رؤیت الٰہی نصیب ہو سکے پس جس طرح لیل کا نہار سے پہلے آنا ضروری ہے اسی طرح تمہاری ترقی کے لئے ایک اور عالم کا ہونا بھی ضروری ہے تم اس جہان میں رہ کر اپنے اندر وہ قابلیتیں پیدا کرو تا کہ اگلے جہان میں رؤیت الٰہی سے حصہ لے سکو۔ اور اگر قرآن یا اسلام کا غلبہ مراد ہو تو اس صورت میں مذکورہ بالا آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ تمہاری قوم سو رہی تھی مگر اللہ تعالیٰ اسی لَیل میں تمہارے اندر نئی قوتیں پیدا کر رہا تھا۔ جب بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے کلام نازل ہوتا ہے اُسی قوم میں نازل ہوتا ہے جو مردہ اور ذلیل ہو چکی ہوتی ہے تا کہ وہ اُس کلام کے ذریعہ نئی طاقتیں لے کر کھڑی ہو جائے اور دنیا پر غالب آ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی خدا تعالیٰ کا کلام کسی قوم میں نازل ہوتا ہے اُس کی قوتوں میں نشوونما پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور آخر ایک دن وہ قوم اُن قوتوں سے کام لے کر دنیا میں پھیل جاتی ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کو دیکھ لو۔ عرب صدیوں سے ذلیل اور مردہ چلے آ رہے تھے اُن کا دنیا میں کہیں غلبہ نہ تھا۔ اُن کی ترقی کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ دنیا سے الگ ایک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہوا تو بے شک وہ قرآن کریم کی مخالفت کرتے تھے۔ وہ اسلام کو مٹانے کی کوششیں کرتے تھے مگر ساتھ ہی اُن کے دلوں میں یہ حسرت بھی موجود تھی کہ ہر قوم نے ترقی کی۔ ہر قوم نے عروج حاصل کیا ہر قوم نے غلبہ پایا مگر ہمیں کوئی ترقی حاصل نہیں ہوئی۔ پس اُن کے دلوں میں ترقی کی تڑپ پائی جاتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ غلبہ حاصل کریں اور ان کی ذاتی خواہش تھی کہ ہماری قوم کو بھی عزت ملنی چاہیے اور اسے بھی دنیا میں غلبہ حاصل ہونا چاہیے اور اس خواہش نے اسلام لانے پر انہیں ترقی میں بڑی مدد دی۔ پس جب بھی کلام الٰہی نازل ہوتا ہے اسی قوم میں نازل ہوتا ہے جو مدتوں سے مردہ ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

کو اللہ تعالیٰ نے ہندوستان میں مبعوث فرمایا جہاں کے رہنے والے مدتوں سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور جن کے دلوں میں یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ ہم بھی بڑھیں اور ترقی کریں۔ اور گو وہ لوگ احمدیت کی مخالفت کرتے ہیں جس طرح عرب کے رہنے والے اسلام کی مخالفت کیا کرتے تھے مگر جس دن اُن کو پتہ لگا کہ احمدیت ہی اُن کی ترقی کا ذریعہ ہے اُسی دن اُن کے اندر بیداری پیدا ہو جائے گی اور وہ اس غرض کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔

وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا میں اللہ تعالیٰ نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ درحقیقت زندگی کا ثبوت صرف دن سے ہی ملتا ہے رات سے نہیں ملتا۔ یہاں ایک عجیب لفظی لطیفہ ہے۔ انسان عام طور پر راحت اور آرام کے سامانوں میں اپنی زندگی بسر کرنا ہی عیش سمجھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس کو تم عیش سمجھتے ہو وہ عیش نہیں بلکہ ایک نیند ہے جو تم پر مسلّط ہوتی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ کھانا پینا سیر و سیاحت کرنا۔ راحت و آرام کے سامانوں میں چکر لگانا انسان کے لئے عیش ہوتا ہے حالانکہ عیش کا زمانہ صرف نبی کا زمانہ ہوتا ہے جب حقیقی کام کا وقت ہوتا ہے اور جب حقیقی عزت حاصل کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ کھانا پینا اور مادی راحت و آرام کے سامانوں سے لطف اُٹھانا یہ عیش نہیں بلکہ سونا ہے۔ گویا جس کو تم عیش کہتے ہو وہ تمہارے سونے کا زمانہ ہے اور جس کو تم تکلیف کا زمانہ کہتے ہو وہ حقیقی معنوں میں عیش کا زمانہ ہے جس طرح دن کو انسان چلتا پھرتا ہے اور رات کو آرام کرتا ہے اسی طرح کام کا وقت عیش کا وقت کہلاتا ہے اور آرام کا وقت لیل کا وقت کہلاتا ہے دنیا میں جس چیز کو عیش سمجھا جاتا ہے وہ سکون کا زمانہ ہوتا ہے۔ اور جس چیز کو تکلیف سمجھا جاتا ہے وہ کام کا زمانہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ تم سکون والی چیز کا نام عیش رکھتے ہو حالانکہ عیش کا زمانہ وہ ہے جس میں انسانی طاقتیں متحرک ہوں اور اس کے لئے لَیْل کا وقت نہیں بلکہ نہار کا وقت مقرر ہے اور درحقیقت وہی زمانہ عیش کا ہوتا ہے جب قوم میں قربانی کی روح پائی جاتی ہو۔ جب اُس کے تمام افراد میں بیداری نظر آتی ہو۔ جب اُس کے ہر فرد میں یہ احساس پایا جاتا ہو کہ جان کو قربان کر دینا اور مال کو خدا تعالیٰ کی راہ میں لٹا دینا ہی کلید کامیابی ہے۔ کیونکہ زندگی حرکت کا نام ہے سکون کا نام نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس کو تم عیش کہتے ہو وہ سکون ہے اور تباہی کی علامت۔ اور جس کو تم تکلیف کا وقت کہتے ہو وہی عیش ہے۔ تم سکون والی زندگی کو عیش کی زندگی قرار دیتے ہو حالانکہ وہ عیش نہیں بلکہ ایک نیند ہے جو تم پر طاری ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں جس چیز کو تم عیش قرار دینے کے لئے تیار نہیں وہی حقیقی معنوں میں عیش ہے۔ گویا ان الفاظ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی ایک غلطی کا ازالہ کیا کہ عیش نام ہے حرکت کا جیسے انسان دن میں حرکت کرتا ہے۔ مگر تم عدمِ حرکت کا نام عیش رکھتے ہو

حالانکہ وہ عیش نہیں بلکہ تمہارے حواس کا بطلان ہے۔

وَّ بَنَیۡنَا فَوۡقَکُمۡ سَبۡعًا شِدَادًا ۙ﴿۱۳﴾

اور ہم نے تمہارے اوپر سات (بلند اور) مضبوط (آسمان) بنائے ہیں۔

حل لغات۔ شِدَادًا شِدَادٌ شَدِیۡدٌ کی جمع ہے اور اَلشَّدِیۡدُ کے معنے ہیں اَلشُّجَاعُ وَالۡبَخِیۡلُ وَالۡاَسَدُ وَالۡقَوِیُّ وَالرَّفِیۡعُ وَالۡوَثِیۡقُ (اقرب) یعنی شَدِیۡدٌ کے معنے شجاعؔ کے بھی ہیں۔ بخیل کے بھی ہیں۔ شیرؔ کے بھی ہیں۔ قویؔ کے بھی ہے۔ بلندؔ کے بھی ہیں اور مضبوطؔ کے بھی ہیں۔ شَدِیۡدٌ کی شِدَادٌ بھی آتی ہے اور اَشِدَّاءُ بھی آتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہی اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر صحابہؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ (الفتح: ۳۰) یہاں سَبۡعًا شِدَادًا کے معنے ہوں گے سَبۡعًا رِفَاعًا یعنی سات اونچی چیزیں ہم نے پیدا کی ہیں اسی طرح قَوِیٌّ کے معنے بھی ہو سکتے ہیں اور وَثِیۡق کے معنے بھی ہو سکتے ہیں۔ گویا اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے سات وہ چیزیں پیدا کی ہیں جو بلند ہیں یا ہم نے سات وہ چیزیں پیدا کی ہیں جو قوی ہیں یا ہم نے سات وہ چیزیں پیدا کی ہیں جو بندھی ہوئی ہیں اپنی جگہ سے ہلتی نہیں ہیں۔

تفسیر۔ سَبۡعًا شِدَادًا سے مراد سات آسمان یہ سات کیا چیزیں کیا ہیں؟ قرآن کریم میں دوسری جگہ آسمانوں کے لئے چونکہ سات کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس لئے یہاں بھی سات سے مراد سات آسمان ہی ہوں گے اور بَنَیۡنَا فَوۡقَکُمۡ سَبۡعًا شِدَادًا کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے تمہارے اوپر سات جسمانی اور مادی بلندیاں پیدا کی ہیں جو بڑی قوی ہیں یعنی اُن میں کوئی تزلزل واقعہ نہیں ہوتا۔ ایک مضبوط قانون اُن میں چلتا چلا جاتا ہے جو کسی حالت میں بھی ٹوٹتا نہیں اور اس وجہ سے نظامِ عالم میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔

شِدَاد کے معنے اگر ہم رَفِیۡعؔ کے لیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے ایک ایسا وسیع اور بلند و بالا نظام تمہارے لئے قائم کیا ہے جس کا رفعت میں کوئی خاتمہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح یہاں وَثِیۡق کے معنے بھی لئے جا سکتے ہیں یعنی وہ نظام جسے ہم نے قائم کیا ہے اُس میں یکرنگی پائی جاتی ہے ایک قانون جس رنگ میں ظاہر ہوتا ہے اُسی رنگ میں چلتا چلا جاتا ہے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ یکرنگی اور نہ ٹوٹنے میں فرق ہوتا ہے۔ نہ ٹوٹنے میں صرف ایک چیز قائم رہتی ہے لیکن یکرنگی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ قانون بالکل یکساں رہتا ہے اُس میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

لفظ شِدَادًا سے نظام سماوی کی تین خصوصیات کی طرف اشارہ دُنیا میں بعض انسان ایسے ہوئے ہیں جن میں عدم استقلال پایا جاتا ہے وہ آج کچھ کہتے ہیں تو کل کچھ کہہ دیتے ہیں ایسے لوگوں کو یکرنگ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جو سَبۡعًا شِدَادًا بنائے ہیں اُن میں یہ تینوں خوبیاں پائی جاتی ہیں قَوِیّ کے لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ ان کے اندر ثبات پایا جاتا ہے رَفِیۡع کے لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ ان میں وسعت اور بلندی پائی جاتی ہے اور وثیق کے لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ اُن میں یکرنگی پائی جاتی ہے گویا بَنَيۡنَا فَوۡقَكُمۡ سَبۡعًا شِدَادًا کے یہ معنے ہوئے کہ ہم نے تمہارے اوپر جو سات بلندیاں پیدا کی ہیں وہ یکرنگ بھی ہیں وہ قائم رہنے والی بھی ہیں اور اپنی ذات میں رفعت بھی رکھتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سَبۡعًا شِدَادًا کا ذکر کرتے ہوئے یہاں اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ تین خصوصیات جو نظام سماوی کی ہم نے بیان کی ہیں یہ بھی اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہیں کہ دُنیا کی پیدائش کا کوئی بہت بڑا مقصد ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کو پیدا کر کے بلاوجہ اور بغیر کسی مقصد کے اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر ایک بہت بڑا، وسیع اور مضبوط نظام بنادیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فعل کو عبث قرار دیتا اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ گویا یہ تمام نظام نعوذ باللہ بالکل لغو اور فضول ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم ہمارے اس قانون کو دیکھو کہ وہ نہ ٹوٹنے والا ہے تم اس قانون کی یکرنگی کو دیکھو کہ کس طرح وہ ایک ہی رنگ میں چلتا چلا جا رہا ہے اور پھر اس نظام کی رفعت اور اس کی وسعت کا اندازہ لگاؤ۔ سائنسدان اس نظام کو دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں اور باجود بہت بڑی علمی ترقی کے اس نظام کی وسعت کا اندازہ لگانے سے اُن کی عقلیں قاصر ہیں۔ تم غور کرو اور سوچو کہ کیا یہ تمام انتظام ایک ایسی دنیا کے لئے اور پھر اس دنیا کی ایک ایسی مخلوق کے لئے کیا جا سکتا تھا جس کی پیدائش کا کوئی مقصد نہ تھا اور جس نے کچھ عرصہ کے بعد فنا ہو کر مٹی ہو جانا تھا۔ یہ انتظام خود اس بات کی دلیل ہے کہ انسانی پیدائش کا کوئی بہت بڑا مقصد اور مدعا ہے۔

نظام سماوی کا ذکر بعث بعد الموت کے ثبوت کے لئے ایک دلیل اگر اس مقصد کو تسلیم نہ کیا جائے تو یہ تمام نظام نعوذ باللہ لغو تسلیم کرنا پڑتا ہے گویا اس رنگ میں نظام سماوی کو اللہ تعالیٰ نے بعث بعد الموت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وسیع اور پُر حکمت نظام جاری کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ انسانی پیدائش صرف اس لئے نہیں ہوئی کہ وہ چند روز کھائے اور پیئے اور فنا ہو جائے بلکہ کسی بہت بڑے مقصد اور مدعا کو پورا کرنے کے لئے اس کی پیدائش ہوئی ہے۔ اور اگر یہاں قرآن مجید مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنی فطرت کو دیکھو اور غور کرو کہ کھانے پینے کے سوا اعلیٰ درجہ کے اخلاق کے حصول کی کتنی عظیم الشان تڑپ تمہارے دلوں میں رکھی

گئی ہے۔تمہارے اندر شوق پایا جاتا ہے کہ تم نیکی میں ترقی کرو۔تمہارے اندر خواہش پائی جاتی ہے کہ تم اعلیٰ درجہ کے روحانی مدارج حاصل کرو۔کیا یہ شوق اور خواہش بلا وجہ ہے اور کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو تمہاری ادنیٰ خواہشیں تھیں اُن کو پورا کرنے کے سامان تو اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیئے مگر جو اعلیٰ درجہ کی روحانی خواہشات تمہارے اندر رکھی گئی تھیں اُن کو پورا کرنے کا خدا نے کوئی سامان پیدا نہیں کیا۔

سَبْعًا شِدَادًا سے مراد سات روحانی مدارج اس صورت میں سَبْعًا شِدَادًا سے مراد وہ سات روحانی مدارج ہوں گے جن کا سورۂ مومنون میں ذکر آتا ہے اور جن کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب مومن ترقی کرتے کرتے ان ساتوں بلندیوں کو طے کر لیتا ہے۔

وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۴﴾

اور ہم نے ایک چمکتا ہوا سورج (بھی) بنایا ہے۔

حل لغات۔سِرَاجٌ سِرَاجٌ کے معنے عام طور پر دیئے کے ہوتے ہیں اور سُرُجٌ اس کی جمع ہے۔سورج کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی خدا کا ایک دیا ہے جو دنیا کو روشن کرنے کے لئے اُس نے بنایا ہے۔

وَهَّاجًا کہتے ہیں وَهَجَتِ النَّارُ والشَّمْسُ وَهْجًا وَ وَهَجَانًا: اِتَّقَدَتْ (اقرب) وَهَجَتِ النَّارُ کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ آگ بھڑک اٹھی وَهَّاج مبالغے کا صیغہ ہے یعنی اَلشَّدِيْدُ الْوَهَج (اقرب) سخت گرمی والا یا سخت بھڑکنے والا۔اور وَهَجٌ کے معنے اس گرمی کے بھی ہوتے ہیں جس کو دور سے محسوس کیا جائے گو یا وَهَجَ کے معنے ہوئے حَرُّ الشَّمْسِ مِنْ بَعِيْدٍ سورج کی گرمی جو دور سے آ رہی ہو۔پس اس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ ہم نے ایک سورج بنایا ہے جس کی صفت یہ ہے کہ وہ بڑا گرم ہے اور اُس کی گرمی دُور دُور تک محسوس ہوتی ہے۔یہاں یہ نہیں فرمایا کہ وَجَعَلْنَا السِّرَاجَ وَهَّاجًا بلکہ فرمایا وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں تنوین تفخیم کے لے آئی ہے اگر جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ہوتا تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ ہم نے سورج کو وَهَّاج بنایا ہے مگر جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا کہہ کر بتادیا کہ ہم نے ایک عظیم الشان سورج بنایا ہے جس کی صفت ذاتی یہ ہے کہ وہ وَهَّاج ہے۔

مفردات میں ہے اَلْوَهَجُ: حُصُوْلُ الضَّوْءِ وَالْحَرِّ مِنَ النَّارِ یعنی آگ سے روشنی حاصل کرنے اور گرمی حاصل کرنے کو وَهَجٌ کہتے ہیں۔اور جب تَوَهَّجَ الْجَوْهَرُ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں تَلَألَأَ یعنی جو ہر چمک اُٹھا۔

اور جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا کے معنے ہیں مُضِيْئًا یعنی ہم نے سورج کو ایسا بنایا ہے کہ دنیا اس سے روشنی حاصل کرتی ہے (مفردات) پس دوسرے معنے جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا کے یہ ہوئے کہ ہم نے سورج بنایا ہے جس کی ذاتی صفت یہ ہے کہ وہ بہت روشنی دینے والا ہے۔

تفسیر۔ لفظ وھاج سے سورج کی ذاتی گرمی کی طرف اشارہ سورج کی صفت **وھّاج** بتا کر اُس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ سورج کی روشنی اور گرمی ذاتی ہے۔ چاند **وھّاج** نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے کہ اس میں اتّقاد نہیں ہے۔ آگ کی طرح جلنے والا سورج ہی ہے۔ سورج کے اندر خدا تعالیٰ نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اس میں ریڈیم موجود ہے کششِ ثقل کے ماتحت جب اس کے ذرّے اندر کی طرف کھنچتے ہیں تو تیز روشنی اور گرمی پیدا ہوتی ہے اور ان ذرّوں کے اندر کی کشش کی وجہ سے اس سے مستقل آگ پیدا ہوتی رہتی ہے۔

سورج کی صفت **وھّاج** بھی کتنی ظاہر ہے۔ کروڑوں کروڑ میل پر سورج ہے یعنی نو کروڑ میل کے قریب دنیا سے اس کا فاصلہ ہے مگر اس کی گرمی جب یہاں پہنچتی ہے تو گرمیوں کے موسم میں کئی لوگ اس کو برداشت نہیں کر سکتے اور وہ مر جاتے ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے لاہور کے متعلق یہ خبر آئی تھی کہ وہاں گرمی کی شدّت کی وجہ سے گھوڑے چلتے چلتے گر کر مر جاتے تھے۔ نیز امریکہ سے خبر آئی تھی کہ گرمی کی وجہ سے درجنوں آدمی پاگل ہوئے اور بلند مکانوں پر سے چھلانگ مارنے پر تیار ہو گئے۔ گویا سورج کو اللہ تعالیٰ نے **وھّاج** بنایا ہے یعنی دور دور تک اس کی گرمی پہنچتی ہے۔ لُغت میں اَلْوَهَجُ مِنَ النَّارِ وَالشَّمْسِ کے معنوں میں لکھا ہے کہ حَرُّهُمَا مِنْ بَعِيْدٍ یعنی سورج یا آگ کی گرمی جو بہت دور سے محسوس ہوتی ہو۔ گویا سِرَاجًا وَّهَّاجًا میں دو اشارے کئے گئے ہیں۔ اوّل یہ کہ سورج کی روشنی اور گرمی ذاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی گرمی بہت دور سے محسوس ہوتی ہے۔

سورج کے جہاں اَور بہت سے فوائد ہیں وہاں اُس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ سورج کی روشنی اور اس کی تپش سے زمین کے اندر روئیدگی کا مادہ پیدا ہوتا ہے چنانچہ ہل چلانے سے محض یہ غرض نہیں ہوتی کہ زمین کو نرم کر دیا جائے بلکہ آج کل جو نئے حل بنائے گئے ہیں وہ ایسی طرز پر بنائے گئے ہیں کہ زمین کے نچلے حصہ کو اُکھاڑ کر باہر پھینک دیتے ہیں یعنی وہ ہل زمین کو صرف نرم ہی نہیں کرتے بلکہ اُوپر کی زمین کو نیچے اور نیچے کی زمین کو اُوپر کر دیتے ہیں اور اس کی غرض یہ ہوا کرتی ہے کہ زمین میں اگانے والے بعض مادے ایسے ہوتے ہیں جن کو فصل کھا جاتی ہے اور اگر پھر اُسے اُٹھا کر سورج کے سامنے نہ کیا جائے تو آئندہ فصل ناقص پیدا ہونے لگتی ہے لیکن جب نچلے حصہ کو اُلٹا کر اُوپر کر دیا جائے تو سورج کی شعاؤں سے طاقت حاصل کر کے زمین کے اس نقص کی کمی پوری ہو جاتی ہے غرض سورج کا تعلق

فصلوں کے اُگانے میں بہت بڑا ہے اگر سورج کی گرمی اور اُس کی شعائیں نہ پہنچیں تو زمین کے بعض ایسے مادے جن سے فصلیں اُگتی ہیں بالکل ختم ہو جائیں۔

جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا کے الفاظ سے قیامت کی طرف لطیف اشارہ جہاں تک سِرَاجًا وَّهَّاجًا کا تعلق ہے اس میں تو میں سمجھتا ہوں قیامت کی طرف اس رنگ میں اشارہ ہے کہ ایک چیز جو اپنی ذات میں جل رہی ہے وہ آخر ایک وقت ختم ہو جائے گی اور جب وہ ختم ہو جائے گی تو نظامِ شمسی میں ضرور کوئی اہم تبدیلی رُونما ہو گی۔ چنانچہ علم ہیئت کے جو بڑے بڑے ماہرین ہیں وہ قیامت کے قائل ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں سورج چھوٹا ہوتا جا رہا ہے اور اسی طرح یہ چھوٹا ہوتا چلا جائے گا یہاں تک ایک دن اس کا وجود نظامِ عالم میں بالکل بیکار ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی باقی تمام سیّارے فنا ہو جائیں گے۔

گو اس کے ساتھ ہی علم ہیئت والوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جہاں تک گرمی کا تعلق ہے سورج کی گرمی گھٹ نہیں رہی بلکہ بڑھ رہی ہے اور جوں جوں وہ اپنے مرکز کے قریب آتا جاتا ہے اس کی گرمی تیز ہوتی چلی جاتی ہے۔ احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب قیامت آئے گی تو شدید گرمی پیدا ہو جائے گی۔

آیت سِرَاجًا وَّهَّاجًا میں غلبہ اسلام کی پیشگوئی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے غلبہ یا قرآن کریم کے غلبہ کے مفہوم کو اگر ہم لیں تو میرے نزدیک اس میں ایک مخفی اشارہ ہجرت کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان الفاظ کے ذریعہ کفّارِ مکہ کو توجہ دلاتا ہے کہ اب تو محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمہارے پاس بیٹھے ہیں اور تم کہتے ہو یہ ہمیں دق کرتے ہیں۔ یہ ہمارے بتوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ یہ ہمیں تبلیغ کرتے ہیں۔ یہ ہمیں آباؤ اجداد کی اتباع کرنے سے روکتے ہیں۔ اور جب یہ تمہیں کوئی نیک بات بتاتے اور تمہیں وعظ و نصیحت کرتے ہیں تو تم شور مچانے لگ جاتے ہو اور چاہتے ہو کہ کسی طرح ان کو اپنے شہر سے نکال دو اور اس طرح امن میں آجاؤ مگر تمہیں پتہ نہیں ہم نے اپنے اس رسول کو سِرَاجًا وَّهَّاجًا بنایا ہے ایک دن یہ تم سے دُور چلا جائے گا مگر پھر بھی تم اس کی گرمی سے نہیں بچو گے بلکہ برابر اس کی گرمی تمہارے پاس پہنچتی رہے گی اور اس کی روشنی تم میں سے سعید روحوں کی تاریکی کو دُور کرتی رہے گی۔ اگر قرآن مراد لے لو تب بھی یہ معنے ہوں گے کہ ایک دن قرآن کا مرکز تم سے دور ہو جائے گا مگر تم یہ نہ سمجھو کہ دور ہو جانے کی وجہ سے تم اس کے اثر سے بچ سکو گے بلکہ پھر بھی قرآن کریم کی تعلیم کا اثر تم تک پہنچے گا اور وہ تمہیں اپنا شکار بنائے گا۔

آیت جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا میں اسلام کے عالمگیر ہونے کا ثبوت انبیاء کے زمانہ میں کچھ ایسا شور ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ مومنوں کے دلوں میں کچھ اس قسم کا اخلاص پیدا کر دیتا ہے کہ انہیں تبلیغ کرنے اور دوسروں تک

اپنی باتیں پہنچانے کے سوا چین ہی نہیں آتا۔ اُنہیں لاکھ گالیاں دی جائیں وہ اپنے کام سے نہیں رُکتے اور لوگوں کی ہدایت کے لئے ان کے پیچھے ہی پڑے رہتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے زمانہ میں بھی ہم مُخالفوں کے مُنہ سے یہ فقرہ سنا کرتے تھے کہ احمدی تو ہمارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ہم نے ایک ایسا سورج بنا دیا ہے جو وَھَّاج ہے اور جس کی گرمی اور روشنی دور دور تک جاتی ہے۔ دوسرے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی عالمگیر تعلیم کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے اور اللہ تعالیٰ یہ بیان فرماتا ہے کہ جس طرح سورج کا نور ساری دنیا میں پھیل جاتا ہے اِسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تعلیم ایک دن ساری دنیا میں پھیل جائے گی۔ تم مکّے کا رونا رو رہے ہو اور کہہ رہے ہو کہ مکّہ میں اسلام پھیل گیا دس بیس پچاس برس کے بعد ایک دن آئے گا جب تم دیکھو گے کہ یہ سِرَاج وَھَّاج بن جائے گا اور اس کی روشنی ساری دنیا پر چھا جائے گی۔ تیسرے دُور تک گرمی اور روشنی کے پھیلنے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا زمانۂ افادہ زمانہ کے لحاظ سے بھی بہت ممتد ہے اور جس طرح یہ دنیوی سورج قیامت تک مادی دنیا کی ضرورتوں کو پورا کرتا رہے گا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا افاضۂ روحانی بھی دنیا کے اختتام تک چلتا چلا جائے گا۔

وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۵﴾

اور ہم نے گھنے بادلوں سے کثرت سے بہنے والا پانی (بھی) اتارا ہے۔

حل لغات۔ مُعْصِرَةٌ مُعْصِرَةٌ کے معنے ہوتے ہیں وہ بدلی جس میں نمی کی بہت زیادتی ہو اور اُس میں سے بارش کے قطرات گرتے ہوں۔ اَلْمُعْصِرَةُ۔ اَلسَّحَابَةُ تُعْتَصَرُ بِالْمَطَرِ۔ یعنی مُعْصِرَةٌ اُس بدلی کو کہتے ہیں جس میں سے پانی کے قطرے ٹپکے پڑتے ہوں۔ پس مُعْصِرَات کے معنے ہوئے اَلسَّحَائِب تُعْتَصَرُ بِالْمَطَرَ (اقرب) وہ بادل جن میں سے پانی کی کثرت کی وجہ سے قطرے ٹپک پڑتے ہیں اور مُعْصِرَةٌ اُس ہوا کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ بگولہ آتا ہے چنانچہ اَعْصَرَتُ الرِّيحُ کے معنے ہیں جَاءَ تْ بِالْاِعْصَارِ (اقرب) ہوا کے ساتھ بگولہ آیا۔ لیکن محاورہ کی رو سے اَلْمُعْصِرَات: اَلسَّحَائِبُ تُعْتَصَرُ بِالْمَطَرَ کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ گو مُعصِرَة کے معنے ہوا کے بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ بعض صحابہؓ نے کئے ہیں لیکن چونکہ عام محاورہ میں مُعصِرَة اُس ہوا کو کہتے ہیں جس کے ساتھ بگولہ ہو اور یہ معنے یہاں پوری طرح چسپاں نہیں ہوتے اس لئے یہاں زیادہ مناسب معنے

ایسے بادل کے ہی ہوں گے جس میں پانی کی کثرت ہو اور اس میں سے پانی ٹپک رہا ہو۔ ہاں وضعِ لُغت کے لحاظ سے اِعْصَار کے معنے چونکہ نچوڑنے کے ہوتے ہیں اس لئے مُعْصِرَات اُن ہواؤں کو بھی کہہ سکتے ہیں جن کے تیزی سے چلنے کی وجہ سے بادلوں کے بخارات جلد مجتمع ہو کر پانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بہرحال بعض صحابہؓ نے مُعْصِرَات کے معنے ہواؤں کے کئے ہیں اور بعض نے اس کے معنے بادلوں کے کئے ہیں۔ اکثر مفسّرین نے ترجیح بادلوں کے معنوں کو ہی دی ہے کیونکہ لُغت کے استعمال میں یہی معنے رائج ہیں (تفسیر فتح البیان، ابن کثیر، جامع البیان زیر آیت ھذا)۔

ثَجَّاجًا ثَجَّاجًا ثَجَّ سے ہے اور ثَجَّ الْمَاءُ کے معنے ہوتے ہیں سَالَ (بِکَثْرَۃٍ) (اقرب) یعنی کثرت کے ساتھ پانی بہنا شروع ہوا۔ اور ثَجَّاج کے معنے ہیں اَلثَّجَّاجُ مِنَ الْمَطَرِ: السَّیَّالُ الشَّدِیْدُ الْاِنْصِبَابِ (اقرب) یعنی ثَجَّاج اُس بارش کو کہتے ہیں جو بڑی تیزی سے برستی ہے۔ پس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ ہم نے بڑی بارش والی بدلیوں میں سے جن سے پانی کی کثرت کی وجہ سے قطرات ٹپکے پڑتے ہیں ایک ایسا پانی اتارا ہے جو کثرت سے بہنے والا ہے۔

تفسیر۔ اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے پہلے سورج کا ذکر کیا اور پھر بدلیوں کا ذکر کر کے بتایا کہ ان دو چیزوں سے مل کر زمین تیار ہوتی ہے یعنی جب سِرَاجٍ وَھَّاج سے زمین تیار ہوتی ہے تو مُعْصِرَات سے پانی برستا ہے جس سے زمین کی روئیدگیاں نشوونما حاصل کرنا شروع کر دیتی ہے۔ دوسرے ان آیات میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جہاں وَھَج سے زمین تیار ہوتی ہے وہاں وَھَج سے ہی بادل اُٹھتے ہیں۔ کیونکہ بادل کیا چیز ہیں۔ بادل سمندروں اور دریاؤں اور نالوں وغیرہ کے پانی کے اجزے ہیں جو سورج کی گرمی سے اُڑ کر فضاء میں جاتے اور پھر فضاء کی سردی میں سیّال بن کر زمین پر ہی واپس آجاتے ہیں۔ جب سورج کی گرمی ان پانیوں پر پڑتی ہے تو جس طرح آگ پر ہم پانی رکھیں تو اُس میں سے دُھوَاں اٹھنا شروع ہو جاتا ہے اور اگر زیادہ دیر تک آگ پر رکھا جائے تو تمام پانی بخارات بن کر اُڑ جاتا ہے اسی طرح سورج کی گرمی سے بخارات اُٹھتے اور آہستہ آہستہ جَوّ میں جمع ہوتے رہتے ہیں پھر ہوائیں اُن کو زمین پر لا کر برسا دیتی ہے۔ تو ایک طرف سِرَاج وھَّاج سے زمین تیار ہوتی ہے اور دوسری طرف سِرَاج وھَّاج ہی پانی لاتا ہے گویا وہی گرمی جو انسان کے بے چین کر رہی ہوتی ہے اُس کو ٹھنڈک پہنچانے کے سامان مہیّا کر رہی ہوتی ہے۔

آیت اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ سے قیامت کی طرف اشارہ اِن آیات میں قیامت کی طرف اس رنگ

میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ ہر چیز کے لئے خدا نے کوئی جواب رکھا ہے۔سورج آسمان پر گرم ہے زمین پر اُس کا اثر پڑتا ہے تو وہ نشوونما اور روئیدگی کے لئے تیار ہوتی ہے پھر وہی سورج جو ایک طرف زمین کو روئیدگی کے لئے تیار کرتا ہے اپنی گرمی سے زمین کے بخارات کو اوپر اٹھاتا ہے اور اس طرح سورج کے وَھَج کے نتیجہ میں وہ بخارات بادل بن کر زمین پر برسنا شروع ہو جاتے ہیں۔سبب اور مسبّب کا یہ سلسلہ جو اللہ تعالیٰ نے اس کائناتِ عالم میں جاری کیا ہوا ہے بیہودہ اور لغو نہیں ہوسکتا۔ضرور ہے کہ اس کا کوئی عظیم الشان نتیجہ نکلے مگر وہ نتیجہ اس دنیا میں نہیں نکل رہا اس لئے لازماً کسی اور زندگی کو ماننا پڑے گا جہاں ان عظیم الشان کاموں کا کوئی نتیجہ نکلے اور انسان کہہ سکے کہ اللہ تعالیٰ نے جس سلسلۂ کائنات کی بنیاد رکھی تھی وہ لغو نہیں تھا۔

آیت وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ میں غلبہ اسلام کی پیشگوئی قرآن مجید اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف اِن آیات میں اس رنگ میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی باتیں تم کو بُری لگتی ہیں تم کہتے ہو کہ انہوں نے دنیا میں آ کر فساد مچا دیا۔تم کہتے ہو کہ جب سے یہ ظاہر ہوا ہے جھگڑے اور لڑائیاں شروع ہو گئی ہیں ایک شور ہے جو اس کی وجہ سے مچ رہا ہے۔باپ بیٹے سے جدا ہو گیا ہے۔بیٹا باپ سے جدا ہو گیا ہے۔ماں لڑکی سے علیحدہ ہو گئی ہے اور لڑکی ماں سے علیحدہ ہو گئی ہے۔بھائی بھائی سے علیحدہ ہو گیا ہے اور دوست دوست سے جدا ہو گیا ہے گویا تمہیں اس کے آنے کی وجہ سے ایک گرمی سی محسوس ہونے لگی ہے جیسے سورج کے نکلنے سے ایک گرمی سی محسوس ہونے لگتی ہے مگر فرماتا ہے بیشک تمہیں آج اس کی وجہ سے گرمی محسوس ہونے لگی ہے مگر یہی گرمی ایک دن تمہارے لئے رحمت کا بادل ثابت ہوگی اِس گرمی سے تمہاری اندرونی قابلیتوں کو اُبھارا جا رہا ہے۔تمہارے اندر نئی قابلیتیں پیدا کی جا رہی ہیں مگر تم ابھی اس کو محسوس نہیں کر سکتے بلکہ تم اس تغیّر پر تکلیف محسوس کرتے ہو جیسے ڈاکٹر جب اپریشن کرنے لگتا ہے اُس کا چاقو انسان کو چُبھتا ہے لیکن آخر وہی چاقو جس سے اُس نے تکلیف محسوس کی تھی اُس کی صحت اور آرام کا موجب بن جاتا ہے۔اسی طرح فرماتا ہے بے شک محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وجہ سے تم ایک بے چینی اور تکلیف سی محسوس کر رہے ہو۔مگر یہی وَھَج اور یہی گرمی اور یہی تپش اور یہی روشنی تمہاری راحت اور آرام کا موجب ہوگی۔جس طرح سورج کی گرمی بادلوں کو اُٹھا کر لاتی اور زمین پر پانی کی صورت میں اُن کو برسا دیتی ہے اسی طرح ایک دن اسی وَھَج سے تمہارے دلوں میں ایمان اور عرفان کی بدلیاں اُٹھنے لگیں گی اور تمہارے دلوں سے علم وعرفان کے وہ سوتے پُھوٹ پڑیں گے جن کا پانی ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔مجھے یہاں مَآءً ثَجَّاجًا کے الفاظ سے اپنا وہ خواب یاد آ گیا جو تھوڑے ہی دن ہوئے مَیں نے دیکھا تھا اور جس میں مجھے انسانی

قلب ایک تنور کی شکل میں دکھایا گیا اور مجھے یہ نظارہ نظر آیا کہ اُس تنور میں سے اللہ تعالیٰ کے عرفان کا پانی پھُوٹنا شروع ہوا اور وہ دنیا کے کناروں تک پھیل گیا۔ میں نے جب اُس پانی کو پھیلتے دیکھا تو اُس وقت مَیں نے کہا یہ پانی پھیلے گا اور پھیلتا چلا جائے گا یہاں تک کہ دنیا کا ایک انچ بھی ایسا باقی نہ رہے گا جہاں خدا کے عرفان کا یہ پانی نہ پہنچے۔ یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمایا ہے کہ وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا۔اس شمس روحانی کی گرمی سے تمہارے دل کی زمینیں تیار ہوں گی پھر اسی گرمی کے نتیجہ میں وہاں سے ایسے بخارات اٹھنے شروع ہوں گے جو بادلوں کی صورت اختیار کرلیں گے اور پھر وہی بادل تمہارے دلوں کی زمین پر برسیں گے اور اُن کا پانی ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔

لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا ۙ﴿۱۶﴾ وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا ؕ﴿۱۷﴾

تا کہ اس کے ذریعہ سے ہم دانے اور سبزیاں نکالیں۔ اور گھنے باغ (اُگائیں)۔

حل لغات۔ حَبًّا اَلْحَبُّ وَالْحَبَّةُ يُقَالُ فِي الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ وَنَحْوِهِمَا مِنَ الْمَطْعُوْمَاتِ یعنی گندم اور جَو اور ایسے ہی وہ تمام غلّہ جات اور اناج جن سے خوراک کا کام لیا جاتا ہے اُن کے دانوں کو حبّ کہتے ہیں۔(مفردات)

لسانؔ میں ہے۔اَلْحَبُّ: اَلزَّرْعُ صَغِيْرًا كَانَ اَوْ كَبِيْرًا یعنی حبّ نباتاتی پیداوار کو کہتے ہیں خواہ چھوٹی ہو یا بڑی۔

نَبَاتًا اَلنَّبْتُ وَالنَّبَاتُ مَا يَخْرُجُ مِنَ الْاَرْضِ مِنَ النَّامِيَاتِ سَوَاءً كَانَ لَهٗ سَاقٌ كَالشَّجَرِ اَوْلَمْ يَكُنْ لَهٗ سَاقٌ كَالنَّجْمِ لٰكِنِ اخْتَصَّ فِي التَّعَارُفِ مِمَّا لَا سَاقَ لَهٗ بَلْ قَدِ اخْتَصَّ عِنْدَ الْعَامَّةِ بِمَا يَأْكُلُهُ الْحَيَوَانُ (مفردات) یعنی نبات زمین سے پیدا ہوکر بڑھنے والی ہر چیز پر بولتے ہیں خواہ وہ درختوں کی قسم سے ہو یا چھوٹی چھوٹی بوٹیوں کی قسم سے لیکن عرف عام میں نبات صرف اس کو کہتے ہیں جس کا تنا نہ ہو یعنی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں ہوں۔ بلکہ عوام کے نزدیک صرف اُس کو نبات کہتے ہیں جس کو حیوان کھاتے ہیں۔ گویا حبٌّ انسانوں کی خوراک ہوئی اور نبات حیوانوں کی خوراک۔

جَنّٰتٌ جنّاتٌ جَنَّةٌ کی جمع ہے اور اَلْجَنَّةُ کے معنے ہیں كُلُّ بُسْتَانٍ ذِيْ شَجَرٍ يَسْتُرُ بِاَشْجَارِهِ الْاَرْضَ

ہر وہ باغ جس میں درخت ہوں اور وہ درختوں کے ذریعے اپنی زمین کو ڈھانپ لے۔(مفردات)

اَلْفَافًا: اَلْفَافٌ لِفٌّ کی جمع ہے اور اَلِلّفُ کے معنے ہیں اَلصِّنْفُ مِنَ النَّاسِ مختلف طرز کے لوگوں میں سے ایک طرز کے لوگ۔ چنانچہ کہتے ہیں عِنْدَہٗ اَلْفَافٌ مِنَ النَّاسِ کہ اس کے پاس مختلف اصناف کے لوگ بیٹھے ہیں نیز اَللِّفُّ کے معنے ہیں اَلرَّوْضَۃُ الْمُلْتَفَّۃُ النَّبَاتِ وہ باغیچہ جس کی نباتات کثیر ہونے کی وجہ سے آپس میں لپٹی ہوئی ہو وَالبُسْتَانُ الْمُجْتَمِعُ الشَّجَرِ اور ایسے باغ کو بھی لِفّ کہتے ہیں جو گھنے درختوں والا ہو۔(اقرب) پس جَنّٰتٍ اَلْفَافًا کے معنے ہوں گے ایسے گھنے باغات جو کثرت اشجار کی وجہ سے آپس میں لپٹے ہوئے ہوں۔

تفسیر۔ پانی جب آسمان سے اُترتا ہے تو اس کے بعد لِّنُخْرِجَ بِہٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا۔وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا کا وقت آجاتا ہے یعنی اُس بارش کے نتائج پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور زمین سے دانے نکلتے ہیں۔ سبزیاں نکلتی ہیں۔ قسم قسم کی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں اور ایسے باغات نکلتے ہیں جو بڑے گھنے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب سورج نکلتا ہے تو تم جانتے ہو اُس کا ظاہری نتیجہ کیا پیدا ہوتا ہے۔ ظاہری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سورج زمین تیار کرتا ہے اور اپنی روشنی کی شعائیں وہاں تک پہنچاتا ہے اور پھر اپنی گرمی کے ذریعہ زمین کا پانی کھینچ کر اوپر لے جاتا ہے گویا ایک چیز سورج دے جاتا ہے اور ایک چیز سورج لے جاتا ہے پھر جو چیز لے جاتا ہے اُسے بادلوں کی صورت میں پھر زمین کی طرف واپس کر دیتا ہے اور اس طرح سورج لوگوں کے لئے رحمت اور برکت کا سامان پیدا کر دیتا ہے چنانچہ بارش سے بڑے بڑے باغ نکلتے ہیں۔ سبزیاں نکلتی ہیں۔ کھیتی باڑی ہوتی ہے اور انسانی زندگی کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب مہیّا ہو جاتی ہیں۔ اتنا بڑا کارخانہ جو خدا نے بنایا ہے کہ کروڑوں کروڑ میل پر ایک سورج بنایا ہے۔ کروڑوں کروڑ میل پر ایک زمین ہے۔ زمین میں یہ قابلیت رکھی گئی ہے کہ وہ سورج کی شعاؤں کو اپنے اندر جذب کرے اور سورج میں یہ قابلیت رکھی گئی ہے کہ اُس کی گرمی پانی کو اُٹھا کر اوپر لے جائے۔ پھر ہوائیں چلتی ہیں جو بادلوں کو زمین پر برسا دیتی ہیں اور زمین میں سے کھیت اُگتے ہیں غلّہ پیدا ہوتا ہے۔ باغات تیار ہوتے ہیں۔ پھل پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک ایک چیز انسان کے کام آتی ہے۔ ان میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے فوائد دیرپا نہیں ہوتے اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے فوائد دیرپا ہوتے ہیں مثلاً غلّہ ہے اِدھر غلہ پیدا ہوتا ہے اور اُدھر انسان اس کو استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرے سال پھر غلہ بوتا ہے اور پھر استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کو بار بار بونے کی ضرورت نہیں ہوتی جیسے پھلدار بوٹیاں ہیں یعنی جانوروں کے کھانے کی جھاڑیاں ہیں اُن کے پھلوں سے انسان زیادہ دیر تک فائدہ اُٹھاتا ہے اور جانور کئی سال تک اپنی

خوراک حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر کچھ چیزیں ایسی ہیں جو اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کام آتی ہیں مثلاً باغات ہیں کہ وہ بعض دفعہ سوسو دو دوسو تین تین سو سال تک کام دیتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے تم غور کرو اور سوچو کہ کیا یہ سارا سلسلہ لغو اور فضول ہے۔ اگر تم سوچو تو تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ کارخانۂ عالم کی پیدائش لغو اور فضول نہیں ہو سکتی بلکہ کوئی نہ کوئی اہم غرض ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ تمام سلسلہ جاری فرمایا ہے اور کوئی نہ کوئی مقصد ہے جس کو پورا کرنے کے لئے اس قدر وسیع کارخانہ کام کر رہا ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان کی پیدائش بالکل عبث ہے اور وہ کسی خاص مقصد کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ اور اگر ہم ان آیات کو روحانی معنوں میں لیں تو اس کے معنے یہ بن جائیں گے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور قرآن کریم دونوں سِرَاجٌ وَهَّاجٌ ہیں اُن کی گرمی تپش اور تیز روشنی آج تمہیں بُری لگتی ہے مگر ایک دن یہی گرمی اور تپش اور روشنی تمہارے دل کے چھپے ہوئے گند دور کرنے کے لئے بادلوں اور روشنی کا کام دے گی۔ سورج آخر کیا کرتا ہے یہی کہ وہ گندے پانی کو بخارات کی صورت میں اُڑاتا اور پھر ایک مصفّٰی پانی کی صورت میں اُسے زمین کی طرف لوٹا دیتا ہے اور اُس کی روشنی قسم قسم کے زہروں کو مارتی اور نئی طاقتیں بخشتی ہے۔ اسی طرح تمہارے پاس جو کلام الٰہی کا پانی پہلے سے موجود ہے وہ ایسا ہے جو گدلا ہو چکا ہے جس کا استعمال تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ بے شک تمہارے پاس ابراہیمؑ کی تعلیم بھی موجود ہے۔ تمہارے پاس موسیٰؑ کی تعلیم بھی موجود ہے۔ تمہارے پاس عیسیٰؑ کی تعلیم بھی موجود ہے۔ تمہارے پاس اور انبیاء کی تعلیم بھی موجود ہے مگر اُن سب تعلیموں کا پانی گدلا ہو چکا ہے۔ اب یہ سِرَاجٌ وَهَّاجٌ جس کی گرمی اور تپش اور تیز روشنی تمہیں بُری معلوم ہوتی ہے اُن چھپڑوں پر سے بخارات اُٹھائے گا اور پھر اُن بخارات کو بادلوں کی صورت میں تمہارے دلوں پر برسائے گا جس سے تمہارے دلوں کے سوتے پھوٹ نکلیں گے اور وہ ساری دنیا کو سیراب کر دیں گے اسی طرح اُس کی روشنی تمہارے دلوں کی تاریکیوں کو پھاڑ کر نورِ بصیرت تم کو بخشے گی۔ گویا کلام الٰہی کا وہ پانی جس کو آج تم ردّ کر رہے ہو ایک دن تمہارے دلوں سے خود بخود پھوٹنے لگے گا اور مَآءً ثَجَّاجًا بن کر ایک عالم کو سیراب کر دے گا پھر اس کے ذریعہ سے تمہارے دلوں میں سے اناج بھی نکلیں گے بوٹیاں بھی نکلیں گی اور باغات بھی نکلیں گے۔ گویا تمہیں کچھ ایسے فوائد حاصل ہوں گے جو قریب کے ہوں گے اور کچھ ایسے فوائد حاصل ہوں گے جو بعید کے ہوں گے یا کچھ ایسے علوم تم سے ظاہر ہوں گے جو عارف لوگوں کے کام آئیں گے جیسے علمِ تصوّف ہے یا علمِ قرآن ہے اور کچھ ایسے علوم ظاہر ہوں گے جو عوام الناس کے کام آئیں گے جیسے سائنس ہے یا جغرافیہ ہے یا حساب ہے یا ہندسہ ہے۔ وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا اور ایسے باغ بھی نکلیں گے جو مدتوں تک کام دیں گے جیسے علمِ تحریر میں

مسلمانوں نے بڑی ترقی کی اور اسے دنیا میں انہوں نے پھیلا دیا۔

اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ مِیۡقَاتًا ﴿ۙ۱۸﴾ یَّوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ

یقیناً یہ فیصلے کا دن ایک مقرر وقت (پر آنے والا) ہے۔ جس دن کہ صور میں پھونکا جائے گا۔ پھر تم گروہ در گروہ

فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا ﴿ۙ۱۹﴾ وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَکَانَتۡ اَبۡوَابًا ﴿ۙ۲۰﴾

ہو کر (ہمارے حضور میں) آ ؤ گے۔ اور آسمان کھول دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ دروازے (دروازے)

وَّ سُیِّرَتِ الۡجِبَالُ فَکَانَتۡ سَرَابًا ﴿ؕ۲۱﴾

ہو جائے گا۔ اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) چلائے جائیں گے یہاں تک کہ وہ سراب (کی مانند) ہو جائیں گے۔

حل لغات۔ یَوۡمٌ اس کے معنے مطلق وقت کے ہوتے ہیں چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ع یَوۡمَاہُ یَوۡمُ نَدًی وَیَوۡمُ طِعَانٍ یعنی میرے ممدوح پر دو ہی قسم کے وقت آتے ہیں۔ یا تو وہ سخاوت میں مشغول ہوتا ہے یا دشمنوں کے قتل کرنے میں۔ اسی طرح عرب کہتے ہیں یَوۡمَاہُ یَوۡمُ نُعۡمٍ وَیَوۡمُ بُؤۡسٍ اَیِ الدَّھۡرُ یعنی زمانہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو انسان کے لئے نعتیں لاتا ہے یا تکالیف لاتا ہے (لسان العرب) اسی طرح سیبویہ کا قول ہے کہ عرب کہتے ہیں اَنَا الۡیَوۡمَ اَفۡعَلُ کَذَا لَا یُرِیۡدُوۡنَ یَوۡمًا بِعَیۡنِہٖ وَلٰکِنَّھُمۡ یُرِیۡدُوۡنَ الۡوَقۡتَ الۡحَاضِرَ (لسان العرب) یعنی جب کہتے ہیں کہ میں آج کے دن اس اس طرح کروں گا تو اس سے مراد چوبیس گھنٹے کا دن نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے مراد صرف موجودہ وقت ہوتا ہے۔ اسی طرح اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ جو قرآن کریم میں آتا ہے اس سے بھی مراد معروف دن نہیں بلکہ زمانہ اور وقت مراد ہے (لسان) پھر لکھا ہے وَقَدۡ یُرَادُ بِالۡیَوۡمِ الۡوَقۡتُ مُطۡلَقًا وَمِنۡہُ الۡحَدِیۡثُ تِلۡکَ اَیَّامُ الۡھَرَجِ اَیۡ وَقۡتُہٗ (لسان) یعنی کبھی یوم سے مطلق وقت مراد ہوتا ہے۔ جیسے حدیث میں ہے کہ یہ فتنہ اور لڑائی کے دن ہیں۔ مراد یہ ہے کہ فتنہ اور لڑائی کا زمانہ ہے۔

اَلۡفَصۡلُ اَلۡفَصۡلُ فَصَلَ کا مصدر ہے۔ اور فَصَلَ الشَّیۡءَ فَصۡلًا کے معنے ہیں قَطَعَہٗ وَاَبَانَہٗ کسی چیز کے حصے کو کاٹ کر اس سے علیحدہ کر دیا اور اَلۡفَصۡلُ کے معنے ہیں اَلۡحَاجِزُ بَیۡنَ الشَّیۡئَیۡنِ دو چیزیں کے درمیان روک اور پردہ اَلۡحَدُّ بَیۡنَ الۡاَرۡضَیۡنِ دو زمینوں کے درمیان حد اَلۡحَقُّ مِنَ الۡقَوۡلِ پکی اور مضبوط بات۔ اَلۡفَصۡلُ

اَیْضًا اَلْقَضَاءُ بَیْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ۔ نیز فصل کے معنے حق اور باطل کے درمیان فیصلہ ہوجانے کے بھی ہیں (اقرب) پس یَوْمُ الْفَصْلِ کے معنے ہوں گے۔ ایسا وقت جبکہ حق اور باطل کے درمیان فیصلہ ہوجائے گا۔

مِیْقَاتًا مِیْقَات کے معنے ہیں اَلْوَقْتُ۔ مطلقاً وقت وَقِیْلَ الْوَقْتُ الْمَضْرُوْبُ لِلشَّیْءِ کسی چیز کے لئے مقرر شدہ ہی وقت اَلْوَعْدُ الَّذِیْ جُعِلَ لَہٗ وَقْتٌ نیز اس وعدہ کو بھی مِیْقَات کہہ دیتے ہیں جس کے لئے وقت مقرر کیا جائے۔ اس کی جمع مَوَاقِیْت آتی ہے (اقرب)

یُنْفَخُ یُنْفَخُ نَفَخَ سے مضارع مجہول واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَلنَّفْخُ کے معنے ہیں نَفْخُ الرِّیْحِ فِی الشَّیْءِ کسی چیز میں ہوا پھونکنا (مفردات) پس یُنْفَخُ کے معنے ہوں گے کہ پھونکا جائے گا۔

اَلصُّوْرُ صَارَ الرَّجُلُ یَصُوْرُ صَوْرًا کے معنے ہیں صَوَّتَ یعنی آواز دی۔ اور صُوْر اس سینگ کو کہتے ہیں جس میں پھونک مار کر اس کو بجایا جاتا ہے (اقرب) بعض نے اس کو اَلصُّوْرَۃُ کی جمع بھی قرار دیا ہے اور اَلصُّوْرَۃُ کے معنے ہیں۔ اَلشَّکْلُ۔ شکل۔ کُلُّ مَا یُصَوَّرُ مُشَبَّهًا بِخَلْقِ اللّٰهِ مِنْ ذَوَاتِ الْاَرْوَاحِ وَغَیْرِھَا۔ کسی جاندار یا غیر جاندار کی تصویر اَلنَّوْعُ۔ قسم۔ الصِّفَۃُ۔ صفت (اقرب) پس یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ کے معنے ہوں گے جبکہ صُوْر میں پھونکا جائے گا۔

اَفْوَاجًا اَفْوَاجًا فَوْجٌ کی جمع ہے اور فَوْج کے معنے انسانوں کی جماعت کے ہیں یا انسانوں کی وہ جماعت جو تیزی سے گزر رہی ہو (اقرب)

سُیِّرَتْ سُیِّرَتْ سَیَّرَ سے مونث مجہول کا صیغہ ہے اور سَیَّرَہٗ کے معنے ہیں جَعَلَهٗ سَائِرًا اس کو چلایا۔ اور جب سَیَّرَہٗ مِنْ بَلَدِہٖ کہیں تو معنے ہوں گے اَخْرَجَہٗ وَاَجْلَاہُ اس کو وطن سے جلاوطن کردیا (اقرب)

اَلْجِبَالُ اَلْجِبَالُ اَلْجَبَلُ کی جمع ہے اور اَلْجَبَلُ کے معنے ہیں کُلُّ وَتَدٍ لِلْاَرْضِ عَظُمَ وَطَالَ زمین پر اُونچے ٹیلے کو جَبَل کہتے ہیں۔ خِلَافُ السَّاحِلِ ساحل کے مخالف مفہوم ادا کرنے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے یعنی خشکی کا علاقہ۔ سَیِّدُ الْقَوْمِ وَعَالِمُھُمْ نیز قوم کے سردار اور عالم کو بھی جَبَل کہتے ہیں (اقرب) پس سُیِّرَتِ الْجِبَالُ کے معنے ہوں گے (۱) جب پہاڑ چلائے جائیں گے (۲) جب قوموں کے سردار اور عالموں کو گھروں سے نکالا جائے گا۔

سَرَابًا مَا تَرَاہُ نِصْفَ النَّھَارِ مِنِ اشْتِدَادِ الْحَرِّ کَالْمَاءِ یَلْصِقُ بِالْاَرْضِ (اقرب) یعنی سَرَاب اس ریتلے میدان کو کہتے ہیں جو دوپہر کے وقت سورج کی شعاؤں میں پانی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ کلیات میں لکھا

ہے وَالسَّرَابُ فِيْ مَا لَا حَقِيْقَةَ لَهٗ کہ سراب اُس کو بھی کہتے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

تفسیر۔ **آسمان کے دروازے دروازے ہو جانے کے معنے** یَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ۔ يَوْمُ الْفَصْلِ کا بدل ہے یعنی يَوْمُ الْفَصْلِ سے کون سا یوم مراد ہے؟ يَوْمُ الْفَصْلِ سے مراد وہ دن ہے کہ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ جس دن صور میں پھونکا جائے گا فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا اور تم فوج درفوج آؤ گے وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ اور آسمان کھولا جائے گا فَكَانَتْ اَبْوَابًا پس وہ دروازے ہی دروازے ہو جائے گا۔

آسمان کے دروازے ہو جانے کے معنے عام طور پر عذاب نازل ہونے کے ہوتے ہیں سوائے اس کے کہ کوئی قرینہ ایسا ہو جو ظاہر کر رہا ہو کہ وہاں عذاب مراد نہیں بلکہ کچھ اور مراد ہے۔ ورنہ اگر کوئی رویا میں دیکھے کہ آسمان پھٹ گیا ہے یا وہ چھید چھید ہو گیا ہے اور ساتھ کوئی قرینہ ایسا نہ ہو جو بتا رہا ہو کہ یہاں عذاب مراد نہیں بلکہ کچھ اور ہے تو اس سے مراد عذاب ہی ہو گا۔ لیکن اگر کوئی شخص دیکھے کہ آسمان مثلاً پھٹ گیا ہے اور ملائکہ خدا تعالیٰ کی تسبیحیں کر رہے اور خوشیاں منا رہے ہیں تو اس سے مراد یہ ہو گا کہ اب کسی نبی کی بعثت کا وقت ہے۔ بہرحال عام طور پر فتح سماء کے معنے عذاب کے ہی ہوتے ہیں اور جب سماء سے مراد ظاہری سماء ہو تو اُس وقت فُتِحَتِ السَّمَآءُ کا یہی مفہوم ہوتا ہے کہ عذاب کا وقت آ گیا ہے۔

قیامت کے دن پہاڑوں کی تباہی وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ۔ اور پہاڑ اپنی جگہ سے چلائے جائیں گے فَكَانَتْ سَرَابًا پس وہ سراب کی طرح ہو جائیں گے۔ سراب وہ ریتلا میدان ہوتا ہے جو دوپہر کے وقت سورج کی شعاؤں کے نیچے پانی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ پہاڑ چونکہ زمین میں سے نکلتے ہیں اور ریت بھی زمین سے ہی پیدا ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک وقت زمین پر ایسی تباہی آئے گی کہ پہاڑ گر جائیں گے اور چونکہ پہاڑ اَوْتَادُ الْاَرْضِ ہوتے ہیں اس لئے جب اَوْتَاد گر جائیں گے تو ساری زمین تباہ ہو جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن پھر زمین میں ایسی گرمی پیدا ہو گی جو نہایت ہی شدید ہو گی اور وہ ایسی تیز ہو گی کہ بجائے اس کے کہ اُس گرمی سے پہاڑ بنیں موجودہ پہاڑ بھی اس کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور باقی زمین بھی تباہ ہو جائے گی۔

یوم الفصل سے مراد قیامت یا غلبہ اسلام یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا اور میں نے بتایا ہے کہ يَوْمُ الْفَصْلِ سے مراد قیامت بھی ہے اور يَوْمُ الْفَصْلِ سے قرآن کریم یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے غلبہ کا ظہور بھی مراد ہے اور درحقیقت یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں گو نام مختلف رکھ دیا گیا ہے۔ چاہے نبوت کے کمالات کا ظہور ہو یا کلام الٰہی کا ظہور ہو بات ایک ہی ہے۔ بہرحال اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ کے معنے ہوئے

جدائی کا دن اور اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا کے معنے ہوئے يَوْمُ الْفَصل کا ایک وقت مقرر ہے اس يَوْمُ الْفَصْل سے جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں غلبۂ اسلام بھی مراد ہے مگر اس میں ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کفّار مکّہ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے جس طرح محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تمہارے ظلموں کی وجہ سے تم سے جدا ہونا پڑا ہے اسی طرح خدا ایک دن محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو غلبہ دے کر تم کو بھی جُدا کر دے گا اور وہ دن تمہارے لئے يَوْمُ الْفَصْل ہوگا۔ چنانچہ اسی کی طرف سورۂ توبہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جو درحقیقت سورۂ انفال کا دوسرا باب ہے۔ یہ سورۃ شروع ہی اس طرح ہوتی ہے کہ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ۔ وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (آیات: ۱ تا ۵)

سورۃ نبأ کے موعود یوم الفصل کا ذکر سورۃ توبہ میں اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ چار مہینے کفّار کو یہاں رہنے کی اجازت ہے۔ جب چار مہینے گذر جائیں تو پھر کفّار یہاں سے چلے جائیں۔ یہ وہ يَوْمُ الْفَصْل ہے جو کفّار پر آیا اور جس کا فتح مکّہ کے بعد اعلان کیا گیا گویا فتح مکّہ کا نتیجہ ہی يَوْمُ الْفَصْل تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا وہ موعود دن تم پر آنے والا ہے جب تم کو اپنے گھروں اور وطن سے جُدا ہونا پڑے گا۔ یعنی ایک دن ایسا آنیوالا ہے جب مسلمان نہ صرف غالب آجائیں گے بلکہ وہ اتنے غالب ہوں گے کہ مشرکوں کو وہ کھلے بندوں یہ سُنا دیں گے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ ہمارا تمہارا کوئی جوڑ نہیں۔ ایسا غلبہ عام حالات میں نہیں ہوتا بلکہ غیر معمولی حالات میں ہی ہوسکتا ہے۔ سپینؔ پر مسلمانوں کو ایک لمبے عرصہ تک غلبہ حاصل رہا مگر باوجود غلبہ کے وہ عیسائیوں کو سپین میں سے نکال نہ سکے۔ اسی طرح اور کئی ممالک ایسے ہیں جہاں مسلمان حکمران ہوئے مگر وہ غیر مذاہب والوں کے اپنے ملکوں سے نکال نہیں سکے۔ ہندوستان میں ہی مسلمانوں کی ایک لمبے عرصہ تک حکومت رہی مگر وہ ہندوؤں کو نہ نکال سکے۔ آجکل ہندوستان میں ہندو بہت طاقتور ہیں مگر وہ مسلمانوں کو نہیں نکال سکتے بلکہ انگریز جن کے ماتحت ہندوستانی ہیں وہ بھی ہندستانیوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم ہندوستان سے

چلے جاؤ۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کَانَ مِیْقَاتًا۔ ایک ایسے عظیم الشان غلبے کا دن آنے والا ہے جو یَوْمُ الْفَصْل ہوگا۔ وہ نہ صرف عام فیصلے کا دن ہوگا بلکہ یَوْمُ الْفَصْل ہوگا یعنی وہ فَصْلٌ بَیْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ ہی نہ ہوگا بلکہ فَصْلٌ بَیْنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَ الْمُؤْمِنِیْنَ بھی ہوگا۔ چنانچہ سورۂ بَرَآءَۃٌ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖٓ اِلَی الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ مشرکوں میں سے جن سے عہد کیا گیا تھا کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب مسلمانوں کو تم پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تُم اُن کے مقابلہ میں بالکل ذلیل اور حقیر ہو جاؤ گے تمہیں وہ مکّہ میں بھی نہیں رہنے دیں گے بلکہ کہیں گے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور اُس وقت تم ذلّت اور رسوائی کی حالت میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہو گے۔ اُن مشرکوں کو کہو کہ اب اُس پیشگوئی کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے گویا اس صورت میں بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖٓ اِلَی الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ کی طرف سے برأت ہے اور اس کے رسول کی طرف سے بھی برأت ہے اُن مشرکین کے مقابلہ میں جن سے تم نے عہد کیا تھا۔ اِن معنوں کے رُو سے میں یہ نہیں کہوں گا کہ یہاں صلح حدیبیہ والے معاہدے کا ذکر آتا ہے بلکہ ان معنوں کے رُو سے عَاھَدْتُّمْ سے مراد وہ معاہدہ ہوگا جس کا سورۂ نبا میں ذکر آتا ہے یعنی سورۂ نبا میں تم سے کہا گیا تھا کہ اے کافرو! ایک دن ایسا آنیوالا ہے جب تم مکّہ میں سے نکال دیئے جاؤ گے۔ یہی وہ عہد جس کا سورۂ توبہ میں عَاھَدْتُّمْ کے الفاظ میں ذکر آتا ہے۔ اس پیشگوئی کو عہد کے نام سے اس لئے پکارا گیا ہے کہ نبی جب کوئی ایسی پیشگوئی کرتا ہے جس کا کفّار پر بھی اثر پڑتا ہو تو مومنوں کو ہی یہ شوق نہیں ہوتا کہ وہ اُس پیشگوئی کو پورا ہوتا دیکھیں بلکہ اگر وہ پیشگوئی کسی وجہ سے پوری نہ ہو تو دشمن بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ پیشگوئی کیوں پوری نہیں ہوئی اس لئے وہ عہد کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ پس عَاھَدْتُّمْ میں سورۂ نبا والی پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ اب خدا اور اس کے رسول کی برأت ہو گئی یعنی اب تم یہ الزام نہیں دے سکتے کہ وہ پیشگوئی پوری نہیں ہوئی بلکہ ہم نے جو تم سے کہا تھا کہ ایک دن ایسا آنیوالا ہے جب مسلمانوں کو تم پر غلبہ حاصل ہو جائے گا اور تم مکّہ میں نہیں ٹھہر سکو گے ہماری وہ بات پوری ہو گئی ہے۔

فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَۃَ اَشْھُرٍ ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے گا اور ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن تمہیں اپنے ملک سے نکال دیا جائے گا اب ہم نے اپنے اس عہد کو پورا کر دیا ہے مگر چونکہ غلبۂ اسلام دیکھنے کے لئے تمہارا ٹھہرنا ضروری ہے اور پیشگوئی کے پورا ہونے کے لئے تمہاری وطن سے جدائی ضروری ہے اس لئے ہم نے تمہارے رہنے کے لئے چار مہینے مقرر کر دیئے ہیں تا کہ تم اس عرصہ میں سارے عرب

میں پھرو اور دیکھو کہ خدا کی باتیں کس طرح پوری ہوئیں وَّ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ اور تم دیکھ لو کہ خدا کا حکم جو اسلام کے غلبہ کے متعلق تھا وہ پورا ہو گیا ہے یا نہیں وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ اور اللہ کافروں کو ذلیل کرنے والا ہے وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ اور اعلان ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ حج اکبر کے دن۔ یعنی خدا نے اس اعلان کے لئے حجِ اکبر کے دن کو مخصوص کیا ہے تا کہ سارے عرب کو یہ اعلان سنایا جا سکے۔ یُوں اگر اعلان کر دیا جاتا تو چار ماہ میں بھی سارے عرب میں نہ پہنچ سکتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس اعلان کے لئے حجِ اکبر کا دن تجویز فرما دیا۔ اس فیصلہ سے فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ کا حکم بھی پورا ہو گیا۔ کیونکہ حج کے موقع پر عرب کے ہر علاقہ سے لوگ آتے ہیں پس اللہ تعالیٰ نے حج کے دن کا انتخاب اسی حکمت کے ماتحت فرمایا کہ جب لوگ حج سے واپس جائیں گے تو اس اعلان کے ساتھ ہی وہ اپنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھتے چلے جائیں گے کہ اسلام کا ہر علاقہ میں غلبہ ہو گیا ہے۔ درحقیقت یہ بھی اسلامی تعلیم میں رحم کے غلبے کا ثبوت ہے کہ اعلان اُس وقت کیا گیا جب سارے لوگ موجود تھے اور اعلان یہ کیا گیا کہ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اللہ مشرکوں کے الزام سے پاک ہے۔ وہ اس عظیم الشان غلبہ کے بعد جس کا ظہور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اللہ تعالیٰ پر یہ الزام نہیں لگا سکتے کہ سورۃ نباء میں جو پیشگوئی کی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوئی وَ رَسُوْلُهٗ اور رسول بھی اِس الزام سے بری ہے فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ اور اگر تم پھر جاؤ تو یاد رکھو جب تم پہلے ہمیں عاجز نہیں کر سکے تو آئندہ کس طرح کر سکو گے۔ اس کے بعد فرماتا ہے اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ سوائے ان لوگوں کے جن سے مشرکوں میں سے تم نے عہد کیا ہے پھر انہوں نے تم سے معاہدہ میں خلاف ورزی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی دشمن کی مدد نہیں کی پس اُن سے جو عہد کیا ہے اُسے مقررہ معیاد تک نباہو اللہ تعالیٰ متقیوں کو پسند فرماتا ہے۔ یہ دلیل ہے میرے اُن معنوں کے درست ہونے کی جو ابھی میں نے بیان کئے ہیں۔ وہاں خدا تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ گویا عہد کے باجود اللہ تعالیٰ نے مشرکوں سے کہا تھا کہ مکّہ میں سے نکل جاؤ مگر یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا ہوا ہے اور انہوں نے اِس معاہدہ کو توڑا نہیں اُن کے معاہدہ کو دیانتداری کے ساتھ پورا کرو اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ وہ معاہدہ اَور ہے اور یہ معاہدہ اَور ہے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ

عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ میں جس معاہدے کا ذکر ہے وہ دُنیوی معاہدہ ہے اور پہلی آیت میں جس معاہدے کا ذکر آتا ہے اس سے الہامی معاہدہ مراد ہے یعنی وہ معاہدہ جس کا الہامی طور پر ذکر کیا گیا تھا اور جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ اگر وہ جھوٹا نکلے تو تمہارا حق ہے کہ گرفت کرو اور کہو کہ تمہاری یہ بات کیوں پوری نہیں ہوئی۔ ایک عہد یکطرفہ ہوتا ہے جس میں انسان خود اپنے نفس سے کوئی عہد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مَیں ایسا کروں گا۔ اُس کے متعلق کوئی دوسرا شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ لیکن وہ معاہدہ جو فریقین میں ہو یا وہ وعدہ جو دو جماعتوں سے تعلّق رکھتا ہو اُس میں دوسرے کو پکڑنے اور گرفت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور اگر وہ بات پوری نہ ہو تو دوسرا کہہ سکتا ہے کہ تم تو کہتے تھے فلاں بات اس طرح ہوگی مگر پھر وہ اُس طرح ہوئی نہیں۔ اس قسم کے معاہدات میں پیشگوئیاں بھی شامل ہیں کیونکہ اُن کے متعلق بھی کفّار یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھیں تو پھر وہ پوری کیوں نہ ہوئیں۔ پس ایک ہی رکوع میں دو جگہ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ کے الفاظ استعمال کرنا اور ایک جگہ تو یہ کہنا کہ جن مشرکوں سے یہ عہد تھا اُن کو چار ماہ کا نوٹس دے کر مکّہ سے نکال دو اور دوسروں کے متعلق یہ کہنا کہ اُن سے جو معاہدہ ہو چکا ہے اُس کو پورا کرو بتا رہا ہے کہ پہلے روحانی معاہدے کا ذکر تھا اور اب جسمانی معاہدے کا ذکر ہے۔ اس جسمانی معاہدہ کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ ہدایت دیتا ہے کہ تم نے اِسے نہیں توڑنا ہاں اگر کفّار توڑ دیں تو اَور بات ہے۔ لیکن اگر اُن کی طرف سے نقضِ عہد نہ ہو تو پھر معاہدہ کی جو بھی معیاد ہے اُس معیاد تک تمہاری طرف سے یہ پوری کوشش ہونی چاہیے کہ اُس کا احترام کرو۔ چنانچہ فرماتا ہے فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اس میں چار ماہ کی کوئی شرط نہیں اگر دو سال کا معاہدہ ہے تو دو سال پورے کرو اور اگر چار سال کا معاہدہ ہے تو چار سال پورے کرو اور اگر چھ سال کا معاہدہ ہے تو چھ سال پورے کرو۔ غرض جتنی مدّت مقرر ہے اُس مدّت تک معاہدے کو پورا کرو۔ غرض اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا میں قرآن اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے غلبہ کی پیشگوئی کی گئی ہے اور کفّار کو بتایا گیا ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب نہ صرف مسلمانوں کو تم پر غلبہ حاصل ہو جائے گا بلکہ اس غلبہ کے ساتھ ہی تم کو مکّہ سے نکال دیا جائے گا۔ اب اگلی آیات میں اس غلبہ کا وقت بتایا گیا ہے فرماتا ہے يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا جس دن صور پھونکا جائے گا اور تم فوج در فوج کی صورت میں آؤ گے وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ اور آسمان کھول دیا جائے گا۔ فوج در فوج اور گروہ در گروہ لوگوں کے آنے کی خبر اُس وقت پوری ہوئی جب مکّہ فتح ہوا بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی سارے عرب میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی اور فتح مکّہ کی جنگ درحقیقت اسی ہلچل کا نتیجہ تھی کیونکہ عربوں میں یہ احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا کہ اب اُن کے لئے دو ہی صورتیں ہیں یا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ مل جائیں

اَور یا مکّہ والوں کے ساتھ مل جائیں چنانچہ کچھ لوگ ادھر آ گئے اور کچھ لوگ اُدھر چلے گئے وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ اور آسمان پر سے عذاب نازل ہونا شروع ہوجائے گا۔

نفخ صور سے مراد نَفخِ صور سے اگر صلح حدیبیہ مراد لے لو تو اِن آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک ایسا واقعہ رونما ہوگا جس سے عرب قبائل میں بے چینی پیدا ہوجائے گی اور اُن کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہونا شروع ہو جائے گا کہ اب اُنہیں کُھلے طور پر یا اسلام میں شامل ہونا چاہیے۔ یا مکہ والوں کے ساتھ مل جانا چاہیے چنانچہ صلح حدیبیہ کے وقت سے لوگوں میں یہ احسان پیدا ہونا شروع ہو گیا کہ اب معاملہ اس قدر بڑھ چکا ہے کہ ہم یا محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھ رہ کر بچ سکتے ہیں یا مکّہ والوں کے ساتھ رہ کر بچ سکتے ہیں چنانچہ اسی خیال کے زیرِ اثر کچھ قبائل رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھ مل گئے اور کچھ قبائل کفّار کے ساتھ مل گئے گویا یَوْمُ الْفَصْلِ کی بنیاد صلح حدیبیہ نے رکھ دی۔

وَ فُتِحَتِ السَّمَآءُ اور آسمان کھولا جائے گا فَكَانَتْ اَبْوَابًا اور وہ دروازے دروازے بن جائے گا۔ اِن معنوں کے لحاظ سے فَكَانَتْ اَبْوَابًا کا یہ مفہوم ہوگا کہ آسمان سے کفّار پر عذاب نازل ہوں گے اور مومنوں پر اُس کی رحمت کی بارش برسے گی گویا آسمان ابواب ابواب ہوجائے گا۔ کچھ دروازے ایسے ہوں گے جن سے خیر نازل ہوگی اور کچھ دروازے ایسے ہوں گے جن سے عذاب نازل ہوگا ہی پہلے بھی مسلمانوں پر آسمان سے خیر نازل ہوئی تھی مگر وہ ایسی ہی تھی جیسے چھیدوں میں سے کوئی چیز گرائی جاتی ہے لیکن صلح حدیبیہ کے بعد یہ خبر اس طرح مسلمانوں پر گرنے لگی جیسے بڑے بڑے دروازوں میں سے کوئی چیز گرتی ہے۔ اسی طرح کفّار پر کثرت سے عذاب آنے شروع ہو گئے۔ گویا آسمان سے رحمت کے سامان بھی نازل ہونے لگ گئے اور عذاب کے سامان بھی نازل ہونے شروع ہو گئے۔

سُيِّرَتِ الْجِبَالُ سے مراد صنادید عرب کی تباہی وَ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ۔ جِبَال کے معنے سردارانِ قوم کے بھی ہوتے ہیں۔ پس سُيِّرَتِ الْجِبَالُ کے یہ معنے ہوئے کہ بڑے بڑے صنادید عرب اور وہ بڑے بڑے سردار جن پر اہلِ عرب کو ناز ہے اپنے گھروں سے نکالے جائیں گے۔ فَكَانَتْ سَرَابًا اور وہ سراب کی طرح ہو جائیں گے یعنی ثابت ہوجائے گا کہ اُن میں کوئی ایسا لیڈر نہیں جو قوم کی صحیح راہنمائی کرنے والا ہو۔ بلکہ سب کے سب لیڈر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مقابلہ میں ناکام رہیں گے۔ سَرَابًا کا لفظ جو اس جگہ رکھا گیا ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ سَرَاب نصف النہار میں نظر آیا کرتا ہے۔ اس لفظ میں اس امر کی طرف بھی اشارہ تھا کہ جب محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا سورج نصف النہار پر پہنچے گا اور اُس کی چمک لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دے گی اُس وقت اُنہیں معلوم ہوجائے گا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلّم کے مقابلہ میں اُن کے لیڈر کیسے ناکام اور کس قدر عقل و خرد سے عاری ہیں۔ چنانچہ

صلح حدیبیہ کے بعد ہی اسلام کی اس فتح کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے اور فتح مکّہ نے اس کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ پس فرماتا ہے اُس وقت لوگوں پر یہ ثابت ہو جائے گا کہ ان کے سارے لیڈر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مقابلہ میں ایک سراب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ قوم کو تباہ کرنے والے اور اُسے ذلّت کے گڑھوں میں گرانے والے ہیں۔ اُس کو ترقی تک پہنچانے کی اُن میں کوئی قابلیت نہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۲﴾ لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۳﴾

یقیناً جہنم ایک راستہ ہے (مگر مذکورہ بالا) سرکشوں کے لئے وہ ٹھہرنے کی جگہ (بھی) ہے۔

حل لغات۔ جَهَنَّم کہتے ہیں بِئْرٌ جَهَنَّمٌ اور مراد ہوتی ہے بَعِيْدَةُ الْقَعْرِ گہری تہ والا کنواں (لسان) لسانؔ کے مصنف کہتے ہیں وَبِهٖ سُمِّيَ جَهَنَّمُ لِبُعْدِ قَعْرِهَا کہ جہنم کو اس لئے جہنم کہا جاتا ہے کہ اس کی تہہ گہری ہوگی۔

مِرْصَادًا کے معنے ہیں اَلْمَكَانُ يُرْصَدُ فِيْهِ الْعَدُوُّ وہ جگہ جہاں دشمن کی انتظار کی جاتی ہے جس کو اُردو میں گھات کہتے ہیں۔ نیز مِرْصَادًا کے معنے اَلطَّرِيْقُ کے بھی ہیں یعنی راستہ (اقرب)

مَاٰبٌ مَاٰب اٰبَ کا مصدر بھی ہے اور اسم زمان اور مکان بھی۔ اٰبَ مَاٰبًا کے معنے ہیں رَجَعَ لوٹا (اقرب) اور المآب کے معنے ہیں اَلْمَرْجِعُ وَالْمُنْقَلَبُ لوٹنے کی جگہ۔ (اقرب)

صاحب مفردات کہتے اَلْاَوْبُ ضَرْبٌ مِنَ الرُّجُوْعِ وَذَالِكَ اَنَّ الْاَوْبَ لَا يُقَالُ اِلَّا فِي الْحَيَوانِ الَّذِيْ لَهٗ اِرَادَةٌ وَالرُّجُوْعُ يُقَالُ فِيْهِ وَفِيْ غَيْرِهٖ (مفردات) یعنی عربی زبان میں اردو زبان کے لفظ ''لوٹنے'' کا مفہوم ادا کرنے کے لئے دو لفظ آتے ہیں (۱) رُجُوْعٌ (۲) لیکن اَوْبٌ رُجُوْعٌ سے خاص ہے اس لئے کہ اَوْبٌ اس کے لوٹنے کو کہیں گے جو ذی ارادہ ہو اور رجوع ذوارادہ اور غیر ذی ارادہ ہر دو کے لوٹنے کو کہتے ہیں۔

تفسیر۔ **جہنم کے گھات میں ہونے سے مراد** قتادہ کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ جہنم گھات میں رہتی ہے جو اُس پر سے گزرتا ہے اگر اُس کے پاس جواز کا پروانہ ہو تو اُسے گزرنے دیتی ہے ورنہ اُسے وہیں گرا لیتی ہے (ابن کثیر زیر آیت ھذا) گویا انہوں نے اس کے معنوں میں جسرِ صراط کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن اگر اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا سے وہی جہنم مراد لیا جائے جو اگلے جہان میں ہوگا تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ اس کا سلسلہ اسی دنیا سے

شروع ہوجاتا ہے اِسی کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ (صحیح بخاری کتاب الصوم باب زیارۃ المرأۃ زوجھا فی اعتکافہ) کہ شیطان انسان کے مجری الدم میں چلتا ہے۔ گویا شیطانی تحریکیں دنیا میں اس قدر ہوتی ہیں کہ انسان اگر ذرا بھی غافل ہوتو وہ نفس پر غالب آجاتی ہیں۔مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا کہ لِلطّٰغِیْنَ مَاٰبًا یعنی یہ سرکشوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ فرمایا ہے اِنَّہٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ۔ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَهٗ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ (النحل:۱۰۰،۱۰۱) کہ شیطان کو مومنوں پر اور خدا تعالیٰ پر توکل رکھنے والوں پر غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔اُس کا غلبہ اُنہی لوگوں پر ہوتا ہے جو خود شیطان سے دوستی رکھتے ہیں اور اسکی محبت کا دم بھرتے اور شرک کرتے ہیں۔لِلطّٰغِیْنَ مَاٰبًا میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے گویا اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا کے مضمون میں وہ حدیث آگئی جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے یہ فرمایا ہے کہ شیطان انسان کے مَجْرَی الدَّم میں چلتا ہے اور لِلطّٰغِیْنَ مَاٰبًا نے بتادیا ہے کہ گو جہنّم کا حملہ مومن و کافر سب پر ہوتا ہے کسی پر کسی رنگ میں اور کسی پر کسی رنگ میں۔لیکن جہنّم ٹھکانہ کے طور پر صرف طاغین کے لئے ہے۔

خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے جہنم پر سے گزرنا ضروری ہے دوسری آیات سے بھی اس مضمون کی تصدیق ہوتی ہے کہ شیطان کو کفّار پر ہی غلبہ ملتا ہے مومنوں پر اُسے غلبہ حاصل نہی ہوتا۔غرض جہنّم کو راستہ قرار دیا جائے یا گھات دونوں صورتوں میں اس کے یہ معنے ہیں کہ انسان کو خدا تعالیٰ تک پہنچانے کے لئے جہنّم بھی ایک ضروری شے ہے۔جب تک انسان اپنے لئے جہنم یعنی تکلیف کا راستہ قبول نہ کرے خدا تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتا۔اور اگر گنہ کر چکا ہوتو پھر بطور سزا کے اس تکلیف کے راستہ پر ایک عرصہ تک چلنا پڑتا ہے خواہ اسی دنیا میں یا اگلے جہان میں۔اس کے بعد لقاء الٰہی نصیب ہوتا ہے۔واللہ اعلم بالصواب۔

لِلطّٰغِیْنَ مَاٰبًا کا حال ہے یعنی اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا وَمَاٰبًا حَالَ كَوْنِهَا لِلطّٰغِیْنَ یا یہ جملہ مِرْصَاد کی صفت بھی ہوسکتا ہے۔

لّٰبِثِیْنَ فِیْهَاۤ اَحْقَابًا ﴿۲۴﴾

درآنحالیکہ وہ برسوں اس میں رہتے چلے جائیں گے۔

حل لغات۔اَحْقَابًا اَحقاب حُقُبٌ کی جمع ہے اور حُقُبٌ کے معنے ہیں ثَمَانُوْنَ سَنَةً اسّی سال کا

عرصہ۔ وَيُقَالُ اَكْثَرَ مِنْ ذَالِكَ اور بعض نے کہا ہے کہ اسّی سال سے زیادہ عرصہ پر بھی حُقُبٌ کا لفظ بولیں گے۔ اَلدَّهْرُ۔ زمانہ۔ اَلسَّنَةُ وَقِيْلَ السِّنُوْنَ مطلق ایک سال کے عرصہ کے لئے بھی عربی میں لفظ حُقُب استعمال ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ کئی سال کا عرصہ حُقُب کہلاتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر ۔ لَابِثِيْنَ طَاغِيْنَ کی ضمیر کا حال ہے یعنی طاغیوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ جہنم میں سالوں یا زمانوں یا صدیوں رہیں گے۔ اُخروی لحاظ سے تو بعد میں بحث کی جائے گی دنیوی لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں جب اسلام کو غلبہ حاصل ہوا تو وہ صدیوں تک ہی رہا۔ بعض قومیں دنیا میں فوراً پھیل جاتی ہیں لیکن اس کے بعد جلدی ہی مٹ جاتی ہیں۔ مگر مسلمانوں کا صدیوں تک غلبہ رہا۔ چنانچہ مسلمان قریباً سات سو سال تک غالب رہے اُن میں کمزوری بے شک چوتھی صدی میں ہی پیدا ہونی شروع ہوگئی تھی مگر مختلف صورتوں میں اُن کا غلبہ سات سو سال تک رہا ہے بلکہ وہ زمانہ جس میں مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی شخص اُٹھ نہیں سکتا تھا اور کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے سامنے کھڑا ہو سکے اُس کو بھی شامل کر کے یہ ایک ہزار سال کا عرصہ بن جاتا ہے۔ اب قریباً ساڑھے تین سو سال سے مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر اقوام کھڑا ہونے کی جرأت ہوئی ہے اور انہوں نے سمجھا ہے کہ ہم بھی مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ یعنی سترھویں صدی کے شروع سے مسلمان ایسے گرنے شروع ہوئے کہ دشمن اُن کے مقابلہ میں کھڑا ہو گیا لیکن اس سے پہلے ایک ہزار سال کے لمبے عرصہ میں کسی کو یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کھڑا ہو سکے اور یہ زمانہ دنیوی لحاظ سے گویا دشمنانِ اسلام کے لئے دوزخِ حسد میں جلنے کا زمانہ تھا۔

احقاب کے معنے مفسرین کے نزدیک اَحْقَاب حُقُبٌ کی جمع ہے اس کے لغوی معنے حل لغات میں لکھے جا چکے ہیں اب اس کے تفسیری معنے لکھے جاتے ہیں۔

ابن جریر حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں (**عن سالم بن ابی الجعد**) کہ حضرت علیؓ نے ہلال الہجری سے کہا کہ حُقُب کے معنے تم کیا کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ حُقُب کے معنے ہیں اسّی سال۔ ہر سال بارہ مہینے کا۔ ہر مہینہ تیس دن کا اور ہر دن ایک ہزار سال کا۔ گویا یہ دو کروڑ اٹھاسی لاکھ سال ہوئے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے۔ کہ حُقُب کے معنے ہیں چالیس سال جس کا ہر دن ہزار سال کا ہے گویا ایک کروڑ چوالیس لاکھ سال۔ اِسی قسم کی روایت ابن ابی حاتم نے ابن عباس سعید بن جبیر اور کئی تابعین سے بھی نقل کی ہے مگر حُقُب کو ستّر سال قرار دیا ہے (جملہ روایات منقول از ابن کثیر ہیں) گویا ان روایات کے مطابق ایک کروڑ چوالیس لاکھ یا دو کروڑ اٹھاسی لاکھ یا دو کروڑ ساٹھ لاکھ سال کو اتنے عدد سے ضرب دی جائے گی جتنے عدد اَحْقَاب کی جمع سے مراد

لئے جائیں گے مگر یہ مقدار خواہ کچھ بھی ہو۔ بیس کروڑ ہو۔ چالیس کروڑ ہو یا ایک ارب ہو۔ بہرحال یہ ایک معیّن عدد ہے اور ان روایات سے اتنا ضرور ثابت ہو گیا کہ دوزخ کا عذاب محدود ہے اور وہ آخر ایک دن ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ احساس مفسّرین کے دلوں میں بھی پیدا ہوا ہے اور اسی وجہ سے مقاتل ابن حیان کہتے ہیں کہ یہ آیت فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا کی آیت سے منسوخ ہے جو اسی رکوع کے آخر میں آتی ہے۔ حالانکہ مفسّرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ساری آیتیں اکٹھی نازل ہوئی تھیں یعنی اس سورۃ کا دو ٹکڑوں میں اترنا ثابت نہیں پس یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ ایک ہی وقت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں اکٹھی نازل ہوئیں اور پھر ان میں سے ایک آیت نے دوسری آیت کو منسوخ کر دیا۔ خالد بن معدان بھی کہتے ہیں (عن ابی جریر بحوالہ ابن کثیر زیر آیت ھذا) کہ یہ منسوخ ہے۔ ان کی روایات لکھ کر ابن جریر کہتے ہیں کہ شاید یہ عبارت لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا سے متعلق ہے یعنی لّٰبِثِيْنَ فِيْهَاۤ اَحْقَابًا سے مراد محض دوزخ میں رہنا نہیں بلکہ اس قسم کا رہنا ہے جس کے متعلق اگلی آیت میں لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا آیا ہے اور مراد یہ ہے کہ دوزخی دوزخ میں صدیوں ایسی حالت میں رہیں گے کہ نہ انہیں کوئی راحت ملے گی اور نہ پینے کو کچھ ملے گا اس کے بعد بھی وہ رہیں گے تو دوزخ میں ہی مگر عذاب کی نوعیت بدل دی جائے گی پھر وہ کہتے ہیں وَالْاَصَحُّ اَنَّهَا لَا انْقِضَاءَ لَهَا یعنی سچی بات تو یہ ہے کہ دوزخ کبھی مٹ ہی نہیں سکتا۔

لفظ احقاب سے دوزخ کے عذاب کے محدود ہونے کا احساس مفسرین کو پھر ابن جریر نے سالم سے اور انہوں نے حسن بصری سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اَمَّا الْاَحْقَابُ فَلَيْسَ لَهَا عِدَّةٌ اِلَّا الْخُلُوْدُ فِي النَّارِ (جامع البیان فی تفسیر القرآن جزء الثلاثون زیر آیت ھذا) یعنی اَحْقَاب جمع کا لفظ خدا تعالیٰ نے بولا ہے اس کی گنتی بیان نہیں کی اس لئے اَحْقَاب کی گنتی غیر محدود ہے اور اس سے مراد دوزخیوں کا ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے۔ اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو ہر اک کے دل میں خیال پیدا ہوا ہے کہ اس آیت کے ظاہری معنے عذاب جہنم کے ختم ہونے پر دلالت کرتے ہیں لیکن پھر ان معنوں کی اپنے عقیدہ کے مطابق تاویل کرنے کی کوشش کی ہے اور یا تو اس آیت کو لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا سے متعلق بتایا ہے اور یا اَحْقَاب کی جمع کو اَن گنت جمع قرار دے دیا ہے۔ جہاں تک اَحْقَاب کی جمع کا سوال ہے یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ اَحْقَاب اوزانِ جمع قلّت میں سے ہے یعنی ان اوزان میں سے ہے جن کے معنے تین سے دس تک کے ہوتے ہیں اور گو ضروری نہیں کہ ہر جمع قلّت کے لفظ سے قلّت ہی مراد لی جائے مگر بہرحال وضع لفظ کو اہمیت ضرور دی جائے گی اور جس غرض کے لئے لغت نے لفظ مقرر کیا ہو اُس سے بدلنے کے لئے کوئی قرینہ ضرور ہونا چاہیے۔ بغیر کسی قرینہ کی موجودگی کے اُس کے دوسرے معنی کرنے جائز

نہیں ہوں گے ورنہ تاویل کا ایسا دروازہ کھل جائے گا جو حقیقت سے بہت دُور لے جائے گا ایسے قرینے بعض دفعہ معنوی ہوتے ہیں یعنی دُوسری آیات اُس پر دلالت کرتی ہیں یا دُوسرے شواہد اُس پر دلالت کرتے ہیں اور بعض دفعہ ظاہری ہوتے ہیں جیسے ال استغراقی آجائے تو اس کے معنے جمع کثرت کے ہو جاتے ہیں یا کسی ایسے لفظ کی طرف اضافت ہو جو اُس کے ایسے معنے کر دے جو کثرت پر دلالت کرتے ہوں۔ مگر بغیر کسی قرینے کے کسی لفظ کو اُن معنوں سے پھرا دینا جو وضع لغت کے لحاظ سے صحیح ہوں جائز نہیں ہو سکتا اور وضع لغت کے لحاظ سے اَحْقَاب کے معنے تین سے دس تک کے ہو سکتے ہیں۔ پس اگر ہم اس کی آخری حد کو سمجھ لیں تو ہم دو کروڑ اٹھاسی لاکھ کو اس سے ضرب دے لیں گے بشرطیکہ ہم اَحْقَاب کے وہ معنے کریں جو تفاسیر میں کئے گئے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس ایک اور حدیث ایسی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ روایت کہ وہاں ہر دن ہزار سال کا ہوگا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نہیں بلکہ غالباً یہود وغیرہ سے سنی ہوئی ہے۔

دوزخ کے غیر ابدی ہونے کا ثبوت حدیث سے بزّاز نے ایک روایت ابو مسلم بن العلاء سے نقل کی ہے کہ انہوں نے سلیمان التیمی سے پوچھا کہ کیا جہنم میں سے کوئی نکلے گا بھی یا نہیں؟ سلیمان التیمی نے جواب دیا کہ حَدَّثَنِیْ نَافِعٌ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ وَاللہِ لَا یَخْرُجُ مِنَ النَّارِ اَحَدٌ حَتّٰی یَمْکُثَ فِیْھَا اَحْقَابًا قَالَ اَلْحُقْبُ بِضْعٌ وَّ ثَمَانُوْنَ سَنَۃً کُلُّ سَنَۃٍ ثَلَاثُ مِائَۃٍ وَسِتُّوْنَ یَوْمًا مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (تفسیر ابن کثیر زیر آیت ھذا) یعنی مجھ سے بیان کیا نافع نے اُنہوں نے سنا عبداللہ بن عمر سے اور عبداللہ بن عمرؓ نے براہ راست رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا خدا کی قسم آگ میں سے کوئی نہ نکلے گا جب تک اُس میں اَحْقَاب یعنی کئی حُقْب نہ رہ لے۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم دوزخ میں اَحْقَاب رہنے کے بعد وہاں سے نکلنے کے قائل ہیں مگر جن لوگوں کا عقیدہ اوپر بیان کیا گیا ہے اُن کے نزدیک اَحْقَاب سے مراد یہ ہے کہ دوزخ میں سے کوئی آدمی کبھی نہیں نکلے گا۔ پس اس روایت نے اُن کے خیالات کی تردید کر دی اور یہ ظاہر ہو گیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وَآلہٖ وسلم نے بھی اس کے معنے یہی لئے ہیں کہ اَحْقَاب کے بعد لوگ دوزخ میں سے نکل آئیں گے پھر آگے جو فرمایا گیا ہے کہ قَالَ اَلْحُقْبُ بِضْعٌ وَّثَمَانُوْنَ سَنَۃً کُلُّ سَنَۃٍ ثَلَاثُ مِائَۃٍ وَسِتُّوْنَ یَوْمًا مِّمَّا تَعُدُّوْنَ یہ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے الفاظ ہیں تب بھی ان کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جنہوں نے یہ معنے کئے ہیں کہ حُقُب کا ہر دن ایک ایک ہزار سال کا ہوگا انہوں نے غلطی کی ہے اور یہ معنے انہوں نے یہود وغیرہ

سے سُن کر نقل کر دیئے ہیں اور اگر قَالَ سے مراد حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں تب بھی مِمَّا تَعُدُّوْنَ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ وہ ان الفاظ کے ذریعہ ایک ہزار سال کا ایک دن ہونے کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔ پس اگر یہ قول رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ہو تب بھی وہ معنے غلط ثابت ہوتے ہیں اور اگر یہ قول حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ہو تب بھی یہ اُن معنوں کے غلط ہونے کی دلیل ہوگی کیونکہ ایک جلیل القدر صحابی ان معنوں کی تردید کر رہا ہے۔ تیسرا قرینہ اِن معنوں کے غلط ہونے کا حضرت علیؓ کی وہ روایت ہے جو سالم بن ابی الجعد سے منقول ہے اُس میں حضرت علیؓ ہلال الھجری سے پوچھتے ہیں کہ تم حُقُب کے کیا معنے کرتے ہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے حُقب کے کوئی خاص معنے مروی نہیں تھے اگر کوئی خاص معنے مروی ہوتے تو حضرت علیؓ ہلال الھجری کو وہ معنے بتاتے نہ یہ کہ ہلال الھجری سے اس لفظ کے معنے پوچھتے پس ان تمام استدلالات اور روایتوں سے یہ معلوم ہوا کہ اس جگہ دوزخ میں سے دوزخیوں کے نکلنے کا جواز بلکہ اُس کی خبر پائی جاتی ہے گو یہ بھی ضرور ہے کہ دوزخ میں رہنے کا ایک لمبا عرصہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ اگر اَحْقَاب سے مراد دس اَحْقَاب لئے جائیں اور حقب کے معنی اسّی سال کے لئے جائیں تب بھی آٹھ سو سال بن جاتے ہیں۔ یہ زمانہ بھی کوئی چھوٹا نہیں کیونکہ عذاب کی ایک گھڑی بھی بہت بڑی ہوتی ہے جیسا کہ میں نے بتایا ہے حُقُب کے معنے ایک لمبے زمانہ کے بھی ہوتے ہیں اور صدی کے بھی ہوتے ہیں۔ اگر صدی کے معنے لئے جائیں تو ایک ہزار سال کا زمانہ بن جاتا ہے اور اگر حُقُب سے مُراد لمبا زمانہ لیا جائے تو اَحْقَاب سے مراد دس لمبے زمانے ہوں گے۔ اس صورت میں یہ عذاب بہت لمبا بھی ہوسکتا ہے کیونکہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (الحج:۴۸) کہ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کا ایک زمانہ ہزار برس کا ہوتا ہے۔ اِس صورت میں اَحْقَاب سے مراد دس ہزار سال بن جائیں گے لیکن بہر حال کوئی معنے ہوں دوزخ کے عذاب کا غیر منتہی ہونا کہیں سے ثابت نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک اور جگہ پچاس ہزار سال کا بھی دن قرار دیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (المعارج:۵) اگر ایک حُقُب کو پچاس ہزار سال کا قرار دو تب بھی جہنم کا عذاب محدود ہی رہے گا غیر محدود ثابت نہیں ہوسکتا۔

لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا کے الفاظ میں اسلام کے دشمنوں کے مغلوب ہونے کے زمانہ کی طرف اشارہ

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے دشمنوں کے دنیوی عذاب کے معنے کرنے کی صورت میں اس آیت میں یہ پیشگوئی نکلتی ہے کہ اسلام کے دشمن دوسو چالیس یا تین سو سے لے کر آٹھ سو یا ہزار سال تک مغلوب رہیں گے

(اسّی سال کا حُقب مانا جائے تو چونکہ جمع قلّت تین سے دس تک ہوتی ہے تین سے اسّی کو ضرب دی جائے تو دو سو چالیس اور دس سے ضرب دی جائے تو آٹھ سو سال کا زمانہ بنتا ہے اور سو سال کا حُقب مانا جائے تو تین سو سے ہزار سال تک کا زمانہ ہوتا ہے) اگر کہو کہ اس طرح دو مُدتیں بتانے میں تو شک پیدا ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کے کلام میں شک نہیں ہوتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس حد تک کلام میں ابہام کا ہونا کسی نئے فائدہ کو پیدا کرتا ہے اُسی حد تک خدا تعالیٰ کے کلام میں ابہام ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ اس جگہ تین صدی سے دس صدی تک اسلام کے غلبہ کی خبر دینے میں دو فوائد تھے اس لئے یہ ابہام قبیح نہیں بلکہ حسن اور مفید ہے۔ اور وہ دو فائدے یہ تھے (۱) کہ دو سو چالیس سال یا تین صدیوں تک اسلام کا غلبہ نہایت مکمل اور اعلیٰ تھا یعنی اندرونی اتحاد اور بیرونی دشمن کی کمزوری دونوں باتیں پائی جاتی تھیں اور اسی عرصہ میں دشمن مکمل طور پر حسد کی آگ میں جل رہا تھا۔ کیونکہ نہ مسلمانوں کی کمزوری اُسے اپنی ترقی کی امید دلاتی تھی نہ اپنی طاقت کوئی امید کی صورت پیدا کرتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سو سال کے بعد مسلمانوں میں ایک اختلاف رونما ہوا تھا۔ سپین اور بغداد الگ ہوئے مگر دو سو ستّر سال تک یہ اختلاف ایسا نمایاں نہیں ہوا کہ اس کا اثر اسلام کی ترقی پر پڑتا۔ اس کے بعد دو سو چالیس یا تین سو سال سے آٹھ سو یا ہزار سال تک کا زمانہ وہ ہے کہ اس میں ایک طرف مسیحیت کو طاقت ملنی شروع ہوئی دوسری طرف مسلمانوں میں کمزوری نمایاں طور پر پیدا ہونی شروع ہوئی۔ مگر مسیحیوں کی بیداری اور مسلمانوں کی کمزوری ایسی نہ تھی کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے غلبہ کو نقصان پہنچے۔ خصوصاً اسی زمانہ کا متمدن علاقہ یعنے ایشیا اور شمالی افریقہ پوری طرح مسلمانوں کے تسلّط میں رہا۔ پس لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا کی پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور اِن دونوں زمانوں کے لحاظ سے اَحْقَاب کا لفظ جو مُبہم عدد پر دلالت کرتا ہے استعمال کیا گیا ہے۔ اَحْقَاب کی ابتدائی مدّت مکمل غلبہ پر دلالت کرتی ہے اور اس کی انتہائی مدّت اس غلبہ پر دلالت کرتی ہے جس میں کسی قدر ضعف کے آثار ظاہر ہونے لگ گئے تھے مگر غلبہ پھر بھی تھا۔

اس کے علاوہ اس ابہام کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ پہلی تین صدیوں اور آخری سات صدیوں کے غلبہ میں ایک اور امتیاز بھی تھا۔ پہلی صدیوں میں اسلامی حکام پر کم وبیش عمل ہوتا تھا اور کفّار سے حسن سلوک کا خیال رکھا جاتا تھا مگر تین سو سال کے بعد ملوکیّت نے زور پکڑ لیا اور کفّار سے نسبتاً سختی شروع ہوگئی جو غیر مذاہب والوں کے سلوک سے تو بہتر تھی مگر اسلامی معیار کے مطابق نہ تھی اس وجہ سے بھی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے دو قسم کے سلوکوں کے الگ الگ زمانوں پر دلالت ہو یعنی تین سو اور ہزار سال کے زمانہ پر۔ ان معنوں کے رُو سے فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا کی آیت بھی خوب حل ہوتی ہے کیونکہ اس آیت میں زمانہ کے ساتھ ساتھ عذاب کی زیادتی کی طرف اشارہ

کیا گیا ہے اور یہی حال کفّار کا ہوا۔ ابتداءً اسلام میں اسلامی تعلیم کے ماتحت ان پر سختی نہ کی جاتی تھی لیکن جوں جوں اسلامی تعلیم کا اثر مسلمانوں کے دلوں سے کم ہوتا گیا مسلمانوں میں سختی پیدا ہوتی گئی اور اسلامی حکومتوں کے دشمنوں پر تعذیب بڑھتی گئی۔

غرض اس آیت کا جہاں تک غلبۂ اسلام سے تعلق ہے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ مسلمانوں کا غلبہ تین سو سال سے ایک ہزار سال تک رہے گا اور ایسا ہی ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ درمیان میں عارضی طور پر ترکوں کی ایک رَو آئی جس نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا مگر وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد مسلمان ہو کر دب گئے اور اسلام کو ہی غلبہ حاصل رہا۔ اس صورت میں یہی نہیں کہ اسلام کی ترقی اور کفر کی بربادی کی اس آیت میں خبر دی گئی ہے بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام کو جو غلبہ حاصل ہوگا وہ ایک ہزار سال تک چلتا چلا جائے گا۔ ایک ہزار سال کے غلبہ کے بعد کفر پھر سر اٹھائے گا اور مسلمانوں کا تنزّل شروع ہو جائے گا۔ چونکہ ہر مضمون کے لحاظ سے آیتوں کے معنے کئے جاتے ہیں اس لئے اسلام اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے غلبہ کے لحاظ سے اس کے یہی معنے ہوں گے۔ لیکن جب ہم ان آیات کو عذاب دوزخ کے متعلق قرار دیں گے تو اس صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ حُقُب سے مراد زمانہ ہے اور اَحۡقَاب سے مراد بہت لمبا زمانہ ہے۔

عذاب جہنم کے منقطع ہونے کے پانچ ثبوت قرآن مجید سے علاوہ ازیں قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب غیر منقطع نہیں اس لئے بھی اَحۡقَاب کو اس کے معنوں سے پھرانے کی اجازت نہ ہوگی۔ چنانچہ فرماتا ہے (۱) اُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (القارعة:۱۰) دوزخ دوزخیوں کی ماں کی طرح ہوگی جس طرح ماں کے رحم میں انسان کی تکمیل ہوتی ہے اسی طرح دوزخ میں دوزخیوں کی روحوں کی تکمیل کی جائے گی اور ظلمات ثلاثہ میں سے گزر کر آخر ایک دن وہ نئی روحانی پیدائش حاصل کر لیں گے (۲) دوسرے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ (اعراف:۱۵۷) میری رحمت نے ہر چیز کو ڈھانپا ہوا ہے۔ جب اللہ کی رحمت نے ہر چیز کو ڈھانپا ہوُا ہے تو دوزخیوں کو بھی اُسے اپنی رحمت سے ڈھانپنا چاہیے اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آخر انسان نجات پا جائے گا (۳) تیسرے فرماتا ہے رَبَّنَا وَسِعۡتَ کُلَّ شَیۡءٍ رَّحۡمَةً وَّ عِلۡمًا (المومن:۸) اے ہمارے رب ہر چیز کا تو نے رحمت اور علم سے احاطہ کیا ہوا ہے۔ اگر اس کی آیت کی موجودگی میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی چیز بھی مخلوق میں سے ایسی ہے جس کا خدا کو علم نہیں تو یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی چیز ایسی ہے جس کو خدا کی رحمت ڈھانپ نہیں لے گی۔ (۴) چوتھے فرماتا ہے خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ ؕ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا

يُرِيْدُ (ھود:۱۰۸) وہ اُس میں اُس وقت تک رہیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین ہیں اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ مگر جو تیرا رب چاہے یعنی تیرا رب جس کو بخشنا چاہے بخش دے اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ تیرا رب وہ بات ضرور کرے گا جس کا وہ ارادہ رکھتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا ہے بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ اُس کی طرف سے بخشش ہو گی بھی۔ (۵) اسی طرح سورۂ ھود میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (ھود:۱۲۰) سوائے ان کے جن پر تیرے رب نے رحم کیا وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق کو پیدا کیا ہے تا کہ اُن پر رحم کرے۔ جب ہر مخلوق کو خدا تعالیٰ نے رحم کے لئے پیدا کیا ہے تو یہ خیال کر لینا کہ وہ کسی کو ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہنے دے گا اس آیت کے بالکل خلاف ہے۔ ابن کثیر میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت آتی ہے کہ لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ يَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ (تفسیر ابن کثیر زیر ھود ۱۱۹) یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو اپنی رحمت کے لئے پیدا کیا ہے عذاب کیلئے پیدا نہیں کیا۔ اور یہ ایک لازمی بات ہے کہ جس چیز کے لئے کسی کو پیدا کیا گیا ہے وہ اس کو ضرور مل جانی چاہیے (۶) پھر فرماتا ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (الزلزال:۸) جو شخص ایک ذرّہ بھر نیکی میں بھی حصہ لے گا اللہ تعالیٰ اس کی نیکی کے ایک ذرّہ کو بھی ضائع نہیں کرے گا اور وہ ضرور اس کا انجام دیکھے گا۔ یہ انجام وہ اسی طرح دیکھ سکتا ہے کہ پہلے اُسے گناہوں کی سزا دے دی جائے اور بعد میں اُسے معاف کر دیا جائے۔ (۷) حدیث میں بھی آتا ہے اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِذَا اَرَادَ عَبْدِيْ اَنْ يَّعْمَلَ سَيِّئَةً فَلَا تَكْتُبُوْهَا عَلَيْهِ حَتّٰى يَعْمَلَهَا فَاِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا بِمِثْلِهَا وَاِنْ تَرَكَهَا مِنْ اَجْلِيْ فَاكْتُبُوْهَا لَهٗ حَسَنَةً وَاِذَا اَرَادَ اَنْ يَّعْمَلَ حَسَنَةً فَلَمْ يَعْمَلْهَا فَاكْتُبُوْهَا لَهٗ حَسَنَةً فَاِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا لَهٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِأَتِ ضِعْفٍ (بخاری مصری جلد رابع کتاب التوحید باب قول اللہ تعالیٰ یریدون ان یبدلوا کلام اللہ) یعنی ہر بدی کی سزا اُس کے برابر ہے اور ہر بدی جس کا خیال چھوڑ دیا جائے اس کے بدلہ میں نیکی لکھی جاتی ہے اور ہر نیکی جس کا انسان خیال کرے خواہ عمل نہ کرے اس کے بدلہ میں نیکی ہے اور ہر نیکی کا بدلہ دس سے سات سو گنے تک ہے۔ قرآن کریم میں بھی نیکی کا دس گنے سے زیادہ ثواب دیئے جانے کا وعدہ کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرۃ:۲۶۲) یعنی جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُن کے اس فعل کی حالت اُس دانہ کی حالت کی مشابہ ہے جو سات بالیں اُگائے اور ہر بال میں سو دانہ ہو اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے اس سے بھی بڑھا بڑھا کر

دیتا ہے اور اللہ وسعت والا ہے اور بہت جاننے والا ہے۔اس آیت سے پتہ لگتا ہے کہ بعض نیکیوں کا بدلہ سات سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔چونکہ انسان میں کچھ نیکی بھی پائی جاتی ہے اس لئے نیکیوں کا شمار اگر اس حدیث اور قرآن کریم کی آیت کے مطابق کیا جائے تو عقل اس بات کو جائز قرار نہیں دیتی کہ کوئی انسان دائمی طور پر نجات سے محروم ہو جائے۔(نیز دیکھو تفسیر کبیر جلد ۴ سورۃ ہود زیر آیت ۱۰۹)

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا حَمِيْمًا

(وہاں ان لوگوں کی یہ حالت ہوگی) کہ وہ نہ تو اس میں کسی قسم کی ٹھنڈک (محسوس کریں گے) اور نہ کوئی پینے کی چیز

وَّ غَسَّاقًا ﴿۲۶﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۷﴾

چکھیں گے سوائے (تیز) گرم پانی اور (ناقابل برداشت) ٹھنڈے پانی کے (اس طرح انہیں ان کے اعمال کے) مطابق بدلہ (دیا جائے گا)۔

حل لغات۔اَلْبَرْدُ نَقِيْضُ الْحَرِّ۔بَرْد کے معنے ٹھنڈک کے ہیں اَلْبَرْدُ اَيْضًا اَلنَّوْمُ۔بَرْد کے ایک معنے نیند کے بھی ہیں چنانچہ عرب کہتے ہیں اَلْبَرْدُ يَمْنَعُ الْبَرْدَ یعنی ٹھنڈک نیند کو روک دیتی ہے(اقرب) فتح البیان میں ہے کہ حسن۔عطا اور ابن زید کے نزدیک بَرْد سے مراد راحت ہے۔(فتح البیان زیر آیت ھٰذا)

حَمِيْمًا اَلْحَمِيْمُ اَلْمَاءُ الْحَارُّ۔حَمِیْم گرم پانی کو کہتے ہیں یہ لفظ اضداد میں سے ہے یعنی اپنے مخالف معنے بھی ادا کرتا ہے چنانچہ اس کے معنے ٹھنڈے پانی کے بھی ہیں۔نیز اَلْحَمِيْمُ کے معنے ہیں اَلْقَيْظُ۔گرمی اَلْعَرَقُ پسینہ۔(اقرب)

غَسَّاق اَلْغَسَّاقُ کے معنے ہیں اَلْمُنْتِنُ الْبَارِدُ الشَّدِيْدُ الْبَرْدِ الَّذِيْ يُحْرِقُ مِنْ بَرْدِهٖ كَاِحْرَاقِ الْحَمِيْمِ سخت ٹھنڈی بدبودار چیز جو اپنی ٹھنڈک سے ایسی ہی تکلیف دے جیسے کہ گرم پانی گرمی سے جلا دیتا ہے (لسان) مَا يَقْطُرُ مِنْ جُلُوْدِ اَهْلِ النَّارِ وَصَدِيْدُهُمْ مِّنْ قَيْحٍ وَنَحْوُهٗ وہ پیپ جو دوزخیوں کے اجسام سے نکلے گی اُس کو بھی غَسَّاق کہتے ہیں۔(اقرب)

وِفَاقًا وِفَاق وَافَقَ کا مصدر ہے اور وَافَقَ عَلَى الشَّيْءِ کے معنے ہیں ضِدُّ خَالَفَ کسی چیز کے مطابق آیا۔ اَلْوَفْقُ کے معنے ہیں اَلْمُطَابَقَةُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ دو اشیاء کے درمیان پوری مطابقت (مفردات) پس جَزَآءً وِّفَاقًا

کے معنے ہوں گے اعمال کے مطابق جزاء۔

تفسیر ۔ لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا یہ طَاغِیْنَ کا دوسرا حال ہے۔ پہلا حال آیت لّٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا میں بیان ہے۔ یعنی طاغیوں کا یہ حال بھی ہوگا کہ وہ نہیں چکھیں گے بَرْد اور نہ ہی شَرَاب اس حالت میں کہ وہ جہنّم میں ہوں گے جو ابن جریر نے معنے کئے ہیں کہ لّٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا والی آیت لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا سے متعلق ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ پھر عذاب کی نوعیت بدل جائے گی مگر یہ معنے بالبداہت باطل ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں آیت کے معنے یہ بنتے ہیں کہ اَحْقَاب کے بعد اُنہیں راحت بھی میسّر آجائے گی اور پینے کے لئے پانی بھی ملنا شروع ہوجائے گا۔ جب انہیں پانی بھی مل جائے گا اور راحت بھی میسّر آجائے گی تو پھر عذاب کس بات کا ہوگا۔ اگر خالی پینے کا ذکر ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ صرف پانی پینے کے بعد بھی دکھ رہ سکتا ہے مگر یہاں تو شَرَابًا کے ساتھ ہی بَرْدًا کا بھی ذکر آتا ہے اور بَرْدًا کے معنے نیند اور راحت کے بھی ہوتے ہیں۔ پس لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا کے معنے یہ ہوں گے کہ اَحْقَاب تک تو انہیں راحت نہیں ملے گی اور نہ پینے کے لئے پانی ملے گا مگر جب اَحْقَاب گزر جائیں گے تو پھر انہیں پینے کے لئے پانی بھی مل جائے گا اور نیند اور راحت کے سامان بھی میسّر آجائیں گے لیکن وہ رہیں گے دوزخ میں ہی۔ پس یہ معنے بالبداہت غلط اور باطل ہیں۔

لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا سے ابن جریر کا غلط استدلال دوسرے بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا میں بَرْدًا کو الگ بیان کیا گیا ہے اور شَرَابًا کو الگ بیان کیا گیا ہے جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہاں بَرْدًا سے ٹھنڈا پانی مراد نہیں بلکہ کچھ اور مراد ہے اور وہ معنے یہی ہو سکتے ہیں کہ انہیں راحت کے سامان بھی میسّر نہیں آئیں گے۔ چنانچہ بَرْد کے ایک معنے راحت کے بھی آتے ہیں چنانچہ لکھا اَلْبَرْدُ: اَلرَّوْحُ وَالرَّاحَةُ (فتح البیان)

جہاں تک قیامت کا تعلق ہی لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا کے معنے ظاہری بھی کئے جاسکتے ہیں کہ وہاں اُن کے لئے کوئی راحت کا سامان نہیں ہوگا اور نہ انہیں پینے کے لئے کوئی چیز ملے گی سوائے گرم پانی اور غَسَّاق کے۔ غَسَّاق کے معنے ہوتے ہیں سخت سرد پانی یا بدبودار پانی کے یا وہ پیپ جو زخموں میں سے بہتی ہے چنانچہ لُغت میں لکھا اَلْغَسَّاقُ۔ اَلْمُنْتِنُ۔ اَلْبَارِدُ الشَّدِیْدُ الْبَرْدِ۔ وَمَا یَقْطُرُ مِنْ جُلُوْدِ اَهْلِ النَّارِ وَصَدِیْدُهُمْ مِنْ قَیْحٍ وَّ نَحْوُهٗ (اقرب) غَسَّاق کا لفظ بھی بتا رہا ہے کہ یہاں برد کے معنے راحت کے ہی ہیں کیونکہ غَسَّاق کے معنے ہیں سخت سرد۔ پس یہ کہنا کہ انہیں وہاں سردی نہیں لگے گی بالبداہت باطل ہوگیا کیونکہ غَسَّاق کے معنے ہی سخت سرد کے ہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دوزخیوں کو جو پانی ملے گا وہ سخت گرم ہوگا۔ اسی طرح اُنہیں زخموں کا دھوون یعنی

اس کی پیپ دی جائے گی یا سخت بدبودار اور سڑا ہوا پانی ملے گا۔ یا اتنا ٹھنڈا پانی دیا جائے گا جس سے ان کے دانت گرنے لگیں گے۔

جَزَآءً وِّفَاقًا کا مطلب جَزَآءً وِّفَاقًا یعنی یہ جزا ہے جو اُن کے مناسب حال ہے۔ وِفَاقًا کے معنے ہوتے ہیں مُوَافِقًا لِلْاَعْمَالِ وہ جزا جو اُن کے اعمال سے مطابقت رکھتی ہے یعنی اُس دنیا میں بھی اُن کے اندر میانہ روی نہیں تھی اور چونکہ دُنیا میں میانہ روی کا وصف اُن کے اندر نہیں پایا جاتا تھا اس لئے اگلے جہان میں بھی انہیں ایسی ہی چیزیں ملیں گی جو حد درجہ گرم ہوں گی یا حد درجہ سرد ہوں گی یا چونکہ دنیا میں وہ سخت غصہ میں آجاتے تھے یا نکمے اور سُست ہو کر بیٹھ رہتے تھے۔ میانہ روی کی عادت جو انسان کو کامیاب کرتی ہے ان کے اندر نہیں تھی اس لئے جہنّم کا عذاب بھی انہیں اسی صورت میں ہی ملے گا۔ کہیں سخت گرم پانی اُن کو پینے کے لئے ملے گا کہیں سخت سرد پانی اُن کو پینے کے لئے ملے گا۔ درمیانی پانی جو راحت بخشتا ہے انہیں جہنّم میں نظر ہی نہیں آئے گا۔ اسلام اور کفر کے اخلاق میں یہی فرق ہے کہ اسلام میں میانہ روی کی تعلیم ہے لیکن اسلام کے علاوہ اور کسی مذہب میں میانہ روی کی تعلیم نہیں پائی جاتی۔ یہودیت کہتی ہے ’’جان کے بدلے جان لے اور آنکھ کے بدلے آنکھ دانت کے بدلے دانت اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور پاؤں کے بدلے پاؤں۔ جلانے کے بدلے جلانا۔ زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ‘‘ (خروج باب ۲۱ آیت ۲۳ تا ۲۵) عیسائیت کہتی ہے ’’جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے‘‘ (متی باب ۵ آیت ۳۹) گویا ایک میں گرمی ہی گرمی چلتی چلی جاتی ہے اور دوسرے میں سردی ہی سردی چلی جاتی ہے۔ پس ایسے اعمال کے بدلہ میں جزاء بھی ایسی ہوگی کسی کو گرمی ہی گرمی پہنچے گی۔ لیکن اسلام اپنے تمام احکام میں میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ فرماتا ہے تم رحم کے موقع پر رحم کرو اور سزا کے موقع پر سزا دو۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (الشوریٰ: ۴۱) یعنی بدی کی سزا اُسی حد تک دینی جائز ہے جس حد تک کہ ظالم نے ظلم کیا تھا مگر جو ظلم کے مقابل پر عفو سے کام لے بشرطیکہ اس عفو سے اصلاح ہوتی ہو تو اُسے اپنے اس عفو کا بدلہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا اور ضرور ملے گا۔

قرآن مجید اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے متعلق اگر ان آیتوں کو لیا جائے تو پھر ان سے روحانی معنی مراد ہوں گے جیسا کہ پہلے روحانی معنے کرتے چلے آئے ہیں۔ یعنی اسلام کے دشمنوں کو کبھی راحت نہیں ملے گی۔ اُن کے دلوں کو کبھی چین نصیب نہیں ہوگا وہ اسلام کے مقابلہ میں جب اپنی ناکامی دیکھیں گے تو اس بے چینی اور اضطراب کی حالت میں کبھی وہ اسلام کے مقابلہ میں بالکل مایوس ہو کر بیٹھ جائیں گے اور کبھی پاگلوں کی طرح اُٹھ کر

حملہ کرنا شروع کر دیں گے حَمِیْمًا وَّ غَسَّاقًا والی حالت یہی ہوتی ہے کہ کبھی انسان جوش میں آ کر پاگلوں کی طرح کام کرنے لگ جائے اور کبھی ہمت ہار کر بیٹھ جائے۔ یہ دونوں حالتیں ایسی ہیں جو انسان کو کامیابی سے دُور رکھتی ہیں۔ نہ پاگلوں کی طرح حملہ کرنے والا جیت سکتا ہے اور نہ مایوسی کی حالت میں قوتِ عمل سے کام نہ لینے والا کبھی کامیاب ہوسکتا ہے۔ لیکن فرماتا ہے جب اس حالت پر اَحْقَاب گزر جائیں گے تو اس کے بعد ان کو ہوش آ جائے گی اور وہ منظم طور پر مسلمانوں پر حملہ کرنا شروع کر دیں گے اُس وقت چونکہ مُسلمان بھی اپنے بُرے اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے غضب کو بڑھا چکے ہوں گے اس لئے ایک طرف اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور دوسری طرف کفر کا منظم حملہ۔ جب یہ دو چیزیں مل جائیں گی تو پھر کفّار جیت جائیں گے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۸﴾

وہ یقیناً (کسی) محاسبہ کا ڈر (اپنے دلوں میں) نہیں رکھتے تھے۔

حل لغات۔ لَا يَرْجُوْنَ رَجَا سے مضارع منفی کا جمع مذکّر کا صیغہ ہے اور رَجَا الشَّيْءَ کے معنے ہیں اَمَّلَ بِهٖ اس کی امید رکھی۔ خَافَ۔ کسی چیز سے ڈرا (اقرب) پس كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ کے معنی ہوں گے (۱) وہ امید نہیں رکھتے (۲) وہ ڈرتے نہ تھے۔

اَلْحِسَابُ الحساب کے معنے ہیں اَلْعَدُّ: شمار کرنا۔ گننا۔ (اقرب)

تفسیر۔ آخرت کے لحاظ سے اس کے معنے یہ ہوں گے کہ بعث بعد الموت پر چونکہ یقین نہیں تھا اس لئے وہ ایسے کام نہیں کرتے تھے جو ان کو اگلی زندگی میں فائدہ پہنچانے والے ہوتے۔ اُن کے کاموں کی اصل غرض دنیوی حالات ہوا کرتے تھے صحیح محرّک اُن کے قلب میں نہیں تھا اس لئے وہ نیکی کو نہیں پا سکتے تھے۔

يَرْجُوْنَ کے دو معنی يَرْجُوْنَ کے معنے خوف کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور امید رکھنے کے بھی۔

لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا کے معنی آخرت کے لحاظ سے اور آخرت کے لحاظ سے یہ دونوں معنی چسپاں ہو سکتے لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا وہ خوف نہیں کرتے تھے کہ ہمارے اعمال کی سزا ہم کو ملے گی یا وہ امید نہیں کرتے تھے کہ اگر ہم نیک اعمال کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کا کوئی بدلہ ملے گا۔ اس لئے رَجَاء کا لفظ یہاں استعمال کیا گیا ہے قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو ایک ہی وقت میں کئی کئی معنوں میں مستعمل ہو جاتے

ہیں۔ یہاں بھی رَجَاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو دو معنوں کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی امید اور خوف۔ درحقیقت انسانی اعمال میں دو وجوہ سے ہی خرابی پیدا ہوتی ہے یا تو اس وجہ سے خرابی پیدا ہوتی کہ بد اعمال کی سزا کا اُسے کوئی ڈر نہیں ہوتا اور یا اس وجہ سے خرابی ہوتی ہے کہ نیک اعمال کی جزاء کا اُسے یقین نہیں ہوتا۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا یہ دونوں باتیں بیان کردی گئی ہیں یہ بھی کہ وہ اس بات سے نہیں ڈرتے تھے کہ اُن کے اعمال کا محاسبہ ہوگا اور یہ بھی کہ وہ امید نہیں رکھتے تھے کہ اگر وہ نیکی کریں گے تو انہیں اس کا کچھ بدلہ ملے گا۔ دنیوی زندگی کے متعلق اس آیت کو سمجھا جائے تب بھی یہ دونوں معنے چسپاں ہوتے ہیں یعنی قرآن مجید اور محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے انہوں نے اس لئے تعلق پیدا نہیں کیا اور اس لئے وہ مغضوب اور مقہور بن گئے کہ اُنہیں اس امر کا ڈر نہ تھا کہ ان کو اُن کی بدیوں کی سزا ملے گی۔ وہ کہتے تھے کہ ہم کیوں بدیاں چھوڑیں ہمیں کسی کا ڈر نہیں ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی وہ اس امر کی بھی امید نہیں رکھتے تھے کہ انہیں نیک اعمال کا اچھا بدلہ ملے گا۔ اور اس وجہ سے نماز، روزہ اور دوسری اسلامی قیود کی طرف اُن کا دل مائل نہیں ہوتا تھا۔

لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا میں دشمنانِ اسلام کے اندر مایوسی پیدا ہوجانے کی طرف اشارہ اسلام کے مقابلہ کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان آیات کا یہ مطلب ہے کہ اُن کے دلوں میں سخت بُغض اور کینہ ہوگا وہ پوری کوشش کریں گے کہ اسلام مٹ جائے اور وہ کسی خطرہ کی پرواہ نہیں کریں گے مگر ساتھ ہی لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا وہ کامیابی کی امید نہیں رکھیں گے۔ اُن کے دلوں میں مایوسی پیدا ہوجائے گی اور وہ خیال کریں گے کہ اب کفر کو فتح حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور جس شخص کے اندر مایوسی پیدا ہوجائے اس کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو پاگلوں کی طرح حملہ کرتا ہے یا پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ؕ﴿۲۹﴾

اور ہمارے نشانات کو سختی کے ساتھ جھٹلاتے تھے۔

حل لغات۔ كَذَّبُوْا كَذَّبَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور كَذَّبَ الْاَمْرَ تَكْذِيْبًا وَّ كِذَّابًا کے معنے ہیں اَنْكَرَهٗ وَجَحَدَهٗ کس چیز کا شدت سے انکار کیا۔ جھٹلایا (اقرب) پس كَذَّبُوْا کے معنے ہوں گے۔ انہوں نے جھٹلایا۔ انکار کیا۔

کِذَّاب: کَذَّبَ کا مصدر ہے جس کے معنے جھٹلانے کے ہوتے ہیں۔

تفسیر ۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ ہمارے نشانوں کو سخت جھٹلایا کرتے تھے یعنی نشانوں کے جھٹلانے کی وجہ سے ایمان لانے کی طرف اُن کو کوئی توجہ نہیں تھی۔

کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا کے دو معنی کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا کِذَّابًا اگر شروع زمانہ کے کافروں کے متعلق سمجھا جائے تو اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ چونکہ یہ لوگ ہماری ان پیشگوئیوں کو کہ اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا اور قیامت آئے گی نہیں مانتے تھے اس لئے گمراہ ہو گئے۔ قیامت پر یہ معنی اس طرح چسپاں ہو سکتے ہیں کہ چونکہ وہ قیامت کے منکر تھے اس لئے اُن کی یہ حالت ہوئی اور اگر کلام الٰہی یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مراد لئے جائیں تو پھر یہ مطلب بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اُن نشانات کو نہ مانتے تھے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے۔ اسی طرح آیات سے مراد کلام الٰہی بھی ہو سکتا ہے۔ پس کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا کِذَّابًا کا یہ مطلب ہوگا کہ چونکہ کلام الٰہی سے اُن کی فطرت کا جوڑ نہیں اس لئے وہ اس کا قطعی طور پر انکار کرتے ہیں۔

وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ﴿۳۰﴾

اور ہم نے (تو) ہر ایک چیز کو (پوری) ☆ پوری طرح گن رکھا ہے۔

حل لغات ۔اَحْصَيْنَاهُ اَحْصٰى سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے۔ اور اَحْصٰى الشَّيْءَ اِحْصَاءً کے معنے ہیں عَدَّهٗ کسی چیز کو گنا اور شمار کیا (اقرب) پس اَحْصَيْنٰهُ کے معنے ہوں گے۔ ہم نے اس کو گن لیا۔

كِتَابًا: اَحْصٰى کا مفعول مطلق بھی ہو سکتا ہے اور حال بھی۔ مفعول مطلق ہونے کی صورت میں اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے ہر چیز کو پوری طرح گن رکھا ہے۔ اور حال ہونے کے لحاظ سے اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اَحْصَيْنٰهُ حَالَ كَوْنِهَا كِتَابًا اَىْ مَكْتُوْبًا۔ یعنی ہم نے ہر چیز کو اس حال میں گن چھوڑا ہے کہ وہ لکھی ہوئی ہے۔ کیونکہ کِتَاب بمعنے مَكْتُوْب بھی آتا ہے۔

کتاب کے معنے ہیں۔ مَا يُكْتَبُ فِيْهِ۔ وہ اوراق جن میں لکھا جاتا ہے۔ اَلْقَدْرُ۔ قدر۔ اَلْحُكْمُ۔ حکم۔

☆ اصل لفظی ترجمہ اس آیت کا یوں ہوگا کہ ہم نے ہر ایک شئے کو گن رکھا ہے گن رکھا ہے پوری طرح۔ چونکہ گن رکھا ہے کا جملہ پہلے محذوف ہے اس لئے اردو میں اس کو ادا کرنے کے لئے پوری پوری طرح گن رکھا ہے ترجمہ کیا گیا ہے۔

اَلْفَرْضُ۔ فرض۔ اَلدَّوَاۃُ۔ دوات (اقرب)

تفسیر۔ کوئی انسانی عمل ضائع نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے ہر چیز کا اچھی طرح اندازہ کر رکھا ہے یا ہر چیز کو ہم نے ایک اندازہ کی جگہ میں محفوظ کر رکھا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ ایسی جگہ محفوظ ہیں جہاں سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کوئی انسانی عمل ایسا نہیں جو ضائع ہو جاتا ہو بلکہ وہ ضرور کسی نہ کسی شکل میں محفوظ ہوتا ہے۔ ریڈیو کی ایجاد نے اس صداقت کو بہت بڑا ثبوت مہیا کر دیا ہے ہزاروں ہزار میل پر ایک شخص اپنی زبان سے کوئی لفظ نکالتا ہے تو فوراً ہم تک پہنچ جاتا ہے اور ہم گھر بیٹھے ہزاروں ہزار میل دور کی آواز اس طرح سُن لیتے ہیں جیسے وہ ہمارے پاس بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ مجھے خیال آیا کرتا ہے کہ کوئی تعجب نہیں اگر یہ علوم ترقی کرتے کرتے اس حالت کو پہنچ جائیں کہ گزشتہ زمانہ کی آوازوں کو بھی ریکارڈ کیا جاسکے۔ اگر کوئی ایسا آلہ نکل آئے تو ہوسکتا ہے ہم رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وہ حدیثیں جو آج کتابوں میں پڑھتے ہیں خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبان سے سن لیں۔ یہ بات موجودہ زمانہ کی ایجادات کو دیکھتے ہوئے اب ناممکن نظر نہیں آتی۔ زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے ممکن ہے آئندہ چل کر کوئی ایسا آلہ ایجاد ہو جائے اور گزشتہ زمانہ کو بھی اپنے کنٹرول میں لایا جاسکے۔ اس صورت میں ہمیں گزشتہ زمانہ کی آوازیں آسانی سے سُنائی دینے لگیں گی۔ ہم جس صدی کے جس سال کی کوئی بات سننا چاہیں گے اُس صدی کے اُس سال پر اُس آلہ کو نصب کر دیں گے اور آوازوں کو سُننا شروع کر دیں گے کاش دنیا اس ترقی سے صداقت کی طرف آئے۔

فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۱﴾ ع

پس (اپنے اپنے اعمال کے مطابق) عذاب چکھو۔ اور ہم تم کو (عذاب کے بعد) ☆ عذاب ہی دیتے چلے جائیں گے۔

حل لغات۔ اَلْعَذَابُ اَلْعَذَابُ كُلُّ مَاشَقَّ عَلَى الْاِنْسَانِ وَمَنَعَهٗ عَنْ مُرَادِهٖ عذاب کے معنے ہیں ہر وہ چیز جو انسان پر شاق گزرے اور حصول مراد سے اُسے روک دے۔ وَفِي الْكُلِّيَاتِ كُلُّ عَذَابٍ فِي الْقُرْاٰنِ فَهُوَ التَّعْذِيْبُ اِلَّا وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ فَاِنَّ الْمُرَادَ الضَّرْبُ اور کلیات میں لکھا کہ لفظ عَذَاب

☆ یہ مراد نہیں کہ عذاب بڑھتا چلا جائے گا بلکہ مراد یہ ہے کہ جب ایک قسم کا عذاب ختم ہوگا تو پھر دوسرا عذاب شروع ہو جائے گا یعنی جب تک کامل بخشش نہ ہوگی عذاب میں وقفہ نہ ہوگا اس مضمون کو ادا کرنے کے لئے ہم نے اوپر کا ترجمہ کیا ہے۔

سے مراد قرآن مجید میں ’’عذاب دینا‘‘ ہوتا ہے سوائے وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا کی آیت کے وہاں ظاہری سزا مراد ہے۔ (اقرب)

اَلْعَذَابُ هُوَالْاِيْجَاعُ الشَّدِيْدُ۔ عذاب کے معنے ہیں سخت تکلیف دینا۔ فَالتَّعْذِيْبُ فِي الْاَصْلِ هُوَ حَمْلُ الْاِنْسَانِ اَنْ يَّعْذِبَ اَیْ يَجُوْعَ وَيَسْهَرَ یعنی اگر مادہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اُس کے معنے ہیں کسی کو بھوکا اور بیدار رکھنا۔ کیونکہ عَذَبَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں۔ اُس نے کھانا پینا ترک کر دیا۔ وَقِيْلَ اَصْلُهٗ مِنَ الْعَذْبِ: فَعَذَّبْتُهٗ اَیْ اَزَلْتُ عَذْبَ حَيٰوتِهٖ بعض نے کہا ہے کہ عذاب عَذْبٌ سے نکلا ہے۔ جس کے معنے میٹھے پانی کے ہیں اور تَعْذِيْب کے معنے اور عذّب کے معنے ہیں کہ اُسے زندگی کی حلاوت سے محروم کر دیا (مفردات) پس عَذَاب کے معنے ہوئے (۱) تکلیف (۲) ایسی چیز جو زندگی کی حلاوت سے محروم کر دے۔ (۳) جو مقصود حیات سے محروم کر دے۔

تفسیر ۔مقہور قوموں کا دنیا میں یہی نقشہ ہوتا ہے جو اس آیت میں کھینچا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عذاب اُن سے ٹلے گا نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ مقہور قومیں جب اپنی آزادی کے لئے کوشش کرتی ہیں تو وہ اور زیادہ عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور جب تک اُن کے غلبہ کا زمانہ نہیں آتا ان کی ہر کوشش اپنے مقصد سے اور زیادہ دور کر دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس جنگ میں انگریز بار بار بلجیم اور فرانس والوں سے کہہ رہے ہیں کہ تم جلدی اُٹھنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تم جلدی اُٹھنے کی کوشش کرو گے تو اَور زیادہ مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے چنانچہ جب بھی وہ اپنی آزادی کے لئے کوشش کرتے ہیں جرمن انہیں اور زیادہ تکلیفیں دینی شروع کر دیتے ہیں۔

فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ میں اسلام کے دشمنوں کی ناکامی کی طرف اشارہ پس فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا کا یہ مطلب ہے کہ جب تک اسلام کے غلبہ کا زمانہ ہے تمہاری کوششیں بیکار ہیں جب تک خاموشی سے بیٹھے رہو گے بیٹھے رہو گے لیکن جب تہوّر سے کام لے کر مسلمانوں کے مقابلہ میں اُٹھو گے اُس وقت تم اپنا ہی نقصان کرو گے اسلام اور مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکو گے۔ قیامت کے لحاظ سے بھی یہ معنی ٹھیک ہیں۔ انسان پر جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اس کی تکلیف بڑھتی جاتی ہے پہلے دن بخار کی حالت اَور ہوتی ہے دوسرے دن اَور۔ اور جب بخار لمبا ہو جائے تو مریض کی بالکل اور حالت ہو جاتی ہے۔ پس عذاب کا زمانہ جتنا لمبا ہوتا چلا جائے گا اُن کی تعذیب بھی بڑھتی چلی جائے گی۔

پس اس آیت سے یہ مراد نہیں کہ اُن کی نجات نہیں ہوگی بلکہ مراد یہ ہے کہ عذاب کے وقت وہ عذاب میں ہی

ترقی کریں گے جوں جوں مرض بڑھتی ہے تکلیف بھی بڑھتی جاتی ہے اور ضعف بھی زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے لیکن اس کے خلاف کبھی عذاب برداشت کرنے کی عادت بھی بڑھ جاتی ہے مگر اُس کا علاج اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ بتا دیا کہ جب اُنہیں عذاب کی عادت ہو جائے گی تو اُن کو نئی جلود دے دی جائیں گی۔

فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا کے دنیوی لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ مسلمان روز بروز ترقی کرتے چلے جائیں گے اور جوں جوں وہ ترقی کریں گے کفّار و مشرکین اُن کے مقابلہ میں روز بروز دبتے چلے جائیں گے۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿۳۲﴾

یقیناً متقیوں کے لئے کامیابی مقدّر ہے۔

حل لغات۔ مَفَازٌ مَفَازٌ فَازَ کا مصدر بھی ہو سکتا ہے اور ظرف مکان کا صیغہ بھی۔ اور فَازَ (يَفُوْزُ فَوْزًا) کے دو معنے ہوتے ہیں۔ ایک فَازَ مِنْ مَكْرُوْهٍ اور ایک فَازَ بِخَيْرٍ فَازَ مِنْ مَّكْرُوْهٍ کے معنے ہوتے ہیں نَجَا یعنی وہ بُری بات سے بچ گیا اور فَازَ بِخَيْرٍ کے معنے ہوتے ہیں ظَفَرَ بِهٖ اچھی بات اس کو حاصل ہو گئی۔ (اقرب) مفردات میں ہے اَلْفَوْزُ: اَلظَّفَرُ بِالْخَيْرِ مَعَ حُصُوْلِ السَّلَامَةِ۔ یعنی کسی کا بہترین مقصود کو اس طور پر پالینا کہ وہ ہر قسم کے نقصان سے بھی محفوظ رہے فَوْز کہلاتا ہے۔ (مفردات) پس اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا کے معنے ہوئے (۱) کہ متقیوں کو کامیابی حاصل ہو گی یعنی وہ تمام قسم کی بھلائیوں کو پالیں گے اور تمام مصایب سے اُن کو نجات مل جائے گی (۲) یہ کہ متقیوں کو یقیناً خدا ایک ایسا مقام عطا فرمانے والا ہے جہاں وہ مصائب سے نجات پا جائیں گے اور تمام قسم کی برکات اور کامیابیوں کو حاصل کر لیں گے۔ ایک مقام تو اُخروی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ اس مقام میں نہ کسی قسم کا شر ہے اور نہ وہاں خیر کی کوئی کمی ہے بلکہ لَهُمْ مَا يَشَآءُوْنَ (الشوریٰ: ۲۳) یعنی جو کچھ وہ چاہیں گے اس میں اُن کو حاصل ہو جائے گے۔ پس ایک تو وہ مقام ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی بعث بعد الموت والی زندگی۔ دوسرے اس دنیا میں بھی مومنوں سے یہ وعدہ ہوتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمن: ۴۷) کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے مقام سے ڈرتا ہے اُس کے لئے اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ جنت کے سامان پیدا کر دیتا ہے اور اگلے جہان میں بھی وہ اس کے لئے جنت کے سامان پیدا کرے گا۔

تفسیر۔ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا میں مسلمانوں کو مصائب سے نجات ملنے کی پیشگوئی میں

بتا چکا ہوں کہ اس سورۃ میں غلبۂ اسلام کا بھی ذکر ہے اور قرآن کریم کے غلبہ کا بھی اس میں ذکر ہے پس اس میں پیشگوئی کی گئی ہے کہ مومنوں کے لئے مکروہات سے نجات حاصل کرنے کے سامان پیدا ہو جائیں گے اور ان کو ایسی جگہیں عنایت ہوں گی جو مقام نجات یا مقام کامیابی کہلانے کی مستحق ہوں گی۔ یہ پیشگوئی ایسے وقت کی گئی تھی جب مسلمانوں کے لئے کسی قسم کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے یہ سورۃ مکّی ہے اور مکّی بھی ابتدائی زمانہ کی ہے۔ اُس وقت اسلام میں صرف دس بارہ آدمی شامل تھے اور ان کو کفار کی طرف سے ایسی ایسی تکالیف دی جاتی تھیں جن کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔

مکہ میں مسلمانوں پر تکالیف کا زمانہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ غلام جو ابتدائی زمانہ میں مسلمان ہو گئے تھے کفّار مکّہ اُن کو تپتی ریت پر عرب جیسے گرم علاقہ میں لٹا دیتے اور جب اس کے نتیجہ میں بھی وہ اسلام سے بیزاری کا اظہار نہ کرتے تو تپتے ہوئے پتھر اُن کے سینہ پر رکھ دیتے بلکہ بعض دفعہ کوئی آدمی اُن کے سینہ پر چڑھ جاتا۔ پھر بعض کے پاؤں میں رسی باندھ کر انہیں مکہ کی گلیوں میں گھسیٹا جاتا۔ وہاں عام طور پر بارشوں کے اثر سے اپنے مکانات کو بچانے کے لئے دروازوں کے آگے بڑے بڑے پتھر رکھ دیتے تھے۔ جن کو کھنگر کہتے ہیں تاکہ بارش کی وجہ سے دیواریں خراب نہ ہوں۔ کفّار مکہ کی عادت تھی کہ وہ مسلمانوں کو جب دکھ دیتے اور اُن کی ٹانگوں میں رسی باندھ کر مکّہ کی گلیوں میں گھسیٹتے تو ان کھنگروں پر سے بھی اُن کو گھسیٹتے ہوئے چلے جاتے اور اُن کے جسم لہولہان ہو جاتے۔ ایک صحابی خباب بن ارتؓ نے جو پہلے غلام تھے اور غلامی کی حالت میں اسلام قبول کرنے کی وجہ سے اُنہیں بڑی بڑی تکالیف دی گئی تھیں ایک دفعہ فتوحات کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن سے مشرکوں کی ایذا دہی کے متعلق دریافت کیا تب انہوں نے اپنی پیٹھ سے کپڑا اُٹھایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ان کی پیٹھ کی کھال ایسی تھی جو عام انسانوں کی نہیں ہوتی۔ وہ دیکھ کر حیران ہوئے اور کہنے لگے کیا آپ کو یہ کوئی بیماری ہے؟ وہ کہنے لگے بیماری نہیں بلکہ پتھروں پر ہمیں گھسیٹا جاتا تھا اس کی وجہ سے زخم اور خراش ہو ہو کر میری پیٹھ کا چمڑا ایسا ہو گیا۔ (اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابۃ زیر عنوان خباب بن الارتؓ الطبقات الکبریٰ زیر عنوان بلال بن رباح، السیرۃ الحلبیۃ زیر عنوان استخفائہ و اصحابہ فی دار الارقم بن الارقم، الکامل فی التاریخ لابن اثیر زیر عنوان تاریخ الرسل والانبیاء)

یہ حالات تھے جو مسلمانوں پر وارد ہو رہے تھے اُدھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ حالت تھی کہ آپؐ باہر نکل کر نماز بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ حضرت اُم ہانیؓ کے مکان میں آپ چند ساتھیوں کو لے کر جمع ہوتے۔ نماز

پڑھتے اور دین کی باتیں کرتے۔ کھلے میدان میں آپ کا نمازیں پڑھنا یا دین کی باتیں کرنا بالکل ناممکن تھا۔ اسی طرح قرآن کریم کو باہر نکل کر پڑھنا یا اپنے صحن میں ہی بلند آواز سے پڑھنا۔ یہ بھی جُرم سمجھا جاتا تھا جب مصائب حد سے بڑھ گئے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہؓ آپ سے اجازت لے کر مکّہ مکرمہ سے باہر جانے شروع ہو گئے۔ (الطبقات الکبریٰ لابن سعد اذن رسول اللہ للمسلمین فی الھجرۃ الی المدنیۃ) ایک دفعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی ہجرت کا ارادہ کیا۔ وہ اپنا سامان لے کر جا رہے تھے کہ مکّہ کا ایک رئیس ابن الدغنہ انہیں ملا۔ اُس نے آپ سے پوچھا کہ آپ اسباب باندھ کر کہاں جا رہے ہیں؟ اُنہوں نے کہا کہ چونکہ اس جگہ دین کی آزادی نہیں ہے اور میری قوم دشمنی کرتی ہے اس لئے میں مکّہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اُس نے کہا وہ شہر کس طرح آباد رہ سکتا ہے جس میں سے آپ جیسا آدمی نکل جائے۔ میں آپ کا ضامن ہوں آپ باہر نہ جائیں۔ چنانچہ اُس نے اعلان کر دیا کہ (حضرت) ابوبکرؓ میری حفاظت میں ہیں۔ اہلِ عرب میں بہت بڑی خودسری پائی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود ان میں یہ خوبی تھی کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کو اپنی حفاظت اور پناہ میں لے لیتا تو پھر اُسے کوئی شخص تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا اور اگر کوئی پہنچانا چاہتا تو دُوسرے اُسے روک دیتے کہ تم ایسا مت کرو یہ فلاں شخص کی حفاظت میں ہے۔ اُس نے بھی جب اعلان کر دیا کہ ابوبکرؓ میری حفاظت میں ہے تو حضرت ابوبکرؓ اطمینان کے ساتھ مکّہ میں رہنے لگ گئے۔ ایک روز وہ اپنے صحن میں باہر نکل کر قرآن شریف پڑھ رہے تھے کہ اِن پر رقّت غالب آگئی اور اُن کے آنسو بہنے شروع ہو گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے کَانَ رَجُلًا بَکَّآءً یعنی اُن کو قرآن شریف پڑھتے وقت بہت رقّت آجایا کرتی تھی اور وہ رو پڑتے تھے۔ اُن کے قرآن شریف پڑھنے کی آواز سُن کر بچے اور عورتیں اردگرد کے گھروں سے نکل کر وہاں جمع ہو جایا کرتی تھیں۔ بچوں اور عورتوں میں خصوصیت سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ جب اُنہیں کوئی نئی چیز نظر آئے تو دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ اُن کے لئے بھی قرآن شریف بالکل نیا کلام تھا اور پھر جب کوئی بڑا آدمی رو رہا ہو تو لازمًا دوسروں کو توجہ پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے دروازوں سے لگ کر قرآن شریف سُننا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب قرآن کریم کی آواز اُن کے کانوں میں پڑی اُدھر حضرت ابوبکرؓ کی رقّت اور اُن کے گریہ کو دیکھا تو محلہ کی عورتیں بھی متاثر ہونے لگیں اور اس طرح اس محلہ میں جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رہتے تھے اسلام کا چرچا شروع ہو گیا اور عورتوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو بڑی اچھی باتیں ہیں۔ جب اُن کے خاوندوں کو علم ہوا کہ ہماری عورتیں اس طرح متاثر ہو رہی ہیں تو وہ اس رئیس کے پاس گئے جس نے انہیں اپنی حفاظت میں لیا تھا اور کہا کہ آپ نے ابوبکرؓ کو اپنی حفاظت میں لے کر یہ کیا مصیبت پیدا کر دی ہے کہ

ہماری عورتیں اور بچے قرآن سے متاثر ہوتے جا رہے ہیں اگر یہی حالت جاری رہی تو تمام محلہ مسلمان ہو جائے گا۔ پس یا تو اُسے سمجھائیں کہ وہ قرآن شریف بلند آواز سے نہ پڑھا کرے اور یا اپنی حفاظت واپس لے لیں۔ وہ رئیس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ آپ اس اس طرح کرتے ہیں جس پر محلہ والے سخت شکوہ کر رہے ہیں اور کہتے کہ اگر یہی طریق جاری رہا تو ہماری عورتیں اور بچے مسلمان ہو جائیں گے اس لئے آپ یہ کام چھوڑ دیں اور اندر بیٹھ کر قرآن شریف پڑھا کریں ورنہ مجھے اپنی حفاظت کو واپس لینا پڑے گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ اپنی حفاظت بے شک واپس لے لیں میں اللہ اور اس کے رسول کی حفاظت میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ (صحیح بخاری کتاب بنیان الکعبة باب هجرة النبی و اصحابه الی المدینة۔تاریخ الخمیس هجرة ابی بکر الی الحبشة) چنانچہ ابن الدغنہ وہاں سے آیا اور اُس نے اپنی حفاظت واپس لینے کا اعلان کر دیا۔ بعد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے بھی ہجرت کے متعلق بدل گئی اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ جب آپ کو ہجرت کی اجازت ہو اُس وقت مجھے بھی آپ اپنے ساتھ لے چلیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس امر کو منظور فرما لیا (صحیح بخاری کتاب مناقب الانصار باب هجرة النبی و اصحابه الی المدینة)۔ ان حالات میں مسلمان مکّہ کے اندر اپنی زندگی کے دن بسر کیا کرتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اگر مکہ والوں کے مظالم کی مثالیں جمع کی جائیں تو وہ سینکڑوں کی تعداد میں نکل آئیں گی جن سے نہ صرف اُن مظالم کا پتہ لگ سکتا ہے جو اہل مکہ مسلمانوں پر کیا کرتے تھے بلکہ لوگوں کو یہ سبق بھی مل سکتا ہے کہ انہیں دین کی خاطر کس طرح قربانیوں سے کام لینا چاہیے۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا کی پیشگوئی کے مطابق مسلمانوں کے لئے ہجرت کا پہلا مقام اس زمانہ میں جب مسلمان انتہائی تکلیف میں اپنی زندگی بسر کر رہے تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا یقیناً یقیناً جو مسلمان اور مُتقی ہیں اُن کی مکروہات ایک دن دور ہو جائیں گی اور وہ تکلیف دہ باتیں جو آج پیدا ہو رہی ہیں خدا اُن سب کو مٹا دے گا اور وہ جگہیں اُن کو حاصل ہوں گی جہاں مکروہات اُن کے قریب بھی نہیں پھٹکیں گی۔ جہاں کامیابی اُن کے پاؤں چومے گی اور جہاں آرام اور آسائش کے دروازے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے لئے کھول دیئے جائیں گے چنانچہ پہلے خدا نے حبشہ کو مَفَاز بنایا۔ مسلمان وہاں ہجرت کر کے گئے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے ہر قسم کے سامانِ راحت بہم پہنچا دیئے۔ یہ سورۃ چونکہ ابتدائی مکّی سورتوں میں سے ہے اس لئے حبشہ کی ہجرت سے بھی پہلے کی ہے۔ حبشہ کی ہجرت ۵ نبوی کے نصف میں ہوئی (الکامل فی التاریخ لابن اثیر زیر عنوان ذکر الھجرۃ الی ارض الحبشة) اور یہ سورۃ پہلے دو تین سال کی ہے پس اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا کے مطابق پہلا مقامِ فوز جو مسلمانوں کے لئے

ظاہر ہوا وہ حبشہ ہے۔ چنانچہ حبشہ میں خدا تعالیٰ کی نصرت اور اس کی تائید کا کیسا زبردست نشان ظاہر ہوا۔ دشمن نے چاہا کہ حبشہ پہنچ کر بھی مسلمانوں کو مبتلائے آلام کرے اور اُنہیں اس ملک میں بھی آرام اور چین سے نہ رہنے دے۔ مگر وہ خدا جس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ متقیوں کو ہر قسم کی مکروہات سے بچا کر ایسے مقام پر لے جائے گا جو اُن کے آرام اور سکون کا موجب ہوگا اُس نے کفّارِ مکّہ کو اپنی اس کوشش میں ناکام کیا اور مسلمان اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق حبشہ میں نہایت آرام اور عزت کے ساتھ رہے۔ چنانچہ تاریخوں میں آتا ہے جب مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گئے تو عمرو بن العاص اور مکہ کا ایک اور رئیس عبداللہ ابن ابی ربیعہ دونوں حبشہ گئے۔ ان کو مکّہ والوں نے اس غرض کے لئے مقرر کیا تھا کہ تم جاؤ اور حبشہ کے بادشاہ سے یہ عرض کرو کہ یہ لوگ ہمارے بھاگے ہوئے غلام ہیں اگر آپ ان کو پناہ دیں گے تو ہمارے تعلقات آپ سے اچھے نہیں رہیں گے۔ یہ لوگ حبشہ گئے اور اپنے ساتھ وہ بڑے بڑے تحفے بھی لے گئے جو اُن کی قوم کے لوگوں نے بادشاہ اور اُس کے وزراء اور پادریوں وغیرہ کے لئے دیئے تھے اور کہا تھا کہ یہ تحفے بادشاہ کو دینا۔ یہ وزراء کے سامنے پیش کرنا اور یہ پادریوں وغیرہ کو دینا۔ چنانچہ یہ لوگ بڑی شان کے ساتھ حبشہ پہنچے اور ہر ایک کے سامنے انہوں نے تحائف پیش کئے پہلے تو بادشاہ نے بڑا اعزاز کیا مگر جب انہوں نے تجویز پیش کی کہ یہ لوگ ہمارے ملک میں سے بھاگے ہوئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ واپس بھیج دیا جائے اور اس کی سفارش بادشاہ کے وزراء نے بھی کی۔ مگر بادشاہ نے کہا۔ کہ جب تک وہ مسلمانوں کو بلا کر اُن کے حالات دریافت نہ کرلے وہ کسی کو اپنے ملک سے نہیں نکال سکتا۔ چنانچہ بادشاہ نے مسلمانوں کو بلوایا اور پوچھا کہ آپ لوگوں کے کیا عقائد ہیں؟ تب مسلمانوں کے نمائندہ جعفر بن ابی طالب نے قرآن کریم کی چند آیات پڑھیں جن میں اسلامی عقائد کا ذکر آتا تھا اور یہ بھی کہ مسلمان حضرت مسیحؑ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں بادشاہ نے وہ آیات سن کر کہا کہ میں تو ان عقائد میں کوئی بری بات نہیں دیکھتا۔ دوسرے دن پھر دونوں سردارقریش دربار میں آئے اور کہا کہ اے بادشاہ! یہ مسلمان مسیح کی ہتک کرتے ہیں تب اُس نے مسلمانوں کو طلب کیا اور اُن کا جواب سُننے پر دربار میں اُس نے ایک تنکا اُٹھایا اور اُسے اُٹھا کر کہنے لگا جو کچھ ان لوگوں نے حضرت مسیحؑ کے متعلق بیان کیا ہے مَیں اُس سے ایک تنکے کے برابر بھی مسیحؑ کو زیادہ نہیں سمجھتا اُن کا وہی رتبہ سمجھتا ہوں جو انہوں نے بیان کیا ہے۔ اِس پر اُس کے درباری بہت چیں بجبیں ہوئے۔ لیکن بادشاہ نے کہا جب میرا باپ مرا تھا مَیں بچہ رہ گیا تھا۔ تم لوگوں نے میرے چچا کے ساتھ مل کر چاہا کہ اس حکومت پر قبضہ کرلو۔ تب خدا نے اپنے فضل سے مجھے طاقت بخشی اور اُس نے تم کو شکست دے کر مجھے اس تخت پر بٹھا دیا۔ جس خدا نے مجھ کو اس بیکسی کی حالت میں بادشاہت کے تخت پر بٹھا دیا اور

میرے دشمنوں کو ناکام ونامراد کیا اُس خدا کی نصرت پر مجھے آج بھی یقین ہے اور آج جب مجھے اُس نے طاقت بخشی ہے مَیں یہ بے شرمی نہیں کر سکتا کہ اُس کے مظلوم بندوں کی مدد نہ کروں۔ اگر تم سارے اُس کو برا بھی مناؤ تب بھی مَیں اُن کو یہاں سے نہیں نکالوں گا۔ چنانچہ سردارانِ قریش جو تحفے لائے تھے ان کو وہ واپس کر دیئے گئے اور وہ ناکام ونامراد واپس لوٹے (تاریخ خمیس ھجرۃ ابی بکر الی الحبشۃ) غرض اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ مَفَازًا (یعنی متقیوں کو کامیابی اور نجات کا مقام ملنے والا ہے) کا نہایت ہی شاندار نظارہ صحابہؓ نے وہاں دیکھا اور انہوں نے اس خدائی وعدہ کو پورا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کو ایسی جگہ دے گا جہاں مکروہات سے یہ لوگ نجات پا جائیں گے اور آرام اور راحت کو دیکھیں گے۔ پھر دوسرا نظارہ اس کا مدینہ میں نظر آیا جبکہ مسلمان وہاں گئے اور اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے لوگوں کی توجہ مسلمانوں کی طرف پھیر دی۔ ابتداء میں صرف چند لوگ مکہ میں حج کے لئے آئے تھے کہ انہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خبر پہنچی اور وہ آپ پر ایمان لے آئے۔ دوسرے سال بعض اور لوگ مدینہ کے حاجیوں میں سے ایمان لے آئے۔ اور انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں تیسرے سال ایک وفد ۷۲ آدمیوں پر مشتمل بھیجا جس نے یہ اقرار کیا کہ مدینہ میں آپؐ پر اور آپ کے ساتھیوں پر اگر کوئی دشمن حملہ کرے گا تو ہم اُس سے لڑیں گے اور آپ کی حفاظت کریں گے۔ چنانچہ اس معاہدہ کے مطابق رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ مدینہ میں تشریف لے گئے (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام زیر عنوان بدء اسلام الانصار) حبشہ میں جو مسلمان ہجرت کر کے گئے تھے وہ بھی اس دوران میں واپس آ کر مدینہ پہنچ گئے۔ اسی لئے وہ اصحاب الھجرتین کہلاتے ہیں یعنی دو ہجرتیں کرنے والے۔ (بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ خیبر) کیونکہ انہوں نے حبشہ کی طرف بھی ہجرت کی اور مدینہ کی طرف بھی۔ پھر مدینہ کے لوگوں نے جس جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مہاجرین کی حفاظت کی یہ تاریخ کا ایک شاندار ورق ہے اور قرآن کریم کی اس پیشگوئی کی صداقت کا ایک زبردست ثبوت ہے کہ اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ مَفَازًا یقیناً ہم متقیوں کو وہ جگہ دیں گے جہاں وہ مکروہات سے بچ جائیں گے اور کامیابیوں کا مونہہ دیکھیں گے۔ چنانچہ پہلا مَفَاز اللہ تعالیٰ نے حبشہ کو بنایا اور دوسرا مَفَاز اللہ تعالیٰ نے مدینہ کو بنایا۔ ابتدائی سالوں کی تمام اسلامی تاریخ اسی آیت کی تشریح ہے۔ حبشہ کا سفر اور مدینہ کے ابتدائی ایام کی تاریخ سب کی سب اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ مَفَازًا والی پیشگوئی کے پورا ہونے کا ایک نہایت ہی روشن اور زبردست ثبوت ہے۔

اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ مَفَازًا میں کی ہوئی پیشگوئی کے مطابق مسلمانوں کے لئے دوسرا نجات کا مقام

دوسرے معنے اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ مَفَازًا کے یہ ہیں۔ کہ متقیوں کو ہم کامیاب و بامراد کریں گے۔ یہ معنے بھی

مدینہ منوّرہ میں پورے ہوئے۔ اور پھر صرف مدینہ منوّرہ ہی نہیں بلکہ مدینہ منورہ کے بعد سارا عرب اور پھر ساری وسطی دنیا اس پیشگوئی کی صداقت کا ایک نشان تھی کہ کس کس طرح یہ لوگ بامراد ہوئے اور کس کس طرح انہوں نے کامیابیاں حاصل کیں۔ ہر قوم جو اُن کے مقابلہ میں اُٹھی اُسے شکست ہوئی۔ ہر طاقت جو مسلمان سے ٹکرائی وہ ذلیل ہوئی۔ قیصر و کسریٰ کے خزانے فتح ہوئے اور وہ ان مسلمانوں کو ملے۔ مدینہ منورہ ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں گھر میں بھی باامن طور پر رہنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ چنانچہ اسی لئے مسلمان یہود سے مختلف معاہدات کرتے رہے تا کہ وہ غداری نہ کریں اور مسلمانوں کے ضعف کا موجب نہ بنیں۔ مگر وہ چھوٹی سی بستی ایک دن ساری دنیا کا مرکز بن گئی۔ اگر مدینہ منورہ سے کوئی حکم نکلتا تھا تو ساری دُنیا کانپ اُٹھتی تھی۔ اور وہ سمجھتی تھی کہ اس حکم کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر مدینہ منورہ ہی وہ بستی تھی جہاں ایک دن قیصر و کسریٰ کے خزائن آئے اور مسلمانوں میں تقسیم ہوئے یہاں تک کہ اسی مدینہ میں کسریٰ کے سونے کے کنگن ایک صحابی سراقہ بن مالکؓ کے ہاتھوں میں پہنائے گئے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک دفعہ ہجرت کے سفر میں اُن سے کہا تھا میں تمہارے ہاتھ میں سونے کے کنگن دیکھتا ہوں۔ جب کسریٰ کی حکومت تباہ ہوئی اور اُس کے سونے کے کنگن مدینہ میں آئے تو حضرت عمرؓ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اس پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے جبری طور پر اس صحابی کے ہاتھ میں سونے کے کنگن ڈالے (الاصابہ فی تمییز الصحابة الجزء الثالث ذکر سراقة بن مالک) اب کجا مدینہ منورہ جو ایک چھوٹی سی بستی تھی اور کجا کسریٰ کے سونے کے کنگن جو ایک غریب صحابی کے ہاتھوں میں پہنائے گئے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ مَفَازً کا لفظ ہلاکت سے نجات کی جگہ کے معنوں کے رُو سے تو حبشہ اور مدینہ پر صادق آتا ہے لیکن دوسرے معنوں یعنی کامیابی کے معنوں کے رُو سے مدینہ ہی مَفَاز ثابت ہوا۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا تو اس کے معنے یہ تھے کہ میں تم کو مدینہ منورہ دینے والا ہوں جو مقام فوز ہے اور اس آیت میں گو ہجرت اُولیٰ کی بھی پیشگوئی تھی مگر زیادہ وضاحت اور شان سے ہجرت ثانیہ کی پیشگوئی تھی۔

ایک یوروپین مصنف مدینہ کی اس حالت کو دیکھ کر ایسا متاثر ہوا ہے کہ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے تم کچھ کہہ لو محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں کو۔ لیکن میں تو جب یہ بات دیکھتا ہوں کہ مدینہ میں ایک چھوٹی سی مسجد میں جس پر کھجور کی ٹہنیوں کی چھت پڑی ہوئی ہے جب بارش ہوتی ہے تو اس میں سے پانی ٹپک پڑتا ہے نماز پڑھتے ہیں تو اُن لوگوں کے گھٹنے اور ماتھے کیچڑ سے لت پت ہو جاتے ہیں۔ اُس مسجد میں ننگی زمین پر بیٹھے ہوئے ایسے آدمی جن کے نہ سروں پر ٹوپیاں ہیں نہ اُن کے تن پر پورا لباس ہے دنیا کو فتح کرنے کا مشورہ کر رہے ہیں اور وہ اس یقین اور

وثوق کے ساتھ یہ باتیں کرتے ہیں کہ گویا دنیا کو فتح کرنا ان کے لئے معمولی بات ہے کیونکہ اُن کے نزدیک یہ خدا کا وعدہ ہے جو کبھی ٹل نہیں سکتا۔ اور پھر وہ ایسا ہی کر کے دکھا دیتے ہیں۔ تو اس بات کو دیکھ کر میرا دل یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ مَیں ان کو جھوٹا اور فریبی کہوں تو اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا میں جو پیشگوئی کی گئی تھی کہ مسلمانوں کو وہ مقام ملے گا جو ان کی کامیابیوں اور فتوحات کا مرکز ہوگا۔ پہلے وہ انہیں مکروہات سے نجات دلائے گا اور پھر اُن کو کامیابیوں اور فتوحات سے حصہ دے گا۔ اس پیشگوئی کا نظارہ مدینہ منورہ سے بڑھ کر اور کہیں نظر نہیں آ سکتا۔ مدینہ منورہ سے بڑھ کر اور کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جو ایسا مرکز بنا ہو جیسے مدینہ اسلام کا مرکز بنا۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ لنڈن اور برلن اور پٹس برگ وغیرہ بھی بڑے بڑے مرکز ہیں ان کے مقابلہ میں مدینہ کی مرکزی حیثیت کس طرح پیش کی جا سکتی ہے مگر وہ کہنے والا یہ نہیں سمجھتا کہ یہ مقامات وہ ہیں جنہیں پہلے سے طاقت حاصل تھی۔ مگر مدینہ وہ مقام تھا جسے کوئی طاقت حاصل نہیں تھی مگر پھر بھی وہ ساری کامیابیوں کا مرکز بن گیا اور اس زمانہ کی پیشگوئی کے مطابق بنا جب مسلمانوں کے لئے سر چھپانے کی جگہ بھی نہ تھی۔

حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا ﴿۳۳﴾

(یعنی) باغات اور انگور۔

حل لغات۔ حَدَآئِقَ حَدِيْقَةٌ کی جمع ہے اور اَلْحَدِيْقَةُ کے معنے ہیں اَلْبُسْتَانُ يَكُوْنُ عَلَيْهِ حَائِطٌ وہ باغ جس کے اردگرد دیوار ہو۔ (اقرب)

اَعْنَاب اَعْنَابٌ عِنَبٌ کی جمع ہے اور عِنَبٌ کے معنے انگور کے ہوتے ہیں یعنی انگور کے پھل کو عربی زبان میں عِنَبٌ کہتے ہیں اور كَرْمٌ انگور کی بیل کو کہا جاتا ہے لیکن عِنَبٌ انگور کو اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ وہ تازہ ہو اگر وہ خشک ہو جائے تو اُسے زَبِيْب کہتے ہیں (اقرب) نیز عِنَبٌ شراب کو بھی کہتے ہیں (اقرب) کیونکہ عنب سے ہی شراب بنتی ہے۔ دراصل کسی چیز کا جب کسی دوسری چیز میں کوئی غالب اثر پایا جائے تو اُس کا نام بعض دفعہ اُسی کے نام پر رکھ دیتے ہیں۔ عِنَب سے چونکہ خَمْر بنتی ہے اس لئے عربی زبان میں عِنَب کے ایک معنے خَمْر کے بھی کئے جاتے ہیں۔

تفسیر۔ حَدَآئِق بدل ہے مَفَازًا کا۔ لیکن میرے نزدیک یہ بدلِ کُل نہیں بلکہ بدل اشتمال ہے یعنی کچھ

جُزئیات اس کی بتائی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ متقیوں کو جو مَفَازًا حاصل ہوگا اس کی کچھ تشریحات ہم تم کو بتاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ متقیوں کو حَدَائِق یعنی باغات ملیں گے۔ حَدَائِق حَدِیْقَۃٌ کی جمع ہے اور یہ حدیقے مکہ میں نہیں ہوتے مدینہ میں ہی ہوتے ہیں گویا ان الفاظ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا نقشہ کھینچ دیا کیونکہ حَدَائِق مدینہ میں ہوا کرتے ہیں۔ بعد میں بے شک ساری دنیا ہی مسلمانوں کے لئے حَدِیْقَۃ بن گئی۔ لیکن جہاں تک ظاہری الفاظ کا سوال ہے یہ نقشہ مدینہ پر ہی چسپاں ہوتا ہے۔ لُغت کے لحاظ سے حَدِیْقَۃ اُس باغ کو کہا جاتا ہے جس کے اردگرد دیوار ہو (اقرب) اور مدینہ میں اس کا عام رواج تھا۔ چنانچہ حدیثوں میں آتا ہے کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران: ۹۳) تو ابوطلحہؓ انصاری نے سب سے پہلے اپنا حَدِیْقَۃ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ مجھے اَحَبُّ الْمَال یہ حَدِیْقَۃ ہے۔ (بخاری کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ لن تنالوا البر حتی۔۔۔و ترمذی جلد دوم کتاب التفسیر باب من سورۃ ال العمران)

حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا کے الفاظ سے مقامِ نجات کی تعیین اسی طرح حضرت ابوھریرہؓ کی ایک روایت میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک دفعہ بعض اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک حضور اُٹھ کر چلے گئے جب آپ کو واپس آنے میں دیر ہوگئی تو میرے دل میں سخت گھبراہٹ پیدا ہوئی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اتنی دیر کیوں لگا دی ہے ایسا نہ ہو کہ کسی دشمن نے آپ کو نقصان پہنچایا دیا ہو۔ چنانچہ میں آپ کی تلاش میں انصار کے ایک حَدِیْقَۃ کی طرف چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُس حَدِیْقَۃ کا پھاٹک بند کر لیا تھا۔ کیونکہ حضرت ابوھریرہ کہتے ہیں جب مجھے اس باغ کے اندر جانے کا اور کوئی راستہ نہ ملا تو میں اُس کی نالی میں سے اندر داخل ہوا جیسے لُومڑ کسی تنگ جگہ میں سے اندر داخل ہوتا ہے (مسلم کتاب الایمان باب من مات علی التوحید دخل الجنۃ قطعا) غرض حَدَائِق کا رواج مدینہ والوں میں زیادہ تھا۔ پس اللہ فرماتا ہے کہ اس پیشگوئی کے مطابق جو مقامِ فوز مسلمانوں کو ملنے والا ہے اس کی علامت یہ ہے کہ اس میں حَدَائِق ہوں گے اور اس میں اَعْنَاب ہوں گے۔

حدائق سے مراد مسلمانوں کی منظم حکومت حَدَائِق کہہ کر بتایا کہ اُن کا اپنا اپنا علاقہ ہوگا اور اُس پر اُنہیں قبضہ تامّہ حاصل ہوگا۔ کیونکہ حَدِیْقَۃ وہی ہوتا ہے جو دوسروں سے الگ ہو۔ اگر حَدِیْقَۃ کے اردگرد دیوار نہ ہو تو یہ شبہ رہتا ہے اِس کی سرحد کون سی ہے اور اُس کی سرحد کون سی ہے۔ پس جب مومنوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے حَدَائِق

کے لفظ کا استعمال فرمایا تو اگر اس سے وہ ساری حکومت مراد لی جائے جو مسلمانوں کو ملنے والی تھی اور یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی آئندہ حکومت کا نام اس جگہ حَدِیْقَۃ رکھا ہے تب اس کے یہ معنے ہوں گے کہ مسلمانوں کی حکومت نہایت منظم ہوگی اور اس کی سرحدیں مضبوط ہوں گی جیسے باغ کے اردگرد دیواریں ہوتی ہیں۔ اور وہ ان دیواروں کی وجہ سے محفوظ ہوتا ہے اسی طرح مسلمانوں کی حکومت منظم ہوگی اور اس کی سرحدیں مضبوط ہوں گی۔ اسی کے متعلق قرآن کریم نے دوسری جگہ ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا (آل عمران:۲۰۱) کہ اے ایماندارو صبر سے کام لو۔ اور دشمن سے بڑھ کر صبر دکھاؤ اور سرحدوں کی نگرانی رکھو یعنی مسلمان حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنی سرحدوں کو مضبوط رکھے اور وہاں حفاظت اور نگرانی کے لئے اپنی فوجوں کو مقرر کرے تاکہ اسلامی علاقہ محفوظ رہے اور غیر اسلامی حکومت کو یہ جرأت نہ ہو کہ وہ اسلامی حکومت پر حملہ کرے۔

حَدَآئِق کے لحاظ سے ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اِنَّ لِکُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا وَ اِنَّ حِمَى اللّٰہِ مَحَارِمُهٗ کہ ہر بادشاہ کی ایک رَکھ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رَکھ اُس کے محارم ہیں۔ آپ نے فرمایا جو شخص بادشاہ کی رکھ کے قریب اپنے جانور کو چراتا ہے وہ بھی غلطی کرتا ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت اُس کا جانور بادشاہ کی رَکھ میں چلا جائے اور وہ نقصان اُٹھائے (بخاری کتاب الایمان باب فضل من استبرا الدینه) پس ایک معنے اس کے یہ ہوں گے کہ مومن اپنے اعمال کی حد بندی کرتا ہے وہ حرام اور حلال میں امتیاز کرتا ہے اور چونکہ متقی کا کام یہ ہوتا ہے کہ حلال اور حرام میں تمیز کرے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ان نعمتوں کا نام جو وہ مومنوں کو دے گا حَدِیْقَۃ رکھ دیا۔ یعنی جس طرح اُس نے فرق کیا اور خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے حلال اور حرام میں امتیاز روا رکھا اسی طرح خدا مومن اور غیر مومن میں امتیاز کرے گا اور اُسے انعام کے طور پر حَدَآئِق عطا فرمائے گا اور اس نسبت سے کہ سچا تقویٰ انسان کے لئے غذا کا بھی کام دیتا ہے اور پھل کا کام بھی دیتا ہے اور نشۂ محبت الٰہی بھی پیدا کرتا ہے اس کا نام اَعْنَاب رکھ دیا کیونکہ اتّقا میں یہ ساری شرطیں ہوتی ہیں۔ ایک طرف وہ مومن کی روحانی غذا ہوتا ہے جس سے وہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہے۔ دوسرے جسے سچا تقویٰ میسر آجاتا ہے وہ آئندہ ایک لمبے زمانہ تک دنیا میں نیک تبدیلی پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے جیسے ذخیرہ خور غذا دیر تک رہتی اور انسان کے کام آتی ہے اسی طرح تقویٰ ایک لمبے زمانہ تک دنیا کے کام آتا ہے گویا ایک طرف وہ انسان کو اپنی ذات کے لئے تازہ بتازہ پھل کا کام دیتا ہے اور دوسری طرف آئندہ کے لیے بھی ذخیرہ کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہیں میں نے صادق کو ترک کئے ہوئے اور اس کی نسل میں سے کسی کو ٹکڑے مانگتے نہیں دیکھا (زبور ۳۷ آیت ۲۵) گویا اِتقا کیا ہے ایک

ذخیرہ خور غذا ہے جو نہ صرف اس کو فائدہ پہنچاتی ہے بلکہ اس کی آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی فائدہ پہنچاتی ہے پھر تقویٰ محبت الٰہی پیدا کرنے کا بھی موجب ہے جیسے عِنَب میں سے شراب نکلتی ہے اسی طرح تقویٰ کے ذریعہ محبت الٰہی پیدا ہوتی ہے جیسے شراب پی کر انسان مست ہو جاتا ہے اور اُسے کسی خیر و شر کی پروا نہیں رہتی۔ نہ اسے کسی نقصان سے ڈر آتا ہے اور نہ کسی خیر کے حصول کی خواہش اُس کے دل میں رہتی ہے محض ایک مستی ہوتی ہے جو شراب کی وجہ سے اُس کے دماغ میں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ نہ کسی خوف سے کام کرتا ہے اور نہ کسی لالچ سے۔ ایک رستہ ہوتا ہے جس پر وہ اس نشہ کی حالت میں چل پڑتا ہے۔ اسی طرح جب کسی شخص کے دل پر محبت الٰہی غالب آ جائے تو اس نشہ میں وہ ایسا چور ہو جاتا ہے کہ وہ نہ دوزخ کے ڈر کے مارے خدا سے تعلق رکھتا ہے اور نہ جنت کی لالچ اُسے نیکیوں پر آمادہ کرتی ہے۔ ڈر اور لالچ کی قسم کے تمام احساسات اُس کے دل سے مٹ جاتے ہیں اور وہ خدا سے محض خدا کی رضا کے لئے محبت کرتا ہے گویا وہ یہ نہیں چاہتا کہ میں دوزخ سے بچ جاؤں وہ یہ نہیں چاہتا کہ میں جنت میں داخل ہو جاؤں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو جائے۔

جنت میں حدائق و اعناب ملنے میں حکمت

پس تقویٰ بھی ایک مستی پیدا کر دیتا ہے جیسے اَعْنَاب سے جو خمر تیار ہوتی ہے وہ انسان کو مست بنا دیتی ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ سے ایک دفعہ سوال کیا گیا کہ آپ جب اللہ تعالیٰ سے ملیں گے تو اُسے کیا کہیں گے انہوں نے کہا کہ میں تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے یہ کہوں گا کہ خدایا مجھے نہ جنت کی خواہش ہے نہ دوزخ کا خوف ہے۔ مَیں تو یہ چاہتا ہوں کہ تُو مجھے جہاں رکھنا چاہتا ہے وہاں رکھ دے۔ اگر دوزخ میں ڈالنا چاہتا ہے تو دوزخ میں ڈال دے اور اگر جنت میں لے جانا چاہتا ہے تو جنت میں لے جا۔ مجھے تو تیری رضا کی ضرورت ہے (تذکرۃ الاولیاء باب چہل وسوم ذکر جنید بغدادی) یہ مستی کی ہی علامت ہے نہ اچھی بات کی خواہش رہے اور نہ بُری بات کا ڈر ہے۔ ایک ہی غرض سامنے رہے کہ میرا محبوب مجھ سے راضی ہو جائے۔ غرض اَعْنَابًا کا ذکر اس لحاظ سے کیا گیا ہے کہ اَعْنَاب ہی وہ پھل ہے کہ پینے کے کام بھی آتا ہے اور میوہ کے کام بھی آتا ہے اور خشک کر کے غذا کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ پس اسے خاص طور پر قرآن کریم نے مثال کے طور پر چُنا ہے یہ بتانے کے لئے کہ ایمان کی بھی یہی مثال ہوتی ہے کہ وہ بشاشت بھی بخشتا ہے وہ لذت بھی بخشتا ہے اور وہ طاقت بھی بخشتا ہے۔ اسی طرح یہ تینوں چیزیں تقویٰ میں بھی پائی جاتی ہیں کہ وہ غذا بھی ہے۔ وہ ذخیرہ خور غذا بھی ہے اور وہ عشق الٰہی بھی پیدا کرتی ہے یعنی خمر والی حالت بھی اس میں پائی جاتی ہے مگر خمر تو انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے یہ وہ نشہ ہے جو عقل کو تیز کرتا ہے۔ البتہ یہ مشابہت ضرور پائی جاتی ہے کہ جس طرح خمر انسان کو مست بنا دیتی

ہے اسی طرح تقویٰ اور ایمان کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی محبت میں مست ہو جاتا ہے۔

وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۴﴾

اور ہم عمر نو جوان عورتیں۔

حل لغات۔ كَوَاعِب كَوَاعِبَ كَاعِبَةٌ کی جمع ہے اور كَاعِبَةٌ کے معنے ہوتے ہیں اَلنَّاهِدُ جوان لڑکی۔ (اقرب)

اَتْرَابٌ اَتْرَابٌ تِرْبٌ کی جمع ہے اور تِرْبٌ اس کو کہتے ہیں جو کسی کا ہم عمر ہو۔ اکثر استعمال اس کا مؤنث میں ہوتا ہے۔

کہتے ہیں هٰذِهٖ تِرْبُ فُلَانَةٍ اِذَا كَانَتْ عَلٰى سِنِّهَا (اقرب) یہ فلاں عورت کی تِرب ہے جبکہ وہ اس عورت کی ہم عمر ہو۔ پس كَوَاعِب کے معنے ہوئے۔ نو جوان عورتیں۔ اور اَتْرَاب کے معنے ہوئے۔ ہم عمر عورتیں۔ کیونکہ عربی زبان کے لحاظ سے اَتْرَابًا میں مرد اور عورت کا مقابلہ نہیں ہوتا یعنی یہ مطلب نہیں ہوتا کہ فلاں مرد کے ہم عمر عورت۔ بلکہ اَتْرَاب کے معنے ہوتے ہیں آپس میں ہم عمر عورتیں یعنی اَتْرَاب میں ہم عمر ہونے کے جو معنے ہیں اُن کی نسبت عورتوں کے لحاظ سے ہے یعنی عورت عورت کی ہم عمر ہو۔ مردوں اور عورتوں میں یہ نسبت نہیں۔ چنانچہ تاج العروس میں سیوطی کا قول درج ہے۔

’’اَلْاَتْرَابُ: اَلْاَسْنَانُ۔ لَا يُقَالُ اِلَّا لِلْاِنَاثِ وَيُقَالُ لِلذُّكُوْرِ اَلْاَسْنَانُ وَالْاَقْرَانُ وَاَمَّا اللِّدَاتُ فَاِنَّهٗ يَكُوْنُ لِلذُّكُوْرِ وَلِلْاِنَاثِ وَقَدْ اَقَرَّهٗ اَئِمَّةُ اللِّسَانِ عَلٰى ذَالِكَ‘‘ (تاج)

یعنی عربی زبان میں جب مردوں کی ہم عمری کا ذکر ہو تو اَقْرَان اور اَسْنَان کا ذکر کرتے ہیں۔ اور جب عورتوں کے آپس میں ہم عمری کا ذکر ہو تو اَتْرَاب کہتے ہیں اور مؤنث و مذکر دونوں کا ہو تو لِدَات۔ چنانچہ تما ائمہ لغت اس بات کی تائید کرتے ہیں پس كَوَاعِبَ اَتْرَابًا کے معنے ہوئے آپس میں ہم عمر جوان عورتیں۔

تفسیر۔ **مومنوں کو کواعب واتراب ملنے کا مطلب** اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قوم میں کام کی حقیقی روح تبھی پیدا ہوتی ہے جب ایک حد تک اُن میں خیالات کا اور جوش کا اور ہمت کا توازن قائم ہو۔ کسی قوم میں اگر بعض لوگ بہت بڑے شاندار کارنامے سرانجام دینے والے ہوں اور باقی لوگ

اس معیار کے نہ ہوں تو وہ قوم کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کرسکتی۔ بڑی کامیابی کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ قوم کا عام معیارِ اخلاق ایک ہو۔ اگر قوم کا ایک فرد آسمان پر ہو اور دوسرا زمین پر تو وہ کبھی اپنی قوم کے لئے اتنے مفید ثابت نہیں ہو سکتے جتنے مفید وہ ساٹھ ستر فیصدی افراد ہو سکتے ہیں جو مثلاً ایک ایک گز زمین سے اُونچے ہوں کیونکہ گو وہ آسمان والے کے مقابلہ میں بہت نیچے ہوں گے مگر سب کا معیار یکساں ہوگا۔ اگر دس افراد دو دو فٹ بھی اُونچے ہوں تو وہ اُن دس افراد سے زیادہ مفید ہوں گے جن میں سے ایک آسمان پر ہو اور نو زمین پر۔ پس کَوَاعِبَ اَتْرَابًا میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ ایسی برکتیں دے گا کہ جب وہ مقام مفاز میں پہنچیں گے تو ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہوگی کہ ان کی عورتوں کا دینی معیار بھی اُونچا ہو جائے گا اور پھر وہ اس معیار میں ایک دوسری کے برابر ہوں گی۔ غرض کَوَاعِب میں اُن کے معیار کے اونچا ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی عورتوں کا دینی معیار بلند ہوگا اور سب میں جوش اور جوانی اور بلندی پائی جائے گی۔ اور اَتْرَابٌ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اُن کی ترقی قومی ترقی ہوگی انفرادی نہیں۔ یعنی سب میں یہ جوش ایک دُوسرے سے ملتا جلتا پایا جائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ چند عورتوں میں تو جوش وخروش بے انتہاء ہو اور باقی اپنے فرض سے غافل ہوں بلکہ سب عورتوں میں ملتا جُلتا دینی جوش پایا جائے گا اور وہ سب کی سب دین کی ترقی کے لئے ایک جیسی قربانی کرنے کے لئے تیار رہیں گی چنانچہ اسلامی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو کثرت سے ایسی عورتوں کی مثالیں نظر آتی ہیں جنھوں نے جنگوں میں بہت بڑی جرأت اور ہمت کا ثبوت دیا۔ مہاجرین کی بیویوں کو ہم دیکھتے ہیں تو اُن میں بھی ہمیں یہ شان نظر آتی ہے اور انصار کی بیویوں کو دیکھتے ہیں تو اُن میں بھی ہمیں یہ شان نظر آتی ہے۔ ہزار ہا عورتیں ایسی ہیں جن کا تاریخوں میں ذکر آتا ہے اور جنھوں نے مختلف مواقع پر کَوَاعِبَ اَتْرَابًا ہونے کی ایسی شان دکھائی کہ آجکل کے مرد بھی اُن کے مقابلہ میں ہیچ نظر آتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کَوَاعِب کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو جسمانی اور روحانی دونوں حالتوں پر دلالت کرتا ہے مگر ایسے لفظ کے لانے میں حکمت یہ تھی کہ یہاں وہ مضمون بیان کئے جا رہے تھے ایک وہ مضمون تھا جس کا قیامت سے تعلق تھا اور ایک وہ مضمون تھا جس کا اس دنیا سے تعلق تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا لفظ استعمال فرمایا جو دونوں مقامات پر چسپاں ہوسکتا ہے قیامت کے معنے اگر لئے جائیں تب بھی یہ لفظ ٹھیک ہے کیونکہ جنت میں ہر آدمی جوان ہونے کی حالت میں داخل کیا جائے گا۔ حدیثوں میں آتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک بوڑھی عورت آئی۔ معلوم ہوتا ہے اُسے بے وقت بات کرنے کی عادت تھی اُس نے آتے ہی

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کرے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم غالباً اور گفتگو میں مصروف تھے اِس لئے اُسے مذاقاً مختصر طور پر جواب دیا کہ جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہیں جائے گی۔ وہ یہ سنتے ہی رونے اور چیخنے چلّانے لگی اور اسی حالت میں واپس ہوگئی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ میں سے کسی کو بُلا کر فرمایا کہ جاؤ اس کو کہو میرا وہ مطلب نہیں تھا جو اُس نے سمجھا ہے بلکہ میرا مطلب تو یہ تھا کہ جنت میں جو بھی داخل کئے جائیں گے سب جوان ہو کر جائیں گے بڑھاپے کی حالت میں نہیں جائیں گے۔ (شمائل ترمذی باب ما جاء فی صفۃ مزاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

کواعب اور اتراب سے مراد مسلمان عورتیں اور واقعہ میں وہ مقام جو دائمی سرور کا ہے وہاں اگر بڑھاپے کی حالت میں کوئی شخص چلا جائے تو جنت دوزخ سے بدتر بن جائے۔ آدمی تو ساٹھ اسی سو سال تک بوڑھا ہو جاتا ہے اگر اسی طرح اس کا بڑھاپا بڑھتا چلا جائے تو دس بیس ہزار سال میں تو وہ ایسی ذلیل چیز بن جائے گا کہ اس کا لذت اٹھانا تو الگ رہا۔ وہ شاید ایک گیند کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ پس جنت کی یہ ایک ضروری شرط ہے کہ وہاں سب جوان کر کے داخل کئے جائیں گے اور ہمیشہ اسی حالت میں رکھے جائیں گے۔ اسی طرح جنت کے لحاظ سے انسان کے جو ساتھی ہوں گے یعنی بیوی بچے وہ بھی سب جوان ہوں گے لیکن جب ہم اس آیت کو دنیا پر چسپاں کریں تو پھر كَوَاعِبَ کے معنے ایسی ہی عورتوں کے ہوں گے جو حوصلہ اور جرأت اور بہادری کے لحاظ سے جوان ہوں۔ كَوَاعِبَ کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ وہ جسمانی لحاظ سے جوان ہوں گی کیونکہ اگر یہ معنے لئے جائیں تو پھر اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ كَوَاعِبَ کے یہ معنے ہوں گے کہ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ كَوَاعِبَ فِي الْاِبْتِدَاءِ یعنی متقیوں کو شروع میں جوان بیویاں ملیں گی لیکن بعد میں بوڑھی ہو جائیں گی اور یا پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ متقیوں کا فرض ہے کہ وہ جوان عورتوں سے شادیاں کریں اور جب وہ بوڑھی ہونے لگیں تو انہیں طلاق دے دیا کریں کیونکہ اُس وقت وہ كَوَاعِب نہیں رہ سکتیں اور یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ متقیوں کو جو عورتیں ملیں گی وہ کبھی بوڑھی ہی نہیں ہوں گی مگر یہ تینوں صورتیں غلط ہیں اور انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ اس جگہ روحانی معنے مراد لے جسمانی معنے مراد نہ لے کیونکہ یہاں زمانہ نہیں بتایا گیا کہ وہ فلاں عمر میں جوان ہوں گی اور فلاں عمر میں نہیں بلکہ بتایا یہ گیا ہے کہ وہ ہمیشہ كَوَاعِب رہیں گی۔ پس لازماً اس کے معنے جوان عمر ہونے کے نہیں بلکہ حوصلہ اور ہمت کے لحاظ سے جوان ہونے کے ہیں۔ پھر بتایا کہ وہ نہ صرف ہمت اور عزم اور ارادہ کے لحاظ سے جوان ہوں گی بلکہ وہ اَتْرَاب بھی ہوں گی یعنی ساری عورتیں یکساں جوان ہوں گی۔ ساری عورتیں یکساں بلند ہمت ہوں گی اور ساری عورتیں یکساں حوصلہ مند ہوں گی۔ یہ ایک بہترین انعام

ہے جو کسی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے کہ جیسے اُس قوم کے مردوں میں جوش ہو ویسا ہی اُس قوم کی عورتوں میں جوش ہو۔ جیسی چند عورتیں بہادر اور دلیر اور قوم کیلئے قربانی کا مادہ اپنے اندر رکھنے والی ہوں ویسی ہی تمام عورتیں بہادر اور دلیر اور قربانی کا مادہ رکھنے والی ہوں بلکہ ایک سے ایک بڑھ کر ہو۔ یہ حقیقی انعام ہے جس سے قومیں ترقی کیا کرتی ہیں۔ دنیا میں انسان کو بُزدلی کی طرف لے جانے والی عورت ہی ہوتی ہے مرد دین کے لئے باہر جانا چاہتا ہے تو عورت اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے تم مجھے کہاں چھوڑے جا رہے ہو تمہارے بغیر میرا کون سہارا ہے۔ پھر کبھی وہ بچوں کو اس کے سامنے لاتی ہے اور کہتی ہے اِن بچوں کو کون پوچھے گا۔ اس پر مرد کا دل بھی بے چین ہو جاتا ہے اور اس کے ارادہ میں تذلزل پیدا ہو جاتا ہے لیکن جب عورت اس کی ہمت بندھاتی ہے جب وہ اسے جرأت اور دلیری کا سبق دیتی ہے۔ جب وہ کہتی ہے کہ شاباش جاؤ اور خدا کے دین کا کام کرو تو مرد کا دل بڑھ جاتا ہے اور وہ پوری بے فکری سے دینی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ عورتیں دینی لحاظ سے بلند معیار پر قائم ہوں اور سب میں دین کا یکساں جوش اور قربانی کی یکساں روح پائی جاتی ہو۔

مسلمانوں کی عورتوں کے کواعب واتراب ہونے کے ثبوت اس جرأت اور بہادری کا نمونہ جن عورتوں نے دکھایا ان کی مثالوں سے اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے۔ انہوں نے اسی رُوح سے کام لیتے ہوئے بعض دفعہ اپنے مردوں سے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر تم میدان جنگ سے بھاگو گے تو پھر ہمارے پاس نہ آنا۔ تاریخوں میں آتا ہے کہ جب جنگ یرموک میں یک دم عیسائی لشکر نے کثیر تعداد اور بھاری سامان کے ساتھ حملہ کیا تو اسلامی لشکر مقابلہ کی تاب نہ لا کر وقتی طور پر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوا۔ اُس وقت مسلمان عورتوں نے خیمے توڑ کر اُن کی لکڑیاں ہاتھوں میں سنبھال لیں اور مسلمان سپاہیوں کے گھوڑوں کے مونہوں پر مار مار کر ان کو واپس دشمن کے لشکر کی طرف لوٹا دیا۔ ان عورتوں میں سے ایک ہند بنت عتبہ بن ربیعہ بھی تھی جو کسی زمانہ میں اسلام کی شدید ترین دشمن رہ چکی تھی۔ مسلمان پیچھے ہٹنے والے سپاہیوں میں ابوسفیان اس کا خاوند بھی شامل تھا اور معاویہ اس کا بیٹا بھی۔ چنانچہ جب لشکر بھاگتا ہوا واپس پہنچا تو ابوسفیان جو لشکر کے اس حصہ کا سردار تھا اُس کی بیوی ہند نے اس کے گھوڑے کو خیمے کی لکڑی سے مار کر واپس کیا اور کہا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مخالفت میں تو پیش پیش ہوتا تھا اب اسلام قبول کر کے میدان جنگ سے کیوں بھاگتا ہے۔ تمہارا تو یہ فرض ہونا چاہیے کہ تم نے اسلام کی شرک کی حالت میں مخالفت کی تھی اس کو دھوڈالو اور اپنی جان پر کھیل جاؤ۔ چنانچہ اُس نے اور باقی سپاہیوں نے جب یہ نظارہ دیکھا تو کہا کہ واپس لوٹو۔ دشمن کی تلواروں سے مسلمان عورتوں کے ڈنڈے زیادہ سخت ہیں۔ یہ سُن کر لشکر واپس لوٹا اور آخر

دشمن پر فتح پائی۔ (فتوح الشام للواقدی وقعۃ الیرموک تحریض النساء للمسلمین علی القتال)

پس کَوَاعِبَ اَتْرَابًا کے مطابق اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو عورتوں کا ایسا لشکر دیا جو دوسری قوموں کے مردوں سے بھی بالا تھا اور پھر ان عورتوں میں سے بھی ایک سے ایک بڑھ کر تھی۔ یہ نہیں کہ حضرت عائشہؓ تو بہادر ہوں اور حضرت زینبؓ نہ ہوں یا حضرت زینب تو بہادر ہوں مگر اسماء بنت ابی بکرؓ بہادر نہ ہوں بلکہ حضرت عائشہؓ بھی کَوَاعِبَ اَتْرَابًا کا مصداق تھیں اور حضرت زینبؓ بھی کَوَاعِبَ اَتْرَابًا کا مصداق تھیں اور اسماء بنت ابی بکر کَوَاعِبَ اَتْرَابًا کا مصداق تھیں بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں ہند جیسی عورت جو کسی زمانہ میں شدید دشمنِ اسلام رہ چکی تھی اس میں بھی یہ روح کام کر رہی تھی اور انہوں نے ایسی قربانیاں کیں جن کی کوئی حد ہی نہیں۔ اسی جنگ کا یہ واقعہ ہے کہ عیسائی لشکر کی طرف سے جب مسلمانوں پر بہت زیادہ دباؤ پڑا تو مقابلہ کرتے کرتے اسلامی لشکر بالکل تھک گیا۔ ایک رات اسلامی لشکر کے کمانڈر انچیف جو حضرت ابوعبیدہ تھے چکّر لگانے کے لئے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ اسلامی لشکر کے اردگرد دو آدمی پھر رہے ہیں اُنہیں شبہ پیدا ہوا کہ دشمن کے آدمی جاسوس کے طور پر نہ آئے ہوں چنانچہ وہ آگے بڑھے اور انہوں نے آواز دی کہ تم کون ہو! اس پر حضرت زبیرؓ آگے بڑھے اُن کے ساتھ اُن کی بیوی اسماء بنت ابی بکر بھی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ آج مسلمان چونکہ سخت تھکے ہوئے تھے اس لئے میں اور میری بیوی دونوں پہرہ کے لئے نکل کھڑے ہوئے (فتوح الشام للواقدی۔ وقعۃ الیرموک ھزیمۃ الروم)

یہ کَوَاعِبَ اَتْرَابًا کی کیسی شاندار مثال ہے اور کس طرح ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہؓ کی عورتوں میں بھی وہی جذبۂ فداکاری پایا جاتا تھا جو خود صحابہ کے اندر موجود تھا۔ پھر یہ نہیں کہ یہ جذبہ کسی خاص خاندان کی عورتوں سے مخصوص ہو بلکہ ہر عورت اسی جذبہ سے سرشار تھی اور یہی روح اُس میں کام کرتی دکھائی دیتی تھی ورنہ دنیا کے لحاظ سے کَوَاعِب کے کوئی اور معنے بنتے ہی نہیں۔ جوان لڑکی پانچ سات سال میں ہی جوانی کی عمر گزار دیتی ہے اور پھر وہ کَوَاعِب میں شامل نہیں رہتی۔ مگر یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ متقیوں کو ایسی عورتیں ملیں گی جو کَوَاعِب ہی رہیں گی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں روحانی معنے مراد ہیں جسمانی نہیں۔ بے شک اگلے جہان کے لحاظ سے جسمانی معنے ہی ٹھیک ہیں کیونکہ جنت میں اگر بوڑھے داخل ہوں یا بڑھاپا آجائے تو پھر جنت جنت نہیں رہتی۔ لیکن جب ہم اس آیت کو دنیا پر چسپاں کریں گے تو اس کے معنے ایسی عورتوں کے ہوں گے جو جوانی والی طاقتیں اپنے اندر رکھتی ہوں کیونکہ دنیا میں انسانی جسم بہرحال نڈھال ہو جاتا ہے۔ اور عمر کی زیادتی کے ساتھ بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن روحانی طاقتیں اگر انسان ان کو ترقی دینا چاہے تو کمزور نہیں ہوسکتیں۔ پس بڑی بات یہ

ہے کہ قوم کی عورتیں کَوَاعِبَ اَتْرَابًا کی مصداق ہوں۔

کواعب کے لفظ سے مسلمان عورتوں کی ذاتی جوانی اور لفظ اتراب سے قومی جوانی کی طرف اشارہ

کَوَاعِب کالفظ ذاتی جوانی پر دلالت کرتا ہے اور اَتْرَاب کا لفظ قومی جوانی پر دلالت کرتا ہے۔ اَتْرَاب کا لفظ بھی بتا رہا ہے کہ اس جگہ روحانی معنے ہی زیادہ موزون ہیں کیونکہ جنّت کے متعلق اَتْرَاب کے لفظ میں کوئی حکمت نہیں ہوسکتی۔ یہ لفظ دنیا سے ہی تعلق رکھتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہی قوم ترقی کرسکتی ہے جس کی ساری عورتوں کا دینی معیار بلند ہو۔ وہ جواں ہمت اور حوصلہ مند ہوں۔ وہ مصائب اور مشکلات کی پرواہ کرنے والی نہ ہوں۔ وہ دین کے لئے ہر قسم کی قربانی پر تیار رہنے والی ہوں وہ جرأت اور بہادری کی پیکر ہوں اور وہ اپنے اخلاص اور اپنے جوش اور اپنی محبت میں مردوں سے پیچھے نہ ہوں۔ یہ معنے ایسے لطیف ہیں کہ میرے نزدیک اپنی ذات میں اس بات کے مستحق ہیں کہ ان معنوں کو بار بار بیان کیا جائے۔ ان پر زور دیا جائے اور انہیں اپنی تقریر و تحریر میں بتکرار لایا جائے تا کہ معلوم ہو کہ اسلام عورتوں کو کس بلند مقام پر پہنچانا چاہتا ہے اور عورتوں میں بھی دینی روح ترقی کرے۔ اگلے جہان میں اگر ساری عورتیں ایک ہی عمر کی ہوں تو اس میں کوئی خاص لطف کی بات نہیں۔ وہ غرض کَوَاعِب کہہ کر ہی پوری ہوسکتی تھی۔ اَتْرَاب کا لفظ زائد طور پر لانا بتا رہا ہے کہ یہ بات خصوصیت سے اس دنیا سے تعلق رکھنے والی ہے۔

وَّ كَاْسًا دِهَاقًا ۝۳۵

اور چھلکتے ہوئے پیالے۔

حل لغات۔ اَلْكَاْسُ اَلْاِنَاءُ يُشْرَبُ فِيْهِ۔ وہ برتن جس میں کوئی چیز پی جاتی ہے۔ وَقِيْلَ مَادَامَ الشَّرَابُ فِيْهِ وَاِلَّا فَهِيَ زُجَاجَةٌ وَاِنَاءٌ وَقَدَحٌ اور بعض کہتے ہیں کہ کَاْس پینے کے برتن کو اس وقت کہیں گے جبکہ اس میں پینے کی چیز بھی موجود ہو ورنہ خالی برتن عربی زبان میں زُجَاجَة اور اِنَاء اور قَدَح کہلاتا ہے۔ لفظ کَاْس مؤنث ہے۔ (اقرب)

دِهَاق دھاق کا لفظ جب کَاْس کے لئے آئے تو اس کے معنے بھرے ہوئے کے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں اَلدِّهَاقُ مِنَ الْكُؤُوْسِ: اَلْمُمْتَلِئَةُ (اقرب) تو كَاْسًا دِهَاقًا کے معنے ہوئے اُنہیں ایسے پیالے ملیں گے جو لبالب بھرے ہوں گے۔

تفسیر۔ متقیوں کو لبالب بھرے ہوئے پیالے ملنے کا مطلب پہلے اللہ تعالیٰ نے اَعْنَاب کا ذکر کر کے فرمایا تھا جن سے شراب بنتی ہے۔ اب یہ بتایا کہ وہ مذکورہ بالا شرابِ معرفت میں اتنے متوالے ہوں گے کہ ان کا نشہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا اور ان کی طبیعتوں میں کہیں سیری حاصل نہیں ہوگی۔ ایک پیالہ ختم ہوگا تو دوسرا پینا شروع کر دیں گے دوسرا پیالہ ختم ہوگا تو تیسرا پیالہ شروع کر دیں گے یعنی ایک قربانی کر لیں گے تو دوسری کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ دوسری قربانی کریں گے تو تیسری کے لئے تیار ہو جائیں گے گویا محبت الٰہی کا پیالہ وہ سیر ہو کر زمین پر رکھیں گے ہی نہیں۔ ہر وقت اُن کا پیالہ بھرا ہوا رہے گا اور عشق الٰہی کے نشہ میں انہیں قربانی کی ایسی عادت پڑ جائے گی کہ کسی موقعہ پر بھی اُن کی طبیعت میں سیری نہیں ہوگی اور چونکہ اگلے جہان کی لذتیں روحانی ہوں گی گو یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی ایک جسمانی شکل بھی ہوگی مگر بہر حال چونکہ اصلی لذت روحانی ہوگی اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ان کو ایسے پیالے ملیں گے جو ہمیشہ بھرے رہیں گے اُن میں کبھی کوئی کمی نہیں آئے گی تو ان الفاظ کو جہاں اگلے جہان پر چسپاں کیا جاتا ہے وہاں اس کے معنے یہ بھی ہوں گے کہ ان کے دل محبت الٰہی سے ہمیشہ لبریز رہیں گے۔ قربانی ان کے قدم کو پیچھے نہیں ہٹائے گی بلکہ ہر قربانی کے بعد ان کا دل چاہے گا کہ ہم اور قربانی کریں اور اپنے عشق کا مظاہرہ کریں اور جب وہ دوبارہ اپنے عشق کا مظاہرہ کریں گے تو ان کے دلوں میں خواہش پیدا ہوگی کہ ہم اپنے عشق کا اب تیسرا مظاہرہ کریں اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا چلا جائے گا۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا ۚ﴿۳۶﴾

نہ تو وہ اِن (جنتوں) میں لغو باتیں سنیں گے اور نہ (ایک دوسرے کو) جھٹلانے والا کلام۔

تفسیر۔ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا کے الفاظ بیان کرنے کی حکمت چونکہ اللہ تعالیٰ نے محبت الٰہی کی مشابہت شراب سے دی تھی اور شراب میں بعض نقائص ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی ذکر فرما دیا کہ گو وہ شراب کی طرح محبت الٰہی کے نشہ میں سرشار ہوں گے مگر ہمارا اس سے یہ مطلب نہیں کہ شراب کے نقائص بھی ان میں پائے جاتے ہوں گے۔ شراب کی خرابی یہ ہے کہ اُس میں لغو بہت ہوتا ہے اسی طرح اُس میں تکذیب ہوتی ہے یعنی شرابی لغو اور فضول باتیں بھی کرتے ہیں۔ اور آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی ہیں۔ مگر فرمایا لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا وہ نہ اس میں کوئی لغو بات سنیں گے اور نہ تکذیب کی کوئی بات سنیں گے۔ لغو سے مراد

بکواس اور بے ہودہ باتیں ہیں۔ مجھے یاد ہے میں ایک دفعہ اپنے گھر میں ٹہل رہا تھا جب میں ٹہلتے ٹہلتے اس دیوار کے پاس پہنچا جو گلی کی طرف ہے تو مجھے اس وقت ایک آدمی کی آواز سنائی دی جو دوسرے شخص کا نام لے کر کہہ رہا تھا سندر سنگھا پکوڑے کھانے این یعنی سندر سنگھ کیا پکوڑے کھاؤ گے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پھر یہی فقرہ کہا۔ کچھ دیر گزری تو پھر مجھے یہی آواز آئی مگر دوسری طرف سے کوئی جواب ہی نہیں ملتا تھا۔ میں نے دیوار پر سے جھانکا تو مجھے نظر آیا کہ مسجد اقصیٰ کے پاس جو موڑ ہے جہاں نظارتوں کے دفاتر ہیں وہ ایک شخص ٹیک لگائے شراب کے نشہ کی حالت میں یہ فقرہ دوہراتا چلا جارہا ہے اور اُس کا مخاطب ساتھی اُس وقت وہاں تک پہنچ چکا تھا جہاں اُم طاہر کا مکان ہے یعنی کہنے والے سے کوئی پچاس گز کے فاصلہ پر۔ مگر وہ یہی کہتا جا رہا تھا کہ سندر سنگھ پکوڑے کھانے ہیں۔ اس طرح وہ کتنی ہی دیر وہاں پر بیٹھا یہ فقرہ دُہراتا رہا حالانکہ دُوسرا شخص اُس وقت تک غالباً دوسرے گاؤں تک پہنچ چکا ہوگا۔

جنت کی نعماء کو لغو اور کذاب سے پاک رکھے جانے سے ان کے تین فوائد کی طرف اشارہ

غرض شراب میں یہ ایک بہت بڑا نقص ہے کہ انسان لغو باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔ دُوسرا نقص اس میں یہ ہے کہ اس کے پینے والا دوسرے سے لڑنے جھگڑنے اور اُسے گالیاں دینے لگ جاتا ہے۔ کِذَّابًا کَذَّبَ کا مصدر ہے اور اس کے معنے ایک دوسرے کو جھٹلانے کے ہوتے ہیں۔ ایک کہتا ہے تُو نے یہ کہا تھا۔ دوسرا کہتا ہے مَیں نے یہ نہیں کہا تھا میں نے تو وہ بات کہی تھی۔ اس وجہ سے اُسی شرابی کا ذکر کر کے قرآن کریم فرماتا ہے لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا جنت کی نعماء خواہ شراب کے پیالوں میں ملیں۔ خواہ عشق الٰہی کی شراب کے پیالے ان کو پلائے جائیں۔ اس شراب کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں لغو نہیں ہوگا اور نہ کِذّاب ہوگا۔ لغو سے انسان کا وقت ضائع ہوتا ہے اسی لئے شراب پی کر انسان ایسی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو وقت کو ضائع کرنے والی ہوتی ہیں۔ مثلاً جوا عام طور پر شراب پی کر ہی کھیلا جاتا ہے۔ لیکن لغو نہ ہونے سے اوّل وقت ضائع نہیں ہوتا۔ دوم ذہن کام کے سوا دوسرے امور کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور توجہ کے قیام سے ترقی جلد جلد ہوتی ہے۔ جب انسان لغو امور کی طرف توجہ کرتا ہے تو چھوٹی چھوٹی باتوں میں اپنے وقت کو ضائع کر دیتا ہے اور توجہ کا اجتماع پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں لغو نہ ہو وہاں اجتماعِ توجہ خوب ہوتا ہے اور کام کی چیزوں کی طرف توجہ رہتی ہے۔ اور چونکہ اس کی عادت میں بات داخل ہو جاتی ہے کہ وہ کام کی طرف توجہ کرے۔ لغو کاموں میں حصہ نہ لے۔ اس لئے اس کے اندر غور اور فکر کی قوت بڑھ جاتی ہے اور ہر بات کی طرف توجہ کرنے کی اُسے عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ تیسرا فائدہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں ہر حصہ کام اور ہر

حصہ قوم مفید ضرورت میں لگ رہا ہوتا ہے جب انسان لغو نہیں کرے گا تو لازماً وہی کام کرے گا جو ضروری ہوگا اور جس کا مفید نتیجہ نکل سکے گا اور جب ساری قوم ایسے ہی کاموں میں حصہ لے گی جن کے مفید نتائج نکل سکتے ہوں تو قومی ترقی جلد جلد ہوگی۔ پس لغو کی طرف توجہ نہ کرنے کے تین فوائد ہیں۔ اوّل اس کے نتیجہ میں وقت ضائع نہیں ہوتا دوم ذہنوں میں مقاصد کی طرف توجہ پیدا کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے سوم اُوپر کی دو باتوں کے نتیجہ میں قوم جلد جلد ترقی کی طرف قدم اُٹھاتی ہے۔

وَلَا كِذّٰبًا: پھر شراب سے لڑائی جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے مگر یہ وہ نشۂ محبت ہے جس میں کذاب نہیں جس میں لڑائی اور جھگڑے کی کوئی صورت نہیں بلکہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی تائید اور تصدیق کرنے والا ہی ہوگا۔ کِذّاب اور تَكْذِيْب بھی قومی ترقی کی جڑ کو لغو کی طرح کاٹنے والی چیز ہے جو شخص دوسرے کی تکذیب نہیں کرتا لازمی بات ہے کہ وہ حسن ظنّی کرے گا کیونکہ تکذیب نہ کرنے کا لازمی نتیجہ حسن ظنی ہے اور جب وہ حسن ظنی کرے گا تو لازمی بات ہے کہ اس کے نتیجہ میں دلوں کو اطمینان حاصل ہوگا۔ ساری خرابی بدظنی سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان بدظنی سے کام لینے لگے تو وہ یہ بھی خیال کرسکتا ہے کہ میری بیوی نے کہیں کھانے میں زہر نہ ملا دیا ہو۔ لیکن اگر اس طرح انسان خیال کرنے لگے تو یہ دنیا ہی دوزخ بن جائے۔ اسی طرح اور بیسیوں معاملات ہیں جن میں حسن ظنی سے کام لینا پڑتا ہے اور اگر انسان شکوک وشبہات میں مبتلا رہے تو اس کے معاملات میں بیسیوں خرابیاں پیدا ہو جائیں۔ لیکن جب لڑائی جھگڑا نہ ہو اور کاموں کی بنیاد حسن ظنی پر ہو تو دلوں کو اطمینان رہتا ہے اور یہ ایک بہت بڑی قومی نعمت ہے جو حسن ظنی سے حاصل ہوتی ہے۔ پھر اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قومی تعاون حاصل ہوتا ہے جب انسان حسن ظنی سے کام لے گا تو نیکی کے کاموں میں وہ دوسروں کی مدد بھی کرے گا اور ان کے تعاون کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے گا اور اس طرح ایک دوسرے کے تعاون سے قوم میں ترقی کی روح پیدا ہوگی اگر انسان یہ خیال کرے کہ فلاں شخص تو میرا دشمن ہے تو اس کے بعد وہ اس کی مدد کے لئے کھڑا نہیں ہوسکتا لیکن اگر وہ یہ بدظنی نہ کرے اور یہی سمجھے کہ وہ میرا دوست ہے تو مشکلات کے وقت وہ اس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ پس حسن ظنی کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قومی تعاون کی رُوح اس سے ترقی کرتی ہے۔ تیسرے حسن ظنی کے نتیجہ میں اقدامِ عمل کے وقت یہ خوف نہیں ہوتا کہ دوسرے الزام لگا کر میری سکیم کو ناکام بنا دیں گے۔ بلکہ وہ دوسروں پر حسن ظنی کرتے ہوئے ہر خطرہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے مثلاً کوئی شخص مصیبت میں مبتلا ہو اور یہ سمجھے کہ اس کے ہمسائے فوراً اس کی مصیبت دور کرنے کے لئے خطرہ میں کود پڑیں گے تو جس دلیری سے وہ مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑا ہوگا اس دلیری

سے وہ شخص نہیں کھڑا ہو سکتا جو سمجھتا ہے کہ نامعلوم میرے ہمسائے اور دوست میری مدد کریں گے یا نہیں۔ پس حسن ظنی کی وجہ سے اقدام عمل کے وقت زیادہ دلیری پیدا ہو جاتی ہے اور انسان قوم کی خاطر ہر بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار رہتا ہے۔

غرض یہ تین فوائد ہیں جو حسن ظنی سے حاصل ہوتے ہیں دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ نہ جنت میں لغو ہوگا نہ ایک دوسرے پر گناہ کا الزام لگانا (الطور: ۲۴) اس جگہ تَأْثِيمٌ کی جگہ كِذَّاب کا لفظ رکھ دیا ہے یہ بتانے کے لئے کہ كِذَّاب اور تَأْثِيم ایک ہی چیز ہیں۔ كِذَّاب کے معنے ہوتے ہیں ایک دوسرے کی تکذیب کرنا اور تَأْثِيم کے معنے ہوتے ہیں ایک دوسرے پر الزام لگانا۔ پس یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں۔

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۷﴾

انہیں تیرے رب کی طرف سے بدلہ دیا جائے گا جو مناسب حال انعام [۱] ہوگا۔

الحساب العد گننا الکافی۔ کافی (اقرب) پس عَطَآءً حِسَابًا کے معنے ہوں گے (۱) ایسی عطا جو کافی ہوگی۔ (۲) ایسی عطا جو حساب میں ہو۔

تفسیر ۔ **حساب کے مطابق جزاء دیئے جانے کا مطلب** یہ تیرے رب کی طرف سے بطور جزاء کے ہوگا اور عَطَآءً حِسَابًا ہوگی عَطَآءً کا لفظ جَزَآءً کے لئے مفعول مطلق کے طور پر استعمال ہوا ہے یعنی یہ ایسی جزاء ہوگی جو حساب کے مطابق ہوگی۔ حساب کے مطابق جزاء ہونے سے بظاہر اس امر پر زور معلوم ہوتا ہے کہ وہاں حساب سے زیادہ جزاء نہیں ہوگی حالانکہ قرآن کریم کی بعض دوسری آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا رحیم ہے اور انسانی اعمال سے بہت زیادہ جزاء دیتا ہے۔ پس بظاہر یہ بات اُن آیات کے خلاف نظر آتی ہے کہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ ہم مومنوں کو ان کے کام سے زیادہ جزاء دیں گے اور دوسری جگہ یہ فرما دیا کہ حساب کے مطابق جزاء ہوگی۔

حساب کے مطابق ملنے سے مراد ضرورت کے مطابق ملنے کے اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کے حساب کے معنے حساب کے مطابق کے علاوہ اور بھی ہوتے ہیں چنانچہ حساب کے ایک معنے گننے کے بھی ہوتے ہیں اور کافی کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) یعنی ایسی چیز جس سے ضرورت پوری ہو جائے پس عَطَآءً حِسَابًا کا یہ مطلب ہوا کہ ایسی عطا جس سے انسان کی ہر ضرروت پوری ہو جائے۔ چنانچہ ابن کثیر لکھتے ہیں كَافِيًا وَافِيًا

[۱] حِسَابًا صفت ہے عَطَآءً کی اور عَطَآءً مفعول مطلق ہے جَزَآءً کا جس کا عامل محذوف ہے۔

سَالِمًا کَثِیْرًا کہ حِسَابًا کے معنے یہ ہیں کہ جو کچھ ملے گا وہ کافی ہوگا بلکہ ضرورت سے زیادہ ہوگا اور سالم ہوگا یعنی کسی قسم کا نقص اُس میں نہیں ہوگا۔ کَثِیْرًا اور وہ پھر بہت ہوگا۔ چنانچہ وہ مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں تَقُوْلُ الْعَرَبُ اَعْطَانِیْ فَاَحْسَبَنِیْ اَیْ کَافَانِیْ یعنی اہل عرب کہتے ہیں اَعْطَانِیْ فَاَحْسَبَنِیْ اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس شخص نے مجھے اتنا دیا کہ میری سب ضرورتوں کو پورا کر دیا۔ پھر کہتے ہیں وَمِنْہُ حَسْبِیَ اللّٰہُ اَیِ اللّٰہُ کَافِیَّ اسی سے حَسْبِیَ اللّٰہ نکلا جس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ میرے لئے کافی ہے۔

عَطَآءً حِسَابًا سے مراد پہلے سے وعدہ دی گئی عطاء لیکن حِسَابًا کے اس جگہ ایک اور معنی بھی ہیں اور وہ یہ کہ انہیں ایسی عطا ملے گی جو حساب میں پہلے ہی موجود تھی یعنی مومن جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو یہ یہ جزا ملے گی کیونکہ خدا نے مجھے بتایا ہوا ہے کہ اس کی طرف سے فلاں فلاں نعمتیں ملیں گی۔ گویا یہاں حِسَابًا کے یہ معنے ہوں گے کہ ایسی عطا جو پہلے ہی حساب میں آئی ہوئی تھی جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی پیشگوئیوں میں ذکر کیا ہوا تھا اور جس کے متعلق مومن یہ امید رکھتا تھا چونکہ خدا نے اپنی پیشگوئیوں میں اس کا ذکر کیا ہوا ہے اس لئے ضروری ہے کہ یہ باتیں ایک دن پوری ہوں اور کافر بھی علم رکھتا تھا کہ مسلمانوں کے متعلق یہ یہ باتیں بیان کی گئی ہیں۔ پس چونکہ اس عطا کے ساتھ ایک پیشگوئی کا بھی تعلق تھا جس پر مومن بھی ایمان رکھتا تھا اور کافر کو بھی اس کا علم تھا اس لئے عَطَاءً کے ساتھ حِسَابًا کا لفظ بڑھا دیا۔ میرے نزدیک عَطَاءً حِسَابًا سے مراد وہی عطا ہے جو حساب میں آچکی تھی یعنی جس کا ذکر ہو چکا تھا جس کا مومن کو بھی علم تھا اور کافر کو بھی علم تھا یہاں عَطَاء کی تعداد مراد نہیں بلکہ اس سے عَطَاء کے ملنے کا وعدہ مراد ہے۔ جیسے کہتے ہیں فلاں چیز تو محسوب ہو چکی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز ہمارے ریکارڈ میں آچکی ہے۔ اسی طرح عَطَآءً حِسَابًا کا یہ مطلب ہے کہ وہ سرکاری دیوان میں لکھی ہوئی عطاء ہوگی جس کی پہلے سے پیشگوئی موجود تھی اور جس کا دوست کو بھی علم تھا اور دشمن کو بھی علم تھا۔

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا یَمْلِكُوْنَ

(تیرے اس رب کی طرف سے جو) آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے ان سب کا رب ہے

مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۸﴾

(اور) بے حد کرم کرنے والا ہے۔ وہ اس کے حضور میں (بلا) اجازت بات کرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔

حل لغات۔ خِطَابًا خِطَاب خَاطَبَ کا مصدر ہے۔ کہتے ہیں خَاطَبَهٗ بِالْکَلَامِ مُخَاطَبَةً

وَخِطَابًا۔ کَالَمَہٗ یعنی اس سے آمنے سامنے ہو کر بات کی (اقرب) پس خِطَاب کے معنے ہوں گے آمنے سامنے ہو کر بات کرنا۔

تفسیر ۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ کہ یہ تیرے رب کی طرف سے جزا ہے اور جزاء رحیمیّت کی علامت ہوتی ہے یعنی جزا اُسی کو ملتی ہے جو کام کرتا ہے پس پہلے تو فرمایا تھا کہ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ مگر آگے اَلرَّحْمٰنِ کا لفظ استعمال فرما دیا جو صفت رحمانیت پر زور دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُس ذات کی طرف سے تمہیں یہ جزا ملے گی جو رحمن ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ رحمٰن اس کو کہتے ہیں جو بغیر کام کے بدلہ دے اور جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ میں یہ بتایا گیا کہ جزاء کام کے بدلہ میں ہو گی کیونکہ جزاء صفتِ رحیمیت کے تابع ہے صفتِ رحمانیت کے تابع نہیں۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلے صفت رحیمیت کے نتیجہ میں جزاء قرار دے کر آگے صفت رحمانیت کا کیوں ذکر کیا گیا ہے۔

جزاء کا لفظ بیان کرنے کے بعد لفظ رحمٰن بیان کرنے کی دو حکمتیں اس کے متعلق یہ امر بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہاں اَلرَّحْمٰنِ کا لفظ لانے میں دو حکمتیں ہیں ایک تو یہ کہ رحمٰن کا لفظ لا کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو کچھ دیا ہے صفت رحیمیت کے ماتحت دیا ہے مگر وہ صرف رحیم ہی نہیں بلکہ رحمٰن بھی ہے۔ جب صفتِ رحیمیت کے ماتحت اس نے تمہیں یہ یہ کچھ دے دیا تو تم خود ہی سمجھ لو کہ وہ کیا انعام ہوگا جو صفت رحمانیت کے ماتحت تمہیں ملے گا وہ تو لازماً اس سے بہت بڑا انعام ہوگا کیونکہ وہ کسی کام کے بدلہ میں استحقاق کے طور پر نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی صفت رحمانیت کے ماتحت تمہیں اپنے اس انعام سے حصہ دے گا۔ گویا وہ خدا جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے جس نے اپنی صفت رحیمیت کے ماتحت تمہیں اپنی نعمتوں سے حصہ دیا اُس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ رحمٰن ہے جب رحیمیت کے ماتحت اس نے تمہیں ایسی عطا دے دی جو تمہاری تمام ضروریات پر حاوی ہے بلکہ تمہاری ضرورتوں سے بھی زائد ہے تو تم اس کی صفت رحمانیت کے ماتحت آنیوالے انعامات کا اندازہ بھی کب کر سکتے ہو۔ گویا یہ نہ سمجھو کہ یہ ہمارا آخری انعام ہے بلکہ یہ انعام تو صرف صفتِ رحیمیت کے نتیجہ میں تمہیں حاصل ہؤا ہے صفتِ رحمانیت کے ماتحت جو انعام ملے گا وہ تو بہت ہی زیادہ ہوگا۔

دوسرے رحمٰن کا لفظ لا کر اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ گو ہم اس کے لئے جزاء کا لفظ بولتے ہیں مگر درحقیقت بات وہی ہے جو غالب نے اپنے شعر میں کہی کہ

جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

(دیوان غالب از مرزا اسد اللہ خان غالب)

فرمایا ہمارا یہ احسان ہے کہ ہم اس کے لئے جزاء کا لفظ استعمال کر رہے ہیں ورنہ تم نے جو کچھ کیا وہ تو ہمارے فضلوں کا ایک طبعی نتیجہ تھا اُس میں تمہاری کون سی قابلیت تھی اگر ہم قرآن کریم نازل نہ کرتے۔ اگر ہم اپنے کلام میں تمہیں اپنی ہدایت کی راہیں نہ بتاتے تو تم کس طرح وہ مقامات حاصل کر سکتے جو آج تمہیں حاصل ہیں۔ یہ قرآن ہی تھا جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیا۔ یہ قرآن ہی تھا جس نے ابوبکر کو ابو بکرؓ۔ عمر کو عمرؓ۔ عثمان کو عثمانؓ اور علی کو علیؓ بنایا۔ بے شک ان لوگوں نے بڑی قربانیاں کیں۔ بے شک ان لوگوں نے دین کی بڑی خدمتیں کیں مگر یہ سب ہماری صفتِ رحمانیت کا نتیجہ تھا۔ یہ سب قرآن کا نتیجہ تھا۔ پس گو ہم تمہارے لئے جزاء کا لفظ استعمال کر رہے ہیں مگر اس بات کو بھول نہ جانا کہ یہ محض ہماری صفت رحمانیت کا نتیجہ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (الرحمٰن: ۲، ۳) کہ اگر رحمٰن خدا کی طرف سے قرآن نازل نہ ہوتا۔ اگر اس کی طرف سے تم پر یہ علوم اور معارف کھولے نہ جاتے تو تم کو وہ مقام کبھی حاصل نہ ہوسکتا جس پر آج تم پہنچے ہوئے ہو۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جس رب کی طرف سے تم کو یہ جزاء ملے گی وہ آسمان و زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے ان سب کا رب ہے۔ پس وہ جس پر مہربان ہو یہ سب کُچھ اُسے بخش سکتا ہے گویا بخشش کی وسعت کے امکان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

لَا یَمْلِکُوْنَ مِنْہُ خِطَابًا۔ ان کو اختیار نہیں ہے اُس سے خطاب کرنے کا۔ یا اُس سے خطاب کرنے کی وہ طاقت نہیں پاتے۔ دنیا میں بعض کام ایسے ہوتے ہیں جن میں ایک شخص دوسرے پر زور دے کر اُس سے اپنی بات منوالیتا ہے یا اگر بات نہ منوائے تو اس پر زور ضرور ڈالتا ہے مثلاً زیدؔ بکرؔ سے بات کرتا ہے۔ اب خواہ بکر زیدؔ کی بات کو مانے یا نہ مانے زیدؔ اس سے خطاب کر لیتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ہستی ایسی ہے کہ اس جہان میں بھی اور اگلے جہان میں بھی وہ لَا یَمْلِکُوْنَ مِنْہُ خِطَابًا کی شان رکھتی ہے یعنی اُس سے خطاب کرنے پر کوئی انسان مقدرت نہیں رکھتا۔ دنیا میں تو انسان کو خدا تعالیٰ پر جو ایمان ہوتا ہے وہ ہوتا ہی ایمان بالغیب ہے اس لئے اس میں خطاب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن آخرت میں بھی یہی کیفیت ہوگی کہ کوئی انسان اس کی اجازت کے بغیر اُس سے گفتگو کرنے کی

مقدرت نہیں رکھے گا۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا خطاب نہیں کہلاتا کیونکہ خطاب کے معنے ہوتے ہیں آمنے سامنے ہو کر بات کرنا اور اس طرح خدا تعالیٰ سے بالمشافہ گفتگو کرنے کی کسی انسان میں طاقت نہیں ہے اگلے جہان میں بھی ایسا ہی ہو گا جس کو اجازت ہو گی بولے گا اور جس کو اجازت نہیں ہو گی نہیں بولے گا۔ اور درحقیقت لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا سے مراد ہی یہ ہے کہ یہ چیز اختیاری نہیں ہو گی ورنہ یہ مراد نہیں کہ ایسا ہو گا ہی نہیں۔

لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا میں صفت رحمانیت کی طرف اشارہ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اس سے پہلے اَلرَّحْمٰن کا لفظ اللہ تعالیٰ نے استعمال کیا تھا جس میں اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ یہ ہمارا احسان ہے کہ ہم نے تم پر اپنا کلام نازل کیا ورنہ کسی انسانی عمل کے نتیجہ میں کلامِ الٰہی نازل نہیں ہوا کرتا۔ پس رحمٰن کے لفظ میں جو اشارہ تھا کہ ہماری صفتِ رحمانیت کے نتیجہ میں ہی محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آئے ہیں اگر ہم محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نہ بھیجتے اور اگر قرآن ہماری طرف سے نازل نہ ہوتا تو تمہیں یہ ترقیات بھی نصیب نہ ہوتیں اور نہ ہماری طرف سے تمہیں کوئی جزاء ملتی۔ پس یہ جزاء جو تمہیں مل رہی ہے درحقیقت نتیجہ ہے خدائی کلام کا۔ مگر لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا۔ کسی انسان میں اُس سے خطاب کرنے کی طاقت نہیں وہ آپ جب فضل نازل کرنا چاہے نازل کر دیتا ہے انسانی مقدرت اور کوشش کا اس میں دخل نہیں ہوتا۔ گویا رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا میں رحمٰن کا لفظ جو بظاہر زائد لایا گیا تھا اس کی وجہ بیان کر دی کہ تمہارے بس اور طاقت کی یہ بات نہیں تھی کہ تم اس قدر ترقی کر جاتے۔ تم نے جو کچھ ترقی کی ہے کلام الٰہی پر عمل کے نتیجہ میں کی ہے اور کلام الٰہی اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا نتیجہ ہوتا ہے زور سے اُسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۖ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ

(یہ اس دن ہو گا) جس دن کہ روح کامل اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے (اور) وہ بات نہ کر سکیں گے

اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۹﴾

سوائے اس کے جسے رحمان (خدا) نے اجازت دی ہو گی۔ اور وہ (مناسب موقعہ) ٹھیک ٹھیک بات کہے گا۔

حل لغات۔ اَلرُّوْحُ اَلرُّوْح اَلْ اور رُوْح کا مجموعہ ہے۔ اَلْ مختلف اغراض کے لئے کسی لفظ پر داخل کیا جاتا ہے۔ اِن اغراض میں سے ایک یہ غرض بھی ہے کہ یہ بتایا جائے کہ جس لفظ پر اَلْ داخل ہوا ہے وہ فرد اپنے

افراد میں سے کامل ہے چنانچہ کہتے ہیں اَنْتَ الرَّجُلُ یعنی مرد کے کمالات کو اگر دیکھا جائے تو اس کی تعریف تجھ پر ہی صادق آتی ہے۔ باقی مردوں میں کچھ نہ کچھ نقص ہیں۔(اقرب) یہاں اَلرُّوْحُ میں بھی اَلْ کمال کے اظہار کے لئے لایا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ ارواح میں سے کامل روح۔

اَلصَّوَابُ اَلصَّوَابُ اَللَّائِقُ مناسب۔ اَلْحَقُّ پکی بات۔ ضِدُّ الْخَطَإِ درست بات۔(اقرب)

تفسیر ۔ یَوْمَ یَقُوْمُ ظرف ہوسکتا ہے لَا یَمْلِکُوْنَ کا بھی اور لَا یَتَکَلَّمُوْنَ کا بھی یعنی لَا یَمْلِکُوْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا یا لَا یَتَکَلَّمُوْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰئِکَۃُ صَفًّا میں نے جو معنے کئے ہیں اس کے لحاظ سے یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ والی آیت لَا یَتَکَلَّمُوْنَ سے زیادہ تعلّق رکھتی ہے گو لَا یَمْلِکُوْنَ سے بھی اس کا تعلق ثابت ہے۔ بہرحال میرے معنوں کے رُو سے اگر اس آیت کو لَا یَتَکَلَّمُوْنَ کے ساتھ لگایا جائے تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

یَقُوْمُ الرُّوْحُ کے فقرہ میں ارواح سے مراد مفسرین کے نزدیک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا جس دن روح بھی اور ملائکہ بھی صف باندھ کر کھڑے ہوں گے۔ یہاں روح کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس سے ارواح بنی آدم مراد ہیں۔ حسنؒ اور قتادہؒ کہتے ہیں کہ اس سے بنو آدم مراد ہیں۔ شعبی اور سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ اس سے مراد جبریل ہے اور وہ نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ (الشعرآء:۱۹۴) سے استدلال کرتے ہیں گویا مفسّرین کے نزدیک روح سے مراد ارواح بنی آدم بنو آدم یا جبریل ہے بعض نے یہ معنے بھی کئے ہیں گو یہ بالکل لغو ہیں کہ اس سے مراد انسانوں کے سوا کوئی اور جنس ہے مگر یہ بالکل لغو بات ہے جب تک قرآن سے ایسی بات ثابت نہ ہو اُسے پیش کرنا خلاف عقل ہے۔ لیکن باقی معنے ایسے ہیں جو اس آیت پر چسپاں کئے جاسکتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کے قول سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ وہ اگلے جہاں کی زندگی کو اسی جسم کے ساتھ نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ انسانی جسم فنا ہوجاتے ہیں اور ارواح انسانی کو اگلے جہان میں زندگی دی جاتی ہے اسی لئے انہوں نے معنے یہ کئے ہیں کہ اس سے ارواح بنی آدم مراد ہیں۔ لیکن حسن اور قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے بنو آدم مراد ہیں گویا وہ اس بات کے قائل تھے کہ زندگی اسی مادی جسم کے ساتھ ہو گی۔ یہ بھی ایک اختلاف ہے جو مسلمانوں میں دیر سے چلا آرہا ہے کہ یہی جسم دوبارہ زندہ ہوگا یا کوئی اور جسم ہوگا۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہاں جسم تو ضرور ہوگا مگر وہ ایک روحانی جسم ہوگا یہ موجودہ جسم نہیں ہوگا۔ یہ جسم مٹی میں مل کر فنا ہو جائے گا البتہ اس کے کسی باریک حصہ کو لے کر جسے درحقیقت روحانی حصہ ہی کہنا چاہیے اللہ تعالیٰ اُسے نشوونما دینا

شروع کر دے گا اور اُسے انسان کا جسم بنا دے گا۔ انسان اپنے ذہن میں اس جسم کو اسی جسم کا ایک تسلسل سمجھے گا اور یہی یقین رکھے گا کہ میں وہی آدمی ہوں جو دنیا میں ہوا کرتا تھا مگر وہ جسم اور ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ اگلے جہان میں ہر انسان کو رُوحانی جسم ملے گا کیونکہ وہ رُوح سے ارواح بنی آدم مراد لیتے ہیں صرف بنو آدم مراد نہیں لیتے۔ معلوم ہوتا ہے خود قتادہ کو جو اُن کے شاگرد تھے یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ میرے اُستاد تو ارواح بنی آدم مراد لے رہے ہیں اور اس طرح اُن کے اپنے عقیدے سے وہ اختلاف رکھتے ہیں۔ چنانچہ قتادہ کہتے ہیں هَذَا مَا كَانَ يُخْفِيهِ ابْنُ عَبَّاسٍ کہ ابن عباس کا مطلب درحقیقت بنو آدم سے ہی تھا مگر انہوں نے اسے لفظوں میں چھپا دیا۔ حالانکہ اُن کو اخفا کی کیا ضرورت تھی۔ معلوم ہوتا ہے ابن عباس کا یہی عقیدہ تھا کہ جو شخص مرجاتا ہے اس کا جسم فنا ہو جاتا ہے زندگی صرف روح کو ہی ملتی ہے۔ بہرحال یہ سارے معنے وہ ہیں جو اگلے جہان پر ہی چسپاں ہوتے ہیں اس جہان پر چسپاں نہیں ہوتے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اس سورۃ میں غلبۂ قرآن۔ غلبۂ اسلام اور قیامت تینوں چیزوں کا ذکر ہے اور تینوں چیزیں مراد لی جاسکتی ہیں لیکن یہ معنے تینوں مقامات پر چسپاں نہیں ہوتے۔ بے شک قیامت پہ چسپاں ہو جائیں گے مگر غلبۂ قرآن یا غلبۂ اسلام پر چسپاں نہیں ہوسکیں گے۔

الروح سے مراد آنحضرت کی روح اس لئے اب میں وہ معنے بتاتا ہوں جو اس دنیا پر بھی چسپاں ہو جاتے ہیں اور اگلے جہان پر بھی چسپاں ہو جاتے ہیں اور وہ معنے یہ ہیں کہ میں اَلرُّوحُ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ کامل مراد لیتا ہوں اور یَوْم سے مراد قیامت کا وہ دن لیتا ہوں جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمائیں گے اور یہ معنے ایسے ہیں جن کی قرآن اور حدیث دونوں سے تصدیق ہوتی ہے۔ حدیثوں سے صاف پتہ لگتا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں پر سخت گھبراہٹ طاری ہوگی اُس وقت آپ فرماتے ہیں کہ میں خدا کے سامنے جا کر لوگوں کی شفاعت کروں گا پس روح سے مراد اس جگہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی روح کامل ہے۔ تو آیت يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا کے معنے ہوں گے جس دن کھڑی ہوگی روحِ کامل اور کھڑے ہوں گے ملائکہ صف باندھ کر۔ لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اس وقت کوئی نہیں بولے گا اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ سوائے اس کے جسے خدا اجازت دے گا اور کہے گا کہ تُو لوگوں کی شفاعت کرسکتا ہے۔ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ کے الفاظ بھی بتا رہے ہیں کہ یہاں شفاعت کا ہی ذکر ہو رہا ہے کیونکہ شفاعت ہی ایک ایسی چیز ہے جو اذن سے ہوگی اور وہی لوگ شفاعت کریں گے جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت ملے گی۔ چنانچہ حدیثوں میں آتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں جب قیامت کا دن آئے گا فَيَشْفَعُ النَّبِيُّوْنَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ فَيَقُوْلُ الْجَبَّارُ بَقِيَتْ

شَفَاعَتِيْ (بخاری کتاب التوحید باب قول اللہ تعالیٰ وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ) کہ انبیاء بھی شفاعت کریں گے اور ملائکہ بھی اور مومن بھی اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ انبیاء نے بھی شفاعت کر لی۔ ملائکہ نے بھی شفاعت کر لی مومنوں نے بھی شفاعت کر لی۔ اب صرف میں باقی رہ گیا ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئے گی اور بہت سے لوگ دوزخ سے نجات پا جائیں گے۔

لَا يَتَكَلَّمُوْنَ میں آنحضرتؐ کے قیامت کے دن شفاعت کرنے کی طرف اشارہ یہ اعتراض کرنا کہ اگر یہاں شفاعت کا ذکر ہے تو پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سوا اور لوگوں کی شفاعت کا کیوں ذکر نہیں۔ درست نہ ہوگا۔ کیونکہ جب بادشاہ کا ذکر کر دیا جائے تو اس کے وزراء اور سکرٹریوں وغیرہ کا ذکر اس میں شامل ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کے تابع ہوتے ہیں۔ جب یہ کہہ دیا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قیامت کے دن لوگوں کی شفاعت فرمائیں گے تو باقی انبیاء اور شہداء اور صلحاء وغیرہ کا اسی میں ذکر آ گیا کیونکہ جب روح کامل کا ذکر کر دیا گیا تو دوسری ارواح جو اس سے نچلے درجہ کی ہیں اُن کا ذکر اسی میں خود آ گیا اسی طرح گزشتہ انبیاء کی روحیں بھی اَلرُّوْحُ میں شامل سمجھی جائیں گی۔ پس لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ نے صاف بتا دیا کہ یہاں شفاعت کا ہی ذکر ہے اور شفاعت جس روح نے کرنی ہے وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہی رُوح ہے اور اَلرُّوْحُ سے مراد رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سوا اور کوئی نہیں۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ کا اظہار اس دنیا میں اس دنیا میں بھی ایسا ہی ہوا۔ محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی روح جب کھڑی ہوئی تو ملائکہ آپ کے ساتھ تھے۔ اس لحاظ سے اس آیت کو اسلامی جنگوں کے متعلق بھی سمجھا جائے گا اور مراد یہ ہوگی کہ جب دشمنوں کے مقابلہ کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نکلیں گے تو فرشتوں کی فوج صف باندھ کر آپ کے ساتھ ہوگی اور وہ آپ کی مدد کریں گے چنانچہ قرآن کریم میں يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ (آل عمران:۱۲۵) کے الفاظ آتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے بعض جنگوں میں پانچ پانچ ہزار ملائکہ کے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کی۔ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا سے خاص طور پر فتح مکّہ کی طرف اشارہ سمجھا جائے گا۔ وہ وقت ایسا تھا کہ جیسے ایک غالب بادشاہ سے مغلوب قوم ڈرتی ہے اسی طرح مشرکین مکہ ڈرتے اور کانپتے ہوئے آپؐ کے سامنے پیش ہوئے اُن کے اندر یہ طاقت ہی نہیں تھی کہ وہ بول سکیں۔ سوائے اس کے کہ رحمٰن خدا کے حکم سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے انہیں بولنے کی اجازت ملتی۔ اس میں کیا شک ہے کہ جہاں تک انسانی انصاف کا سوال ہے کفّارِ مکّہ سخت سزا کے مستحق تھے مگر رحمٰن خدا نے

ان کے لئے بخشش کا فیصلہ محمد رسول اللہ علیہ وسلم کو سنا دیا تھا پس جب کفار مکہ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کہا کہ ہم سے وہی سلوک کرو جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کیا تو انہوں نے اسی سبق کو دُہرایا جو رحمن نے قرآن کریم میں ان کو دیا تھا کہ ہم نے محمدؐ کو مثل یوسف بنایا ہے اور جب محمد رسول اللہ صلعم نے معاف فرمایا تب بھی رحمٰن کے حکم ہی کو دُہرایا۔

لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ میں دربارِ محمدیؐ کا نقشہ پھر تیسرے معنوں کے لحاظ سے اس میں غلبۂ اسلام کی طرف بھی اشارہ ہے اور مراد یہ ہے کہ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ جس دن ہمارا رسول محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تم پر فتح حاصل کر کے کھڑا ہوگا وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا اور ملائکہ اس کے ساتھ صف باندھے کھڑے ہوں گے۔ یہاں ملائکہ سے ہم فرشتے مراد نہیں لیں گے بلکہ مراد یہ لیں گے کہ ایسے لوگوں کی جماعت آپ کے ساتھ ہوگی جو ملائکہ صفت ہوں گے۔ اسلام کی منظم حکومت دنیا میں قائم ہو جائے گی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست دنیا سے خطاب کریں گے لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ اُس وقت وہی بولے گا جسے خدا کی طرف سے بولنے کی اجازت ہوگی یعنی محمد رسول اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دربار میں بولنے والے ایسے ہی ہوں گے جن کو خدا نے اجازت دی ہوگی کہ وہ بولیں۔ وَ قَالَ صَوَابًا اور وہ جو بھی مشورہ دیں گے بالکل صحیح ہوگا۔ گویا محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی جماعت ملے گی جس کی بڑی خوبی یہ ہوگی کہ وہ تب بولے گی جب خدا اُسے حکم دے گا وہ کوئی کام خدا کے حکم کے بغیر نہیں کرے گی۔ جو کچھ کہے گی خدا کے حکم کے مطابق کہے گی اور جو کچھ کرے گی خدا کے حکم کے مطابق کرے گی۔ باقی لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ خدا کی اجازت کی طرف نہیں دیکھتے بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں۔ خدا نے نہیں کہا کہ رنڈیوں کا ناچ دیکھو مگر وہ رنڈیوں کا ناچ دیکھتے ہیں۔ خدا نے نہیں کہا کہ تم بے ہودہ اور گندے گانے سنو مگر وہ اپنی ساری لذّت انہی گندی گانوں میں سمجھتے ہیں۔ خدا نے نہیں کہا کہ لغو قصّے کہانیوں میں اپنا وقت گزارو۔ مگر وہ اپنا اکثر وقت ایسی ہی گندی کتابوں اور ناولوں کے پڑھنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ گویا وہ جو کچھ کرتے ہیں خدا کے اذن کے بغیر اور اس کے منشاء کے خلاف کرتے ہیں۔ مگر محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ ایسی جماعت دے گا جس کے افراد اُسی وقت بولیں گے جب خُدا اُن سے کہے گا کہ بولو۔ اس کے بغیر وہ کوئی بات نہیں کریں گے وَ قَالَ صَوَابًا اور پھر وہ سچے مشورے دینے والے ہوں گے جھوٹے مشورے دینے والے اور خوشامدی نہیں ہوں گے گویا ان آیات میں دربارِ محمدیؐ کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ اِس طرح ہوگا۔

يَقُوْمُ الرُّوْحُ سے مراد غلبۂ اسلام اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس دن ہمارے رسول کی روح کھڑی ہوئی اور روح

کے کھڑے ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ دنیا پر غالب آ گئی۔ گویا قیام سے مراد ظاہری قیام نہیں بلکہ دُنیا پر غالب آنا اور اُسے اپنے زیرِ نگیں کر لینا ہے۔ فرمایا جس دن یہ کامل روح کھڑی ہو جائے گی اور ملائکہ اس کے ساتھ صف باندھے کھڑے ہوں گے تو لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا وہ لوگ جو اس کے ساتھی ہوں گے اُن کی یہ خصوصیت ہوگی کہ وہ نہیں بولیں گے جب تک خدا اُن کو بولنے کے لئے نہ کہے۔ وہ اُسی وقت بولیں گے جب خدا کی طرف سے ان کو بولنے کا حکم ہوگا اور اُسی قدر بولیں گے جس قدر بولنے کا خدا انہیں حکم دے گا۔ وہ لغو اور بے ہودہ باتیں محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مجلس میں نہیں کریں گے بلکہ ہر بات خدا تعالیٰ کے احکام اور اس کی ہدایت کے مطابق کریں گے قرآن کریم میں بعض اور جگہ بھی اس کے متعلق اشارے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (المائدۃ:۱۰۲) اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے لغو سوالات سے صحابہ کو روک دیا کہ یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مجلس کے آداب کے خلاف ہے۔ اور فرمایا کہ ایسی باتیں نہ پوچھو جن کا پوچھنا تمہارا خدا پسند نہیں کرتا بلکہ ایسی ہی باتیں پوچھو جن کا پوچھنا تمہارا خدا پسند کرتا ہے۔ یہی بات اس آیت میں بیان کر دی گئی کہ لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا صحابہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مجلس میں وہی باتیں کریں گے جن باتوں کی انہیں خدا کی طرف سے اجازت ہے۔ اور جب بھی بولیں گے صحیح اور درست مشورہ دیں گے۔ اُن کے مشوروں میں منافقت نہیں ہوگی۔ وہ کسی سے ڈر کر بات نہیں کریں گے وہ کسی خودغرضی کے ماتحت کوئی مشورہ پیش نہیں کریں گے بلکہ وہ جو کچھ کہیں گے بالکل درست اور صحیح ہوگا اور جو مشورہ دیں گے وہ سچا مشورہ ہوگا۔ اُن کے نفس کی کسی خواہش کا اُس میں دخل نہیں ہوگا۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۴۰﴾

یہ دن ہو کر رہنے والا ہے۔ پس (تم میں سے) جو (شخص) چاہے اپنے رب کے پاس (اپنا) ٹھکانہ بنا لے

حل لغات۔ مَاٰبٌ مَاٰبٌ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ النّبا ءآیت ۲۳۔

اَلْحَقُّ اَلْحَقُّ کے معنے ہیں اَلْاَمْرُ الْمَقْضِيُّ فیصلہ شدہ بات۔ اَلْمَوْجُوْدُ الثَّابِتُ ایسی چیز جو موجود اور ثابت ہو۔ (اقرب)

تفسیر۔ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ یہ دن آ کر رہنے والا ہے۔ حقّ کے معنے ہوتے ہیں واقع۔ ثابت۔ فَمَنْ شَآءَ

اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا۔ پس جو چاہے اپنے رب کو مَاٰب بنا لے۔ مَاٰب کے معنے ہوتے ہیں وہ چیز جس کی طرف انسان بار بار لوٹ کر جاتا ہے چونکہ اسلام خدا کو مومن کا معشوق قرار دیتا ہے اس لئے فرماتا ہے اگر تم اپنے دعویٰ عشق میں صادق ہو تو پھر تمہارا کام یہ ہے کہ جب بھی تم دنیا کے کاموں سے فارغ ہو جاؤ خدا کو مَاٰب بناؤ اور اُسی سے اپنی محبت اور عشق کا اظہار کرو۔ دوسری جگہ اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ (الانشراح:۸،۹) کہ جب تم دنیا کے دھندوں سے فارغ ہو جاؤ تو پھر خدا کی طرف ہی رغبت کرو اور اُسی کو اپنا مَاٰب بناؤ۔ اُسی کی طرف جاؤ اور بار بار جاؤ۔ مثلاً انسان کوئی کتاب لکھ رہا ہے تو اِدھر فقرہ ختم ہوا اور اُدھر اُس کی زبان سے نکلے سُبحان اللہ۔ یا ایک شخص کھانا کھا رہا ہو تو اِدھر لقمہ چباتا جائے اور اُدھر سُبحان اللہ سُبحان اللہ کہتا جائے گویا اُس کا مَاٰب صرف خدا ہی ہو اور کسی طرف اُس کی حقیقی توجہ نہ ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اس طرف بھی اشارہ فرماتا ہے کہ چونکہ وہ دن آنے والا ہے جس میں اسلام کو چاروں اطراف میں غلبہ حاصل ہو جائے گا اس لئے کئی لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوگی کہ ہم کو بھی اس عزت میں سے کچھ حصہ مل جائے ایسے لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے کہ اگر تمہاری سچے دل سے یہ خواہش ہے کہ تم بھی ان کامیابیوں میں حصہ لو اور تمہیں بھی کوئی مقام حاصل ہو جائے تو ہماری نصیحت ہے کہ تم اپنے رب کو مَاٰب بنا لو۔ اور لوٹ لوٹ کر خدا کی طرف جاؤ۔ تمہیں کام سے ذرا بھی فراغت نصیب ہو۔ تو تمہارا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو جاؤ۔ اُس سے اپنی محبت بڑھاؤ۔ اُس کی طرف دوڑ دوڑ کر جاؤ اور اُس کو اپنی جائے پناہ قرار دو۔ صرف پانچ وقت کی نمازیں اور تیس دن کے روزے انسان کے کام نہیں آتے بلکہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا اور انسان کا بار بار اس کی طرف لوٹنا۔ یہ چیز ہے جو انسان کے کام آیا کرتی ہے۔

اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚۖ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا

ہم نے تم کو ایک قریب (زمانہ میں آنے والے) عذاب سے یقیناً ہوشیار کر دیا ہے۔ جس دن کہ انسان اُس کو

قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۱﴾ ع ۲

دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہوگا اور کافر (اُس دن) کہہ اُٹھے گا اے کاش! (کاش) میں مٹی ہوتا۔

حل لغات۔ اَنْذَرْنٰكُمْ اَنْذَرَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اور اَنْذَرَهٗ بِالْاَمْرِ کے معنے

ہوتے ہیں اَعْلَمَہٗ وَحَذَّرَہٗ مِنْ عَوَاقِبِہٖ قَبْلَ حَلُوْلِہٖ کسی خطرے سے اس کو آگاہ کیا اور خطرے کے آنے سے پیشتر ہی اُس کے بُرے انجاموں سے خبردار کر دیا (اقوب) پس اَنْذَرْنٰکُمْ کے معنے ہوں گے کہ ہم نے عذاب قریب کے آنے سے پیشتر ہی اس سے اور اس کے انجاموں سے خبردار کر دیا ہے۔

تفسیر۔ اِنَّآ اَنْذَرْنٰکُمْ کے فقرہ میں غلبہ اسلام کی طرف اشارہ فرماتا ہے ہم نے تمہیں عذابِ قریب سے ڈرا دیا ہے۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہاں اسلام اور قرآن کا غلبہ بھی مراد ہے صرف اگلا جہاں مراد نہیں۔ کیونکہ یہاں ایک بات سے دوسری بات کا نتیجہ نکالا گیا ہے۔ فرماتا ہے ہم نے عذابِ قریب سے تمہیں ڈرا دیا ہے۔ جو ثبوت ہوگا اس بات کا کہ عذابِ بعید بھی آنے والا ہے۔

اِنَّآ اَنْذَرْنٰکُمْ کے فقرہ میں موعود عذاب کے آنے کا وقت یَوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدٰہُ: یَوْمَ عَذَابًا کا بدل ہے۔ پس اس جملہ کے یہ معنے ہیں کہ ہماری مراد اس سے وہ عذاب ہے جس دن انسان اپنے کاموں کے نتائج کو دیکھ لے گا۔ دیکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اتفاقی طور پر دیکھ لے گا بلکہ مراد یہ ہے کہ اُس پر اپنی ناکامی واضح ہو جائے گی۔ وہ دیکھ لے گا کہ اس نے اپنے کئے کا بدلہ پا لیا۔ مسلمان جیت گئے اور اُن کے دشمن ذلیل اور رُسوا ہو گئے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے غالب آنے کے ساتھ کفّار نے بھی اپنا انجام دیکھ لیا اور مومنوں نے بھی اپنے انعامات دیکھ لئے۔ یہاں تک کہ ابو قحافہ کے بیٹے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسی کے نتیجہ میں بادشاہت کا مقام حاصل کر لیا ورنہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی حیثیت کیا تھی۔ مکّہ کے ایک تاجر سے بڑھ کر اُن کی کوئی حیثیت نہ تھا مگر کُجا مکّہ کا ایک تاجر جسے مکّہ کی ریاست بھی حاصل نہیں تھی اور کُجا یہ کہ وہ ساری وسطی دنیا کے بادشاہ بن گئے۔ جب وہ بادشاہ ہوئے تو ایک شخص اُن کے والد ابو قحافہ کے پاس دوڑا دوڑا گیا۔ ابو قحافہ اُن کے والد کی کنیت تھی اور وہ اُن دنوں مکّہ میں تھے۔ چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فوت ہو چکے تھے اِس لئے تمام مسلمانوں میں سخت گھبراہٹ تھی کہ اب نامعلوم کون مسلمانوں کا بادشاہ بنتا ہے۔ وہ دوڑا دوڑا وہاں پہنچا اور کہنے لگا ابو بکر بادشاہ ہو گئے ہیں۔ اُن کے والد نے یہ بات سُنی تو کہنے لگے کون ابو بکر؟ گویا اُن کو یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ بادشاہ بننے والا اُن کا بیٹا ہو سکتا ہے۔ اُس نے کہا وہی جو تمہارا بیٹا ہے اَور کون۔ انہوں نے سوال کرنا شروع کیا۔ کیا فلاں قبیلہ نے مان لیا؟ کیا فلاں قبیلہ نے مان لیا؟ کیا فلاں قبیلہ نے مان لیا؟ جب اُس نے سب سوالوں کا جواب اثبات میں دیا تو وہ کہنے لگے کیا بنو ہاشم نے بھی مان لیا ہے؟ وہ کہنے لگا بنو ہاشم نے بھی مان لیا ہے۔ اِس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے والد کہنے لگے اللہ! اللہ! محمد صلے اللہ علیہ وسلم سچے رسول تھے جن کے اثر کے نیچے ابو قحافہ کے بیٹے کو

عرب کے قبائل اور سرداروں نے اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا۔ غرض یَوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدٰہُ سے اسی طرف اشارہ تھا کہ ہر اِک اپنے اپنے کام کے مطابق نتیجہ دیکھ لے گا۔ چنانچہ لوگوں نے دیکھ لیا کہ رؤسا عرب ذلیل ورسوا ہو گئے اور ابوقحافہ کے بیٹے کی بنوہاشم اور بنوعبدالمطلب نے بھی اطاعت اختیار کرلی۔

مسلمانوں کی شوکت کے ایام میں کافر کا حسرت سے یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا کہنا اگلے جہاں کے لحاظ سے وَیَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا کے یہ معنے ہوں گے کہ کافر عذاب کو دیکھ کر حسرت کے ساتھ کہے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا اور اس عذاب کو نہ دیکھتا۔ اور اس جہان کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہیں کہ کاش میں مٹی ہوتا اور اس ندامت اور شرمندگی کی ذلّت سے بچ جاتا جو مجھے دیکھنی نصیب ہوئی۔ چنانچہ مسلمانوں کی شوکت کے زمانہ میں کفّار کی یہی حالت ہوئی۔ مکّہ کے وہ بڑے بڑے رؤسا اور سردار جو نہایت حقارت کے ساتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لانے والوں کو مکّہ کی گلیوں میں گھسیٹا کرتے تھے جب دیکھتے ہوں گے کہ وہ معمولی غلام جن کو ہم خاطر میں بھی نہ لاتے تھے جن کی تحقیر ہمارا دن رات کام تھا اور جن کو مٹانے کی ہم نے بڑی کوششیں کی وہ ہم پر غالب آ چکے ہیں اور ہم اُن کے سامنے معمولی غلاموں کی طرح کھڑے ہیں تو اُن کے دلوں میں کیا کیا حسرتیں پیدا ہوتی ہوں گی اور کس طرح وہ اپنے دلوں میں بار بار کہتے ہوں گے کہ کاش ہم اس سے پہلے مر کر فنا ہو چکے ہوتے اور اس شرمندگی اور ذلّت کو دیکھنے سے بچ جاتے۔

آنحضرتؐ کو مکہ میں قبول نہ کرنے کی وجہ سے سرداران مکہ کے دلوں میں حسرت حضرت عمرؓ ایک دفعہ اپنے زمانۂ خلافت میں مکّہ تشریف لائے تو شہر کے بڑے بڑے رؤسا جو مشہور خاندانوں میں سے تھے اُن کے ملنے کے لئے آئے۔ انہیں خیال پیدا ہوا کہ حضرت عمرؓ ہمارے خاندانوں سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے اب جب کہ وہ خود بادشاہ ہیں ہمارے خاندانوں کا بھی پوری طرح اعزاز کریں گے اور ہم پھر اپنی گم گشتہ عزت کو حاصل کرسکیں گے۔ چنانچہ وہ آئے اور انہوں نے آپ سے باتیں شروع کردیں ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ حضرت عمرؓ کی مجلس میں بلالؓ آ گئے۔ تھوڑی دیر گزری تو حضرت خبابؓ آ گئے اور اسی طرح یکے بعد دیگرے اول الایمان غلام آتے چلے گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ان رؤسا یا اُن کے آباء کے غلام رہ چکے تھے اور جن پر وہ اپنی طاقت کے زمانہ میں شدید ترین مظالم کیا کرتے تھے حضرت عمرؓ نے ہر غلام کی آمد پر اُس کا استقبال کیا اور رؤساء سے کہا آپ ذرا پیچھے ہوجائیں اور اُن کو آگے بیٹھنے کے لئے جگہ دے دیں حتیٰ کے وہ نوجوان رؤسا جو آپ سے ملنے آئے تھے ہٹتے ہٹتے دروازہ تک جا پہنچے۔ اُس زمانہ میں کوئی بڑے بڑے ہال تو ہوتے نہیں تھے ایک چھوٹا سا کمرہ

ہوگا اور چونکہ وہ سب اس میں سما نہیں سکتے تھے اس لئے اُن کو پیچھے ہٹتے ہٹتے جوتیوں میں بیٹھنا پڑا۔ جب مکّہ کے وہ رؤسا جوتیوں میں جا پہنچے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح ایک کے بعد ایک مسلمان غلام آیا اور اُس کو آگے بٹھانے کے لئے اُن کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا گیا تو اُن کے دل کو سخت چوٹ لگی۔ خدا تعالیٰ نے بھی اُس وقت کچھ ایسے سامان پیدا کر دئے کہ یکے بعد دیگرے کئی ایسے مسلمان آ گئے جو کسی زمانہ میں کفّار کے غلام رہ چکے تھے۔ اگر ایک بار ہی وُہ رؤسا پیچھے ہٹتے تو اُن کو احساس بھی نہ ہوتا مگر چونکہ بار باراُن کو پیچھے ہٹنا پڑا اس لئے وہ اس بات کو برداشت نہ کر سکے اور اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ باہر نکل کر وہ ایک دوسرے سے شکایت کرنے لگے کہ دیکھو آج ہماری کیسی ذلّت اور رسوائی ہوئی ہے۔ ایک ایک غلام کے آنے پر ہم کو پیچھے ہٹایا گیا۔ یہاں تک کہ ہم جوتیوں میں جا پہنچے۔ اس پر اُن میں سے ایک نوجوان بولا اس میں کس کا قصور ہے عمرؓ کا ہے یا ہمارے باپ دادا کا؟ اگر تم سوچو تو معلوم ہوگا کہ اس میں عمرؓ کا کوئی قصور نہیں۔ یہ ہمارے باپ دادا کا ہی قصور تھا جس کی آج ہمیں سزا ملی۔ کیونکہ خدا نے جب اپنا رسول مبعوث فرمایا تو ہمارے باپ دادا نے مخالفت کی مگر ان غلاموں نے اُس کو قبول کیا اور ہر قسم کی تکالیف کو خوشی سے برداشت کیا اس لئے آج اگر ہمیں مجلس میں ذلیل ہونا پڑا ہے تو اس میں عمرؓ کا کوئی قصور نہیں ہمارا اپنا قصور ہے۔ اس کی یہ بات سُن کر دوسرے کہنے لگے ہم نے یہ تو مان لیا کہ یہ ہمارے باپ دادا کے قصور کا نتیجہ ہے مگر کیا اس ذلّت کے داغ کو دُور کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں؟ اس پر سب نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہماری سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آتی چلو حضرت عمرؓ سے ہی پوچھیں کہ اس کا کیا علاج ہے؟ چنانچہ وہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے آج جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے اُس کو آپ بھی خوب جانتے ہیں اور ہم بھی خوب جانتے ہیں۔ حضرت عمرؓ فرمانے لگے معاف کرنا میں مجبور تھا کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں معزز تھے۔ اس لئے میرا بھی فرض تھا کہ اُن کی عزت کرتا۔ انہوں نے کہا کہ ہم جانتے ہیں یہ ہمارے ہی قصور کا نتیجہ ہے لیکن آیا اس عار کو مٹانے کا کوئی بھی ذریعہ ہے؟ ہم لوگ تو اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ اُنہیں مکّہ میں کس قدر رسوخ حاصل تھا لیکن حضرت عمرؓ اُن کے خاندانی حالات کو خُوب جانتے تھے۔ آپ مکہ میں پیدا ہوئے اور مکہ میں ہی بڑے ہوئے اس لئے آپ جانتے تھے کہ ان نوجوانوں کے باپ دادا کس قدر عزت رکھتے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ کوئی شخص ان کے سامنے آنکھ اٹھانے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اور آپ جانتے تھے کہ اُنہیں کس قدر رُعب اور دبدبہ حاصل تھا۔ جب انہوں نے یہ بات کہی تو حضرت عمرؓ کے سامنے ایک ایک کر کے یہ تمام وقعات آ گئے اور آپ پر رقّت طاری ہو گئی۔ اُس وقت آپ غلبۂ رقّت کی وجہ سے بول بھی نہ سکے صرف آپ نے ہاتھ اُٹھایا اور شمال کی طرف انگلی سے

اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ شمال میں یعنی شام میں بعض اسلامی جنگیں ہو رہی ہیں اگر تم ان جنگوں میں شامل ہو جاؤ تو ممکن ہے اس کا کفّارہ ہو جائے چنانچہ وہ وہاں سے اٹھے اور جلد ہی ان جنگوں میں شامل ہونے کے لئے چل پڑے (مناقب امیر المومنین عمر بن الخطاب الباب الثامن و الثلاثون ذکر عدله فی رعیته)۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اُن میں سے ایک شخص بھی زندہ واپس نہیں آیا سب اسی جگہ شہید ہو گئے اور اس طرح انہوں نے اپنے خاندانوں کے نام پر سے داغِ ذلّت کو مٹا دیا۔

پیشگوئیوں کے مطابق اسلامی غلبہ یہ لوگ تو مخلص تھے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لا چکے تھے جب اُن کا یہ حال تھا تو سمجھ لو کہ کفّار کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ وہ کس طرح ان حالات کو دیکھ دیکھ کر کُڑھتے ہوں گے اور کہتے ہوں گے ہائے ہم مٹ جاتے۔ ہم مر کر فنا ہو چکے ہوتے مگر یہ دن ہمیں دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ جب وہی لوگ جن کو وہ گلیوں میں گھسیٹا کرتے تھے جن کے سینوں پر وہ بڑے بڑے گرم پتھّر رکھ کر انہیں اسلام سے پھرانے کی کوشش کرتے تھے۔ جن کو مارتے اور گالیاں دیتے اور ہر قسم کے دُکھ پہنچایا کرتے تھے فتح مکہ کے دن گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے ہوں گے اور یہ لوگ اپنے گھروں میں چھپ کر بیٹھ رہے ہوں گے کہ کہیں ان لوگوں کی ہم پر نظر نہ پڑ جائے۔ تو کس طرح اُن کو اپنی عزتیں خاک میں ملتی ہوئی نظر آتی ہوں گی۔ کس طرح بار باراُن کی زبان سے یہ نکلتا ہوگا کہ کاش ہم اس سے پہلے ہی مر کر فنا ہو چکے ہوتے اور اپنی ذلّت کا یہ دن نہ دیکھتے۔ غرض ابتدائی ایام اسلام میں ہی اللہ تعالیٰ نے وہ سارا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا جو آئندہ زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کا ہونے والا تھا۔ ابھی وہ بہت سے لوگ زندہ تھے۔ جنہوں نے اس نقشہ کو ایک مجنون کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ دی تھی کہ خدا کی بات پوری ہو گئی اور ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس نقشہ کے مطابق پیدا ہوتے ہوئے حالات دیکھ لئے۔

سُوْرَۃُ النّٰزِعَاتِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ نازعات۔ یہ سورۃ مکّی ہے۔

وَھِیَ سِتٌّ وَّ اَرْبَعُوْنَ اٰیَۃً دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَفِیْھَا رُکُوْعَانِ

اور اس کی بسم اللہ کے علاوہ چھیالیس آیتیں اور دو رکوع ہیں۔

سورۃ نازعات مکی ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا قول ہے کہ یہ مکی سورۃ ہے۔ اور اس کے متعلق کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ سب مفسّرین کا اس سورۃ کے مکّی ہونے پر اتفاق ہے (فتح البیان سورۃ النازعۃ ابتدائیۃ)۔

سورۃ نازعات کا سورۃ نباء سے تعلق میرے نزدیک اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے یہ جوڑ ہے کہ پہلی سورۃ میں بیان کیا گیا تھا کہ مسلمان جو آج تمہیں حقیر نظر آتے ہیں جن کی تعداد دیکھ کر تم ہنستے ہو اور جن کے متعلق تم یہ خیال کرتے ہو کہ انہوں نے دنیا میں کیا تغیّر پیدا کرنا ہے یہ ایک دن تم پر غالب آجائیں گے اور تم ان کے مقابلہ میں بالکل ذلیل ہو جاؤ گے۔ چنانچہ سورۃ نبأ میں جو اس وقت نازل ہوئی جب سارے مکّہ میں مسلمانوں کی کل تعداد زیادہ سے زیادہ چالیس تھی بڑے زور سے یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ وہ دن آنے والا ہے جب مسلمان غالب آجائیں گے اور مشرکین کو حکم دیدیا جائے گا کہ وہ مکّہ سے نکل جائیں۔

سورۃ نازعات کے مضمون کا خلاصہ جب انبیاء کی طرف سے پیشگوئیاں کی جاتی ہیں تو دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ ہوتے ہیں جو ہر چیز کو روحانی نظر سے دیکھتے ہیں جب انہیں کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایسے کہا ہے تو وہ صرف اس امر کی تحقیق کرتے ہیں کہ آیا خدا تعالیٰ نے ایسا کہا ہے یا نہیں کہا۔ جب انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں بات خدا تعالیٰ نے ہی کہی ہے تو ان کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ نے ایسا کہا ہے تو لازماً ایک نہ ایک دن ویسا ہی ہو بھی جائے گا اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی تسلّی محض اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ خدا تعالیٰ ایسا کہتا ہے بلکہ وہ اس کے شواہد اور آثار بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ گویا ایک خبر کے متعلق باوجود یہ سُن لینے کے کہ وہ خدا تعالیٰ نے دی ہے کسی انسان نے وہ خبر نہیں دی پھر بھی اُن کا دل تسلی نہیں پاتا۔ بلکہ وہ مادی دُنیا میں اس کی صداقت کے کچھ آثار بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں خدا تعالیٰ بھی جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اسباب اور ذرائع سے کام لیتا ہے۔ بغیر اسباب اور ذرائع کے کوئی کام نہیں

ہوتا۔لیکن ہمیں اس دنیا میں وہ سامان نظر نہیں آتے ۔وہ ذرائع اور وہ اسباب دکھائی نہیں دیتے جن سے یہ کام ہوگا۔ ان کی فطرتیں تب تسلی پاتی ہیں جب اُن پیشگوئیوں کی صداقت کے متعلق اس مادی دنیا میں آثار ظاہر ہونے شروع ہوجاتے ہیں اگر اس قسم کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوجائیں تب وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہی اسباب اور ذرائع ایک دن اس کام کے پورا کرنے کا ذریعہ بن جائیں گے۔پس چونکہ دنیا میں بعض طبائع اس قسم کی ہوتی ہیں جن کا اطمینان اُس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وُہ پیشگوئی کی صداقت کے آثار دیکھنا شروع نہ کردیں اس لئے جب یہ پیشگوئی کی گئی کہ مسلمان ایک دن غالب آئیں گے اور نہ صرف غالب آئیں گے بلکہ ان کا غلبہ اس قدر بڑھ جائے گا کہ وہ مشرکین کو مکّہ میں سے نکال دیں گے تو ایسے لوگ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے تھے اور کہتے تھے یہ تیس چالیس آدمی ہیں۔دشمن ان کو مارتا ہے۔پیٹتا ہے۔دکھ دیتا ہے۔گرم گرم پتھروں پر لٹاتا ہے۔مکّہ کی گلیوں میں ان کی ٹانگوں میں رسیاں باندھ کر گھسیٹا جاتا ہے اور ان کی طرف سے کہا یہ جارہا ہے کہ ہم ایک دن ساری دنیا پر غالب آجائیں گے اور مشرکین کو اس سرزمین سے نکال دیں گے آخر یہ ہوگا کس طرح؟ ہمیں تو اس مادی دنیا میں اس غلبہ کے ظہور کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔پس وہ سوال کرتے تھے کہ یہ غلبہ کیونکر ہوگا؟ سورۃ نازعات میں ان کے اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے اور متقیوں کا وہ مَفَاز جس کا سورہ نباء میں ذکر کیا گیا تھا اُس کی تفصیل بتائی گئی ہے کہ مومن کس طرح اس دنیا میں ترقی کرنا شروع کریں گے۔کس طرح انہیں غلبہ حاصل ہوگا اور کون سے وہ آثار رونما ہوں گے جن سے تم بھی یہ اندازہ لگا سکو گے کہ یہ قوم ایک دن غالب آجائے گی۔اگلے جہان میں مسلمان کو جو کچھ حاصل ہوگا وہ تو ہوگا ہی۔

سورۃ نازعات میں مسلمانوں کی ترقی کے ذرائع کی طرف اشارہ اس جگہ اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ ہم اسی دنیا میں مسلمانوں کی ترقی کے سامان کریں گے اور مسلمانوں کی یہ ترقی اس بات کا ثبوت ہوگی کہ اگلے جہان کے متعلق اللہ تعالیٰ کے جو وعدے ہیں وہ بھی ایک دن پورے ہوکر رہیں گے چنانچہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اس دَورِ ترقی کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں اور پھر جنگوں کی بھی خبر دی ہے گویا بتایا کہ تم جو پوچھتے ہو کہ مسلمانوں کو کس طرح ترقی حاصل ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ جنگیں ہوں گی اور یہ لوگ تم پر غلبہ واقتدار حاصل کریں گے۔گویا بتایا کہ مسلمان اپنی اندرونی اصلاح کے بعد اُسی ہتھیار کی طرف توجہ کریں گے جو آج اُن کے خلاف استعمال کیا جارہا ہے۔اب تو تم ان پر تلوار سے حملہ کررہے ہو۔انہیں دُکھوں پر دُکھ اور تکلیفوں پر تکلیف دیتے چلے جاتے ہو اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت صبر سے کام لے رہے ہیں تمہارے خلاف اپنا ہاتھ نہیں اٹھاتے مگر ایک دن آئے گا جبکہ یہ دیکھتے ہوئے کہ تم مسلمانوں پر حملہ کرنے سے باز نہیں آرہے تلوار کا تلوار سے مقابلہ کرنے کا

حکم دیا جائے گا اور تمہیں ان مظالم کا مزہ چکھایا جائے گا۔ جیسے سویا ہوا آدمی بیدار ہو جاتا ہے اسی طرح مسلمانوں کی اندرونی اصلاح اور اُن کی روحانی تربیت کے بعد ایک دن ہم اُن کو بیدار کر دیں گے اور اُنہیں اجازت دے دیں گے کہ اب کھڑے ہو جاؤ اور تلوار کا تلوار سے مقابلہ کرو۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے سوئے شیر کے جسم پر ایک چُوہا بھی دوڑ سکتا ہے۔ مگر جب وہ جاگتا ہے تو ایک مسلّح انسان کے لئے بھی اس کا مقابلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اس سورۃ میں یہی مضمون بیان فرماتا ہے کہ پہلے وہ مسلمانوں کو سُلائے رکھے گا۔ کفّار اُن پر ظلم پر ظلم کرتے چلے جائیں گے اور وہ اُن کے مقابلہ میں زبان تک نہیں ہلائیں گے یہاں تک کہ وہ خیال کرنے لگ جائیں گے کہ مسلمان کیا ہیں مٹی کی مُورتیں ہیں انہیں جس طرح چاہو تکلیف دے لو مگر ایک دن ہم اپنے اس سوئے ہوئے شیر کو جگا دیں گے اور جب سویا ہوا شیر اُٹھتا ہے تو اس کا جسم کانپتا ہے اور پھریری لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اُس وقت اس شیر کا مقابلہ کرنا کوئی آسان بات نہیں ہوتا۔ پس اللہ تعالیٰ اس سورۃ میں یہ ذکر فرماتا ہے کہ ایک دن ایسا ہوگا جب ہمارا یہ شیر ہمارے حکم کے مطابق اُٹھے گا اُس وقت لڑائیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ایک کے بعد دوسری۔ دوسری کے بعد تیسری اور تیسری کے بعد چوتھی تبدیلی رُونما ہوگی اور اس طرح مسلمانوں کی ترقی کے لئے مادی تدابیر بھی اختیار کی جائیں گی۔ گو یہ بھی ایک آئندہ کی ہی خبر ہے مگر جب کسی چیز کی مادی شکل بتا دی جائے تو انسان کو کچھ تسلی ہو جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو بات پوری ہو جائے گی۔ پہلے تو منکر خیال کرتا تھا کہ شاید قرآن کریم میں سورۂ نبأ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ فرشتے اُتریں گے اور لوگوں کی گردنیں مروڑ کر انہیں اسلام میں داخل کر دیں گے مگر جب مادی شکل بتا دی گئی تو انسانی نفس جو مادیات کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے اس کے لئے تسلّی پانے کے زیادہ قریبی دلائل پیدا ہو گئے اور اُس کے اطمینان کی مزید صورت پیدا ہو گئی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝۱

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

وَ النّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۝۲

(مجھے) قسم ہے ان (ہستیوں) کی جو کھینچتی ہیں پوری طرح۔

حل لغات۔ نَازِعَات نَازِعَات نَازِعَةٌ سے جمع کا صیغہ ہے جو نَزَعَ سے اسم فاعل مونث کا صیغہ

ہے۔نَزَعَ کے کئی مصدر آتے ہیں اس لئے جب نَزَعَ کا مصدر نَزْعًا ہو تو اُس وقت نَزَعَ الشَّیْءَ عَنْ مَکَانِہٖ کے معنے ہوتے ہیں قَلَعَہٗ کسی چیز کو جڑ سے اکھیڑ دیا۔ اور جب نَزَعَ الْاَمِیْرُ الْعَامِلَ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں عَزَلَہٗ۔ امیر نے عامل کو معزول کر دیا۔ نیز کہتے ہیں نَزَعَ بِالسَّھْمِ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ رَمٰی بِہٖ اُس نے تیر پھینکا۔ اسی طرح کہتے ہیں نَزَعَ فِی الْقَوْسِ اَیْ مَدَّھَا اَیْ جَذَبَ وَتَرَھَا یعنی اُس نے کمان کا چلّہ خُوب زور سے کھینچا۔ اور نَزَعَ عَنِ الْقَوْسِ کے معنے ہوتے ہیں رَمٰی عَنْھَا کمان سے تیر کو پھینکا یعنی تیر اندازی کی۔ اور نَزَعَ الدَّلْوَ کے معنے ہوتے ہیں جَذَبَھَا وَاسْتَقٰی بِھَا کنوئیں سے ڈول کے ذریعہ پانی کھینچا اور لوگوں کو پلایا اور جب نَزَعَ کا لفظ مریض کے لئے استعمال کریں اور نَزَعَ الْمَرِیْضُ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَشْرَفَ عَلَی الْمَوْتِ۔ مریض موت کے قریب پہنچ گیا۔ چنانچہ اُردو میں بھی کہتے ہیں فلاں شخص کا تو اب نزع کا وقت ہے۔

اور جب نَزَعَ کا مصدر نُزُوْعًا ہو تو نَزَعَ عَنْ کَذَا کے معنے ہوتے ہیں کَفَّ وَانْتَھٰی عَنْہُ وہ کوئی کام کرنے سے رُک گیا اور باز آ گیا۔ اِسی مصدر میں جب کہیں گے نَزَعَ الْوَلَدُ اَبَاہُ یا نَزَعَ الْوَلَدُ اِلٰی اُمِّہٖ تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَشْبَہَہٗ بیٹا اپنے باپ یا اپنی ماں کے مشابہ ہو گیا۔ اور جب نَزَعَ کا نَزَاعَۃً وَنِزَاعًا وَنُزُوْعًا مصدر ہو تو نَزَعَ اِلَی الشَّیْءِ کے معنے ہوں گے اِشْتَھَاہُ اُس نے فلاں چیز کی خواہش کی اور جب کہیں نَزَعَ اِلٰی اَھْلِہٖ تو اس کے معنے ہوتے ہیں اِشْتَاقَ اس کے دل میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ یا انگریزی محاورہ کے مطابق کہیں گے فلاں شخص ہوم سِک Homesick ہو گیا۔ اسی مصدر کے ماتحت جب نَزَعَ بِفُلَانٍ اِلٰی کَذَا کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں دَعَاہُ اِلَیْہِ اُس نے کسی آدمی کو کسی کام کی دعوت دی۔ (اقرب)

نَازِعَات کے بعد غَرْقًا کا لفظ آتا ہے اس کے متعلق بھی یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ اُردو میں غرق کا لفظ جو ڈوبنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے عربی زبان میں اُس کا مصدر غَرْقًا نہیں بلکہ غَرَقًا استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں غَرِقَ غَرَقًا مگر یہاں غَرْقًا اَغْرَقَ ثلاثی مزید کا مصدر استعمال ہوا ہے۔ گویا غَرْقًا بمعنے اِغْرَاقًا استعمال ہوا ہے اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے پہلے پارہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنَّ مِنْھَا لَمَا یَھْبِطُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ (البقرۃ:۷۵) کہ پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں جو خشیۃ اللہ سے گر جاتے ہیں۔ یہاں سب تسلیم کرتے ہیں کہ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ کے الفاظ مِنْ اِخْشَاءِ اللّٰہِ کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ ڈرانے کی وجہ سے۔ اسی طرح یہاں غَرْقًا قائمقام اِغْرَاقٌ کا ہے جو اَغْرَقَ کا مصدر ہے۔ اور اَغْرَقَ فِی الْمَاءِ کے معنے ہوتے ہیں غَرَّقَہٗ اُس کو پانی میں ڈبو دیا۔ اور جب کہیں اَغْرَقَ الْکَأْسَ تو اس کے معنے ہوتے ہیں مَلَأَھَا اُس کو بھر دیا۔ اور جب کہیں

آغْرَقَ النَّازِعُ فِي الْقَوْسِ تو اس کے معنے ہوتے ہیں مَدَّهَا اُس کو خوب کھینچا اور جب کہیں کہ آغْرَقَ النَّبْلَ تو اس کے معنے ہوتے ہیں اِذَا بَلَغَ بِهٖ غَايَةَ الْحَدِّ فِي الْقَوْسِ یعنی اُس نے تیر کو اتنے زور سے کھینچا کہ اُس کی نوک کمان کے ڈنڈے سے آملی۔ اور جب کہیں آغْرَقَ فُلَانٌ فِي الشَّيْءِ تو اس کے معنے ہوتے ہیں بَالَغَ فِيْهِ وَ اَطْنَبَ اُس نے کام کو حد تک پہنچا دیا اور اُس میں اطناب اور طوالت سے کام لیا۔ مثلاً کوئی شخص بات شروع کرے اور وہ لمبی گفتگو کرتا چلا جائے تو اُس موقع پر یہ فقرہ استعمال کریں گے۔ اسی طرح جب کہیں آغْرَقَ النَّاسُ فُلَانًا تو اس کے معنے ہوتے ہیں كَثُرُوْا عَلَيْهِ فَغَلَبُوْهُ (اقرب) لوگوں نے جمع ہو کر اُس پر حملہ کر دیا اور اُسے مغلوب کر لیا۔

وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے لغوی معنی گویا وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے معنے ہو جائیں گے کہ (۱) کسی چیز کو اس کی جڑ سے خوب اچھی طرح اُکھیڑنے والی ہستیاں (۲) یا وہ گروہ جو اپنے کام کو اُس کی پوری انتہاء تک پہنچا دیتے ہیں (۳) یا حکامِ وقت کو معزول کر دینے والے گروہ جو اپنی تدبیر کو کمال تک پہنچا دیتے ہیں (۴) یا تیروں کو کھینچنے والی جماعتیں جو لڑائی میں تیروں کو اس قدر زور اور جوش سے کھینچتی ہیں کہ تیر کمانوں کی لکڑی تک پہنچ جاتے ہیں (۵) یا وہ جماعتیں جو کنوؤں میں سے پانی نکال نکال کر پانی پلاتی ہیں اور پورے زور سے پانی کھینچتی ہیں۔ (۶) یا وہ جماعتیں جو بعض کاموں سے پوری طرح رُک جاتی ہیں (۷) وہ جماعتیں جو اپنی روحانی یا جسمانی باپوں سے انتہائی طور پر مشابہت اختیار کر لیتی ہیں (۸) یا وہ جماعتیں جن کے دلوں میں اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کی زبردست خواہش ہوتی ہے (۹) یا وہ جماعتیں جو لوگوں کو کسی کام کی نہایت ہی جوش وخروش سے دعوت دیتی ہے۔

تفسیر۔ النّٰزِعٰتِ سے پہلے واؤ قسم کی ہے اَلنَّازِعَات کے شروع میں جو واؤ آتا ہے یہ قسم کا ہے اور بعد کے واؤ عطف کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم قسم کھاتے ہیں نَازِعَاتِ کی جو غرق ہو کر نزع کرتی ہیں۔

عربی زبان میں قسم کے لئے واؔ۔ باؔ۔ تاؔ۔ تین حروف آتے ہیں۔ اِن میں سے واؤ کا زیادہ استعمال ہوتا ہے لیکن عربی زبان میں اصل حرفِ قسم باؔ کو سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے اُقْسِمُ بِاللّٰهِ یعنی اُقْسِمُ کے ساتھ باء کو بھی ظاہر کر دیا جاتا ہے مگر یہ کبھی نہیں کہا جاتا کہ اُقْسِمُ وَاللّٰهِ یا اُقْسِمُ تَاللّٰهِ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قسم کیلئے اصل حرف باء ہے۔ لیکن کبھی باء کے بدلہ میں واؤ بھی آجاتی ہے اور واؤ کے بدلہ میں تاء آجاتی ہے گویا واؤ اور تاء یہ دونوں باء کے تابع ہیں۔ قرآن مجید میں تمام اقسام جو شہادت کے رنگ میں آتی ہیں ان سے پہلے واؤ استعمال ہوا ہے باء یا تاء استعمال نہیں ہوئے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ واؤ کا حرف ایسی قَسمِ شہادت کے لئے جو اپنے سے ادنیٰ ہستی کی کھائی جائے زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ آیت زیرِ بحث میں بھی وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا آتا ہے نہ کہ تَالنَّازِعَاتِ۔

قرآنی قسموں کی فلاسفی یہاں موقع کے لحاظ سے اگرچہ اس بحث کی جگہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ قسمیں کیوں کھاتا ہے۔ اس سے پہلے بہت سی سورتیں ایسی گزر چکی ہیں جہاں یہ بحث آنی چاہیے تھی مگر چونکہ آخری پارے کی تفسیر پہلے شائع ہو رہی ہے۔ اس لئے جیسے سورۂ یونس سے پہلے مقطّعات کے متعلق بحث کی گئی ہے کیونکہ اس حصہ کی تفسیر سورۂ بقرہ سے پہلے شائع ہوئی ہے۔ یہاں بھی اس امر پر بحث کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قسم کیوں کھاتا ہے یا پھر یہ کہ اگر یہ قسم خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں تو کیا بندے کی طرف سے ہے؟ ادنیٰ تدبر سے معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ قسم بندے کی طرف سے نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس کے بعد جو مضمون بیان ہوا ہے وہ انسان کی طرف سے نہیں کہا جا سکتا۔ ان قسموں کے بعد فرمایا گیا ہے یَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَۃُ اور یہ ایک پیشگوئی ہے اور پیشگوئی علمِ غیب سے ناواقف انسان کی طرف سے نہیں ہوسکتی۔ عالم الغیب ہستی ہی کی طرف سے ہوسکتی ہے۔ پس ان قسموں کو خدا تعالیٰ کی قسمیں ہی قرار دینا پڑے گا اور اس پر سوال پیدا ہوگا کہ خدا نے قسم کیوں کھائی یا کیوں وہ متعدد مقامات پر قسم کھاتا ہے؟ انسان تو اس لئے خدا تعالیٰ کی قسم کھایا کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ ایک بالا ہستی ہے اور انسان اس کے مقابلہ میں بالکل بے بس ہے وہ خدا تعالیٰ کو اپنے دعویٰ کی تائید میں گواہ کے طور پر پیش کرتا ہے اَور یہ کہتا ہے کہ اگر مَیں اُس کا نام گواہی کے طور پر یُوں ہی لیتا ہوں تو وہ طاقت رکھتا ہے کہ مجھے تباہ کر دے اور اگر وہ باوجود اس کا نام جھوٹے طور پر لے دینے کے مجھے تباہ نہ کرے تو سمجھ لو کہ وہ میرے سچے ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ لیکن خدا کے اُوپر تو کوئی اَور ہستی نہیں جسے وہ اپنے دعویٰ کی سچائی کے ثبوت میں پیش کرسکتا ہو اور جب تمام چیزیں خدا تعالیٰ سے شان اور طاقت میں چھوٹی ہیں تو چھوٹی چیز کی قسم کھانے سے کیا فائدہ۔ ایسی قسم کے تو کوئی معنے ہی نہیں ہو سکتے۔ انسان اگر قسم کھاتا ہے تو بڑی چیز کی کھاتا ہے لیکن خدا تعالیٰ سے بڑی تو اور کوئی ہستی نہیں پھر خدا تعالیٰ نے قسم کیوں کھائی ہے۔

قسم کھانے کا مطلب جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے انسان جب قسم کھاتا ہے تو اُس کی قسم کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا حکم سچ بولنے کا ہے اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو اُس کا حکم توڑتا ہوں اور اُس کے غضب کو اپنے اُوپر بھڑکاتا ہوں اِس لئے میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں سچ بول رہا ہوں تا کہ اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ میرے جھوٹ اور نافرمانی کی وجہ سے مجھے سزا دے۔ گویا انسان جب اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جھوٹ کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کا غضب بھڑکا کرتا ہے کیونکہ خدا جھوٹ کو ناپسند کرتا ہے ایسی حالت میں جب میں خدا کی قسم کھا کر کوئی جھوٹی بات کہتا ہوں تو گویا اُس کے غضب کو میں اَور بھی بھڑکاتا ہوں۔ کیونکہ اول خدا کا حکم تھا کہ میں سچ بولوں مگر میں نے خدا کے حکم کو توڑا اور سچ بولنے کی بجائے جھوٹ سے کام لیا۔

دوسرے ایک زائد بات یہ کی کہ میں نے یہ کہا کہ خدا اس بات کا گواہ ہے کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ گویا ایک تو خدا تعالیٰ کا حکم توڑا کیونکہ خدا تعالیٰ کا حکم تھا کہ ہمیشہ سچ بولو مگر میں نے اس حکم کے خلاف جھوٹ بولا اور اس کی نافرمانی کی؟ دوسرے نہ صرف میں نے جھوٹ بولا بلکہ اس میں خدا تعالیٰ کو بھی شریک کرنا چاہا کہ وہ بھی گواہ ہے کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر انسان سے کوئی عام گناہ صادر ہوگا تو خدا تعالیٰ کی غیرت اُس کے خلاف اتنی نہیں بھڑکے گی جتنی اُس صورت میں بھڑکے گی جب وہ خدا تعالیٰ کو بھی اپنے گندے فعل میں شریک کرنا چاہے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر گناہ کے خلاف خدا تعالیٰ کی غیرت بھڑکتی ہے مگر گناہ گناہ میں فرق ہوتا ہے کسی پر اُس کی غیرت کم بھڑکتی ہے اور کسی پر اُس کی غیرت زیادہ بھڑکتی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے گناہ میں خدا تعالیٰ کو بھی شریک کرنا چاہے گا تو یہ لازمی بات ہے کہ اس پر خدا تعالیٰ کی غیرت زیادہ بھڑکے گی۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے اگر کوئی شخص شراب پیئے تو ہم کہیں گے کہ وہ بہت بُرا کرتا ہے لیکن اگر اُسے شراب سے منع کیا جائے اور وہ کہے کہ فلاں بزرگ بھی شراب پیتا ہے اور وہ بزرگ ایسا ہو جس کی عزت لوگوں کے دلوں میں ہو تو اس کے خلاف لوگوں کو اور زیادہ غصّہ آئے گا کہ ایک تو تم شراب پیتے ہو اور دوسرے شراب کے گناہ میں ایک بزرگ کو بھی ملوّث کرنا چاہتے ہو۔ اسی طرح ہر گناہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہوتا ہے مگر جب کوئی جھوٹی قسم کھاتا ہے تو وہ اُس کی ناراضگی کو اور بھی بھڑکاتا ہے کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کو بھی اپنے جھوٹ میں شریک کرتا ہے۔

قسم کے معنے خدا تعالیٰ کو اپنے فعل میں شریک کرنے کے ہیں قسم کے معنے درحقیقت خدا تعالیٰ کو اپنے فعل میں شریک کرنے کے ہوتے ہیں۔ پس اگر وہ سچی بات ہے جس پر کوئی شخص قسم کھاتا ہے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ مثلاً وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں اور واقعہ بھی یہی ہو کہ وہ نماز پڑھا کرتا ہو تو اس میں خدا تعالیٰ کی غیرت بھڑکنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ خدا تعالیٰ بہرحال جانتا ہے کہ وہ نماز پڑھا کرتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے سچ کہہ رہا ہے۔ لیکن اگر وہ نماز نہیں پڑھتا اور کہتا ہے کہ خدا کی قسم! میں نماز پڑھا کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے فریب اور دغا میں خدا تعالیٰ کو بھی شامل کرتا ہے اور جب وہ ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی غیرت اُس کے خلاف بھڑک اٹھتی ہے۔

قسم ذریعہ تسلی گویا قسم کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ سننے والوں کی تسلی ہو جائے۔ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایسا فعل کیا ہے تو خدا تعالیٰ تو اس کی سچائی کی شہادت اپنی زبان سے نہیں دیتا اور نہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قسم کے بعد اللہ تعالیٰ یوں کہے کہ ہاں میرا یہ بندا سچ بول رہا ہے لیکن باوجود اس کے جو شخص قسم

کھاتا ہے وہ بھی سمجھ رہا ہوتا ہے کہ اگر میں نے جھوٹی قسم کھائی تو خدا تعالیٰ کی گرفت میں آجاؤں گا اور سننے والا بھی سمجھتا ہے کہ اگر اس نے جھوٹ بولا تو چونکہ اس نے اپنے جھوٹ میں خدا تعالیٰ کو بھی شریک کرلیا ہے اس لئے وہ اسے سزا دئے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ پس قسم میں اوّل تو دوسروں کو اس بات کا یقین دلانا مدنظر ہوتا ہے کہ مجھے اپنی بات کی سچائی پر اس قدر کامل یقین ہے کہ میں خدا تعالیٰ کو بھی اپنے بیان کا گواہ بناتا ہوں گویا میرے علم اور خدا تعالیٰ کے علم میں جہاں تک اس بات کا تعلق ہے بالکل مطابقت ہے کوئی بات خلاف حقیقت میں نے بیان نہیں کی۔ دوسرے سننے والوں کو تسلّی ہو جاتی ہے کہ اگر قسم کھانے والے نے خدا کو اپنے جھوٹ میں شریک کیا تو ہمیں گھبرانے کی ضرورت نہیں خدا تعالیٰ خود اسے سزا دے گا۔

غرض یہ حکمت ہے جو قسموں میں پائی جاتی ہے ایک طرف انسان خدا تعالیٰ سے اپنے اتّحاد کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس بارہ میں میرا علم اور خدا کا علم ایک ہی ہے مثلاً جب وہ کہتا ہے میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زیدؔ لاہور گیا ہے تو اس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنے ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ جو علیم و خبیر ہے جو زمین و آسمان کے ذرّہ ذرّہ کے حالات کو جاننے والا ہے جس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں اس بارہ میں اُس کا علم اور میرا علم ایک ہی ہے۔ دوسرے سننے والوں کی تسلّی ہو جاتی ہے کہ اگر اُس نے افتراء سے کام لیا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے خود پکڑے گا اور جب پکڑے گا اُس وقت ہمیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس شخص نے جھوٹ اور افتراء سے کام لیا تھا۔ گویا قسم میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ اوّل خدا تعالیٰ کے علم کے ساتھ اپنے علم کو شریک کرنا اور کہنا کہ میرا علم اور خدا تعالیٰ کا علم اس بارہ میں ایک ہی ہے۔ دوسرے خدا تعالیٰ کی سزا کو چیلنج کرنا کہ اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو میں اس بات کے لئے تیار ہوں کہ وہ مجھے پکڑے اور اپنے عذاب میں گرفتار کرے۔ مگر خدا تعالیٰ پر تو نہ کوئی حاکم ہے نہ اُس پر کسی کا حکم جاری ہے نہ اُسے کوئی سزا دے سکتا ہے اور جب نہ خدا تعالیٰ پر کوئی حاکم ہے نہ اُس پر کسی کا حکم جاری ہے اور نہ اُسے کوئی سزا دے سکتا ہے تو سوال یہ ہے کہ پھر اُس کے قسم کھانے میں کیا فائدہ مدنظر ہو سکتا ہے۔ جب کوئی انسان قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں نے ایسا کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چونکہ میں نے خدا تعالیٰ کو بھی اپنے فعل میں شریک کرلیا ہے اس لئے اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو وہ مجھے سزا دے گا۔ لیکن خدا تعالیٰ کو تو کوئی سزا نہیں دے سکتا۔ پھر قسم میں اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ اس بارہ میں میرا علم اور خدا تعالیٰ کا علم یکساں ہے۔ مگر خدا تعالیٰ قسم کھاتا ہے تو اُس میں یہ حکمت بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ خدا تعالیٰ کا علم بہر حال غالب ہے دوسرے کے علم کو یکساں قرار دینے سے اُس کے بیان کو کوئی تقویت حاصل نہیں ہوتی۔ پس وہ کسی دوسرے علم کو اپنے علم کی شہادت کے طور پر پیش نہیں کر سکتا۔ پھر ایسی قسم کا نتیجہ ہی کیا نکلے گا

جبکہ جس کی قسم کھائی گئی ہے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بے اختیار ہے اور اس کا علم خدا تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ایک طالب علم تو کہہ سکتا ہے کہ جو مسئلہ میں نے بتایا ہے درست ہے جاؤ اُستاد سے پوچھ لو لیکن کبھی کوئی استاد یہ نہیں کرتا کہ جو مسئلہ میں نے بتایا ہے وہ درست ہے جاؤ میرے شاگرد سے پوچھ لو۔ پس مخالف کہتا ہے کہ ایسی قسمیں بالکل فضول ہیں۔ان کا وجود کلام الٰہی میں پایا جانا خلاف عقل ہے۔

قسم کا مفہوم عربی زبان میں اس اعتراض کا جواب دینے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قسم کا مفہوم کیا ہے۔ عربی زبان میں قسم کے لئے تین الفاظ استعمال ہوتے ہیں (۱) حلف (۲) یمین (۳) قسم

جو معنے قسم کے اوپر بیان کئے گئے ہیں وہ وہی ہیں جو عرفِ عام میں لئے جاتے ہیں لیکن قرآن مجید چونکہ عربی زبان میں ہے اس لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ عربی زبان میں حلف یمین اور قسم کا کیا مفہوم ہوتا ہے اور اُس مفہوم کے مطابق اللہ تعالیٰ کے قسم کھانے میں کیا حکمت ہے۔

قسم کا مفہوم ادا کرنے کے لئے عربی زبان میں تین الفاظ میں بتا چکا ہوں کہ عربی زبان میں قسم کے لئے تین الفاظ پائے جاتے ہیں حلف۔یمین اور قسم۔ چنانچہ عربی زبان میں کہتے ہیں حَلَفَ بِاللّٰہِ حَلْفًا اور اس کے معنے وہ یہ کرتے ہیں اَقْسَمَ بِہٖ (اقرب) اُس نے خدا تعالیٰ کی قسم کھائی۔ جہاں تک ان معنوں کا تعلق ہے یہ کوئی زائد بات نہیں بتاتے صرف عُرفِ عام میں قسم کا جو مفہوم سمجھا جاتا ہے اُسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس لئے ہم حلف کے لفظ کو یا اُس کے اشتقاق صغیر و کبیر کے معنوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ کیا ہیں تا کہ ہمیں پتہ لگے کہ حلف کے معنوں میں کون کون سی بات پائی جاتی ہے۔

عربی زبان میں قسم کے لئے مختلف الفاظ کا استعمال اور ان کا اشتقاق کے لحاظ سے آپس میں تعلق جہاں تک لفظِ حلف کا تعلق ہے اُس کے قریباً سارے اشتقاق خواہ وہ اشتقاق صغیر ہوں یا اشتقاق کبیر قسم کے معنے دیتے ہیں سوائے اَلْحَلْفَاءُ کے جس کے معنے قسم کے نہیں۔ بلکہ حَلْفَاءُ ایک ایسی بوٹی کو کہتے ہیں جو پانی میں اُگتی ہے اور جس کے پتّوں کے کونے نوکدار اور تیز ہوتے ہیں (اقرب) اسی طرح حَلِیْف کا لفظ عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے جس کے معنے ہر اُس چیز کے ہوتے ہیں جو دوسری سے جُدا نہ ہو چنانچہ لکھا ہے اَلْحَلِیْفُ کُلُّ شَیْءٍ لَزِمَ شَیْئًا فَلَمْ یُفَارِقْہُ (اقرب) حَلِیْف کے دوسرے معنے اَلْحَدِیْدُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ کے ہوتے ہیں (اقرب) یعنی ہر ایسی چیز جو تیز اور دھار دار ہو۔ گویا حَلْفَاء وہ بوٹی ہوتی ہے جس کے پتوں کے کونے نوکدار اور تیز ہوتے ہیں۔ حَلِیْف وہ چیز ہوتی ہے جو کسی دوسری چیز سے چمٹی رہے اور حلیف اُس چیز کو بھی کہتے ہیں جو تیز اور دھار دار

ہو۔اس تشریح سے دو معنے ایسے نکل آئے جن سے حلف کے مفہوم میں فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے اوّل تیز اور دھار دار ہونا دوم کسی چیز کا کسی دوسری چیز سے چمٹا ہوا ہونا۔گویا جہاں بھی حاء۔ لام۔اور فاء اکٹھے ہوں گے وہاں یہ دو معنے ضرور پائے جائیں گے(اول) کسی چیز کا دوسری چیز سے چمٹ جانا(دوم) اُس کا تیز اور دھار دار ہونا۔

اس کے بعد ہم حاء۔لام۔اور فاء کے دوسرے مرکبات کو لیتے ہیں جو پانچ ہیں یعنی (۱) حَفلَ۔(۲) لَحفَ۔ (۳) لفحَ۔(۴) فحل (۵) فلحَ۔ گویا حاء۔فاء اور لام اکٹھے ہوجائیں تو حَفْلٌ بن جائے گا۔لام۔حاء۔ اور فاء اکھٹے ہوجائیں تو لحف بن جائے گا۔لام،فاء اور حاء اکٹھے ہوجائیں گے تو لفحٌ بن جائے گا۔فاء،حاء اور لام اکھٹے ہوجائیں تو فحل بن جائے گا۔ اور فاء۔ لام۔ حاء اکٹھے ہوں جائیں تو فَلْحٌ بن جائے گا۔ یہ پانچوں قسم کے اشتقاق عربی زبان میں مستعمل ہیں۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان حروف کے تغیر سے معنے کیا بنتے ہیں۔ یعنی جب حَاء، فَاء اور لَام اکٹھے ہوں تو اس کے معنے ہوتے ہیں اور جب لام، حاء اور فَاء اکٹھے ہوں تو اس کے کیا معنے ہوتے ہیں۔سب سے پہلے ہم حَفْلٌ کو لیتے ہیں حَفْلٌ کے تمام مشتقات اجتماع اور کثرت پر دلالت کرتے ہیں چنانچہ حَفْلَۃٌ جلسہ اور اجتماع کو کہتے ہیں۔اور اجتماع میں ایک دوسرے سے مل کر بیٹھا جاتا ہے یہی مفہوم حَلِیْف کا بھی تھا کیونکہ اس کے بھی یہی معنے تھے کہ کُلُّ شَیْءٍ لَزِمَ شَیْئًا فَلَمْ یُفَارِقْهُ (اقرب) ایک چیز جو دوسرے کے ساتھ مل گئی اور پھر اُس سے جدا نہ ہوئی۔ حَفْلٌ کے معنے بھی اکٹھے ہونے اور آپس میں جڑ جانے کے ہیں (اقرب) اسی لئے جلسہ کو حَفْلَۃٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہاں بھی ایک دوسرے سے مل کر بیٹھا جاتا ہے۔اسی طرح حَفْلٌ کسی کام کو اس کی حد تک پہنچا دینے کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے اِحْتَفَلَ فِیْهِ اَیْ بَالَغَ (اقرب) یعنی اس نے اس کام کو اس کی حد تک پہنچا دیا۔ نیز کہتے ہیں اِحْتَفَلَ بِالْاَمْرِ اَیْ اَحْسَنَ الْقِیَامَ بِهٖ (اقرب) یعنی کسی معاملہ کی پوری نگہداشت کی۔اس میں بھی جڑنے اور دوسری چیز سے جدا نہ ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ کیونکہ کسی کام کو اس کی حد تک وہی شخص پہنچا سکتا ہے جو اس کام کے ساتھ چمٹا رہے اور اُس سے الگ نہ ہو۔ گویا اس میں بھی جڑنے کے معنے آ گئے۔اسی طرح اَحْسَنَ الْقِیَامَ بِهٖ کے بھی یہی معنے ہیں کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے اِدھر وہ کوئی کام شروع کرتے ہیں اور اُدھر اس کو چھوڑ دیتے ہیں گویا استقلال کا مادہ اُن میں نہیں ہوتا۔لیکن بعض ایسے ہوتے ہیں جو استقلال کے ساتھ اُس کام میں لگے رہتے ہیں گویا وہ اپنے کام کے ساتھ جڑے رہتے ہیں اُس سے الگ نہیں ہوتے۔اس میں بھی جُڑنے اور دوسری چیز سے الگ نہ ہونے کا مفہوم آ گیا۔

دوسرا اشتقاق لَحْفٌ ہے۔یہ بھی ایک دوسری چیز کو لپٹانے یا ملانے یا لگانے کے معنے دیتا ہے۔اسی سے ہماری

اُردو زبان کا لِحَاف نکلا ہے کیونکہ ہم اُس کو اوڑھ لیتے ہیں اور وُہ ساری رات ہمارے جسم سے چمٹا رہتا ہے۔

تیسرا اشتقاق لَفْحٌ ہے۔ اس کے معنے بھی چھونے کے ہوتے ہیں کہتے ہیں لَفَحَهٗ بِالسَّيْفِ: ضَرَبَهٗ بِهٖ (اقرب) یعنی اس کو تلوار سے مارا۔ اس میں دوسرے معنے بھی پائے جاتے ہیں یعنی وہ معنے جو نقصان اور ضرر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں لَفَحَتْهُ النَّارُ: اَحْرَقَتْهُ (اقرب) یعنی آگ نے اُس کو جلا دیا۔ لسان العرب والے کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ اَصَابَتْ وَجْهَهٗ یعنی آگ لگی اور اُس نے دوسرے کے منہ کو جُھلسا دیا۔ گویا اس میں چھونے کے معنی بھی پائے جاتے ہیں اور ضرر کے معنے بھی پائے جاتے ہیں۔ لُفَّاحٌ ایک خوشبودار بُوٹی ہوتی ہے جس کو سُونگھا جاتا ہے (اقرب) گویا اس اشتقاق میں بھی لگنے اور چھونے اور ضرر پہنچانے کے معنے شامل ہیں۔

چوتھا اشتقاق فَحْلٌ ہے اور فَحْلٌ عربی زبان میں سانڈ کو کہا جاتا ہے جس سے بچہ لیا جاتا ہے (اقرب) اس میں بھی چھونے کے معنے پائے جاتے ہیں کیونکہ اُسے بچہ لینے کے لئے مادہ پر ڈالا جاتا ہے۔ راوی کو بھی فَحْل کہتے ہیں (اقرب) جس سے دوسرے لوگ روایتیں نقل کرتے ہیں کیونکہ وہ بھی ساتھ رہتا ہے اور دوسرے کو چمٹا رہتا ہے۔ فَحْلَةٌ اُس عورت کو کہتے ہیں جو زبان دراز ہو (اقرب) جسے ذرا بھی کوئی بات کہہ دی جائے تو وہ پیچھے پڑ جائے۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں کہ پیچھا بھی چھوڑ۔ یعنی تُو تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے اپنی بات کو ختم ہی نہیں کرتا۔ پس فَحْلَةٌ اس عورت کو کہتے ہیں جو دوسرے کے پیچھے پڑ جائے اور ساتھ ہی وہ زبان دراز ہو۔ گویا اس میں بھی چمٹنے اور ضرر پہنچانے کے معنے پائے جاتے ہیں۔ ف ل ح اس کا آخری اشتقاق ہے جس سے ایک لفظ فَلَاح بنتا ہے۔ اس کے معنے کامیابی اور بامراد ہونے کے ہیں۔ اِن معنوں میں بھی ایک چیز کو اپنے ساتھ چمٹانے اور لگائے رکھنے کا مفہوم پایا جاتا ہے کیونکہ جو شخص اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے وُہ اُس کو اپنے پاس ہی رکھ لیتا ہے دوسرے کے پاس وہ اُس کو جانے نہیں دیتا۔ پھر فلح کے اشتقاق میں علاوہ کامیابی کے پھاڑنے کے بھی معنے پائے جاتے ہیں چنانچہ اسی اشتقاق سے فَلَّاح کا لفظ نکلا ہے جس کے معنے زمیندار کے ہیں جو زمین کو پھاڑتا ہے۔ ملّاح جو چپُّو سے کشتی کو چلاتا ہے اُس کو بھی اسی لئے فلاح کہہ لیتے ہیں کہ وہ پانی کو پھاڑ کر کشتی چلاتا ہے۔ اور یہ لفظ بھی اشتقاق اکبر کے طور پر ف لا ح کے معنوں پر دلالت کرتا ہے (اقرب)

ان سب معنوں کو جب اکٹھا ملا کر دیکھا جائے تو اِن میں دو باتیں پائی جاتی ہیں۔ اوّل ایک چیز کا دوسری چیز سے چمٹ جانا یا ایک چیز کو دوسری سے جوڑنا جیسے حَلِيْف اُس کو کہتے ہیں جو دوسرے سے جدا نہ ہو۔ حَفْلَةٌ اجتماع اور اکٹھے ہونے کو کہتے ہیں۔ لِحَافٌ اُس کو کہتے ہیں جو اُوپر آ کر لپٹ جاتا ہے۔ لَفْحٌ شعلہ کے آ چمٹنے کو کہتے ہیں۔

لُفَّاحٌ وہ بُوٹی ہے جسے سُونگھا جاتا یعنی ناک سے لگایا جاتا ہے۔ فَحْلٌ سانڈ کو کہتے ہیں جو مادہ پر سوار ہوتا ہے۔ فَحْلَةٌ اس عورت کو کہتے ہیں جو پیچھے پڑ جائے اور راوی بھی فَحْلٌ کہلاتا ہے کہ روایات یاد رکھنے کے لئے وہ ساتھ رہتا ہے۔ فَلَاح یعنی کامیابی کے بھی یہی معنے ہیں کہ انسان اپنے مطلب کو پالیتا ہے۔ گویا یہ سب معنے اکٹھا کرنے۔ جوڑنے اور ساتھ ملانے پر دلالت کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ایک اور معنے بھی پائے جاتے ہیں اور وہ آگ کے جلانے۔ تلوار مارنے اور زمین اور پانی کو پھاڑنے کے ہیں۔ گویا بعض اوقات کسی چیز کا دکھ دینا۔ جلانا یا چبھنا بھی اسی کے مفہوم میں شامل ہیں۔

یہ دونوں معنے قَسم کے اُس عام مفہوم سے ملتے ہیں جو ہمارے ملک میں سمجھا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں جہاں بھی حاء اور لام اور فاء اکٹھے ہوں گے وہاں دو معنے ضرور پائے جائیں گے۔ ایکؔ یہ کہ کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے جوڑنا۔ اور دوسرےؔ یہ کہ کسی چیز کو پھاڑنا۔ جلانا اور نقصان پہنچانا۔ اِن دونوں معنوں کو اگر مدنظر رکھا جائے تو حلف کے یہ معنے ہوں گے کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ ملانا۔ مگر اس طرح کہ بعض صورتوں میں قطع تعلق اور مخالفت کا بھی خطرہ ہو اور یہی غرض حلف کی ہوتی ہے۔ انسان قسم اس لئے کھاتا ہے کہ جس کی حلف اُٹھاتا ہے اُسے اپنا گواہ اور ساتھی قرار دیتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ اگر اُس کا نام میں غلط طور پر لیتا ہوں تو وہ مجھے سزا دے یا میرے جھوٹ پر گواہ ہو۔ پس حلف کا مفہوم یہ ہوا کہ بندہ ایک طرف خدا کو اپنے ساتھ ملاتا ہے اور کہتا ہے خدا میرے ساتھ ہے اور اُس کا علم میری اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر میں نے جھوٹ بولا ہے تو میں پھاڑا جاؤں۔ جلایا جاؤں۔ تباہ کر دیا جاؤں۔

دوسرا لفظ قسم کے لئے عربی زبان میں قَسَم ہی ہے کہتے ہیں اَقْسَمَ بِاللّٰہِ اُس نے اللہ کی قسم کھائی یا اُقْسِمُ بِاللّٰہِ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں اِس کا ثلاثی قَسَم ہے اور اس کے تین معنے ہیں قَسَمَ الرَّجُلُ الْمَالَ: جَزَّأَهٗ اَوْ فَرَزَهٗ اَجْزَاءً (اقرب) اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے یا اُسے تقسیم کیا۔ نیز کہتے ہیں قَسَمَ الدَّهْرُ الْقَوْمَ: فَرَّقَهُمْ (اقرب) قوم کو گردشِ زمانہ نے بکھیر دیا یا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پھر کہتے ہیں قَسَمَ فُلَانٌ اَمْرَهٗ: قَدَّرَهٗ وَنَظَرَ فِيْهِ كَيْفَ يَفْعَلُ اَوْ لَمْ يَدْرِ مَا يَصْنَعُ فِيْهِ (اقرب) یعنی جب یہ کہیں کہ قَسَمَ فُلَانٌ اَمْرَهٗ تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اُس نے اپنے کام کی تقسیم کی۔ اُس کا اندازہ کیا اور اس کے متعلق غور کیا کہ اُسے وہ کس طرح کرے یا وہ شک میں پڑ گیا کہ اس کام کو کس طرح سرانجام دے۔

عربی زبان میں قسم کے لئے استعمال ہونے والے الفاظ کی آپس میں معنی کی شرکت

میرے

نزدیک اَقْسَمَ بِاللّٰہِ کے معنے حَلَفَ بِہٖ کے ہی ہیں اور چونکہ اَقْسَمَ کے اور کوئی معنے عربی میں استعمال نہیں ہوئے اس لئے ثلاثی مجرد سے ہی اس کے معنوں کی حقیقت معلوم کرنی پڑے گی اور چونکہ اس کا فعل ثلاثی مجرد متعدی ہے اس لئے باب افعال کا ہمزہ سلب کے معنوں کے لئے زیادہ موزوں ہوگا جو اس باب کے ہمزہ کے مختلف معنی میں سے ایک معنے ہیں یعنی جو قَسَمَ کے معنے تھے وہ اَقْسَمَ بِاللّٰہ میں آکر سلبی صورت اختیار کرلیں گے وہاں اُس کے معنے تھے ٹکڑے کر دیا یا بکھیر دیا۔ اور یہاں یہ معنے ہوں گے کہ اختلاف دور کر دیا اور ٹکڑوں کو ملا دیا۔ گویا ملانے کے معنے آ گئے جو حلف کے معنوں سے مل جاتے ہیں۔ اسی طرح قَسَمَ فُلَانٌ اَمْرَہٗ کے معنے یہ تھے کہ وہ شک اور تردّد میں پڑ گیا۔ ایسے شک اور تردّد میں کہ لَمْ یَدْرِ مَا یَصْنَعُ فِیْہِ اُسے کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ اس بارہ میں کیا کرے۔ لیکن اَقْسَمَ کے معنے ہوں گے اُس نے شک کو دور کر دیا گویا ازالۂ شک کرنے والی چیز بن گئی۔ یہ معنے بھی حلف والے معنوں سے مل جاتے ہیں کیونکہ حلف کے ذریعہ انسان دوسرے کے تردّد کو دُور کرتا اور یقین دلاتا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بالکل درست ہے اور میری اس بات پر خدا بھی گواہ ہے۔ گویا ہمزہ کو اگر ہم سلبیہ مانیں تو حلف کے معنوں سے اس کے معنے بالکل مل جاتے ہیں۔ حلف میں بھی ملانے اور اکٹھا کر دینے کے معنے تھے اور اس میں بھی ٹکڑوں کو ملانے اور اختلاف کو دُور کرنے کا مفہوم شامل ہے اسی طرح وہاں بھی تردد کو دور کرنے کا مفہوم تھا اور یہاں بھی یہی مفہوم ہے کہ اُس نے تردّد دُور کر دیا۔

تیسرا لفظ قسم کے لئے عربی زبان میں یَمِیْن ہے لیکن اس لفظ کو قسم کے لئے اس لئے استعمال نہیں کرتے کہ اس میں قسم کی طرف کوئی معنوی اشارہ پایا جاتا ہے بلکہ یَمِیْن کا لفظ اس لئے قسم کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے کہ عرب لوگ قسم کھا کر جب معاہدہ کرتے تھے تو ایک دُوسرے کے دائیں ہاتھ کو چُھوتے تھے۔ پس چونکہ ایسے موقع پر اَیْمَن (یمین کی جمع ہے) ملائے جاتے تھے اس لئے قسم کے لئے بھی یمینؔ کا لفظ استعمال ہونے لگا (لسان) گویا یمینؔ کا لفظ صرف قسم کے ایک ذریعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اس کے لئے لغت موضوع نہیں ہے۔

پس قسم کے بارہ میں لغت کی شہادت صرف حلف اور قَسم کے لفظوں سے ملتی ہے اور جیسا کہ میں اُوپر بتا آیا ہوں اِن دونوں لفظوں سے یہ شہادت ملتی ہے کہ حلف اور قسم کے لفظوں کی غرض مشترک اتحاد پیدا کرنا۔ شک کو دُور کر نا سزا دینا اور قطع کرنا ہے۔ یعنی ایک طرف قسم کے ذریعہ انسان اللہ تعالیٰ سے اتحاد پیدا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس معاملہ میں میرا علم اور خدا تعالیٰ کا علم ایک ہی ہے اور دوسری طرف وہ یہ بات پیش کرتا ہے کہ اگر میں نے یہ بات غلط کہی ہے تو اللہ تعالیٰ کی سزا مجھ پر نازل ہو۔ پس حلف کی غرض عربوں کے نزدیک یہ ٹھہری کہ جس سے ایک وجود

دوسرے وجود سے اپنا اتحاد ثابت کر کے اُسے اپنے سچے ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے اور اُس میں غلط ہونے کی صورت میں قطع وعذاب کا مطالبہ کرتا ہے۔

قسم خدا کی طرف سے نازل ہونے والے کلام کے لئے خدائی کلام ہونے کا ایک ثبوت اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا ان معنوں کے رُو سے خدا تعالیٰ کے لئے حلف اٹھانی جائز ہوسکتی ہے یا نہیں۔ اور کیا جب خدا تعالیٰ کسی چیز کی قسم کھائے تو یہ معنے وہاں چسپاں ہو سکتے ہیں؟ سو ہم دیکھتے ہیں کہ گو جو کچھ خدا تعالیٰ کہے اس کے انکار کی کسی انسان کو گنجائش نہیں ہوسکتی کیونکہ ہم مانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہے اور جب وہ ہمیں کہتا ہے کہ بات یوں ہے تو ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے لازماً ہمیں ماننا پڑے گا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک ہے۔ لیکن ایک اور سوال ہے جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ اس مقام پر ٹھوکر کھا جاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ وراء الوراء ہے وہ ہمیں اپنی آنکھوں سے نظر نہیں آ سکتا۔ یہ نہیں ہوا کہ آسمان پھٹا ہو اور خدا تعالیٰ نے یہ کہا ہو کہ فلاں بات میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تھی یا فلاں بات میں نے موسیٰ ؑ سے کہی تھی یا فلاں بات میں نے عیسیٰ ؑ سے کہی تھی یا فلاں بات میں نے زرتشت سے کہی تھی یا فلاں بات کرشنؑ سے کہی تھی۔ حضرت نوح ؑ آئے تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے ایسا کہا ہے۔ حضرت ابراہیم ؑ آئے تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ خدا نے مجھ سے ایسا کہا ہے۔ حضرت موسیٰ ؑ آئے تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ خدا نے مجھ سے ایسا کہا ہے حضرت عیسیٰ ؑ آئے تو انہوں نے بھی یہی کہا اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ سے ایسا کہا ہے مگر اُن کے مخاطبین نے اپنی آنکھوں سے خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ اُن کے سامنے بات کرنے والا انسان ہی ہوتا تھا خدا تعالیٰ نہیں ہوتا تھا اور چونکہ خدا تعالیٰ نظر نہیں آتا اس لئے گو خدا تعالیٰ کی بات کا انکار نہیں ہوسکتا مگر اس کی طرف سے بھیجا ہوا کلام ضرور ثبوت کا محتاج ہوتا ہے۔ پس بے شک خدا تعالیٰ کو اپنی بات منوانے کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں مگر اُس کے کلام کو ایسے ثبوت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ لوگ اس کلام کو براہ راست اللہ تعالیٰ کے منہ سے نہیں سنتے بلکہ ایک اپنے جیسے انسان کے منہ سے سنتے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ خدا تعالیٰ کو قسم کی کیا ضرورت ہے محض ایک دھوکا ہے اگر مخاطب یہ بھی مان لیں کہ اس کلام کو سننے والا مانتا ہے کہ وہ خدا کا کلام ہے تو بھی اُس مدعی یا یہ یقین ہر سننے والے کو تو یقین نہیں دلا سکتا۔ مثلاً میں قرآن مجید پر کامل ایمان رکھتا ہوں میرے سامنے اگر بغیر قسم کے بھی قرآن مجید کوئی بات پیش کرے تو میں کہوں گا کہ ہاں بالکل درست ہے مجھے اس کی صداقت پر پورا ایمان ہے لیکن جو شخص قرآن مجید کو نہیں مانتا اُس کو تو ثبوت کی ضرورت ہے وہ بغیر کسی ثبوت کے کس طرح تسلیم کر لے گا کہ جو بات اُس کے سامنے پیش کی

جارہی ہے وہ خدا تعالیٰ نے ہی کہی ہے کسی انسان نے اپنے پاس سے نہیں بنالی۔ اگر اس قسم کا ثبوت خدائی کلام میں موجود نہ ہوتو اس کا ایک بہت بڑا نقصان یہ ہو کہ صادق اور کاذب مدعی میں کوئی مابہ الامتیاز نہ رہے گا اور لوگ اسی دھوکا میں گرفتار رہیں گے کہ ہمارے سامنے جو مدعی کھڑا ہے اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے کلام نازل ہوتا ہے یا یہ اپنے پاس سے بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے پس اس قسم کا ثبوت صرف اس لئے ضروری نہیں کہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جو بغیر اس امر پر تسلّی پانے کے کہ اس کلام کے پیش کرنے والے کو خود بھی اپنے الہام پر کامل یقین ہوتا ہے ایمان لانے کے لئے تیار نہیں ہوتیں بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ یہ خدا کا ہی کلام ہے اور اس کے متعلق جھوٹ سے کام نہیں لیا گیا۔ اگر بغیر دلیل اور ثبوت کے الٰہی کلام پیش کر دیا جائے اور جب کوئی ثبوت مانگے تو اُسے کہہ دیا جائے کہ خدائی کلام کے متعلق کسی ثبوت کی کیا ضرورت ہے کیا یہ بات کم ہے کہ میں کہہ رہا ہوں خدا تعالیٰ نے یہ کلام نازل کیا ہے تو کل کوئی جھوٹا مدعی کھڑا ہو جائے گا اور وہ بھی کہنا شروع کر دے گا کہ مجھے خدا تعالیٰ نے اس اس طرح کہا ہے۔ تب لوگ گھبرائیں گے کہ ہم کیا کریں کس کو مانیں اور کس کو ردّ کریں یہ بھی کہتا ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے کھڑا کیا ہے اور وہ بھی کہتا ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے کھڑا کیا ہے ہم اس کی بات مانیں یا اس کی بات مانیں۔ پس چونکہ صادق اور کاذب مدعیان میں اس طرح کوئی مابہ الامتیاز نہیں رہ سکتا تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے جھوٹے مدعیان نبوت کے فتنوں کو باطل کرنے اور دنیا پر ان کا جھوٹ ظاہر کرنے کے لئے اپنے اُوپر یہ واجب کر لیا ہے کہ وہ خود اپنے کلام کی سچائی کا ثبوت پیش کیا کرے گا۔ اگر حضرت ابراہیم یہ کہتے کہ جب میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ایسا کہہ رہا ہے تو تم کیوں نہیں مانتے۔ یا حضرت موسیٰؑ کہتے کہ تمہیں کسی ثبوت کی کیا ضرورت ہے میں جو کہہ رہا ہوں کہ خدا تعالیٰ مجھ سے ہم کلام ہوا اور اُس نے مجھ سے یہ یہ بات کی یا حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں کہ مجھ سے کسی ثبوت مانگنے کی کیا ضرورت ہے میں جو کہہ رہا ہوں کہ خدا مجھ سے بولا اور اُس نے مجھے یہ پیغام دیا۔ یا اگر یہی طریق حضرت زرتشتؑ اختیار کرتے یہی طریق حضرت کرشنؑ اختیار کرتے یہی طریق حضرت رامچندر اختیار کرتے تو لوگ اس قدر ڈر جاتے کہ جو شخص بھی ان کے زمانہ میں مدعی بن جاتا اُسے مان لیتے اور اُس سے کسی ثبوت کا مطالبہ نہ کرتے اور چونکہ جھوٹے مدعی ہر زمانہ میں ہو سکتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جھوٹ پھیل جاتا اور صداقت مشتبہ ہو جاتی۔ پس خدا تعالیٰ نے اس فتنہ کو روکنے کے لئے اپنے کلام کی صداقت کا ثبوت مہیا کرنا اپنے اوپر واجب کر لیا ہے تا کہ جب کوئی کہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ کلام خدا تعالیٰ نے نازل کیا ہے تو فوراً اس کے سامنے ثبوت پیش کر دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ یہ یہ ثبوت ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے کسی انسان کا بنایا ہوا کلام

نہیں۔ پس چونکہ کاذب اور صادق میں امتیاز کرنا ضروری تھا اس لئے خدا تعالیٰ کا کوئی ایسا ثبوت پیش کرنا جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ کلام جو اس کی طرف منسوب کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے درست ہے یا نہیں اس کی شان کے خلاف نہیں بلکہ اُس کی شانِ رحیمیت کا عین تقاضا ہے۔ وہ شخص جو خدا تعالیٰ کی طرف ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اگر وہ اپنے اُس کلام کی صداقت کا کوئی ثبوت پیش نہ کرے جسے وہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے بلکہ اگر اُسے کہا جائے کہ کوئی ثبوت اپنی سچائی میں پیش کرو تو وہ اس بات کو خدا تعالیٰ کی ہتک قرار دینے لگے تو نظام عالم پر تباہی آجائے۔ روز کوئی نہ کوئی مدعی کھڑا ہو جائے اور خدا تعالیٰ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنا شروع کر دے اِسی لئے خدا تعالیٰ نے یہ واجب کر لیا ہے کہ وُہ اپنے کلام کی سچائی کے ثبوت میں تائیدی شہادات پیش کیا کرے ورنہ کمزور لوگوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا ایسے ثبوت پیش کرنا اس کی شان کے خلاف نہیں بلکہ اس کی گواہی اپنے کلام کی سچائی کے لئے نہایت ہی ضروری ہے۔ اس لئے بھی کہ بندوں پر ثابت ہو جائے کہ وہ خدا کا کلام تھا اور اس لئے بھی کہ کوئی جھوٹا آدمی یہ جرأت نہ کرے کہ وہ بغیر کسی ثبوت کے خدا تعالیٰ کی طرف باتیں منسوب کرنے لگ جائے۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی تو اب اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی روک نہیں ہو سکتی۔ کہ کوئی ایسا ثبوت جو حلف کے مشابہ ہو یقیناً ایک بہت بڑا ثبوت کلام الٰہی کی صداقت کا ہوگا۔ اور خدا تعالیٰ کا اپنے کلام کی تائید میں کسی ایسی دلیل کا پیش کرنا اس کی شان کے خلاف نہ سمجھا جائے گا بلکہ عین ضروری ہوگا۔

کسی کلام کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت حلف ہی ہوتا ہے جب ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ اپنے کلام کی صداقت کا ثبوت خدا تعالیٰ کو بھی پیش کرنا چاہیے تو اب سوال یہ ہے کہ صداقت کا ثبوت سب سے بڑا کون سا ہوتا ہے؟ دنیا میں صداقت کا سب سے بڑا ثبوت حلف کو سمجھا جاتا ہے بلکہ آخری فیصلہ حلف پر ہی قرار پاتا ہے کیونکہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جنہیں حلف کے بغیر اور کسی بات سے اطمینان ہی نہیں ہوتا۔ وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ فلاں شخص نیک ہے وہ یہ بھی یقین رکھتے ہوں گے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا مگر ساتھ ہی اُن کے دلوں میں یہ شبہ بھی ہوگا کہ کہیں یہ سب کچھ ڈھکونسلہ ہی نہ ہو کہ آسمان سے فرشتے اُترتے اور اللہ تعالیٰ کا کلام لاتے ہیں یا اللہ تعالیٰ بالمشافہ کسی شخص سے گفتگو کر سکتا ہے۔ لیکن جب کوئی قسم کھا لیتا ہے تو ان کو تسلی ہو جاتی ہے اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ صرف ڈھکونسلہ نہیں بلکہ مشاہدہ اس کی تائید میں ہے۔ اگر مشاہدہ اس کی تائید میں نہ ہوتا تو یہ قسم کیوں کھاتا۔

قرآن کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کا قسم کھانا پس شبہ کو دور کرنے والی آخری چیز حلف ہی ہے اور جب شُبہات کو دُور کرنے کا خدا تعالیٰ نے حلف کو ایک قطعی اور یقینی ذریعہ قرار دیا ہوا ہے تو خدا تعالیٰ

کا کلام جو سب سے زیادہ دلائل کا حقدار ہوتا ہے اگر اس دلیل کو ترک کر دے اور یہ ثبوت اپنی تائید میں پیش نہ کرے تو وُہ یقیناً ایک مفید اور ضروری پہلو کو ترک کرنے والا قرار پائے گا اور دنیا کے ایک حصہ کو جس کا حلف کے بغیر اور کسی بات سے اطمینان نہیں ہوتا غیر مطمئن رکھنے والا سمجھا جائے گا۔

اس اعتراض کا جواب کہ گو حلف قرآن مجید خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہے لیکن اس کے کھانے والے تو آنحضرت صلعم ہی ہیں اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گو حلف خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئی ہو مگر قسم کھانے والا تو وہ انسان ہی ہوگا جو اس کلام کو پیش کرتا ہے اس صُورت میں اسے کلام الٰہی کی سچائی کا ثبوت کس طرح سمجھا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بے شک حلف کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہوگا اور بے شک حلف کھانیوالا بھی ایک انسان ہی ہوگا جو اس کلام کو پیش کرتا ہے لیکن اگر وہ جھوٹا ثابت ہوگا تو وہ قسم کس کے خلاف پڑے گی یقیناً اسی انسان کے خلاف پڑے گی جس نے اس قسم کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ مثلاً زید کہتا ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے ایسا کہا اور زید بھی کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ قسم کھا کر کہتا ہے کہ یہ بات سچی ہے۔ اب اگر وہ اپنی اس بات میں جھوٹا ہے اور اُسے خدا تعالیٰ نے کوئی بات نہیں کہی تو اُس قسم کی ذمہ واری کس پر عائد ہوگی؟ اُسی پر ہوگی جس نے خدا تعالیٰ پر جھوٹ بولا اور جھوٹی قسم کھا کر لوگوں کو دھوکا دیتا رہا اور جب اُسی پر اس کی ذمہ واری ہوگی تو جب وہ الٰہی گرفت میں آئے گا سب لوگوں کو پتہ لگ جائے گا کہ وہ ایک جھوٹا انسان تھا جس نے افتراء سے کام لیا اور جس کے نتیجہ میں وہ الٰہی عذاب میں گرفتار ہو گیا۔ پس بنی نوع انسان کے دلوں کو یقین دلانے اور اُن کے شکوک و شبہات کو دُور کرنے کے لئے ضرور کوئی ایسا طریق ہونا چاہیے تھا جس سے ان کی تسلی ہو جاتی اور اسی وجہ سے قرآن کریم میں قسمیں کھائی گئی ہیں ان قسموں کے متعلق دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) یا تو کوئی شخص یہ تسلیم کرے گا کہ یہ قسمیں خدا تعالیٰ نے ہی کھائی ہیں کسی انسان نے نہیں کھائیں۔ اور جب وہ ان قسموں کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرے گا تو یہ لازمی بات ہے کہ وہ کلام الٰہی کی صداقت پر بھی ایمان رکھے گا۔ (۲) یا پھر اس کا یہ عقیدہ ہوگا کہ یہ قسمیں خدا نے نہیں کھائیں بلکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کھائی ہیں تب بھی وہ یقین رکھے گا کہ اگر انہوں نے نعوذ باللہ جھوٹی قسمیں کھائی ہیں تو خدا تعالیٰ اُن کو سزا دے گا۔ گویا اس دلیل کی جو غرض تھی وہ بہر حال پوری ہو جائے گی۔ اگر کسی شخص نے قرآن کریم کو خدا تعالیٰ کا کلام مان لیا تو اُس کے لئے کسی حلف یا تائیدی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ وہ یقین رکھے گا کہ جس قدر قسمیں کھائی ہیں خدا تعالیٰ نے ہی کھائی ہیں اور اگر وہ سمجھے گا کہ یہ قسمیں خدا تعالیٰ نے نہیں کھائیں بلکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نعوذ باللہ خدا تعالیٰ پر افتراء کیا ہے تب بھی اس کا

دل مطمئن ہو جائے گا۔اور وہ سمجھے گا کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے چونکہ (نعوذ باللہ من ذالک) جھوٹی قسمیں کھائی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں پکڑے اور سزا دے۔اس کے بعد اِن قسموں کے نتائج اُس پر خود ظاہر کر دیں گے کہ حقیقت کیا ہے۔بہر حال حلف کلام الٰہی کی صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔اور گو حلف کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔مگر چونکہ جھوٹے کلام کی صورت میں قسم کھانے والا وہی انسان ہوگا جو اس کلام کو پیش کرتا ہے۔اس لئے وہ قسم اس کے خلاف پڑے گی اور اس طرح ظاہر ہو جائے گا کہ حقیقت کیا تھی۔صداقت کس طرف تھی اور دھوکہ وفریب کس طرف تھا۔

دوسرے وہی حلف حلف کہلا سکے گی جو حلف کی غرض پوری کرتی ہو۔اور حلف کی غرض یہی ہوتی ہے کہ دوسرے وجود سے اپنا تعلق بتا کر اُسے بطور شاہد پیش کیا جاتا ہے اور اِن معنوں سے خدا تعالیٰ بھی حلف اٹھا سکتا ہے کیونکہ حلف کی ایک غرض یہ ہوتی ہے کہ قسم کھا کر دوسرے کو یقین دلایا جاتا ہے کہ اس بارہ میں فلاں اور مَیں دونوں ایک ہی بات کہتے ہیں۔جب کوئی کہتا ہے خدا تعالیٰ کی قسم! فلاں بات اس طرح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ بھی جانتا ہے کہ یہ بات اس طرح ہے۔اور میں بھی جانتا ہوں کہ یہ بات اس طرح ہے اور اگر کسی اور چیز کی گواہی اپنی تائید میں پیش کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز بھی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بالکل درست ہے۔اس طرح اُس چیز کی گواہی بتا دیتی ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ غلط ہے یا درست۔خدا تعالیٰ چونکہ لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے اس لئے جب وہ کسی چیز کو بطور گواہ پیش کرے گا تو اُس چیز کی گواہی صداقت یا عدم صداقت کو بالکل ظاہر کر دے گی۔اگر وہ چیز گواہی دے دے گی تو ثابت ہو جائے گا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ کہا گیا ہے واقعہ میں وہ اُسی نے کہا ہے اور اگر وہ چیز گواہی نہیں دے گی تو ثابت ہو جائے گا کہ خدا تعالیٰ کی طرف غلط بات منسوب کی گئی ہے پس خدا تعالیٰ کے قسم کھانے کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ اس چیز یا چیزوں کو جن کی وہ حلف اٹھاتا ہے اپنے دعویٰ کی صداقت کے لئے بطور گواہ پیش کرتا ہے اگر وہ اشیاء گواہی دے دیں گی تو معلوم ہو جائے گا کہ خدا تعالیٰ کی طرف وہ کلام سچے طور پر منسوب کیا گیا ہے اور اگر وہ گواہی نہیں دیں گی تو ثابت ہو جائے گا کہ وہ کلام جھوٹے طور پر خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہوا ہے۔مثلاً خدا تعالیٰ کے کلام میں اگر یہ آجائے کہ فلاں بات کی صداقت پر پہاڑ گواہی پیش کریں گے تو یہ بات بالکل صاف ہو جائے گی اگر پہاڑ گواہی دے دیں گے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ بات خدا تعالیٰ نے ہی کہی تھی کیونکہ پہاڑوں سے گواہی دلوانا کسی انسان کے اختیار میں نہیں خدا ہی اُن سے گواہی دلوا سکتا ہے۔اور اگر وہ گواہی نہیں دیں گے تو کلام کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے گا

اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کے کلام میں آ جائے کہ فلاں بات کی صداقت پر دریا گواہی دیں گے تو ہم دیکھیں گے کہ دریا اُس بات کی صداقت میں اپنی گواہی پیش کرتے ہیں یا نہیں اگر وہ گواہی دے دیں گے تو ثابت ہو جائے گا کہ خدا تعالیٰ نے ہی وہ بات کہی تھی اور اگر وہ گواہی نہیں دیں گے تو ثابت ہو جائے گا کہ وہ خدا تعالیٰ کا کلام نہیں تھا بلکہ جھوٹے طور پر اُس کی طرف منسوب کیا گیا تھا کیونکہ کوئی انسان یہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ کسی پہاڑ سے گواہی دلوا سکے یا کسی دریا کو گواہ بنا سکے۔ یہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کے قبضہ وتصرف میں ہیں اور وہی طاقت رکھتا ہے کہ اُن سے گواہی لے کر دُنیا کے سامنے پیش کرے۔

خدا تعالیٰ کی بات کے لئے مخلوق کے گواہی دینے کا مطلب اگر کہا جائے کہ خدا تعالیٰ کی بات کو مخلوق کی گواہی سے کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے تو اس کا جواب وہی ہے جو اُوپر بیان ہو چکا ہے کہ الٰہی کلام کے بارہ میں یہ سوال نہیں ہوا کرتا کہ آیا خدا تعالیٰ نے سچ کہا ہے یا نہیں بلکہ سوال یہ ہوا کرتا ہے جو بندہ اُس کلام کو پیش کر رہا ہے وہ خدا تعالیٰ پر سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔ پس یہ بحث ہی نہیں ہوتی کہ خدا تعالیٰ سچ کہہ رہا ہے یا نہیں۔ بلکہ بحث یہ ہوا کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ کا نمائندہ ہونے کا مدعی انسان جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سچ ہے یا نہیں۔ پس وہ دلیل جو مخلوق کی شہادت کی خدا تعالیٰ کی طرف سے پیش کی جائے گی وہ اس امر کو ثابت کر دے گی کہ مدعی جو کچھ کہہ رہا تھا سچ کہہ رہا تھا اور اُس کا پیش کردہ کلام فی الواقعہ خدا تعالیٰ کی طرف سے تھا اور اس لئے وہ شخص سچا ہے پس مخلوق نے خدا تعالیٰ کو سچا ثابت نہیں کیا بلکہ اُس انسان مدعی کو سچا ثابت کیا جو خدا تعالیٰ کی طرف ایک کلام منسوب کر رہا تھا جب کسی پیشگوئی کے مطابق دریا گواہی دینے لگ جائیں یا پہاڑ گواہی دینے لگ جائیں یا سورج اور چاند گواہی دینے لگ جائیں اور فرض کرو کہ ان پیشگوئیوں کا ذکر کرشن کے کلام میں آتا ہو تو دریاؤں اور پہاڑوں اور سورج اور چاند کی گواہی اس بات کو ثابت نہیں کرے گی کہ خدا تعالیٰ سچا ہے بلکہ اس بات کو ثابت کرے گی کہ کرشن جی نے جھوٹ نہیں بولا بلکہ اُس نے خدا تعالیٰ کی طرف جس کلام کو منسوب کیا تھا وہ خدا تعالیٰ کا ہی کلام تھا یا اگر حضرت ابراہیمؑ کی صداقت میں پہاڑ اور دریا گواہی دینے لگ جائیں تو اس کا یہ نتیجہ نہیں نکالا جائے گا کہ چونکہ ان چیزوں نے گواہی دیدی ہے اِس لئے خدا تعالیٰ سچا ہے بلکہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ ابراہیمؑ سچ کہہ رہا تھا کہ اُسے خدا تعالیٰ نے یہ یہ باتیں کہی ہیں یا جب حضرت موسیٰؑ کی پیشگوئی میں ذکر آ جائے کہ پہاڑ اور دریا گواہی دیں گے اور وہ واقعہ میں گواہی دے دیں تو اُن کی گواہی سے یہ ثابت نہیں ہوگا کہ خدا تعالیٰ سچا ہے بلکہ یہ ثابت ہوگا کہ موسیٰؑ نے اپنے خدا پر جھوٹ نہیں بولا بلکہ جو کچھ کہا سچ کہا۔ یا اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تائید میں پہاڑ اور دریا اور دنیا کی اور چیزیں گواہی دینے لگ جائیں تو اس کے

یہ معنے نہیں ہوں گے کہ خدا تعالیٰ ان چیزوں کی گواہی کا محتاج تھا بلکہ اس کے صرف یہ معنے ہوں گے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ اپنی صداقت کے لئے ان گواہیوں کا محتاج تھا جب ان چیزوں نے گواہی دے دی تو ثابت ہو گیا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جب کہا تھا کہ پہاڑ گواہی دیں گے یا دریا گواہی دیں گے تو انہوں نے یہ بات اپنی طرف نہیں کہی تھی بلکہ خدا کی طرف سے کہی تھی۔ پس مخلوق نے خدا تعالیٰ کو سچا ثابت نہیں کیا بلکہ اُس انسان مدعی کو سچا ثابت کیا جو خدا تعالیٰ کی طرف ایک کلام منسوب کر رہا تھا۔

اس سوال کا جواب کہ اگر قرآن مجید کی صداقت کے لئے حلف کی ضرورت تھی تو آنحضرت صلعم کو حلف اٹھانا چاہیے تھا نہ کہ خدا کو اگر کہا جائے کہ جب سوال صرف اُس انسان کی سچائی کا ہوتا ہے جو خدا کا کلام پیش کر رہا ہوتا ہے تو اُسے خود قسم کھانی چاہیے نہ کہ خدا تعالیٰ کو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل وہ انسان بھی الگ قسم کھایا کرتا ہے لیکن چونکہ الٰہی کلام بھی مکمل ہوتا ہے اس لئے اُس کے اندر بھی حلف کا ثبوت جو دنیا میں اکثر لوگوں کے نزدیک سب سے کامل ہوتا ہے ہونا چاہیے تا اندرونی شہادت اس امر پر موجود ہو کہ وہ کلام مکمل ہے ورنہ وہ مکمل نہیں رہے گا۔ اگر کلام الٰہی میں حلف موجود نہ ہو بلکہ نبی اپنے دعویٰ کی صداقت میں علیحدہ طور پر قسم کھائے تو اس کی حلف اوّل مستقل نہیں ہوگی جیسے حدیثوں میں اس قسم کی حلف کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ مگر حدیثوں کے متعلق لوگ شبہ کرتے ہیں کہ نہ معلوم وہ صحیح ہیں یا نہیں۔ اُن کا یہ شبہ صحیح ہو یا غلط یہ الگ بحث ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں کو اس قسم کے شبہ کی گنجائش ہے اور ہم بھی دعویٰ سے نہیں کہہ سکتے کہ ہر حدیث صحیح ہے یا ہر حدیث انہی الفاظ میں ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمائے۔ یقینی اور قطعی کلام جس کے ایک ایک لفظ پر ہم حلف اٹھا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور اسی طرح ہے جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے بیان فرمایا وہ صرف قرآن کریم ہی ہے۔ چنانچہ میور اور نولڈک جیسے دشمنانِ اسلام بھی یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ جس طرح محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے بتایا اُسی طرح آج تک موجود ہے اُس میں ذرا بھی تغیّر و تبدّل نہیں ہوا (لائف آف محمد سر ولیم میور صفحہ ۵۶۲، ۵۶۳ زیر عنوان sources for the biography of Mahomet انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Koran)۔ پس اگر اس کلام میں قسم موجود ہوگی تو یہ اس بات کا ایک قطعی اور یقینی ثبوت ہوگا۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قسم کھائی ہے۔ اگر اس کلام میں قسم موجود نہ ہوتی تو دوسری قسمیں جو حدیثوں وغیرہ میں آتی ہیں وہ اس قِسم کی قطعی اور یقینی نہیں ہو سکتی تھیں۔ پس الٰہی کلام میں بھی حلف کا ثبوت موجود ہونا چاہیے تھا تا کہ یہ اندرونی شہادت دوسری شہادتوں کی تکمیل کرتی۔

دوسرے کلام الٰہی میں کلام لانے والے کی حلف نہیں ہو سکتی بلکہ خدا تعالیٰ کی ہی ہوگی۔ اگر نبی کی حلف ہوگی تو کلام اللہ میں انسانی کلام مل جائے گا۔ مثلاً محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ کہتے کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے خدا تعالیٰ نے بھیجا ہے اور یہ الفاظ قرآن کریم میں موجود ہوتے تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ کلام اللہ میں غیر کا کلام بھی شامل ہو گیا حالانکہ قرآن کریم وہ کتاب ہے جو بسم اللہ کی باء سے لے کر والناس کے س تک تمام کا تمام خدا تعالیٰ کا کلام ہے یا اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فقرہ اُس میں موجود ہوتا کہ اے لوگو سنو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں تو اس صورت میں بھی انسانی کلام اللہ تعالیٰ کے کلام میں شامل ہو جاتا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کے کلام میں یہ آجاتا کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہم تجھے کہتے ہیں کہ تو اپنے دعویٰ کی صداقت کے متعلق لوگوں کے سامنے قسم کھا تب بھی شبہ کی گنجائش رہتی کہ نہ معلوم انہوں نے قسم کھائی ہے یا نہیں کھائی۔ جیسے قرآن کریم میں کئی مقامات پر آتا ہے کہ قُلْ یعنی اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم تُو لوگوں سے ایسا کہہ دے۔ اب گو ہمارا یقین ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وہ تمام باتیں لوگوں سے کہہ دیں مگر پھر بھی لفظ قُلْ سے ایک دشمن کی نگاہ میں تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہہ بھی دیا تھا۔ اسی طرح اگر قرآن کریم میں ہوتا اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم تُو قسم کھا تو دشمن کہہ سکتے تھے کہ کیا معلوم انہوں نے قسم کھائی تھی یا نہیں بہر حال دونوں صورتوں میں قسم کی غرض فوت ہو جاتی۔ اگر کلام الٰہی میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قسم آجاتی تو کلام الٰہی میں انسانی کلام مل جاتا اور اگر خدا تعالیٰ اپنے کلام میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو قسم کھانے کی ہدایت فرماتا تو پھر بھی لوگوں کو یہ شبہ رہتا کہ نہ معلوم انہوں نے اس کے مطابق قسم کھائی تھی یا نہیں اور اگر الگ قسم کھا لیتے تب بھی کلام الٰہی اس زبردست ثبوت کی عدم موجودگی کی وجہ سے نامکمل رہتا۔

دوسری بات یہ مدنظر رکھنی چاہیے کہ قرآن کریم نے جن امور پر قسم کھائی ہے یا جن امور کو اپنی صداقت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے اُن میں سے کم سے کم ایک حصہ تو ضرور ایسے علوم سے تعلق رکھتا ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علم اور قبضہ سے بالا تھے (میرے نزدیک سب قسمیں ہی ایسے امور پر مشتمل ہیں) اُن کو شہادت کے طور پر وہ پیش ہی کس طرح کر سکتے تھے انہیں تو خدا تعالیٰ جو علیم وخبیر ہے وہی پیش کر سکتا تھا اور اُسی نے پیش کیا۔ پس یہ سوال کہ قسم اُس انسان کی کھانی چاہیے تھی جس پر خدا کا کلام نازل ہو رہا تھا نہ کہ خدا تعالیٰ کو۔ بالکل غلط ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تو ان چیزوں کا علم ہی نہیں تھا اور نہ یہ چیزیں اُن کے قبضہ اور اختیار میں تھیں پھر وہ اُن کی قسم کس طرح کھا سکتے تھے۔ پس قسمیں چونکہ علوم غیبیہ پر مشتمل ہوتی ہیں اس لئے کوئی نبی وہ قسمیں کھا ہی نہیں سکتا

کیونکہ اُسے معلوم ہی نہیں ہوسکتا کہ آئندہ کیا کچھ ہونے والا ہے خدا تعالیٰ ہی ہے جو ان چیزوں کوشہادت کے طور پر پیش کرسکتا ہے۔اگر کہا جائے کہ قسم کی ضرورت ہی کیا ہے بہت سے لوگ قسم کو وقعت ہی نہیں دیتے اور وہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی قسم کا کیا سوال ہے قسم تو بندے کو بھی نہیں کھانی چاہیے چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب پادری آتھم کے مقابلہ میں یہ بات پیش کی کہ اگر پیشگوئی کی ہیبت اس کے دل پر طاری نہیں ہوئی تو وہ قسم کھا کر اعلان کردے تو عیسائیوں نے یہی کہا کہ قسم کھانا کوئی اچھی بات نہیں ہم اس طریق فیصلہ کو قبول نہیں کرسکتے (ضیاء الحق روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۲۵۶۔۲۵۷)۔تو بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قسم کی کوئی قیمت ہی نہیں سمجھتے اور اس وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ الٰہی کلام میں بھی قسمیں نہیں آنی چاہئیں۔اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بے شک بعض لوگ قسم کو وقعت نہیں دیتے مگر کسی کے وقعت نہ دینے سے کیا بنتا ہے۔سوال تو یہ ہے کہ قسم اپنی ذات میں وقعت رکھتی ہے یا نہیں؟اگر رکھتی ہے تو بے شک بعض لوگ اُسے وقعت نہ دیں ان کی وجہ سے ایک سچائی کو چھوڑا نہیں جاسکتا اگر کوئی خدا ہے تو اُس کی جھوٹی قسم کھانا یقیناً سخت عذاب کا موجب ہونا چاہیے بشرطیکہ دنیا کو اُس سے کوئی بڑا نقصان پہنچتا ہو لغو قسم نہ ہو۔پس قسم اپنی ذات میں ایک بہت بڑا ثبوت ہے اور بعض کے نہ ماننے کی وجہ سے اُسے چھوڑا نہیں جاسکتا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر بعض اُسے مفید نہیں سمجھتے تو بعض دُوسرے اُسے ایک اہم دلیل قرار دیتے ہیں۔بے شک کچھ حصّہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو کہتے ہیں کہ قسم ایک لغو اور فضول چیز ہے مگر کچھ حصہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جن کی قسم کھانے کے بغیر تسلّی ہی نہیں ہوتی۔جو کلام ساری دنیا کے لئے آئے گا اُس کے لئے ضروری ہوگا کہ اگر کسی ایک گروہ کا مطالبہ بھی جائز اور درست ہو تو اُس کو پورا کرے۔کیونکہ قرآن کریم صرف اُن لوگوں کے لئے نہیں جو قسم کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔بلکہ ساری دنیا کے لئے ہے جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کا قسم کے بغیر اطمینان ہی نہیں ہوتا۔پس جہاں جہاں قسمیں نہیں کھائی گئیں اُس حصۂ قرآن سے وہ لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو قسموں کو ضروری نہیں سمجھتے اور جہاں قسمیں کھائی گئی ہیں اُسی حصہ سے وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو قسموں کو ضروری سمجھتے ہیں۔اگر صرف ایک گروہ کا مطالبہ پورا کردیا جاتا اور دوسرے گروہ کا جائز مطالبہ ردّ کردیا جاتا تو قرآن کریم سب لوگوں کے لئے نہیں ہوسکتا تھا۔پھر وہ ایک محدود طبقہ کے لئے رہ جاتا۔غرض چونکہ دنیا میں ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو قسموں پر اعتبار کرتا ہے بلکہ اسے ضروری سمجھتا ہے اس لئے قرآن کریم کا فرض تھا کہ وہ اور دلائل کے ساتھ اس دلیل کو بھی پیش کردیتا اور اُس ثبوت کو ترک نہ کرتا جو ایک طبقہ کے اطمینان کے لئے ضروری تھا۔حدیثوں میں آتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک شخص آیا اور اُس نے کہا میں آپ سے یہ بات دریافت کرنا چاہتا ہوں

کہ آپ خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ آپ جو باتیں کہہ رہے ہیں اُن کے کہنے کا آپ کو خدا نے حکم دیا ہے؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا مَیں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ اِس پر وہ اسی وقت آپ پر ایمان لے آیا (صحیح بخاری کتاب العلم باب ما جاء فی العلم و قولہ تعالیٰ و قل رب زدنی علما۔ صحیح مسلم کتاب الایمان باب السوال عن ارکان الاسلام) گویا اور دلیلوں سے تو اُس کو تسلی نہ ہوئی لیکن جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قسم کھالی تو اس کی تسلّی ہوگئی۔

قرآن مجید میں ہر قسم کے لوگوں کے لئے دلائل تو جب ایک گروہ دنیا میں ایسا ہے جس کی قسم سے ہی تسلی ہوسکتی ہے تو اگر اللہ تعالیٰ کے کلام میں قسم موجود نہ ہوتی تو ایسا گروہ صداقت کے قبول کرنے سے محروم رہ جاتا اور کلام الٰہی پر یہ اعتراض عائد ہوتا کہ وہ دعویٰ تو یہ کررہا ہے کہ تمام لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے نازل ہوا مگر ایک طبقہ کے جائز مطالبہ کو اس میں نظر انداز کردیا گیا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اپنی صداقت کے لئے قسم کھانا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں بھی بعض ایسے واقعات ہوئے ہیں۔ ایک دفعہ آپ کے پاس ایک شخص آیا اور آکر کہنے لگا کیا آپ قسم کھا کر مجھے لکھ کردے سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مسیح موعود بنایا ہے؟ آپ نے فرمایا ایک ہفتہ کے بعد آنا۔ جب وہ ہفتہ کے بعد آیا تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُسے ایک تحریر لکھ کردی جس کا مضمون یہ تھا کہ میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اپنی کتابوں میں لکھا ہے یا اپنی تقریروں وغیرہ میں بیان کرتا ہوں یہ تمام علوم مجھے خدا نے عطا فرمائے ہیں اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ان باتوں کو لوگوں کے سامنے پیش کروں اور اُسی کے حکم سے میں نے مسیح موعود اور مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا ہے (ایک ہفتہ بعد آنے کی شرط غالباً آپ نے اس لئے لگائی تا اس شخص کی سنجیدگی کا ثبوت مل جائے۔ ورنہ بعض لوگ تماشہ کے طور پر سوال کردیتے ہیں آپ نے ایک ہفتہ کے بعد آنے کی شرط لگا کر امتحان کرلیا کہ وُہ شخص سنجیدہ ہے اور وقت مقررہ پر پھر تکلیف اٹھا کر آیا ہے جب یہ امتحان ہوگیا تو آپ نے قسم تحریر فرمادی) تو ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جو اور کسی دلیل کا متلاشی نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے اگر یہ بات سچ ہے تو پھر اس پر قسم کھاؤ۔ اس قسم کی فطرت والوں کی اصلاح اور ہدایت کے لئے ضروری تھا کہ قرآن کریم میں قسمیں ہوتیں تا کہ یہ گروہ قبولِ ہدایت سے محروم نہ رہ جاتا۔

تیسرے قرآن کریم کی قسمیں خود اپنی ذات میں ایک ثبوت ہیں چنانچہ قرآن کریم میں جہاں جہاں قسمیں

کھائی گئی ہیں اللہ تعالیٰ نے اُن چیزوں کو شہادت کے طور پر پیش کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر یہ چیزیں شہادت دے دیں تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ کلام خدا تعالیٰ کا ہی تھا۔ اور اگر شہادت نہ دیں تو بیشک اس کے الٹ نتیجہ نکالنا۔ پس وہ قسمیں خود اپنی ذات میں قرآن کریم کی سچائی کا ایک بہت بڑا ثبوت ہیں۔ اُن کا نام حلف رکھو یا شہادت بات ایک ہی ہے بلکہ اگر وہ شہادتِ محضہ کے رنگ میں بھی بیان ہوں تب بھی قرآن کریم کی صداقت کا ایک ثبوت ہیں پس جو لوگ حلف کو وقعت نہیں دیتے وُہ اُن کو شہادت سمجھ کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور جو حلف کو وقعت دیتے ہیں وہ اسے شہادت مؤکدبہ حلف سمجھ کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں گویا ایک ہی وقت میں دو مختلف طبائع کے لوگوں کی تسلی کا وہ موجب ہو سکتی ہیں اور اس لئے وہ قابلِ قدر شئے ہیں نہ کہ قابل اعتراض۔ کیونکہ ان قسموں نے دونوں قسم کی ضرورتوں کو پورا کر دیا۔ (قرآنی قسموں کے متعلق ایک مکمل مگر اجمالی بحث انشاءاللہ پہلی قسم کے ماتحت لکھی جائے گی اور تفصیلی بحث تو ہر قسم کے نیچے آجائے گی۔ امام ابن قیم کی اقسام القرآن کتاب بھی اس بارہ میں مطالعہ کے قابل ہے اور بہت سی مفید باتیں اُس میں بیان ہوئی ہیں۔ جزاہ اللہ خیراً عن المسلمین)

جن چیزوں کی اس آیت اور اگلی آیتوں میں قسم کھائی گئی ہے وہ کیا ہیں۔ اس کی مفصل بحث فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کی آیت کے آخر میں آئے گی۔

وَّ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ﴿۳﴾

اور اُن (ہستیوں) کی جو گرہ باندھتی ہیں خوب اچھی طرح۔

حلّ لُغَات۔ نَاشِطَات نَاشِطَات نَشَطَ سے اسم فاعل کا جمع مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور نَشِطَ يَنْشَطُ نَشَاطًا کے معنے ہوتے ہیں طَابَتْ نَفْسُهٗ لِلْعَمَلِ اُس نے کام کے متعلق اپنے اندر رغبت اور خوشی پیدا کی۔ اور نَشَطَ (يَنْشُطُ نَشْطًا) الْحَبْلَ کے معنے ہوتے ہیں عَقَدَهٗ رسّے کو اُس نے گرہ دی۔ اور نَشَطَ الْعُقْدَةَ کے معنے ہوتے ہیں اشَدَّهَا گرہ کو اس نے سخت باندھا اور جب کہیں نَشَطَ الدَّلْوَ مِنَ الْبِئْرِ تو اس کے معنے ہوتے ہیں نَزَعَهَا بِغَيْرِ قَامَةٍ وَانْتَشَلَهَا بِلَا بَكْرَةٍ اُس نے ڈول کو بغیر چرخی کے ہاتھوں سے کھینچا۔ اور جب یہ لفظ ان معنوں میں استعارةً استعمال ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس نے بہت زور لگایا کیونکہ جب پانی بغیر چرخی کے نکالا جائے تو بہت زور لگتا ہے۔ اِسی طرح کہتے ہیں نَشَطَ زَيْدًا اور اس کے معنے ہوتے ہیں طَعَنَهٗ اُس کو نیزہ مارا۔ اور

جب کہیں نَشَطَتْهُ الْحَيَّةُ تو اس کے معنے ہوتے ہیں عَضَّتْهُ اُس کو سانپ نے کاٹ لیا (اقرب) اور نَشَطَتِ الْاِبِلُ کے معنے ہوتے ہیں مَضَتْ عَلٰى هُدًى اَوْ غَيْرِ هُدًى اونٹ کسی خاص راستہ پر یا یونہی جنگل میں اِدھر اُدھر چل پڑا (اقرب) پس نَاشِطَات کے معنے ہوں گے (۱) ایک چیز کو دوسری سے باندھنے والی ہستیاں (۲) کام کو کرتے وقت بہت زور لگانے والے گروہ (۳) نیزہ زنی کرنے والے گروہ۔

تفسیر ۔اس آیت کی تشریح فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کی آیت کے بعد آئے گی۔

وَّ السّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ﴿۴﴾

اور اُن (ہستیوں) کی جو دُور دُور نکل جاتی ہیں۔

حلّ لُغَات ۔اَلسَّابِحَاتِ السَّابِحَات سَبَحَ سے اسم فاعل کا جمع مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور جب سَبَحَ الرَّجُلُ کا فقرہ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں تَصَرَّفَ فِيْ مَعَاشِهٖ انسان اپنے معاش کے کاموں میں لگ گیا اسی طرح اس کے معنے ہوتے ہیں نَامَ ۔سو گیا۔ سَكَنَ ۔ٹھہر گیا۔ اَبْعَدَ فِي السَّيْرِ ۔دور نکل گیا۔ اور سَبَحَ فِي الْكَلَامِ کے معنے ہوتے ہیں اَكْثَرَ فِيْهِ ۔اُس نے لمبی گفتگو کی اور سَبَحَ فِي الْاَرْضِ کے معنے ہوتے ہیں حَفَرَ فِيْهَا ۔اُس نے زمین میں گڑھا کھودا۔ اور سَبَحَ فِي النَّهْرِ وَبِالنَّهْرِ کے معنے ہوتے ہیں عَامَ وَانْبَسَطَ فِيْهِ پانی میں تیرا اور تیرتے تیرتے دُور نکل گیا۔ اور سَبَحَ سُبْحَانًا کے معنے ہوتے ہیں قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ ۔اُس نے سبحان اللہ کہا (اقرب) پس اَلسَّابِحَات کے ایک معنے ہوں گے۔ وہ گروہ جو دُور دُور نکل جاتے ہیں (۲) وہ گروہ جو قادر الکلام ہیں۔ (۳) وہ گروہ جو خوب تیرنے والے ہیں (۴) وہ گروہ جو اپنے معاش کو خود پیدا کرتے ہیں۔

تفسیر ۔اس آیت کی تشریح فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کی آیت کے بعد آئے گی۔

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ﴿۵﴾

پھر (مقابلہ کر کے اپنے مدمقابل سے) خوب آگے نکل جاتی ہیں۔

حلّ لُغَات ۔اَلسَّابِقَات السَّابِقَات سَبَقَ سے اسم فاعل کا جمع مؤنث کا صیغہ ہے اور سَبَقَ (يَسْبِقُ) سَبْقًا کے معنے ہوتے ہیں تَقَدَّمَهٗ وَجَازَهٗ وَخَلَّفَهٗ کسی کے آگے نکل گیا اور اس کو پیچھے چھوڑ گیا۔ اور

سَبَقَ عَلَى الشَّيْءِ کے معنے ہوتے ہیں غَلَبَهٗ اس پر غالب آ گیا۔(اقرب) پس اَلسَّابِقَات کے معنے ہوں گے۔ وہ گروہ جو دوسروں سے آگے نکل جاتے ہیں۔(۶) وہ ہستیاں جو دوسروں پر غالب آ جاتی ہیں۔

تفسیر۔اس آیت کی تشریح اگلی آیت کے بعد آئے گی۔

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴿۶﴾

پھر جو (دنیا کا) کام (چلانے) کی تدبیروں میں لگ جاتی ہیں۔

حلّ لُغات۔**اَلْمُدَبِّرَات** تَدْبِیْر کے معنے آگے پیچھے کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں دَبَّرَ الْاَمْرَ اَیْ رَتَّبَهٗ وَنَظَّمَهٗ کسی چیز کے کسی حصہ کو پہلے رکھا اور کسی کو بعد میں رکھا اور اس طرح اس کی ترتیب دی۔ نیز کہتے ہیں دَبَّرَ الْاَمْرَ اَیْ نَظَرَ فِیْ عَاقِبَتِهٖ وَتَفَکَّرَ کسی امر کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے اس کا انتظام کیا اور جب دَبَّرَ الْوَالِیْ اَقْطَاعَهٗ کہیں تو معنے ہوتے ہیں اَحْسَنَ سِیَاسَتَهٗ یعنی منتظم نے اپنی جاگیر کا اچھا انتظام کیا (اقرب) مُدَبِّرَات اسم فاعل کا جمع مؤنث کا صیغہ ہے پس فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کے معنے ہوں گے کسی بات کے تمام پہلوؤں کو دیکھ کر معاملہ کا انتظام کرنے والے گروہ۔ گویا مدبّر کے لفظ میں منتظم کا فرض بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ وہ تمام پہلوؤں کو دیکھ کر انتظام کرتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک بات کو تو دیکھے اور دوسری باتوں کو نظر انداز کر دے۔

تفسیر۔**سورۃ نازعات کی پہلی پانچ آیتوں کی تفسیر مختلف مفسرین کے نزدیک** ان آیات کے متعلق اپنا نقطہ نظر پیش کرنے سے پہلے میں مفسّرین کے مختلف اقوال کو پیش کرتا ہوں اسی میں یہ بھی ذکر آ جائے گا کہ ہمارے پُرانے بزرگوں نے اِن آیات کے کیا معنے کئے ہیں۔ پہلے میں وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا اور وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا کو لے لیتا ہوں نَازِعَات اور نَاشِطَات کے متعلق اکثر مفسّرین اور صحابہؓ اور اُمتِ محمدؐیہ کے بزرگوں کے جو اقوال ملتے ہیں وہ خلاصۃً یہ ہیں۔

صاحبِ کشّاف لکھتے ہیں نَازِعَات اور نَاشِطَات فرشتوں کے وہ گروہ ہیں جو جسم کی گہرائیوں میں جا کر جان نکالتے ہیں اور پھر اُسے باہر نکالتے ہیں (جو نَشْطًا کے معنے ہیں) اور پھر اُس گروہ کی قسم کھائی جو خدا تعالیٰ کے احکام کے پورا کرنے میں تیزی سے کام کرتا ہے اور اس کے حکم کے ماتحت امورِ عالم کی تدبیر کرتا ہے۔(کشاف زیر آیت ھذا)

فتح البیان میں اُوپر کے معنوں کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ قول اکثر صحابہؓ اور تابعین اور اُن کے بعد

کے لوگوں کا ہے۔ پھر لکھا ہے سدیؔ کہتے ہیں کہ نَازِعَات سے مراد نفوس ہیں جب وہ سینہ میں غرق ہو جاتے ہیں یعنی موت کے وقت۔ اور مجاہد کہتے ہیں کہ نَازِعَات سے مراد موتیں ہیں جو روحوں کو نکالتی ہیں اور قتادہ کہتے ہیں کہ ان سے مراد ستارے ہیں جو ایک افق سے دوسرے افق کی طرف جاتے ہیں اور پھر دوسرے افق سے نکل آتے ہیں اور ابوعبیدہؔ اور اخفشؔ اور ابن کَیْسَان کا بھی یہی قول ہے۔ اور اس حد تک یہ معنے درست ہیں کہ لغت میں لکھا ہے نَزَعَ اِلَی الشَّیْئِ نِزَاعًا: ذَھَبَ اِلَیْہِ یُقَالُ ''لَہٗ نَزْعَۃٌ اِلٰی کَذَا'' یعنی نَزَعَ اِلَی الشَّیْئِ کے معنے ہوتے ہیں۔ وہ اس طرف جاتا ہے اسی طرح کہتے ہیں نَزَعَ بِفُلَانٍ اِلٰی کَذَا: دَعَاہُ اِلَیْہِ یعنی اس شخص کو فلاں کام کی طرف بلایا (اقرب) اور نَزَعْتُ بِالْحَبْلِ کے معنے ہوتے ہیں میں نے رسّہ سے کھینچا۔ گویا لغت کے لحاظ سے ایک طرف سے جانا اور دوسری طرف سے نکل آنا اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ چونکہ ستارے بھی ایک طرف سے جا کر دوسری طرف سے نکل آتے ہیں اس لئے انہیں نَازِعَاتِ غَرْقًا کہا گیا۔ عطاءؔ اور عکرمہؔ کا قول ہے کہ نَازِعَات کمانیں ہیں کہ تیر پھینکتی ہیں اور غَرْقًا سے مراد اِغْرَاقٌ ہے کہ تیرانداز تیر کو اس قدر کھینچتا ہے کہ تانت کے ساتھ تیر کا نوک آ لگتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ نَازِعَات سے مراد وہ غازی ہیں جو تیراندازی کرتے ہیں۔ گویا اُن کے نزدیک غَرْقًا پر نصب بطور مصدر ہے اور مراد اِغْرَاقًا ہے چنانچہ کہتے ہیں اَغْرَقَ فِیْہِ: (یُغْرِقُ) اِذَا بَالَغَ غَایَتَہٗ یعنی کام کو اس کی انتہائی حد تک پہنچایا۔ (فتح البیان زیر آیت ھذا) اور مراد یہ ہے کہ وَالنّٰزِعٰتِ وَالْمُغْرِقَاتِ غَرْقًا یا اِغْرَاقًا ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں تیروں کو کھینچنے والے نفوس کو جو اتنا کھینچتے ہیں کہ تیر کا اگلا سرا کھینچ کر تانت تک آ جاتا ہے۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ یہ ارواح کفّار ہیں۔ (فتح البیان) حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ کفّار کی ارواح پہلے کھینچی جاتی ہیں پھر نکالی جاتی ہیں پھر آگ میں پھینک دی جاتی ہیں۔

سابق مفسرین کے نزدیک وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا کا مطلب وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا۔ ابن عباس اور سدیؔ کہتے ہیں کہ اس سے مراد نفوس ہیں جو قدموں سے نکالے جاتے ہیں۔ گویا جان تمام جسم میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے لیکن جب قدموں کے پاس سے نکالی جائے تو اُن جانوں کو نَاشِطَات کہتے ہیں۔ مجاہد کہتے ہیں اس سے مراد موت ہے جو نفوس انسانی کو نکالتی ہے قتادہؔ۔ حسنؔ اور اخفشؔ کہتے ہیں کہ ستارے ہیں کہ ایک افق سے دوسرے افق کی طرف جاتے ہیں۔ صاحب الصحاح کہتے ہیں کہ ستارے ہیں جو ایک برج سے دوسرے برج کی طرف جاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نَاشِطَات کا لفظ رواحِ مومنین کی طرف اشارہ کرتا ہے اور نَازِعَات سے ارواحِ کفّار کی طرف اشارہ ہے مگر حضرت علیؓ ناشطات کو کفار کی ارواح نکالنے کی طرف اشارہ بتاتے ہیں اسی کے مطابق معاذؔ ابن جبلؓ سے ابن

مردویہ نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے کہ نَاشِطَات دوزخ کے کُتّے ہیں جو گوشت نوچیں گے جس کا مطلب یہ نکلا کہ نَاشِطَات میں مومنوں کی روح کا ذکر نہیں بلکہ کفّار کا ذکر ہے کیونکہ دوزخ کے کتے تو کفار پر ہی حملہ آور ہوں گے۔(فتح البیان)

مفسرین کے نزدیک سابحات کے معنے وَالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں جو مومنوں کی جان نرمی سے نکالتے ہیں۔مجاہدؒ اور ابو صالحؒ کا قول ہے کہ اس سے ملائکہ مراد ہیں جو آسمان سے خدا تعالیٰ کا حکم پورا کرنے کے لئے دوڑتے ہوئے اُترتے ہیں۔مجاہد کا یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد موت ہے جو جسموں میں تیرتی ہے۔بعض نے کہا ہے کہ یہ گھوڑے ہیں جو غزوات میں دوڑتے ہیں۔قتادہؒ اور حسنؒ کہتے ہیں کہ یہ ستارے ہیں جو افلاک میں پھرتے ہیں جیسے فرمایا کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ (الانبیاء:۳۴) عطاء کہتے ہیں کہ کشتیاں ہیں کہ پانی میں تیرتی ہیں بعض نے کہا ہے کہ مومنوں کی ارواح ہیں کہ لقاء الٰہی کے شوق میں تیرتی ہیں۔حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا یہ ملائکہ ہیں جو مومنوں کی ارواح کو لے کر آسمان میں دوڑتے ہیں۔(فتح البیان)

سَابِقَاتِ سَبۡقًا کے متعلق مفسرین کی رائے فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا مجاہدؒ اور مسروقؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں کہ وحی لے کر شیطانوں سے آگے پہنچتے ہیں اور ابو روقؒ کہتے ہیں کہ ملائکہ ہیں کہ انسانوں سے عمل اور خیر میں آگے نکل گئے۔مجاہدؒ کا بھی ایسا ہی قول ہے اور مقاتلؒ کہتے ہیں کہ ملائکہ ہیں جو ارواحِ مومنین کو لے کر آگے نکل جاتے ہیں۔ربیعؒ کا قول ہے کہ ارواحِ مومنین ہیں کہ لقاء الٰہی کے شوق میں ملائکہ کی طرح دوڑتی ہیں۔حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ ملائکہ ہیں کہ مومنوں کی ارواح لے کر ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہیں۔مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے مراد موت ہے کہ انسان کو دوڑ کر جا پکڑتی ہے۔قتادہ اور حسن اور معمر کہتے ہیں کہ ستارے ہیں کہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔(فتح البیان زیر آیت و النازعات غرقا و الناشطات نشطا)

(یہاں ضمنی طور پر میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ بات قرآن کریم کے خلاف ہے کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رات اور دن کا آنا جانا ہمارے ایک قانون کے مطابق ہو رہا ہے اور تمام سیّارے اور ستارے اسی قانون کے ماتحت گردش کر رہے ہیں۔وہ ایک دوسرے سے سباق کی کوشش نہیں کر سکتے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا الشَّمۡسُ یَنۡۢبَغِیۡ لَہَاۤ اَنۡ تُدۡرِکَ الۡقَمَرَ وَ لَا الَّیۡلُ سَابِقُ النَّہَارِ (یٰس:۴۱) کہ نہ سورج چاند کو پکڑ سکتا ہے اور نہ رات دن سے بڑھ سکتی ہے پس قرآن کریم کی یہ آیات قتادہ اور حسن اور معمر کی متذکرہ بالا بات کو ردّ کرتی ہیں کہ ستارے ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں)

عطاء کہتے ہیں کہ اس سے مراد گھوڑے ہیں کہ جہاد میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس جگہ پر جُرجانی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ پہلے تو ان آیات میں واؤ واؤ آئی تھی مگر یہاں فاء آ گیا ہے پس سَابِقَات پر جو عطف آیا ہے یہ دلیل ہے اس بات کی کہ سَابِحَات سَابِقَات کا سبب ہے اور سَابِقَات نتیجہ ہے جو سَابِحَات کے بعد بیان کیا گیا ہے یعنی بوجہ تیرنے کے آگے نکل جاتے ہیں۔ مگر واحدی کہتے ہیں یہ دلیل باطل ہے اس لئے کہ آگے مُدَبِّرَات پر بھی فاء ہے اور آگے نکل جانا کسی کام کی تدبیر کرنے کا سبب نہیں ہوسکتا یعنی اگر واؤ کی جگہ فَالسَّابِقَات پر فاء آنے کے سبب سے سَابِحَات کو سَابِقَات کا سبب قرار دیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ چونکہ مُدَبِّرَات سے پہلے بھی فاء آیا ہے اس لئے تدبیر کا سبب آگے نکل جانا ہے مگر یہ درست نہیں کیونکہ آگے نکل جانے کا فعل تدبیر کرنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ پس مُدَبِّرَات کے لفظ سے پہلے بھی فاء کا آنا بتاتا ہے کہ یہ دلیل غلط ہے۔ امام رازی کہتے ہیں کہ واحدی کا یہ اعتراض درست نہیں کیونکہ سَبْحٌ اور پھر سِبَاقٌ اور پھر تَدْبِیْرِ امر فی الواقعہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور اسی وجہ سے ایک ترتیب میں سب کا ذکر آتا ہے اس پر مؤلف فتح البیان کہتے ہیں کہ اتّصال اور سبب میں فرق ہے اس لئے رازی کا یہ جواب غلط ہے۔ فاء محض عطف کے لئے بھی آتی ہے (فتح البیان) اس لئے اس سے کسی نکتہ کے نکالنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے یہ مضمون اس لئے نقل کر دیا ہے کہ بعض لوگ فاء کے استعمال سے لازماً سبب کے معنے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کے لئے یہ بحث ہدایت کا موجب ہو مگر یہ کہنا کہ فاء یونہی لایا گیا ہے یہ بھی درست نہیں اس جگہ واؤ استعمال کرتے ہوئے فاء کا لانا بتاتا ہے کہ مضمون بدل گیا ہے ورنہ جب پہلی دو آیتوں پر واؤ عطف لایا گیا تھا تو کیوں آخری دو آیتوں پر واؤ عطف نہ لایا گیا (پہلی آیت پر جو واؤ ہے وہ واؤ قسم ہے) اصل بات یہ ہے کہ اس جگہ فاء ضرور دوسرے معنے دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ واؤ کو ترک کر کے فاء کو استعمال کیا گیا ہے۔ اگر دوسرے معنے پیدا کرنے مقصود نہ ہوتے تو واؤ عطف کا استعمال جاری رکھا جاتا۔ وہ دوسرے معنے کیا ہیں؟ وہ معنے میرے نزدیک ترتیب کے ہیں ان دو آیتوں میں ضرور ایسے معنے بھی پائے جاتے ہیں جو ترتیب پر دلالت کرتے ہیں اور جو پہلی آیتوں کے مضمون کے ثابت ہونے کے بعد ہی حاصل ہو سکتے ہیں چنانچہ ان معنوں کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا حضرت علیؓ فرماتے ہیں اس سے مراد ملائکہ ہیں جو امر عبادت کی تدبیر سال کے شروع سے لے کر آخر تک کرتے ہیں۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں ملائکہ ہیں جو ملک الموت کے ساتھ آتے ہیں کوئی رُوح اُوپر لے جاتا ہے۔ کوئی دعا پر آمین کہتا ہے کوئی استغفار کرتا ہے۔ قشیری کہتے ہیں کہ اس پر اجماع ہے کہ یہاں ملائکہ کا ذکر ہے

مگر ماوردی کہتے ہیں کہ نہیں دو تفسیریں ہیں بعض نے ملائکہ مراد لئے ہیں اور بعض نے سات ستارے قرار دئے ہیں اور تدبیر امر سے بھی دو امر مراد لئے گئے ہیں ایک اُن کی حرکات کی تدبیر اور دوسرے امور قضاء کی تدبیر جو ان کے بارہ میں ہوں۔ تدبیرِ ملائکہ سے بعض نے یہ مراد لیا ہے کہ الٰہی احکام کی تنفیذ جو ملائکہ پر نازل ہوتے ہیں اس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ (فتح البیان)

سورۃ نازعات کی پہلی پانچ آیات کی تفسیر میں مفسرین کو ایک ٹھوکر یہ قرآن کریم کے اِن پانچ جملوں کی اس تفسیر کا خلاصہ ہے جو گزشتہ مفسّرین نے کی ہے۔ جہاں تک اِن الفاظ کے معنوں کا سوال ہے ہمیں کسی ایسے معنے پر اعتراض نہیں ہو سکتا جو لغتاً صحیح ہوں جو معنے لغتاً جائز اور درست ہیں اُن میں سے ہر معنے اپنی اپنی جگہ پر چسپاں ہو سکتے ہیں مگر جب کسی کلام کی تفسیر کی جاتی ہے تو اس کلام کی صحیح تفسیر اور تشریح کرنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کلام کا قرینہ کیا تھا یا اس کلام کا محل کیا تھا۔ اگر اس کلام کا محل ہم سمجھ لیں تو سب سے پہلے اس کے محل کو دیکھیں گے اور اگر محل نہ ملے تو قرینہ سے اس کلام کی تشریح کی جائے گی۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے دوڑ کر بازار سے سودا خرید لاؤ اور ہم بھی اُس کے اس فقرہ کو سُن لیتے ہیں تو اگر اُس وقت اس کا نوکر موجود تھا تو چونکہ کلام کے محل کا ہمیں علم ہو گیا اس لئے ہم کہیں گے کہ اُس نے اس فقرہ کے ذریعہ اپنے نوکر سے کہا تھا کہ جاؤ اور دوڑ کر بازار سے سودا لے آؤ لیکن اگر ہم کلام کے اس محل کو تو نہ دیکھیں اور یہ فقرہ سُن کر کہ دوڑ جاؤ یہ نتائج اخذ کرنا شروع کر دیں کہ اس سے نوکر کہاں مراد ہو سکتا ہے اِس سے تو ہر انسان مراد ہے کیونکہ ہر انسان آخر دوڑ سکتا ہے یا یہ کہنا شروع کر دیں کہ اس سے مراد فلاں بادشاہ ہو گا اور جب اس سے پوچھا جائے کہ اس کا ثبوت کیا ہے تو وہ کہہ دے کہ کیا بادشاہ دوڑ نہیں سکتا یا بادشاہ بازار سے سودا خرید کر نہیں لا سکتا یا یہ کہنا شروع کر دیں کہ اُس کے اِس فقرہ کا مطلب یہ تھا کہ فلاں مشہور فلاسفر دوڑ کر جائے اور سودا خرید لائے یا فلاں کروڑ پتی دوڑ کر جائے اور سودا خرید لائے تو ہر شخص ہمیں پاگل اور احمق قرار دے گا اور کہے گا کہ تم موقع اور محل کو بھی تو دیکھو اور یہ بھی تو سوچو کہ اُس نے جس وقت یہ بات کہی ہے اس کا نوکر سامنے کھڑا تھا بے شک بادشاہ بھی دوڑ سکتا ہے۔ فلاسفر بھی دوڑ سکتا ہے کروڑ پتی بھی دوڑ سکتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب اُس نے یہ بات کہی تو اس کے کلام کا محل کیا تھا۔ اگر ہم محل کو تو نہ دیکھیں اگر ہم اس امر کو تو نظر انداز کر دیں کہ اُس کا نوکر اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اُسے مخاطب کر کے کہہ رہا تھا کہ جاؤ اور بازار سے سودا خرید لاؤ اور خود ہی قیاس آرائی شروع کر دیں کہ یہ فقرہ کس کے متعلق ہے ایک کہے بادشاہ کے متعلق ہے۔ دوسرا کہے میرا خیال ہے کہ فلاں فلاسفر کے متعلق ہے۔ تیسرا کہے میرا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ یہ فلاں کروڑ پتی کے متعلق ہے تو سب لوگ ہنسیں

گے اور کہیں گے کہ تم کو کیا ہو گیا ہے کہ اتنی بات بھی نہیں سوچتے کہ یہ فقرہ کہا کس کو گیا تھا۔ بے شک بادشاہ بھی دوڑ سکتا ہے اور سودا خرید کر لا سکتا ہے۔ بے شک ایک فلاسفر بھی دوڑ سکتا ہے اور سودا خرید کر لا سکتا ہے۔ بے شک ایک کروڑ پتی بھی دوڑ سکتا ہے اور سودا خرید کر لا سکتا ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ اس بات کا محل کیا تھا؟ نوکر اس کے سامنے کھڑا تھا اور وُہ اسے کہہ رہا تھا کہ دوڑ کر بازار سے سودا خرید لاؤ۔ پس لازماً اس سے مراد اُس کا نوکر ہی ہوگا کوئی اور شخص نہیں ہوگا پس کسی کلام کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اُس کلام کے محل کو دیکھا جائے اور پھر اُس کلام کے کوئی معنے کئے جائیں۔ محل کو نہ دیکھنا اور یونہی قیاس آرائی شروع کر دینا دانائی نہیں ہوتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی بات کا محل ہمیں معلوم نہ ہو سکے تو قرینہ دیکھنا چاہیے۔ مثلاً ایک شخص گھر میں آتا ہے نوکر اُس کے سامنے نہیں مگر وہ یہی سمجھتا ہے کہ نوکر گھر پر ہوگا۔ اُس وقت اتفاقاً اُسے کوئی ضروری کام پیش آجاتا ہے اور وہ کہتا ہے جلدی دوڑو اور فلاں کام کر آؤ۔ اب بیشک نوکر ہمارے سامنے نہیں ہوگا مگر یہ قرینہ تو ہوگا کہ آقا نے اپنے گھر میں یہ فقرہ کہا پس لازماً اس سے مراد اس کا نوکر ہی ہوگا لیکن اگر قرینہ کو نہ دیکھا جائے اور یہ فقرہ لے کر ایک شخص کہے کہ دوڑ جاؤ جو کہا گیا ہے تو یہ فلاں دکاندار سے کہا گیا ہے۔ دوسرا کہے یہ بالکل غلط ہے میرا خیال ہے کہ فلاں کو نہیں فلاں سے کہا گیا ہے۔ تیسرا کہے کہ میرا قیاس کچھ اور کہتا ہے میرے نزدیک تو فلاں سے کہا گیا ہے کہ دوڑ جاؤ۔ تو یہ ساری باتیں لغو اور بے ہودہ ہوں گی۔ ہم کہیں گے کہ پہلے قرینہ کو بھی تو دیکھو کہ وہ کس امر کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ قرینہ بتا رہا ہے کہ ایک شخص نے یہ بات اپنے گھر میں کہی۔ پس پہلا قیاس یہ ہو سکتا ہے کہ اُس نے یہ بات اپنے نوکر سے کہی ہو دوسرا قیاس یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ بات اپنے بیٹے سے کہی ہو کیونکہ بیٹا بھی خادم کی حیثیت رکھتا ہے یا اگر اُس نے بیٹے کو نہیں کہا تو ممکن ہے اُس نے اپنے کسی اور عزیز رشتہ دار کو یہ بات کہہ دی ہو مثلاً بھتیجے کو یہ بات کہہ دی ہو یا بھانجے کو یہ بات کہہ دی ہو لیکن اگر ہم قرینہ کو تو نہیں دیکھتے اور ایک فقرہ کو لے کر یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اس سے فلاں مراد ہوگا یا فلاں مراد ہوگا یا فلاں اس سے مراد ہوگا تو یہ بات ہماری معقول نہ کہلا سکے گی۔ اِسی طرح یہاں محض یہ سوال نہیں کہ نَازِعَات کے کیا معنے ہیں یہ سوال نہیں کہ نَاشِطَات کے لغت میں کیا معنے ہیں۔ یہ سوال نہیں کہ سَابِحَات کے کیا معنے ہیں۔ یہ سوال نہیں کہ سَابِقَات کے کیا معنے ہیں۔ یہ سوال نہیں کہ مُدَبِّرَات کے کیا معنے ہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ اس مقام پر اور اس جگہ پر ان الفاظ کے موقع و محل اور قرائن کے اعتبار سے کون سے معنے ہو سکتے ہیں۔ پس ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس جگہ پر وہ معنے چسپاں ہو سکتے ہیں جو مفسّرین نے لئے ہیں۔ اس غرض کے لئے اوّل ہم ترتیب الفاظ کو دیکھیں گے کہ آیا ترتیب الفاظ کے لحاظ سے وہ معنی چسپاں ہو

سکتے ہیں یا نہیں۔ پھر آیتوں کے باہمی جوڑ کو دیکھیں گے کہ اُن کے لحاظ سے وہ معنی کہاں تک موزون ہیں پھر سیاق دیکھیں گے کہ اس کے مطابق وہ بنتے ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد اگلی آیتوں کو دیکھیں گے کہ اُن کے ساتھ ان معنوں کی مناسبت سے پچھلی آیتوں کا کوئی جوڑ ثابت ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ غرض کئی باتوں کو دیکھا جائے گا اور کئی پہلوؤں سے ان معنوں پر غور کیا جائے گا اگر یہ معنے مطابقت کھائیں گے تو انہیں لے لیا جائے گا ورنہ ان کو ردّ کر دیا جائے گا۔ مثلاً یہی دیکھ لو وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا سے مراد بعض نے وہ ستارے لئے ہیں جو ایک افق سے دوسرے افق کی طرف جاتے اور پھر دوسرے افق میں سے نکل آتے ہیں۔ اب یہ ایک معنے نَازِعَات کے نکال لئے جاتے ہیں مگر جب وَ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا کے الفاظ آتے ہیں تو پھر بھی یہی معنی کئے جاتے ہیں کہ یہ ستارے ہیں جو ایک افق سے دوسرے افق کی طرف جاتے ہیں۔ اول تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں دو آیتیں بیان کی گئی ہیں مگر اُن کے دو معنے نہیں کئے جاتے بلکہ ایک ہی معنے کئے جاتے ہیں۔ نَازِعَات سے بھی ستاروں کا جانا اور واپس آنا مراد لیا جاتا ہے اور نَاشِطَات سے بھی ستاروں کا جانا اور واپس آنا مراد لیا جاتا ہے۔ اب یہ کیسی عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بات نَازِعَات میں بیان کی تھی وہی اس نے نَاشِطَات میں بیان کر دی کوئی زائد بات اُس نے بیان نہیں کی یہ بات تو نہایت ردّی اور فصاحت سے گرے ہوئے کلام میں پائی جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی کتاب تو ہر قسم کے نقائص سے منزّہ اور فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے دنیا کی تمام کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے اُس میں ایسی بات کس طرح آ سکتی ہے کہ نَازِعَات میں بھی وہ ستاروں کے آنے جانے کا ذکر کرے اور نَاشِطَات میں بھی وہ ستاروں کے آنے جانے کا ذکر کرے۔ یہ پہلا ثبوت ہمیں اس بات کا ملتا ہے کہ جو معنے ان الفاظ کے کئے گئے ہیں گو وہ لغت کے لحاظ سے تو درست ہوں مگر ان آیات میں وہ معنے مراد نہیں۔ ستاروں کا ذکر اس جگہ اسی صورت میں مراد لیا جا سکتا تھا کہ دونوں آیتوں کا الگ الگ مضمون ہوتا۔ ان مفسّرین کا اس بات پر مجبور ہونا کہ دونوں آیتوں کے ایک ہی معنے کریں بتاتا ہے کہ یہ معنے ہی غلط ہیں ورنہ اُن معنوں کے رو سے اگر وَ النَّاشِطَاتِ نَشْطًا کو بالکل الگ کر دیا جائے تو وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا سے ہی وہ معنے نکل آتے ہیں جن کو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ وَ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا کے الفاظ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اسی طرح وَ السّٰبِحٰتِ سَبْحًا کے یہ معنے کئے گئے ہیں کہ یہ ستارے ہیں جو افلاک میں دوڑتے پھرتے ہیں اور اس کا استدلال كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (الانبیاء: ۳۴) والی آیت سے کیا جاتا ہے اور پھر فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا کے بھی یہی معنے کر لئے جاتے ہیں کہ یہ ستارے ہیں جو ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ قرآن کریم میں بڑا زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ہر چیز اپنے اپنے دائرہ میں گردش کر رہی ہے یہ

نہیں کہ سورج بھاگا بھاگا جارہا ہو کہ کہیں چاند مجھے نہ پکڑ لے اور چاند اس ڈر سے دوڑ رہا ہو کہ کہیں مرّیخ مجھ پر قبضہ نہ پالے۔ مگر ہمیں فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا کے ایسے معنے بتائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا سورج اور چاند اور ستارے سب جاندار چیزیں ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں حالانکہ اگر سورج چاند کو پکڑ لے تو اس میں کیا فائدہ ہے نقصان ہی نقصان ہے کہ نظامِ شمسی تباہ و برباد ہو جائے گا ہمیں سباق اُن باتوں میں تلاش کرنا چاہیے جن میں دنیا کا نفع ہے نہ کہ اُن باتوں میں جن میں نقصان اور تباہی ہے۔

پھر فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد نجوم ہیں حالانکہ قرآن کریم اور احادیث سے بالصراحت ثابت ہے کہ تدبیرِ امر خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے ستارے مدبرات امر نہیں کہلا سکتے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں یَقُوْلُ اللّٰہُ (عَزَّوَجَلَّ) مَنۡ قَالَ مُطِرۡنَا بِنَوۡءِ کَذَا وَ کَذَا فَذٰلِكَ کَافِرٌ بِیۡ مُؤۡمِنٌ بِالۡکَوۡکَبِ (بخاری کتاب الاستسقاء باب قول اللّٰہ تعالیٰ وتجعلون رزقکم انکم تکذبون) یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص کہتا ہے فلاں فلاں ستارہ کے اثر کی وجہ سے بارش ہوتی ہے وہ میرا کافر ہے اور ستاروں کا مومن۔ گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بفرمان خداوندی ستاروں کی طرف تدبیر امر کی نفی کرتے ہیں مگر بعض مفسّرین یہ بتاتے ہیں کہ ان سے ستارے مراد ہیں۔ غرض اِن آیتوں کے جس قدر معنے کئے جاتے ہیں اُن میں سے بعض کو قرآن کریم بالنّص ردّ کرتا ہے اور بعض ایسے ہیں جو استدلال کی روشنی میں قابل قبول نہیں رہتے۔ اور بعض ایسے ہیں جن کو تسلیم کرنے کے نتیجہ میں بعض قرآنی الفاظ کو زائد قرار دینا پڑتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ پہلے فقرہ کے جو معنے ہیں وہی دوسرے فقرہ کے ہیں حالانکہ قرآن کریم خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کا ہر لفظ حکمت پر مبنی ہے۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ نَازِعَات کے یہ معنے کئے جاتے ہیں کہ اس سے فرشتوں کے وہ گروہ مراد ہیں جو جسم کی گہرائیوں میں جا کر جان نکالتے اور پھر اسے باہر نکالتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد موتیں ہیں جو جان کو نکالتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس سے مراد نفوس ہیں جو سینہ میں غرق ہو جاتے ہیں یہ تو وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا کے معنے تھے جب وَالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا کے الفاظ آتے ہیں تو پھر یہ معنے کر لئے جاتے ہیں کہ اس سے مراد وہ نفوس ہیں جو قدموں سے نکالے جاتے ہیں۔ کوئی کہہ دیتا ہے یہ موت ہے جو نفوس انسانی کو نکالتی ہے۔ اس کے بعد وَالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا کا ذکر آتا ہے تو پھر کہہ دیتے ہیں یہ ملائکہ ہیں جو مومنوں کی نرمی سے جان نکالتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس سے مراد موت ہے جو جسم میں تیرتی ہے۔ چوتھے نمبر پر فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا کا ذکر آتا تھا اس کے بھی یہ معنے کر لئے گئے ہیں کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں جو مومنوں کی ارواح لے کر آگے نکل جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس سے مراد موت ہے جو انسان کو

دوڑ کر جا کر پکڑتی ہے۔ آخر میں فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کا ذکر آیا تھا اس کے متعلق بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ ملائکہ ہیں جو ملک الموت کے ساتھ آتے ہیں۔ گویا پانچ فقرے خدا تعالیٰ نے استعمال کئے مگر ہر جگہ انہوں نے یہی معنے کر لئے کہ اس سے مراد موت ہے۔ کوئی کہتا ہے قدموں میں سے جان نکالی جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے وہ تیر کی طرح انسانی جسم میں تیرتی ہے۔ کوئی کہتا ہے وہ انسان کو دوڑ کر آ پکڑتی ہے حالانکہ وہ خواہ تیر کی طرح تیرے یا قدموں میں سے نکلے پھر ہوا کیا۔ اور بات کیا بنی کہ ہر جگہ موت کا ذکر شروع ہو گیا اور وہ بھی بالکل بے معنی۔ ایک فقرہ آتا ہے تو اس کے معنے بھی روح کے نکالے جانے کے کئے جاتے ہیں۔ دوسرا فقرہ آتا ہے تو اس کے معنے بھی روح کے نکالے جانے کے کئے جاتے ہیں۔ تیسرا فقرہ آتا ہے تو اس کے معنے بھی روح کے نکالے جانے کے کئے جاتے ہیں۔ یہ بات کیا ہوئی اور قرآن کا مقصد کیا ہوا کہ بار بار روح کے قبض کا ذکر بغیر کسی مزید مقصد اور فائدہ کے کرتا ہے۔ آخر اس سے بنی نوع انسان کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے یا اُن کے علم میں اس سے کیا اضافہ ہو سکتا ہے یا کون سی پیشگوئی ہے جو اِن معنوں میں نظر آتی ہے۔ کون سا غیب ہے جو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے یا کون سی ترقی ہے جو ان معنوں میں علمِ سائنس میں ہوتی ہے یا علم الاخلاق میں ہوتی ہے یا علم روحانیت میں ہوتی ہے۔ آخر ہوا کیا؟ جان قدموں میں سے نکلے یا ہاتھ پاؤں میں سے نکلے بہرحال جو مر گیا وہ مر گیا ہمیں اس سے کیا بحث ہے کہ اس کی جان قدموں سے نکلی تھی یا سر میں سے نکلی تھی۔ مگر کوئی حکمت نہیں بتائی جاتی اور اندھا دُھند خدائی کلام کے پانچ فقروں کے مسلسل یہ معنے کئے جاتے ہیں کہ اس سے موت ہی مراد ہے اور کچھ مراد نہیں۔

پھر خود ایک ایک آیت کے جو معنے کئے گئے ہیں اُن میں بڑا اختلاف ہے۔ معاذ بن جبل سے ابن مردویہ نے جو حدیث نقل کی ہے اُس میں یہ بتایا گیا ہے کہ نَاشِطَاتِ دوزخ کے وہ کُتّے ہیں جو دوزخیوں کا گوشت نوچیں گے اور دوسرے کہتے ہیں اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مومنوں کی جان نکالتے ہیں۔ یہ کتنے متضاد معنے ہیں کہ ایک شخص کہتا ہے یہ دوزخ کے وہ کُتّے ہیں جو دوزخیوں کا گوشت نوچیں گے اور دوسرا کہتا ہے اس سے وہ ملائکہ مراد ہیں جو مومنوں کی جان نکالتے ہیں۔

نازعات اور ناشطات سے مراد فرشتوں کے گروہ ان ساری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک امر پر مفسّرین کا اتفاق نہیں ہوا بلکہ ہر بات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ صرف ایک معنے ہیں جس پر اتفاق پایا جاتا ہے اور وہ معنے فرشتوں کے ہیں۔ اکثر صحابہ اور تابعین اور اُن کے بعد آنے والے مسلمان زیادہ تر اسی امر پر متفق نظر آتے ہیں کہ نَازِعَات اور نَاشِطَاتِ سے مراد فرشتوں کے گروہ ہیں لیکن اس میں ایک دِقّت ضرور ہے اور وہ یہ کہ

ان معنوں کے لحاظ سے بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جو بات نَازِعَات میں بیان کی گئی تھی وہی نَاشِطَاتِ میں بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں نَازِعَات سے مراد بھی فرشتوں کے گروہ ہیں جو جان نکالتے ہیں اور نَاشِطَاتِ سے مراد بھی فرشتوں کے گروہ ہیں جو جان نکالتے ہیں گویا ان معنوں کو تسلیم کر لینے کی صورت میں پھر بھی یہ دِقّت باقی رہے گی کہ جو بات ایک آیت کے ذریعہ ادا کی جا سکتی تھی اس کے لئے دو آیتیں کیوں لائی گئی ہیں پس یہ ایک دِقّت ضرور ہے لیکن جہاں تک محل کا سوال ہے ان آیات کے معنوں میں فرشتوں کا تسلیم کرنا کوئی بعید بات نہیں بلکہ قرین قیاس ہے اور آیتوں کا مضمون اس کی تائید کرتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ نقص ضرور ہے کہ اس کی تفاصیل میں مفسّرین نے بعض ایسی باتیں بیان کی ہیں جن کے متعلق یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اُن میں بلا وجہ تکرار سے کام لیا گیا ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم میں بعض مقامات میں تکرار بھی پایا جاتا ہے مگر وہی تکرار مفید ہوتا ہے جو زائد معنے دیتا ہو۔ اور اگر اُس تکرار کو اُڑا دیا جائے تو ساتھ ہی مضمون کے وہ زائد معنے بھی اُڑ جاتے ہوں لیکن جہاں ایسے معنے نہ ہو سکیں وہاں کلام الٰہی میں تکرار ایک عیب کی چیز ہے۔ بہرحال اگر اس نقص کو دُور کر کے اِن معنوں کو قرآن کریم کی اِن آیات پر چسپاں کیا جا سکے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ معنے بالکل قرین قیاس اور آیات کے مضمون کے مطابق ہوں گے۔

نازعات سے مراد غازیوں کے گروہ تیسرے معنے جن کی طرف سب سے کم توجہ دی گئی ہے مگر درحقیقت وہ سب سے زیادہ اِن آیات پر چسپاں ہوتے ہیں اور جن کی طرف تفاسیر میں اشارہ بھی پایا جاتا ہے وہ یہ ہیں کہ ان میں نَازِعَاتِ سے مراد وہ غازی ہیں جو تیر اندازی کرتے اور غزوات میں اپنے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ یہ معنے سب سے زیادہ قرین قیاس ہیں لیکن انہی معنوں کی طرف سب سے کم مفسّرین نے توجہ کی ہے پس اگر اُن کے اس فقرہ پر ہم کوئی عمارت کھڑی کر سکیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کچھ حصہ پُرانے مفسّرین کا بھی ہے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہی اس کے موجد ہیں بلکہ ہمیں اس بارہ میں پُرانے مفسّرین کی راہنمائی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ ان آیات پر ملائکہ کے معنے بھی چسپاں ہو سکتے ہیں جس کی طرف اکثر صحابہ اور تابعین اور بڑے بڑے مسلمانوں کا خیال گیا ہے اسی طرح ان آیات میں غازی بھی مراد لئے جا سکتے ہیں اور گو ہم نہیں کہہ سکتے کہ تابعین سے یہ معنے مروی ہیں مگر بہرحال مفسّرین نے اس خیال کا اظہار کیا ہے اور یہ معنے بھی یقیناً ایسے ہیں جو اس مقام پر چسپاں ہو سکتے ہیں اور اُن کا اس پہلو کے متعلق خیال پیدا کر دینا بھی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ بیشک دفعہ بعض دفعہ عمارت بنانی بھی بڑی مشکل ہوتی ہے مگر عام طور پر عمارت بنانی اتنی مشکل نہیں ہوتی جتنی راہنمائی مشکل

ہوتی ہے۔ پس یہ دو معنے ایسے ہیں جو قرینِ قیاس اور موقعہ و محل کے مطابق ہیں۔ گو ان معنوں کو آیات پر چسپاں کرتے ہوئے مفسّرین سے بہت کچھ غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ مثلاً فرشتوں کے معنے تو انہوں نے لے لئے ہیں مگر اُن معنوں کو ایسے رنگ میں چسپاں کیا ہے جس میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ کہیں آیتوں کا باہمی جوڑ نہیں ملتا۔ کہیں ترتیب میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ کہیں بلا وجہ تکرار تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال اگر ہم ان معنوں کو پسند کرتے ہیں تو ان مشکلات کو حل کرنا ہمارا کام ہے۔

اب پیشتر اس کے کہ میں اِن آیات کے متعلق اپنی تشریح بیان کروں یہ امر واضح کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جگہ چار فقروں میں مفعول مطلق استعمال ہوئے ہیں اور پانچویں فقرہ میں مفعول بہٖ آیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا۔ وَّ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا۔ وَّ السّٰبِحٰتِ سَبْحًا۔ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا۔ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا۔ اِن میں سے پہلے چار فقروں میں غَرْقًا۔ نَشْطًا۔ سَبْحًا اور سَبْقًا مفعول مطلق کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اور اَمْرًا مُدَبِّرَات کا مفعول بہٖ کے طور پر۔ جہاں تک فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کا تعلق ہے وہ تو زیر بحث نہیں لیکن باقی چار جگہوں میں مصدر آئے ہیں اُن کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تین مصدر تو انہی افعال سے آئے ہیں جو پہلے آ چکے ہیں مثلاً نَاشِطَات کا نَشْطًا ہے سَابِحَات کا سَبْحًا ہے اور سَابِقَات کا سَبْقًا ہے مگر نَازِعَات کے مقابلہ میں غَرْقًا رکھ دیا گیا ہے حالانکہ نَزَعَ کا مصدر نَزْعًا ہے یا نُزُوْعًا ہے یا نَزَاعَةً وَنِزَاعًا ہے مگر بجائے اس کے کہ ان میں سے کوئی ایک مصدر رکھا جاتا ان کی بجائے باہر سے ایک اَور لفظ لے لیا گیا ہے اور نَازِعَات کے ساتھ غَرْقًا کا لفظ رکھ دیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی بعض آیات کے صحیح معنے سمجھنے کا ایک گر اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ بہت بڑی حکمت کی بات ہے عربی زبان میں صرف فعل سے معنے متعین نہیں ہوتے بلکہ فعل کو اس کے مصدر سے باندھ کر معنے پیدا ہوتے ہیں مثلاً اگر ہم صرف نَزَعَ کہہ دیں تو خالی نَزَعَ کے معنے یہ بھی ہوں گے کہ کسی چیز کو اُکھیڑ دیا۔ یہ معنے بھی ہوں گے کہ فلاں شخص ایک بات سے رُک گیا۔ یہ معنے بھی ہوں گے کہ اُس نے کسی چیز کی خواہش کی۔ لیکن جب اس کو کسی مصدر سے باندھ دیا جائے گا تو اس کے وہی معنے ہوں گے جو اس مصدر سے ظاہر ہوتے ہوں گے۔ مثلاً ہم نَزَعَ نَزْعًا کہیں گے تو اس کے معنے مشابہ ہو جانے کے نہیں ہوں گے کیونکہ مشابہ ہونے کے معنے نُزُوْعًا مصدر سے پیدا ہوتے ہیں یا اس کے معنے شوق اور خواہش پیدا ہونے کے نہیں ہوں گے کیونکہ یہ معنے اُس وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب نَزَاعَةً وَنِزَاعًا وَنُزُوْعًا مصدر ہو بلکہ نَزَعَ نَزْعًا کے معنے کسی چیز کو اُکھیڑ دینے یا کسی کو معزول کر دینے کے ہوں

گے یا اَور دوسرے معنے ہوں گے جو اس مصدر سے پیدا ہوتے ہیں۔ تو مصدر معنوں کی تعیین کر دیا کرتا ہے۔ فعل کی شکل ایک ہوتی ہے لیکن مصدر مختلف ہونے سے ان کے معنے بدلتے چلے جائیں گے۔ اب اگر قرآن کریم میں وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کی بجائے وَالنّٰزِعٰتِ نَزْعًا ہوتا تو اس کے معنے صرف اتنے ہوتے جو نَزْعًا مصدر کی صورت میں نَزَعَ کو حاصل ہوتے ہیں یا اگر وَالنّٰزِعٰتِ نَزْعًا کی بجائے وَالنّٰزِعٰتِ نُزُوْعًا ہوتا پھر نَازِعٰت کے وہ معنے ہوتے جن پر نُزُوْعًا کا مصدر دلالت کرتا ہے یا اگر نَازِعٰت کے ساتھ نِزَاعًا آجاتا تو پھر وہ معنے ہوتے جو نَزَعَ نَزَاعَۃً وَنِزَاعًا سے ظاہر ہوتے ہیں تو عربی زبان میں مصدر کا دہرانا محض تاکید کے لئے نہیں ہوتا بلکہ معنوں کی تعیین کے لئے بھی ہوتا ہے لیکن جب کسی فعل کا مصدر نہ آئے بلکہ باہر سے کوئی لفظ آجائے جیسے وَالنّٰزِعٰتِ کے ساتھ غَرْقًا رکھ دیا گیا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے تمام مصدروں کے معنوں میں سے جو بھی اس جگہ چسپاں ہو سکتے ہوں مراد لئے جا سکتے ہیں۔ اگر نَازِعٰت کے ساتھ نَزْعًا مصدر ہوتا تو ہم صرف وہ معنے کرتے جو نَزْعًا سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر نُزُوْعًا مصدر ہوتا تو ہم صرف وہ معنے کرتے جو نُزُوْعًا سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر نَزَاعَۃً یا نِزَاعًا مصدر ہوتا تو ہم صرف وہ معنے کرتے جو نَزَاعَۃً یا نِزَاعًا سے ظاہر ہوتے ہیں اور اس طرح آیت کے معنے محدود ہو جاتے لیکن جب وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کہہ دیا گیا تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ نَزَعَ کے سارے مصادر کے معنے اس مقام پر چسپاں ہو سکتے ہیں گویا اِس طریق سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم سب معنوں کو دیکھو اور پھر غور کرو کہ اس آیت کے کیا معنے ہیں۔ اسی طرح آگے آتا ہے وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا اس کے بھی دو مصدر ہیں ایک نَشَطَ یَنْشُطُ نَشَاطًا اور ایک نَشَطَ یَنْشُطُ نَشْطًا یہاں نَشْطًا کہہ کر معنوں کو وسیع نہیں کیا بلکہ ان کو محدود کر دیا گیا ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ اس آیت کے وہی معنے ہو سکتے ہیں جن پر نَشْطًا مصدر دلالت کرتا ہے نَشَاطًا مصدر والے معنے اس مقام پر چسپاں نہیں ہو سکتے پاس ہم اس آیت کے جب بھی معنے کریں گے نَشْطًا مصدر کو مدنظر رکھیں گے۔ اور اُن معنوں کی طرف نہیں جائیں گے جو نَشَاطًا سے ظاہر ہوتے ہیں۔

سورۃ نازعات کی پہلی پانچ آیتوں کی صحیح تفسیر اب میں پانچوں آیتوں کے متعلق اپنا نقطہ نظر پیش کرتا ہوں۔ میں بتا چکا ہوں کہ ایک معنے جو میرے نزدیک معقول ہیں اور جن پر اکثر صحابہؓ اور تابعین اور تبع تابعین کا اتفاق ہے اور جو اکثر مفسّرین سے بھی مروی ہیں وہ یہ ہیں کہ اس جگہ ملائکہ مراد ہیں۔ مگر یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ملائکہ کی طرف تو مذکّر کی ضمیر جانی چاہیے تھی جیسے قرآن کریم میں ایک اور جگہ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (النحل: ۵۱) کہہ کر ملائکہ کی طرف مذکر کی ضمیر پھیری گئی ہے مگر یہاں مذکر کی بجائے مؤنث کی ضمیر آتی ہے حالانکہ ملائکہ مؤنث

نہیں ہیں۔اس کے متعلق صحابہؓ کے کسی جواب کا تو مفسّرین ذکر نہیں کرتے مگر انہوں نے خود اس اشکال کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گو فرشتوں کے لئے ضمیر مذکر آنی چاہیے تھی مگر اس جگہ فرشتوں سے مراد طوائف الملائکہ یعنی فرشتوں کے گروہ ہیں اور چونکہ ضمیر طوائف کی طرف جاتی تھی اس لئے یہاں مؤنث کی ضمیر لائی گئی ہے مذکر کی ضمیر نہیں لائی گئی۔ چنانچہ تمام مفسّرین اور ادیب اس امر پر اتفاق رکھتے ہیں کہ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا اور وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا سے طوائف الملائکہ یعنی فرشتوں کے بہت سے گروہ مراد ہیں اور چونکہ نَازِعَات میں جمع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس لئے معنے یہ ہوں گے کہ فرشتوں کے گروہ در گروہ۔ پس چونکہ اکثر صحابہؓ اور تابعین اور تبع تابعین اور پھر مفسّرین بھی اس بات پر متفق ہیں کہ اس جگہ ملائکہ کی طرف اشارہ ہے اس لئے لازمًا وہ اس امر پر بھی متفق سمجھے جائیں گے کہ ضمیر مؤنث طائفہ کی وجہ سے لائی گئی ہے یعنی نَازِعَات سے مراد طَوَائِفُ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ ہیں۔ جہاں تک اس نقطہ نگاہ والوں کا سوال ہے جن میں اکثر صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین شامل ہیں یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ یہ خیال کہ کوئی ایک فرشتہ جسمانی طور پر اتر کر دنیا کے سب کام کرتا ہے خلافِ شریعت اور خلاف عقیدۂ قرآن ہے اگر عزرائیل ہر شخص کے پاس جا کر اس کی جان نکالتا ہے تو پھر جان نکالنے کے لئے کسی طائفہ کی کیا ضرورت ہے طائفہ کی تو اُسی جگہ ضرورت ہوتی ہے جہاں کام ایک کی طاقت کا نہیں ہوتا یا متعدد کام ہونے کی وجہ سے متعدد کام کرنے والوں کی ضرورت ہو۔ پس یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ عزرائیل میں لوگوں کی جان نکالنے کی طاقت نہیں اسی لئے وہ لوگوں کی جان نکالنے کے لئے اپنے ساتھ ایک جتھہ لے کر جاتا ہے اور یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ جان نکالنے والا طائفہ مختلف انسانوں کی اپنے اپنے رنگ میں جان نکالتا ہے۔ اسی طرح باقی کاموں کے متعلق سمجھا جائے گا ورنہ اگر یہی خیال کیا جائے کہ ایک فرشتہ ہی زمین پر اتر کر تمام کام کرتا ہے تو یہ عقیدہ اسلام کے خلاف ہوگا کیونکہ اول تو ہبوطِ جسمانی ہر جگہ پر ایک شرک کے مشابہ عقیدہ ہے گویا اس طرح ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک ہی فرشتہ ایک ہی وقت میں حاضر بھی ہے اور غائب بھی ہے یہاں بھی ہے اور وہاں بھی ہے اور ہر جگہ ہے۔ گویا محیطِ کُل ہونے اور ایک ہی وقت میں عرش و فرش پر ہونے میں وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا شریک ہے نعوذ باللہ من ذالک۔ دوم ہبوط جسمانی کی ضرورت تو مادی اجسام میں ہوتی ہے ملائکہ تو روحانی اجسام ہیں اور ارواح لطیفہ اپنی شعاؤں سے زیادہ کام کرتی ہے بہ نسبت اپنے جسم کے بدلنے کے۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جتنی جتنی کوئی چیز لطیف ہوتی چلی جاتی ہے وہ بجائے اپنے مقام بدلنے کے شعاعوں سے کام لیتی ہے پس جیسا کہ ان آیات سے (جن کے ملائکہ کی نسبت ہونے پر سب متفق ہیں) ظاہر ہے ایک ایک کام پر ایک گروہ ملائکہ مقرر ہے جس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنی ہیں کہ

ملائکہ کا کام محدود ہوتا ہے اور پھر دائرہ عمل بھی محدود ہوتا ہے ایک کام جو ایک گروہ کے سپرد ہوتا اُسے ایک گروہ کرتا ہے نہ کہ کوئی ایک فرشتہ اور جب یہ حالت ہے تو ماننا پڑے گا کہ ہر گروہ کا کوئی مرکز بھی ہے اور اُس مرکز کے ساتھ اس کے افراد کے تعلقات ہیں اور وہاں وہ اپنے افسر کو رپورٹ دیتے ہیں بے شک انسانوں کی طرح نہیں بلکہ اسی طرح پر جو ملائکہ کے شایانِ شان اور مناسب حال ہے۔ (ملائکہ کے انتظام اور کام کے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے توضیح مرام طبع پنجم صفحہ ۱۵ تا آخر)

النّٰزِعٰتِ غَرْقًا کا صحیح حل اس تمہید کے بعد مَیں پہلے نَازِعَات کو لیتا ہوں اور اس کی تشریح کرتے ہوئے فرشتوں والے معنوں کو مقدم کر لیتا ہوں کیونکہ اس پر اکثر صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین اور مفسّرین کا اتفاق ہے۔

نازعات سے مراد طوائف الملائکۃ نَازِعَات کے ایک معنے اُکھیڑنے والی جماعتوں کے ہیں کہتے ہیں نَزَعَ الشَّیْءَ عَنْ مَّکَانِہٖ اَیْ قَلَعَہٗ۔ یعنی کسی چیز کو اپنی جگہ سے اُکھیڑا۔ پس ان معنوں کے رُو سے نَازِعَات کے معنے ہوں گے اپنی اپنی جگہ سے بعض چیزوں کو اکھیڑنے والے فرشتوں کے متعدد گروہوں کو ہم بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ اوّل تو اس ترجمہ سے اُس تمہید پر جسے میں بیان کر چکا ہوں مزید روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ایک گروہ فرشتوں کا نَزْعٌ کے کام پر مقرر ہے بلکہ خود نَزْعٌ کا کام مختلف اقسام کا ہے اور ہر کام پر الگ قسم کا گروہ مقرر ہے گویا یہاں سے فرشتوں کے گروہ در گروہ ہونے کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے اور پتہ لگتا ہے کہ نَزْعٌ کے کام کے لئے کئی گروہ ہیں اور نَزْعٌ کی ہر قسم پر ایک ایک گروہ مقرر ہے اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت ہر سبب کا مسبب ایک فرشتہ ہوتا ہے اور چونکہ اسباب بے انتہاء اور لَا تُعَدُّ وَ لَا تُحْصٰی ہیں اس لئے فرشتے بھی اَن گنت ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ مَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (المدثر: ۳۲) فرشتوں کی تعداد کا اندازہ انسان نہیں لگا سکتا۔ جس طرح دنیا کے کاموں میں باریک در باریک اسباب کا سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے جن کا کوئی انسان اندازہ بھی نہیں لگا سکتا اسی طرح اُن پر جو ملائکہ مقرر ہیں ان کا بھی کوئی انسان اندازہ نہیں لگا سکتا۔

ملائکہ کی مدد سے مسلمانوں کی ترقی اس آیت میں جو فرمایا کہ اپنی جگہ سے اکھیڑنے والے متعدد گروہ تو اس میں اکھیڑنے سے مراد کفّار کے اُن دلوں کا اُکھیڑنا ہے جو بظاہر کافر لیکن بباطن اسلام سے مناسبت رکھتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس سے پہلی سورۃ میں غلبۂ اسلام اور غلبۂ قرآن کا ذکر تھا اور اس غلبہ کو قیامت کا ثبوت قرار دیا گیا تھا پس اس ترتیب کے مطابق یہ ضروری تھا کہ اس سورۃ میں یہ بتایا جاتا کہ یہ غلبہ کس طرح ہوگا۔ اسلام کس طرح ترقی کرے گا اور کفر کی بنیادوں کو کس طرح اکھیڑا جائے گا اسی لئے اس کو وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا سے شروع کیا گیا اور بتایا گیا

کہ کفار کے دل جو بظاہر اسلام سے عناد رکھتے ہیں لیکن بباطن اسلام کی خوبیوں کے قائل ہیں ان کو اکھیڑنے کے لئے فرشتوں کے متعدد گروہ کام کریں گے چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ اُن میں سے کوئی شخص کسی وجہ سے مخفی طور پر کفر سے بیزار تھا اور کوئی کسی وجہ سے۔ کوئی ان کی وحشت کی وجہ سے بیزار تھا اور کوئی بدانتظامی کی وجہ سے۔ کوئی ظلم کی وجہ سے بیزار تھا اور کوئی شریعت نہ ہونے کی وجہ سے۔ اور اس طرح گو کچھ لوگ کفر کے باغ کے درخت تھے مگر اُن کی جڑیں اس زمین میں کھوکھلی ہو چکی تھیں اور اب اُن کی کفر کی سرزمین سے مناسبت نہیں رہی تھی جب محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی تو ہر خُلق پر مقرر فرشتے نے اپنے اپنے دائرہ کے باغ کو چُنا اور اُن کے نیک جذبات کو ابھارنا شروع کیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کامل تعلیم لائے تھے اُس میں شرک نہ تھا۔ توحید تھی۔ جہالت نہ تھی۔ علم تھا۔ ظلم نہ تھا۔ انصاف تھا۔ وحشت نہ تھی۔ رأفت تھی۔ مادر پدر آزادی نہ تھی۔ ایک باقاعدہ اور مفید قانون تھا۔ بدانتظامی نہ تھی۔ انتظام تھا۔ غرض ہر قسم کی ضرورت جو انسانی فطرت کو پیش آسکتی تھی اس کا سامان آپ کی تعلیم میں موجود تھا اور ہر غلطی جو کفر میں موجود تھی اس کی اصلاح کا سامان بھی موجود تھا۔ پس ہر فرشتہ جو کسی خلق پر مقرر تھا اُس نے ہر دل میں جو اس کے مطابق حال تھا اپنے دائرہ کے مطابق نیک جذبات کو اُبھار کر اس نیکی کو نمایاں کرنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے کفر کا وُہ نقص اُسے بہت ہی بھیانک نظر آنے لگا۔ مثلاً ایک شخص اگر شرک کو ناپسند کرتا تھا تو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے بعد توحید کے قیام کے لئے جو فرشتے مقرر تھے انہوں نے اِن تھوڑی نفرت رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں مزید نفرت پیدا کرنی شروع کر دی اور شرک کی خرابی اُن پر اور زیادہ واضح کر دی۔ دوسری طرف انہوں نے اپنے اپنے دائرہ کی نیک تعلیم جو اسلام میں تھی اسے ان لوگوں کے قریب الفہم بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے باغ سے اور زیادہ دل برداشتہ ہو گئے اور جس زمین میں وہ ٹکے ہوئے تھے اُس سے اور بھی نفرت کرنے لگے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ زمین ہمارے مناسب حال نہیں اور باغ محمدیؐ میں جانے کے بے انتہاء شائق ہو گئے۔ جب یہ حالت پیدا ہو گئی۔ پہلا قدم فرشتوں نے اٹھالیا اور لوگوں کے دلوں میں کفر سے نفرت پیدا کر دی اور جو شخص جس نیکی کی طرف مائل تھا اُسے اُس نیکی کی طرف انہوں نے اور زیادہ مائل کر لیا اور اس طرح اسلام کی محبت اُن کے دلوں میں پیدا کر دی۔ تو اس کے بعد ہر گروہ کے فرشتوں نے دوسرا کام شروع کیا جس کا وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا میں ذکر آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا قسم ہے اُن طوائفِ ملائکہ کی جو گرہیں باندھتے ہیں یعنی وہ وہاں سے اُن ارواح کو کاٹ کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دامن سے باندھنا شروع کر دیں گے۔ پہلے اُن فرشتوں کا

ذکر کرنے سے جو قَلَع کرتے ہیں یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرا گروہ پہلا عمل نہیں کرتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب وہ پہلا عمل کر لیں گے تو پھر یہ دوسرا کام شروع کر دیں گے۔ یعنی کفر سے بیزار کرنے کے مرحلہ کے بعد ان کے اندر ایمان کی محبت پیدا کریں گے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لا کر وابستہ کر دیں گے بیعت بھی باندھنا ہی کہلاتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَكُنْ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ فَمَاتَ مِيْتَةَ الْجَاهِلِيَّةِ (مسلم کتاب الامارة باب وجوب ملازمة جماعة المسلمین عند الفتن فی کل حال) اور نَشْطٌ کے معنے بھی ہیں عَقْدُ الْحَبْلِ یعنی باندھنا۔ پس وَ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا کے معنے یہ ہوئے کہ اُن لوگوں کو جو پہلے کفر سے بیزار ہو جائیں گے ان کے متعلقہ فرشتے اسلام کی طرف راغب کر کے آخر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی رسّی میں لا کر باندھ دیں گے۔

پھر فرمایا وَ السّٰبِحٰتِ سَبْحًا اور قسم ہے اُن ملائکہ کے گروہوں کی جو تیرتے ہیں اور تیرتے تیرتے دُور نکل جاتے ہیں اِس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی ترقی کے لئے ملائکہ صرف مکّہ میں کوشش نہ کریں گے بلکہ جو مستعد روحیں مکّہ میں ہوں گی ان کو اسلام کی طرف لا کر وہ دوسرے علاقوں میں نکل جائیں گے اور وہاں جو مستعد ارواح ہوں گی انہیں اسلام کی طرف لائیں گے چنانچہ ملائکہ کی اس پرواز کا ہی نتیجہ تھا کہ ابو ذر غفاریؓ قبیلہ غفار سے اور وفدِ انصار مدینہ سے اسلام لایا۔ ابو موسیٰ اشعری اور اُن کے ساتھ تعلق رکھنے والا گروہ یمن سے آیا اور سلمان فارسی فارس سے آئے اور اس طرح ایک وقت میں اسلام کے مختلف اکناف میں پھیلنے کا سامان ہو گیا۔

مختلف فرشتوں کے گروہوں کا اثر صحابہ پر

اس کے بعد فرمایا فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا۔ پھر انہوں نے مقابلہ شروع کیا کہ کون بڑھتا ہے یعنی جب مختلف علاقوں میں ملائکہ قلوبِ مومنین فتح کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو ہر علاقہ میں مسابقت کی رُوح پیدا ہو جائے گی اور ہر طبقہ اور ہر علاقہ کے ملائکہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے چنانچہ ملائکہ کے اضلال مومنین کے کاموں سے ہم دیکھتے ہیں کہ اُن میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی بے انتہاء تڑپ تھی اور ہر قوم دوسروں سے آگے نکلنے کی خواہش مند تھی چنانچہ زمانۂ خلافتِ اولیٰ اور ثانیہ میں اس کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ خود زمانۂ نبویؐ میں جب مسلمانوں کی جماعت نہایت چھوٹی سی تھی۔ اس مسابقت کی روح کا کئی مثالوں سے اچھی طرح پتہ لگ جاتا ہے قوموں کے لحاظ سے مہاجر اور انصار گو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور بھائیوں سے بھی زیادہ وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے مگر دین کی خدمت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ ان میں شدید طور پر پایا جاتا تھا۔ پھر انصار کے خود دو قبیلے تھے اوسؔ اور خزرجؔ۔ وہ آپس کی لڑائی کو

بھول چکے تھے۔ وہ اسلام میں داخل ہو کر بھائی بھائی بن گئے تھے۔ مگر دین میں مسابقت کی رُوح اُن میں ایسی پیدا ہوگئی تھی کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ کون ہے جو مجھے میرے دشمن کی تکلیف سے بچانے کے لئے آگے بڑھے اور آپ کا مطلب اس سے کعب بن اشرف شدید دشمنِ اسلام تھا تو اوس میں سے ایک جماعت کھڑی ہوگئی اور اُس نے کہا یا رسول اللہ ہم اس کام کے لئے تیار ہیں چنانچہ آپ نے وہ کام اُن کے سپرد کیا اور انہوں نے اس دشمنِ اسلام کو عام جنگی قواعد کے مطابق (نہ کہ ظلم سے) مار دیا (سیرۃ النبویۃ لابن ھشام اجزٔ الثالث زیر عنوان مقتل کعب بن اشرف) (یہ تفصیل کا موقع نہیں۔ دشمنانِ اسلام اعتراض کیا کرتے ہیں کہ آپ نے ناجائز طور پر اس کو قتل کرایا تھا لیکن اُن کا یہ الزام خلافِ تاریخ ہے۔ تفصیلی بحث کے لئے دیکھو تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ ۱۹۸) جب کعب مارا گیا تو وہی مسابقت کی روح کہ اسلام میں ہم ایک دوسرے سے بڑھ کر رہیں دوسرے گروہ کے دل میں پیدا ہوئی چنانچہ قبیلہ خزرج کے لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ اب ہمیں بھی کوئی ایسا ہی کام دیجئے تا کہ ہم بھی اپنے بھائیوں سے پیچھے نہ رہیں اور آخر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ابو رافع کو قتل کرنے کا کام اُن کے سپرد کیا اور اس قبیلہ نے اس دشمنِ اسلام کو جا کر مارا (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام الجزء الثالث زیر عنوان مقتل سلام بن ابی الحقیق) پھر یہ مسابقت کی روح قبائل میں ہی نہ تھی قبیلوں سے جو چھوٹے چھوٹے خاندان تھے اُن میں بھی یہ روح پائی جاتی تھی چنانچہ انصار کے دونوں قبائل کے مختلف خاندان باری باری رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا رات کو پہرہ دیا کرتے تھے مگر وہ عام طور پر بغیر ہتھیار لگائے پہرہ دیا کرتے تھے۔ ایک دن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے باہر ہتھیاروں کی آواز سنی اور پوچھا کہ یہ شور کیسا ہے کسی نے دریافت کر کے بتایا کہ فلاں خاندان کے لوگ ہتھیار بند ہو کر پہرہ دینے آئے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کی اس روح مسابقت کو دیکھ کر پسند فرمایا۔ (بخاری کتاب الجهاد باب الحراسة فی الغزو۔۔۔)

سَابِقٰتِ سَبْقًا کے ماتحت مسلمانوں میں مسابقت کی روح پھر غریبوں اور امیروں میں مسابقت کی روح اس قدر پائی جاتی تھی کہ ایک دفعہ غرباء رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ امیر لوگ زکوٰۃ دیتے ہیں مگر ہم بوجہ مال نہ ہونے کے زکوٰۃ کے ثواب سے محروم ہیں۔ اسی طرح امراء صدقہ وخیرات کرتے ہیں مگر ہم یہ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے پاس مال نہیں ہے۔ یا رسول اللہ ہمیں کوئی ایسی نیکی بتائیں جس پر عمل کر کے ہم اُن سے پیچھے نہ رہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ہر نماز کے بعد تینتیس دفعہ سُبْحَانَ اللّٰہ تینتیس دفعہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اور چونتیس دفعہ اَللّٰہُ اَکْبَر کہہ لیا کرو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے

پھر شکایت کی کہ یا رسول اللہ اس بات کا کسی طرح امیروں کو بھی علم ہو گیا ہے اور وہ بھی ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس دفعہ سُبْحَانَ اللّٰہ و اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اور چونتیس دفعہ اَللّٰہُ اَکْبَر کہنے لگ گئے ہیں یا رسول اللہ آپ ان کو روکیں کہ وہ ایسا نہ کریں۔ آپ نے فرمایا میں اُن کو نیکی سے نہیں روک سکتا (مسلم کتاب المساجد و مواضع الصلوة باب استجاب الذکر بعد الصلوٰۃ) پھر یہ مسابقت کی روح صرف مردوں میں ہی نہیں پائی جاتی تھی بلکہ عورتوں میں بھی یہ روح کام کرتی نظر آتی تھی چنانچہ عورتوں نے ایک دفعہ احتجاج کیا کہ یا رسول اللہ مردوں میں تو آپ وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہیں لیکن عورتوں کو یہ موقعہ نہیں ملتا اس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کے لئے بھی ایک دن مقرر فرما دیا (بخاری کتاب العلم باب ھل یجعل للنساء یوم علی حدۃ فی العلم) غرض مسلمانوں میں کام کے متعلق یہ روح نہیں تھی کہ شکر ہے فلاں شخص نے کام کر لیا اور میرا بوجھ اُتر گیا بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ماننے والے تمام افراد میں یہ جوش پایا جاتا تھا کہ ہم دوسروں سے زیادہ ذمہ واری اپنے اوپر لیں۔ اور یہی قومی ترقی کا راز ہے۔ جب قوم کے افراد ذمہ واری کے مواقع پر دوسروں پر اس بوجھ کو ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب قوم کے ہر فرد میں یہ احساس ہو کہ زیادہ کام کرنے کا موقع مجھ کو ہی ملے تو وہ قوم ترقی کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ صحابہؓ میں یہی مادہ پایا جاتا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ ان کے دلوں میں نیک تحریکیں کرنے والے ملائکہ میں بھی یہی روح پائی جاتی تھی۔ جب اسلام اَور پھیلا تو یہ مسابقت کی روح ایسی بڑھی کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافتِ اُولیٰ اور خلافتِ ثانیہ کے زمانہ میں بعض قبائل نے اپنی ساری آبادی ہی جنگ میں فنا کر دی۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اسلام کے لئے اس موت کے قبول کرنے میں ہمارے ساتھ دوسرے بھی شریک ہوں۔ وہ ظاہری انعام و کرام میں تو دوسروں کو شریک بنانا چاہتے تھے مگر ملّی اور قومی قربانیوں میں ان کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ موت کا پیالہ صرف ہم کو ہی ملے دوسروں کو نہ ملے۔ یہ اتنا لمبا مضمون ہے کہ تفسیر اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بہرحال فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا کا یہ بیّن اور روشن ثبوت تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔

صحابہ کرامؓ کے ذریعہ اس دنیا میں خدا کی بادشاہت کا قیام فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب مسابقت والا کام ملائکہ کر لیں گے تو پھر ملائکہ مُدَبِّرَاتِ اَمْرًا ہو جائیں گے یعنی زمین پر انہی کی حکومت ہو جائے گی۔ کیونکہ ملائکہ نیک تحریکیں کرنے والے ہیں۔ جب زمین پر نیک لوگوں کی حکومت ہو جائے گی تو ہر محکمہ پر اُن لوگوں کا قبضہ ہو گا جو ملائکہ کی باتیں ماننے والے ہیں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ دنیا پر ملائکہ کی حکومت ہو جائے گی یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ خدا کی بادشاہت دنیا میں قائم ہو جائے گی کیونکہ ملائکہ کے متعلق آتا ہے یَفْعَلُوْنَ

مَایُؤْمَرُوْنَ (النحل :۵۱) وہ وہی کرتے ہیں جو خدا کہتا ہے۔ پس ایسے انسانوں کی حکومت کی وجہ سے جو ملائکہ کی بات مانتے ہیں دنیا پر ملائکہ کی حکومت ہوگی اور ان ملائکہ کی وجہ سے جو خدا کی ہر بات مانتے ہیں خدا کی بادشاہت دنیا میں قائم ہوجائے گی یا تیسرے لفظوں میں یہ کہہ لو کہ وہ دعا جو مسیحؑ نے کی تھی کہ اے خدا ''تیری بادشاہت آوے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی برآوے'' (متی باب ۶ آیت ۱۰) وہ حضرت مسیحؑ کے ذریعہ سے تو پوری نہ ہوئی کیونکہ جب تک اُن کی قوم نیک تھی بادشاہت نہ ملی اور جب بادشاہت ملی تو قوم مشرک ہو چکی تھی۔ مگر یہ دعا محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعہ پوری ہوگئی۔ اُن کو اُسی وقت حکومت ملی جب اُن کے اتباع کے دل فرشتوں کے ہاتھ میں تھے اور وہ وہی کچھ دنیا میں کرتے تھے جو فرشتے اُن سے کہتے تھے اور فرشتے وہی کچھ کہتے تھے جو خدا تعالیٰ اُن سے کہتا تھا اِس طرح اُن کے زمانہ میں خدا تعالیٰ کی بادشاہت آسمان پر ہی نہ رہی بلکہ زمین پر بھی آگئی۔ کیسی شاندار اور زبردست یہ پیشگوئی ہے اور کس طرح دشمن بھی یہ اقرار کرنے پر مجبور ہے کہ خلفاء اسلام کی بادشاہت انسانی بادشاہت نہیں تھی بلکہ اخلاق کی حکومت تھی اور یہ الفاظ غیر مسلموں کے ہاں اسی حکومت کے لئے بولے جاتے ہیں جسے اسلامی اصطلاح میں فرشتوں کی حکومت کہتے ہیں اور کیوں نہ ہم اِسے فرشتوں کی حکومت کہیں کیا یوسفؑ کو اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (یوسف:۳۲) نہیں کہا گیا تھا۔

اَلسّٰبِحٰتِ سَبْحًا میں عالمگیر ترقی کرنے کے دو اصولوں کی طرف اشارہ اس جگہ دو ضمنی باتیں بھی بیان کرنے کے قابل ہیں جو بطور قانونی سبق کے اِن آیات سے نکلتی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

اوّل۔ اس جگہ اسلامی ترقی کے لئے وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا فرمایا یعنی ابتداء میں ہی دور دور تک اس کی اشاعت ہوجائے گی۔ اِس سے اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام کی تحریک عالمگیر کشش رکھنے والی ہے کسی ایک ملک یا قوم سے اس کو وابستگی نہیں۔ قومی یا ملکی روایات کی زمین میں اس کی جڑیں نہیں گاڑیں گئیں بلکہ اخلاقِ انسانی اور جذباتِ انسانی کی زمین میں اس کی بنیادیں رکھی گئی ہیں اس لئے وہ جلد جلد دُور دُور پھیل جائے گا۔ خواہ شروع میں تھوڑے لوگ ماننے والے ہوں مگر جلد ہی سب قوموں کی توجہ کو اسلام کھینچ لے گا۔ جہاں اس میں اسلام کی ایک زبردست فضیلت کا اظہار ہے جس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں وہاں اس میں سب ایسی تحریکوں کے لئے جو عالمگیر ہونا چاہتی ہوں ایک نکتۂ معرفت بھی بیان کیا گیا ہے۔ جب تک انسان اپنے قومی تعصّب سے بالا نہیں ہو جاتا وہ کوئی عالمگیر تحریک بھی نہیں کرسکتا۔ مثلاً ہندوستان صرف ایک ملک ہے دنیا نہیں۔ مگر یہاں کے سیاسی لیڈر ابھی تک وطنی فضا بھی پیدا نہیں کر سکے کیونکہ انہوں نے اپنی تحریکوں کی جڑیں قومی دباؤ کی وجہ سے یا اپنے نسبی میلانوں سے مجبور ہو

کر ملکی نہیں بلکہ قبائلی میلانات کی زمین میں گاڑیں ہیں اس وجہ سے وہ درخت جو ان تحریکوں سے پیدا ہوتے ہیں ایک وقت تک نشوونما پا کر یا کلی طور پر یا جزوی طور پر خشک ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور سارے ملک کو سایہ دینے والا درخت اُن سے پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام نے شدید قومی تعصّبات کے زمانہ میں جب مدینہ جیسے معمولی قصبہ کے دو قبیلے اوسؔ اور خزرجؔ بھی آپس میں لڑ رہے تھے مکّہ سے اوس وخزرج کو کھینچا یمن جو عرب میں سیاسی برتری کا مدعی تھا اسے اپنے تابع کیا یہود سے عبداللہ بن سلام اور ایران سے سلمان فارسی دوڑتے ہوئے آئے مگر یہ صرف اپنی قوموں کے نمائندے تھے بعد میں قومیں آئیں اور پروانوں کی طرح آئیں کیونکہ اسلام ایک تالاب کا پانی نہ تھا وہ بارش تھی جو ٹیلے پر برستی ہے اور وہ وہیں جمع نہیں ہو جاتی بلکہ دُور دُور پھیل جاتی ہے اس کے حامل قومی کارکن نہ تھے وہ بنی نوع انسان کے خادم تھے ہر اک نے سمجھا میں ہی اس دولت کا وارث نہیں دُوسرے ملک بھی اس میں حصہ دار ہیں چنانچہ وہ اس تعلیم کو لے کر دوڑا اور سب جہان میں اس کی تعلیم پھیل گئی اگر وہ تعلیم قومی اور ملکی روایات سے متاثر ہوتی یا اس کے ماننے والے مخصوص قوم و ملک کی برتری کے خواہش مند ہوتے تو یہ کبھی نہ ہوتا اب بھی جو قوم انہی مقصود حدود کے مطابق اپنی تعلیم اور اپنے اخلاق کو وسیع نہ کرے گی کبھی بھی اپنی مقصود حدود کو نہ پہنچ سکے گی۔

اسلامی تعلیم ہر قسم کی فطرت کے لئے دوسرا سبق اس آیت میں یہ دیا گیا ہے کہ اسلام کی تعلیم حدود کے لحاظ سے ہی وسیع نہیں بلکہ طبائع کے لحاظ سے بھی وسیع ہے اور اسی کی طرف بھی نَازِعَات اور نَاشِطَات کے جمع کے صیغوں سے اشارہ کیا گیا ہے یعنی ملائکہ کے کئی کئی طوائف اس کام میں لگے ہوئے ہیں اس کے مخاطب کسی ایک فطرت کے آدمی نہیں بلکہ ہر فطرت تک وہ پہنچتی ہے اس مضمون کی تفصیل کی بھی تفسیر حامل نہیں ہو سکتی مگر یہ موٹی موٹی باتیں ذہن میں رکھو تو یہ امر سمجھ میں آجاتا ہے کہ اسلام میں سیاسی، تمدنی، معاشرتی، تجارتی، اقتصادی سب ہی قسم کے احکام بیان ہوئے ہیں پھر آقا اور ماتحت۔ بیوی اور میاں۔ باپ اور اولاد۔ بھائی اور بھائی۔ استاد اور شاگرد۔ غریب اور امیر۔ بادشاہ اور رعایا۔ دوست اور دوست سب ہی کے متعلق غیر جانبدارانہ تعلیم موجود ہے اس کے علاوہ عبادت گزار۔ سپاہی۔ قاضی۔ جہاد کی طرف میلان رکھنے والا۔ انصاف کا دلدادہ۔ تعلیم کا شیدا۔ صدقہ وخیرات کا شائق اور تنظیم کا خواہش مند غرض کون سا طبعی مادہ ہے جس کے ابھارنے کی اس میں سبیل پیدا نہیں کی گئی۔ پس جہاں یہ کہہ کر کہ اسلام کی تبلیغ کے لئے ہر ملک اور ہر طبیعت کے مؤکل ملائکہ مقرر کئے گئے ہیں کیونکہ اس میں ہر ملک کی طرف اور ہر طبیعت کی طرف توجہ کی گئی ہے اسلام کی برتری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہاں عالمگیر تحریکوں کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جہانگیر تحریکوں کے لئے ہر طبیعت اور ہر قوم کے لوگوں کا لحاظ رکھنا اس حد تک کہ اُن کا لحاظ قومی اور ملی کاموں

میں روک نہ ہو ضروری ہے بلکہ ہر فرد کی مخصوص قابلیت کو ابھارنا قومی ترقی کا ایک اہم اور قیمتی جزو ہے۔ انہی معنوں کے رو سے یہ آیات طوائف ملائکہ کی جگہ طوائفِ مومنین کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں لیکن اس تشریح کی ضرورت نہیں کیونکہ اُوپر کی تشریح کے مطابق اسے خود ہی حل کیا جا سکتا ہے۔

سورۃ نازعات کی پہلی پانچ آیتوں کی تفسیر اس لحاظ سے کہ ان آیات میں طوائف انسانی مراد ہیں

اب میں ان آیات کی ایک دوسری تشریح بیان کرتا ہوں اور یہ تشریح اس امر کو فرض کر کے ہے کہ اس جگہ طوائف ملائکہ مراد نہیں بلکہ طوائفِ انسانی مراد ہیں۔ نَزَعَ کے ایک معنے تیر اندازی کے ہیں اور نَشَطَ کے معنے رسیوں سے باندھنے کے ہیں۔ سَبَحَ کے معنے تیرنے یا دُور دُور نکل جانے کے ہیں۔ سِبَاق کے معنے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کے اور غالب آجانے کے ہیں اور تدبیر امر کے معنے نظامِ حکومت کے ہاتھ میں آجانے کے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے یہ ایک پیشگوئی ہے اسلامی فتوحات کی۔ سورۂ نبأ میں یوم الفصل کی طرف اشارہ کیا تھا اور اُس دن کی طرف توجہ دلائی گئی تھی جب اسلام کا غلبہ ایسے رنگ میں ہو جائے گا کہ کافر کہے گا یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا کہ اُف! اسلام اس قدر غالب آ گیا کاش میں اس سے پہلے مٹی ہو چکا ہوتا۔ اسی مضمون کی تفصیل سورۂ نازعات میں بیان کی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اس غلبہ کا آغاز کس طرح ہوگا اور انتہا کیا ہوگی۔

فرماتا ہے وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا ہم مسلمانوں کے اُن گروہوں کو اپنے دعویٰ کی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو تیر انداز ہوں گے اور ایسے تیر انداز ہوں گے کہ اِغْرَاق کی کیفیت ان کو حاصل ہوگی یعنی جب وہ اس کام میں لگیں گے تو انہیں تن بدن کا ہوش نہ رہے گا اور وہ اس کام اور مقصد کو اس انتہاء تک پہنچا دیں گے یہ صحابہؓ کے گروہ ہیں۔ وہ صحابہؓ جو اس سورۃ کے نزول کے وقت صرف چند آدمی تھے اور ابھی وہ ایک گروہ بھی نہیں کہلا سکتے تھے اور مظالم کا شکار تھے تلوار تو الگ رہی اپنے دشمن کے سامنے ہاتھ بھی نہ اٹھا سکتے تھے۔ فرماتا ہے وہ غلبۂ اسلام کا دن جب کفار میں سے بعض کہیں گے کہ کاش ہم مٹی ہوتے اس طرح آئے گا کہ ہم اسلام کو ملک میں پھیلا دیں گے۔ مختلف اقوام اس میں داخل ہو جائیں گی۔ لڑائی کی اجازت اُن کو مل جائے گی اور یہ اپنے جہاد کے فرض کو اس طرح ادا کریں گے کہ کسی نے اس طرح ادا نہ کیا ہوگا کیونکہ اِغْرَاق کے معنے ہیں کسی کام کو اس کی حد تک پہنچا دینا۔ اب دیکھو کس طرح آئندہ زمانہ نے اس پیشگوئی کو پورا کیا۔ اسلام مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچا اور ایک قوم سے دو قوم بن گیا۔ آگے مدینہ میں دو قومیں بستی تھیں اوس اور خزرج۔ اور وہ بھی ایک نہ تھے دونوں میں شدید رقابت تھی اس طرح وہ دو سے تین قوم بن گیا اور جمع کے صیغہ کا اُن پر اطلاق جائز ہو گیا۔ چنانچہ جس دن سے مسلمانوں کو جنگ میں آنے کی اجازت ملی اُسی دن

سے وہ تین گروہ تھے اور وہ نَازِعَات اور نَاشِطَات کہلانے کے مستحق تھے۔ جب یہ تین گروہ اسلام کے جھنڈے کے نیچے آ گئے تو وہ وقت آ گیا جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۔ اِلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج: ۴۰ تا ۴۲) یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جارہی تھی لڑائی کی اجازت دی گئی ہے اور اس لئے دی گئی ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا تھا اور اس لئے اجازت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے اگر اس جنگ کے نتیجہ میں انہوں نے فنا ہو جانا ہوتا تو وہ ان کو کبھی جنگ کی اجازت نہ دیتا اس کی اجازت دینا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا ان کی مدد کا ذمہ وار ہو گیا ہے۔ وہ لوگ ایسے ہیں جو اپنے گھروں سے نکالے گئے بغیر اس کے کہ کوئی وجہ ہوتی۔ صرف اس بناء پر کہ انہوں نے کہا اللہ ہمارا رب ہے اور اگر اللہ تعالیٰ بعض قوموں سے بعض کا شر دور نہ کرے تو یہودیوں اور عیسائیوں اور مسلمانوں سب کی عبادت گاہیں تباہ ہو جائیں جن میں خدا تعالیٰ کا بڑی کثرت سے ذکر ہوتا ہے۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اس کے دین کی تائید کے لئے کھڑا ہو گا اور اللہ بڑا قوی اور غالب ہے۔ وہ لوگ جن کو اب بادشاہت ملنے والی ہے ایسے ہیں کہ جب ہم ان کے ہاتھ میں نظامِ حکومت دیں گے تو وہ نمازوں کو قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیک باتوں کا حکم دیں گے اور بُری باتوں سے روکیں گے اور دُنیا میں اپنی نہیں خدا کی بادشاہت قائم کریں گے۔ چنانچہ بدرؔ کے موقع پر یہ بات پوری ہوئی۔ صحابہؓ کو لڑائی کی اجازت ملی اور وہ اپنے سے تین گُنے سے بھی زیادہ دشمن کے مقابل پر جا کھڑے ہوئے اور یہ جنگ زیادہ تر تیروں کی جنگ تھی اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال: ۱۸) گو اس میں مٹھی بھر کنکروں کی طرف بھی اشارہ ہے مگر اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس مٹھی کے پھینکنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے پیچھے کی طرف سے ہوا چلا دی (زرقانی مواھب اللدینیة للعسطلانی باب غزوة بدر العظمی) اور نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے تیر نشانہ پر اور زور سے لگتے اور کفار کے ہوا کے دباؤ سے یا تو رستہ میں رہ جاتے یا بے اثر ہو جاتے۔

اُن کے غَرْقًا ہونے کا ثبوت کہ بس ایک ہی مقصد اُن کے سامنے تھا کہ کچھ ہو۔ کتنا عرصہ لگے وہ جنگ کرتے ہی چلے جائیں گے پیچھے نہ ہٹیں گے کفار کے ایک سردار عمیر بن وہب کے واقعہ سے ملتا ہے۔ اُسے مکہ والوں نے

جنگ بدر کے موقعہ پر مسلمانوں کا اندازہ لگانے کے لئے بھجوایا اُس نے واپس آ کر کہا کہ مسلمان تین سو یا اس کے لگ بھگ ہوں گے اور یہ اندازہ صحیح تھا مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ تھی۔ مگر اُس کے بعد اس نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم گو وہ تھوڑے ہیں مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ اُن سے جنگ نہ کرو کیونکہ میں نے اونٹنیوں پر آدمی نہیں بلکہ موتیں سوار دیکھی ہیں (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام ذکر غزوۃ بدر الکبریٰ، تشاور قریش فی الرجوع عن القتال) یعنی اُن میں سے ہر شخص کے چہرہ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لڑتے لڑتے مرجانے کے لئے آیا ہے اس لئے نہیں آیا کہ یہاں سے زندہ واپس جائے۔ پہلے تو کفارِ مکّہ اُس کی بات سے متاثر ہوئے مگر ابوجہل کی ایک تدبیر سے لڑائی شروع ہوگئی۔

فریضہ جنگ کو ادا کرنے میں مسلمانوں کی حیرت انگیز قربانیاں دوسری شہادت اس کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ سے ملتی ہے۔ بدر کی جنگ کے کچھ عرصہ بعد جب اُن کے لڑکے عبدالرحمٰن بھی مسلمان ہوکر مدینہ آ گئے تو ایک دفعہ کسی مجلس میں باپ بیٹا دونوں آپس میں گفتگو کر رہے تھے اور پُرانی باتوں کا تذکرہ جاری تھا کہ باتوں باتوں میں جنگ بدر کا ذکر آ گیا۔ عبدالرحمٰن نے کہا ابّا جان کئی دفعہ آپ لڑتے لڑتے ایسی جگہ پر پہنچے جہاں آپ میری زد میں ہوتے تھے۔ لیکن ہر دفعہ میں نے حملہ سے گریز کیا اور میں نے کہا کہ میں اپنے باپ کو تو نہیں مار سکتا۔ تب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا میری نظر تم پر نہ پڑی ورنہ اگر میری نظر پڑ جاتی تو میں نے کوئی لحاظ نہیں کرنا تھا کہ یہ میرا بیٹا ہے بلکہ میں نے اُسی وقت تم کو قتل کر دینا تھا (الروض الانف شرح ابن ھشام الجزء الثالث غزوۃ بدر فصل و ذکر قول ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ لابنہ۔۔۔) حالانکہ عام طور پر بیٹوں کو اپنے باپ سے جو محبت ہوتی ہے اس سے بہت زیادہ باپ کو اپنے بیٹوں سے محبت ہوتی ہے۔ مگر یہ اسلام کی ہی روح تھی جس نے ہر باپ اور ہر بیٹے، ہر خاوند اور ہر بیوی کو اس بات پر آمادہ کر دیا تھا کہ سچائی کے راستہ میں کوئی چیز بھی روک ہو ہم نے اس کی پروا نہیں کرنی۔ غرض مومنین و کفار کی شہادتوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ صحابہؓ کی جماعتیں وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا کی مصداق تھیں پہلے وہ صلح سے رہے اور صبر دکھایا تو حد تک دکھایا اور جب نَازِعَات بنے اور تیر کمان ہاتھ میں پکڑ لئے تو غَرْقًا ہونے کا ایسا ثبوت دیا کہ جب تک تن سے جان نہیں نکل گئی کمان کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اَصْحٰبِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

کفار کے لئے اسی دنیا میں یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا کا نظارہ چنانچہ اس اخلاص کا نتیجہ یہ نکلا کہ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا کا نظارہ کفار نے اسی دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ابوجہل جو مکّہ کے تمام گھرانوں کا سردار اور کفار کی فوج کا کمانڈر تھا جب بدر کی جنگ کے موقعہ پر وہ فوج کی ترتیب کر رہا تھا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جیسا تجربہ کار

جرنیل کہتا ہے کہ میں نے اپنے دائیں بائیں دو انصاری لڑکوں کو دیکھا جو پندرہ پندرہ سال کی عمر کے تھے میں نے اُن کو دیکھ کر کہا آج دل کی حسرتیں نکالنے کا موقعہ نہیں بدقسمتی سے میرے اردگرد نا تجربہ کار بچے اور وہ بھی انصاری بچے کھڑے ہیں جن کو جنگ سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔ میں اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ دائیں طرف سے میرے پہلو میں کہنی لگی میں نے سمجھا کہ دائیں طرف کا بچہ کچھ کہنا چاہتا ہے اور میں نے اس کی طرف اپنا منہ موڑا۔ اُس نے کہا کہ چچا ذرا جھک کر بات سنو میں آپ کے کان میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں تا کہ میرا ساتھی اس بات کو نہ سُن لے۔ وہ کہتے ہیں جب میں نے اپنا کان اُس کی طرف جھکایا تو اس نے کہا چچا وہ ابوجہل کون سا ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس قدر دکھ دیا کرتا تھا۔ چچا میرا دل چاہتا ہے کہ میں اُس کو ماروں۔ وہ کہتے ہیں ابھی اس کی یہ بات ختم نہ ہوئی تھی کہ میرے بائیں پہلو میں کہنی لگی اور میں اپنے بائیں طرف کے بچے کی طرف جھک گیا اور اس بائیں طرف والے بچے نے بھی یہی کہا کہ چچا وہ ابوجہل کون سا ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اتنا دکھ دیا کرتا تھا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں آج اس کو ماروں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں باوجود تجربہ کار سپاہی ہونے کے میرے دل میں یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ابوجہل جو فوج کا کمانڈر تھا جو تجربہ کار سپاہیوں کے حلقہ میں کھڑا تھا اس کو میں مار سکتا ہوں۔ میں نے انگلی اٹھائی اور ایک ہی وقت میں اُن دونوں لڑکوں کو بتایا کہ وہ سامنے جو شخص خَود پہنے زرہ میں چھپا ہوا کھڑا ہے جس کے سامنے مضبوط اور بہادر جرنیل ننگی تلواریں اپنے ہاتھوں میں لئے کھڑے ہیں وُہ ابوجہل ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ میں اُن کو بتاؤں کہ تمہارے جیسے نا تجربہ کار بچوں کے اختیار سے یہ بات باہر ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں میری وہ انگلی جو اشارہ کر رہی تھی ابھی نیچے نہیں جھکی تھی کہ جیسے باز چڑیا پر حملہ کرتا ہے اسی طرح وہ دونوں انصاری بچے کفار کی صفوں کو چیرتے ہوئے ابوجہل کی طرف دوڑنا شروع ہوئے۔ ابوجہل کے آگے عکرمہ اس کا بیٹا کھڑا تھا جو بڑا بہادر اور تجربہ کار جرنیل تھا مگر یہ انصاری بچے اس تیزی سے گئے کہ کسی کو وہم وگمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کس مقصد کے لئے یہ آگے بڑھے ہیں اور دیکھتے دیکھتے ابوجہل پر حملہ کرنے کے لئے کفار کی صفوں کو چیرتے ہوئے عین پہرہ داروں تک جا پہنچے۔ ننگی تلواریں اپنے ہاتھ میں لئے جو پہرے دار کھڑے تھے وہ وقت پر اپنی تلواریں بھی نیچے نہ لا سکے صرف ایک پہرے دار کی تلوار نیچے جھک سکی اور ایک انصاری لڑکے کا بازو کٹ گیا مگر جن کو جان دینا آسان معلوم ہوتا تھا ان کے لئے بازو کا کٹنا کیا روک بن سکتا تھا۔ جس طرح پہاڑ پر سے پتھر گرتا ہے اسی طرح وہ دونوں لڑکے پہرہ داروں پر دباؤ ڈالتے ہوئے ابوجہل پر جا گرے اور جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی کفار کے کمانڈر کو جا گرایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں جنگ کے آخری وقت میں وہاں پہنچا جہاں ابوجہل جان کندنی کی

حالت میں پڑا ہوا تھا میں نے کہا سناؤ کیا حال ہے اُس نے کہا مر رہا ہوں پر حسرت سے مر رہا ہوں کیونکہ مرنا تو کوئی بڑی بات نہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ دل کی حسرت نکالنے سے پہلے انصار کے دو چھوکروں نے مجھے مار گرایا۔ مکہ کے لوگ انصار کو بہت حقیر سمجھا کرتے تھے اسی لئے اُس نے افسوس کے ساتھ اس کا ذکر کیا اور کہا کہ یہی حسرت ہے جو اپنے دل میں لئے مر رہا ہوں کہ انصار کے دو چھوکروں نے مجھے مار ڈالا۔ پھر وہ ان سے کہنے لگا میں اس قدر شدید تکلیف میں ہوں کہ تم مجھ پر احسان کرو گے اگر تلوار کے ایک وار سے میرا خاتمہ کر دو مگر دیکھنا میری گردن ذرا لمبی کاٹنا کہ جرنیل کی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس کی گردن لمبی کاٹی جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کی یہ بات تو مان لی کہ مجھے قتل کر دو اور اس دکھ سے بچا لو مگر انہوں نے ٹھوڑی کے پاس سے اُس کی گردن کو کاٹا۔ گویا مرتے وقت اس کی یہ حسرت بھی پوری نہ ہوئی کہ اس کی گردن لمبی کاٹی جائے (سیرت النبویۃ لابن ھشام زیر عنوان ذکر رویا عاتکۃ بنت عبد المطلب عود الی مقتل ابی جھل) دیکھو کس واضح طور پر یہ پیشگوئی پوری ہوئی کہ وَ يَقُوۡلُ الۡكٰفِرُ يٰلَيۡتَنِىۡ كُنۡتُ تُرٰبًا۔ اَلۡ کو ہم معہود ذہنی کے طور پر بھی لے سکتے ہیں اور کمال کے معنوں میں بھی لے سکتے ہیں اس صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وَيَقُوۡلُ الۡكَافِرُ يَا لَيۡتَنِيۡ كُنۡتُ تُرَابًا۔ میں الۡكَافِرُ سے مراد کفر کا مجسمہ یا کافروں کا سردار ابو جہل تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ اُس دن یہ کافر کہے گا اے کاش میں اس سے پہلے مٹی ہو چکا ہوتا۔ چنانچہ واقعات پر غور کرو اور سوچو کیا ابو جہل نے اس دن نہیں کہا کہ اے کاش میں اس سے پہلے مٹی ہو چکا ہوتا۔ اُس نے اپنی ذلّت کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس طرح وہ پیشگوئی بڑی شان کے ساتھ پوری ہو گئی جو سورۂ نبأ میں بیان کی گئی تھی۔

النّٰشِطٰتِ نَشۡطًا میں مسلمانوں کے کفار پر غالب آنے کی پیشگوئی اس کے بعد کی آیت ہے وَالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس جنگ کا نتیجہ یہ نہ ہوگا کہ مسلمان مارے جائیں۔ پہلی آیت نے شکست کا سوال حل کر دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ اُن کے سامنے شکست و فتح کا کوئی سوال نہیں ہوگا اُن کے سامنے سوال صرف یہ ہوگا کہ اسلام پر پروانہ وار فدا ہو جائیں۔ اب اِس آیت میں دوسرے سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ کیا اسطرح اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کے نتیجہ میں وہ تباہ ہو جائیں گے فرماتا ہے نہیں ایسا نہ ہوگا اس جنگ کے نتیجہ میں مسلمان مارے نہیں جائیں گے بلکہ جیتیں گے اور رسیوں سے اپنے دشمنوں کو باندھیں گے اور قید کریں گے چنانچہ بدر کی جنگ میں بہت سے قیدی ہاتھ آئے اور رسیوں سے ہی باندھے گئے۔ (الزرقانی غزوۃ بدر)

السّٰبِحٰتِ سَبۡحًا میں مسلمانوں کے مدینہ سے دور جا کر جنگیں کرنے کی پیشگوئی وَالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ

اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ وہ فنونِ جنگ کے بڑے ماہر اور تیراک ہو جائیں گے۔ کیونکہ جو شخص کسی فن میں ماہر ہو جاتا ہے اُس کے متعلق یہی کہتے ہیں کہ وہ اس فن میں تیرتا ہے یعنی سہولت سے اپنے فرائض کو بجا لاتا ہے۔ یہ نظارہ بھی صحابہؓ نے دکھایا وہ فنون جنگ کے ایسے ماہر ہو گئے کہ بعد میں جب قیصر و کسریٰ کی تجربہ کار اور تنخواہ دار فوجوں سے اُن کا مقابلہ ہوا تب بھی یہ لوگ اُن پر غالب رہے۔ دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اُن کی جنگیں مدینہ سے دُور دُور چلی جائیں گی اور جس طرح تیرنے والا کنارہ سے دُور سے چلا جاتا ہے اسی طرح مدینہ سے شروع ہو کر دشمن کو دباتے ہوئے وہ دُور دُور تک نکل جائیں گے چنانچہ جنگ کے بعد جنگ ہوئی اور آخر اطرافِ عرب تک جنگیں جا پہنچیں۔

اَلسّٰبِقٰتِ سَبْقًا میں مسلمانوں کی پے در پے جنگیں کرنے کی پیشگوئی پھر فرمایا فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ہم اُن گروہ مسلمین کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔ جب جنگ دُور دُور تک پھیل جاتی ہے اور ایک کے بعد دُوسری اور دوسری کے بعد تیسری جنگ شروع ہو کر اُس کا سلسلہ لمبا ہوتا چلا جاتا ہے تو عام طور پر قومیں تھک جاتی ہیں مگر فرماتا ہے کہ مسلمانوں میں ایسے آدمی موجود ہوں گے جو اپنے اندر یہ روح رکھتے ہیں ہوں گے کہ جنگ کی لمبائی اور اس کی وسعت اُن کو تھکائے گی نہیں۔ اُن کے حوصلے بڑھتے جائیں گے اور ان کے ایمان زیادہ ہی ہوتے جائیں گے یہاں تک کہ وہ جان دینے کو ایک کھیل سمجھنے لگیں گے اور ایک دوسرے سے اس میدان میں بڑھنے کی کوشش کریں گے جس طرح فٹ بال اور کرکٹ کی ٹیموں میں کھلاڑی ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح وہ جان دینے میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کریں گے اور آخر فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کا زمانہ آجائے گا اور زمامِ حکومت اُن کے ہاتھ میں آجائے گی اور جن قوموں میں اُوپر والے اخلاق پیدا ہو جائیں حکومت اُن ہی کے ہاتھ میں آیا کرتی ہے۔ حکومت کو اُن کے ہاتھوں میں آنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ دُشمن کے مقابلہ میں اِغْرَاق کی کیفیت کا پیدا ہو جانا اور اس قدر اپنے اندر انہماک پیدا کر لینا کہ اُس فن میں ایک سہولت اور لذت محسوس ہونے لگے اور پھر قومی قربانی کے مقابلہ میں آپس میں مسابقت کی روح کا پیدا ہو جانا یہ قوم کو غالب بنا دیا کرتا ہے۔ اور یہی پیشگوئی مسلمانوں کے متعلق ان آیات میں کی گئی ہے چنانچہ ایسا ہی نظارہ صحابہؓ نے بعد میں دکھایا۔

سورۃ نازعات کی پہلی آیات کے تیسرے معنے تیسرا سلسلۂ مضامین ایک اور بھی اس سے نکلتا ہے اور وہ روحانی قابلیت کا ہے نَزَعَ یَنْزِعُ نُزُوْعًا عَنْ کَذَا کے معنے ہوتے ہیں کَفَّ عَنْہُ اس سے رُک گیا اور نَشَطَ

اَلدَّلْوَ مِنَ الْبِئْرِ کے معنے ہیں نَزَعَهَا وَ انْتَشَلَهَا بِلَا بَكْرَةٍ یعنی بغیر چرخی کے ہاتھ سے پانی نکالا جو مشقت کا کام ہوتا ہے۔

اس سوال کا جواب کہ کمزور مسلمان کیونکر دنیا پر غالب آئیں گے جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے قرآن کریم نے غلبۂ اسلام اور قیامت دونوں کو ملا کر بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ تم اسلام کے غلبہ اور قیامت دونوں کے منکر ہو مگر یہ دونوں باتیں ہو کر رہیں گی اور ان میں سے ایک چیز دوسری کا ثبوت ہوگی یہی مضمون سورۂ نبأ میں تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے کفار کے ایک اعتراض کے پہلو کو لیا ہے۔ انسانی فطرت میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ مان لیا خدا ایسا کر دے گا مگر دنیا میں خدا جو کچھ کرتا ہے اس کے کچھ آثار اور شواہد بھی پہلے سے ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں خدا تعالیٰ بچہ پیدا کرتا ہے اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا مگر اس کے لئے خدا تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں میں بچہ کی قابلیت رکھی ہے۔ جب ایک مرد اور عورت کا آپس میں نکاح ہو جاتا ہے تو ہمیں نظر آ جاتا ہے کہ اب دونوں میں ہیجان پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ پھر میاں بیوی اکٹھے رہتے ہیں تو ہمیں اور زیادہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اب بچہ پیدا ہونے کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ چند دنوں کے بعد اُن آثار کا ظاہر میں بھی علم ہو جاتا ہے اور ہر شخص کہنے لگ جاتا ہے کہ اب اُن کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے گا۔ گو بچہ پیدا ہونے میں ابھی دیر ہوتی ہے مگر بہر حال انسان سمجھ لیتا ہے کہ چند ماہ کے بعد بچہ ضرور پیدا ہو جائے گا کیونکہ آثار نظر آنے لگ گئے ہیں۔ یا ایک لڑکا علم حاصل کرنے کے لئے کالج میں جاتا ہے تو ہم جانتے ہیں یہ ایک دن پڑھ جائے گا یا اگر کوئی شخص کہے فلاں آدمی نے محل بنانا ہے اور ہمیں یہ بھی نظر آتا ہو کہ اس کے پاس مال ہے دولت ہے طاقت ہے تو گو ہمیں ظاہر میں محل کے آثار نظر نہ آتے ہوں مگر ہم سمجھ لیتے ہیں کہ چونکہ محل کے سامان موجود ہیں۔ ارادہ موجود ہے۔ بنانے والے موجود ہیں۔ اس لئے ایک دن محل بھی بن جائے گا۔ تو دنیا میں کسی چیز کے متعلق لوگوں کو اُس وقت تک یقین نہیں آتا جب تک اُس کے کچھ نہ کچھ آثار وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھنے لگ جائیں۔ اسی اصول کے مطابق کفار مسلمانوں پر اعتراض کرتے تھے کہ تم کہتے ہو قیامت آئے گی اور جب تم سے پوچھا جاتا ہے کہ قیامت کا ثبوت کیا ہے تو تم کہتے ہو اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسلام غالب آ جائے گا اور کفر مٹ جائے گا اور اسلام کا غلبہ اس بات کی دلیل ہوگا کہ جو دوسری بات بتائی گئی ہے وہ بھی ایک دن پوری ہو جائے گی مگر یہ غلبۂ اسلام جسے قیامت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے خود ابھی ثبوت کا محتاج ہے اور ہمیں اُس کے کوئی آثار ظاہر میں نظر نہیں آتے۔ آٹھ دس آدمی ہیں جو ابھی ایمان لائے ہیں مگر اُن میں دنیا پر غالب آنے کی کوئی روح نظر نہیں آتی۔ انسان دنیا پر غالب آتا ہے اپنے علم کے زور سے مگر ان میں کون سا عالم

ہے۔ اُن کی مراد عالمِ روحانی سے نہیں تھی بلکہ کہانت وغیرہ کی طرف ان کا اشارہ تھا کہ اس قسم کے علوم کا انہیں کچھ پتہ نہیں۔ اسی طرح دنیا پر صنعت کے ذریعہ سے غلبہ حاصل ہوتا ہے مگر ان میں کوئی ایسے صناع بھی نہیں ہیں جن کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ دنیا کو یہ لوگ مغلوب کرلیں گے۔ اتنے بڑے جرنیل بھی نہیں ہیں کہ ان کے متعلق خیال کیا جاسکے کہ یہ دنیا کو فتح کرلیں گے۔ اتنا بڑا رعب اور دبدبا رکھنے والے بھی یہ لوگ نہیں ہیں کہ دنیا مرعوب ہو کر ان کے پیچھے چل پڑے گی۔ چند غریب آدمی ہیں جو ایمان لائے ہیں اور اُن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ساری دُنیا پر غالب آجائیں گے حالانکہ نہ اُن میں کوئی قابلیت پائی جاتی ہے نہ اُن کے اندر ذاتی جوہر ایسے نظر آتے ہیں کہ گو آج یہ قابل نہیں ہیں مگر کچھ عرصہ کے بعد اپنی قابلیت کا سکّہ بٹھالیں گے۔ صرف نماز پڑھ لینا یا کلمہ پڑھ لینا اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ یہ دنیا کو بھی مغلوب کرلیں گے۔ دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے مخصوص قابلیتوں کا پایا جانا ضروری ہے اور وہ قابلیتیں ہمیں اُن میں دکھائی نہیں دیتیں بلکہ اُن قابلیتوں کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔ گویا نہ بالفعل انہیں یہ کمالات حاصل ہیں اور نہ بالقوۃ انہیں یہ کمالات حاصل ہیں۔ اگر ایک کارخانہ قائم ہورہا ہو تو اس کے متعلق امید کی جا سکتی ہے کہ اگر آج نہیں تو کل اس کارخانہ کے ذریعہ لاکھوں روپے آجائیں گے مگر یہ تو وہ لوگ ہیں کہ نہ بالفعل اُنہیں کوئی کمال حاصل ہے اور نہ بالقوّۃ انہیں کوئی کمال حاصل ہے اور جب حالت یہ ہے تو اس قسم کے لوگوں کے ذریعہ کسی آئندہ زمانہ میں ظاہر ہونے والے ایک موہوم غلبہ کو قیامت کے وجود کی دلیل کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے؟

یہ اعتراض ہے جو سورۂ نبأ کے مضامین پر پیدا ہوتا تھا اور سورۂ نازعات میں اسی کا جواب دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا آج مومن تم کو ذلیل نظر آتے ہیں اُن میں کوئی لیاقت نہیں۔ یہ اپنی قوم کے سب سے کم تعلیم یافتہ سب سے کم تجربہ کار۔ اور سب سے کم فنون کے جاننے والے ہیں ہر پیشہ اور علم میں پیچھے ہیں۔ تم ان کو ذلیل سمجھتے ہو۔ ناکارہ خیال کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ کہاں جہاں داری اور سیادت کے قابل ہوسکتے ہیں لیکن یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر وہ قابلیتیں پیدا کردی ہیں اور پیدا کردے گا جن سے انسانوں کو سیادت اور کامیابی حاصل ہوا کرتی ہے اور یہ اپنے عمل سے وہ سب باتیں دکھا دیں گے۔ چنانچہ فرماتا ہے یہ تم کو بے کار وجود نظر آتے ہیں لیکن، ہم شہادت کے طور پر پانچ صفات پیش کرتے ہیں جن کے متعلق تم دیکھو گے کہ وہ آہستہ آہستہ مسلمانوں میں پیدا ہوتی چلی جائیں گی اور جس قوم میں یہ پانچ صفات پیدا ہوجائیں وہ کبھی ہار نہیں سکتی۔ تمہارا بڑا اعتراض یہی ہے کہ یہ لوگ علم میں، دولت میں، قوت میں، لڑائی کے فنون اور تجربہ وغیرہ میں بہت پیچھے ہیں بلکہ یہ چیزیں ان کو حاصل ہی نہیں حالانکہ علم اور دولت اور قوت اور فنون وغیرہ آسمان سے گرا نہیں کرتے اور نہ یہ چیزیں ایسی ہیں جو دنیا پر یقینی

طور پر غلبہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ سب میں سے اعلیٰ اور فائق بننے کے لئے مندرجہ ذیل قابلیتوں کا ہونا ضروری ہے اور اگر تم غور کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ان کے مسلمان ہوتے ہی یہ قابلیتیں پیدا ہو چکی ہیں اور اب روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہیں اور اسی میں ان کی کامیابی کا راز ہے چنانچہ فرماتا ہے وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا۔ نَزَعَ کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ اوّل کَفَّ عَنْهُ اُس سے رُک گیا اور دوسرے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ وہ کسی چیز کا مشتاق ہوا۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے نَزَعَ نِزَاعًا اِلَی الشَّیْءِ ذَهَبَ اِلَیْهِ یعنی نَزَعَ اِلَی الشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں اُس چیز کی خواہش دل میں پیدا ہوئی اور جب نَزَعَ اِلٰی اَهْلِهٖ کہیں تو اس کے معنے ہوں گے اِشْتَاقَ اس کے دل میں اپنے اہل سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا یا اس کے دل میں اپنے اہل کی طرف رغبت پیدا ہوئی (اقرب) ان دو معنوں کو ملحوظ کرتے ہوئے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترقی کے لئے مندرجہ ذیل قابلیتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

اوّل ترقی کرنے والی قوم کے اندر مادہ صبر کا پایا جانا نہایت ضروری ہے یعنی اُس میں یہ قابلیت ہونی چاہیے کہ اُسے جس بات سے بھی روکا جائے رُک جائے تا کہ جب بھی بدیوں کے مواقع آئیں خرابیوں اور تباہیوں کے اوقات آئیں وہ اپنے نفس کو روک لے اور اُن بدیوں میں ملوّث ہونے سے اپنے آپ کو بچالے یہی وہ خوبی ہوتی ہے جس کو پیدا کرنے کی وجہ سے ایک قوم جیت جاتی ہے اور دوسری قوم اس سے محروم ہونے کی وجہ سے شکست کھا جاتی ہے۔ ورنہ جہاں تک آنکھ، کان، دل اور دماغ وغیرہ کا سوال ہے وہ سب میں یکساں ہوتے ہیں فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنے آپ کو موقعہ پڑنے پر بُری باتوں سے روک نہیں سکتے اور بعض روک لیتے ہیں۔ روکنے والے جیت جاتے ہیں اور دوسرے لوگ ہار جاتے ہیں۔

دوسری چیز جس کا ترقی کرنے والی قوم کے اندر پایا جانا نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی اچھی چیز اس کے سامنے آئے اُس کے دل میں یہ شدید شوق پیدا ہو جائے کہ کسی طرح میں اس چیز کو حاصل کرلوں گو یا صفتِ صبر اور صفتِ اشتیاقِ شدید یا رغبتِ شدید یہ دو خوبیاں جس قوم کے اندر پائی جائیں وہ یقیناً دنیا پر غالب آجاتی ہے۔ اور یہی دو چیزیں ہیں جن پر ترقیات کا مدار ہے۔ ایک بڑا ڈاکٹر، ایک بڑا انجینئر یا ایک بڑا سیاستدان کیوں مشہور ہوتا ہے؟ اِسی لئے کہ اس ڈاکٹر کو اپنے ڈاکٹری کے فن میں اشتیاق ہوتا ہے۔ اس انجینئر کو اپنے انجینئرنگ کے کام کی طرف رغبت ہوتی ہے اور وہ سیاستدان اپنے ملک کی سیاسی ترقی کی تدابیر میں منہمک رہتا ہے۔ گاندھی جی کو ہی دیکھ لو کس طرح دن رات ملکی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ اُن میں اور دوسرے لوگوں میں کیا فرق ہے یہی کہ گاندھی جی اس کام میں تن من سے لگ گئے اور دوسروں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ورنہ جہاں تک آنکھ،

کان، ناک، اور مُنہ وغیرہ کا سوال ہے جس طرح دوسروں کی آنکھیں ہیں اسی طرح گاندھی جی کی آنکھیں ہیں جس طرح دوسروں کے کان ناک اور مُنہ ہیں اِسی طرح اُن کے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ اور لوگ تو جوئے بازی کرتے رہے یا سینما اور میوزک وغیرہ میں مشغول رہے اور وہ اس کام میں لگے رہے اگر وہ بھی اسی کام میں لگ جاتے تو آج وہ بھی بڑے بڑے کام کرنے والے سمجھے جاتے۔ یا ایک ڈاکٹر سے مریض کیوں اچھے ہوتے ہیں اور دوسرے سے کیوں اچھے نہیں ہوتے؟ اسی لئے کہ ایک شخص نے ڈاکٹری کے مطالعہ میں اور معالجہ میں انہماک پیدا کر لیا اور اس فن کے متعلق اُس نے رغبت اور اشتیاق کا اظہار کیا اور دوسرے نے رغبت سے کام نہ لیا۔ تو ترقی کرنے کے لئے دو قابلیتوں کا پایا جانا نہایت ضروری ہوتا ہے اوّل یہ کہ جب کسی بُری بات سے اُسے روکا جائے تو وہ رُک جائے دوسرے یہ کہ جس قدر مفید اور کارآمد چیزیں ہوں اُن کے حصول کی اُس کے دل میں شدید رغبت پائی جاتی ہو۔ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کہہ کر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی انہی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جتنی چیزیں انسانی ترقی میں حائل ہو سکتی ہیں اُن سب سے یہ لوگ بچتے ہیں۔ تم میں اور ان میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ تم بعض چیزوں کے متعلق سمجھتے ہو کہ وہ بُری ہیں مگر پھر بھی اُن سے بچتے نہیں۔ لیکن مسلمانوں کو جس چیز کے متعلق یہ علم ہو جائے کہ وہ بُری ہے اُس کے قریب بھی وہ نہیں پھٹکتے۔ اس ایک بات سے ہی اندازہ لگا لو کہ ترقی کون کر سکتا ہے تم ترقی کر سکتے ہو یا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں۔ تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تم مانتے ہو شراب بُری چیز ہے۔ تم مانتے ہو جوا بُری چیز ہے مگر پھر نہ تم شراب سے بچتے ہو نہ جوئے سے رُکتے ہو مگر مسلمان چونکہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ بُری چیزیں ہیں اس لئے نہ وہ شراب کے قریب جاتے ہیں نہ وہ جوئے کے قریب جاتے ہیں۔ یہ علامت ہے اِس بات کی کہ مسلمانوں کے اندر بڑھنے اور ترقی کرنے کا مادہ پایا جاتا ہے۔ مگر تمہارے اندر وہ مادہ نہیں پایا جاتا۔ تم بھی کہتے ہو کہ سچ بڑی اچھی چیز ہے اور مسلمان بھی کہتے ہیں کہ سچ بڑی اچھی چیز ہے مگر تم سب جھوٹ بولتے ہو اور مسلمان سب سچ بولتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ انسان کو وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے مگر باوجود یہ تسلیم کرنے کے کہ وقت ضائع کرنا بُری بات ہے تم اپنے وقت کو ضائع کر دیتے ہو۔ تم مانتے ہو کہ دوسروں پر ظلم نہیں کرنا چاہیے مگر پھر تمہاری یہ حالت ہے کہ تم دن رات ظلم سے کام لیتے رہتے ہو۔ تم مانتے ہو کہ امانت بڑی اچھی چیز ہے مگر تمہاری عملی حالت یہ ہے کہ جب تمہارے پاس کوئی شخص امانتًا روپیہ رکھواتا ہے تو تم کھا جاتے ہو۔ اب بتاؤ جب تم اپنے نفوس کو بُری باتوں سے نہیں روک سکتے اور مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ ہر بُری بات سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں تو تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ مسلمانوں میں ترقی کرنے کی قابلیت نہیں ہے۔

نَزَعَ کے دوسرے معنے رغبت کے ہیں چنانچہ نَزَعَ اِلَی الشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں اِشْتَھَاہُ اس چیز کی خواہش کی اور نَزَعَ اِلٰی اَھْلِہٖ کے معنے ہوتے ہیں اِشْتَاقَ اُسے اپنے اہل سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ گویا اس میں صرف رغبت کے معنی ہی نہیں پائے جاتے بلکہ اس رغبت کے معنے پائے جاتے ہیں جو انسان کو اپنے اہل کے متعلق ہوتی ہے اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ اہل کی طرف رغبت عام رغبت سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایک واقف سے ملنے کی خواہش اور قسم کی ہوگی لیکن ایک بچہ جب اپنی ماں سے ملتا ہے یا ماں اپنے بچہ سے ملتی ہے تو وہ خواہش اور وہ رغبت بہت زیادہ ہوتی ہے تو وَالنّٰزِعَاتِ کہہ کر اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ گو تم میں سے بھی بعض کو نیکی کے حصول کا معمولی اشتیاق ہے لیکن مسلمان ایسے ہیں کہ جب انہیں نیک باتوں کا علم ہوتا ہے تو وہ ان کی طرف اس رغبت اور شوق سے دوڑتے ہیں جس رغبت اور شوق سے ایک بچہ اپنی ماں کی طرف جاتا ہے گویا دونوں قسم کے کمالات اُن میں نظر آتے ہیں۔ غرض پہلا قدم قومی ترقی کے لئے یہ ہوتا ہے کہ قوم اُن اعمال سے بچتی ہے جو ترقی میں روک ہوتے ہیں مثلاً سُستی ہے، جہالت ہے، غفلت ہے، ضد ہے، نافرمانی ہے، ظلم ہے، لڑائی جھگڑا ہے، بدسلوکی ہے، تلخی ہے، جھوٹ ہے، فریب ہے، خیانت ہے، فسق و فجور ہے یا اسی طرح کی اور خرابیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ لوگ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ہیں کہ اپنے نفوس کو ایسی تمام باتوں سے روکتے ہیں جن سے رُکنا چاہیے اور ان میں یہ مادہ پایا جاتا ہے کہ جب انہیں کہا جاتا ہے فلاں بات بُری ہے اس سے بچو تو یہ فوراً اس سے رُک جاتے ہیں اور اس حد تک اپنے نفوس کو روکتے ہیں کہ غَرْقًا ہو جاتے ہیں یعنی اپنے نفوس پر غالب آجاتے ہیں مگر تمہاری یہ حالت ہے کہ تم مانتے ہو کہ فلاں فلاں باتیں بُری ہیں مگر تم ان سے بچتے نہیں۔ پھر یہ صرف اپنے نفوس پر ہی غالب نہیں آتے بلکہ دوسروں کی بھی اصلاح کرتے ہیں گویا ان میں خالی اپنے نفس کو روکنے کا ہی مادہ نہیں بلکہ دوسروں کی اصلاح کا مادہ بھی اُن کے اندر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اِغْرَاق کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ لوگ ایک شخص پر حملہ آور ہوئے اور اُسے مغلوب کر لیا گویا جب وہ اپنے کسی ساتھی میں کوئی عیب دیکھتے ہیں تو وہ صرف اس بات پر راضی نہیں ہو جاتے کہ ہم نے اپنے آپ کو اس بدی سے روکا ہوا ہے بلکہ وہ سارے اکٹھے ہو کر اس پر حملہ آور ہو جاتے اور پھر اُسے مغلوب کر لیتے ہیں یعنی یا تو وہ اُس کا عیب دُور کر دیتے ہیں اور اُسے نیک بنا لیتے ہیں اور یا پھر وہ اُس کو اپنی قوم میں سے باہر نکال دیتے ہیں۔ بدی کا وجود وہ اپنے اندر برداشت نہیں کر سکتے مگر یہ اوپر کا درجہ ہے پہلا درجہ یہی ہے کہ جتنی چیزیں انسان کی ترقی میں روک بننے والی ہیں وہ اُن سب سے بچتے ہیں اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ بدی کو اپنی قوم میں دیکھ ہی نہیں سکتے۔ جہاں بدی اُن کو نظر آتی ہے فوراً اس پر حملہ کر دیتے ہیں اور بدی کرنے والے کو مغلوب کر لیتے ہیں یعنی یا تو

اُسے باہر نکال دیں گے یا اسے جیت لیں گے اور اس کی اصلاح کر لیں گے۔ بہر حال وہ اُس شکل میں اس کو نہیں رہنے دیں گے جس شکل میں وہ پہلے دکھائی دیتا تھا۔ یہ دو قابلیتیں ہیں جو قوم کو ترقی کی طرف لے جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ دونوں قابلیتیں مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ پس وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے یہ معنے ہوئے کہ وہ رُوحیں جو رکنے والی ہیں بُری باتوں سے اور بد رُوحیں جو اُن میں آ جائیں اُن کو دبا لینے والی ہیں۔

وَ النّٰزِعٰتِ کے دوسرے معنے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اشتیاق کے ہوتے ہیں اس لحاظ سے وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ نیکیوں کی طرف اس طرح رغبت کرتے ہیں جیسے انسان اپنے اہل وعیال کی طرف رغبت کرتا ہے گویا وہ صرف بدیوں سے ہی نہیں رُکتے بلکہ اُن کے اندر امانت اور انصاف اور رحم اور خوش خلقی اور محنت اور علم اور غرباء پروری اور اقرار احسان اور جرأت اور سخاوت اور ہمسایہ کی خبر گیری۔ مسافروں کا خیال۔ یتیموں کا خیال اور بیواؤں کا خیال۔ صفائی کا خیال۔ عفّت اور ایسی ہی سب نیکیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ نہ صرف ان کے حصول کی کوشش کرتے ہیں بلکہ بعض کو یہ نیکیاں ایسی پیاری لگتی ہیں جیسے بچہ کو اپنی ماں سے یا ماں کو اپنے بچہ سے پیار ہوتا ہے۔

وَ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا پھر فرماتا ہے ان نیکیوں کے حصول میں عاداتِ قومی کی وجہ سے انہیں محنت تو کرنی پڑتی ہے مگر وہ محنت کر کے یہ کام کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کام میں جو صعوبتیں آئیں اُن سب کو برداشت کرتے ہیں۔ نَشَطَ کے ایک معنے ڈول کو بغیر چرخی کے نکالنے کے ہوتے ہیں گویا محنت اور مشقت کرنا اس کے مفہوم میں شامل ہے کیونکہ چرخی ہو تو پانی آسانی سے نکل آتا ہے اور اگر چرخی نہ ہو تو بہت زور لگانا پڑتا ہے پس عربی میں یہ محاورہ ہے کہ جب کسی کے متعلق اس امر کا اظہار کرنا ہو کہ اس نے بڑی محنت اور مشقت سے کام لیا تو کہتے ہیں اِنْتَشَلَهَا بِلَا بَكَرَةٍ اس نے پانی بغیر چرخی کے نکالا پس وَ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا میں صحابہؓ کی یہ خوبی بیان فرمائی کہ اُن کو نیکیوں میں ترقی کرنے کا اس قدر خیال ہے کہ اس راستہ میں انہیں کوئی بھی قربانی کرنی پڑے وہ اس سے دریغ نہیں کرتے بعض لوگوں کو نیکیوں سے رغبت بھی ہوتی ہے مگر جب کام کا وقت آئے تو اُن کا دل ڈر جاتا ہے اور وہ نیکی میں حصہ نہیں لے سکتے کیونکہ انہیں قربانی سے کام لینا پڑتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر نہ صرف یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ انہیں نیکیوں کے حصول کا شوق ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ دوسری خوبی بھی اُن کے اندر پائی جاتی ہے کہ وہ نَاشِطَات ہیں یعنی ہر قسم کی محنت برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اُن کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ کوئی نیکیوں پر اکسانے والا نہیں ہوتا۔ کوئی پیٹھ ٹھونکنے والا اور قومی خدمات پر شاباش کہنے والا نہیں ہوتا۔ مگر پھر

بھی وہ قومی خدمت کرتے چلے جاتے ہیں اور اس سے رکتے نہیں ہیں۔

وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا یہ لازمی بات ہے کہ جو شخص محنت سے کام لیتا ہے وہ آخر فن کا ماہر ہو جاتا ہے اور جب کوئی شخص فن کا ماہر ہو جائے تو اس کے لئے کام میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہی کام جو ایک پیشہ ور لوہار کرتا ہے اگر ہمیں اس کی جگہ کرنا پڑے تو ہم بڑی محنت سے آہستہ آہستہ اس کام کو کرسکیں گے اور پھر بھی وہ کام خراب ہو جائے گا۔ مجھے یاد ہے بچپن میں ایک دفعہ بڑھئی ہمارے گھر میں کام کر رہے تھے مجھے ان کا کام بڑا پسند آیا اور میں نے سمجھا کہ یہ معمولی بات ہے اس کام کو تو میں بھی کرلوں گا۔ میری عُمر اس وقت نو دس سال کی تھی جب وہ کھانا کھانے چلے گئے تو میں نے تیشہ اٹھایا اور ایک لکڑی کو چھیلنے کے لئے اُس پر مارا مگر وہ بجائے لکڑی پر پڑنے کے سیدھا میرے ہاتھ کے انگوٹھے پر لگا جس سے گہرا زخم ہو گیا اور اس کا نشان آج تک موجود ہے دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ بڑھئی جو کچھ کر رہا ہے معمولی بات ہے اور اس طرح میں بھی کرسکتا ہوں مگر جب کام کا وقت آتا ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ مگر بڑھیوں کو اس کام کے کرتے وقت کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ایک لمبے عرصہ کی مشق کی وجہ سے وہ اس کام میں تیراکوں کی طرح ہو جاتے ہیں یہی خوبی اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کی اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ اب تو انہیں نیکیوں کے حصول میں بڑی محنت اور مشقت سے کام لینا پڑتا ہے لیکن ایک زمانہ آئے گا جب یہ ان کاموں میں تیراکوں کی طرح ہو جائیں گے اور ایک طبعی رغبت اور نشاط ان میں پیدا ہو جائے گا اور ایک دن یہ روحانی سمندر کے تیراک ہو جائیں گے جس طرح ایک ماہر تیراک دُور دُور تک تیرتا چلا جاتا ہے اور اُسے کوئی مشکل محسوس نہیں ہوتی اسی طرح وہ نیکیوں پر ایسا غلبہ حاصل کرلیں گے کہ ایک طبعی رغبت اور نشاط ان میں پیدا ہو جائے گا اور نیکیوں کے بجا لانے میں انہیں سرور محسوس ہوگا۔ لوگوں کو جھوٹ سے بچنے کیلئے بڑی بڑی کوششیں کرنی پڑتی ہیں مگر اُن کے لئے جھوٹ چھوڑ دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ لوگوں کو صداقت پر قائم رہنا بڑا مشکل ہوتا ہے مگر اُن کے لئے صداقت سے کام لینا ایسا ہی ہے جیسے صداقت کی طرف ایک طبعی میلان اُن کے اندر پایا جاتا ہے۔ یہی حال دوسری نیکیوں کا ہے کہ اُن کے کرتے وقت انہیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے نیکیوں سے ان کی فطرت کو طبعی مناسبت پیدا ہو چکی ہے اور اب وہ کسی اور طرف جا ہی نہیں سکتے۔ گویا ہر نیکی انہیں یوں معلوم ہوتی ہے جیسے ماں کا دودھ ہے جس طرح بچہ اُس دودھ کو آسانی سے پی لیتا ہے اور اُسے کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوتا اسی طرح کسی نیک بات پر بھی عمل کرنا اُن کے لئے بوجھ نہیں رہے گا۔ بلکہ وہ دلی شوق اور نشاطِ خاطر سے اس میں حصہ لیں گے۔

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا جب اُن میں نشاط پیدا ہو جائے گا تو اس کے بعد نیکی کی طرف ان کا ایک اور قدم اٹھے گا اور

اُن میں یہ شوق پیدا ہو جائے گا کہ ہم اس میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ گویا وہ صرف یہ نہیں دیکھیں گے کہ وہ اچھی طرح اور نشاطِ خاطر سے کام کر رہے ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی بھی کوشش کریں گے اور قوتِ مسابقت کو حرکت میں لائیں گے۔ سخاوت ہر ایک کو آسان معلوم ہوگی مگر اس کے بعد وہ یہ کوشش کریں گے کہ ہم دوسروں سے زیادہ سخاوت کریں۔ عفّت ہر ایک کو آسان معلوم ہوگی مگر اس کے بعد ہر شخص کے اندر یہ جوش پیدا ہوگا کہ میں دوسروں سے زیادہ عفیف بنوں۔ خوش خلقی ہر ایک کو آسان معلوم ہوگی مگر اس کے بعد ہر شخص کے اندر یہ جذبہ موجزن ہوگا کہ میں دوسروں سے زیادہ خوش خلق بنوں۔ رحم کرنا ہر ایک کو آسان معلوم ہوگا مگر اس کے بعد ہر شخص کے دل میں یہ جوش پیدا ہوگا کہ میں دوسروں سے زیادہ رحم کا نمونہ دکھاؤں۔ گویا نیکیوں کے میدان میں اُن کا مقابلہ شروع ہو جائے گا اور ہر شخص کوشش کرے گا کہ میں دوسروں سے بڑھ جاؤں۔ جب وہ اس مقام پر پہنچیں گے تو فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا یہ زائد بات بھی اُن میں پیدا ہو جائے گی کہ اُن میں سے ہر شخص اپنے آپ کو قوم کا ذمہ وار سمجھے گا۔ یہ نہیں دیکھے گا کہ یہ کام فلاں کا ہے اور یہ کام فلاں کا۔ بلکہ ہر شخص سمجھے گا کہ میں ہی ساری جماعت کا ذمہ وار ہوں۔ ہندوستان میں بیئے کی مثال مشہور ہے جو ایک چھوٹا سا جانور ہوتا ہے بعض یہی بات پدّے کے متعلق کہتے ہیں کہ رات کو وہ اُلٹا سوتا ہے ایک دفعہ اس سے کسی نے پوچھا کہ تُو الٹا کیوں سوتا ہے تو اُس نے جواب دیا کہ رات کو ساری دنیا سو رہی ہوتی ہے اگر آسمان گر پڑے تو اُسے کون سنبھالے گا میں اس لئے اُلٹا سوتا ہوں کہ اگر آسمان گرا تو دنیا کو بچا لوں گا۔ یہ بظاہر ایک مضحکہ خیز مثال ہے لیکن انسانوں کے متعلق واقعہ یہی ہے کہ جو شخص کمال نیکی کو پہنچ جاتا ہے وہ ساری دنیا کی ذمہ واری اپنے اوپر لے لیتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ اس کی ذمہ واری فلاں پر ہے اور اس کی ذمہ واری فلاں پر۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو ہی واحد ذمہ وار سمجھتا ہے جب یہ خوبی کسی قوم کے افراد میں پیدا ہو جائے تو وہ قوم کبھی تباہ نہیں ہو سکتی۔ ایک سو جائے گا تو دوسرا اُس کو جگانے کے لئے موجود رہے گا۔ آخر تمام لوگ ایک وقت میں تو سو نہیں سکتے لازمًا کچھ حصہ سوئے گا اور کچھ حصہ بیدار رہے گا اور جب کچھ حصہ بیدار رہے گا تو اس کے یہ معنے ہیں کہ قوم کو بچانے والے افراد موجود رہیں گے اور وہ تباہی سے اُسے محفوظ رکھیں گے۔ غرض جس قوم میں بھی یہ نیکیاں پیدا ہو جائیں اس قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا وہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور ساری دنیا پر غالب آ جاتی ہے۔

سورۃ نازعات کی پہلی آیات کے چوتھے معنی ان آیات کے ایک چوتھے معنے بھی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ نَزَعَ کے معنے مشابہ ہو جانے کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ نَزَعَ الْوَلَدُ اَبَاہُ اَوْ اِلٰی اُمِّہٖ کے معنے ہوتے ہیں اَشْبَہَ وہ اپنی ماں یا اپنے باپ کے مشابہ ہو گیا۔ اس لحاظ سے وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے یہ معنے ہوں گے کہ مسلمان محمد رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کا سوال ہے مکّہ والے اُن کو ذلیل سمجھا کرتے تھے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق وہ یہ کبھی نہیں کہتے تھے کہ آپ نعوذ باللہ ذلیل ہیں۔ بے شک ایک منافق نے ایک دفعہ آپ کو ذلیل کہہ دیا تھا مگر مکّہ والے تسلیم کرتے تھے کہ آپ کے اندر وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جو ایک کامیاب لیڈر کے اندر پائے جانے چاہئیں۔ اور وہ آپ کی قابلیت کے منکر نہیں تھے۔ بے شک وہ سمجھتے تھے کہ آپ غریب ہیں۔ آپ کے پاس مال و دولت نہیں ہے مگر جہاں تک ذاتی قابلیت کا سوال ہے وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قائل تھے آپ کو امین اور صدوق سمجھتے تھے اور اپنی قوم کے جھگڑوں میں آپ سے فیصلہ کرانے پر تیار ہو جایا کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم آج مسلمانوں کو ذلیل سمجھتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ اُن میں کوئی قابلیت نہیں مگر تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ قابلیتیں کس طرح پیدا ہوا کرتی ہیں۔ قابلیت حاصل ہونے کا صرف ایک ہی طریق ہے کہ اچھا اُستاد مل جائے اور شاگرد اس کا کامل طور پر تتبع کرے۔ یہ واحد ذریعہ ہے اعلیٰ درجہ کی قابلیتیں اپنے اندر پیدا کرنے کا کہ کسی کو اچھا استاد مل جائے اور وہ اس استاد کی پوری پوری نقل کرے۔

مسلمانوں کا آنحضرت صلعم کے مشابہ ہو جانا پس فرماتا ہے وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا یہ مسلمان تو وہ ہیں جو اپنے باپ کے مشابہ ہیں کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم وہ ہیں جن کی قابلیت کا تم میں سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ تم اُسے دعویٰ سے پہلے ہی صدوق اور امین تسلیم کرتے تھے جیسا کہ نبیوں کے متعلق یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ انہیں بعثت سے قبل قوم میں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور ان کی قابلیتوں کا اعتراف کیا جاتا ہے چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن کریم میں آتا ہے کہ لوگوں نے اُن سے کہا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ (ھود: ۶۳) کہ اے صالح! ہم تو تجھ پر امید لگائے بیٹھے تھے کہ تو ایک دن ہماری قوم کا لیڈر بنے گا مگر تُو نے ہماری امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ تو جہاں تک انبیاء کا تعلق ہے بعثت سے قبل ہی لوگ ان کی قابلیتوں کو تسلیم کرنا شروع کر دیتے ہیں مگر یہ کہیں قانون نظر نہیں آتا کہ انبیاء پر ایمان لانے والوں کو دشمن ذلیل قرار نہ دیتے ہوں۔ ابتداء میں انبیاء پر ایمان لانے والے چونکہ زیادہ تر غرباء اور ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے لوگ انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر بھی ایمان لانے والے چونکہ زیادہ تر غرباء تھے (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ) اس لئے مکّہ والے انہیں سخت حقارت سے دیکھتے تھے۔ اسی طرح ظاہری علوم کے لحاظ سے مسلمان بہت پیچھے تھے چنانچہ

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لانے والے نوجوانوں میں سے صرف حضرت زبیرؓ ہی لکھ سکتے تھے باقی صحابہؓ لکھنا بھی نہ جانتے تھے۔لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ مسلمان اپنے باپ کی مشابہت اختیار کر رہے ہیں۔اور جب یہ اپنے باپ کے مشابہ ہو جائیں گے تو جو قابلیتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی ہیں وہی ان میں پیدا ہو جائیں گی۔تم تسلیم کرتے ہو کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم امین ہیں۔ جب تم اس خوبی کو تسلیم کرتے ہو اور دوسری طرف مسلمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ لازمی بات ہے کہ وہ بھی امین بن جائیں گے تم تسلیم کرتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صدوق ہیں اور تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ مسلمان آپ کی اقتداء کی کامل کوشش کر رہے ہیں تو اس کا یہ ایک لازمی نتیجہ نکلنے والا ہے کہ جس طرح آپ صدوق ہیں اسی طرح مسلمان بھی راستبازی اور صداقت شعاری کا ایک نمونہ بن جائیں گے پس گو تمہیں آج مسلمانوں میں کوئی قابلیت نظر نہیں آ رہی لیکن حصول علم کی خواہش اور اچھے نمونہ کی موجودگی کی وجہ سے ایک دن خود بخود ان میں بھی قابلیت پیدا ہو جائے گی۔

غَرْقًا کے معنے یہ ہیں کہ انہوں نے اتباع رسول کو حد تک پہنچا دیا ہے چنانچہ دیکھ لو مشابہتِ رسول کو مسلمانوں نے کس حد تک پہنچا دیا کہ سوائے اسلام کے اور کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں سُنت کا لفظ پایا جاتا ہو باقی مذاہب میں یا حدیث کا ذکر آتا ہے یا الہام کا۔ یا تو وہ کہیں گے قَالَ مُوْسٰی یعنی موسیٰ نے یوں کہا۔ قَالَ عِیْسٰی یعنی عیسیٰ نے یوں کہا۔اور یا کہیں گے اُوْحِیَ اِلٰی مُوْسٰی موسیٰ کی طرف یہ وحی کی گئی یا اُوْحِیَ اِلٰی عِیْسٰی عیسیٰ کی طرف یہ وحی کی گئی۔ یہ کبھی نہیں کہیں گے کہ یہ موسیٰؑ کی سنت ہے یا عیسیٰؑ کی سنّت ہے یا کرشنؑ کی سنّت ہے یا رامچندرؑ کی سنّت ہے۔ سنّت کی اصطلاح سوائے اسلام کے اور کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ یہ اصطلاح اسلام سے مخصوص ہے اور ہر مسلمان یہ معلوم کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اعمال کو کس طرح بجا لاتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا یہ مسلمان محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی نقل کو انتہاء تک پہنچا دیں گے۔اور جب آپ کی کامل طور پر نقل کر لیں گے تو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی قابلیتوں کے بھی وہ حامل ہو جائیں گے۔ پھر ان کی خوبیوں اور کمالات میں کیا شبہ ہو سکے گا جب کہ ہر شخص ان میں سے اپنے اپنے دائرہ میں ایک چھوٹا محمد بن جائے گا۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی متابعت صحابہؓ جس طرح کیا کرتے تھے اس کا ثبوت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ سے مل سکتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب بعض قبائلِ عرب نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے خلاف جنگ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اُس وقت حالت ایسی

نازک تھی کہ حضرت عمرؓ جیسے انسان نے مشورہ دیا کہ ان لوگوں سے نرمی کرنی چاہیے مگر حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا ابوقحافہ کے بیٹے کی کیا طاقت ہے کہ وہ اس حکم کو منسوخ کر دے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے خدا کی قسم اگر یہ لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اُونٹ کا گھٹنا باندھنے کی ایک رسّی بھی زکوٰۃ میں دیا کرتے تھے تو میں وہ رسّی بھی اُن سے لے کر رہوں گا اور اس وقت تک دم نہیں لوں گا جب تک وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب وجوب الزکاۃ) اگر تم اس معاملہ میں میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو بے شک نہ دو میں اکیلا ہی اُن سے مقابلہ کروں گا۔ کس قدر اتباعِ رسول ہے کہ نہایت خطرناک حالات میں باوجود اس کے کہ اکابر صحابہ لڑائی کے خلاف مشورہ دیتے ہیں پھر بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کو پورا کرنے کے لئے وہ ہر قسم کا خطرہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

صحابہ کے آنحضرت صلعم کی کامل اقتداء کرنے کے بعض واقعات اسی طرح لشکرِ اسامہ کو روک لینے کے متعلق صحابہؓ نے بہت زور لگایا مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر دشمن اتنا طاقتور ہو جائے کہ وہ مدینہ پر فتح پائے اور مسلمان عورتوں کی لاشیں کُتے گھسیٹتے پھریں تب بھی میں اس لشکر کو جسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھجوانے کے لئے تیار کیا تھا روک نہیں سکتا (تاریخ الخلفاء للسیوطی فصل فی ما وقع فی خلافۃ ابی بکر، البدایۃ والنہایۃ فصل فی تنقید جیش اسامۃ بن زید) اسی طرح کی ایک نقل کا واقعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بھی ہے اُن کے متعلق لکھا ہے کہ وہ جب حج کے لئے جاتے تو ایک جگہ پیشاب کرنے کی طرز پر بیٹھ جاتے چونکہ ہر بار حج کو جاتے ہوئے اس طرح کیا کرتے تھے اس لئے ایک دفعہ اُن کے کسی دوست نے اُن سے کہا کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں کہ ہر دفعہ اس مقام پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ بعض دفعہ پیشاب نہیں کرتے یونہی بیٹھ کر آ جاتے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے اور آپ کیوں ایسا کرتے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جواب دیا کہ میں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک دفعہ یہاں پیشاب کرتے دیکھا تھا اس لئے میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی آپ کے فعل کی نقل کروں چنانچہ میں اس جگہ پیشاب کرنے کی طرز پر بیٹھ جایا کرتا ہوں۔

جس قوم نے اس حد تک نقل کو پہنچا دیا ہو اس کے متعلق ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ اخلاقی اور روحانی امور میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نقل کرنے کی کس حد تک کوشش کرتی ہوگی۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا بے شک مسلمان تمہاری نگاہ میں ذلیل ہیں لیکن ایک شخص جس کی قابلیت کے تم بھی معترف ہو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور تم دیکھ رہے ہو کہ مسلمان اُن کی کامل اقتداء کر رہے ہیں پس بے شک آج اُن میں قابلیت نہ ہو لیکن

اس نقل کے نتیجہ میں ایک دن آئے گا جب یہ سارے اپنے اپنے درجہ کے مطابق محمد صلے اللہ علیہ وسلم بنے ہوئے ہوں گے اور وہی کمالات جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم میں پائے جاتے ہیں ان میں بھی پیدا ہو جائیں گے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق تم بھی مانتے ہو کہ اُن جیسا سردار اور لیڈر سارے عرب میں اور کوئی نہیں۔ جب یہ لوگ ایسے شخص کی مشابہت اختیار کر رہے ہیں تو یہ ایک لازمی امر ہے کہ اس کے نتیجہ میں وہ خود بھی تمام خوبیوں کے حامل ہو جائیں گے۔

النّٰشِطٰتِ نَشْطًا میں مسلمانوں کے دور دور پھیل جانے کی پیشگوئی وَ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا پھر دوسری خوبی ان میں یہ ہے کہ یہ دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ نَشَط کے ایک معنے پھیل جانے کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں نَشَطَ مِنَ الْمَكَانِ: خَرَجَ۔ وَمِنْ بَلَدٍ اِلٰى بَلَدٍ: قَطَعَ یعنی نَشْطٌ کے معنے سفر کرنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا بھی ہوتا ہے پس وَ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا کے یہ معنے ہوئے کہ یہ لوگ دنیا میں پھیل جانے والے ہیں۔ ان کے دلوں میں اپنے وطن کی جھوٹی محبت نہیں بلکہ تم دیکھو گے کہ یہ اپنے وطن چھوڑنے کے لئے بھی تیار ہو جائیں گے مگر تمہارے ظلموں کو برداشت نہیں کریں گے۔ درحقیقت اسلام نے ہی سب سے پہلے اس مسئلہ کو پیش کیا ہے کہ وطن بے شک اچھی چیز ہے لیکن وطن سے زیادہ قیمتی چیز صداقت ہے۔ اگر وطن میں رہنے سے صداقت کو چھوڑنا پڑتا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ وطن کو چھوڑ دو اور صداقت کو قائم رکھو۔ اسی کی طرف اللہ ایک دوسری جگہ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے وَ مَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (النساء:۱۰۱) گویا بتایا کہ وطن بے شک اچھی چیز ہے جیسا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِيْمَانِ(تشیید المبانی فی تخریج احادیث مکتوبات الامام ربانی صفحہ ۲۵) مگر جب اس محبت کے مقابلہ میں صداقت اور ایمان کی محبت آ جائے اور تمہیں مظالم کا تختۂ مشق بنایا جائے تو وطن بے شک چھوڑ دو اور صداقت کی حفاظت کو مقدم رکھو۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے دلوں پر وطن کی محبت اس قدر غالب ہوتی ہے کہ خواہ انہیں کس قدر دکھ دئے جائیں وہ وطن کو چھوڑنے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتے۔ مگر فرمایا یہ مسلمان وہ ہیں جنہیں ہم نے نَاشِطَاتِ بنایا ہے جو خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں اپنے وطن کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے اور وقت آنے پر اس کو قربان کر دیں گے چنانچہ اس پیشگوئی کے بعد مسلمانوں نے دو دفعہ ہجرت کی۔ ایک دفعہ حبشہ کی طرف اور دوسری دفعہ مدینہ کی طرف پس مسلمانوں کو نَاشِطَاتِ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وطن کی جھوٹی محبت جو ایک جگہ سے باندھ دیتی ہے اُن کے دلوں میں نہیں ہے

اگر انہیں اپنا وطن قربان کرنا پڑا تو یہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کو قربان کر دیں گے۔

نَازِعَاتِ غَرْقًا میں مسلمانوں کی جسمانی قربانی کی طرف اشارہ نَازِعَات میں مسلمانوں کی جسمانی قربانی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا کیونکہ جسمانی قربانی اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک محنت ومشقت برداشت کرنے کی عادت انسان میں پیدا نہ ہو۔ اور بتایا گیا تھا کہ مسلمان اس بارہ میں اعلیٰ درجہ کی صفات اپنے اندر رکھتے ہیں وہ بدیوں سے رُک بھی سکتے ہیں اور نیکیوں کے حصول کی تڑپ بھی رکھتے ہیں۔ بے شک قومی عادات کی وجہ سے بدیوں کے ترک کرنے میں انہیں محنت کرنی پڑتی ہے مگر وہ اس محنت کو برداشت کرتے چلے جاتے ہیں اور پھر صرف اسی حد تک نہیں بلکہ نیکیوں کے میدان میں بھی ترقی کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اب نَاشِطَاتِ میں یہ بتایا کہ وہ نہ صرف جسمانی قربانی کرنے کا مادہ اپنے اندر رکھتے ہیں بلکہ وطن کو قربان کرنے کا مادہ بھی اُن کے اندر پایا جاتا ہے تم یہ نہ سمجھو کہ خواہ تمہاری طرف سے کس قدر مظالم ہوتے گئے وہ اُن کو برداشت کرتے چلے جائیں گے ہم تمہاری توجہ مسلمانوں کے اُن گروہوں کی طرف مبذول کراتے ہیں جو اپنے وطنوں کو چھوڑ کر باہر نکل جائیں گے۔ درحقیقت وطن کو چھوڑنا بھی قومی ترقی کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔

السّٰبِحٰتِ سَبْحًا میں مسلمانوں کے مفت طور پر قومی کام کرنے کی طرف اشارہ۔ پھر فرماتا ہے وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا۔ سَبَحَ الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں تَصَرَّفَ فِيْ مَعَاشِهٖ یعنی آدمی اپنی روزی کمانے میں لگا ہوا ہے۔ پس اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی تنخواہ کا قوم پر کوئی بار نہیں۔ اپنے دنیوی کام کر کے اپنا گزارہ کرتے ہیں اور اس وجہ سے قوم کو اَن گنت کارکن مل رہے ہیں۔ درحقیقت قومی ترقی کے راستہ میں ایک بڑی روک یہ ہوتی ہے کہ مفت کام کرنے والے نہیں ملتے۔ اسی وجہ سے حکومتیں تنخواہ دار فوجیں رکھتی ہیں۔ تنخواہ دار مدرس رکھتی ہیں۔ تنخواہ دار کام کرنے والے رکھتی ہیں۔ اگر اسلام کی بھی یہی حالت ہوتی تو مسلمان کس طرح ترقی کر سکتے۔ مسلمانوں کے پاس نہ مال تھا کہ وہ تنخواہیں دے سکتے۔ نہ اتنی وسعت تھی کہ اس بار کو برداشت کر سکتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں یہ جذبہ ودیعت کر دیا کہ وہ قومی کاموں کے لئے مفت خدمات پیش کرتے تھے۔ وہ گھر سے کھانا کھاتے اور ملک اور قوم کے لئے اپنے اوقات کو صرف کرتے گویا وہ ایسے وجود تھے جن کا جماعت پر کوئی بار نہیں تھا۔ بلکہ وہ مفت کے کارکن تھے۔ پس اللہ تعالیٰ ان آیات میں صحابہؓ کا نقشہ کھینچتا ہے کہ ایک طرف وہ تمام بدیوں سے بچتے ہیں۔ دوسری طرف تمام نیکیوں کے میدان میں بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تیسری طرف وطن کی قربانی اُن کی نگاہوں میں بالکل ہیچ ہے اور چوتھی طرف ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کوئی پیسہ نہیں

مانگتے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ جب ہم اس قدر کام کرتے ہیں تو ہمیں کچھ معاوضہ بھی ملنا چاہیے بلکہ وہ جس طرح ہو سکے اپنے گھر سے گزارہ کرتے اور قوم کا کام کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کو اَن گنت کام کرنے والے مل رہے ہیں اور پھر یہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر کامل طور پر چلنے والے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم انہیں لڑنے کے لئے کہتے ہیں تو یہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں صلح کے لئے کہتے ہیں تو صلح کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ صدقہ و خیرات کا حکم دیتے ہیں تو وہ اپنا سارا مال صدقہ وخیرات میں لٹانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے وہی کچھ کرنا ہے جس کا محمد صلے اللہ علیہ وسلم انہیں حکم دیں اور پھر انہوں نے معاوضہ کے طور پر کوئی پیسہ نہیں مانگنا اس کا ذکر کے اللہ تعالیٰ کفار مکّہ کو بتاتا ہے تم غور کرو اور سوچو کہ تم ان مسلمانوں کا کہاں مقابلہ کر سکتے ہو۔ ہر مسلمان قومی خادم ہے۔ ہر مسلمان قومی سپاہی ہے۔ ہر مسلمان اپنا مال ٹیکس میں دینے کے لئے تیار ہے اور جب حالت یہ ہے تو تم ان کا مقابلہ کہاں کر سکتے ہو۔ فرض کرو مکّہ والوں میں سے پچاس فیصدی لوگ کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تب بھی وہ مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ مسلمان سو فیصدی کام کرنے والے تھے اور سَو کا پچاس مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پھر صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ وہ مفت کام کرتے تھے مگر مکّہ والوں میں یہ روح نہیں تھی۔ اسی طرح صحابہؓ جس شوق سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکام کی تعمیل کرتے تھے اس شوق سے مکہ والے اپنے سرداروں کے احکام کی کہاں اطاعت کر سکتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بیشک مسلمانوں کی تعداد تمہارے مقابلہ میں تھوڑی ہے مگر دُنیا میں تعداد سے فتح نہیں ہوتی بلکہ کام کرنے والوں سے فتح حاصل ہوتی ہے اور کام کرنے والے مسلمانوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ تم میں نہیں پائے جاتے۔

السّٰبِقٰتِ سَبْقًا میں مسلمانوں کے سب قوموں سے بڑھ جانے کی وجہ کا ذکر

اس کے بعد فرماتا ہے فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا یہاں فاء کا استعمال لازمی نتیجہ کے معنوں میں ہوا ہے یعنی جب مسلمانوں کی حالت یہ ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس مفت خدمت کی وجہ سے اسلام کو اَن گنت کام کرنے والے مل جائیں گے اور لازمًا یہ ان لوگوں اور قوموں پر فتح پا جائیں گے جن میں مفت خدمت نہیں ہے۔ فرماتا ہے جب یہ سارے کے سارے اپنے گھر سے روٹی کھا کر خدمت کریں گے تو تم ان کا کس طرح مقابلہ کر سکو گے بے شک تعداد سے لحاظ سے تم زیادہ ہو مگر کام کرنے والوں کے لحاظ سے وہ زیادہ ہیں۔ اگر ایک قوم کی دس لاکھ تعداد ہو اور اس میں سے سپاہی صرف چندسَو ہوں اور دوسری قوم کی تعداد اگرچہ چندسَو ہو مگر وہ ساری کی ساری سپاہی ہو تو یہ لازمی بات ہے کہ جب مقابلہ ہوگا زیادہ تعداد رکھنے والی قوم ہار جائے گی اور دوسری قوم جیت جائے گی۔ تو فرماتا ہے تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ تم جیت

جاؤ گے کام کرنے والوں کے لحاظ سے قوم زیادہ ہوا کرتی ہے نہ کہ افراد کی تعداد کے لحاظ سے قوم بڑی ہوتی ہے۔ اور جب دوسری اقوام کے کارکنوں پر یہ شوق اور خدمت میں غالب آجائیں گے تو لازمًا حکومت بھی اُن کے قبضہ میں آجائے گی۔ چنانچہ فرماتا ہے فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا جب یہ کام کے لحاظ سے تم پر غالب آگئے ہیں تو لازمًا ایک دن حکومت اُن کے ہاتھ میں آجائے گی تمہارے ہاتھ میں نہیں رہ سکتی۔

یہ چار معنے ہیں جو میں نے اِن آیات کے بتائے ہیں اور ان چاروں معنوں کے لحاظ سے آیات میں ایک ترتیب نظر آتی ہے اور جو اضطراب گزشتہ مفسرین کے معنوں میں پایا جاتا ہے کہ کبھی نَازِعَات سے مراد ستارے مراد لے لئے اور کبھی فرشتے اور پھر اگلی آیات کے متعلق کہنا کہ اُن میں بھی یہی مضمون پایا جاتا ہے وہ اضطراب ان معنوں میں سے کسی میں بھی نہیں ہے اور یہ سب کے سب ایسے معنے ہیں جو ترتیب کے ساتھ سب آیات پر چسپاں ہو جاتے ہیں۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ﴿۷﴾

(ان کا ظہور اس دن ہوگا) جس دن جنگ (کی تیاری) کرنے والی (قوم) جنگ کی تیاری کرے گی۔

حَلِّ لُغَات۔ تَرْجُفُ تَرْجُفُ رَجَفَ سے مضارع مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور رَجَفَ (يَرْجُفُ) رَجْفًا کے معنے ہیں حَرَّكَهٗ فَرَجَفَ هُوَ اَيْ تَحَرَّكَ وَاضْطَرَبَ شَدِيْدًا کسی چیز کو زور سے حرکت دی اور وہ حرکت میں آگئی اور زور سے ہلنے لگی۔ اور جب رَجَفَ الرَّجُلُ کہیں تو معنے ہوں گے اِضْطَرَبَ شَدِيْدًا کانپنے لگا۔ اور رَجَفَتِ الْاَرْضُ کے معنے ہیں زُلْزِلَتْ۔ زمین ہلادی گئی یعنی بھونچال آگیا۔ اور رَجَفَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں تَهَيَّاءُ وْلِلْحَرْبِ۔ قوم لڑائی کے لئے تیار ہوگئی۔ (اقرب)

تفسیر۔ **سورۃ نازعات کی پہلی پانچ آیات میں کی ہوئی پیشگوئیوں کے ظہور کا وقت** اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ یعنی اوپر کی باتیں اُس دن سے کامل طور پر ظاہر ہونی شروع ہوں گی جب کانپنے والی کانپے گی یا یہ کہ جب اوپر کی تمام باتیں ہو جائیں گی تو پھر وہ دن آئے گا جسے ہم خصوصیت کے ساتھ تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ دن ایسا ہوگا کہ کانپنے والی کانپے گی۔ گویا ایک صورت میں يَوْمَ جو ظرف واقعہ ہوا ہے ان باتوں کے شروع ہونے سے تعلق رکھتا ہے اور دُوسری صورت میں اُن کے ختم ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ سے مراد یہ ہے کہ ایک دن آئے گا جب مسلمان قوم جنگ کے لئے تیار ہو جائے گی۔ تم

آج اِن مسلمانوں پر پے در پے ظلم کر رہے ہو اور وہ تمہارے مقابلہ میں بالکل خاموش ہیں۔ تم خیال کرتے ہو کہ اِن مسلمانوں میں شاید مظالم برداشت کرتے کرتے مقابلہ کی حس ہی باقی نہیں رہی اُن کے دل مردہ ہو چکے ہیں اور اُن کے احساسات مٹ چکے ہیں لیکن تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے مسلمانوں کے دل مردہ نہیں ہوئے بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اُن کے دل ان تکالیف کو دیکھ دیکھ کر جو تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پہنچا رہے ہو تڑپ رہے ہیں۔ صرف ہم نے روکا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ تمہیں ان مظالم کا مزہ نہیں چکھا سکتے اور پیچ وتاب کھا کر رہ جاتے ہیں۔ گویا رَاجِفَۃ کہہ کر بتا دیا کہ مسلمانوں کے دل زندہ ہیں یہ نہ سمجھو کہ مظالم نے اُن کے احساسات کو مٹا ڈالا ہے۔ وہ صرف ہماری اجازت کے منتظر بیٹھے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ تمہارے مقابلہ میں ہاتھ نہیں اٹھاتے لیکن یاد رکھو یَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَۃُ جس دن یہ بڑے حسّاس دل اپنے جوش واضطراب کا اظہار کریں گے اُس دن یہ تمام باتیں جن کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے ظاہر ہونی شروع ہو جائیں گی۔ ابھی ہم ان کے اخلاق کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں اگر آج ہی اُن کو لڑائی کی اجازت دے دیں تو وہ اعلیٰ اخلاق جو ہم اُن میں پیدا کرنا چاہتے ہیں کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہم ابھی اُن پر ظلم کروائیں گے تا کہ اُن میں مادۂ صبر پیدا ہو جائے۔ اسی طرح وہ اخلاق پیدا ہو جائیں جو ظلم کے نتیجہ میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ پس تم اُن کی موجودہ حالت پر قیاس مت کرو۔ تم اُس دن کو یاد کرو جب اُن کے حساس دل اپنے زندہ ہونے کا ثبوت پیش کر دیں گے۔

نَازِعَات کے معنے اگر تیر اندازی کرنے والوں کے کئے جائیں تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تیر اندازی اُس دن شروع ہو گی جب اُن کے حساس دل اضطراب شدید کا اظہار کرنا شروع کر دیں گے۔ اور چونکہ رَجۡفٌ کے ایک معنے قوم کے لڑائی کے لئے تیار ہونے کے بھی ہیں اس لئے یَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَۃُ کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ قوم جس کے دل لڑائی کے لئے مستعد ہیں مگر ہماری طرف سے اجازت نہ ہونے کی وجہ سے رُکے ہوئے ہیں ایک دن جنگ کیلئے تیّار ہو جائے گی یعنی امن اور صلح کے شیدائی آخر ظلموں کو دین کے لئے نقصان دہ دیکھ کر خدا تعالیٰ کے حکم سے جنگ پر آمادہ ہو جائیں گے یا جب اوپر کی باتیں ہو جائیں گی اُس کے بعد ہم اس دن کو لائیں گے۔

تَتۡبَعُهَا الرَّادِفَةُ ؕ﴿۸﴾

اس (جنگ کی تیاری) کے بعد (اس قسم کی) پیچھے آنیوالی (ایک اور) گھڑی آئے گی۔

حَلّ لُغَات۔ اَلرَّادِفَۃُ۔ الرَّادِفَۃُ رَدَفَ سے اسم فائل مؤنث کا صیغہ ہے اور رَدَفَ (یَرۡدُفُ وَرَدِفَ

یَرْدَفُ) رَدَفًا کے معنے ہیں تَبِعَہٗ اس کے پیچھے پیچھے آیا (اقرب) پس رَادِفَۃٌ کے معنے ہوئے پیچھے آنے والی۔

تفسیر۔بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کے اندر بظاہر لڑائی کا بڑا جوش نظر آتا ہے اور وہ کہتا ہے میں یوں کر دوں گا ؤوں کر دوں گا۔مگر اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگر اسے ایک تھپڑ بھی لگ جائے تو اس کا سارا جوش وخروش جاتا رہتا ہے اور وہ خاموش ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔اسی طرح بعض لوگ اپنے آپ کو بڑا بہادر سمجھتے ہیں مگر وقت آنے پر اُن کی حقیقت کُھل جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی بہادری کے دعوے سب غلط تھے۔میں نے کئی دفعہ اس شخص کی مثال سنائی ہے جو ایک گودنے والے کے پاس گیا اور اُسے کہنے لگا کہ میرے بازو پر شیر کی تصویر گود دو۔اُسے بھی یہ وہم تھا کہ میں بہت بہادر ہوں۔جب جراح نے سُوئی چبھوئی تو جھٹ چونک کر کہنے لگا کیا بنانے لگے ہو؟ وہ کہنے لگا کہ شیر کا کان۔کہنے لگا اگر شیر کا کان نہ ہو تو آیا شیر رہتا ہے یا نہیں رہتا؟ اس نے کہا کیوں نہیں رہتا۔وہ کہنے لگا تو پھر کان چھوڑ دو اور کوئی اور حصہ بناؤ۔پھر اُس نے سوئی ماری تو اُس نے دوبارہ شور مچا دیا اور کہنے لگا اب کیا کرنے لگے ہو؟ وہ کہنے لگا کہ شیر کا دوسرا کان بنانے لگا ہوں۔اُس نے کہا اگر یہ کان نہ ہو تو پھر یہ شیر رہتا ہے یا نہیں رہتا؟ وہ کہنے لگا رہتا کیوں نہیں۔کہنے لگا اچھا تو پھر اس کو بھی چھوڑ و اور آگے چلو۔اسی طرح وہ ہر دفعہ یہی کہتا چلا گیا۔آخر گودنے والے نے سوئی رکھ دی اور کہنے لگا اب تو کچھ بھی نہیں بن سکتا۔تو بعض فطرتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بہادری کا دعویٰ تو بہت کرتی ہیں مگر وقت پر بزدل ثابت ہوتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَتْبَعُهَا الرَّادِفَۃُ یہ نہیں ہوگا کہ مسلمان پھر اپنے ہاتھ سے تلوار چھوڑ دیں بلکہ ایک دفعہ تلوار اٹھے گی تو پھر پے در پے جنگیں ہوتی ہی چلی جائیں گی۔یہ نہیں ہوگا کہ مسلمان ڈر جائیں یا ایک حملہ کے بعد دوسرا حملہ نہ کریں بلکہ متواتر اور مسلسل جنگیں ہوں گی اور وہ اُس وقت تک تلوار ہاتھ سے نہ رکھیں گے جب تک فتح نہ پائیں۔

قُلُوْبٌ يَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ﴿۹﴾

اس دن کچھ (لوگوں کے) دل دھڑک رہے ہوں۔

حَلّ لُغَات۔وَاجِفَۃٌ وَجَفَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے۔وَجَفَ (یَجِفُ) وَجْفًا وَوَجِیْفًا وَوُجُوْفًا کے معنے ہوتے ہیں اِضْطَرَبَ وہ کانپنے لگا اور جب قلب کے لئے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے خفقان کے ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں وَجَفَ الْقَلْبُ وَجِیْفًا اَیْ خَفَقَ یعنی دل دھڑکنے لگا۔اور جب گھوڑے یا اونٹ

کے متعلق یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں عَدَا وَسَارَ الْعَنَقَ۔ وہ تیز دوڑا اور عنق (تیز چال) چال چلا (اقرب) پس قُلُوْبٌ يَّوْمَىٕذٍ وَّاجِفَةٌ کے معنے ہوں گے اس دن کچھ دل ایسے ہوں گے جو دھڑک رہے ہوں گے۔

تفسیر۔ غلبہ اسلام کے ظہور سے قیامت کے برپا ہونے کے متعلق کفار کے دلوں میں خیالات جیسا کہ سورۂ نبأ کی تفسیر میں بیان کیا جاچکا ہے اللہ تعالیٰ ایک ہی وقت میں قرآن اور اسلام کے غلبہ اور قیامت کا ذکر کرتا ہے اور اسلام کے غلبہ کو قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے کہ جو خدا اتنا عظیم الشان تغیّر پیدا کر سکتا ہے تمہیں یقین رکھنا چاہیے کہ وہ مرنے کے بعد بھی زندگی بخش سکتا ہے۔ اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ جب یہ حالات رُونما ہوں گے بڑے بڑے صنادید مارے جائیں گے اور مسلمان کفار کو مغلوب کر لیں گے تو اُن کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہونا شروع ہو جائے گا کہ کہیں سچ مچ قیامت بھی تو نہیں آنے والی۔ جب ایک بات پوری ہونی شروع ہوگئی ہے تو دوسری بات جس کا اسی کے ساتھ تعلق تھا وہ بھی پوری ہو سکتی ہے۔ پس اُس دن کفار گھبرا جائیں گے اور آثار شکست ظاہر ہو جائیں گے یہاں تک کے کفار کے دل میں اپنے عقیدۂ قیامت کے انکار کے متعلق بھی شبہات پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے اور وہ کہیں گے ارے کہیں قیامت بھی تو نہیں آنیوالی جس کا مسلمانوں کی طرف سے ذکر کیا جارہا تھا۔

اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ⑩

اور ان کی نظریں خوف سے جھکی ہوئی ہوں گی۔

حَلِّ لُغَات۔ اَلْخَاشِعَةُ اَلْخَاشِعَةَ خَشَعَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے اور خَشَعَ بِبَصَرِهٖ کے معنے ہوتے ہیں غَضَّهٗ آنکھ کو نیچا کیا۔ وَغَضَّ بَصَرُهٗ: اِنْكَسَرَ اس کی آنکھ انکسار سے جھک گئی۔ وَفِي النِّهَايَةِ اَلْخُشُوْعُ فِي الصَّوْتِ وَالْبَصَرِ كَالْخُضُوْعِ فِي الْبَدَنِ۔ نہایۃ کے مصنف لکھتے ہیں کہ جس طرح بدن کی عاجزی اور انکساری کے اظہار کے لئے خضوع کا لفظ استعمال کرتے ہیں اسی طرح آنکھ اور آواز سے عجز کے اظہار کو خشوع کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ میں ھا کی ضمیر کا مرجع اَبْصَارُهَا کی ضمیر قلوب کی طرف جاتی ہے اور اَبْصَار کے معنے آنکھوں کے ہوتے ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ دلوں کی تو آنکھیں نہیں ہوتیں پھر اَبْصَارُهَا کیوں کہا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اَبْصَارُهَا میں هَاء سے مراد اہل قلوب ہیں جیسا کہ يَقُوْلُوْنَ

سے ظاہر ہے فرماتا ہے یَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر اہل قلوب مراد ہیں تو پھر ضمیر مؤنث کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ یہاں اہل قلوب مراد ہیں۔ اس لئے قلوب کی طرف اضافت کے باعث ضمیر مؤنث آسکتی ہے جیسے تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ (البقرة:۷۰) میں ہے یہ عربی کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی لفظ مؤنث یا مذکر کی طرف مضاف ہو تو مضاف الیہ کی مطابقت میں اسے بھی مؤنث یا مذکر قرار دے دیتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اَبْصَار۔ بَصَرٌ کی جمع ہے اور بَصَرٌ کا لفظ حَاسَّةُ الرُّؤْيَة کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اَلْعَیْن کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اَلْعِلْمُ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے (اقرب) اور علم کی ضمیر قلوب کی طرف پھیری جاسکتی ہے یعنی ان کے قلوب میں عقل اور فہم کی جو حس ہے وہ منکسر ہو جائے گی اور انہیں معلوم ہوگا کہ ان کے دلوں جو علم کے دعوے تھے سب غلط تھے۔ اور اگر اَبْصَار سے ظاہری آنکھیں مراد لیں تو جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ اس دن کچھ دل دھڑک رہے ہوں گے اور اُن اہل قلوب کی آنکھیں ذلّت اور ندامت سے جھکی ہوئی ہوں گی۔ وہ شرمندہ ہوں گے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہو گیا۔ اس مشاہدہ اور معائنہ کے بعد اُن کی آنکھیں شرمندگی اور ذلّت اور انکسار سے جھک جائیں گی۔ یعنی یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا والا نظارہ دیکھ کر کسی کے سامنے آنکھ نہ اٹھا سکیں گے اور دل میں قیامت کے انکار کے متعلق بھی شبہ پیدا ہو جائے گا کہ جس طرح یہ بات پوری ہوئی کیا وہ بھی تو پوری نہ ہو جائے گی۔ دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ اُس دن کچھ دل دھڑک رہے ہوں گے۔ اُن کی بصیرتیں اور علوم سب باطل ہو جائیں گے اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اُن کے علم و فہم کے دعوے سب غلط تھے۔

یَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ ﴿۱۱﴾

(اور) وہ کہیں گے کیا ہمیں اپنے رستے پر اُلٹے پاؤں لوٹایا جائے گا۔

حَلّ لُغَات۔ اَلْحَافِرَةُ الحَافِرَةُ مؤنث ہے اَلْحَافِرُ کی اور اس کے معنے ہیں اَلْخَلْقَةُ الْاُوْلٰی۔ پہلی پیدائش۔ کہتے ہیں رَجَعَ عَلٰی حَافِرَتِهٖ وَفِیْ حَافِرَتِهٖ اَیْ فِیْ طَرِیْقِهِ الَّتِیْ جَاءَ فِیْهَا یعنی رَجَعَ عَلٰی حَافِرَتِهٖ کہیں تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وُہ اُسی طرف چلا گیا جس طرف سے آیا تھا۔ نیز کہتے ہیں فُلَانٌ رَجَعَ فِیْ حَافِرَتِهٖ: شَاخَ وَهَرِمَ یعنی وہ بڈھا ہو گیا۔ وَرَجَعَ عَلٰی حَافِرَتِهٖ یُقَالُ اَیْضًا لِمَنْ کَانَ فِیْ اَمْرٍ فَخَرَجَ مِنْهُ ثُمَّ

عَادَ اِلَیْہِ (اقرب) جو شخص کوئی کام کرتا ہوا چھوڑ دے اور پھر اُسے کرنے لگ جائے اس کے متعلق کہتے ہیں کہ رَجَعَ عَلٰی حَافِرَتِہٖ۔

تفسیر ۔ یَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ سے مراد یہ ہے کہ جب کفار ایک پیشگوئی کو پورا ہوتے ہوئے دیکھیں گے تو اُن کے دل دھڑکیں گے اور وہ کہیں گے کیوں جی ایک بات تو پوری ہو گئی۔ کیا دوبارہ زندہ ہونے والی بات بھی پوری ہو جائے گی یعنی خُود بخو اُن کے دل میں سوال اُٹھنا شروع ہو جائے گا یا وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہیں گے کہ ایک بات تو ہو گئی کیا اس سے ہم یہ نتیجہ نکال لیں کہ قیامت کا مسئلہ بھی سچ مچ صحیح ہے اور کیا اب اس طرح ہو کر رہے گا اگر ایسا ہوا تو ہمیں بڑا نقصان پہنچے گا۔

ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ؕ ﴿۱۲﴾ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا

کیا (اس حالت میں بھی کہ) جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے (ایسا ہوگا)۔

كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿۱۳﴾

وہ کہتے ہیں (اگر ایسا ہوا) تب تو یہ بڑی گھاٹے والی واپسی ہوگی

حل لغات ۔ نَخِرَةٌ نَخِرَ الْعَظْمُ کے معنے ہوتے ہیں بَلِیَ وَتَفَتَّتَ ہڈیاں گل سڑ گئیں اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں (اقرب) اَلْعِظَامُ النَّخِرَةُ: اَلْبَالِیَةُ الْمُتَفَتِّتَةُ بوسیدہ اور گلی سڑی ہڈیاں (اقرب)

اَلْكَرَّةُ کے معنے ہیں لوٹنا اور اَلْكَرَّةُ الْخَاسِرَةُ کے معنے ہیں نقصان دِہ لوٹنا۔

تفسیر ۔ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً میں سوال انکاری نہیں بلکہ استعجاب کا سوال ہے یعنی کفّار تعجب سے کہتے ہیں کہ ایک بات تو مسلمانوں کی پوری ہو گئی۔ دوسری بات جو مسلمان کہا کرتے تھے کہ جب ہڈیاں گل سڑ جائیں گی۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی تو پھر دوبارہ اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے زندہ کر دیا جائے گا۔ پس جب ان کی ایک بات پوری ہوتی نظر آ گئی ہے تو دوسری بات بھی پوری ہو سکتی ہے گویا وہ جو کہا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ کیا جائے گا یہ بات تو ٹھیک ہوتی نظر آتی ہے۔

قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ کفار کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہوگا تو یہ ہمارا لوٹنا بڑا نقصان دہ ہوگا اس لئے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی تھی کہ دو قیامتیں آنے والی ہیں۔ ایک قیامت میرا غلبہ ہے اور ایک

قیامت وہ ہے جب مرنے کے بعد ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اُسے اپنے اعمال کا جواب دینا پڑے گا۔ ہم نے ان دونوں قیامتوں کا انکار کیا اور کہا کہ ہم کسی بات کو ماننے کیلئے تیار نہیں۔ چنانچہ ہم نے اس کا مقابلہ کیا اور اس کو مٹانے کیلئے اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں مگر جب بھی ہم نے اُس کے مقابلہ میں سر اٹھایا ہم کچلے گئے اور ہمیں ذلّت کے ساتھ نا کام ہونا پڑا۔ اس کے بعد ساری قوم نے مل کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو گرانے اور آپ کو اپنے مقصد میں نا کام کرنے کی کوشش کی مگر پھر بھی ہم مارے گئے۔ پس جب ہم تیاری کر کے مارے گئے تو جہاں ہم بے تیاری کے جائیں گے وہاں ہمارا کیا حال ہوگا۔ اُس دن کے لئے تو ہم نے کوئی بھی تیاری نہیں کی۔ پس اگر وہ بات بھی پوری ہوئی تو پھر تو ہمارا بُرا حال ہوگا کیونکہ اس کے لئے ہم نے کوئی تیاری نہیں کی۔ اس دنیوی دن کے لئے تو تیاری کی تھی پھر بھی ذلیل ہو گئے وہ دن جس کے لئے تیاری نہیں کی اُس دن کیا حال ہوگا۔ وہ ہمارا لوٹنا تو بڑا نقصان دِہ ہوگا۔

اس جگہ دوزخ کا ذکر یہ بتانے کے لئے کیا گیا ہے کہ یہاں قیامت اور غلبۂ رسول دونوں کا اکٹھا ذکر ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ جب اِن میں سے ایک بات پوری ہو جائے گی تو کفار خود بخود اس سے یہ استدلال کرنا شروع کر دیں گے کہ جو دوسری بات کہی گئی تھی معلوم ہوتا ہے وہ بھی پوری ہو جائے گی اور اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں بڑا نقصان ہوگا کیونکہ ہم نے تو اُس دن کے لئے تو کوئی تیاری نہیں کی۔ اس کے بعد پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے۔

فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۴﴾

پس (حقیقت میں) یہ (جنگ کی تیاری) ایک (الٰہی) ڈانٹ (ڈپٹ کا نتیجہ) ہوگی۔

حَلِّ لُغَات۔ زَجْرَةٌ زَجْرَةٌ زَجَرَ سے ہے اور زَجَرَہٗ عَنْ کَذَا زَجْرًا کے معنے ہوتے ہیں مَنَعَهٗ وَنَهَاهُ اس کو کسی چیز سے سختی سے روکا اور منع کیا وَیُقَالُ اَصْلُ الزَّجْرِ اَلطَّرْدُ مَعَ الصَّوْتِ یعنی زجر کے اصل معنے آواز کے ساتھ دوڑانے کے ہیں چنانچہ کہتے ہیں زَجَرَ الْبَعِيْرُ: صَاحَ بِهٖ لِيَسُوْقَهٗ زور زور سے آوازیں دے کر اونٹ کو ہانکا اور جب زَجَرَتِ النَّاقَةُ بِمَا فِيْ بَطْنِهَا کہیں تو معنی ہوں گے رَمَتْ بِهٖ اونٹنی نے اپنا بچہ پھینک دیا اور زَجَرَ الطَّيْرَ کے معنے ہوتے ہیں تَفَاءَلَ بِهٖ فَتَطَيَّرَ فَنَهَرَهٗ یعنی طیر سے تفاؤل لیا اور پھر منحوس فال نکلنے پر پرندے کو اڑا دیا۔ اسی طرح کہتے ہیں فُلَانٌ يَزْجُرُ الطَّيْرَ یعنی اُس نے پرندہ اڑا دیا۔ دائیں طرف گیا تو نیک فال

لی۔ بائیں طرف گیا تو بُری فال لی (اقرب) گویا زجر کے اور معنوں کے علاوہ ایک معنے روکنے اور منع کرنے کے بھی ہیں اور ایک معنے اونٹوں کو شور کے ساتھ ہنکا کر لے جانے کے ہیں۔ پس زَجْرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ کے معنے ہوئے ایک دفعہ دھکیل کر لے جانا یا ہنکا کر لے جانا۔

تفسیر۔ اِنَّمَا هِیَ زَجْرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ میں جنگ بدر کا نقشہ فرماتا ہے فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ ارے میاں ابھی تمہارے دل دھڑکنے لگ گئے۔ یہ درحقیقت جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے اور فرماتا ہے کہ یہ جو ہم نے کہا تھا کہ یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَۃُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَۃُ اُس کا تو ابھی ہم نے صرف پہلا نمونہ دکھایا ہے اور ابھی سے تم حواس باختہ ہو گئے اور تمہارے دل دھڑکنے لگ گئے حالانکہ ابھی تَتْبَعُهَا الرَّادِفَۃُ والی پیشگوئی پوری ہونی باقی ہے اور تمہیں ہم نے کئی دفعہ ان میدانوں میں ہنکا کر لے جانا ہے۔ یہ ویسا ہی فقرہ ہے جیسے ایک شاعر نے کہا کہ ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیو ہوتا ہے کیا

فرماتا ہے فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ یہ عذاب جس کا ہم نے ذکر کیا ہے عذابوں کے لمبے سلسلہ میں سے پہلا عذاب ہوگا اور اسی کے دیکھنے سے تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے حالانکہ ہم تمہیں اور تمہاری قوم کے سرداروں کو بار بار جمع کریں گے اور بار بار مسلمانوں کے مقابلہ میں تم شکست کھاؤ گے۔

ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے بدر کی جنگ کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ بدر کی جنگ میں نہ مسلمان لڑنے کی نیت سے نکلے تھے اور نہ کفار لڑنے کی نیت سے نکلے تھے۔ مسلمان مدینہ سے صرف اس لئے نکلے تھے کہ انہیں معلوم ہوا کہ شام سے کفار کا ایک قافلہ آ رہا ہے اور چونکہ یہ ایک غیر معمولی قافلہ تھا جس میں قریش کے ہر مرد وعورت کا تجارتی حصہ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق رؤساء قریش کی یہ نیت تھی کہ اس کا منافع مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے میں استعمال کیا جائے گا۔ چنانچہ تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ یہی منافع جنگ اُحد کی تیاری میں صرف کیا گیا (الطبقات الکبریٰ لابن سعد غزوۃ رسول اللہ احدا) پس علاوہ اس کے کہ وہ قوم کی قوم مسلمانوں سے برسرِ پیکار رہتی تھی اپنے روپیہ اور مال کے ذریعہ سے بھی مسلمانوں کے خلاف مختلف قسم کے منصوبے سوچتی رہتی تھی اور یہ مال انہیں زیادہ تر تجارت سے حاصل ہوتا تھا۔ دوسرے مسلمانوں کو علم تھا کہ کفار مکہ بھی اسی قافلہ کی پیشوائی کو ایک لشکر لے کر نکلے ہیں پس مسلمان یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہم تم سے ڈرتے نہیں لیکن اُن کو قطعی طور پر یہ علم نہ تھا کہ کفار سے جنگ ضرور ہو جائے گی۔ پس چونکہ اس روپیہ کا استعمال مسلمانوں کے خلاف ہونے والا تھا۔ اور دوسرے کفار مکہ ایک لشکر

کے ذریعہ سے مسلمانوں کے رعب کو مٹانے کے لئے نکلے تھے اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو لے کر نکلے کہ تا علاقہ پر کفار کا رعب نہ پڑے گو پہلے بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے اشارات ہو رہے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ کفار سے جنگ ہونے والی ہے مگر یہ امر واضح نہ تھا کہ ابھی ایسا ہونے والا ہے لیکن جب آپ لشکر لے کر نکلے تو آپ کو وحی سے بتایا گیا کہ دراصل کفار سے لڑائی ہونی ہے قافلہ سے مقابلہ نہیں ہوگا۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ابھی یہ بات بتائیں نہیں جس وقت آپ بدر کے قریب پہنچے تو اُس وقت آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے کہ قافلہ سامنے آجائے یا دشمن کے لشکر سے ہی مقابلہ ہو جائے اُس وقت صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ! جو صورتِ حالات بھی پیدا ہو ہم اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں مگر اب بھی اُن کے ذہن میں یہی تھا کہ لشکر سے کہاں مقابلہ ہونا ہے قافلہ والوں سے ہی مقابلہ ہوگا۔ مگر جب آپ بدر کے مقام پر پہنچے تو وہاں کفار کا لشکر موجود تھا اُس وقت آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ بولو اب کیا رائے ہے؟ صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ ہم لڑائی کے لئے تیار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس جنگ میں صرف تین سو تیرہ صحابہ شامل ہوئے ورنہ مسلمانوں کی تعداد اس سے زیادہ تھی۔ اس قدر تھوڑی تعداد میں مسلمان اسی لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئے تھے کہ ان کا خیال تھا کہ غالباً مقابلہ کوئی نہ ہوگا اس لئے زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں مگر جب قافلہ کی بجائے لشکر سے مقابلہ ہو گیا تو بعض صحابہؓ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم آپ کے لئے مقامِ حفاظت بنا دیتے ہیں تاکہ آپ محفوظ رہیں۔ اور آپ کے پاس ایسی تیز رفتار اونٹنیاں باندھ دیتے ہیں جو نہایت مضبوط ہوں۔ یا رسول اللہ! اگر ہم سب کے سب اس جنگ میں مارے جائیں تو ہماری درخواست ہے کہ آپ ان تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو کر مدینہ تشریف لے جائیں وہاں ہمارے بھائی موجود ہیں جن کے دلوں میں ویسا ہی اخلاص موجود ہے جیسا ہمارے دلوں میں ہے اور جو دین کے لئے قربانی کی ویسی ہی روح رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں مگر انہیں معلوم نہ تھا کہ جنگ ہونے والی ہے ان کا یہی خیال تھا کہ شاید جنگ نہ ہو اور اسی لئے وہ ساتھ نہیں آئے۔ آپ ہمارے اُن بھائیوں کو ساتھ لے کر پھر ان کفار کا مقابلہ کر سکتے ہیں (السیرۃ الحلبیۃ باب غزوۃ بدر) دوسری طرف کفار کا یہ حال تھا کہ جب انہوں نے سنا کہ قافلہ بچ کر نکل آیا ہے تو ابوجہل اور دوسرے بڑے بڑے سرداروں نے کہا چلو ہم ذرا عیش کر آئیں اور خوشی منائیں کہ مسلمان ہمارے قافلہ کو روک نہیں سکے۔ پس وہ بھی لڑائی کے ارادہ سے نہیں نکلے تھے بلکہ اُن کا منشاء یہ تھا کہ ہم تین دن دعوتیں کریں گے شرابیں پئیں گے اور خوب عیش منائیں گے اور علاقہ پر رعب ڈالیں گے۔ پس اپنی طرف سے وہ عیش منانے کے لئے آئے تھے اور سمجھتے تھے

کہ مسلمانوں میں یہ جرأت کہاں ہوسکتی ہے کہ وہ ہمارے مقابلہ میں آئیں۔ اِدھر مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ہم کسی یقینی لڑائی کے لئے نہیں جارہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت سے دونوں کو ایک مقام پر لڑائی کے لئے جمع کردیا۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (الانفال: ۴۳) یعنی ہم اپنے حکم سے تم دونوں کو نکال کر لائے تھے ورنہ نہ وہ آتے نہ تم آتے۔ اُن کے لئے بھی کوئی جنگ کا موقع نہ تھا کیونکہ اس وقت ان کے مدنظر یہ بات تھی کہ قافلہ اپنے ساتھ جو جو چیزیں لایا اسے ہم بیچیں اور روپیہ کمائیں دوسری طرف مسلمانوں کے دلوں میں بھی لڑائی کی کوئی خواہش نہ تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ہی فیصلہ تھا جس نے دونوں کو لڑائی کے لئے جمع کردیا۔

فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ؕ ﴿۱۵﴾

چنانچہ وہ یکدم (جنگ کے) میدان میں آموجود ہوں گے۔

حَلّ لُغَات۔ اَلسَّاهِرَةُ اَلسَّاهِرَةُ قِيْلَ وَجْهُ الْاَرْضِ (مفردات) یعنی سَاهِرَة کے معنے سطح زمین کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اقرب الموارد میں لکھا ہے اَلسَّاهِرَةُ وَجْهُ الْاَرْضِ۔ سطح زمین۔ وَقِيْلَ اَلْفَلَاةُ۔ جنگل۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے صرف ایک دفعہ تمہیں ہنکا کر لانے پر کفّار مسلمانوں کے مقابل پر بالکل ننگے ہوجائیں گے اب آگے آگے دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ جب اس ایک واقعہ سے قیامت کے متعلق اُن کے دلوں میں خیالات پیدا ہونے شروع ہوجائیں گے تو آئندہ کیا ہوگا جب تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ کا وقت آئے گا اور پے در پے اُنہیں مسلمانوں کے مقابلہ میں جنگ کے لئے ہنکا کر لایا جائے گا۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۱۶﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۚ ﴿۱۷﴾

کیا تجھے موسیٰ کی بات (بھی) پہنچی ہے۔ جبکہ اُسے اس کے رب نے (اس) مقدس وادی

یعنی طویٰ میں پکارا۔

تفسیر۔ فرماتا ہے جب یہ واقعات ظہور میں آئیں گے تو تم اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے کہو گے کہ یہ محض

اتفاق ہے حالانکہ تم اسے اتفاق نہیں کہہ سکتے۔ پہلے نبیوں کے زمانہ میں بھی ایسا ہوتا چلا آیا ہے اور تمہارے سامنے اس کی مثالیں موجود ہیں۔ تم کس کس شہادت کو اتفاق قرار دے کر اُس کا انکار کرو گے۔ اوّل تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تمہارے سامنے صرف یہ پہلی پیشگوئی نہیں کی بلکہ اور بھی کئی پیشگوئیاں کی ہیں اور تم ان نشانات کو پورا ہوتے دیکھ چکے ہو۔ لیکن اگر پھر بھی تم اس کو اتفاق قرار دو گے تو ہم تمہارے سامنے دوسری مثال پیش کرتے ہیں۔

آنحضرتؐ کے غلبہ کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات کا ذکر هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى کیا تمہیں کچھ موسیٰ کی بھی خبر ہے اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى جب خدا نے اُس کو طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا۔ طویٰ شام میں ایک وادی بھی ہے اور طُویٰ کے معنے ہیں اَلشَّيْءُ الْمُثْنٰى (اقرب) ایسی چیز جو ٹیڑی ہو سیدھی نہ ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو دیکھنے اور آنحضرتؐ کے خدا تعالیٰ کو دیکھنے میں فرق اس آیت میں ایک زبردست لطیفہ ہے اور وُہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب خدا تعالیٰ سے ملے تو وُہ وادیٔ طویٰ میں تھے جس کے معنے ٹیڑھی وادی کے ہیں لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب اللہ تعالیٰ سے ملے تو اُس وقت کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ دَنَا فَتَدَلّٰى۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (النجم:۹،۱۰) آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح جا کھڑے ہوئے جس طرح دو قوسوں میں وتر ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ نزدیک ہو کر آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ اب یہ سیدھی بات ہے کہ وادیٔ طویٰ میں جو شخص کھڑا ہو گا وہ خدا تعالیٰ کو اُس طرح نہیں دیکھ سکے گا جس طرح قَابَ قَوْسَيْنِ والا دیکھ سکے گا۔ مثلاً جب یہ شکل بنائی جائے [شکل] تو اس میں الفؔ مقام کو بؔ مقام والا نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن اس دوسری شکل میں [شکل] مقامِ الفؔ کو بؔ مقام والا دیکھ سکتا ہے۔ اس میں درحقیقت اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھے گی لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متبع روحانیت میں درجۂ کمال حاصل کریں گے اور وُہ خدا تعالیٰ کو اپنے سامنے دیکھ سکیں گے کیونکہ قَابَ قَوْسَيْنِ والی حالت میں آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا جا سکتا ہے لیکن دوسری صورت میں آمنے سامنے ہو کر نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ خدا ایک زاویہ پر رہتا ہے اور بندہ دوسرے زاویہ پر۔

اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّہٗ طَغٰی ﴿ۖ۱۸﴾ فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰۤی اَنۡ

(اور فرمایا) فرعون کی طرف جا کیونکہ وہ باغی ہو رہا ہے۔ اور (اُسے) کہو کہ کیا تجھے (اس بات کی بھی کچھ)

تَزَکّٰی ﴿ۙ۱۹﴾

خواہش ہے کہ تُو پاک ہو جائے۔

حَلّ لُغَات۔ تَزَکّٰی تَزَکّٰی اصل میں تَتَزَکّٰی ہے جو تَزَکّٰی سے مضارع مخاطب کا صیغہ ہے اور تَزَکّٰی کے معنے ہیں صَارَ زَکِیًّا۔ پاک ہوگیا (اقرب) اور تَتَزَکّٰی کے معنے ہوں گے۔ پاک ہوتا ہے۔ اور هَلۡ لَّكَ اِلٰۤی اَنۡ تَزَکّٰی کے معنے ہوں گے۔ کیا تیری اس طرف رغبت ہے کہ تُو پاک ہو۔

تفسیر۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّہٗ طَغٰی تو فرعون کی طرف جا کیونکہ وہ بڑا سرکش ہوگیا ہے فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰۤی اَنۡ تَزَکّٰی اور اسے کہہ ارے میاں کچھ پاکیزگی کا بھی دل میں شوق ہے۔ هَلۡ لَّكَ اِلٰۤی اَنۡ تَزَکّٰی کے معنی یہ ہیں کہ هَلۡ لَّكَ رَغۡبَۃٌ اِلٰۤی اَنۡ تَزَکّٰی کیا تزکیہ کی طرف بھی تجھے کچھ رغبت اور شوق ہے۔ یہ بھی گفتگو کا ایک طریق ہوتا ہے جیسے ہمارے ہندوستان میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ پان کا شوق فرمائیں گے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ فرعون سے جا کر کہو کہ ارے میاں کچھ پاکیزگی کا بھی شوق ہے؟ اگر تزکیہ کا شوق ہو تو تمہیں کچھ باتیں بتاؤں وَاَهۡدِیَكَ اِلٰی رَبِّكَ اور میں تجھے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ بتاؤں فَتَخۡشٰی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا کا خوف تمہارے دل میں پیدا ہو جائے گا۔

وَاَهۡدِیَكَ اِلٰی رَبِّكَ فَتَخۡشٰی ﴿ۚ۲۰﴾ فَاَرٰىهُ الۡاٰیَۃَ الۡکُبۡرٰی ﴿ۖ۲۱﴾

اور (اس کے نتیجہ میں) مَیں تجھے تیرے رب کی طرف راستہ دکھاؤں پس تو (خدا سے) ڈرنے لگے چنانچہ (موسیٰ گئے اور انہوں نے) اُسے ایک بڑا نشان دکھلایا۔

تفسیر۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم زائد باتیں حذف کر دیتا ہے۔ پہلے فرمایا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ اگر تمہیں پاکیزگی کا شوق ہو تو میں تمہیں کچھ ہدایت کی باتیں بتلاؤں۔ اس کے بعد

یہ مضمون آتا تھا کہ جب فرعون کو یہ کہا گیا تو اُس نے بے رغبتی کا اظہار کیا اور کہا میں ایسی باتوں کی خواہش نہیں رکھتا تم میرے سامنے ایسی باتیں مت پیش کرو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان زوائد کو حذف کر دیا۔ کیونکہ یہ باتیں خود بخود سمجھی جاسکتی ہیں۔ بہر حال فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان لمبی بحث ہوئی جس کے نتیجہ میں فرعون کو آیت کبریٰ دکھائی گئی۔

آیت کبریٰ سے مراد معجزہ عصاء یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وہ کون سی آیت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آیت کبریٰ قرار دیا ہے۔ نشانات تو بہت سے دکھائے گئے تھے چنانچہ قرآن کریم میں بھی دوسری جگہ تِسۡعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ (بنی اسرائیل: ۱۰۲) کے الفاظ آتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے نو نشانات دیئے جو بہت روشن اور واضح تھے۔ اسی طرح فرماتا ہے وَلَقَدۡ اَرَيۡنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى (طٰہٰ: ۵۷) کہ ہم نے فرعون کو اپنی تمام آیات دکھائیں مگر پھر بھی اُس نے تکذیب کی اور انکار سے کام لیا۔ پس سوال یہ ہے کہ جب فرعون کو بہت سے نشانات دکھائے گئے تو پھر آیت کُبریٰ سے کون سا نشان مراد ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ سورۂ طٰہٰ سے ہی ظاہر ہے پہلے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا کا معجزہ دکھایا تھا یہاں بھی چونکہ فرعون سے پہلی ملاقات کا ہی ذکر ہے اس لئے آیات کبریٰ سے مراد عصا والا معجزہ ہے۔ قرآن کریم نے بھی بار بار عصا کے معجزہ کا ذکر کیا ہے۔ بیشک ید بیضاء کا معجزہ بھی کئی دفعہ ظاہر ہوا مگر بیضاء کا معجزہ ہمیشہ عصا والے معجزہ کے بعد ظاہر ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کے مقام پر کھڑا کیا گیا تو اُس وقت بھی پہلے عصا کا معجزہ ظاہر ہوا اور بعد میں یدِ بیضا کا۔ فرعون کے سامنے ساحروں کے مقابلہ میں بھی عصا کا معجزہ ہی دکھایا گیا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ساتھ دریا کو پار کیا تو اُس وقت بھی عصا ہی سمندر پر مارا گیا اور جب پانی کی سخت ضرورت تھی تو اُس وقت بھی عصا ہی چٹان پر مارا گیا۔ پس عصا کے ساتھ خصوصیت سے کئی نشانات وابستہ تھے اِسی لئے اِس معجزہ کو آیت کُبریٰ قرار دیا گیا ہے خروج باب ۷ آیت ۸ تا ۱۰ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا کا معجزہ ہی دکھایا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون کو کہا کہ جب فرعون تمہیں کہے کہ اپنا معجزہ دکھاؤ تو ہارون کو کہیو کہ اپنا عصا لے اور فرعون کے آگے پھینک دے وہ ایک سانپ بن جائے گا تب موسیٰ اور ہارون فرعون کے آگے گئے اور انہوں نے وہ جو خداوند نے انہیں فرمایا تھا۔ کیا۔ ہارون نے اپنا عصا فرعون اور اس کے خادموں کے آگے پھینکا اور وہ سانپ ہو گیا۔

قرآن کریم کے رُو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ساحروں نے بھی یہی معجزہ دکھانا چاہا تھا جس

سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن بھی اس معجزہ کی اہمیت کو تسلیم کرتا تھا۔ بائیبل نے بیان کیا ہے کہ خون بنانے کا معجزہ بھی ساحروں نے دکھایا مگر قرآن کریم نے اس کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ اصل معجزہ جو فرعون اور اس کے ساتھیوں کو دکھایا گیا عصا کا ہی تھا باقی جس قدر معجزات تھے وہ اس کے تابع تھے۔

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۳﴾

جس پر اس نے (موسیٰ کو) جھٹلایا اور نافرمانی کی۔ مزید براں (اُس نے) فساد کی تدبیریں کرتے ہوئے حق سے

فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۴﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۵﴾

پیٹھ پھیر لی چنانچہ (اس نے درباریوں کو) جمع کیا اور (ملک میں عام) منادی (بھی) کرائی اور (لوگوں کو جمع کر کے) کہا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔

تفسیر ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے باوجود اس کے کہ فرعون کو آیت کبریٰ دکھائی گئی پھر بھی اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور نافرمانی کی۔ ثُمَّ اَدْبَرَ پھر پیٹھ پھیری۔ يَسْعٰى اور مخالفت میں لگ گیا۔ يَسْعٰى کے معنے سعی اور کوشش کے بھی ہوتے ہیں اور دوڑنے کے بھی۔ یہاں يَسْعٰى سے مراد عملی کوشش کے ہیں نہ کہ قدموں سے بھاگنے کی کوشش کے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اُس نے پورا زور مخالفت میں لگایا اور اپنی تمام کوششیں موسیٰؑ کو برباد کرنے میں صرف کر دیں۔

فَحَشَرَ فَنَادٰى میں عوام اور خواص ہر دو قسم کے لوگوں کو بلانے کی طرف اشارہ فَحَشَرَ فَنَادٰى

پھر اس نے تمام لوگوں کو اکٹھا کیا۔ اور اُنہیں بلانے کے لئے منادی کی۔ اکٹھا کرنے سے یہ مراد ہے کہ اُس کی طرف سے بڑے بڑے لوگوں کو چٹھیاں بھیجی گئیں کہ وہ فلاں دن جمع ہو جائیں۔ دُنیا میں بُلانے کے دو ہی طریق ہیں۔ معزز لوگوں کی طرف چٹھیاں بھیج دی جاتی ہیں اور عوام کو بُلانے کے لئے منادی کر دی جاتی ہے۔ اُس نے بھی بڑے بڑے اُمراء اور سرداروں کو خاص طور پر چٹھیاں بھجوا دیں یا اُن کی طرف آدمی بھیج دئے کہ وہ فلاں دن پہنچ جائیں۔ اور پھر عام منادی بھی کرا دی تا کہ سب لوگ جمع ہو جائیں۔ جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو وہ اُن سے کہنے لگا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى میں تمہارا بڑا رب ہوں مگر یہ شخص تمہارے خلاف منصوبہ بازیاں کرتا رہتا ہے تم سب کو اس کے خلاف اکٹھے ہو جانا چاہیے۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى ؕ﴿۲۶﴾

اس پر اللہ (تعالیٰ) نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں مبتلا کرنے کے لئے پکڑ لیا۔

حَلّ لُغَات۔ نَكَال نَكَالٌ نَكَلَ سے اسم ہے اور نَكَّلَ بِفُلَانٍ کے معنے ہیں صَنَعَ بِهٖ صَنِيْعًا يَحْذُرُ غَيْرَهٗ اِذَا رَاٰهُ کسی امر کے مرتکب ہونے پر کسی سے ایسا سلوک کیا کہ دوسرا شخص اس سلوک کو دیکھ کر عبرت پکڑے اور وہ ویسے کام کا مرتکب نہ ہو (اقرب) پس اِلنَّكَالُ کے معنے ہیں ایسی سزا جو عبرت دلا دے۔

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو موسیٰ ؑ کی پیشگوئی کے ماتحت نکالِ آخرت کے ذریعہ سے تباہ کر دیا۔ یہاں نَكَالَ الْاٰخِرَةِ یا تو مفعول لہٗ ہے اور یا مفعول مطلق ہے کیونکہ نَكَّلَ بِهٖ کے معنے بھی اَخَذَهٗ کے ہی ہوتے ہیں۔ پس اس کے یا تو یہ معنے ہو جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو عذابِ آخرت اور عذابِ اُولیٰ میں مبتلا کرنے کے لئے پکڑا یا بُری طرح پکڑا۔ آخرت کے لحاظ سے بھی اور اُولیٰ کے لحاظ سے بھی۔

یہاں بھی وہی نتیجہ نکالا گیا ہے جو اسلامی غلبہ کی پیشگوئی سے نکالا گیا تھا کہ موسیٰ ؑ کی جیت سے نہ صرف وہ پیشگوئی پوری ہوگئی جو موسیٰ ؑ کے غلبہ کے متعلق تھی بلکہ اس پیشگوئی کے ظہور سے قیامت کا ثبوت بھی مل گیا کیونکہ یہ دونوں پیشگوئیاں آپس میں وابستہ و پیوستہ تھیں جب ایک ناممکن بات مخالف حالات کے باوجود پوری ہوگئی تو اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دوسری بات بھی ایک دن پوری ہو جائے گی۔

درحقیقت ہر نبی جو اس دنیا میں آیا ہے اُس کا خدا تعالیٰ پر ایمان پیدا کرنے کے بعد مقدّم کام یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں قیامت کے متعلق ایمان اور یقین پیدا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے غلبہ اور اپنی کامیابی کی پیشگوئی کو قیامت کے ساتھ جوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں مخالف حالات کے باوجود ایک دن تم پر غالب آؤں گا اور میرا یہ غلبہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ قیامت کے متعلق میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بھی ایک دن پورا ہو جائے گا کیونکہ میرا کام مُردہ روحوں کو زندہ کرنا ہے جو بظاہر حالات بالکل ناممکن دکھائی دیتا ہے اگر یہ زندگی ایک دن پیدا ہوگئی اگر یہ رُوحانی مردے ایک دن زندہ ہو گئے اور اگر یہ ناممکن حالات ایک دن ممکن نظر آنے لگے تو تمہیں یقین کر لینا چاہیے کہ اگلے جہان کی زندگی کے متعلق جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ بھی بالکل صحیح اور درست ہے۔ کیونکہ اگر مردہ روحیں اس جہان میں زندہ ہو سکتی ہیں تو اگلے جہان میں بھی مردے زندہ ہو سکتے ہیں۔ اس نظارہ کو دیکھنے کے بعد قیامت پر یقین لانا بالکل آسان ہو جاتا ہے اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس خدا کی قدرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اس جہان میں

بعث روحانی کر دے وہ اگلے جہان میں بھی مردہ کو زندہ کر سکتا ہے۔

فرعون کا موسیٰ علیہ السلام کے مقابل اس دنیا میں عذاب میں گرفتار ہونا اس کے آخرت میں عذاب میں مبتلا ہونے کی ایک دلیل پس فرماتا ہے فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ۔اللہ تعالیٰ نے اُس کو آخرت کے عذاب سے بھی پکڑا اور دنیا کے عذاب سے بھی پکڑا۔ یہاں خدا تعالیٰ نے یَاْخُذُهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کو آخرت کے عذاب سے پکڑے گا بلکہ اَخَذَهُ اللّٰهُ فرمایا یعنی اللہ تعالیٰ نے اُسے نکالِ آخرۃ دینے کے لئے پکڑا جس کے معنے درحقیقت یہی ہیں کہ اس عذابِ اُولیٰ نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ مرنے کے بعد زندہ بھی ہوگا اور اُسے آخرت کا عذاب بھی دیا جائے گا۔ ماضی کے لفظ سے قیامت کی موجودگی کی دلیل بیان کی گئی ہے اسی لئے آخرۃ کو پہلے رکھا اور اولیٰ کو بعد میں رکھا جس میں یہی اشارہ ہے کہ اس عذاب اُولیٰ نے ثابت کر دیا ہے کہ فرعون زندہ بھی ہوگا اور اُسے عذابِ آخرت میں بھی گرفتار کیا جائے گا۔

گویا بتایا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کی یہ پہلی مثال نہیں کہ تم اسے اتفاق قرار دے دو بلکہ ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ جب بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی نبی آیا ہے ناممکن حالات میں اُس نے غلبہ حاصل کیا ہے غلبہ کے سامان اُسے حاصل نہیں ہوتے۔ طاقت اُس کے پاس نہیں ہوتی۔ مال اُس کے پاس نہیں ہوتا۔ جمعیت اس کے پاس نہیں ہوتی مگر پھر بھی خدا تعالیٰ اُسے غالب کر دیتا ہے اور اُس کے ہاتھ سے قوموں کا احیاء کرتا ہے۔ یہ دلیل ہوتی ہے اس بات کی کہ جب مخالف حالات میں اِس جگہ روحانی احیاء ہو گیا تو موت کے بعد بھی اِحیاء ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ سب کو زندہ کر دے گا۔ جس خدا نے مردہ دلوں اور مردہ روحوں کو اس جہان میں ناممکن حالات میں زندہ کر دیا کیا وہ خدا یہ طاقت نہیں رکھتا کہ مردہ جسموں کو بظاہر ناممکن حالات میں زندہ کر دے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو آج کل کے مفکّر کیا کرتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ سوال نہایت اہم ہے۔ وہ سوال یہ کیا کرتے ہیں کہ کسی ایک چیز سے دوسری چیز کا نتیجہ نکال لینا منطقی طور پر درست نہیں ہے۔ اگر ہم کسی کے متعلق یہ کہیں کہ وہ بہت بڑا عالم ہے تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکل آئے گا کہ وہ کرسی بھی بنا سکتا ہے یا کُوچ بھی تیار کر سکتا ہے؟ وہ کہتے ہیں اگر تم ثابت بھی کر دو کہ خدا تعالیٰ نے بعض غیب کی خبریں دیں اور وہ پوری ہو گئیں تو اس سے اتنا ہی نتیجہ نکلے گا کہ جو خبریں دی گئی تھیں وہ پوری ہو گئیں یہ کس طرح نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قیامت بھی آ جائے گی اِن دو باتوں کا تو آپس میں کوئی جوڑ اور تعلق ہی نہیں۔ اُن کی یہ دلیل واقعہ میں اہم ہے اور جس حد تک وہ بات بیان کرتے ہیں اُس حد تک ہمیں اُس کی صحت تسلیم کرنے سے کوئی انکار نہیں۔ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کسی ایک صفت

سے دوسری صفت کا نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا جب تک وہ دونوں آپس میں لازم وملزوم نہ ہوں یا سابق مسبوق کی حیثیت اُن میں نہ پائی جاتی ہو یا سبب اور مسبب کے طور پر وہ دونوں اکٹھی نہ ہوں یعنی یا تو یہ ہو کہ جہاں ایک بات پائی جاتی ہو وہاں لازماً دوسری بات بھی پائی جانی چاہیے تب بے شک ایک بات کو دوسری بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور یا پھر دونوں باتیں آپس میں ایسی مشابہ ہوں کہ ایک بات کی موجودگی دوسری بات کا یقین دلانے کے لئے بالکل کافی ہو۔ مثلاً یہ کہنا کہ جب ایک شخص عالم ہے تو وہ کُرسی بھی بنا سکتا ہے یا کُوچ بھی تیار کر سکتا ہے بیشک بے وقوفی ہے کیونکہ ان دونوں باتوں میں ایسی کوئی نسبت نہیں پائی جاتی۔ لیکن اگر ایک شخص ہم کو ایک انگریزی کتاب پڑھ کر سنائے اور ہم اس کے متعلق کہہ دیں کہ وہ دوسری انگریزی کتاب بھی پڑھ سکتا ہے اور وہ آگے سے کہہ دے کہ تم یہ نتیجہ کس طرح نکال سکتے ہو تو سب لوگ ہنس پڑیں گے کہ جب اُس نے ایک انگریزی کتاب کو پڑھ لیا تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ دوسری کتاب بھی پڑھ سکے گا بالکل درست اور طبعی نتیجہ ہے اس میں خلاف عقل کون سی بات ہے یا اگر کوئی شخص اردو کی کوئی کتاب پڑھ سکتا ہے اور ہم اس کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ وہ دوسری کتاب بھی جو اردو میں ہے پڑھ سکتا ہے تو یہ بالکل جائز ہوگا کیونکہ دونوں چیزوں میں آپس میں ایسی مشابہت پائی جاتی ہے کہ ایک بات کی موجودگی کی وجہ سے دوسری بات کا انکار ہی نہیں ہوسکتا۔

قیامت کے ثبوت کے لئے تین ثبوت اب ہم دیکھتے ہیں کہ قیامت کے مشابہ کون کون سی چیز ہے۔

قیامت کے لئے پہلی اور دوسری دلیل یعنی خدا تعالیٰ کی صفت خلق سو اس بارہ میں سب سے پہلی چیز جو قیامت سے مشابہت رکھتی ہے صفتِ خلق ہے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خدا تعالیٰ خلق کرتا ہے خواہ اُس نے سابق میں خلق کیا ہو یا اب خلق کیا ہو تو بہر حال یہ ماننا پڑے گا کہ جو ہستی ایک دفعہ خلق کر سکتی ہے وہ دوسری دفعہ بھی کر سکتی ہے۔ سوال صرف یہ رہ جائے گا کہ آیا اُس نے کہا بھی ہے یا نہیں کہ میں دوبارہ خلق کروں گا۔ اگر اُس نے کہہ دیا ہو کہ میں دوبارہ بھی خلق کروں گا تو بات ختم ہو جاتی ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ جو خدا ایک دفعہ پیدا کر سکتا ہے وہ دوسری دفعہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ پس اگر ہم ثابت کر دیں کہ خدا تعالیٰ اس جہان میں خلق کرتا ہے تو چونکہ خلق قیامت کے مشابہ چیز ہے اس لئے یہ دلیل اس بات کو ثابت کر دے گی کہ قیامت کا عقیدہ بھی درست ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس خلق کے مشابہ کوئی اور خلق ہو جو ویسی ہی مستبعد اور تعجب انگیز ہو جیسے یہ خلق مستبعد اور تعجب انگیز ہے تو جو خدا اس خلق کے مشابہ خلق کر سکے گا اس کے متعلق ہمیں ماننا پڑے گا کہ اگر وہ دعویٰ کرے تو وہ قیامت کے دن بھی ایک نئی خلق پر قدرت رکھتا ہے کیونکہ اُس نے دکھا دیا کہ وہ ویسی ہی خلق اس دنیا میں کر سکتا ہے

اور جب اُس نے اپنی قدرت اور طاقت اور جلال کا ثبوت اِسی دنیا میں اُس خلق کے مشابہ ایک اَور خلق سے دے دیا ہے تو ہمیں ایمان لانا پڑے گا کہ اتنی بڑی طاقت رکھنے والے خدا نے جب کہا ہے کہ میں اگلے جہان میں بھی ایک خلق کروں تو ضرور اُس نے سچ کہا ہے اتنی بڑی طاقت اور قوت رکھنے کے بعد اُسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

قیامت کے ثبوت کے لئے تیسری دلیل یعنی خدا تعالیٰ کا علم تام تیسری چیز علم تام ہے۔ اگر ثابت ہو جائے کہ خدا تعالیٰ کو علم تام حاصل ہے تب بھی مسئلہ بالکل حل ہو جائے گا کیونکہ جو ہستی کسی چیز کے متعلق علم تام رکھتی ہو وہ اسے ہر وقت بنا سکتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتب میں تحریر فرمایا ہے کہ لوگ پوچھتے ہیں خدا تعالیٰ نے دنیا کس طرح بنائی ہے؟ آپ فرماتے ہیں اگر تمہیں دنیا کی پیدائش کے متعلق علم تام حاصل ہو جائے تو پھر تم میں اور خدا میں فرق کیا رہ جائے۔ پھر تم بھی آسمان اور زمین اور چاند اور سورج اور ستارے بنانے لگ جاؤ۔ جس شخص کو پتہ ہو کہ میز اس طرح بنتا ہے کرسی اس طرح تیار ہوتی ہے۔ ہتھوڑا اس طرح چلایا جاتا ہے۔ تیشے کا اس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ بہرحال میز اور کرسی کو بنا لے گا اور اس کے لئے یہ کام کرنا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ (سرمہ چشمہ آریہ، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۲۲۹، ۲۶۳، ۲۶۹) پس اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خدا تعالیٰ کو مخلوق کے متعلق علم تام حاصل ہے تو اس کے بعد یہ کہنا کہ وہ دوبارہ لوگوں کو زندہ نہیں کر سکتا یا دوبارہ ان کو پیدا نہیں کر سکتا ایک پاگل پن کی بات ہوگی۔ یہ تین چیزیں ہیں جو قیامت کے ثبوت کے لئے ضروری ہیں اور یہ تینوں چیزیں مل کر قیامت کا ثبوت بنتی ہیں۔ یعنی یا تو یہ ثابت ہو جائے کہ دنیا میں جس قدر مخلوق ہے سب خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے تو پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے گا کہ جو خدا اس جہان میں پیدا کر سکتا ہے وہ اگلے جہان میں بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اور یا پھر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اسی قسم کا مشابہ احیاء اس دنیا میں بھی کیا کرتا ہے۔ جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ ایک قسم کا احیاء اس دنیا میں بھی کیا کرتا ہے تو اگلے جہان کے متعلق بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہاں اللہ تعالیٰ احیاء کر سکتا ہے اور پھر تیسری بات یہ ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خدا تعالیٰ کو مخلوق کے متعلق علم تام حاصل ہے تو اس کے بعد بھی قیامت پر ایمان لانا پڑے گا۔ کیونکہ جسے مخلوق کا علم تام حاصل ہو۔ جو اس کی جزئیات تک سے واقف ہو۔ جو اس کی باریکیوں سے آگاہ ہو وہ یقیناً دوبارہ بھی مخلوق کو پیدا کر سکتا ہے۔

یہ تین چیزیں ہیں جو مل کر قیامت کا ثبوت بنتی ہیں۔ اور یہی تینوں چیزیں قرآن کریم میں ہمیشہ اکٹھی پیش کی جاتی ہیں تاکہ قیامت کا انکار نہ ہو سکے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ چونکہ خدا تعالیٰ نے فلاں بات کہی تھی اور وہ بات پوری ہو گئی اس لئے قیامت بھی آ جائے گی۔ اگر صرف اتنی بات کہی جائے تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ دلیل ناکافی ہوگی۔ یا

اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ پیشگوئی کے مطابق فلاں مقدمہ میں فتح ہوگئی یا فلاں شخص کے گھر لڑکا پیدا ہوگیا اس لئے یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ قیامت بھی ہوگی تو تسلیم کریں گے کہ یہ قیامت کی کوئی دلیل نہیں اور یقیناً زید کے گھر لڑکا ہونے یا کسی مقدمہ میں کامیابی حاصل ہوجانے کا منطقی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا ہے کہ قیامت بھی آنیوالی ہے کیونکہ یہ باتیں آپس میں لازم ملزوم نہیں ہیں اور نہ اِن کا قیامت سے کوئی براہ راست تعلق ہے۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ تو بالکل اور ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا ہے اور جو خدا ایک دفعہ پیدا کرسکتا ہے وہ دوسری دفعہ بھی پیدا کرسکتا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس احیاء کے بالکل مشابہ اس دنیا میں ایک روحانی احیاء بھی کیا کرتا ہے پس جو خدا ایک مشابہ خلق کرسکتا ہے وہ اگلے جہان میں بھی نئی خلق پر قدرت رکھتا ہے۔ پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو علمِ تام حاصل ہے اور مخلوق کے تمام اسرار کو وہ جانتا ہے۔ اور جب یہ کیفیت ہے تو مخلوق کا پیدا کرنا اس کے لئے کون سا مشکل کام ہے۔ قرآن کریم نے قیامت کے ثبوت میں یہی طریق اختیار کیا ہے۔ بے شک دوسری کتابوں پر یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ وہ قیامت کا ثبوت پیش نہیں کرتیں مگر قرآن کریم پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم جہاں بھی قیامت کا ذکر کرتا ہے وہاں پہلی خلق کو اس کے ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے چنانچہ سورۂ یٰسٓ میں ہی جب اس سوال کا ذکر کیا گیا کہ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَ ھِیَ رَمِیْمٌ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ قُلْ یُحْیِیْھَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَھَآ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ؕ وَ ھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُ ۔ ِالَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْہُ تُوْقِدُوْنَ ۔ اَوَ لَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَھُمْ ؕ بَلٰی ٭ وَ ھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ (یٰس: ۷۹ تا ۸۲) یہاں بھی پہلی خلق اور علمِ تام سے قیامت کا نتیجہ نکالا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو خدا ایک دفعہ پیدا کرسکتا ہے اور کل علم مخلوق کا رکھتا ہے کیا اُس کی طاقت اور قدرت میں یہ بات نہیں کہ وہ دوبارہ بھی پیدا کردے۔ گویا قیامت کی ایک دلیل اللہ تعالیٰ یہ دیتا ہے کہ وہ کہتا ہے تمہاری آنکھوں کے سامنے مخلوق موجود ہے تم بتاؤ یہ کس نے پیدا کی ہے۔ جب خدا نے اس تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے تو تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ دوبارہ پیدا نہیں کرسکتا۔

قیامت کی دوسری دلیل کے طور پر اللہ تعالیٰ اُس نشاۃ روحانیہ کو پیش کرتا ہے جو انبیاء کے ذریعہ اس دنیا میں ہوتی ہے اور بتاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مخالف بلکہ ناممکن قرار دینے والے حالات میں مُردہ روحوں کو اس دُنیا میں زندہ کردیتا ہے تو تم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگلے جہان میں بھی وہ زندگی بخش سکتا ہے۔ اُس کے لئے یہ کام ناممکن نہیں ہے۔

تیسری دلیل علم کامل کی ہے۔ علم کامل کے بعد بھی کسی چیز کا بنانا کوئی مشکل امر نہیں رہتا۔ جس شخص کو پتہ ہو کہ

حلوا اس طرح بنتا ہے کہ پہلے سُوجی لی جائے پھر اُسے گھی میں بُھونا جائے پھر اُس میں میٹھا ملایا جائے اور پانی میں ملا کر آگ پر اُسے دم دیا جائے وہ جب چاہے گا حلوا بنا لے گا اُسے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اِسی طرح جب خدا تعالیٰ کو مخلوق کے متعلق علمِ تام حاصل ہے اور وہ کائنات کے تمام اسرار جانتا ہے تو اس کے لئے مردوں کو زندہ کر دینا کون سا مشکل کام ہے جس نے یہ کام ایک دفعہ کر لیا وہ اُسے دوسری دفعہ بھی کر لے گا۔

غرض یہ تین دلیلیں ہیں جو اللہ تعالیٰ قیامت کے ثبوت میں دیا کرتا ہے اس لئے لوگوں کا یہ اعتراض کرنا کہ ایک غیب کی خبر پوری ہونے سے دوسری خبر کی صداقت کا ہم کس طرح نتیجہ نکال سکتے ہیں صحیح نہیں۔ اگر صرف ایک غیب کی خبر سے دوسری غیب کی خبر کو سچّا قرار دیا جاتا تو بے شک یہ اعتراض ہو سکتا مگر ہمارا تو یہ دعویٰ ہی نہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا خلق پر قادر ہونا۔ اُس کا اِسی دنیا میں اِحیاءِ موتیٰ کر دینا اور پھر مخلوق کے متعلق علمِ تام رکھنا یہ قیامت کی دلیل ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ چونکہ لیکھرام پیشگوئی کے مطابق مر گیا اس لئے یہ ثبوت ہو گا اس بات کا کہ قیامت بھی آنے والی ہے۔ یا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے فلاں بیٹے کے متعلق پیشگوئی کی تھی اور وہ پوری ہو گئی ہے اِس لئے یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ قیامت بھی آنے والی ہے۔ ہم قیامت کے ثبوت میں اِن تین باتوں کو پیش کرتے ہیں جن کو تفصیل کے ساتھ میں بیان کر چکا ہوں۔ اِن پیشگوئیوں کے پورا ہونے سے اللہ تعالیٰ کا صرف جزئیات کے متعلق علم ثابت ہوتا ہے علمِ کامل ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب اِحیاءِ موتیٰ کی صفت ظاہر ہو تو وہ بے شک قیامت کا ثبوت ہوتی ہے کیونکہ لوگوں کے سامنے ایک نمونہ موجود ہوتا ہے کہ مردہ روحیں نبی کے فیضِ صحبت اور اُس کی قوتِ قدسیہ سے زندہ ہو گئیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس خدا نے اس دنیا میں مردہ روحوں کو زندہ کر دیا ہے وہ اگلے جہان میں بھی زندہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یا پھر دوسری دلیل خلق کی ہے جو خدا ایک دفعہ مخلوق کو پیدا کر سکتا ہے اس کے لئے یہ کون سی مشکل بات ہے کہ وہ دوبارہ اُسی مخلوق کو پیدا کر دے۔ تیسری چیز علمِ کامل ہے۔ جس خدا کو تمام کائنات کا علمِ تام حاصل ہے اور وہ کائنات کے اسرار کو جانتا ہے اس کے لئے بھی مخلوق کا دوبارہ پیدا کرنا کوئی مشکل نہیں۔ غرض یہ تین دلیلیں ہیں جو قرآن کریم قیامت کے ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے اور جن کو کوئی شخص ردّ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ پس بے شک آج کل تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے جو سوال کیا جاتا ہے وہ درست ہے مگر جہاں تک اُن کا یہ خیال ہے کہ قرآن کریم نے بھی اسی رنگ کو اختیار کیا ہے وہ غلط ہے۔ ہم اس بات سے کلیۃً متفق ہیں کہ بعض پیشگوئیاں یقیناً ایسی ہوتی ہیں جن کو قیامت کے ثبوت کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہم اس امر کے اظہار سے بھی نہیں رہ سکتے کہ جہاں یہ تین باتیں مل جائیں یا ان تین باتوں

میں سے کوئی ایک بات ہی بیان کر دی جائے وہاں یقینی اور قطعی طور پر یہ قیامت کی دلیل بن جاتی ہیں کیونکہ یہ تینوں دلیلیں ایسی ہیں جو قیامت کے ساتھ لازم ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے جو بات بھی ثابت ہو جائے وہ قیامت کو ضرور ثابت کر دے گی۔ پس یہ اعتراض جو آجکل کے مفکرین کی طرف سے کیا جاتا ہے بالکل غلط ہے اور قرآن کریم کی حقیقت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿٢٦﴾

یقیناً اس (واقعہ) میں اس کے لئے جو خدا سے ڈرتا ہے ایک بڑی عبرت (کا سامان) ہے

حل لغات۔ اَلْعِبْرَةُ اَلْعِبْرَةُ کے معنے ہیں (۱) اَلْاَصْلُ الَّذِیْ تُرَدُّ اِلَیْهِ النَّظَائِرُ۔ ایسا اصل جس کی طرف اس کے امثال کو لوٹا کر ان کی حقیقت و اصلیت معلوم کی جا سکے (۲) اَلنَّظْرُ فِی الْاَحْوَالِ حالات میں غور و فکر کر کے اُن کی حقیقت کو پانا (۳) اَلْعِظَةُ یُتَّعَظُ بِهَا ایسی بات جس سے نصیحت حاصل کی جا سکے (اقرب) اس کی جمع عِبَرٌ آتی ہے۔

تفسیر۔ **عبرۃ سے مراد** عبرت سے مراد یہ ہے کہ اِس سے اُخروی زندگی کی دلیل دی جا سکتی ہے۔ ایک نہیں متعدد مثالیں ایسی پائی جاتی ہیں کہ اُخروی زندگی کو دنیوی روحانی اِحیاء سے ملا کر خدا تعالیٰ کے انبیاء نے پیش کیا ہے اور ناممکن حالات میں اِحیاء کر کے اُخروی زندگی کا ثبوت دیا ہے پس اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں رکھتا ہو اور ضد اور تعصّب کا مادہ اُس میں نہ ہو تو وہ اِس سے اُخروی زندگی پر یقین اور ایمان اپنے دل میں پیدا کر سکتا ہے۔ عِبْرَةٌ عَبُوْرٌ سے نکلا ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو کہتے ہیں۔ پس عِبْرَةٌ کے معنے ہوتے ہیں ایک بات سے دوسری کا نتیجہ نکالنا۔ گویا وہ پُل کی طرح ایک طرف سے دوسری طرف عبور کا سامان کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ دلیل بھی ایسی ہے جو انسانی دماغ کو ضرور اس طرف لے جاتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی ایک قیامت ہونے والی ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ﴿٢٨﴾

کیا تمہیں پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کو جسے اس (خدا) نے بنایا ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے کیا تمہاری پیدائش زیادہ مشکل اور سخت ہے اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا یا آسمان و زمین کی

پیدائش زیادہ مشکل ہے۔

اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا میں السماء سے مراد اجرام فلکی یہاں اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا سے مراد صرف آسمان ہی نہیں جیسا کہ اگلی آیات سے ظاہر ہے کہ ایک طرف تو اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا کہا اور دوسری طرف تشریح کرتے ہوئے اس میں زمین کو بھی شامل کر لیا۔ پس درحقیقت یہاں سماء سے مراد نظامِ سماوی ہے اور اس کی پیدائش کی اہمیت کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا۔ وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰىهَا۔ وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا۔ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰىهَا۔ وَ الْجِبَالَ اَرْسٰىهَا۔ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ گویا جو تشریح کی گئی ہے اُس میں اجرام فلکی۔ بلندی۔ جَوّ اور زمین وغیرہ سب شامل ہیں۔ پس یہاں سماء سے مراد نظامِ سماوی ہے خالی وہ سماء مراد نہیں جو زمین کے مقابلہ میں ہوتا ہے بلکہ وہ سماء مراد ہے جس میں زمین بھی شامل ہے۔

فرماتا ہے کہ کارخانۂ عالم جس کا ہم اب ذکر کرنے والے ہیں تم سے بہت زیادہ اہم اور پیچیدہ ہے۔ انسان درحقیقت اپنے متعلق دھوکا کھا جاتا ہے اور وہ یہ کہ بظاہر وہ یہ خیال کرتا ہے کہ نظامِ عالم اور انسان کو آپس میں مشابہ کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے اور ان میں ایک دوسرے کی دلیل کس طرح بن سکتا ہے۔ انسان تو بڑا عقلمند۔ سمجھدار اور غور و فکر کا ملکہ اپنے اندر رکھنے والا ہے اور سورج چاند وغیرہ میں کوئی سوچ سمجھ نہیں۔ اس طرح وہ خیال کرتا ہے کہ یہ دلیل ایسی دلیل ہے جس میں ایک ادنیٰ چیز کو اعلیٰ چیز سے مشابہت دی جاتی ہے اور ادنیٰ چیز کو ثابت کر کے اعلیٰ چیز کے وجود کا استدلال کیا جاتا ہے مگر یہ غلط ہے درحقیقت پیدائشِ عالم کے سلسلہ سے استدلال اعلیٰ سے ادنیٰ کا استدلال ہے نہ کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کا استدلال۔ اس میں استدلال بالاولیٰ ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان کو اپنی ذات کے متعلق یہ دھوکا لگ جاتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے میں بڑا سوچنے والا اور سمجھنے والا اور تدبر کرنے والا انسان ہوں اس لئے اپنی ذات کی ابتداء کی طرف اُس کا ذہن نہیں جاتا۔ انسان اپنے آپ کو مکمل سمجھتا اور دنیا میں خدا تعالیٰ کا قائم مقام سمجھتا ہے اِس لئے سبب اور مسبب کی جو دلیل ہے اس کی طرف اپنی پیدائش کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ذہن نہیں جاتا۔ اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیشہ نظامِ عالم کو اپنی ہستی کے ثبوت میں پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ دیکھو کیا تمہیں اس عظیم الشان نظام سے یہ نظر نہیں آتا کہ اس میں ایک خالق کا ہاتھ کام کر رہا ہے اور ہر ٹکڑہ دوسرے ٹکڑے کا محتاج ہے کوئی چیز اپنی ذات میں منفرد نہیں ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ دنیا اس طرح بنی ہے کہ ذرّے آپس میں جُڑ گئے اور اُن ذرّوں کے آپس میں ملنے سے آہستہ آہستہ یہ عظیم الشان دنیا تیار ہو گئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم نے مان لیا دنیا مختلف ذرّات کے مجموعہ سے بنی ہے مگر اُن ذرّوں کے آپس میں ملنے سے یہ کس طرح ہو گیا کہ ہمیں آج یہاں ضرورت پیش آتی

ہے تو میلوں میل پر اُس ضرورت کو پورا کرنے کا سامان موجود ہوتا ہے بیشک ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ ایٹمز Atoms کے ملنے سے یہ دنیا بنی لیکن اگر اس دنیا کا کوئی خدا نہیں تو یہ کس طرح ہو گیا کہ وہ ذرّے اسی طرح آپس میں ملے جس طرح بنی نوع انسان کو ضرورت تھی اور اسی جگہ ملے جہاں انسان کو کوئی ضرورت پیش آنے والی تھی۔ ذرّوں کا آپس میں ملنا اتفاق ہو سکتا ہے لیکن اُن ذرّوں کا آپس میں مل کر ہر انسانی ضرورت کو پورا کرنے کا سامان مہیا کر دینا یہ اتفاق نہیں ہو سکتا بلکہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کارخانۂ عالم کے پیچھے کوئی اور ہستی کام کر رہی ہے۔ ہم اگر ایک چمڑا پڑا ہوا دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ چمڑا یہاں اتفاقی طور پر آ گیا لیکن اگر ہمیں ایک بوٹ دکھائی دیتا ہو جو اس چمڑے سے بنا ہوا ہو۔ پھر ہمیں وہی چمڑا کہیں صوفوں پر لگا ہوا نظر آئے۔ کہیں کرسیوں اور زینوں پر لگا ہوا دکھائی دے تو ان ساری چیزوں کو ہم اتفاق نہیں کہہ سکتے۔ پس نظامِ کلی اتفاقی نہیں ہوتا۔ جزئی چیز کو بے شک اتفاقی کہا جا سکتا ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں خدا تعالیٰ نے ایک طرف آنکھ بنائی اور اُس آنکھ میں یہ مادہ رکھا کہ وہ بغیر روشنی کے نہیں دیکھ سکتی تو دوسری طرف کروڑوں کروڑ میل پر سورج بنا دیا تا کہ آنکھ اس روشنی کے ذریعہ اردگرد کی چیزوں کو دیکھ سکے۔ اب بھلا اس کو کون اتفاق کہہ سکتا ہے؟ یہی حال اور ضروریاتِ انسانی کا ہے کوئی انسانی ضرورت ایسی نہیں جو طبعی ہو اور اُس کو پورا کرنے کے سامان اللہ تعالیٰ نے پیدا نہ فرمائے ہوں۔ بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کو پورا کرنے کے سامان اللہ تعالیٰ نے انسانی نفس میں ہی رکھ دئے ہیں۔ بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کو پورا کرنے کے سامان اللہ تعالیٰ نے انسان کے اردگرد رکھ دئے ہیں اور بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کو پورا کرنے کے سامان اللہ تعالیٰ نے کروڑوں کروڑ میل پر پیدا کر دیئے ہیں۔ بہرحال ہر انسانی ضرورت کو پورا کرنے کے سامان اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں پیدا کئے ہوئے ہیں اور یہ نظام اپنی ذات میں ایسا مکمل ہے کہ اس ساری تصویر کو ملا کر کوئی شخص یہ خیال تک بھی نہیں کر سکتا کہ یہ سب کچھ اتفاقی ہو گیا ہے۔ پس فرماتا ہے تم اس نظام سماوی اور ارضی کو دیکھو جو خلق میں تمہاری اپنی پیدائش سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ تم کسی ایک چیز کے متعلق کہہ سکتے ہو کہ وہ اتفاقی ہو گئی۔ تم دو کے متعلق کہہ سکتے ہو کہ وہ اتفاقی ہو گئیں لیکن تم اس سارے نظام کو کس طرح اتفاقی کہہ سکتے ہو کہ رَفَعَ سَمۡکَهَا فَسَوّٰىهَا۔ وَ اَغۡطَشَ لَیۡلَهَا وَ اَخۡرَجَ ضُحٰىهَا۔ وَ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا۔ اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا وَ مَرۡعٰىهَا۔ وَ الۡجِبَالَ اَرۡسٰىهَا۔ مَتَاعًا لَّكُمۡ وَ لِاَنۡعَامِكُمۡ (النازعات: ۲۹ تا ۳۴)۔ نظام کی یہ ساری تصویر جو ہم تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں اس پر غور کرو اور بتاؤ کہ کیا یہ سب چیزیں اتفاقی ہو سکتی ہیں؟ میں سمجھتا ہوں دنیا کے عجیب سے عجیب فلسفہ پر بھی اگر کوئی شخص اپنے علم کی بنیاد رکھتا ہو تو وہ اسے اتفاقی نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ اُسے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کارخانۂ عالم کے پیچھے ضرور کوئی اور ہستی

کام کر رہی ہے جو تمام ضروریات انسانی کو جانتی اور پھر ان کو پورا کرنے کے سامان بھی مہیا کرتی ہے۔

خدا تعالیٰ کے خالق ہونے پر نظام عالم کی شہادت پس فرماتا ہے تم اس نظام پر غور کرو۔ تم اپنے متعلق خیال کر سکتے ہو کہ ہم اپنے آپ خالق ہیں مگر تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نظام کا خالق اور کوئی نہیں۔ اس لئے ہم اپنی خالقیت منوانے کے لئے تمہارے سامنے اسی نظام کو پیش کرتے ہیں تم اس کو اچھی طرح دیکھو اور پھر سوچو کہ کیا تمہارا بھی کوئی خالق ہے یا نہیں۔ گویا ایک نہایت ہی لطیف پیرایہ میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کیا گیا۔ اگر انسان کو اپنی ذات کی طرف توجہ دلائی جاتی اور کہا جاتا کہ خدا نے تمہیں زبان دی ہے۔ کان دئے ہیں۔ آنکھیں دی ہیں۔ دل دیا ہے۔ دماغ دیا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ تمہارا کوئی خالق ہے تو وہ انکار کر دیتا اور کہتا اِس کا فلاں سبب ہے اور اُس کا فلاں سبب ہے۔ بیشک ہم گفتگو کرتے ہوئے عام طور پر یہی مثال دیا کرتے ہیں مگر قرآن کریم چونکہ مکمل بات کرتا ہے۔ اِس لئے اُس نے کارخانۂ عالم کو اپنی خالقیت کے ثبوت میں پیش کیا ہے کیونکہ دوسری چیز کے متعلق سوچنا اور غور کرنا آسان ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سِرّ دلبراں

گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

(مثنوی مولوی معنوی مطبع منشی نول کشور دفتر اول صفحہ ۸)

اپنے متعلق سوچنا اور غور کرنا اُتنا آسان نہیں ہوتا جتنا دوسری چیز کے متعلق غور کرنا آسان ہوتا ہے یہی حکمت ہے جس کی بناء پر قرآن کریم نے بجائے یہ طریق اختیار کرنے کے کہ تم غور کرو خدا نے تمہیں آنکھیں دی ہیں۔ دل دیا ہے۔ دماغ دیا ہے۔ کان دئے ہیں۔ ہاتھ اور پاؤں دئے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ تمہارا کوئی خالق ہے یہ طریق اختیار کیا ہے کہ وہ انسان کے سامنے نظامِ عالم کی گواہی پیش کرتا ہے تا کہ اس کے متعلق سوچنا آسان ہو اور وہ لوگ جو ہستی باری تعالیٰ کے قائل نہیں ٹھنڈے دل سے اِس معاملہ پر غور کر سکیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات تو بے شک ہے مگر نکلا اسی نظام سے ہے اور وُہ اس سارے نظام کا ایک ادنیٰ پُرزہ ہے۔ وہ اشرف ہو گیا ہے اپنی دماغی ترقی کیوجہ سے ورنہ جہاں تک اُس کی پیدائش کا سوال ہے وہ اپنی پیدائش کے لحاظ سے اس سارے نظام کا ایک جُزو اور پُرزہ ہے اور خلقت کے لحاظ سے زمین و آسمان کی پیدائش کے سامنے بالکل غیر اہم ہے پس جہاں تک خالی پیدائش کا سوال ہے۔ پیدائشِ عالم زیادہ اہم ہے اور پیدائش انسان اُس کے مقابلہ میں بہت حقیر چیز ہے۔ بعد میں کوئی چیز ارتقاء حاصل کر کے بڑی ہو جائے تو اِس سے

نفسِ مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔ پس چونکہ پیدائشِ عالم پیدائشِ انسانی کی نسبت زیادہ اہم ہے اس لئے اللہ تعالیٰ پیدائشِ عالم کو پیش کر کے بتاتا ہے کہ جس نے اتنا بڑا کارخانہ بنالیا وہ تم کو کیوں نہیں بنا سکتا۔ یہ دلیل پیش کر کے اللہ تعالیٰ نے ضمنی طور پر دو ۲ اور اہم مسائل کا بھی فیصلہ کر دیا ہے ایک حیات بعد الممات کا اور دوسرے اسی عالم میں اُس احیاء روحانی کا جو انبیاء کے ذریعہ ہوتا ہے۔

پیدائش عالم کا مسئلہ حیات بعد الموت کے لئے ایک دلیل حیات بعد الممات کا تو اس رنگ میں ثبوت دیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا کارخانۂ عالم بنا دیا ہے جو تمہاری پیدائش سے بھی زیادہ اہم ہے اور جس نظام کا تم بھی ایک جزو ہو تو بہرحال تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ دوسرے عالم میں بھی پیدائش کر سکتا ہے۔ گویا یا تو یہ تسلیم کرو کہ یہ نظام خود بخود ہے اس کے پیچھے کوئی اور ہستی کام نہیں کر رہی اور اگر تم اس نظام کو دیکھ کر اور اس کی باریک در باریک حکمتوں پر غور کر کے یہ ماننے پر مجبور ہو کہ یہ نظام اتفاقی نہیں ہو سکتا بلکہ ایک اَور ہستی اس نظام کی خالق ہے تو تمہیں ماننا پڑے گا کہ جس خدا نے ایک دفعہ یہ سب کچھ بنالیا وہ دوسری دفعہ بھی تم کو بنا سکتا ہے گویا ایک ہی دلیل سے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اپنی ہستی کا ثبوت پیش کر دیا بلکہ حیات بعد الموت کا مسئلہ بھی واضح کر دیا۔ آخر بعض لوگ مرنے کے بعد کسی اَور زندگی کے کیوں قائل نہیں؟ اِسی لئے کہ وہ خیال کرتے ہیں ایسا کب ہو سکتا ہے کہ مر کر انسان زندہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ بتاتا ہے تم تو اس نظام کو ایک حقیر سا پُرزہ ہو۔ تم غور کرو کہ اتنا بڑا کارخانہ کس نے بنایا ہے۔ تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سب کارخانہ خدا نے بنایا ہے۔ جب خدا نے اس دنیا کو بنایا ہے تو جو خدا اتنا بڑا کارخانہ جاری کر سکتا ہے کیا وہ یہ طاقت نہیں رکھتا کہ دوبارہ تم کو پیدا کر دے۔ گویا جس طرح فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى میں عذابِ دنیا کو عذاب آخرت کا ثبوت قرار دیا گیا تھا اسی طرح اِس جہان کی پیدائش کو اگلے جہان کی پیدائش کا ثبوت قرار دیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ جو خدا اس جہان میں تمہیں پیدا کر سکتا ہے وُہ تمہیں اگلے جہان میں بھی پیدا کر سکتا ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اُس نے دوبارہ پیدا کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے یا نہیں؟ اگر وعدہ کیا ہے تو بات ختم ہو جاتی ہے اور یہ سوال نہیں رہتا کہ وُہ کس طرح کرے گا جب اُس نے اس جہان میں اتنا بڑا نظام پیدا کر کے دکھا دیا ہے تو وہ اگلے جہان میں بھی پیدا کر سکتا ہے اُس کے لئے یہ ناممکن بات نہیں۔ گویا پیدائش عالم کا مسئلہ حیات بعد الموت کا بھی ایک رنگ میں ثبوت ہے۔

اسی طرح یہاں روحانی احیاء کا مسئلہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ جس خدا نے تمہاری ادنیٰ ادنیٰ ضرورتوں کو پورا کرنے کا اس قدر سامان کیا ہے کیا اُس خدا کے متعلق تم یہ خیال بھی کر سکتے ہو کہ اُس نے تمہارے روحانی اِحیاء کا کوئی

سامان نہیں کیا ہوگا جب تمہارے جسم کی حفاظت کے لئے جو بہر حال ایک دن فنا ہو جانے والا ہے اللہ تعالیٰ نے اِس قدر سامان پیدا کر دیئے ہیں جن میں سے بعض کروڑوں کروڑ میل پر ہیں تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری روح کی حفاظت کے لئے کیوں سامان نہیں کئے ہوں گے۔ وہ خدا جو عالم کبیر کا نظام ہر جہت سے مکمل رکھتا ہے عالم صغیر کی ضروریات پوری کرنے سے خواہ وہ روحانی ہوں یا جسمانی کس طرح اغماض کر سکتا تھا۔

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۹﴾

(اور) اس کی بلندی کو اونچا کیا ہے پھر اُسے بے عیب بنایا ہے۔

حَلّ لُغَات۔ اَلسَّمْكُ اَلسَّمْكُ مصدر ہے سَمَكَ کا اور اس کے معنے بلند کرنے یا بلند ہونے کے ہوتے ہیں اور سَمْكٌ اسم بھی ہے اس صورت میں اس کے معنے چھت کے یا چھت سے تہ زمین تک کے فاصلے کے ہوتے ہیں اور اس کے معنے کسی چیز کی اونچائی کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) کہتے ہیں سَنَامٌ سامكٌ۔ اونٹ کا اونچا کوہان (تاج) اور موٹاپے کو بھی کہتے ہیں سَمْكَ الْمَنَارَةِ یعنی مینارہ کی گولائی (اقرب) گویا اس کے معنوں میں دو چیزیں پائی جاتی ہیں یا تو فاصلہ ہو اور وہ چیز بہت اونچی ہو اور یا پھر خود وہ چیز قد میں اونچی ہو یا دَل میں موٹی ہو۔ ابن جزی کہتے ہیں اَلسَّمْكُ غِلْظُ السَّمَآءِ وَ هُوَ الْاِرْتِفَاعُ الَّذِیْ بَیْنَ سَطْحِ السِّفْلِ الْاَسْفَلِ الَّذِیْ یَلِیْنَا وَسَطْحُهَا الْاَعْلَی الَّذِیْ یَلِیْ مَا فَوْقَهَا یعنی سَمْك کے معنے آسمان کا دَل ہے اور اس سے مراد آسمان کی وہ بلندی ہے جو آسمان کی نچلی سطح اور اوپر کی سطح کے درمیان ہے (فتح البیان زیر آیت ھذا) اس کے معنوں میں ایک اختلاف بھی ہے اور وہ یہ کہ بعض لُغت والے کہتے ہیں سَمْكٌ کا لفظ خالی بلندی کی طرف اشارہ نہیں کرتا بلکہ اعلیٰ سے اسفل کی طرف جانے کو سَمْكٌ کہتے ہیں۔ اقرب والے نے بھی یہی لکھا ہے کہ مِنْ اَعْلَی الْبَیْتِ اِلٰی اَسْفَلِهٖ لیکن بعض دوسرے ادیب اس کے خلاف نیچے سے اوپر کے معنے کرتے ہیں صاحب کشاف زیر آیت ھذا لکھتے ہیں رَفَعَ سَمْكَهَا اَیْ جَعَلَ مِقْدَارَ ذِهَابِهَا فِیْ سِمْتِ الْعُلُوِّ مَدِیْدًا رَفِیْعًا یعنی نیچے سے اوپر تک اس کا دَل لمبا اور اونچا ہے۔ پس سَمْكٌ نام ہے نیچے سے اوپر کی طرف جانے کا گویا مِنْ اَعْلَی الْبَیْتِ اِلٰی اَسْفَلِهٖ کی بجائے مِنْ اَسْفَلِ الْبَیْتِ اِلٰی اَعْلَاهُ کو سَمْكٌ کہتے ہیں۔ بعض ادیب اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اعلیٰ سے اسفل کی طرف نسبت بتانے کے لئے عربی زبان میں عُمْق کا لفظ پایا جاتا ہے (مفردات) چنانچہ جب عُمْق کا لفظ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد

اوپر سے نیچے کی نسبت ہی ہوتی ہے لیکن جب ہم سَمْكٌ کہتے ہیں تو اس سے مراد نیچے سے اوپر کی طرف جانا ہوتا ہے مگر قرآن کریم سَمْكٌ کا لفظ بیان کرنے کے بعد نیچے سے اوپر کی طرف جانے کی بجائے اُوپر سے نیچے کی طرف آیا ہے چنانچہ آسمان کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا ۔ وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ۔ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰهَا ۔ وَ الْجِبَالَ اَرْسٰهَا ۔ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ۔ یہاں بلندی کی چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے پہلے بیان کیا ہے اور زمین کی چیزوں کو بعد میں بیان کیا ہے۔ پس قرآنی ترتیب کے مطابق ان لوگوں کے معنے زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں جو کہ سَمْك اوپر سے نیچے کی طرف نسبت رکھنے کو کہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ درحقیقت یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہو۔

فَسَوّٰهَا پھر ہم نے اُس کو بے عیب بنایا۔ کہتے ہیں سَوَّى الشَّيْءَ: جَعَلَهٗ سَوِيًّا اَيْ لَا دَاءَ بِهٖ وَلَا عَيْب (اقرب) کسی چیز کو ایسا بنایا کہ اس میں کوئی عیب نہ رہے۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے اگر تم نظامِ عالم پر نظر دوڑاؤ تو تمہیں معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ ساری چیزیں نامکمل رہتیں اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلندیاں نہ بنائی جاتیں۔ اِن بلندیوں نے زمین کے نقائص اور اُس کے عیوب کو ڈھانک دیا ہے اور تمام چیزیں ایک مکمل صورت میں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ سورج اور چاند اور ستارے اور دوسرے بڑے بڑے سیّارے نہ بناتا تو زمین کا قیام بالکل ناممکن ہوتا۔ درحقیقت سورج چاند اور ستاروں کی کشش کی وجہ سے ہی زمین رہنے کے قابل ہوئی ہے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلندی پر ان اجرامِ فلکی کو پیدا نہ کیا جاتا تو وہی زمین جو آج تمہیں بے عیب دکھائی دیتی ہے وہی زمین جو تمہارے کھانے کا سامان پیدا کرتی ہے۔ وہی زمین جو تمہارے لئے پینے کا سامان مہیا کرتی ہے۔ اُسی زمین میں تمہیں سو سو خرابیاں نظر آتیں بلکہ درحقیقت یہ زمین بنی نوع انسان کے رہنے کے قابل نہ ہوتی۔ آسمان ہی ہے جس نے زمین کے عیوب کو ڈھانکا۔ اور وہی بلندیاں ہیں جن سے دن پیدا ہوا جس میں تم کسبِ معاش کے ذرائع اختیار کرتے ہو۔ اور انہی بلندیوں کے نتیجہ میں رات پیدا ہوئی جس میں تم آرام کرتے ہو اور اپنی کھوئی ہوئی طاقتوں کو دوبارہ حاصل کرتے ہو۔ پس اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے آسمان بنایا اور اُس آسمان کو بلندی کی نسبت وسیع کیا۔

فَسَوّٰهَا میں فاء نتیجہ اور ترتیب کے لئے ہے مراد یہ ہے کہ اُس نے بلندی کو بہت اونچا کیا اور پھر اُسے اونچا کر کے اُس کے نتیجہ میں زمین کو بے عیب بنایا۔ گویا فَسَوّٰهَا کی فاء اس مضمون کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ دنیا کا نظام کبھی مکمل نہ ہوتا اگر اس کے اوپر ایک اور نظام قائم نہ ہوتا۔

انسان کا بے عیب ہونا اس کی بلندی اور وصول الی اللہ سے تعلق رکھتا ہے اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کا بے عیب ہونا بھی اُس کی بلندی اور وصول الی اللہ سے تعلق رکھتا ہے۔ دنیا میں خواہ بڑے بڑے صنّاع ہوں۔ بڑے بڑے انجینئر ہوں۔ بڑے بڑے مہندس ہوں یہ دنیا یوں معلوم ہوتی ہے جیسے وحشیوں سے بھری ہوئی ہے نہ انہیں اخلاق کا خیال ہوتا ہے نہ انہیں روحانیت کی طرف توجہ ہوتی ہے نہ انہیں خدا تعالیٰ کی محبت کا احساس ہوتا ہے وہ مادی دنیا اور اس کے لذائذ کی طرف اسی طرح جھکے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح جانور کھانے پینے کی طرف متوجہ رہتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء آتے ہیں تو پھر وہی دنیا جو وحشت و بربریت کا منظر پیش کر رہی ہوتی ہے حسین صورت میں نظر آنے لگتی ہے۔ دلوں میں اخلاص پیدا ہو جاتا ہے۔ آنکھوں میں محبت کی چمک ظاہر ہونے لگتی ہے۔ وہ دل جو کبھی خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے اب اُن میں بھی محبت کی ٹیسیں اُٹھنی شروع ہو جاتی ہیں اور دنیا رہنے کے قابل نظر آنے لگتی ہے۔ اُس وقت وہی فلسفی جو خدا سے دُور ہوتا ہے انبیاء کے نور کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے بڑے بڑے انجینئر اور صناع اور موجد جن کی طاقتیں ضائع ہو رہی ہوتی ہیں پھر صحیح راستوں پر چلنے لگ جاتے ہیں اور اُن کے سارے عیب اور اُن کی ساری کمزوریاں جاتی رہتی ہیں پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر تم دنیا کو بے عیب دیکھنا چاہتے ہو تو آسمان کی ضرورت سے کبھی انکار مت کرو۔ جس طرح عالمِ کبیر میں کوئی زمین آسمان کے بغیر نہیں رہ سکتی اسی طرح عالمِ صغیر کا حُسن اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتا جب تک آسمان سے وحی نازل نہ ہو اللہ تعالیٰ کا کلام نازل نہ ہو اور انبیاء اس کے حسن کو نمایاں کرنے والے مبعوث نہ ہوں اگر تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ خدا تعالیٰ نے زمین کے قیام کے لئے آسمان بنایا اور آسمان کے قیام کے نتیجہ میں ہی زمین بے عیب بنی تو پھر تمہیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کا الہام بھی ضروری ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے کلام نہ اُترے اگر اس کی طرف سے انبیاء مبعوث نہ ہوں تو پھر دنیا میں عیب ہی عیب نظر آئیں۔ کمزوریاں ہی کمزوریاں دکھائی دیں۔ گناہ ہی گناہ چھائیں رہیں۔ خدا تعالیٰ کا تازہ کلام اور اُس کے انبیاء کی بعثت ہی ہے جو دنیا کے عیوب کو ڈھانکتی ہے اور جس کے بعد وہ ایک حسین صورت میں دکھائی دینے لگتی ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تفصیل بتائی ہے کہ اُس نے کس طرح تسویہ کیا اور اس کے کیا کیا نتائج ظاہر ہوئے۔

وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا ﴿۳۰﴾

اور اس کی رات کو (تو) تاریک بنایا ہے اور اس کی دوپہر کو (روشن کر کے) نکالا ہے۔

تفسیر۔ اَغْطَشَ لَيْلَهَا میں لَيْلَهَا کی ضمیر کا مرجع اَغْطَشَ لَيْلَهَا خدا نے اس کی رات کو تاریک بنایا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا اور اس کے دن کو نکالا یا اُس کی دھوپ یا دوپہر کو ظاہر کیا۔ یہ مراد نہیں کہ ایک چیز کو اُس نے دوسری شکل دے دی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کی رات اندھیری ہے اور اُس کا دن روشن ہے۔ اَغْطَشَ لَيْلَهَا میں هَا ء کی ضمیر آسمان کی طرف پھیری گئی ہے اور ضُحٰی میں بھی ضمیر اسی کی طرف لوٹائی گئی ہے۔ حالانکہ زمین پر رات سورج کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے آتی ہے آسمان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے وہ رات ہماری رات ہوتی ہے آسمان کی رات نہیں ہوتی۔ اسی طرح ضُحٰی بھی ہماری ہوتی ہے آسمان کی نہیں ہوتی۔ پس یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں ضمیریں آسمان کی طرف کیوں پھیری گئی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند چونکہ آسمان کا حصہ ہیں اور رات ہمیشہ سورج کے غروب ہونے سے آتی ہے جو بلندی پر واقعہ ہے اس لئے لَیْل کو سماء کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ رات آسمان پر آتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ رات جو اس نظام کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اس نظام کا کام دنیا کو روشنی پہنچانا ہے مگر جب دنیا سورج کے سامنے نہیں ہوتی تو روشنی نہیں آسکتی اور اندھیرا چھا جاتا ہے پس رات کو آسمان کی طرف اس لئے منسوب کیا گیا ہے کہ یہ رات نظامِ سماوی سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح ہم ضُحٰی کو ضُحَی السَّمَآءِ بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہماری ضُحٰی بھی نظامِ سماوی سے تعلق رکھتی ہے۔

دُوسرا جواب یہ ہے کہ سماء سے مراد کوئی مادی شئے نہیں بلکہ بالائی جوف ہے اس لئے رات اور دن اس کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں۔

فرماتا ہے رات اور دن میں سے ایک کو ہم نے تاریک بنایا ہے اور دوسرے کو روشن بنایا ہے۔ اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ رات گمنامی کا زمانہ ہوتا ہے جس میں انسانی طاقتیں پوشیدہ رہتی ہیں اور اُن طاقتوں کا ظہور اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک دن کی روشنی رات کی ظلمت کو دُور نہیں کر دیتی۔ اسی طرح جبتک نبی کا ظہور نہ ہو لوگوں کی قابلیتیں مخفی رہتی ہیں ان کی استعدادوں کا ظہور نہیں ہوتا وہ خواہ طبعی طور پر اپنے اندر بعض اوصاف رکھتے ہوں اُن سے دنیا ناواقف رہتی ہے جب تک نبوت کا سورج ان کی حقیقت کو ظاہر نہیں کر دیتا اور ان کی چھپی ہوئی استعدادوں کو اُبھار نہیں دیتا۔ یہ ایک قانون ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عالمِ روحانی اور عالمِ جسمانی

دونوں میں کام کرتا دکھائی دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسی قانون کا اس جگہ ذکر کرتے ہوئے اہل عرب کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے تم اپنے متعلق یہ خیال کرتے ہو کہ تمہارے اندر بہت بڑی قابلیتیں پائی جاتی ہیں۔ تم بہادری میں یکتا ہو۔ تم سخاوت میں نامور ہو۔ تم پابندیٔ عہد میں ایک نمایاں خصوصیت اپنے اندر رکھتے ہو لیکن تمہیں علم ہونا چاہیے کہ جب تک نبی نہیں آتا اُس وقت تک ان طاقتوں کا مکمل ظہور نہیں ہوسکتا۔ نبی کے آنے سے پہلے بے شک قوم میں یہ استعدادیں موجود ہوتی ہیں مگر لوگوں کا دائرۂ عمل نہایت محدود ہوتا ہے۔ اور بوجہ اس کے کہ کوئی نظام اُن میں نہیں ہوتا ان خوبیوں سے اجتماعی طور پر قوم کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن جب نبی آجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُس کے ذریعہ ایک نیا نظام قائم فرماتا ہے تو اس وقت افرادِ قوم کی استعدادیں اُبھرنی شروع ہو جاتی ہیں اور ہر شخص کا وصف نمایاں ہو کر قوم کے سامنے آنا شروع ہو جاتا ہے۔ سخاوت وہ پہلے بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ بہادری وہ پہلے بھی دکھا رہے ہوتے ہیں۔ مہمان نوازی کا وصف اُن میں پہلے بھی موجود ہوتا ہے۔ پابندیٔ عہد کی عادت اُن میں پہلے بھی پائی جاتی ہے مگر ان کا دائرہ ایسا محدود ہوتا ہے کہ دنیا کی نگاہ ان خوبیوں کی طرف نہیں اُٹھتی۔ مگر جب انبیاء کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایک نیا نظام قائم کر دیتا ہے اور تمام لوگوں کو ایک سلک میں منسلک کر دیتا ہے تو پھر ہر ایک کی قابلیت نمایاں طور پر دنیا کے سامنے آجاتی ہے اور اُسے اِس امر کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ یہ لوگ اپنے اندر ترقی کی حیرت انگیز قابلیت رکھتے ہیں۔ اُس وقت ان کی سخاوت بھی ایک تنظیم میں آجاتی ہے۔ اُن کی جرأت اور بہادری کی رُوح بھی منظم رنگ میں ظاہر ہوتی ہے اور اُن کی ذاتی اور اخلاقی خوبیاں بھی قوم کے لئے ایک نمونہ قرار پا جاتی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ خوبیاں لوگوں میں پہلے بھی موجود ہوتی ہیں مگر اُس وقت رات کی ظلمت نے ان خوبیوں پر پردہ ڈالا ہوا ہوتا ہے جب دن چڑھتا ہے۔ جب نبوت کا سورج اُن پر طلوع کرتا ہے تو ہر شخص کی آنکھ ان کی طرف اُٹھنی شروع ہو جاتی ہے۔ اُن کی وہی خوبیاں جو پہلے کسی کو نظر نہیں آتی تھیں اب ہر ایک کو دکھائی دینے لگتی ہیں اور تحسین و آفرین کی آوازیں ان کے متعلق سنائی دینے لگتی ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو۔ تاریخی شہادت اس امر پر موجود ہے کہ عربوں میں بہادری کی روح پہلے بھی پائی جاتی تھی۔ کفر کی حالت میں بھی وہ نڈر تھے۔ وہ دلیر اور بہادر تھے۔ مگر ان کا یہ وصف دنیا کی نگاہوں سے بالکل اوجھل تھا۔ عرب کے لوگ بے شک اپنے اس ذاتی جوہر سے آگاہ ہوں مگر دنیا کا اَور کون سا ملک تھا جو عربوں کی اس بہادری سے واقف تھا؟ پس بے شک عربوں میں بہادری تھی مگر رات کی ظلمت نے اُن کی اس خوبی کو ڈھانکا ہوا تھا جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نور کی روشنی اُن پر پڑی تو جیسے پالش رنگ کو چمکا دیتی ہے اسی طرح ان کا رنگ چمک گیا۔ اُن کی بہادری کی روح اُبھری اور ایسے جوش اور ایسی شان سے اُبھری کہ آج

دنیا کی تاریخیں عربوں کی بہادری کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔اسی طرح سخاوت کو لو۔اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ عربوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعث سے پہلے بھی سخاوت کی روح موجود تھی مگر اسلام کے ظہور نے اہلِ عرب کو یہ سبق دیا کہ وہ اِحتِسَابًا اس خُلق سے کام لیں اور اللہ تعالیٰ کی رضاء اور اُس کی محبت کے حصول کے لئے سخاوت کیا کریں۔

پھر دوسرا فائدہ اہلِ عرب کو یہ ہوا۔ کہ گو پہلے بھی سخاوت کی روح اُن میں موجود تھی مگر دنیا اُن اس خوبی سے ناواقف تھی اسلام کی روشنی جب اُن کے چہرہ پر پڑی۔ جب اُس آفتاب نے رات کی ظلمت کا پردہ چاک کر دیا تو دنیا پر اہل عرب کی سخاوت کا ایسا شہرہ ہوا کہ آج تک اُن کی سخاوت کی داستانیں اَوراقِ تاریخ پر نظر آتی ہیں۔

آنحضرت صلعم کی بعثت کا اثر اہل عرب کی عادات پر اسی طرح انسانی اخلاق میں سے ایک نمایاں خلق پابندیٔ عہد ہے جس پر اسلام نے خاص طور پر زور دیا ہے مگر اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ عربوں میں اسلام سے پہلے بھی یہ خوبی موجود تھی۔فرق تھا تو یہ کہ اُن کی اس خوبی کو جِلا حاصل نہیں تھی۔اسلام کا ظہور اُن کی اس خوبی کو نمایاں کرنے کا موجب بن گیا۔اسلام سے قبل ہر شخص اس وصف کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھتا تھا قومی معاملات میں اس کی پرواہ نہیں کی جاتی تھی مگر اسلام نے ذاتی اور قومی ہر دو امور میں پابندیٔ عہد کو ایک ضروری امر قرار دیا۔اور اس کی خلاف ورزی کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب بتایا۔اسی طرح جب اسلام کا سورج چڑھا تو اہلِ عرب کو مزید فائدہ یہ ہوا کہ اُن کے اس حُسن کی طرف دنیا کی توجہ کھچ گئی۔جس طرح رات کو کچھ پتہ نہیں لگتا کہ خوبصورت چیز کون سی ہے اور بدصورت کونسی۔لیکن جب دن چڑھتا ہے تو حُسن والے کا حُسن نمایاں ہوجاتا ہے اور نقص والے کا نقص نمایاں ہوجاتا ہے۔اسی طرح بے شک اہل عرب میں یہ خوبی موجود تھی مگر اسلام نے اُن کی اس خوبی کو ایسی جِلا بخشی کہ تاریخیں اہل عرب کی پابندیٔ عہد کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔

ہم بچے تھے کہ ہمیں انگریزی ریڈروں میں یہ واقعہ پڑھایا جاتا کہ سپین میں ایک یوسف نامی تاجر گزرا ہے ایک دفعہ اُس کے لڑکے کو کسی شخص نے قتل کر دیا اور پھر وہ قاتل بھاگ کر اُسی مقتول کے باپ کے پاس گیا اور کہنے لگا مجھے پناہ دو اُسے علم نہیں تھا کہ میں اُسی کے لڑکے کو قتل کر کے آ رہا ہوں اور یوسف کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا لڑکا اسی کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے مگر جب اُس نے کہا کہ مجھے پناہ دی جائے سپاہی میرے تعاقب میں آ رہے ہیں تو یوسف نے کہا بہت اچھا اور یہ کہہ کر اُس نے اُسے اپنے ایک کمرہ میں چھپا دیا۔تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ سپاہی اُس کے بیٹے کی لاش اٹھائے وہاں آ نکلے اور انہوں نے کہا کہ ابھی ابھی ایک شخص نے تمہارے اس بیٹے کو قتل کر دیا ہے اور ہم نے

دیکھا ہے کہ قاتل بھاگ کر اسی طرف آیا ہے کیا تمہیں اس کا کچھ پتہ ہے؟ یوسف تاجر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اُس کا بیٹا قتل ہو چکا ہے اور اُس وقت اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ شخص جو میرے پاس پناہ کے لئے آیا ہے وہی میرے بیٹے کا قاتل ہے مگر عہد کی خلاف ورزی کو اُس نے برداشت نہ کیا اور اُس نے سپاہیوں کو کچھ ایسا جواب دیا کہ وہ مایوس ہو کر وہاں سے چلے گئے اور انہوں سمجھا کہ قاتل کسی اور طرف بھاگ گیا ہے۔ جب سپاہی چلے گئے تو اُس نے اپنے پچھواڑے کا دروازہ کھولا اور قاتل سے کہا کہ سپاہی چلے گئے ہیں تم اب بھاگ جاؤ۔

یہ پابندیٔ عہد کا ایسا شاندار نمونہ ہے کہ یوروپین لوگوں کو سارے یورپ میں اس قسم کی کوئی مثال نظر نہیں آئی اور اسلام سے شدید دشمنی رکھنے کے باوجود وہ اس بات پر مجبور ہوئے ہیں کہ اس واقعہ کو پیش کریں چنانچہ وفائے عہد کی مثال میں یہ قصہ اب تک اُن کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے حالانکہ یہ ایک مسلمان کا واقعہ ہے۔

پس گو یہ چیز پہلے بھی عربوں میں پائی جاتی تھی اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ مگر اسلام کے آنے پر وہ حُسن بہت نمایاں ہو گیا اور دوسرے اس سے پہلے وہ خوبی اس طرح ظاہر نہ ہوتی تھی کہ دنیا کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ سکے مگر جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی روشنی اُن پر پڑی تو اُن کا حُسن دنیا کے سامنے آ گیا اور جس طرح سورج کی روشنی کے بعد کوئی چیز مخفی نہیں رہ سکتی اسی طرح اُن کی مخفی قابلیتیں اُبھرنی شروع ہو گئیں اور لوگوں کی نظریں اُن پر جم گئیں۔ پس اللہ تعالیٰ اہل عرب کو توجہ دلاتا ہے اور فرماتا ہے ہم نے مان لیا تمہارے اندر فطری طور پر بعض قابلیتیں پائی جاتی ہیں مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان قابلیتوں کے ظہور کے لئے دن کی روشنی بھی ضروری ہے اگر تم اس روشنی میں نہیں چلو گے تو تمہاری قابلیتیں دنیا کی نگاہ سے بالکل مخفی رہیں گی لیکن اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا نور تم پر پڑنے لگا تو یہ روشنی تمہاری استعدادوں کو ایسی جِلا بخشے گی کہ ہر شخص کی نگاہ تمہاری طرف اُٹھنے لگے گی اور باہر کی اقوام بھی تمہارے حسن کو دیکھنے لگیں گی۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۱﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ

اور اس کے ساتھ (یعنی اسی زمانہ میں) زمین کو بھی بچھایا ہے پھر (اس میں سے) اس کا پانی اور اس کا چارہ نکالا ہے۔

مَرْعٰىهَا ﴿۳۲﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۳﴾

اور پہاڑوں کو بھی اس نے اس میں گاڑا ہے۔

حلّ لغات۔ بَعْدَ یہ قَبْل کے مقابل معنے ادا کرنے کے لئے لایا جاتا ہے اور کبھی اس کے معنے مَعَ

(یعنی ساتھ) کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) پس وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا کے دونوں معنے ہو سکیں گے (۱) زمین کو اس کے بعد بچھایا (۲) زمین کو اس کے بننے کے ساتھ ساتھ ہی بچھایا۔

دَحٰی دَحٰی کے معنے ہوتے ہیں بَسَطَ یعنی اُس نے پھیلایا (اقرب) دَحَی الْاَرْضَ۔ اَوْسَعَهَا۔ زمین کو وسیع بنایا۔ (لسان)

تفسیر۔ یہاں بَعْدَ ذٰلِكَ کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں بعدؔ کے بھی اور ساتھؔ کے بھی۔ یعنی یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ نظامِ شمسی کے بعد زمین کو پھیلایا گیا اور یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ نظام شمسی کے ساتھ ہی زمین کو پھیلانے کا کام کیا گیا۔ زیادہ صحیح معنے یہاں ساتھؔ کے ہی ہیں کہ ہم نے زمین کو اس نظام شمسی کے بنانے کے ساتھ ہی بچھایا۔

زمین کے پھیلائے جانے کے دو معنے یہاں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نظام شمسی کے پیدا ہونے پر زمین کو پھیلایا گیا ہے۔ پھیلانے سے یہ مراد نہیں کہ اسے بستر کے طور پر پھیلایا گیا بلکہ یہ مراد ہے کہ اس کے بعد زمین رہنے کے قابل ہوئی۔ جہاں تک جیالوجی کا تعلق ہے گو ہم اُس کے پابند نہیں مگر اُس کی تحقیق قرآن کریم کی اِس آیت کی پوری طرح تصدیق کرتی ہے۔ علم طبقات الارض کے ماہرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پہلے زمین میں شدید گرمی تھی گرمی کے ابخرات سے پانی بنا اور پھر لاوا نکل نکل کر پہاڑوں کی صورت میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ یہ لازمی بات ہے کہ جب زمین میں سے کچھ مادہ نکل کر ایک بلند پہاڑ کی شکل اختیار کرلے گا تو دوسری طرف سے زمین نیچے دھنس جائے گی چنانچہ زلزلوں سے ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک طرف سے زمین اُوپر کو نکل کر آتی ہے اور دوسری طرف سے زمین نیچے چلی جاتی ہے۔ جب زمین کا گرم مادہ نکل کر ایک طرف اونچا ہو گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دوسری طرف گڑھا پڑ جاتا۔ چنانچہ جوں جوں پہاڑ بنتے چلے گئے زمین کا ایک حصہ نیچے کی طرف دبتا چلا گیا اور چونکہ پانی ہمیشہ ڈھلوان کی طرف جاتا ہے اس لئے جب زمین کا ایک حصّہ نیچا ہو گیا تو پانی وہاں جمع ہو کر سمندر بن گیا۔ سمندر درحقیقت قائم مقام ہیں اُس مادہ کے جو زمین میں سے نکلا اور پہاڑوں کی شکل اختیار کر گیا۔ جب ایک طرف پہاڑ بلند ہو گئے اور دوسری طرف پانی سمٹ کر نیچے کی طرف چلا گیا تو زمین کی سطح ہموار ہو گئی اور وہ انسانی آبادی کے قابل بن گئی۔ مگر بہرحال یہ ایک قیاسی بات ہے ممکن ہے بعد میں کوئی اور تحقیقات اس کو غلط ثابت کر دے۔ اسی طرح زمین کی پیدائش کے متعلق سائنس والوں کا نظریہ یہ ہے کہ زمین اور دوسرے اجرام نظام شمسی ایک کُرّہ کے جو ابھی ٹھوس نہ ہوا تھا حصّہ تھے جو اُس کی تیز گردش کی وجہ سے اُس سے کٹ کر الگ ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں جس طرح بچے بعض دفعہ آٹا لے کر زور سے گھماتے ہیں اور اس کے ٹکڑے ادھر ادھر جا پڑتے ہیں۔ اسی طرح اس نیم سیّال کرّہ

نے جب تیز گردش کی تو اُس کے ٹکڑے اڑ کر اِدھر اُدھر جا پڑے اور وہ سرد ہو کر مختلف کرّوں کی شکل اختیار کر گئے۔ بہر حال نظام شمسی کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کئے جن سے یہ زمین رہائش کے قابل ہوئی۔ اگر نظام شمسی نہ ہوتا تو زمین کا قیام بھی نہ ہوتا۔ اِسی طرح نظامِ جسمانی بھی نظام شمسی روحانی کے قیام بعد قابلِ قدر ہوتا ہے۔ جس طرح نظامِ ارضی میں نظامِ شمسی کا وجود نہایت ضروری ہے اگر وہ نظام نہ ہوتا تو نہ پہاڑ بنتے نہ گڑھے پیدا ہوتے نہ سمندر تیار ہوتے۔ نہ انسان اس میں رہائش اختیار کر سکتے۔ اسی طرح جب تک نظامِ شمسی روحانی کے قائم نہ ہو جو انسان کے اندرونی آتش فشاں مادوں کو نکال کر باہر پھینک دے اور اس کی طبیعت میں یکسانیت پیدا کر دے اس وقت تک نظامِ جسمانی بھی اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ نظامِ شمسی روحانی ہی ہے جو ایک طرف غصّہ کو دباتا ہے دوسری طرف انتہائی نرمی اور بے حیائی سے بچاتا ہے اور اس طرح اعتدال کی تعلیم دے کر اُسے بنی نوع انسان کے لئے مفید اور کار آمد وجود بناتا ہے گویا جس طرح زمین کے لاوا کو اللہ تعالیٰ پہاڑوں کی صورت میں زمین سے باہر نکال دیتا ہے اسی طرح مذہب ایک طرف انسان کے غضب اور جوش اور انتقام کی روح کو بعض پابندیوں کے نیچے لا کر ٹھنڈا کرتا ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ آگ بالکل ختم ہو جائے اور گرمی کا مادہ بالکل نہ رہے۔ چنانچہ وہ ایسی تعلیم بھی دیتا ہے جو بے حیائیوں سے بچانے والی بے غیرتیوں سے محفوظ رکھنے والی اور سستی اور کاہلی سے نفرت دلانے والی ہوتی ہے جب ہر قسم کے خراب مادے دور ہو جاتے ہیں اور جب ہر قسم کے نیک مادے فطرتِ انسانی میں پیدا ہو جاتے ہیں تب یہ نظامِ جسمانی قابلِ قدر ہوتا ہے اگر اس نظام پر ایک روحانی آسمان نہ ہو اور اگر یہ نظام روحانی ایک طرف انسان کے حیوانی جذبات کو نہ دبائے اور دوسری طرف سستی اور غفلت کے جذبات کو دُور نہ کرے تو یہ نظام اپنے اندر کسی قسم کی جاذبیت اور کشش نہیں رکھ سکتا۔ یہ آسمانی نظام ہی ہے جس کے بعد روحانی غذا اور شرب کے سامان پیدا ہوتے ہیں اور پہاڑوں کی طرح زمین کو قائم رکھنے والے وجود پیدا ہوتے ہیں۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ﴿۳۴﴾

(یہ سب کچھ) تمہارے اور تمہارے جانوروں کے فائدہ کے لئے (اس نے کیا ہے)۔

حلّ لُغات۔ اَنْعَامٌ: اَنْعَامٌ نَعَمٌ کی جمع ہے اور اَلنَّعَمُ کے معنے ہیں اَلْاِبِلُ وَالشَّاءُ وَقِيْلَ خَاصٌّ بِالْاِبِلِ یعنی نَعَم کا لفظ اونٹ اور بکریوں پر بولا جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ لفظ صرف اونٹوں پر بولا

جاتا ہے۔ اور کتاب مصباح میں لکھا ہے اَلنَّعَمُ : اَلْمَالُ الرَّاعِیْ وَھُوَ جَمْعٌ لَا وَاحِدَلَہٗ مِنْ لَفْظِہٖ وَاَکْثَرُ مَا یَقَعُ عَلَی الْاِبِلِ کہ نَعَم تمام چرنے والے جانوروں کو کہتے ہیں ہاں کثرت سے اس لفظ کا استعمال اونٹوں کے لئے ہی کرتے ہیں اور لفظ نَعَم جمع ہے اس کے مادہ (ن ع م) سے اس کا کوئی مفرد نہیں (جیسے عربی میں نِسْوَۃٌ کا لفظ ہے جس کے معنے عورتوں کے ہیں اس کا مفرد اس کے مادہ سے نہیں آتا بلکہ مفرد کے لئے اِمْرَأَۃٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے)

بعض آئمۂ لغت کا قول ہے کہ نَعَمْ کا لفظ اونٹوں کے لئے خاص ہے لیکن اَنْعَام میں اونٹ۔ بھیڑ۔ گائے سبھی شامل ہیں پھر لکھتے ہیں کہ اَنْعَام کا لفظ بھیڑ۔ اونٹ اور گائے کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے لیکن اگر اونٹوں کو اُن سے علیحدہ کیا جائے تو اونٹوں کے لئے نَعَم کا لفظ بولا جائے گا مگر صرف گائے۔ بھیڑ، بکریوں کو نَعَم نہیں کہیں گے (اقرب)

تفسیر ۔ **جسمانی اور روحانی ہر دو نظاموں میں چوپاؤں کی ضرورت کا احساس**۔ نظامِ عالم کو پیش کر کے اس جگہ جسمانی طور پر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ یہ نظام نہ صرف تمہارے فائدہ کے لئے ہے بلکہ تمہارے چوپاؤں کا بھی اس نظام میں خیال رکھا گیا ہے اور اُن کی رہائش اور حیات کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی اُن کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہیا کیا گیا ہے۔ اس جسمانی نظام کو پیش کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہمارا یہ طریق صرف اس ظاہری نظام میں ہی نہیں بلکہ روحانی عالم میں بھی جانوروں کا خیال رکھا جاتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں اس مضمون پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے اور مومنوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ہر ایک کو اُس کا حق ادا کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَفِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات: ۲۰) کہ مومن کے اموال میں سائل اور محروم دونوں کا حق ہے ان کا بھی جو مانگ سکتے ہیں اور ان کا بھی جو مانگ نہیں سکتے۔ جیسے کم گو اور گری ہوئی اقوام یا جانور وغیرہ ہیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں بھی اس امر کا خیال رکھنے کی تاکید فرمائی ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں ایک عورت کو محض اس لئے جنت میں داخل کیا گیا کہ اُس نے پیاسے کُتے کو پانی پلایا تھا (مسلم کتاب السلام باب فضل ساقی البھائم المحترمۃ و اطعامھا) اسی طرح آپ نے فرمایا ہے جانوروں پر رحم کیا کرو کیونکہ خدا نے ان کو تمہارے سپرد کیا ہے تو روحانی تعلیم صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ جانوروں کے لئے بھی امن پیدا کرتی ہے۔ جسمانی نظام میں بھی خدا تعالیٰ کے نظام کے ماتحت ہی جانور پلتے ہیں۔ اس مادی عالم میں غلّہ انسانوں کے کام آتا ہے اور بھوسہ جانوروں کے کام آتا ہے مجھے ہمیشہ خیال آتا ہے کہ اگر غلّہ ہی غلّہ پیدا ہوتا تو لوگ جانوروں کو بھوکا مار دیتے مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو دیکھو کہ اُس نے آدمی کا پیٹ چھوٹا بنایا اور جانور کا بڑا بنایا۔ دوسری طرف اسی مناسبت سے غلّہ تھوڑا ہوتا ہے اور بھوسہ بہت زیادہ ہوتا ہے اگر غلّہ ہی غلّہ ہوتا تو سب کچھ انسان کھا

جاتے اور جانور بھوکے مرجاتے۔ یہی روحانی نظام کی کیفیت ہے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی نظام قائم نہ کیا جاتا تو بڑے بڑے لوگ ساری دنیا کے حقوق دبا کر بیٹھ رہتے اور غریبوں کو لوٹ لیتے جیسے آجکل ہو رہا ہے کہ جرمنی چاہتا ہے ساری دنیا کی دولت میں کھینچ لوں۔ انگلستان اور امریکہ والے چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاتھوں میں سب دنیا کی دولت ہو وہ دوسروں کو اُن کے حقوق تو دیتے ہیں مگر اپنا ساتھی یا دوست ہونے کی وجہ سے دیتے ہیں انسان ہونے کی حیثیت سے نہیں دیتے مگر اللہ تعالیٰ جس نظام کو قائم کرتا ہے اس میں چھوٹے بڑے۔ امیر غریب ماتحت اور افسر سب کے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے اور ہر ایک کو اُس کا جائز حق دلایا جاتا ہے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۞۳۵

پس جب وہ بڑی آفت آئے گی۔

حل لغات۔ اَلطَّآمَّةُ الطَّآمَّةُ طَمَّ سے ہے اور طَمَّ الْمَآءُ کے معنے ہوتے ہیں غَمَرَ یعنی کسی چیز کو پانی نے ڈھانپ لیا۔ طَمَّ فُلَانٌ اَلْاِنَاءَ کے معنے ہوتے ہیں مَلَأَهٗ اُس نے برتن کو پانی سے بھر دیا۔ طَمَّ الشَّيْءُ کے معنے ہوتے ہیں عَلَا وَغَلَبَ وہ چیز اونچی ہوگئی اور غالب آ گئی۔ اور طَمَّ الْاَمْرُ کے معنے ہوتے ہیں تَفَاخَمَ وہ کام بہت زیادہ اور عظیم الشان صورت اختیار کر گیا۔ (اقرب)

اَلطَّآمَّةُ: اَلدَّاهِيَةُ تَغْلِبُ مَا سِوَاهَا قِيْلَ لَهَا ذَالِكَ لِاَنَّهَا تَطُمُّ كُلَّ شَيْءٍ اَىْ تَعْلُوْهُ وَ تُغَطِّيْهِ یعنی طَآمَّة اس سخت مصیبت کو کہتے ہیں جو باقی تمام مصیبتوں پر غالب آجائے اور جس کی وجہ سے اور تمام مصیبتیں انسان کو بھول جائیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ یہاں خدا تعالیٰ نے احیاء روحانی اور بعث بعد الموت کے متعلق ایک اور دلیل پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ جو خدا اس دنیا میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کر سکتا ہے جو کسی انسانی قیاس اور واہمہ میں بھی نہیں آسکتا تھا وہ تمہیں مرنے کے بعد کیوں زندہ نہیں کر سکتا یا کیوں تم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکال لیتے کہ اسلام کے غلبہ کے متعلق جو کچھ کہا جارہا ہے وہ بھی بالکل صحیح اور درست ہے۔

پہلے فرمایا تھا فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ۔ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ کہ ایک دن اچانک ہم کفار کو میدانِ جنگ کی طرف ہنکا کر لے جائیں گے اور یہ سب کے سب وہاں ننگے ہو جائیں گے اس میں جنگ بدر کی طرف اشارہ تھا اور

بتایا گیا تھا کہ ابھی تو تمہیں ایک ہی دھکّا لگا ہے۔ آگے آگے دیکھو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ کے مطابق پے در پے کئی جنگیں ہوئیں اور رادفہ کے بعد رادفہ آئی۔ اب فرماتا ہے ان متواتر اور مسلسل جنگوں کے بعد ایک طامۂ کبریٰ کا دن آنے والا ہے۔

طامہ کبریٰ سے مراد اس دنیا کا عذاب اس طامۂ کبریٰ سے مراد فتح مکہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب وہ طامۂ کبریٰ آئے گی تو اُس دن تمہیں اپنے اعمال کی حقیقت خوب اچھی طرح معلوم ہو جائے گی۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہاں دنیا کے عذاب کا ہی ذکر ہو رہا ہے اگلے جہان کی قیامت اس سے مراد نہیں۔ کیونکہ یہ وہ عذاب ہیں جن کے آہستہ آہستہ آنے کا ذکر ہو رہا ہے پہلے یوں ہوگا۔ پھر یوں ہوگا اور پھر طامۂ کبریٰ کا دن آئے گا۔ مگر اُخروی قیامت تو وہ ہے جو اچانک آجائے گی پس یہاں رجفہؔ اور رادفہؔ اور طامۂ کبریٰؔ وغیرہ سے مراد وہ عذاب ہیں جو کفار پر آنے والے تھے۔ چنانچہ پہلے بدر کی جنگ ہوئی اور پھر رادفہ کے بعد رادفہ آئی اور آخر مکہ فتح ہوا اور اسلام کا غلبہ ہو گیا۔

اگر ان آیات کو اگلے جہان پر چسپاں کیا جائے تو پھر ہم یہ معنے کریں گے کہ مضمون کو یہاں دہرایا گیا ہے اور مختلف عذابوں کے نزول کے بعد فیصلے کا جو آخری دن آنے والا تھا اور جس میں عذاب نے اپنے کمال کو پہنچ جانا تھا اُس کو تامۂ کبریٰ قرار دیا گیا ہے لیکن بہر حال پہلا اشارہ دنیوی عذابوں کی طرف ہی ہے۔

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۶﴾

جس دن انسان اپنے کئے کو یاد کرے گا۔

تفسیر۔ طامہ کبریٰ کے آنے کا وقت۔ جس دن انسان یاد کرے گا اُس کو جو اُس نے کوشش کی تھی یعنی انسان کو اپنے اعمال نظر کے سامنے رکھتے ہوئے یاد آجائے گا کہ اُس نے یہ کچھ کیا تھا اور اُسے یہ کچھ کرنا چاہیے تھا۔ جب بھی انسان کے کسی بُرے فعل کا کوئی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اب مُجھے اُس کام کی وجہ سے سزا ملنے لگی ہے تو اُس وقت اُس کے دل میں یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں فلاں وقت یوں کرتا تو یوں ہو جاتا۔ اگر اس طرح کام کرنے کی بجائے اُس طرح کرتا تو اور نتیجہ نکلتا۔ یہ بات انسانی فطرت میں داخل ہے اور اللہ تعالیٰ اسی نے انسانی فطرت کا اس جگہ نقشہ کھینچا ہے۔

میں سمجھتا ہوں دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آسکتا جو اپنے کاموں کے اچھے یا بُرے نتیجہ کے وقت یہ سوچتا

نہ ہو کہ اگر میں اس طرح کرتا تو یہ نتیجہ نکلتا۔ بچوں کو دیکھ لو جب وہ امتحان میں فیل ہو جائیں تو وہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر ہم کھیل کود میں اپنے دن ضائع نہ کرتے تو کبھی فیل نہ ہوتے اور اگر پاس ہو جائیں تو پھر وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم فلاں فلاں کھیل میں اپنا وقت ضائع نہ کرتے تو موجودہ نمبروں سے بہت زیادہ نمبر حاصل کرتے۔ غرض آخری نتیجہ کے وقت انسان ضرور اپنے گزشتہ اعمال پر نظر دوڑاتا اور اُن کو یاد کر کے سوچتا ہے۔ اگر اُسے ناکامی ہو تو وہ حسرت کرتا ہے کہ میں نے کیوں ایسے کام کئے جن سے مجھے ناکامی ہوئی۔ اور اگر اُسے کامیابی ہو تو پھر وہ یہ سوچنے لگ جاتا ہے کہ اگر میں اس سے بھی زیادہ کام کرتا تو نتیجہ اور بھی شاندار نکلتا اللہ تعالیٰ اسی انسانی فطرت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس جگہ فرماتا ہے کہ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى اسلام اور کفر کا آخری فیصلہ جب فتح مکہ کے دن ہوگا تو اُس دن انسان اپنے کاموں کو یاد کرے گا اور جیسا جیسا کسی نے اسلام سے سلوک کیا ہوگا وہ اُس کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

فتح مکہ کے بعد کفار و مشرکین کے دل میں کس طرح بار بار یہ خیال آتا ہوگا کہ اگر ہم رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مخالفت نہ کرتے تو کیا اچھا ہوتا۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں داخلہ کے وقت یہ اعلان کیا ہوگا کہ جو شخص اپنے گھر کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ رہے گا اُسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اُس وقت وہ لوگ جو مسلمانوں کو بڑی بڑی سخت اذیّتیں پہنچایا کرتے تھے کس طرح اندر گھروں میں بیٹھے ہوئے سوچتے ہوں گے کہ اگر ہم اسلام کی مخالفت نہ کرتے تو آج ہم بھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے مکہ کی گلیوں میں پھر رہے ہوتے اور مکانوں کے اندر چھپ کر نہ بیٹھے ہوتے۔

حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے ایام میں ایک دفعہ حج کرنے کے لئے مکہ میں آئے تو مکّہ کے بڑے بڑے رؤساء آپ کے ملنے کے لئے گئے۔ خاندانی لحاظ سے حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ سے بڑے تھے اور مکہ میں اُن کا خاندان بہت مشہور تھا۔ جب آپ حج کے لئے آئے تو مکہ کے رؤسا نے سمجھا کہ اب چونکہ ایسا شخص خلیفہ ہے جو ہمارے خاندانوں کی عظمت سے خوب واقف ہے اس لئے اب ہمارا خاص طور پر اعزاز کیا جائے گا اور ہماری خاندانی روایات کو قائم رکھا جائے گا۔ چنانچہ وہ حضرت عمرؓ سے ملنے کیلئے آئے اور آپ نے اُن سے باتیں شروع کر دیں۔ وہ ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک حبشی اور غلام مسلمان جس کو قریش کے بڑے بڑے سردار مکہ کی گلیوں میں گھسیٹا کرتے تھے آ پہنچا اور اُس نے حضرت عمرؓ کو السلام علیکم کہا۔ حضرت عمرؓ رؤسا مکہ سے کہنے لگے ان کو ذرا جگہ دے دو۔ اور خود پیچھے ہٹ جاؤ چنانچہ وہ پیچھے ہٹ گئے اور حضرت عمرؓ نے اُن سے باتیں شروع کر دیں۔ اتنے

میں ایک دوسرا مسلمان سابق غلام آ گیا۔ پھر تیسرا اور پھر چوتھا آیا۔ خدا تعالیٰ کی قدرت ہے کہ یکے بعد دیگرے سات مسلمان جو کسی زمانہ میں کفار مکہ کے غلام ہوا کرتے تھے آ پہنچے۔ شاید اللہ تعالیٰ اس ذریعہ سے اُن کو سبق دینا چاہتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک جب مکان میں داخل ہوتا تو حضرت عمرؓ ان سے فرماتے ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور ان کو بیٹھنے کے لئے جگہ دو۔ چنانچہ ہر مسلمان غلام کے آنے پر وہ پیچھے ہٹتے چلے گئے یہاں تک کہ جوتیوں میں جا پہنچے اور تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے اُٹھ کر باہر آ گئے۔ باہر نکل کر انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ کچھ دیکھا آج ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے اور مجلس میں ہماری کتنی بڑی ذلّت کی گئی ہے۔ ہم وہ ہیں جو بادشاہوں کے درباروں میں بھی عزت کی جگہ حاصل کرتے تھے مگر آج ایک ایک حبشی غلام کو جو ہمارے باپ دادا کی خدمتیں کیا کرتے تھے ہمارے مقابلہ میں عزت دی گئی اور ہمیں ہر دفعہ پیچھے ہٹایا گیا یہاں تک کہ ہم جوتیوں میں جا پہنچے۔ یہ کتنی بڑی ذلّت ہے جو آج ہماری ہوئی ہے۔ اِس پر اُنہی میں سے ایک شخص جو زیادہ سمجھدار تھا بولا کہ تم جو کچھ کہتے ہو ٹھیک ہے مگر تم یہ بھی تو سوچو کہ اس میں کس کا قصور ہے عمرؓ کا قصور ہے یا ہمارا اپنا قصور ہے؟ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دعویٰ فرمایا تو اُس وقت یہی حبشی غلام تھے جو آپ پر ایمان لائے مگر ہمارے باپ دادا نے آپ کی مخالفت کی اور شدید مخالفت کی۔ پس اگر اُن کو زیادہ عزت سے بٹھایا گیا ہے اور ہمیں ان کے آنے پر پیچھے بٹھایا گیا ہے تو یہ بالکل درست ہوا ہے وہ اسی بات کے مستحق تھے کہ ان کو عزت کا مقام دیا جاتا اور ہم اس بات کے مستحق تھے کہ ہم کو پیچھے ہٹایا جاتا کیونکہ ہمارے باپ دادا نے اسلام کی مخالفت کی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے محروم رہے۔ انہوں نے کہا یہ تو درست ہے مگر کیا اس ذلّت کو دور کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اور کیا ایسا کوئی طریق نہیں ہے جس سے اس رسوائی کا ازالہ ہو سکے؟ آخر سب نے سوچنے کے بعد فیصلہ کیا کہ ہمیں تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی چلو حضرت عمرؓ سے ہی دریافت کریں کہ اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اُس وقت تک مجلس برخاست ہو چکی تھی اور دوسرے لوگ واپس جا چکے تھے۔ وہ السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے اور انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا آج ہمارے ساتھ جو ہوا وہ آپ نے دیکھ لیا ہم اُسی کے متعلق کچھ کہنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں معذرت کرتا ہوں کیونکہ میرے لئے سخت مجبوری تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ادب کیا کرتے تھے اور جن کا ادب میرا آقا کرتا رہا میرا بھی فرض ہے کہ میں اُن کا لحاظ کروں اور اُنہیں دوسروں پر ترجیح دُوں مجھے افسوس ہے کہ اس سے آپ کو تکلیف ہوئی مگر میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ انہوں نے کہا ہم سمجھ گئے ہیں کہ آپ نے جو کچھ کیا درست کیا ہم صرف یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اس ذلّت کو دُور

کرنے کا کوئی طریق نہیں؟ اگر کوئی علاج ہو تو بتایا جائے کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ یہ ذلّت کا داغ ہم پر رہے۔

وہ رؤساء جو حضرت عمرؓ کے پاس آئے تھے اُن میں سے کسی کا باپ حضرت عمرؓ کا دوست تھا۔ کسی کے چچا سے اُن کے تعلقات تھے۔ کوئی ان سے رشتہ داری کے تعلقات رکھتا تھا اور کسی سے اُنہیں ذاتی طور پر اُنس اور تعلق تھا۔ حضرت عمرؓ جانتے تھے کہ ان کا خاندانی لحاظ سے کس قدر شہرہ تھا۔ کس قدر رُعب اور شوکت یہ لوگ رکھتے تھے اور کس طرح مسلمانوں کو تحقیر کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ جب انہی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے حضرت عمرؓ سے یہ کہا کہ ہمیں کوئی ایسا طریق بتایا جائے جس سے یہ ذلّت کا داغ ہم سے دُور ہو جائے تو حضرت عمرؓ کو اُن کی پرانی حشمت یاد آ گئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور غلبۂ رقت کی وجہ سے وہ کوئی جواب نہ دے سکے صرف انہوں نے انگلی اٹھائی اور شام کی طرف اشارہ کر دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ادھر اسلام کی فتح کے لئے ایک جنگ ہو رہی ہے اگر تم اس ذلّت کے داغ کو دور کرنا چاہتے ہو تو جاؤ اس جنگ میں شامل ہو کر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دو۔ وہ اس جواب کو سمجھ گئے چنانچہ وہ وہاں سے اٹھے اور بغیر اس کے کہ اپنے گھروں کو واپس جاتے سب کے سب شام کی طرف چلے گئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ پھر اُن میں سے ایک شخص بھی زندہ واپس نہ آیا۔ بلکہ سب کے سب اس جگہ شہید ہو گئے۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَوْمَ یَتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰی اس دن ہر انسان سوچے گا کہ وہ کیا کچھ کرتا رہا ہے صحابہؓ نے بھی جب ان ترقیات اور انعامات کو دیکھا ہو گا تو اُن کے دلوں میں بار بار یہ خیال آتا ہو گا کہ کاش ہم زیادہ قربانیاں کرتے۔ کاش ہم زیادہ اپنے اخلاص کا ثبوت دیتے۔ وہی قربانیاں جن کو وہ پہلے بڑا سمجھا کرتے تھے۔ وہی چندے جن کو وہ پہلے غیر معمولی قرار دیا کرتے تھے۔ انہی قربانیوں اور انہی چندوں کے متعلق اُن کو خیال آتا ہو گا کہ ہم نے تو کچھ بھی نہ کیا کاش ہم اس سے زیادہ قربانیاں کرتے اور زیادہ انعامات حاصل کرتے۔ اسی طرح کفار کے دل میں حسرت پیدا ہوتی ہو گی کہ کاش ہم اسلام کی مخالفت نہ کرتے اور ان ترقیات میں ہم بھی حصہ دار بنتے پس یَوْمَ یَتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰی کا یہ مطلب ہے کہ اُس دن ہر انسان کہے گا کہ کاش میں نے جو فلاں کام کیا ہے میں نہ کرتا یا کاش میں نے جو کچھ کیا ہے اس سے بڑھ کر کام کرتا قیامت کی صورت میں اس سے مراد ہو گی کہ دنیا کے اعمال کو یاد کر کے انسان حسرت کرے گا کہ کاش میں ایسا نہ کرتا۔ یا خوش ہو گا کہ میں نے بہت اچھا کیا۔

وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿۳۷﴾

اور جہنم اس کے لئے جو اُسے دیکھے گا ظاہر کر دی جائے گی۔

حل لغات۔ **بَجَحِيْم** بَجَحِيْم بَجَمَ میں سے ہے۔ بَجَمَ النَّارَ کے معنے ہیں اَوْقَدَهَا۔ آگ کو جلایا اور اَلْجَحِيْمُ کے معنے ہیں اَلنَّارُ الشَّدِيْدَةُ التَّاَجُّجِ۔ سخت بھڑکنے والی آگ۔ اَلْمَكَانُ الشَّدِيْدُ الْحَرِّ۔ سخت گرمی والی جگہ۔ كُلُّ نَارٍ عَظِيْمَةٍ فِيْ مَهْوَاةٍ۔ ہر بڑی آگ جو گہری جگہ میں جل رہی ہو۔ اِسْمٌ مِنْ اَسْمَآءِ جَهَنَّمَ۔ نیز جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ لِمَنْ يَّرٰى اصل میں لِمَنْ يَّرَاهُ ہے یعنی جہنم اس شخص کے قریب کی جائے گی جو اس کو دیکھے گا اس کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ بینا ہی جہنم کا عذاب پائے گا اندھا شخص جہنم میں داخل نہیں کیا جائے گا اور جب اس کا یہ مفہوم نہیں تو لازمًا ہمیں کوئی اور مفہوم لینا پڑے گا۔ میرے نزدیک وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى کے دو معنے ہیں۔

اوّل یہ کہ جہنّم اس کے قریب کی جائے گی جس نے اُسے دیکھنا ہے یعنی اس میں پڑنے کا مستحق ہے۔ مومن اُسے دیکھیں گے بھی نہیں۔ آخر جو جہنّم کفّار کو نظر آ رہی تھی وہ صحابہؓ کو کس طرح نظر آ سکتی تھی وہ اسی میں اپنے لئے جنت دیکھ رہے تھے۔ گویا ایک ہی فعل کے نتیجہ میں کفار کو جہنم نظر آ رہی تھی اور مومن اپنے لئے جنت دیکھ رہے تھے صحابہؓ جب گھوڑے دوڑاتے ہوئے مکّہ میں پھرتے ہوں گے تو انہیں اس جہنم کا خیال بھی کس طرح آ سکتا تھا جس میں کفار مبتلا تھے۔ واقعہ ایک ہی تھا مگر کفار کے لئے وہ دوزخ بنا ہوا تھا اور صحابہؓ کے لئے جنت بن رہا تھا پس اس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ دوزخ اُسی شخص کے قریب کی جائے گی جو اس میں پڑنے کا مستحق ہے دوسرا شخص اُس دوزخ کو نہیں دیکھ سکے گا۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ لِمَنْ يَّرٰى سے مراد قلبی رویت ہے۔ ظاہری چیزیں ایسی ہوتی ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے مثلاً آگ ہے جب جل رہی ہو تو کسی شخص کے اندر بصیرت کا مادہ ہو یا نہ ہو وہ اُسے دیکھ لے گا لیکن روحانی جہنم بسااوقات موجود تو ہوتی ہے مگر نظر نہیں آتی۔ پس اس صورت میں دنیوی لحاظ سے لِمَنْ يَّرٰى کے یہ معنے ہوں گے کہ جہنم جس کی آنکھیں ہوں گی اُسے نظر آ جائے گی اور جس کی آنکھیں نہیں ہوں گی اُسے نظر نہیں آئے گی۔ کیونکہ یہ وہ جہنم ہے جس کے دیکھنے کے لئے بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے گویا اس رویت سے مراد ظاہری رویت نہیں بلکہ قلبی رویت ہوگی۔ مثلاً جب اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو بھیجتا ہے تو اُن کے آنے پر ایمان لانے والے آہستہ آہستہ بڑھنا

شروع ہو جاتے ہیں اور انکار کرنے والے آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اب جس کی بصیرت ہوتی ہے وہ تو جانتا ہے کہ ایک قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تائید کا ہاتھ کام کرتا نظر آتا ہے اور دوسری قوم اس کی نصرت و مدد سے محروم ہو رہی ہے مگر جسے بصیرتِ روحانی حاصل نہیں ہوتی وہ کہہ دیتا ہے کہ یہ بھی کوئی بڑی بات ہے دنیا میں ہمیشہ قومیں گھٹتی بڑھتی ہیں یہ کوئی معجزہ نہیں کہ ایک قوم بڑھ رہی ہے اور دوسری گھٹ رہی ہے۔ گویا ایک قوم کو نظر آ رہا ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ جہنم کی طرف جا رہے ہیں مگر انہیں اپنا جہنم نظر ہی نہیں آتا۔ اسی طرح یہاں بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى میں دیکھنے سے مراد قلبی رویت بھی لی جاسکتی ہے کہ جس کے اندر بصیرت پائی جاتی ہوگی صرف وہ اس جہنم کو قبل از وقت دیکھ سکے گا۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق تاریخوں میں ذکر آتا ہے کہ آپ جب مکہ فتح کرنے کے لئے تشریف لائے تو اس وقت آپ نے صحابہؓ کو خاص طور پر ہدایت دے دی کہ اس موقعہ پر اپنی کسی شان کا اظہار نہیں کرنا۔ بلکہ جب ایک مسلمان افسر نے کہا کہ آج ہم مکّہ کی حرمت کو چاک کر کے رکھ دیں گے اور ان کفار کو بتا دیں گے کہ انہوں نے ہم پر جو مظالم کئے تھے اُن کا کیا انجام نکلا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فوراً اُسے اپنے عہدہ سے برطرف کر دیا اور اس کے بیٹے کو اس کی جگہ مقرر کر دیا (السیرۃ النبویۃ جلد ۲ مصنّفہ احمد زینی زیر عنوان غزوۃ الفتح الاعظم وھو فتح مکہ شرفھا اللہ تعالیٰ) اس کی یہی وجہ تھی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم دیکھ رہے تھے کہ آج کفّار کے لئے جو جہنم پیدا ہوگئی ہے وہ اُن کی طاقتِ برداشت سے بالکل باہر ہے اور آپ چاہتے تھے کہ اُن کی تکلیف کو جتنا بھی ہو سکے کم کیا جائے چنانچہ آپ نے حکم دے دیا کہ جو لوگ اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ جائیں گے ان کو کچھ نہیں کہا جائے گا (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام ذکر الاسباب الموجبۃ المسیر الی مکۃ و ذکر فتح المکۃ)۔ اس میں بھی دراصل یہی حکمت تھی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اگر کفار اپنے گھروں سے باہر نکلے اور انہوں نے مسلمانوں کے ایک عظیم الشان لشکر کو مکّہ کی گلیوں میں پھرتے دیکھا تو ان کو سخت تکلیف ہوگی پس آپ نے چاہا کہ ان کے اس عذاب کو جس قدر ہلکا کیا جا سکے ہلکا کر دیا جائے۔ اسی لئے آپ نے یہ احکام دئے۔ ان معنوں کے لحاظ سے لِمَنْ يَّرٰى میں مومن بھی شامل ہیں لیکن پہلے معنوں کے لحاظ سے لِمَنْ يَّرٰى میں صرف کافر ہی شامل ہیں۔

درحقیقت رویت کئی قسم کی ہوتی ہے ایک رویت جسمانی ہوتی ہے۔ ایک رویت حسّی ہوتی ہے۔ ایک رویت عرفانی ہوتی ہے۔ ایک رویت علمی ہوتی ہے۔ ایک رویت قلبی ہوتی ہے۔ رویتِ حسّی یا رویتِ جسمانی کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ صرف کافر ہی اس جہنم کو دیکھے گا کیونکہ وہی اس میں پڑنے کا مستحق ہے۔ اور رویتِ عرفانی

یا رویتِ قلبی کے لحاظ سے مومن بھی اس رویت میں شامل ہو گا اور اُسے کفار کے اس دُکھ اور عذاب کا علم ہو گا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى کے یہ معنے بھی ہیں کہ جہنم اس شخص کے لئے ظاہر کر دی جائے گی یا اُس شخص کو دکھا دی جائے گی جو اُسے دیکھنے کا مستحق ہے پس اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دنیوی دوزخ کا ہی ذکر ہو رہا ہے کیونکہ اگلا دوزخ تو ہر ایک کو نظر آ جائے گا اُس میں ایسی کسی شرط کی ضرورت نہیں ہے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۸﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۹﴾

پس جس نے سرکشی اختیار کی اور ورلی زندگی کو (آخرت پر) ترجیح دی تو

فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۰﴾

یقیناً جہنم (ہی اس کا) ٹھکانہ ہے۔

حَل لُغَات۔ اَلْمَاْوٰى اَلْمَاْوٰى اِسْمٌ لِلْمَكَانِ الَّذِيْ يَاْوِيْ اِلَيْهِ۔ پناہ لینے کی جگہ۔ (مفردات)

تفسیر۔ پس وہ جس نے سرکشی کی اور ورلی زندگی کو اختیار کیا۔ اُخروی زندگی کا اُس نے کوئی خیال نہ رکھا وہ اُس دن کو دیکھ لے گا جب جہنم اُس کا ٹھکانہ ہوگی۔ هِيَ الْمَاْوٰى سے مراد هِيَ الْمَاْوٰى لَهٗ ہے کہ جہنم اُس کا مَاْوٰى یعنی ٹھکانہ ہوگی۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ

اور جس نے اپنے رب کے درجہ سے خوف کیا اور (اپنے) نفس کو گری ہوئی خواہشوں سے روکا تو یقیناً

الْهَوٰى ﴿۴۱﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۲﴾

جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔

تفسیر۔ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ کے دو معنے ہیں یہ بھی معنے ہیں کہ وہ اپنے رب کی شان اور رُتبہ سے ڈرتا ہے اور یہ معنے بھی ہیں کہ وہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے۔ گویا مَقَامَ رَبِّهٖ کے معنے مَقَامَهٗ اَمَامَ رَبِّهٖ کے بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتے کہ وہ اُس کی شان اور عظمت کا خوف رکھتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو

انسان کو گناہ سے بچاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ کی شان اور عظمت کا خوف اعلیٰ مقام رکھنے والے مومن کو گناہوں سے بچاتا ہے اور مُجرم کے طور پر اُس کے سامنے پیش ہونے کا خوف ادنیٰ درجہ کے انسان کے لئے نجات کا موجب ہوتا ہے۔ بڑا مجرم تو کسی بات کی بھی پروانہیں کرتا لیکن چھوٹا مجرم ڈرتا ہے کہ اگر وہ اسی جرم کی حالت میں خدا تعالیٰ کے سامنے پیش ہوا تو اُس کو کیا جواب دے گا۔ لیکن بڑا مومن خدا تعالیٰ کے درجہ اور اُس کی شان کو دیکھ کر ڈرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اور بھی ترقی کرنی چاہیے میرا رب چھوٹے مقام پر رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ وہ یہی چاہتا ہے کہ اُس کا بندہ اُس کی محبت اور قرب کے مراتب میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرے۔

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى۔ ھَوٰی کے معنے ہوا و ہوس اور خواہشاتِ نفسانی کے بھی ہوتے ہیں اور ھَوٰی کے معنے گرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ چونکہ بلند ہے اور ہوا و ہوس کی پیروی انسان کو نیچے کی طرف لے جاتی ہے اس لئے جو شخص خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے چلتا ہے وہ گر جاتا ہے اور گرنے کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے بہت دور چلا جاتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ خدا تعالیٰ یہاں تلازم کے طور پر ایک ایسا لفظ لایا ہے جو خدا تعالیٰ سے دور جانے کی حقیقت کو بھی واضح کر رہا ہے کیونکہ ھَوٰی صرف خواہشاتِ نفسانی کو ہی نہیں کہتے بلکہ گرنے کو بھی کہتے ہیں اس میں درحقیقت اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کی پیروی انسان کو گرا دیتی ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ بہت بلند ہے اس لئے ایسا انسان اللہ تعالیٰ کے قرب کے راستوں سے دُور چلا جاتا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ﴿۴۳﴾

وہ تجھ سے اس گھڑی کے متعلق پوچھتے ہیں (کہ) اس کا آنا کب ہوگا

فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ؕ﴿۴۴﴾

تجھے اس کے (آنے کے) ذکر سے کیا تعلق۔

حَلّ لُغَات۔ اَلسَّاعَةُ اَلْقِيَامَةُ وَقِيْلَ اَلْوَقْتُ الَّذِىْ تَقُوْمُ فِيْهِ الْقِيَامَةُ۔ السَّاعَةَ کے معنے قیامت کے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں اس وقت کا نام سَاعَت ہے جس میں قیامت برپا ہوگی۔ اَلْبُعْدُ۔ دُوری اَلْمُشَقَّةُ۔ تکلیف اَلْهَالِكُوْنَ۔ ہلاک ہونے والے لوگ۔ اس معنے میں سَاعَةٌ سَائِع کی جمع سمجھی جائے گی۔ نیز

اَلسَّاعَةُ کے معنے ہیں دن یا رات کا کوئی حصہ جس کو اُردو میں ایک گھڑی سے تعبیر کرتے ہیں۔(اقرب)

اَلْمُرْسٰی اَلْمُرْسٰی اَرْسٰی سے اسم مفعول یا ظرف ہے اور اَرْسَی السَّفِیْنَةَ کے معنے ہیں اَوْقَفَهَا عَلَی الْاَنْجَرِ۔ کشتی یا جہاز کو ان کی بندرگاہ پر لنگر انداز کر دیا یَسْئَلُوْنَكَ اَیَّانَ مُرْسٰهَا اَیْ مَتٰی وَقُوْعُهَا یعنی کب یہ پیشگوئیاں پوری ہوں گی۔(اقرب)

فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا اس کے ذکر سے تجھے کیا۔ فِیْمَ اَنْتَ ایک محاورہ ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ تجھے اس سے کیا واسطہ۔ یعنی اس ذکر سے تیرا کیا تعلق کہ ایسا کب ہوگا اور کب یہ باتیں وقوع میں آئیں گی۔

تفسیر۔ پیشگوئیوں کے ظہور کا وقت بتایا جانا ضروری نہیں اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیشگوئیوں میں وقت کا بتانا ضروری نہیں ہوتا اور نہ اس سے اصل معاملہ کا کوئی تعلق ہوتا ہے جب تم پر عذاب ہی آنا ہے تو وہ دو دن پہلے آ گیا یا دو دن بعد میں آ گیا۔ اس سے اصل پیشگوئی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پیشگوئیوں کے التواء میں بعض حکمتیں بھی ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو دوسری جگہ بیان بھی کیا ہے لیکن دشمن کا ہمیشہ یہ سوال رہتا ہے کہ جب ایک پیشگوئی کی گئی ہے تو اس کے پورا ہونے کی تاریخ بھی بتا دی جائے اور اس امر کا بھی اظہار کر دیا جائے کہ ایسا کب ہوگا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمہیں اس سے کیا واسطہ۔ جب پیشگوئی پوری ہو گئی تم میں سے ہر شخص کو نظر آ جائے گا کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔ تمہیں اس کی تاریخ اور وقت اگر بتا بھی دیا جائے تو تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ حیرت آتی ہے کہ باوجود اس کے کہ قرآن کریم میں یہ ذکر آتا ہے کہ کفار یہ کہا کرتے تھے کہ جو پیشگوئیاں ہمارے سامنے کی جارہی ہیں وُہ کب پوری ہوں گی۔ اور باوجود اس کے کہ قرآن کریم میں یہ جواب دیا گیا ہے کہ پیشگوئیوں کے پورا ہونے کا وقت بتانا ضروری نہیں تم اگر ایک سال پہلے مرے یا ایک سال پیچھے مرے تمہارے لئے پیشگوئی کا وقت معلوم ہو جانے میں کوئی فائدہ نہیں تم نے تو بہر حال ہلاک اور تباہ ہونا ہے۔ مگر پھر بھی یہی اعتراض مخالفین کی طرف سے بار بار کیا جاتا ہے کہ جس عذاب کے آنے کی خبر دی گئی ہے وہ عذاب آئے گا کب۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر مخالفین سلسلہ کی طرف سے بار بار یہی اعتراض کیا جاتا رہا کہ پیشگوئیاں مبہم رنگ میں کی جاتی ہیں اُن کے پورا ہونے کا وقت نہیں بتایا جاتا۔ حالانکہ یہ ایسا سوال ہے جس کے جواب سے مخالفین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ نبی کی اصل پیشگوئی تو یہ ہوتی ہے کہ میں کامیاب ہوں گا اور دنیا میرے مقابلہ میں ناکام رہے گی۔ یہ پیشگوئی ایسی ہے جس کے لئے کسی خاص وقت کی تعیین کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ اس میں کوئی ابہام ہوتا ہے۔ مخالف اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ وہ تباہ ہوتے جا رہے ہیں اور نبی کو ماننے

والے غالب آتے جارہے ہیں مگر پھر بھی ان کی طرف سے یہ سوال جاری رہتا ہے کہ ہمیں وقت بتایا جائے ایسا کب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہیں اس سے کیا واسطہ۔ تم نے تو بہرحال تباہ ہونا ہے تمہیں اگر بتا بھی دیا جائے کہ تم مثلاً چار سال کے بعد تباہ ہوگے تو تمہیں کیا فائدہ ہوگا جب تباہی آئے گی اس وقت خود بخود پیشگوئی کی صداقت واضح ہوجائے گی۔

فرماتا ہے یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ یہ لوگ تجھ سے تیری اُن پیشگوئیوں کے بارہ میں جو اسلام کی ترقی اور کفر کے نابود ہونے کے متعلق ہیں سوال کرتے ہیں اور کہتے ہیں اَیَّانَ مُرْسٰىهَا ذرا یہ تو بتایئے کہ آپ کا جو بڑا بھاری جہاز کفار کی تباہی کے لئے آنیوالا ہے وہ کب لنگر انداز ہوگا؟ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا میں بظاہر تفخیم ہے لیکن درحقیقت اس سے مراد اُن کی تحقیر ہے کہ یہ بُلبلہ پھوٹے گا کب؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا تجھے اس سے کیا واسطہ اس ساعت نے تو تمہیں خدا تک پہنچانا ہے پھر تمہیں اس سے کیا کہ وہ تمہیں چند دن آگے پہنچا دیتی ہے یا پیچھے پہنچا دیتی ہے۔ ساعت کے متعلق تمہارا اس قدر اصرار کرنا اور کہنا کہ اس کی تاریخ بتلا دی جائے بالکل غلط ہے۔ یہ ساعت تو ایسی ہے جو لوگوں کو ایک دن خدا تک لے جائے گی۔ کسی کو مجرم بنا کر اور کسی کو مومن بتا کر۔ پس جب ایسا عظیم الشان تغیر پیدا ہونا ہے کہ خدا تعالیٰ کے سامنے کسی نے مجرم ہونے کی حیثیت میں پیش ہونا ہے اور کسی نے مومن ہونے کی حیثیت میں پیش ہونا ہے تو پھر اس میں ابہام کون سا رہا اور تاریخ پوچھنے کی ضرورت ہی کیا رہی ہم تو تمہارے سامنے یہ خبر پیش کررہے ہیں کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب ہر شخص خدا تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوگا کہ کچھ لوگ مجرموں کی حیثیت میں اس کے سامنے کھڑے ہوں گے اور کچھ لوگ مومنوں کی حیثیت میں اس کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ کچھ لوگ انعام حاصل کریں گے اور کچھ لوگ عذاب کے مورد بنیں گے۔ اتنی بڑی خبر کے لئے کسی تاریخ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی جب یہ بات وقوع میں آئی تمہیں خود بخود اس کی صداقت معلوم ہو جائے گی۔

اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿۴۵﴾ؕ

اس (کے وقت) کی انتہاء (کی تعیین) تو تیرے رب سے تعلق رکھتی ہے۔

تفسیر۔ اس آیت میں پیشگوئیوں کے وقوع کی تاریخ معلوم کرنے کی لغویت بتائی ہے اور بتایا ہے کہ وقت معلوم کرنے سے فائدہ کیا۔ اصل غرض تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا جلال ظاہر ہوجائے سو وہ ایک دن ظاہر ہوجائے گا

اور وہ گھڑی انسانوں کو خدا تعالیٰ تک لے جائے گی۔ اصل اہمیت تو اسی امر کی ہے سو یہ ہم نے بتا دیا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو مکّہ کے متعلق جب یہ پیشگوئی کی گئی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک دن اس کو فتح کریں گے۔ مسلمان غالب آئیں گے۔ کفار تباہ ہوں گے اور وہ جن کو غلام سمجھ کر مبتلائے آلام کیا جاتا تھا بڑی بڑی عزتیں حاصل کریں گے تو اس کے بعد بھلا یہ کیا سوال رہ جاتا ہے کہ یہ بات جمعہ کو ہوگی یا ہفتہ کو۔ اس سال ہوگی یا اگلے سال ہوگی؟

دوسری صورت میں جب ان آیات کو اُخروی زندگی کے متعلق سمجھا جائے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ تقدیر کے دھاگے تو اس کے ہاتھ میں ہیں اور تمام اسباب اس کے قبضہ وتصرّف میں ہیں اس لئے وہ جب چاہے گا اس کا ظہور کرے گا یعنی جو کچھ ہوتا ہے الٰہی منشاء اور اس کے ارادہ کے ماتحت ہوتا ہے بندوں کا اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ پس جبکہ اس نے تمام تقدیریں اپنے قبضہ میں رکھی ہوئی ہیں تو پھر جب چاہے گا اس ساعت کو ظاہر کردے گا چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ وضاحت کردی گئی ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ (لقمان: ۳۵) قیامت کے دن کا علم سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں۔ یہی بات اس جگہ بیان کی گئی ہے کہ اِلٰی رَبِّکَ مُنۡتَہٰہَا سارے تغیرات تو ہم نے کرنے ہیں تمہارا اس سے کیا واسطہ ہے۔

اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرُ مَنۡ یَّخۡشٰہَا ﴿۴۶﴾ؕ کَاَنَّہُمۡ یَوۡمَ یَرَوۡنَہَا

تُو تو صرف اُس کو جو اس (آفت) سے ڈرتا ہے ہوشیار کرنے والا ہے۔ وہ جس دن اُسے دیکھیں گے (ان کی حالت

لَمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا عَشِیَّۃً اَوۡ ضُحٰہَا ﴿۴۷﴾ؒ

ایسی ہوگی کہ) گویا وہ صرف ایک شام یا اس کی صبح (اس دنیا میں) رہے ہیں۔

رکوع ۲

حل لغات۔ مُنۡذِرٌ مُنۡذِرٌ اَنۡذَرَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اَنۡذَرَ کے معنے ہوتے ہیں کسی امر کی حقیقت سے اُسے آگاہ کیا اور اس امر کے نتائج کے ظاہر ہونے سے پہلے اُسے ہوشیار کردیا۔ نیز اس کے معنے یہ بھی ہوتے ہیں کہ خبر پہنچاتے ہوئے خوب ہوشیار کردیا (اقرب) پس مُنۡذِرٌ کے معنے ہوں گے۔ خبردار کرنے والا۔ خطرے سے خوب ہوشیار کرنے والا۔

اَلۡعَشِیُّ اٰخِرُ النَّہَارِ۔ دن کا آخری حصہ۔ وَقِیۡلَ مِنۡ صَلٰوۃِ الۡمَغۡرِبِ اِلَی الۡعَتَمَۃِ اور بعض کے نزدیک مغرب سے لے کر عشاء تک کا وقت عَشِیٌّ کہلاتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے تُو تو صرف ایک منذر ہے اُس شخص کے لئے جو آنے والے عذاب سے ڈرتا ہے ہاں ہم صرف ایک بات بتادیتے ہیں اور وہ یہ کہ جب وہ عذاب آئے گا تو لَمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا عَشِیَّۃً اَوۡ ضُحٰھَا وہ اتنے شدید عذاب کا دن ہوگا کہ انہیں اپنی ساری گزشتہ ترقی یُوں معلوم ہوگی جیسے صرف چند گھنٹے رہی ۔ یہ عذاب کی شدّت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب انسان کو کوئی شدید تکلیف پہنچے تو اُسے اپنے آرام اور راحت کی گھڑیاں بالکل چھوٹی معلوم ہوتی ہیں اور انسان یوں سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ دُکھ میں ہی مبتلا چلا آ رہا ہے آرام اُسے کبھی نصیب نہیں ہوا۔

پس فرماتا ہے جب وہ عذاب آئے گا تو کفار اپنی ساری گزشتہ شان و شوکت کو بھول جائیں گے اور انہیں اپنی ترقی کا دَور یوں معلوم ہوگا جیسے وہ چند گھنٹے کا تھا۔ چنانچہ دیکھ لو جب عرب کی تاریخ بیان کی جاتی ہے تو پانچ دس صفحوں میں عرب کی تمام پہلی تاریخ آ جاتی ہے اور باقی دس ہزار صفحوں میں اسلامی حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے حالانکہ پُرانی تاریخ کا زمانہ بہت لمبا تھا مگر جب اسلام کا ظہور ہوا تو وہ واقعات ہی مٹ گئے۔ وہ حالات ہی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اب جس کی بھی نظر پڑتی ہے اسلامی دَور پر ہی پڑتی ہے پہلے زمانہ کے حالات پر نہیں پڑتی چنانچہ تاریخ کی کتابیں لکھنے والے چند صفحوں میں سارے عرب کی تاریخ لکھ دیتے ہیں اور پھر ہزاروں صفحات رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مسلمانوں کے حالات کے لئے وقف کر دیتے ہیں پس جس طرح انسانی زندگی کے مقابلہ میں عشیّہ اور ضحیٰ کا نہایت قلیل حصہ ہوتا ہے اسی طرح فرماتا ہے اسلام کے مقابلہ میں تمہاری تاریخیں مٹ جائیں گی۔تمہاری عظمتیں جاتی رہیں گی۔تمہاری شان و شوکت کی داستانیں دنیا سے محو ہو جائیں گی اور کوئی شخص تمہارے باپ دادا کے کارناموں بلکہ ان کے ناموں تک سے بھی واقف نہیں رہے گا۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے الہامًا فرمایا کہ یَنۡقَطِعُ اٰبَآئُکَ وَیُبۡدَأُ مِنۡکَ (تذکرہ صفحہ ۵۹ ایڈیشن ۲۰۲۲ء) یعنی تیرے آباء کا ذکر منقطع کر دیا جائے گا اور تجھ سے آئندہ تاریخ کا ابتداء کیا جائے گا چنانچہ دیکھ لو اگر کوئی تاریخ لکھنا چاہے تو وہ چند صفحوں میں ہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تمام آباؤ اجداد کے حالات ختم کر دے گا اور اصل تاریخ اس وقت سے شروع کرے گا جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر آئے گا۔ حالانکہ دنیوی لحاظ سے وہ بہت بڑی شان رکھتے تھے مگر باوجود اس کے کہ اپنے زمانہ مین وہ بہت بڑی عظمت رکھتے تھے اللہ تعالیٰ نے یہی فیصلہ کیا کہ آئندہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تاریخ کی ابتدا کرے اور آپ کے آباء کے ذکر کو منقطع کر دیا جائے۔ اسی طرح فرماتا لَمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا عَشِیَّۃً اَوۡ ضُحٰھَا ہم ان کی تاریخ کو اتنا چھوٹا کر دیں گے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ان کے مقابلہ میں اتنی عظمت دیں گے کہ عرب کی ساری تاریخ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

کی عشیّہ یا ضحیٰ جتنی رہ جائے گی۔

عَشِیّۃ کو پہلے اور ضُحٰی کو بعد میں بیان کرنے کی حکمت ضُحٰھَا کی ضمیر عَشِیَّۃ کی طرف جاتی ہے اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوپہر تو پہلے آتی ہے اور شام بعد کو پھر اس جگہ عَشِیّۃ کو پہلے اور ضحیٰ کو بعد میں کیوں بیان کیا گیا ہے؟ وہ لوگ جو قرآن کریم کی حکمتِ کاملہ اور فصاحت فوق البشریّہ پر پوری آگاہی نہیں رکھتے کہہ دیں گے کہ قافیہ کے لئے ایسا کر دیا گیا ہے چونکہ پہلی آیتوں کا خاتمہ مُرْسٰهَا۔ ذِكْرٰهَا مُنْتَهٰهَا۔ يَخْشٰهَا کے الفاظ پر ہوا تھا وزن ملانے کے لئے یہاں بھی عَشِیَّۃ کو پہلے کر دیا گیا ہے اور ضُحٰھَا کو بعد میں رکھ دیا گیا ہے۔ مگر فصاحت قرآنیہ اور اس کے معجزۂ بیان کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ جواب صحیح نہ ہوگا۔ قرآن کریم صرف لفظی رعایت کی وجہ سے مضمون کو کبھی نہیں بگاڑتا۔

اصل بات یہ ہے کہ دن یا بعض حصّہ دن تھوڑے وقت کے بیان کرنے کے لئے قرآن کریم میں آتا ہے جیسے کہ سورہ مومنون آیت ۱۱۴ میں کفار کی نسبت آیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ دنیا میں رہے۔ وہی محاورہ دوسرے الفاظ میں اس جگہ بیان ہوا ہے دن کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے چوبیس گھنٹوں کے وقت کو بھی دن کہتے ہیں اور صبح سے شام تک کے وقت کو بھی دن کہتے ہیں ان آیات میں صبح سے شام تک کے وقت کا نام دن رکھا گیا ہے اور صبح سے شام تک کے وقت میں لمبا وقت وہ ہے جو شام کو ختم ہوا اور چھوٹا وقت وہ ہے جو دوپہر کو ختم ہو۔ چونکہ اس جگہ یہ امر بتانا مقصود ہے کہ کفّار کی سب ترقیات ہیچ اور لغو تھیں کیونکہ انجام سزا اور عذاب کی صورت میں ہوا۔ اس لئے عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا کہہ کر بتایا گیا ہے کہ منکرین اسلام کا انجام دو طرح کا ہوگا۔ بعض دشمن تو وہ ہیں جن کی مثال ایسی ہوگی کہ وہ اپنی دنیوی ترقیات کا زمانہ ختم کر چکے ہیں اور اپنی عمر کی شام کو پہنچ چکے ہیں اور وہ اب اسلام سے ٹکرا کر تباہ ہو جائیں گے لیکن بعض ایسے ہیں کہ جنہوں نے اپنی دنیوی ترقی کا زمانہ دیکھا بھی نہیں اب اُن پر جوانی کا زمانہ آیا ہے وہ بھی بوجہ اسلام سے ٹکرانے کے تباہ ہو جائیں گے گویا یہ لوگ شام کا مُنہ بھی دیکھنے نہ پائیں گے اپنی قومی زندگی کی دوپہر کو ہی ہلاک ہو کر عبرت بن جائیں گے۔ یہ وہی مضمون ہے جو کسی شاعر نے ان الفاظ میں باندھا ہے ؎

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے

غرض جب تباہی کا ذکر کرنا ہو تو بلاغت کا مطالبہ ہوتا ہے کہ پہلے لمبے زمانہ کا ذکر کیا جائے پھر چھوٹے کا۔ اس

لئے یوں فرمایا کہ ان لوگوں میں سے بعض تو شام تک پہنچے اور بعض دو پہر تک ہی پہنچے تھے کہ ہلاک ہو گئے۔ اسی مناسبت سے جہاں یوم اور بعض یوم کے الفاظ استعمال کئے ہیں وہاں بھی یوم کا ذکر پہلے کیا ہے اور بعض یوم کا بعد میں۔ پس ضُحٰهَا کو بعد میں قافیہ کی غرض سے بیان نہیں کیا۔ بلکہ اس لئے بعد میں بیان کیا ہے کہ ضحیٰ چھوٹے عرصہ پر دلالت کرتا ہے اور اس مقام پر لمبے عرصہ کا ذکر پہلے اور چھوٹے کا بعد میں ہی مناسب ہے کیونکہ لمبا عرصہ گزارنا چھوٹے عذاب پر دلالت کرتا ہے اور تھوڑا عرصہ گزارنا بڑے عذاب پر۔ اور ترتیب مناسب یہی ہے کہ جب عذاب کا ذکر ہو تو پہلے چھوٹے عذاب کا ذکر کیا جائے اور بعد میں بڑے عذاب کا۔ تا تدریج و ترتیب مدنظر رہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اسلام کی عظمت اور اس کی ترقی کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کفر کا زمانہ بالکل سُکڑ جائے گا اور اسلام کا زمانہ اتنا پھیلے گا۔ اتنا پھیلے گا کہ اسلامی ترقی کے زمانہ کے مقابلہ میں کفار کو اپنا زمانہ ایسا ہی نظر آئے گا جیسے انسانی عمر کے مقابلہ میں ایک عشیّہ یا ضحیٰ کی حیثیت ہوتی ہے۔

سُوْرَۃُ عَبَسَ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ عبس۔ یہ سورۃ مکّی ہے

وَھِیَ اثْنَتَانِ وَ اَرْبَعُوْنَ آیَۃً دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَ فِیْھَا رُکُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے بغیر بیالیس آیتیں ہیں اور ایک رکوع ہے۔

سورۃ عبس مکّی ہے سورۃ عبس مکی سورۃ ہے اور بہت ہی ابتدائی سورتوں میں سے ہے (روح المعانی تفسیر سورۃ عبس)۔ یوروپین مصنّفین بھی اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ابتدائی مکّی سورۃ ہے چنانچہ نولڈک Noldeke جرمن مستشرق ابتدائی زمانہ کی بھی ابتدائی سورتوں میں اس کو شامل کرتا ہے۔ میور MUIR بھی اِسے اُن پہلی سورتوں میں سے قرار دیتا ہے (Comprehensive Commentary on the Quran by Wherry vol.4 pg 218) جنہیں کفار پر ظاہر کیا گیا یعنی پہلی چند سورتوں کے متعلق مستشرقین کا خیال ہے کہ اُن کا اعلان اُن سورتوں کے نزول کے وقت ہی نہیں ہوا بلکہ کچھ عرصہ بعد ہوا۔ پس میور کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائی چند سورتوں کے بعد یہ نازل ہوئی۔

سورۃ عبس کا پہلی سورۃ سے تعلق اس سورۃ کا پہلی سورۃ کے ساتھ ایک تو قریبی تعلق ہے اور ایک سارے مضمون کے لحاظ سے۔ قریبی تعلق تو یہ ہے کہ پچھلی سورۃ کی آخری آیت سے پہلی آیت میں یہ مضمون تھا کہ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰھَا۔ کہ ڈرانا اسی کو مفید ہوسکتا ہے جو یَوْمُ الْحِسَاب یا انجامِ اعمال سے ڈرتا ہو۔ یَخْشٰھَا کی ضمیر سَاعَۃٌ کی طرف جاتی ہے اور ہم سَاعَۃٌ کے دونوں معنے کرتے ہیں۔ حیات بعد الموت بھی اور غلبہ اسلام یا غلبہ قرآن بھی۔ پس اس میں ان دونوں باتوں کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰھَا۔ (النازعات: ۴۶) جو شخص حیات بعد الموت سے خوف رکھتا ہو یا اپنے اعمال کے انجام سے ڈرتا ہو کہ جو اعمال میں کر رہا ہوں اُن کے نتیجہ میں تو اسلام جیتتا نظر آتا ہے اور میں ہارتا دکھائی دیتا ہوں اُس شخص کو یہ انذار مفید ہوسکتا ہے چنانچہ اسی لحاظ سے اب اس سورۃ میں ذکر فرماتا ہے کہ اُن لوگوں کی طرف زیادہ توجہ کرو جو حق کو غور سے سُننے کے شائق ہیں اور حق کی قبولیت کا استحقاق اپنے اندر رکھتے ہیں۔ حق کی قبولیت کا استحقاق کئی طرح سے ہوتا ہے۔ اوّل اعمال سے یعنی ایک شخص کے اندر جہاں تک اُس کا ایمان ہے خشیۃ اللہ پائی جاتی ہے یا سنجیدگی پائی جاتی ہے اور وہ دین کی باتوں کو غور سے سُنتا ہے اور یا پھر قومی استحقاق اس طرح ہوتا ہے کہ جب بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے انبیاء آتے ہیں بالعموم ادنیٰ اور غریب طبقہ کے لوگ اُن کی طرف آتے ہیں گویا انبیاء کی بعثت پر نوّے فی صدی احتمال یہ

ہوگا کہ غرباء جلدی دین کو سیکھیں گے۔ اگر کسی نبی کی جماعت زیادہ تر امراء کی طرف توجہ رکھے گی تو وہ اپنے دائرہ ترقی کو محدود کر دے گی۔ بے شک امراء بھی آتے ہیں مگر نسبت سے کم۔ اس فرق کو بھی قرآن کریم نے کئی جگہ بیان فرمایا ہے۔

مضمون کے لحاظ سے اس کا پہلی سورۃ سے یہ تعلق ہے کہ پہلی سورۃ میں اور اس سے بھی پہلی سورۃ میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ نے اسلام کی ترقی مقدر کی ہے اور اس کے ذرائع بھی بتائے گئے تھے جو یہ تھے۔ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا۔ وَّ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا۔ وَّ السّٰبِحٰتِ سَبْحًا۔ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا۔ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا۔ اب یہ بتاتا ہے کہ جس طرح ساعت کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے کہ وہ کب ظاہر ہوگی۔ اسی طرح اس بات کا علم بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے کہ وہ کن لوگوں کے ہاتھ سے ظاہر ہوگی اور وہ نَازِعَات اور نَاشِطَات اور سَابِحَاتِ اور سَابِقَات اور مَدَبِّرَات بننے والے کون ہوں گے مطلب یہ کہ وہ لوگ جو قوم میں بظاہر بڑے نظر آتے ہیں بظاہر بڑے ہوشیار اور کام کرنے والے دکھائی دیتے ہیں۔ ہماری یہ مراد نہیں کہ تمہیں وہ لوگ مل جائیں گے کیونکہ ہوسکتا تھا کہ یہ خیال کر لیا جاتا کہ النَّازِعَات سے فلاں فلاں آدمی مراد ہیں یا فلاں فلاں کام کرنے والے مراد ہیں یا فلاں فلاں بڑے آدمی مراد ہیں اور اس طرح قیاس کر لیا جاتا کہ یہ یہ شخص اس سے مراد ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ایسا نہیں ہے جس طرح خدا تعالیٰ نے ساعت کا علم اپنے پاس رکھا ہوا ہے اسی طرح نَازِعَات بننے والی روحیں اور نَاشِطَات اور سَابِحَات اور سَابِقَات اور مُدَبِّرَات بننے والی روحیں بھی خدا تعالیٰ کے علم میں ہی ہیں تم اُن کے متعلق کوئی قیاس نہیں کر سکتے۔ تم ظاہر میں سمجھو گے کہ فلاں فلاں شخص قابل ہیں لیکن درحقیقت وہ اندرونی طور پر قابل نہیں ہوں گے۔ یہ علم بھی سَاعَۃ کی طرح خدا تعالیٰ نے اپنے پاس ہی رکھا ہوا ہے گویا اَلنَّازِعَات کے مستحق لوگ خدا تعالیٰ کے علم میں ہیں وقت پر وہ اُن کو لاتا جائے گا خود اُن کی جستجو کرنا مفید نہیں ہوسکتا۔ خدا تعالیٰ کی سُنّت ہے کہ وہ اپنے سلسلہ کو اُن لوگوں کی معرفت ترقی نہیں دیتا جو پہلے سے جانے بوجھے ہوتے ہیں بلکہ اُن کے ذریعہ سے ترقی دیتا ہے جو کلّی طور پر اُس دین سے عزت پاتے ہیں جن کی نسبت یہ کہا جائے کہ دین نے اُن سے عزت پائی وہ سچے دین کے قابل نہیں۔ سچے دین کے قابل وہی ہوتا ہے جس کے متعلق کہا جائے کہ دین سے اُس نے عزت پائی۔ نبی کے زمانہ میں اُس کے اَتباع خدا تعالیٰ کی طرف اشارہ نہیں کرتے کہ اے لوگو! اُس کو مان لو۔ بلکہ خدا تعالیٰ ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ لوگو یہ وہ ہیں جن کو میں خدمت دین کے لئے چُنتا ہوں۔ پس اس سورۃ میں اَلنَّازِعَات کی جماعت کی تشریح کی گئی ہے اور اُن کے انتخاب کا طریق بتایا گیا ہے جو یہ ہے کہ وقت پر اللہ تعالیٰ اُن

کو خود ظاہر کرے گا۔ چنانچہ اسلام کی تاریخ کو دیکھ لو جتنے لوگ چُنے گئے وہ وہی ہیں جن کی صداقت اور نیکی کا دشمن معترف تھا۔لیکن اس زمانہ کے ماحول کے مطابق اگر دنیا کو کہا جاتا کہ اس کام کے لئے آدمیوں کو چنو تو وہ کبھی اُن کو نہ چنتی۔ کیونکہ گو اُن کے اندر مخفی قابلیتیں تھیں لیکن ایک مبہم خیال سے زیادہ لوگ ان کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ آخر مکّہ والے ابوبکرؓ کی قابلیت کے تو قائل تھے مگر سرداری کے لئے تو انہوں نے ابوجہل، عتبہ اور شیبہ کو ہی چنا ہوا تھا۔ کیونکہ ابوبکرؓ کے اندر وہ ایک مبہم نیکی پاتے تھے۔ ظاہری قابلیتیں ان کو عتبہ، شیبہ اور ابوجہل میں ہی نظر آتی تھیں۔ اسی طرح عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، زبیرؓ اور طلحہؓ وغیرہم میں سے ایک بھی نہیں تھا جس کو قوم نے اپنی سرداری کے لئے منتخب کیا ہو۔ اسی طرح یمن میں مثلاً ابوموسیٰ اشعری ایمان لائے اور یہود میں سے عبداللہ بن سلام ایمان لائے۔ مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر اُن کی قومیں منتخب کرتیں تو وہ انہی لوگوں کو کرتیں۔ یقیناً وہ دوسروں کو کرتیں لیکن اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مبہم اقرار اُن کی نیکی کا لوگوں کے دلوں میں ضرور موجود تھا۔

غرض یہ لوگ ایسے تھے کہ قوم میں کسی تغیر کا پیدا کرنا ان سے متوقع نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر تغیر پیدا انہوں نے ہی کیا اور جن سے تغیر متوقع ہو سکتا تھا وہ محروم رہ گئے۔ پس یہ ایک نہایت ہی اہم معاملہ قومی ترقی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس مضمون پر اس سورۃ میں خاص طور پر بحث کی گئی ہے کہ جب قوموں پر تغیر کا زمانہ آتا ہے تو اصل قابلیتیں دب جاتی ہیں اور جھوٹی قابلیتیں ابھر آتی ہیں لوگوں کے مزاج کچھ ایسے بگڑ جاتے ہیں کہ حقیقی نیکی کو وہ پسند نہیں کرتے اور مظاہرے اور بناوٹ اور قوم کی رگ پہچاننے کو وہ زیادہ قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں وہ اس شخص کو آگے نہیں آنے دیتے جو حقیقی لیڈر ہو۔ بلکہ اُسے آگے لاتے ہیں جو نام کا تو لیڈر ہو لیکن واقعہ میں قومی رسوم اور عادات کے پیچھے چلنے والا ہو اس لئے زمانۂ ظلمت کی اصلاح کے لیڈر کا چننا لوگوں کے لئے ناممکن ہوتا ہے کیونکہ ان کی فطرتیں مسخ اور غلامانہ بن چکی ہوتی ہیں جو اس نیک جدّت کو بھی جو رسم و رواج کے خلاف ہو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں پس اس انتخاب کا حق اللہ تعالیٰ اپنے قبضہ میں رکھتا ہے کیونکہ خدا کی نظر دلوں پر ہوتی ہے صرف منہ کی باتیں وہ پسند نہیں کرتا۔ ایک عام انسان تو کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ لوگ لائق ہیں تو آگے کیوں نہیں آ گئے لیکن خدا جانتا ہے کہ اُن کا آگے نہ آنا حالات کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے ہے۔ قوم کے حالات ہی گندے ہو جاتے ہیں اور اس گندی زمین میں کوئی پاکیزہ درخت اُگ ہی نہیں سکتا اور جب تک اس زمین میں سے اُن کو نہ اکھاڑا جائے وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ اسی کی طرف سورۂ نازعات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ قابل تو یہ ہیں مگر زمین خراب ہے اس زمین میں یہ اُگ نہیں سکتے۔ اب ہم ایک نئی زمین ان لوگوں کے لئے پیدا کریں گے تب اُن کی قابلیتیں تمہیں نظر آنے لگ جائیں گی۔ چنانچہ ہم

دیکھتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے۔ جب مکّہ میں یہ خبر اُس جگہ پہنچی جہاں اُن کے والد بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے مدینہ سے آنے والے ایک آدمی سے پوچھا کہ سناؤ مدینہ کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں انہوں نے پوچھا تو پھر مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ انہوں نے ایک آدمی کی بیعت کر لی ہے۔ انہوں نے کہا کس آدمی کی؟ وہ کہنے لگا ابوبکرؓ کی۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا کون ابوبکرؓ؟ اُس نے جواب دیا ابن ابی قحافہ۔ کہنے لگے کون ابو قحافہ؟ اُس نے کہا تم۔ پھر انہوں نے مختلف خاندانوں کے نام لے کر پوچھا کہ کیا انہوں نے بیعت کر لی ہے؟ جب اُس نے بتایا کہ انہوں نے بیعت کر لی ہے تو وہ کہنے لگے بنو ہاشم کا کیا حال ہے۔ کیا انہوں نے بھی بیعت کر لی؟ اُس نے کہا ہاں۔ پھر انہوں نے بعض اور قبائل کے متعلق پوچھا اُس نے یہی جواب دیا کہ اُنہوں نے بھی بیعت کر لی ہے۔ ابو قحافہ ظاہر میں تو اسلام لے آئے تھے لیکن ابھی پورے طور پر اُن کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوا تھا جب انہوں نے یہ باتیں سُنیں تو تھوڑی دیر تک خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا سر اٹھایا اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں (طبقات الکبریٰ لابن سعد جلد سوم صفحہ ۱۸۴ زیر عنوان ذکر بیعۃ ابی بکر)۔ گویا یہ دن اُن کے ایمان کی صفائی کا تھا جس میں اُن کو اسلام کی سچائی کے متعلق حقیقی بصیرت حاصل ہوئی۔ اُن کے ذہن میں یہ کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ کوئی دن ایسا بھی آسکتا ہے جب ابوبکرؓ کو عرب کے سارے قبائل اپنا خلیفہ اور بادشاہ مان لیں گے اور یہ بات بھی ٹھیک ہے جس ابوبکرؓ کو انہوں نے پالا تھا اور جس نگاہ سے انہوں نے ابوبکرؓ کو دیکھا تھا وہ ابوبکر واقعہ میں اُس وقت اس عظیم الشان منصب کے قابل نہیں تھا۔ مگر اُس کی وجہ یہی تھی کہ اُنہیں اس مٹی میں اُگایا جا رہا تھا جس سے اُن کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ جب خدا نے زمین بدل دی اور وہ زمین اس پودے کے مناسب حال ہو گئی تب ابوبکرؓ کی روح کا پودا ابھرا اور اُس نے نشوونما پاتے پاتے ایک بہت بڑے درخت کا رنگ اختیار کر لیا۔ یہ بالکل ویسی ہی بات ہے جیسے آم کشمیر میں لگا دو تو وہ نہیں اُگیں گے۔ اور اگر سیب کا درخت پنجاب میں بو دو تو وہ کبھی اچھا پھل نہیں دے گا۔ نیک روحوں کے لئے بھی مناسب حال زمین کی ضرورت ہوتی ہے اور زمین کے لئے مناسب حال پودے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کفر کی زمین میں عتبہؔ شیبہؔ اور ابوجہلؔ ہی بڑھ سکتے تھے۔ ابوبکر سر نہیں اٹھا سکتے تھے اور ایمان کی زمین میں ابوبکرؓ ہی بڑھ سکتے تھے۔ عتبہ، شیبہ اور ابوجہل سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ وہ اس زمین میں جھاڑیوں سے بھی زیادہ ذلیل نظر آتے تھے بلکہ جھاڑیاں تو کیا اُن کی گھاس پھُونس جیسی حیثیت بھی نہیں تھی۔ اسی مضمون کی طرف اس سورۃ میں اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تم کو وہ روحیں نظر نہیں آتیں جنہوں نے دین کی اشاعت کا کام

سرانجام دینا ہے اور جن کے ہاتھوں پر اسلام کا غلبہ مقدر ہے۔ اِسی لئے تم پوچھتے ہو کہ وہ روحیں آئیں گی کہاں سے جو نَازِعَات۔ نَاشِطَات۔ سَابِقَات۔ سَابِحَات اور مُدَبِّرَات ہوں گی اور ان روحوں کو چُنے گا کون؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم چُنیں گے اور کون چُنے گا۔ بے شک آج وہ روحیں تم کو نظر نہیں آتیں مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہاری زمین ناساز گار ہے۔ تمہارے باغ میں وہ نیکی کے پودے تو لگے ہوئے ہیں مگر زمین کے مناسب حال نہ ہونے کی وجہ سے وہ سُوکھ رہے ہیں۔ جب ہم ان پودوں کو اس زمین سے اکھیڑ کر اصل زمین میں بوئیں گے تو اُس وقت تم دیکھو گے کہ وہ کیسے شاندار درخت بنتے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ﴿۲﴾ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ﴿۳﴾

(کیا) چیں بجبیں ہو گیا اور مُنہ موڑ لیا؟ (صرف) اس بات پر کہ اُس کے پاس (ایک) نابینا (جسے واقف لوگ جانتے ہیں) آیا؟

حَلّ لُغَات۔ **عَبَسَ** عَبَسَ فُلَانٌ وَجۡھَہٗ کے معنے ہوتے ہیں قَطَّبَہٗ۔ اُس نے ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے ماتھے پر شکن ڈال لئے (اقرب) اور تَوَلّٰی عَنۡہُ کے معنے ہوتے ہیں اَعۡرَضَ عَنۡہُ وَتَرَکَہٗ۔ اس سے اعراض کرلیا اور اُس سے توجہ کو ہٹا لیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ سورۃ عبس کا شانِ نزول کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن اُم مکتوم ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں تشریف لائے۔ یہ اس وقت تک مسلمان ہو چکے تھے یا اگر ظاہری طور پر انہوں نے بیعت نہ کی ہو تو بہر حال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے۔ جب یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوئے تو اُس وقت آپ کے پاس عتبہ و شیبہ (ربیعہ کے دونوں بیٹے جو مکّہ کے لیڈروں میں سے تھے) اور ابوجہل اور عباس ابن عبدالمطلب اور امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ بیٹھے ہوئے تھے اور آپ ان کو بڑے شوق سے تبلیغ کر رہے تھے کہ شاید یہ مان جائیں تو اُن کے ذریعہ سے باقی مکّہ والے بھی اسلام میں داخل ہو جائیں باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ عبداللہ بن ام مکتوم آئے اور انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ

اَقْرِئْنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰہُ تَعَالٰی کہ مجھے قرآن پڑھائیے اور جو کچھ خدا تعالیٰ نے آپ کو سکھایا ہے وہ مجھے بھی سکھائیے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جس پر انہوں نے دو تین بار اسی بات کو دُہرایا چنانچہ لکھا ہے وَلَمْ یَعْلَمْ تَشَاغُلَهٗ بِالْقَوْمِ یعنی اُن کو علم نہ ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں سے باتیں کر رہے ہیں۔ فَکَرِہَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَطْعَهٗ لِکَلَامِہٖ وَعَبَسَ وَاَعْرَضَ عَنْهُ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے قطع کلام کو ناپسند فرمایا اور آپ کے ماتھے پر شکن پڑے اور آپ نے اُن سے اعراض کر لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ توبیخ نازل ہوئی (کشاف زیر آیت ھذا) چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بعد میں اُن کو بلا کر اُن کی عزت افزائی کی اور اُن سے باتیں کیں اور اس کے بعد جب کبھی وہ آپ کے پاس آتے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اُن کے لئے چادر بچھا دیتے اور انہیں اس پر بیٹھنے کے لئے کہتے۔ (فتح البیان زیر آیت ھذا)

یہ واقعہ ہے جو اس سورۃ کا شانِ نزول بتایا جاتا ہے اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک اندھے کو حقیر جانا اور یہ سمجھ کر کہ وہ معمولی اور غریب آدمی ہے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اور وہ بڑے بڑے خاندانوں کے لوگ جو اس وقت آپ کے پاس موجود تھے اُن کی طرف ہی آپ نے اپنی توجہ رکھی اور یہ سمجھا کہ مشہور خاندانی لوگوں کی طرف توجہ رکھنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے ایک اندھے اور غریب کی طرف توجہ کی کیا ضرورت ہے۔

اس روایت کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ عبداللہ بن ام مکتوم کون تھا۔ عبداللہ بن ام مکتوم حضرت خدیجہؓ کے بھائی تھے یعنی اُن کے ماموں کے بیٹے تھے اُن کے نام اور نسب کے متعلق قریب کے ناموں میں اختلاف ہے مگر قوم کے لحاظ سے سب اس بات پر متفق ہیں کہ بنی عامر بن لُؤَی میں سے تھے۔ اُن کا نام اور نسب نامہ بعض عبداللہ بن شریح بن مالک بن ربیعۃ الفہری بتاتے ہیں اور بعض عبداللہ بن عمرو بن قیس ابن زائدہ بن الاعصم بتاتے ہیں اور بعض اُن کا نام ہی عمرو بن قیس ابن زائدہ بتاتے ہیں (روح المعانی زیر آیت ھذا) یہ ابن ام مکتوم کیوں کہلاتے ہیں اس کے متعلق زمخشری نے لکھا ہے کہ اُم مکتوم اُن کی دادی کا نام تھا (تفسیر کشاف زیر آیت ھذا)۔ لیکن ابن عبدالبرؒ اور دوسرے مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے اُن کے نزدیک یہ اُن کی والدہ کی کنیت ہے اور ان کا اصل نام عاتکہ بنت عامر بن مخزوم تھا (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ حرف العین)۔ اُن کی کنیت ام مکتوم اس لئے تھی کہ یہ پیدا ہی اندھے ہوئے تھے اس لئے ان کی کنیت ام مکتوم پڑ گئی یعنی اندھے کی ماں۔ بعض مؤرخین یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اندھے پیدا نہیں ہوئے تھے کچھ دیر تک اُن کی آنکھیں سلامت رہیں مگر بعد میں کسی

وجہ سے اُن کی بینائی جاتی رہی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دو دفعہ اُن کو مدینہ کا امیر بھی مقرر فرمایا۔ (استیعاب فی معرفة الاصحاب جلد ۳ صفحہ ۲۷۶ زیر عنوان عمرو بن قیس بن الاعصم) اس شجرۂ نسب کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ یہ کہنا کہ وہ حقیر آدمی تھے اور اُن کی طرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی توجہ مفید نہیں ہوسکتی تھی ان واقعات سے بالبداہت غلط ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ ان کی والدہ اور والد دونوں زبردست قبائل میں سے ہیں۔ اور یہ ایک ایسی عورت کے بھائی ہیں جس کی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں انتہاء درجہ کی عزّت تھی اور اس حد تک عزت تھی کہ اُن کی وفات کے سالوں بعد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اُن پر رشک آجاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ خود بیان کرتی ہیں کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تکرار اور تواتر کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کا ذکر فرماتے تو میں بعض دفعہ بے تاب ہو کر کہتی یا رسول اللہ! آپ اُس بڑھیا کا ذکر چھوڑیں گے بھی یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کو اس سے بہت بہتر عورتیں دے دی ہیں؟ اُس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُن کے جواب میں فرماتے عائشہ! تم کو معلوم نہیں خدیجہؓ کے اندر کتنی خوبیاں تھیں اور اس نے میری ایک لمبے عرصہ تک کیسے خدمت کی۔ پس حضرت خدیجہؓ کے بھائی اور ماں اور باپ دونوں کی طرف سے زبردست خاندانوں کے فرد کی عظمت صرف نابینا ہونے کی وجہ سے تو نہیں جاسکتی تھی۔ آخر تبلیغ زبان سے کی جاتی ہے آنکھوں سے تو نہیں کی جاتی۔ پس یہ کہنا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھا کہ ایک حقیر اندھا آدمی میرے پاس آیا ہے میں بڑے بڑے لوگوں کو چھوڑ کر ایسے غریب اور معمولی آدمی کی طرف کیوں توجہ کروں بالبداہت واقعات سے غلط ثابت ہوتا ہے۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دو دفعہ مدینہ کا سردار مقرر کیا اور یہ سردار مقرر کرنا محض لحاظ کے طور پر نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو سردار مقرر فرمایا تو اس لئے کہ ان میں امارت کی قابلیت تھی اور اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ سمجھتے تھے کہ عرب ان کی خاندانی عظمت کی وجہ سے انہیں اپنا سردار تسلیم کرنے میں کوئی تکلیف محسوس نہیں کریں گے۔ کیونکہ عرب کے دستور کے مطابق کوئی ایسا شخص امیر مقرر نہیں کیا جا سکتا تھا جس کا خاندانی لحاظ سے لوگوں پر اثر نہ ہوتا۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب بھی امیر مقرر کیا ہمیشہ انہی لوگوں کو کیا جو خاندانی لحاظ سے عظمت وشہرت کے مالک ہوتے تھے اور جن کے متعلق یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ لوگوں کو اُن کی اطاعت سے کوئی گریز نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے بعد امیر مقرر فرمایا (السیرة النبویة لابن هشام زیر عنوان غزوة تبوک)۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں میں نسلی تعصب اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ وہ ادنیٰ اقوام یا بے اثر لوگوں کی امارت کو تسلیم ہی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تو بہت لمبے عرصہ کے بعد

اسلام نے ان کے دلوں سے یہ بات دُور کی ورنہ شروع شروع میں یہ بالکل ناممکن تھا کہ وہ کسی ایسے آدمی کی امارت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتے جو خاندانی طور پر کوئی اثر نہ رکھتا ہو۔ پس یہ سمجھنا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک حقیر آدمی آیا اور آپ نے اُس کی طرف محض اُس کی غربت اور عدم عزّت کی وجہ سے توجہ نہ کی بالبداہت باطل ہے اور یہ اتنا موٹا مضمون ہے کہ تعجب آتا ہے مسلمانوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آیا حالانکہ بعض دشمنانِ اسلام کی سمجھ میں آ گیا ہے چنانچہ نولڈ کے Noldeke جو مشہور جرمن مستشرق ہے وہ یہ واقعہ لکھ کر کہتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹا واقعہ ہے عبداللہ بن ام مکتوم کا شجرہ نسب بتا رہا ہے کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا (Comprehensive Commentary on the Quran by Wherry vol 4 pg. 218)۔ اور اس لئے یہ بات اس کے متعلق ہر گز نہیں ہوسکتی گویا اُس کا ذہن بھی اِدھر چلا گیا کہ یہ واقعہ یہاں چسپاں نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر یہ بات درست ہوتی تو اُس کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہتک ہوتی ہے مگر وہ کہتا ہے یہ بات واقعات کے بالکل خلاف ہے اور اسے ان آیات پر چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔

اس سورۃ کے نزول کے متعلق مفسرین کے بیان کئے ہوئے واقعہ پر چسپاں نہ ہونے پر پانچ دلائل

میرے نزدیک علاوہ اس شہادت کے پانچ اور امور ایسے ہیں جن کی وجہ سے ہر شخص کو ماننا پڑتا ہے کہ یہ واقعہ اس رنگ میں یہاں چسپاں نہیں ہوتا۔

پہلی دلیل (۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ ابن ام مکتوم اندھے تھے بہرے نہیں تھے۔ یا تو یہ کہا جاتا کہ ابن ام مکتوم بہرے تھے اور چونکہ بہرے ہونے کی وجہ سے وہ باتوں کو نہیں سُن سکتے تھے اس لئے اُن کو پتہ نہیں لگا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بعض دوسرے لوگوں سے مصروف گفتگو ہیں اور چونکہ اُن کو اپنے بہرے پن کی وجہ سے اس بات کا علم نہیں ہوسکا اس لئے انہوں نے آتے ہی سوال کر دیا۔ اگر یہ ثابت ہو جائے تو پھر ابن ام مکتوم پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ عدمِ علم کی حالت میں کسی بات کا انسان سے سرزد ہو جانا اُسے موردِ الزام قرار نہیں دے سکتا لیکن تاریخ سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ بہرے تھے۔ چنانچہ بعض مفسرین کو بھی یہ اعتراض سوجھا ہے کہ جب ہم اس واقعہ کو بیان کر رہے ہیں تو ہر شخص یہ کہے گا کہ قصور ابن ام مکتوم کا ہے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بات کر رہے تھے تو انہوں نے بیچ میں دخل کیوں دے دیا۔ آخر ہر شخص جانتا ہے کہ جب دوسرے سے گفتگو کی جا رہی ہو تو اُس وقت اگر کوئی شخص دخل دے دے اور کلام کو قطع کرنے کی کوشش کرے تو وہ تہذیب اور شائستگی کے خلاف حرکت کا مرتکب سمجھا جاتا ہے اور اُسے کسی صورت میں بھی اپنے فعل میں حق بجانب نہیں سمجھا جا سکتا پس جب رسول کریم

صلے اللہ علیہ وسلم بعض اور لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے اور عبداللہ بن اُم مکتوم نے اس میں دخل دے دیا اور آپ کی بات کو قطع کرنا چاہا تو ایسی صورت میں عبداللہ بن اُم مکتوم ہی زجر کے قابل تھا کہ اُس نے خلافِ تہذیب ایک حرکت کا ارتکاب کیا۔ بہر حال یہ ایک اعتراض ہے جو مفسرین کو بھی سوجھا ہے اور انہوں نے اس کا جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے مگر وہ جواب ایسا کمزور ہے کہ اُسے پڑھ کر حیرت آتی ہے کہ مفسرین نے یہ کیا کہہ دیا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم شاید ان لوگوں کو کان میں تبلیغ کر رہے تھے جس کی آواز عبداللہ بن ام مکتوم کو نہیں پہنچی (تفسیر ابن کثیر زیر آیت ھذا)۔ مگر یہ بالکل ہنسی کے قابل بات ہے کہ سات آدمی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں موجود ہوں اور ان سات آدمیوں کو آپ کان میں تبلیغ کر رہے ہوں اور ایسی ہلکی آواز سے کہ کوئی پاس کا شخص بھی اُس کو سُن نہ سکے دُنیا کی کوئی عقل اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتی اور احمق سے احمق انسان بھی اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ سات آدمی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور اُن سات آدمیوں کو بجائے کھلے طور پر تبلیغ کرنے کے آپ ہر ایک کے کان کے ساتھ اپنا منہ لگا رہے ہوں اور اُسے اسلام کی تبلیغ کر رہے ہوں۔ بات یہ ہے کہ فطرت خود بولتی ہے کہ سچائی کیا ہے خواہ اس پر کس قدر پردے ڈالنے کی کوشش کی جائے۔ بہر حال اگر عبداللہ بن اُم مکتوم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اس وقت بولے جب آپ دوسروں کو تبلیغ کر رہے تھے تو ملزم ابن ام مکتوم تھے اور اُن کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ اس وقت بولتے۔ اور اگر انہوں نے سُنا نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تبلیغ کر رہے ہیں تو پھر ثابت کرنا چاہیے کہ وہ بہرے تھے لیکن تاریخ یہ تو بتاتی ہے کہ وہ اندھے تھے یہ نہیں بتاتی کہ وہ اس کے ساتھ بہرے بھی تھے۔ اور جب وہ بہرے نہیں تھے جب وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کو سُن رہے تھے۔ جب انہیں معلوم تھا کہ اس وقت مکہ کے بڑے بڑے رؤساء کو تبلیغ کی جا رہی ہے تو وہ بولے کیوں؟ اُن کا اس موقعہ پر بولنا بتا رہا ہے کہ قصور ابن مکتوم کا ہی تھا اور یہ بات تو عقل کے بالکل خلاف ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بات کر رہے ہوں اور ابن مکتوم نے اُس کو سنا ہی نہ ہو۔ جیسے مفسرین نے ایک بے بنیاد توجیہہ کی ہے بہر حال جرم ابن ام مکتوم کا ثابت ہوتا ہے مگر بتایا یہ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈانٹ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پڑی۔ اسی مشکل کی وجہ سے مفسرین نے عجیب قیاس کیا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُن کو کان میں تبلیغ کر رہے تھے حالانکہ یہ تبلیغ کا موقع تھا کسی کی بیوی کا جھگڑا نہیں تھا کہ اس کے متعلق اسے کان میں کچھ کہنے کی ضرورت ہوتی تا کہ دوسرا شخص اُسے سُن نہ لے۔ خدا اور رسول کی باتیں تھیں۔ اسلام کی اشاعت کا کام تھا۔ توحید کی تعلیم تھی۔ مگر بتایا یہ جاتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بڑی آہستگی سے عتبہ اور شیبہ کے کان کے ساتھ اپنا منہ لگا

کر کہہ رہے تھے کہ دیکھو اللہ ایک ہے۔ اللہ نے ہی سب دنیا کو پیدا کیا ہے۔ بُتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ انہیں چھوڑ دو اور توحید کا اقرار کرو۔ دنیا کا کوئی بھی معقول انسان اسے تسلیم نہیں کرسکتا بلکہ جس شخص کے سامنے بھی یہ بات پیش کی جائے وہ ہنس پڑے گا کہ کیسی جاہلانہ بات کہی جارہی ہے۔

دوسری دلیل۔ (۲) دوسرے اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہیں دیا تو آپ نے عین ثواب کا کام کیا اُن پر اعتراض کیسا؟ آپ بڑے بڑے رؤساء کو تبلیغ کررہے تھے۔ اُن پر اسلام کی حقیقت واضح کررہے تھے۔ اُن کو خدا اور اُس کے رسول کی طرف بُلا رہے تھے۔ ایسی حالت میں جب ایک شخص نے آپ کے کلام کو قطع کرنا چاہا اور موقع اور محل کو نظر انداز کر کے تہذیب وشائستگی کے اصول کے بالکل خلاف ایک بات پیش کر دی تو اُس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اگر اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو آپ نے بالکل درست کیا۔ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جو ہمیں اس فعل سے روکتی ہو بلکہ اگر آج بھی ہماری مجلس میں کوئی ایسی حرکت کرے تو باوجود عَبَسَ وَ تَوَلّٰی والی آیت کے نازل ہونے کے ہم آج بھی اس سے وہی سلوک کریں گے جو عبداللہ بن ام مکتوم سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ میں اگر قرآن کریم کا درس دے رہا ہوں اور کوئی شخص درمیان میں مجھے آکر کہے کہ اس درس کو چھوڑ یئے اور میری فلاں بات کا جواب دیجئے۔ تو کیا میں اُس وقت درس چھوڑ دوں گا اور اس کی بات کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا۔ یا اُس سے اعراض کروں گا کہ اُس نے موقع اور محل کو نظر انداز کر کے سلسلہ کلام کو قطع کرنا چاہا؟ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسے موقع پر اعراض کرنا ہی ضروری ہوتا ہے۔ اگر درمیان میں کوئی شخص دخل دے دے تو اس سے بات کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ طبائع پر جو اثر ہو رہا ہوتا ہے وہ جاتا رہتا ہے۔ دلیل بھول جاتی ہے اور دخل دینے والے کی بدتہذیبی کا الگ اثر پڑتا ہے۔ پس ایسی حالت میں ضروری ہوتا ہے کہ اس کی بات کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ کیا کوئی شخص اس بات کو جائز قرار دے سکتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت پیش کررہے ہوتے اور ابن ام مکتوم کے دخل دینے پر اُسے سورۃ نَازِعَات کا درس دینا شروع کر دیتے اور جب گھنٹہ بھر گزر جاتا تو پھر اُن لوگوں سے کہتے کہ لو اب بقیہ آدھی دلیل تم بھی سن لو؟ دنیا میں جاہل سے جاہل اور احمق سے احمق انسان بھی ایسی حرکت نہیں کرتا مگر یہ لوگ محض اس بات کی وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ آپ کو تبلیغ چھوڑ کر ابن ام مکتوم کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے تھا اور تہذیب وتمدن کے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے تھا۔ گویا یہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کو ایک ایسا رنگ دینا چاہتے ہیں جسے دنیا میں کہیں بھی معقول قرار نہیں دیا جاتا۔

تیسری دلیل۔(۳) تیسرے اندھے کی بات کو ناپسند کر کے اُس پر تیوری چڑھانا اور مُنہ پھیر لینا یہ تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا ثبوت ہے۔ اس پر تو آپ کی تعریف ہونی چاہیے تھی نہ یہ کہ توبیخ نازل ہوتی۔ ایک اندھا شخص آتا ہے وہ ایک غیر معقول بات کرتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ڈانٹتے نہیں تا کہ اُس کا دل میلا نہ ہو صرف اُس کے بار بار دخل دینے کی وجہ سے آپ کے ماتھے پر شکن آجاتے ہیں لیکن پھر بھی آپ کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتے آپ چاہتے تھے کہ اُس کا دل نہ دُکھے مگر دُوسری طرف وہ ایک ایسی بات کر رہا تھا جو سراسر غیر معقول تھی۔ ایسی حالت میں آپ حیران تھے کہ میں کروں کیا؟ ادھر میں بات کو نہیں چھوڑ سکتا دوسری طرف اگر اس کو ڈانٹتا ہوں تو اس کا دل میلا ہوتا ہے اب میں کروں تو کیا کروں۔ ایسی حالت میں بہترین طریق جو ایک انسان اختیار کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ مُنہ پھیر لے اور اس طرح دونوں باتیں ہو جائیں سلسلہ کلام بھی نہ رُکے اور دوسرے شخص کے دل کو بھی صدمہ نہ پہنچے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ماتھے پر شکن پڑے اور آپ نے اُس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ مُنہ پھیرنے میں حکمت یہ تھی کہ آپؐ چاہتے تھے مجھے غصہ پیدا نہ ہو اگر عبداللہ بن اُم مکتوم میرے سامنے ہو گا تو ممکن ہے غصہ کی حالت میں میرے مُنہ سے کوئی بات نکل جائے۔ چنانچہ آپ نے تیوری چڑھائی جس کو اندھا نہیں دیکھ سکتا تھا اور پھر اُس سے مُنہ پھیر لیا تا کہ اس کے متعلق زیادہ غصہ پیدا نہ ہو اور زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جس سے اُس کے دل کو صدمہ ہو پس آپ کا یہ فعل تو ایسا تھا کہ اس پر عرش سے خدا تعالیٰ کی طرف سے تعریف آنی چاہیے تھی نہ یہ کہ ڈانٹ پڑتی؟ اور کہا جاتا ہے کہ آپ نے اچھا کام نہیں کیا۔ پھر اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ طریق اختیار نہ کرتے تو مفسّرین کو بتانا چاہیے تھا کہ آپؐ کیا کرتے اور وہ کون سا دوسرا قدم تھا جو آپ تمام اخلاقی پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اٹھا سکتے تھے۔ مگر وہ کوئی دوسرا طریق نہیں بتا سکے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک بھی یہی طریق تھا جو اس موقعہ پر اختیار کیا جا سکتا تھا۔ اگر اس واقعہ سے کچھ پتہ چلتا ہے تو وہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیوری چڑھائی اور آپ کو ابن ام مکتوم کی بات بُری لگی لیکن آپ نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف زائد بات یہ کی کہ جب آپ نے دیکھا کہ وہ باز نہیں آتا تو آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ایسا نہ ہو اُسے اپنے سامنے بیٹھے دیکھ کر غصہ میں میرے منہ سے کوئی بات نکل جائے۔ آپ نے اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا تا کہ نہ وہ نظر آئے اور نہ اس کے متعلق طبیعت میں زیادہ جوش پیدا ہو اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نہایت اعلیٰ درجہ کے اخلاق پر دلالت کرتی ہیں۔

چوتھی دلیل۔(۴) چوتھے ابن اُم مکتوم خود ایک بڑے خاندان کے فرد تھے۔ اس لئے ان کو حقیر سمجھنے کے کوئی معنے

ہی نہیں۔ لیکن اگر فرض بھی کر لو کہ وہ حقیر تھے تو اُن کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کی غربت کی وجہ سے یا ان کے ادنیٰ ہونے کی وجہ سے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم غرباء کی طرف خاص طور پر توجہ کیا کرتے تھے اور کبھی کسی شخص کو محض اُس کے غریب ہونے یا اس کے ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے تحقیر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں مکّہ کی زندگی میں ہی آپ غلاموں کو تبلیغ کرتے اور بعض دفعہ گھنٹہ گھنٹہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ اُن کے پاس کھڑے رہتے اور انہیں محبت اور پیار کے ساتھ اسلام کی باتیں پہنچاتے حالانکہ وہ نہایت ادنیٰ طبقہ کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ دو عیسائی غلاموں کے متعلق تاریخ میں ذکر آتا ہے کہ وہ نہایت شوق سے انجیل پڑھا کرتے تھے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے اندر یہ مذہبی جوش پایا تو آپ بہت خوش ہوئے اور آپ نے سمجھا کہ یہ لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کو خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچایا جائے۔ چنانچہ آپ اُن کے پاس جاتے اور بڑی بڑی دیر تک اُن کے پاس بیٹھے رہتے وہ عیسائی غلام آہن گری کا کام کرتے تھے۔ وہ لوہا کوٹتے جاتے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس کھڑے ہو کر انہیں تبلیغ کرتے رہتے (تفسیر فتح البیان زیر آیت و لقد نعلم انهم یقولون ۔۔۔)۔ پس وہ شخص جو گلیوں میں ادنیٰ ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے پاس کھڑا ہو جاتا تھا۔ جو غلاموں کو کئی کئی گھنٹے تبلیغ کرتا رہتا تھا۔ جو غریب اور معمولی طبقہ کے لوگوں سے ملنے میں اپنی کوئی ہتک محسوس نہیں کرتا تھا۔ اُس کے متعلق یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے ایک شخص کی طرف محض اس لئے متوجہ نہ ہوا کہ وہ غریب آدمی تھا۔ جو شخص غلاموں کے ساتھ برسرِ بازار گفتگو کرنے سے نہیں گھبراتا تھا اور جو شخص اُن کو تبلیغ کرنے میں اپنی کوئی ہتک محسوس نہیں کرتا تھا اُس کے لئے یہ کوئی شرم کی بات نہیں تھی کہ وہ ابن ام مکتوم سے بات کر لیتا بشرطیکہ اخلاق اس بات کی اجازت دیتے۔

<u>پانچویں دلیل</u>۔ (۵) پانچواں ردّ اس کا یہ ہے کہ اگر یہ توبیخ تھی اور اگر اس آیت کے ذریعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ ڈانٹا گیا تھا تو پھر چاہیے تھا کہ آپ اپنے رویّہ کو بدل لیتے کیونکہ ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کے بعد ابن ام مکتوم کو بلایا اور اُسے کہا کہ بتاؤ تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو تمہاری خاطر تو خدا نے مجھ کو ڈانٹا ہے۔ (تفسیر فتح البیان زیر آیت ھذا) پس اگر یہ واقعہ درست ہے تو اس کے بعد لازمی طور پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا سابق طریقِ عمل بدل لینا چاہیے تھا اور آئندہ یہ دستورُ العمل بنا لینا چاہیے تھا کہ جب بھی کوئی شخص آپ کی بات میں دخل دیتا آپ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اپنے سلسلۂ کلام کو منقطع کر دیتے۔ مگر ہمیں تاریخ سے ایسے واقعات نظر آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بعد

میں بھی اپنا یہی طریق عمل رکھا۔ چنانچہ بخاری میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا حضور اُس وقت مجلس میں گفتگو فرما رہے تھے اُس نے آپ کے کلام میں دخل دیتے ہوئے ایک سوال کیا مگر آپ نے اُس کا جواب نہیں دیا اور اپنی بات میں ہی مشغول رہے یہاں تک کہ صحابہ کہتے ہیں ہم نے سمجھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم شاید خفا ہو گئے ہیں۔ جب آپ بات ختم کر چکے تو آپ نے فرمایا کہ سائل کہاں ہے؟ اور پھر آپ نے اُس کے سوال کا جواب دیا (بخاری کتاب العلم باب مَنْ سُئِلَ عِلْمًا وَ هُوَ مُشْتَغِلاً فِی حَدِیْثِہٖ فاتمّ الحدیث ثم اجاب السائل) گویا وہ طریق جو ابن ام مکتوم کے واقعہ کے وقت آپ نے اختیار کیا تھا وہی طریق آپ نے بعد میں بھی جاری رکھا اور جب بھی کسی شخص نے آپ کی گفتگو کے دوران میں دخل دے کر آپ سے کوئی سوال کرنا چاہا آپ نے کبھی اس کا جواب نہیں دیا جب تک اپنی بات کو ختم نہیں کر لیا۔ اور یہ طریق وہ ہے جو نہ صرف مکّہ مکرمہ میں بلکہ مدینہ منورہ میں بھی آپ نے جاری رکھا۔ بلکہ جیسا کہ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے آپ کا عام طریق ہی یہ تھا کہ جب تک بات ختم نہ کر لیتے کسی دوسرے شخص کے سوال کا جواب نہ دیتے اور یہی شرفاء کا طریق ہے۔ پس اگر واقعہ میں یہ توبیخ ہوتی تو پھر چاہیے تھا کہ اِن آیات کے نزول کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جب بھی کوئی شخص بات کرتا اور جس حالت میں بھی کرتا آپ فوراً اس کا جواب دینا شروع کر دیتے اور سمجھتے کہ میں اُس غلطی کا اعادہ نہ کروں جو ایک دفعہ مجھ سے ہو چکی ہے۔ لیکن آپ نے کبھی اپنے طریق کو نہیں بدلا۔ اور جب آپ نے وہی رویّہ رکھا جو ابن اُم مکتوم کے واقعہ کے وقت تھا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ توبیخ کس بات پر تھی اور کس بات سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو روکا گیا تھا؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل تو ثابت کر رہا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کے آخر تک عَبَسَ وَ تَوَلّٰی والی بات پر ہی عمل کیا اور جب بھی کوئی شخص آپ کی بات میں دخل دیتا آپ اُسے پسند نہ فرماتے۔ کیونکہ تداخل سے تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ اثر جاتا رہتا ہے۔ بات پوری نہیں ہوتی اور مضمون کے کئی پہلو ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ پس اگر اس واقعہ کو درست تسلیم کیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ ڈانٹ بھی پڑی مگر آپ پھر بھی نہ مانے۔

میں اِن دلائل کے بیان کرنے سے پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ عبداللہ بن ام مکتوم کے حالات بتاتے ہیں کہ وہ کوئی ذلیل یا حقیر آدمی نہیں تھے۔ بیشک وہ اندھے تھے لیکن آخر وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں سے تھے حضرت خدیجہؓ کے ماموں زاد بھائی تھے اور باپ اور ماں کی طرف سے بھی مشہور خاندانوں میں سے تھے۔ اس خاندانی اثر کی وجہ سے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ کے تعلقات

کی وجہ سے اُنہیں آپ کا مقرب ہونا چاہیے تھا اور جیسا کہ واقعات ثابت کرتے ہیں وہ آپ کے مقرب ہی تھے۔ چنانچہ بعد میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا انہیں دو دفعہ اپنے بعد مدینہ کا امیر مقرر کرنا اسی بات کا ثبوت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں ان کا احترام پایا جاتا تھا اور آپ اُن کے خاندانی اثر کے قائل تھے۔ پس یہ دلیل بھی اس واقعہ کے غلط ہونے کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

سورۃ کی پہلی آیات میں مفسرین کو پیش آنے والی مشکلات کا حل میرے نزدیک ان آیات میں ہی خدا تعالیٰ نے ایک حل رکھ دیا ہے جس کی طرف مفسّرین نے توجہ نہیں کی۔ اُن کا ذہن ادھر گیا ہے مگر وہ اس کی اَور اور توجیہیں کرتے رہے ہیں۔ اور وہ حل یہ ہے کہ ان آیات کی بناوٹ اور ان کی ترتیب پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔ یہ آیات اس طرح ہیں عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی۔ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى۔ وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى۔ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى۔ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى۔ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى۔ وَ مَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى۔ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى۔ وَ هُوَ يَخْشٰى۔ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى۔ اِن آیات میں عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی۔ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى۔ تین غائب کے صیغے ہیں۔ یعنی کسی نے عَبُوس اختیار کیا۔ کسی نے تَوَلّٰی کی اور کسی کے پاس اَعْمٰی آیا۔ لیکن آگے فرماتا ہے وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى تجھ کو کس نے بتایا کہ اس کے متعلق یہ امید کی جاسکتی تھی کہ وہ تزکیہ حاصل کرلے گا۔ یہاں غائب کی بجائے مخاطب کا صیغہ آ گیا۔ اسی طرح اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى۔ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى۔ میں مخاطب کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے گویا یہاں کچھ غائب کے صیغے ہیں اور کچھ مخاطب کے صیغے ہیں ان غائب اور مخاطب کے صیغوں کے متعلق چار ہی صورتیں ہیں۔ (۱) یا تو ہم غائب اور مخاطب دونوں کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق سمجھیں۔ (۲) یا ہم غائب اور مخاطب دونوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر کے متعلق سمجھیں یعنی یا تو ہم یہ سمجھیں کہ عَبَسَ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے اور مَا يُدْرِيْكَ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے اور یا ہم یہ سمجھیں کہ عَبَسَ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کے متعلق ہے اور مَا يُدْرِيْكَ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کے متعلق ہے (۳) اور یا پھر ہم یہ سمجھیں کہ عَبَسَ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے اور مَا يُدْرِيْكَ کسی اور کے متعلق ہے (۴) اور یا پھر ہم یہ سمجھیں کہ عَبَسَ کسی اور کے متعلق ہے اور مَا يُدْرِيْكَ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے۔ یہ چار ہی صورتیں ہیں جو بن سکتی ہیں اور ہمیں یہ تعیین کرنا ہے کہ اِن چاروں میں سے اصل بات کیا ہے۔ پہلے ہم اس بات کو لے لیتے ہیں کہ یہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہی نہیں عَبَسَ بھی غیر نے کیا اور مَا يُدْرِيْكَ بھی غیر سے تعلق رکھتا ہے مگر اس طرح چونکہ آیات کے معنے بالکل غیر معقول ہو جاتے ہیں اس لئے ہمیں ان میں

پڑنے کی ضرورت نہیں۔ روایات نہایت تواتر سے ابنِ ام مکتوم کا قصہ بیان کرتی ہیں اور جس قصہ کو اِتنے تواتر اور تکرار کے ساتھ مختلف کتب میں بیان کیا جائے وہ جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ بہرحال ماننا پڑتا ہے کہ کوئی واقعہ ہوا ضرور ہے۔ پس اگر ہم عَبَسَ اور مَا یُدْرِیْكَ دونوں کسی غیر کے متعلق قرار دیں تو اس قصّہ کو سرے سے جھوٹا کہنا پڑتا ہے اور یہ بات بظاہر ناممکن ہے۔ ہم احادیث اور تاریخ دونوں میں اس واقعہ کا تکرار کے ساتھ ذکر پاتے ہیں اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عَبَسَ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہیں بلکہ کسی اور کے متعلق ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہم عَبَسَ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق سمجھ لیتے ہیں اور مَا یُدْرِیْكَ میں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب سمجھ لیتے ہیں۔ مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ضمائر کو کیوں بدلا۔ پہلے اُس نے عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی کیوں کہا اور پھر اُس نے مَا یُدْرِیْكَ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیوں کیا؟ مفسّرین اس موقعہ پر بیان کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا لحاظ کر کے غائب کے صیغے استعمال فرمائے ہیں اگر مخاطب کے صیغے استعمال کئے جاتے تو آپ کو زیادہ تکلیف ہوتی اس لئے خدا تعالیٰ نے یہ خیال کر کے کہ آپ کو بُرا نہ لگے عَبَسْتَ وَتَوَلَّیْتَ اَنْ جَآءَكَ الْاَعْمٰی نہیں فرمایا بلکہ عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی۔ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی فرمایا۔ پھر ذرا اعتاب کم ہوگیا تو مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰٓی سے آپ کو خطاب شروع کر دیا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اگلی آیتوں میں عتاب زیادہ ہے کم نہیں ہے۔ اور عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی میں تو عتاب ہے ہی نہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ ایک اندھے کے سامنے عَبُوْس اور تَوَلّٰی سے کام لینا ہرگز کوئی ایسا فعل نہیں ہے جس سے اس کی دلآزاری ہو اور نہ یہ فعل ایسا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عتاب نازل ہونے کا امکان ہو۔ بلکہ یہ تو آپ کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا ایک ثبوت تھا۔ پس یہ عجیب بات ہے کہ جہاں عتاب نہیں تھا وہاں تو اُس نے غائب کے صیغے استعمال کئے اور جہاں بہت زیادہ عتاب تھا وہاں اُس نے مخاطب کے صیغے استعمال کرنے شروع کر دئے۔ آخر یہ کتنے سخت الفاظ ہیں کہ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی۔ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی۔ وَ مَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی۔ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی۔ وَ هُوَ یَخْشٰی۔ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی۔ کہ جو شخص مستغنی ہے تو اُس کی طرف پوری توجہ دیتا ہے حالانکہ تجھ پر کوئی اعتراض نہیں اگر وہ پاک نہ ہو اور جو تیری طرف دوڑتا آتا ہے اور وہ ڈرتا بھی ہے تُو اس سے بے رغبتی ظاہر کرتا ہے۔ کیا یہ عبوس اور تولّی سے کم خطرناک الفاظ ہیں؟ پس جہاں واقعہ میں توبیخ کا موقع تھا وہاں تو اللہ تعالیٰ نے مخاطب کے صیغے استعمال کر دیئے اور جہاں توبیخ کا کوئی موقع ہی نہیں تھا بلکہ تعریف کا موقع تھا وہاں اس نے غائب کے صیغے رکھ دئے۔ گویا تعریف کو تو نظر انداز کر دیا اور توبیخ کے پہلو کو نمایاں کر دیا۔ پس یہ توجیہہ جو مفسّرین کی طرف سے کی جاتی ہے بالکل غلط ہے اور

ان کے معنوں کو تسلیم کرتے ہوئے ضمائر کے بدلنے کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی۔

اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں جن میں سے پہلی یہ ہے کہ عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ہم کسی غیر کے متعلق سمجھیں اور مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرار دیں۔ مگر اس صورت میں جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ہمیں اس واقعہ کا انکار کرنا پڑتا ہے جو ابن اُم مکتوم کے متعلق احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ایسا ہے جس کا اس قدر شہادات کے بعد کسی صورت میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا متواتر تاریخی کتب میں اس واقعہ کو دوہرایا گیا ہے اور صحاح ستہ کی بعض کتب میں بھی یہ واقعہ پایا جاتا ہے (ترمذی ابواب التفسیر، باب سورۃ عبس) پس اگر ہم عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہ سمجھیں تو ایک بہت بڑے تاریخی واقعہ کو غلط قرار دینا پڑتا ہے۔ حالانکہ تاریخی ثبوت اُس وقت تک ردّ نہیں کیا جا سکتا جب تک کوئی ویسا ہی اہم ثبوت اس کی تردید نہ کر دے۔ اب صرف چوتھی صورت ہی رہ جاتی ہے کہ عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق سمجھیں اور مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى کا خطاب کسی اور سے قرار دیں۔ اور میرے نزدیک یہی صورت ایسی ہے جس سے اس مشکل کا حل ہو سکتا ہے اس طرح قصّہ کی بناوٹ پر جو زد پڑتی ہے وہ دُور ہو جاتی ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقام اور آپ کی شان پر بھی کوئی اعتراض واقع نہیں ہو سکتا۔ پس میرے نزدیک عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ابن اُم مکتوم کا واقعہ بالکل صحیح ہے کیونکہ تواتر اور تکرار سے یہ واقعہ مختلف کتب میں بیان کیا گیا ہے اور ہم بغیر کسی قطعی اور یقینی ثبوت کے جو تاریخی شہادت بھی اپنے اندر رکھتا ہو اس واقعہ کو ردّ نہیں کر سکتے۔ بہر حال ابن اُم مکتوم آئے اور اُس وقت آئے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کفار مکّہ کے بڑے بڑے روٴساء کو تبلیغ کر رہے تھے۔ اُنہیں یہ دیکھ کر جوش پیدا ہوا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اِن کفار پر اپنے قیمتی وقت کو کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ دنیا میں مختلف طبائع ہوتی ہیں اور وہ اپنے اپنے رنگ میں خیالات کا اظہار کر دیتی ہیں۔ میں نے احمدیوں میں بھی دیکھا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جب اُنہیں معلوم ہو کہ کسی شدید دشمن کو تبلیغ کی جا رہی ہے تو وہ اُس وقت برداشت نہیں کر سکتے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ جانے بھی دو یہ مردود لوگ ہیں یہ مُنہ لگانے کے قابل نہیں یہ تو دوزخ کی آگ میں جلنے والے ہیں ان پر اپنا وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گویا دشمن کو دیکھ کر اُن کی طبیعت میں ایسا جوش پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہ برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ اُن سے باتیں کیوں کی جا رہی ہیں۔ اُن کا نقطۂ نگاہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ تو جہنم کا ایندھن ہیں اِسی مخالفت کی حالت میں مریں گے اور خدا کے غضب کے مستحق ہوں گے انہیں تبلیغ کرنا۔ خدا اور اس کے رسول

کی باتیں سمجھانا اپنے وقت کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عبداللہ بن ام مکتوم کی طبیعت بھی ایسی ہی ہوگی۔ جب وہ وہاں پہنچے اور انہوں نے دیکھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم عتبہ اور شیبہ اور ابوجہل اور امیہ اور ولید وغیرہ کو تبلیغ کر رہے ہیں تو اُن کا جوش بھڑک اٹھا اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ خبیث دشمن جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دن رات گالیاں دینے والے ہیں آپ کی مجلس میں آکر کیوں بیٹھے ہیں یہ تو جہنم کی آگ کے مورد ہیں ان کا خدا اور اس کے رسول کی باتوں سے کیا تعلق ہے اور ان پر اپنے وقت کو ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ اُن کے دل کے خیالات تھے اور انہی خیالات کے نتیجہ میں انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی باتوں میں دخل دینا شروع کر دیا کہ یا رسول اللہ! آپ عتبہ اور شیبہ اور ابوجہل وغیرہ کو اسلام کی باتیں کیوں بتا رہے ہیں اَقْرِئْنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مِمَّا عَلَّمَکَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔ ان کو دفع کریں اور میری طرف آپ توجہ کریں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اُن کا اس طرح دخل دینا سخت ناگوار گزرا کہ باہر سے مہمان آئے ہوئے ہیں میں اُن سے گفتگو کر رہا ہوں اور میرا ہی ایک مرید حد سے متجاوز ہوتا جا رہا ہے اور ایسا رویّہ اختیار کر رہا ہے جو ان مہمانوں کی دل آزاری اور دل شکنی کا موجب ہے۔ اور گو انہوں نے اس وقت کفار کو کوئی گالی نہیں دی مگر بہر حال جب انہوں نے کہہ دیا کہ آپ میری طرف توجہ کریں تو اس کے معنے یہی تھے کہ ان لوگوں کو آپ دفع کریں یہ تو اسلام کے شدید دشمن ہیں انہوں نے اسلام کے احکام کو کہاں ماننا ہے۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سمجھتے تھے کہ یہ لوگ خواہ مانیں یا نہ مانیں میرا فرض ہے کہ میں ان کے کانوں تک تمام باتیں پہنچا دُوں اور خدا کے حضور بری الذمہ ہو جاؤں۔ غرض عبداللہ بن ام مکتوم نے اپنے جوش میں ایک ایسی حرکت کی جو عقل اور تہذیب کے بالکل خلاف تھی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تبلیغ کر رہے تھے تو اُن کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ یہ سمجھ لیتے کہ ان کو تبلیغ بے فائدہ ہے آپ کو چاہیے اُن کو چھوڑ کر میری طرف توجہ کریں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ لوگ بعد میں واقع میں جہنمی ہی ثابت ہوئے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے مگر اُس وقت تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہی فرض تھا کہ آپ آنیوالے مہمانوں کی عزت کریں۔ ان کی طرف توجہ کریں اور اُن سے عزت واحترام کے ساتھ باتیں کریں۔ لیکن عبداللہ بن اُم مکتوم کے دل میں خدا تعالیٰ کے احکام کا وہ ادب نہیں ہوسکتا تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں تھا۔ اور نہ اُن کو اکرامِ ضعیف کا اس قدر احساس ہوسکتا تھا جتنا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کا احساس تھا خصوصًا اندھے میں تو یہ احساس بہت کم ہوتا ہے چونکہ اسے کچھ نظر نہیں آتا اس لئے وہ دوسروں کو کھری کھری سُنا دیتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی کہتے ہیں کہ اگر کھری کھری باتیں سُننی ہوں تو کسی اندھے سے جا کر سُن لو۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ چونکہ اندھے کو نظر

نہیں آتا اس لئے اُسے اس بات کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ لوگوں پر اس کی بات کا کیا اثر ہو رہا ہے۔ غرض عبداللہ بن اُم مکتوم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ آپ اشد ترین دشمن کفار کو تبلیغ کر رہے ہیں تو اُن کی طبعیت میں سخت جوش پیدا ہوا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں اور اُن سے بھی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ تم یہاں سے نکلو تمہارا یہاں کیا کام؟ آخر انہوں نے سوچ کر یہی کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنا شروع کر دیا کہ یارسول اللہ! اَقْرِئْنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ تَعَالٰی اور اس کو بار بار دُوہرایا اُن کی یہ بات رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ آئی۔ دوسری طرف آپ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ اُن کا دل ٹوٹے اس لئے اُس وقت آپ نے عبوس اور تولّی سے کام لیا۔ آپ نے خیال فرمایا کہ آخر یہ کفار کے روٴساء کیا کہیں گے کہ یہ مسلمان ایسے تہذیب سے ناآشنا ہیں کہ آداب مجلس کا بھی خیال نہیں رکھتے اور یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کوئی شخص اُن کے پاس اُن کی باتیں سُننے کے لئے آیا ہوا ہے۔ خواہ وہ منافقت سے آئے تھے۔ خواہ دل میں وہ آپ کی باتوں کو جھوٹا ہی کہتے جاتے تھے مگر چونکہ وہ ظاہر یہ کرتے تھے کہ ہم اسلام کی باتیں سننے کے لئے آئے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی سمجھتے تھے کہ ان کو تبلیغ کرنا ضروری ہے اس لئے آپ نے ابن اُم مکتوم کی دخل اندازی پر عبوس کیا اور تولّی کی۔ اس واقعہ کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤى ہمارے رسول نے عبوس کیا اور تولّی کی۔ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى اس موقعہ پر کہ آپ کے پاس ایک اندھا آیا۔ اَلْاَعْمٰى کا لفظ بھی بتلاتا ہے کہ یہاں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اَلْاَعْمٰى سے کوئی خاص اندھا مراد ہے۔ اگر اس جگہ اس اندھے کی تعریف کرنے کا موقعہ ہوتا اور یہ کہنا ہوتا کہ اُس اندھے کی طرف کیوں توجہ نہیں کی گئی یا اُس اندھے نے جو فعل کیا تھا وہ بڑا قابل تعریف تھا تو بجائے اَلْاَعْمٰى کہنے کے اس کا نام لیا جاتا اور کہا جاتا کہ فلاں شخص آیا مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عبوس اور تولّی سے کام لیا۔ لیکن اس جگہ چونکہ زد ایک اندھے پر پڑتی تھی اس لئے اس کا نام نہیں لیا گیا اور اَعْمٰى کہہ کر اشارہ کر دیا کہ یہاں ایک خاص واقعہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے اَعْمٰى کے ساتھ اَلْ لگا دیا۔ اور اس طرح ایک مخصوص اندھے کی طرف اشارہ کیا گیا پس اللہ تعالیٰ کا اَلْاَعْمٰى کہنا بتا رہا ہے کہ اس واقعہ کی زد اُس اعمٰی پر ہی پڑتی تھی تبھی اُس کا نام نہیں لیا گیا۔ ورنہ اگر یہ تعریف کا موقع ہوتا تو اللہ تعالیٰ ضرور نام لیتا۔ اور کہتا کہ عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى اَنْ جَآءَهُ عَبْدُاللّٰهِ ابْنُ اُمِّ مَكْتُوْمٍ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ اِدھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق صرف عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤى کے الفاظ رکھ دئے کیونکہ ان دونوں میں آپ کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کی تعریف کی گئی ہے۔

میرے نزدیک واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ بن اُمّ مکتوم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئے اور انہوں نے ایسے رنگ میں سوال کیا جو دوسروں کی دل شکنی کا باعث تھا اور پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کلام بھی قطع ہوتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر اپنی ناراضگی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ صرف اتنا ہوا کہ آپ نے ماتھے پر تیوری چڑھائی۔ اور اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن کو ایک اندھا شخص دیکھ نہیں سکتا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی باتیں جاری رکھیں اور عبداللہ بن اُم مکتوم کی طرف کوئی توجہ نہ کی تو وہ غُصّہ میں اُٹھ کر چلے گئے۔ ممکن ہے انہوں نے بعض اور لوگوں کے پاس بھی اس بات کو بیان کیا ہو اور ممکن ہے جن کے پاس انہوں نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہو ان کی طبیعت بھی اسی قسم کی جوش والی ہو اور ان کے دل میں بھی یہ میں خیال پیدا ہوا ہو کہ یہ بات اچھی نہیں ہوئی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری طرف توجہ کرنی چاہیے یہ خبیث دشمن کون ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور آپ کے وقت کو ضائع کرتے ہیں۔ پس عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے اور مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰٓی میں عبداللہ بن ام مکتوم کی طرح کے خیالات رکھنے والے لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہمارے اس رسول نے ایک اندھے کے بیجا دخل دینے پر عبوست کی اور بڑے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا ثبوت دیا اور ہمارے اس رسول نے صرف توَلّی کی اور بڑے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا ثبوت دیا تاکہ غصّہ اور ناراضگی کی حالت میں بات بڑھ نہ جائے۔ ☆

☆ نوٹ: عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی سے كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ تک کی آیات کا ترجمہ متن میں اس مضمون کے مطابق نہیں کیا گیا جو آیت نمبر ۲، ۳ میں بیان ہو چکا ہے ان آیات کا ترجمہ ایک اور مضمون کے مطابق کیا گیا جو کہ آیت نمبر ۱۲ کے ماتحت درج کیا گیا ہے۔ آیت نمبر ۲، ۳ کے ماتحت کی گئی تفسیر کے مطابق ان آیات کا ترجمہ یوں ہو جاتا ہے۔ ''وہ چیں بجبیں ہوا اور (اس کی طرف سے) مُنہ موڑ لیا۔ اس وجہ سے کہ اس کے پاس ایک نابینا (جسے واقف لوگ جانتے ہیں) آیا اور اے معترض کون سی بات تجھے (اس پر) آگاہ کر سکتی ہے کہ وہ ضرور پاک ہو جائے گا یا (موجبات عبرت کو) یاد کرے گا تو (یہ) یاد کرنا اُسے نفع بخش دے گا وہ شخص جو بے پروائی کرتا ہے تو تُو (اس کی طرف) خوب توجہ کرتا ہے حالانکہ تجھ پر (اس وجہ سے) کوئی الزام نہیں کہ وہ پاک نہ ہوگا۔ اور جو تیری طرف دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ (ساتھ ہی خُدا سے) ڈرتا بھی ہے تو تُو اس سے بے اعتنائی کرتا ہے۔ ہرگز نہیں یقیناً یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے۔''

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝۴ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ

اور (اے رسول) کون سی بات تجھے (اس پر) آگاہ کر سکتی ہے کہ وہ ضرور پاک ہو جائے گا یا (موجبات عبرت کو)

الذِّكْرٰى ۝۵

یاد کرے گا تو (یہ) یاد کرنا اُسے نفع بخش دے گا۔☆

حَلِّ لُغَات۔مَا يُدْرِيْكَ يُدْرِيْكَ يُدْرِيْ اور ک سے مرکب ہے۔یُدْرِیْ اَدْرٰی کا مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور کاف ضمیر کا ہے۔اَدْرٰی کے معنے ہیں اَعْلَمَهٗ۔اُس کو بتایا (اقرب) یُدْرِيْكَ کے معنے ہوں گے اس نے تجھ کو بتایا ہے اور مَا يُدْرِيْكَ کے معنے ہوں گے کس نے تجھے بتایا ہے؟ نیز عرب لوگ جب کہتے ہیں مَا يُدْرِيْكَ تو بسا اوقات مراد یہ ہوتی ہے کہ مَا تَدْرِيْ یعنی تو نہیں جانتا۔تجھے اس کا علم نہیں؟

يَزَّكّٰى يَزَّكّٰى اصل میں يَتَزَكّٰى ہے تاء کا زاء میں ادغام کر دیا گیا اور يَتَزَكّٰى سے يَزَّكّٰى ہو گیا۔تَزَكّٰى فُلَانٌ کے معنے ہوتے ہیں۔صَارَ زَكِيًّا وہ پاک ہو گیا (اقرب) اور يَتَزَكّٰى کے معنے ہوں گے۔وہ پاک ہو جاتا ہے۔اور لَعَلَّهٗ يَتَزَكّٰى کے معنے ہوں گے کہ اُس کے لئے ممکن ہے کہ وہ ہدایت پا جائے۔

يَذَّكَّرُ يَذَّكَّرُ اصل میں يَتَذَكَّرُ ہے۔تاء کو ذال میں ادغام کر دیا گیا۔اور يَذَّكَّرُ ہو گیا۔يَتَذَكَّرُ تَذَكَّرَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔اور تَذَكَّرَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں حَفِظَهٗ فِيْ ذِهْنِهٖ کسی چیز کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔اور جب تَذَكَّرَ مَا كَانَ قَدْ نَسِيَ کہیں تو معنے ہوں گے فَطِنَ بِهٖ کسی بھولی ہوئی بات کو یاد کر لیا۔(اقرب) پس يَتَذَكَّرُ کے معنے ہوں گے۔کسی نصیحت والی بات کو ذہن میں وہ محفوظ کر لے (۲) یا کسی نصیحت والی بھولی ہوئی بات کو یاد کر لے۔

تفسیر۔اس آیت کے صاف معنے یہ ہیں کہ تجھ کو کس نے بتایا کہ وہ شخص ہدایت پا جاتا۔مگر مفسّرین اس کے معنے یہ کرتے ہیں کہ تجھ کو کس نے بتایا کہ وہ ہدایت نہ پاتا۔پھر وہ کہتے ہیں مَا يُدْرِيْكَ الگ جملہ ہے اور لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى الگ جملہ ہے۔گویا اس کے معنے وہ اس رنگ میں کرتے ہیں کہ مَا يُدْرِيْكَ تجھے کس نے بتایا ہے کہ وہ ہدایت نہ پاتا لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى شاید وہ ہدایت پا جاتا۔حالانکہ اس آیت کے صاف معنے یہ ہیں کہ تجھے کس نے بتایا کہ وہ شخص ضرور

☆نوٹ۔لَعَلَّ کا ترجمہ ''ضرور'' کے لفظ سے کیا گیا ہے اس لئے کہ لَعَلَّ کلام ملوک کے طور پر استعمال ہوتا ہے یعنی بادشاہ کے لئے کوئی اور یا بادشاہ اپنی نسبت خود امید اور توقع کے الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن مراد اس سے یقینی بات یا حکم کے ہوتی ہے۔

فائدہ اٹھاتا۔ یہاں یُدۡرِیۡکَ سے مراد وہ خیال ہوگا جو بعض مسلمانوں کے دل میں اُس وقت پیدا ہوا یا ہوسکتا تھا۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے معترض تجھے کس نے بتایا ہے کہ اگر عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف توجہ کی جاتی تو وہ ضرور فائدہ اٹھاتا۔ آخر لوگ مرتد بھی ہوجاتے ہیں اور باوجود ایمان کے بڑے بڑے دعووں کے اُن پر بعض دفعہ ایسا وقت بھی آجاتا ہے جب اُن کی تمام کوششیں ایمان کے خلاف صرف ہونے لگ جاتی ہیں۔ پس جب حالت یہ ہے اور تغیّرات کے مختلف دور آتے رہتے ہیں تو تمہارے پاس کون سا ذریعہ ایسا ہے جس سے تمہیں پتہ لگ گیا کہ فلاں شخص کی طرف توجہ کرنا زیادہ مفید تھا۔ انبیاء کا مقام بیشک ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ کسی شخص سے کوئی بات کہیں تو خواہ وہ کیسے ہی اہم کام میں مشغول ہو اور خواہ اس کو ترک کرنا کتنا ہی تکلیف دِہ ہو اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو ترک کر دے اور نبی کی بات سننے کی طرف متوجہ ہوجائے اور درحقیقت یہی ایمان کی علامت ہے خدا کے رسول کی آواز کے بعد کسی انسان کا کوئی حق نہیں رہتا کہ وہ دوسرے امور کی طرف متوجہ رہے۔ پس مقامِ نبوت رکھنے والا انسان یا اُس کا نائب اگر کسی شخص کو اپنی طرف متوجہ کرے اور وہ شخص مثلاً اُس وقت کسی کو تبلیغ کر رہا ہو تو خواہ قطع کلامی کو لوگ بدتہذیبی سمجھیں اس کا فرض ہوگا کہ وہ تبلیغ کو بند کر دے اور خدا کے رسول اور اس کے نائب کی بات سننے کی طرف متوجہ ہوجائے۔ اگر ابن ام مکتوم تبلیغ کر رہے ہوتے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو بلاتے تو اُن کا فرض تھا کہ وہ تبلیغ کو چھوڑ دیتے اور اس بات کی پروا نہ کرتے کہ اگر میں نے ایسا کیا تو اس کو تہذیب کے خلاف سمجھا جائے گا۔ مگر عبداللہ بن ام مکتوم کو یہ مقام حاصل نہیں تھا کہ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تو آپ اُس کی طرف ضرور متوجہ ہوجاتے اور دوسروں کو تبلیغ چھوڑ دیتے۔ یہ بھی ایک قیاس تھا کہ اگر کفار کی طرف توجہ کی گئی تو ان کو فائدہ نہ ہوگا۔ اور یہ بھی ایک قیاس تھا کہ اگر عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف توجہ کی جاتی تو اُسے فائدہ ہوتا۔ کوئی قطعی اور یقینی بات نہیں تھی اور جب یہ دونوں قیاسی باتیں تھیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض تھا کہ اخلاق جس بات کی تائید میں تھے اس کو اختیار کرتے اور جس بات کی اخلاق اجازت نہیں دیتے اس کی طرف توجہ نہ کرتے اسی وجہ سے آپ نے عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف تو توجہ نہ کی اور کفار کی طرف ہی تمام توجہ رکھی۔ پس مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی میں یہ بتایا گیا ہے کہ اے معترض تُو جو کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلطی کی تجھے کس نے بتایا ہے کہ ابن اُم مکتوم کے لئے تزکیہ حاصل کرنا ممکن تھا دوسرے کے لئے نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُس نے بعد میں تزکیہ حاصل کر لیا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا پتہ تھا کہ کل اس کا کیا انجام ہوگا اور یہ ہدایت پر قائم بھی رہے گا یا نہیں۔ بہرحال جب خدا نے کہا ہے کہ جو شخص تمہارے گھر میں آئے تم اس کا احترام کرو اور جب خدا نے یہ کہا ہے کہ

جو بات مقدم ہو اُس کو مقدم رکھو اور جو مؤخر ہو اس کو مؤخر رکھو تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کس طرح کر سکتے تھے؟ اور کس طرح فیصلہ کر سکتے تھے کہ عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف اگر توجہ کی گئی تو وہ ضرور پاک ہو جائے گا۔ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى یا یہ بھی کس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو سکتا تھا کہ اگر اُسے کچھ نصیحت کی باتیں بتائی گئیں تو وہ اُن سے فائدہ اٹھالے گا؟ ممکن ہے کوئی شخص کہہ دیتا کہ اگر زیادہ نہ سہی تو عبداللہ بن ام مکتوم کچھ تو فائدہ اٹھا لیتے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہیں اس بات کا بھی کیا علم ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ فائدہ اٹھاتا یا نہ اٹھاتا؟ یہ بھی ایک قیاس ہے اور وہ بھی ایک قیاس ہے۔ اور جب دو قیاس جمع ہو گئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس قیاس کو ترجیح دے دی جس کے ترجیح دینے سے اکرامِ ضعیف میں بھی کوئی نقص واقع نہیں ہو سکتا تھا۔ اور خدا تعالیٰ کا یہ قانون بھی پورا ہو جاتا تھا کہ مقدم کو مقدم اور مؤخر کو مؤخر رکھو۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ۝۶ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ؕ۝۷ وَمَا عَلَيْكَ

(کیا) جو شخص (حق سے) بے پرواہی کرتا ہے۔ (اس کی طرف) تو تُو خوب توجہ کرتا ہے؟ حالانکہ تجھ پر

اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ۝۸

(اس وجہ سے) کوئی الزام نہیں کہ وہ پاک نہ ہوگا۔

حَلِّ لُغَات۔ اِسْتَغْنٰى اِسْتَغْنٰى غَنِيَ سے باب استفعال ہے۔ غَنِيَ غِنًا کے معنے ہوتے ہیں۔ وہ مالدار ہو گیا۔ اور اِسْتَغْنٰى کے معنے ہوں گے۔ اُس نے چاہا کہ وہ مالدار ہو جائے۔ نیز اِسْتَغْنٰى عَنْهُ بِهٖ کے معنے ہوتے ہیں اِكْتَفٰى اُس نے ایک چیز کے مل جانے سے دوسری سے لاپرواہی کی (اقرب) پس اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى کے معنے ہوں گے وہ جو مال کا طالب ہے (۲) وہ جو لاپرواہی کرتا ہے۔

تَصَدّٰى تَصَدّٰى اصل میں تَتَصَدّٰى ہے جو تَصَدّٰى کا مضارع ہے۔ تَصَدّٰى لَهٗ کے معنے ہیں تَعَرَّضَ وَهُوَ الَّذِيْ يَسْتَشْرِفُهٗ نَاظِرًا اِلَيْهِ۔ کسی چیز کے سامنے آیا۔ اور شوق سے اس کو دیکھا۔ اور تَصَدّٰى لِلْاَمْرِ کہیں تو معنے ہوں گے رَفَعَ رَاْسَهٗ اِلَيْهِ اپنا سر اس کی طرف توجہ کے لئے اٹھایا (اقرب) پس تَصَدّٰى کے معنے ہوں گے۔ تُو اس کے سامنے آتا ہے (۲) تُو اس کی طرف توجہ دیتا ہے۔

تفسیر۔ یہاں عام انسانوں کی حالت بیان کرتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے

والوں کا اپنا حال بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کی اپنی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ بڑے لوگوں کی طرف تو توجہ کرتے ہیں لیکن چھوٹے درجہ کے آدمیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے والوں کو ان کی اپنی حالت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اے معترض! تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہتا ہے کہ جو مستغنی ہوتا ہے اس کی طرف وہ زیادہ توجہ کرتے ہیں اور جو غریب اور معمولی درجہ کا آدمی ہوتا ہے اس کی طرف وہ کوئی توجہ نہیں کرتے۔ حالانکہ اے معترض تُو جو کچھ کہہ رہا ہے یہ تیری اپنی حالت ہے اور تیرا ذاتی رویّہ واقعہ میں ایسا ہی ہے کہ تو اُمراء کی طرف توجہ کرتا ہے اور غرباء کو نظر انداز کر دیتا ہے مگر تُو اپنی اس حالت کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتا ہے اور جو الزام خود تجھ پر عائد ہوتا ہے وہ تُو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگا رہا ہے۔ تُو اپنے حالات پر غور کر اور دیکھ کہ کیا یہ سچ نہیں کہ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی۔ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی جو شخص امیر ہوتا ہے تیری ساری توجہ کا وہ مرکز بن جاتا ہے تَصَدّٰی دراصل تَتَصَدّٰی ہے وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی حالانکہ تجھ پر اس بات کی کوئی ذمہ واری نہیں کہ کون شخص ہدایت پاتا ہے اور کون نہیں پاتا۔ تمہیں خدا تعالیٰ کے قانون کا احترام مدنظر رکھنا چاہیے اور جو کچھ خدا کہے اس پر اپنی ذاتی خواہشات کو قربان کر دینا چاہیے خدا کہے کہ مومن سے بات کرو تو تم مومن سے بات کرو اور اگر خدا کہے کہ کافر سے بات کرو تو تم کافر سے بات کرو۔ مگر تم تو عمداً اور ارادتاً اُنہی کی طرف توجہ کرتے ہو جو امراء میں شامل ہوتے ہیں حالانکہ یہ صرف خدا کو ہی پتہ ہے کہ کس نے نَازِعَات میں سے بننا ہے اور کس نے نَاشِطَات میں سے بننا ہے۔ تمہارا کام یہی ہے کہ جو خدا تعالیٰ کے مقررہ قواعد ہیں اُن پر عمل کرو۔ خدا تعالیٰ نے اکرام ضیف کا حکم دیا ہے تم اکرامِ ضیف کو ملحوظ رکھو۔ خدا تعالیٰ نے مقدم کو مقدم اور مؤخر کو مؤخر رکھنے کا حکم دیا ہے تمہارا فرض ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو اور اس بات کو نظر انداز کر دو کہ فلاں امیر ہے اور فلاں غریب۔ مگر تمہاری حالت یہ ہے کہ تم امراء کی طرف توجہ رکھتے ہو اور پھر کہتے یہ ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کرتے ہیں حالانکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو جو کچھ کیا خدائی منشاء کے مطابق کیا۔ اس کے احکام کو انہوں نے ملحوظ رکھا۔ اس کے اوامر کو انہوں نے تسلیم کیا اور اُس کے قوانین کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ مگر تم بجائے اپنی حالت پر غور کرنے کے یہ نقص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر رہے ہو۔ حالانکہ انہوں نے جو کچھ کیا بالکل بجا اور درست کیا۔

وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ﴿۹﴾ وَ هُوَ يَخْشٰى ۙ﴿۱۰﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ

اور (کیا) جو تیری طرف دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ (ساتھ ہی خدا سے) ڈرتا بھی ہے تو تو اس

تَلَهّٰى ۚ﴿۱۱﴾

سے بے اعتنائی کرتا ہے۔

حَلّ لُغَات۔يَسْعٰى يَسْعىٰ سَعٰى سے مضارع کا صیغہ ہے اور سَعٰی کے معنے ہیں قَصَدَ اُس نے ارادہ کیا۔ اور جب سَعٰى الرَّجُلُ کہیں تو معنے ہوں گے مَشٰى وَعَدَا یعنی وہ دوڑ کر چلا (اقرب) پس يَسْعٰى کے معنے ہوں گے وُہ دوڑ کر آتا ہے (۲) وہ قصد کرتا ہے۔

تَلَهّٰى تَلَهّٰى اصل میں تَتَلَهّٰى ہے جو تَلَهّٰى سے مضارع ہے اور تَتَلَهّٰى کے معنے ہیں تَتَشَاغَلُ تو ایک سے توجہ ہٹا کر دوسرے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ (لسان)

تفسیر۔اس آیت میں خدا تعالیٰ نے کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ نہیں کیا مگر اس سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ یہ آیت ابن ام مکتوم والے واقعہ پر چسپاں نہیں ہوسکتی کیونکہ ابن اُم مکتوم تو اندھے تھے وہ دوڑتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کس طرح آسکتے تھے۔ پھر ابن اُم مکتوم تو اتنے دلیر آدمی تھے کہ مکّہ کے بڑے بڑے رؤساء بیٹھے ہیں اور وہ آتے ہی اُن کو ڈانٹنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ خدا اور رسول کے دشمن یہاں بیٹھے ہی کیوں ہیں۔ یہ تو مردود لوگ ہیں ان کی طرف توجہ کرنا اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے مگر یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَهُوَ يَخْشٰى ساتھ ہی وہ ڈرتا بھی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا عبداللہ بن ام مکتوم والے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں بھی درحقیقت لوگوں کے اندرونی اخلاق کا ایک عام نقشہ کھینچا گیا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے والوں کو جواب دیا گیا ہے کہ تم ہمارے رسول پر کیا اعتراض کرتے ہو تمہاری تو اپنی حالت یہ ہے کہ تمھارے پاس اگر کوئی غریب شخص دوڑا دوڑا آئے تو تم اُس کی طرف منہ بھی نہیں کرتے لیکن اگر کوئی امیر آجائے تو صرف اتنی بات پر ہی خوش ہو جاتے ہو کہ وہ امیر تمہارے پاس چل کر آیا اور تم اس پر خوشی سے اپنے جامہ میں پھُولے نہیں سماتے۔ پس یہ تمہاری اپنی حالت ہے ہمارا رسول ایسا نہیں۔ ہمارے رسول کے متعلق یہ کہنا کہ وہ امیروں کی طرف زیادہ توجہ کرتا ہے اور غرباء کو نظر انداز کر دیتا ہے صریح ظلم ہے۔ ہاں تمہاری حالت یہی ہے اور اس

کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں چنانچہ واقعہ میں اگر دُنیا پر غور کر کے دیکھا جائے تو لوگوں کے دلوں میں اس بات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ کسی امیر شخص سے اُنہیں گفتگو کرنے کا موقعہ مل جائے مگر اللہ تعالیٰ کے انبیاء ان باتوں کی ذرا بھی پروانہیں کرتے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک دفعہ لاہور یا امرتسر کے سٹیشن پر تھے کہ پنڈت لیکھرام بھی وہاں آ پہنچے اور اس نے آپ کو آکر سلام کیا۔ چونکہ پنڈت لیکھرام آریہ سماج میں بہت بڑی حیثیت رکھتے تھے اس لئے جو لوگ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ تھے وہ بہت خوش ہوئے کہ لیکھرام آپ کو سلام کرنے کے لئے آیا ہے۔ مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کی طرف ذرا بھی توجہ نہ کی اور جب یہ سمجھ کر کہ شاید آپ نے دیکھا نہیں کہ پنڈت لیکھرام صاحب سلام کر رہے ہیں آپ کو اس طرف توجہ دلائی گئی تو آپ نے بڑے جوش سے فرمایا کہ اسے شرم نہیں آتی کہ میرے آقا کو تو گالیاں دیتا ہے اور مجھے آکر سلام کرتا ہے۔ گویا آپ نے اس بات کی ذرا بھی پَروا نہ کی کہ لیکھرام آیا ہے لیکن عام لوگوں کے نزدیک سب سے بڑی کامیابی یہی ہوتی ہے کہ کسی بڑے رئیس یا لیڈر سے اُن کو ملنے کا اتفاق ہو جائے۔ چنانچہ جب کوئی ایسا شخص اُن کے پاس آتا ہے وہ بڑی توجہ سے اُس سے ملتے ہیں لیکن اگر کوئی غریب شخص آجائے تو پروا بھی نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ معترضین کو اُن کے اسی نقص کی طرف توجہ دلاتا ہے اور بتاتا ہے کہ اَمَّا مَنۡ جَآءَکَ یَسۡعٰی۔ وَ ھُوَ یَخۡشٰی۔ فَاَنۡتَ عَنۡہُ تَلَہّٰی۔ تمہاری اپنی حالت یہ ہے کہ جو شخص تمہارے پاس دوڑتا ہوا آئے اور ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت بھی اپنے دل میں رکھتا ہو لیکن امارت اس میں نہ ہو تم اُس سے غافل رہتے ہو۔ پس وہ لوگ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اُن کو زجر کیا ہے کہ تم ہمارے رسول پر کیا اعتراض کرتے ہو جاؤ اور اپنے اخلاق کو دیکھو۔ تمہاری حالت یہ ہے کہ جب تمہارے پاس کوئی بڑا آدمی آجائے تو تم اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے ہو۔ اس کی طرف تم اپنی تمام توجہ صرف کر دیتے ہو لیکن اگر کوئی مسکین اور غریب آدمی آجائے تو تُم اس سے منہ پھیر لیتے ہو اور اُس سے بات تک کرنا گوارا نہیں کرتے۔ تمہارا اعتراض آخر کیا ہے یہی کہ عبد اللہ بن ام مکتوم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ نے اس کی طرف توجہ نہ کی حالانکہ اُس وقت آپ کا اس کی طرف توجہ نہ کرنا ہی ضروری تھا۔ اُس نے مجلس میں آکر ایک نامناسب حرکت کی خلافِ اخلاق حرکت کی۔ خلافِ آداب حرکت کی اور وہ یقیناً اسی بات کا مستحق تھا کہ اس کی طرف توجہ نہ کی جاتی مگر تم اس پر اعتراض کر رہے ہو اور تم یہ نہیں دیکھتے کہ ایک جائز فعل پر تو اعتراض کر رہے ہو اور تمہاری اپنی حالت یہ ہے کہ تم امیروں کی

طرف ہی توجہ رکھتے ہو غریبوں کو اپنی خاطر میں ہی نہیں لاتے۔

ابن ام مکتوم کے آنے اور بیجا دخل پر عبوس وتولّٰی اختیار کرنے سے آنحضرتؐ کے بہترین اخلاق کا اظہار

غرض اُن چاروں باتوں میں سے جن کو میں تفصیل کے ساتھ اوپر بیان کر چکا ہوں اِس موقعہ پر ایک ہی بات چسپاں ہوتی ہے۔ میرے نزدیک عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہی ہے اور میرے نزدیک ایک اندھے کے آنے پر آپ کا عبوس اور تولّٰی اختیار کرنا اعلیٰ درجے کا قابلِ تعریف فعل ہے اور یہ آیت بھی آپ کے اخلاق کی تعریف کے لئے ہی نازل ہوئی ہے مذّمت کے لئے نازل نہیں ہوئی۔ مذمّت والے معنے کر کے آیات کی ترتیب قائم ہی نہیں رہتی مَیں نے بتایا ہے کہ ان آیات میں غائب کے صیغے شروع ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد ہی مخاطب کے صیغے شروع ہو جاتے ہیں۔ صیغوں کی یہ تبدیلی کسی حکمت کے بغیر نہیں ہو سکتی اور وہ حکمت یہی ہے کہ پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی گئی ہے اور پھر کفار یا بعض ناتربیت یافتہ مسلمانوں کے دلوں میں اِس واقعہ سے جو وساوس پیدا ہوئے تھے یا ہو سکتے تھے اُن کا ازالہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے منشاء اور اُس کے احکام کے بالکل مطابق تھا آپؐ پر اعتراض کرنے والوں کی اپنی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اُمراء اور غرباء میں تفاوت کرتے ہیں۔ وہ بڑوں اور چھوٹوں میں امتیاز روا رکھتے ہیں مگر ہمارا رسول ایسا نہیں ہے پس عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرنے کے بعد وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى میں معترضین کو مخاطب کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تمہارا اعتراض بالکل بے ہودہ ہے تمہیں کون سا یقینی علم اِس بات کا ہے کہ ابن اُم مکتوم کی طرف اگر توجہ کی جاتی تو وہ ضرور فائدہ اٹھاتا یا تمہیں کون سا الہام ہوا ہے کہ ابن ام مکتوم کا فائدہ اٹھانا زیادہ قرینِ قیاس تھا۔ صرف تمہارا قیاس ہی ہے کہ اس کی طرف توجہ کرنا زیادہ بہتر تھا۔ اور جب یہ صرف قیاس تھا کسی یقینی اور قطعی علم پر اِس کی بنیاد نہیں تھی تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدم کو مقدم رکھا اور اکرامِ ضیف کے حکم کو بھی نظر انداز نہ ہونے دیا اور ابن ام مکتوم کی دخل اندازی پر ایسے رنگ میں اظہار ناراضگی کیا جس سے اندھے کو کوئی خاص تکلیف نہیں ہو سکتی تھی۔ پس آپؐ نے جو کچھ کیا بالکل درست کیا۔ لیکن اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے والو! تمہارے اپنے اخلاق یہی ہیں مگر تم الزام ہمارے رسول پر لگا رہے ہو۔ انبیاءؑ پر الزام لگانا یا اُن پر کوئی بے جا اعتراض کرنا بہت خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاءؑ کے متعلق بہت بڑی غیرت رکھتا ہے۔ اسی غیرت کا مظاہرہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ کمزوری خود تمہارے اندر پائی جاتی ہے اور تمہارے اپنے

اخلاق ایسے ہی ہیں۔

مَیں نے دیکھا ہے بیسیوں دفعہ منافق مجھ پر کئی قِسم کے اعتراض کرتے ہیں مَیں اُن کے جواب میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ یہ اعتراض تو صحیح ہیں مگر مجھ پر نہیں بلکہ خود تم پر پڑتے ہیں کیونکہ تمہارے اپنے اعمال بتا رہے ہیں کہ تم میں یہ یہ خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ یہی طریق اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اختیار کیا ہے کہ جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ بعض لوگ غریبوں کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اُمراء کی طرف توجہ کر لیتے ہیں یہ تو بالکل صحیح اور درست ہے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا بلکہ معترضین کے اندر بیشک یہ کمزوری پائی جاتی ہے اور ہم اِن کی اس کمزوری کو تسلیم کرتے ہیں۔ گویا ایک طرف اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کو صحیح قرار دے دیا اور دوسری طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراض کیا جاتا تھا اُس کو غلط قرار دے دیا اور مسلمانوں کو نصیحت کر دی کہ مسلمانوں میں سے جدید العہد یا کفار میں سے بعض لوگ چونکہ خود اُن کے اندر یہ نقائص پائے جاتے ہیں اِس لئے وہ اِن نقائص کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں حرج نہیں سمجھتے۔ تمہیں اِن باتوں سے بچنا چاہیے اور رسول کے متعلق مقامِ ادب پر کھڑا ہونا چاہیے۔

احادیث کی روایتوں کو نظر انداز کرنے کی صورت میں عَبَسَ وَ تَوَلّٰی کے معنے اگر روایتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تب تو آسانی سے اِن آیات کے یہ معنے کئے جا سکتے ہیں کہ عَبَسَ وَ تَوَلّٰی کافر کی نسبت ہے اور مراد یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب رؤساء مشرکین بیٹھے ہوئے تھے ایک اندھا آیا اور اُس نے کچھ سیکھنا چاہا اس پر ایک کافر سردار نے عبوست کا اظہار کیا۔ اور مُنہ پھیر لیا۔ گویا اِس امر کو کہ آپؐ کے پاس ایک اندھا سیکھنے آیا ہے ایک حقیر امر سمجھا اور اس پر حقارت کا اظہار مُنہ پھیر لینے سے کیا۔ اس پر فرماتا ہے اے عبوست اور تولّی کرنے والے! تجھے کیا معلوم ہے یہ شخص تو تزکیہ حاصل کرے گا یا نصیحت سُنے گا اور اُس سے فائدہ اٹھائے گا اور بطور دوست اور شاگرد ایسا ہی آدمی مفید ہوتا ہے اور عقلمند ایسے ہی انسان کی عزّت کرتے ہیں۔ باقی رہا مالدار اور ظاہری ترقی یافتہ سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غرباء کے آنے پر ناک بھوں چڑھانے والے تُو تو ایسے ہی آدمی کی طرف لپکتا ہے اور اُسی کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اور تجھے اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا کہ وہ پاک ہوتا ہے یا بدکار رہتا ہے تجھے تو اس سے غرض ہے کہ وہ مالدار اور دولتمند ہو پھر کسی اور شے کی پرواہ نہیں۔ اور دوسرا شخص جو تیری طرف دوڑتا آتا ہے (یعنی سوالی یا حاجتمند) اور اس کا دل ڈر رہا ہوتا ہے کہ یہ بڑا آدمی ہے میری بات بھی سُنتا ہے یا نہیں۔ تُو نہ اس کو اپنی عنایت کا امیدوار سمجھ کر اس کی قدر کرتا ہے اور نہ اُس کی مسکینی اور دھڑکتے ہوئے دل کا

خیال کرتا ہے اور اُسے کہہ دیتا ہے ہمیں فرصت نہیں اور سمجھتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اندھوں اور اپاہجوں کی طرف توجہ کرنا اُس کے ادنیٰ ہونے کی علامت ہے اور تیرا مالداروں کی صحبت کا متلاشی ہونا تیرے بڑے ہونے کی علامت ہے۔ مگر یہ امر درست نہیں کیونکہ قابلِ توجہ وہی ہے جس کی اصلاح اور پاکیزگی کی امید کی جائے۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل مستحسن ہے اور تیرا ناک بُھوں چڑھانا ناواجب ہے۔ اِن آیات میں بتایا ہے کہ اسلام کے آئندہ سپاہی امراء سے نہیں چُنے جائیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ اُن کا انتخاب اُن ارواحِ طیّبہ سے کرے گا جو صداقت کو ماننے اور پاکیزگی کو حاصل کرنے کی تڑپ رکھتی ہیں۔ گویا اَلنّٰزِعٰت اَلنّٰشِطٰت وغیرہ ارواح جن کا اُوپر ذکر ہوا تھا ان کی نسبت بتاتا ہے کہ اُن کی جستجو مالداروں اور رؤساء میں نہ کرو اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ کہیں اور دبکی بیٹھی ہیں اللہ تعالیٰ ہی اُن کو چُنے گا۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۲﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۳﴾

(ایسا) ہرگز نہیں (یہ سب الزامات غلط ہیں) یقیناً یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے پس جو چاہے اسے اپنے ذہن میں مستحضر کر لے۔

تفسیر۔ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ میں ابن ام مکتوم کے متعلق آنحضرتؐ پر اعتراض کرنے والوں کا جواب اُن معنوں کے لحاظ سے جن کو اوپر بیان کیا جا چکا ہے كَلَّآ کا لفظ اس کمزور انسان کے متعلق سمجھا جائے گا جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق شبہ کیا اور اپنے دل میں بعض ایسے وساوس کو آنے دیا جو اعلیٰ درجہ کے ایمان کے خلاف تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كَلَّآ ہرگز یوں بات نہیں جس طرح تم خیال کرتے ہو اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ یہ چیز جو ہماری طرف سے آئی ہے یہ تو ایک نصیحت کے طور پر ہے یعنی قرآن کریم خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک نصیحت نامہ کے طور پر نازل ہوا ہے اور اُس کے نزول سے ہماری غرض یہ ہے کہ دُنیا کے تمام لوگ ہدایت پائیں پس جبکہ اس کتاب کی غرض لوگوں کو ہدایت کے راستہ پر قائم کرنا ہے تو بنی نوع انسان میں سے جس شخص کے قلب کو بھی اِس ہدایت سے مناسبت ہو گی وہ اس کو ضرور قبول کرے گا کیونکہ جب یہ چیز اُسی زمین میں پنپ سکتی ہے جو اس کے مناسب حال ہو تو وہ لوگ جو اُس سے مناسبت نہیں رکھتے ہوں گے وہ اس کی طرف آئیں گے ہی نہیں۔ اور جو لوگ اُس سے مناسبت رکھتے ہوں گے وہ خود بخود آ جائیں گے اُن کو چننے اور انتخاب کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔ مَیں نے جیسا کہ شروع میں بیان کیا تھا سورۂ نازعات کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ یہ نَازِعَات اور

نَاشِطَات بننے والی روحیں آئیں گی کہاں سے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمہارے دل میں یہ سوال کیوں پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں کہاں سے آئیں گے جب ہم نے خود ان لوگوں کو چُننا ہے اور جب ان کا انتخاب ہمارے ہاتھوں میں ہے تو تمہیں اس کے متعلق کسی فکر کی ضرورت نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ نَازِعَات اور نَاشِطَات بننے والی قابلیتوں کے حامل کون کون لوگ ہیں اور آیا وہ اُمراء میں ہیں یا غُرباء میں یا اُمراء اور غُرباء دونوں میں ہیں۔ ہم اُن کے ذاتی اوصاف سے آگاہ ہیں۔ ہمیں اُن کی مخفی قابلیتوں کا علم ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کسی میں کیا کیا خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے ہم خود ان عظیم الشان امور کی سرانجام دہی کے لئے قابلیّتیں رکھنے والے نفوس کو کھینچ کھینچ کر لائیں گے قطع نظر اِس کے کہ ایسے نفوس اُمراء میں ہوں یا غرباء میں۔ چنانچہ دیکھ لو حضرت عثمانؓ اسلام میں داخل ہوئے جو مکّہ کے مالدار خاندان میں سے تھے اور طلحہؓ اور زبیرؓ بھی اسلام میں داخل ہوئے جو چوٹی کے رئیس خاندانوں میں سے تھے گو اُس وقت قوم کے منتخب لیڈر نہ تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ دولت اپنے ساتھ نہیں لائے لیکن حضرت عثمان اپنے ساتھ دولت بھی لائے۔ گویا امراء اور معزّز خاندانوں میں سے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے مناسب حال پایا اُن کو کھینچ لایا اور جن کو غرباء میں سے اسلام کے مناسب حال دیکھا اُن کو غرباء میں سے کھینچ لایا۔

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے ہماری جماعت کے ایک دوست تھے شیخ غلام احمد صاحب مرحوم اُن کو اپنے متعلق تصوّف میں دخل رکھنے کا خاص خیال تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ تصوّف کے متعلق جو اُن کا نظریہ ہے وہی سب دُنیا کا ہونا چاہیے۔ ایک دفعہ وہ مجھ سے ملے اور کہنے لگے بتائیے آپ کو غریب اچھے لگتے ہیں یا امیر اچھے لگتے ہیں۔ میں نے پہلے تو اُن کو ٹالنا چاہا مگر جب بار بار اور اصرار کے ساتھ انہوں نے یہ سوال کیا تو میں نے اُنہیں کہا کہ مجھے نہ امیر اچھے لگتے ہیں نہ غریب اچھے لگتے ہیں نہ امیر بُرے لگتے ہیں نہ غریب بُرے لگتے ہیں۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ جہاں تک خدا تعالیٰ کے کام کا تعلق ہے اس کو سرانجام دینے کے لئے وہ میرے ساتھ کسی امیر کو وابستہ کرتا ہے یا کسی غریب کو وابستہ کرتا ہے۔ اگر میرے کام کے لئے وہ ایک غریب کو چُنتا ہے تو وہی مجھے اچھا لگتا ہے اور اگر میرے کام کے لئے وہ ایک امیر کو چُنتا ہے تو وہی مجھے اچھا لگتا ہے میں تو اللہ تعالیٰ کے اشارہ کی طرف نگاہ رکھتا ہوں کہ وہ کس آدمی کو کام کے لئے میرے ساتھ وابستہ کر رہا ہے۔ اگر امیر ہو تو مجھے اس امیر سے محبت ہو جاتی ہے اور اگر غریب ہو تو مُجھے اُس غریب سے محبت ہو جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی یہ سُنّت ہے کہ وہ اپنے کام کے لئے امیروں کو بھی چُنتا ہے اور غریبوں کو بھی چُنتا ہے مگر اکثر وہ غریبوں میں سے چُنتا ہے اور اگر کوئی امیر چُنا جاتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ خاندانی لحاظ سے

اللہ تعالیٰ اس کو آگے لانا پسند کرتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ذاتی قابلیتوں کے لحاظ سے وہ اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اُسے آگے لایا جائے مگر چونکہ خاندانی عظمت کا جوہر بھی اُس کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے نبی کی جماعت میں وہ عزت پا جاتا ہے۔

یہ مضمون ہے جو اللہ تعالیٰ اس آیت میں بیان فرما رہا ہے کہ کَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ۔ یہ قرآن تو ایک نصیحت کی کتاب ہے جو چاہے اِسے پڑھے اور جو چاہے اس سے فائدہ اٹھالے۔ اس میں نبی کا کوئی واسطہ نہیں۔ خدا تعالیٰ نے مختلف لوگوں کی طبائع اس کے مطابق بنا دی ہیں اور وہ آہستہ آہستہ اس سے فائدہ اٹھاتے چلے جائیں گے ان کے راستہ میں کوئی چیز روک نہیں بن سکتی اگر امیر کو اس کے ساتھ قلبی مناسبت ہے تو اس امیر کو روکا نہیں جا سکتا اور اگر ایک غریب کو اس کے ساتھ قلبی مناسبت ہے تو اُس غریب کو روکا نہیں جا سکتا۔ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ یہ خیال کر لینا کہ دین صرف غریبوں کے لئے ہی ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ دین غریبوں کے لئے بھی ہے اور دین امیروں کے لئے بھی ہے جو چاہے خدا تعالیٰ کے دین میں داخل ہو کر فائدہ اٹھالے اور اللہ تعالیٰ کے قرب میں بڑھ جائے ہم نے کسی کو روکا ہوا نہیں۔ یہی فقرہ ہے جو میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا اور جس پر آج کل خاص طور پر زور پڑا ہوا ہے میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قرب کے راستوں کو محدود نہیں کیا۔ اُس نے اپنے فرشتوں کو اعلیٰ درجہ کے روحانی مدارج پر اس لئے نہیں کھڑا کر دیا کہ اب کسی کو آگے مت بڑھنے دو۔ خدا تعالیٰ کے قرب کے راستے کھلے ہیں اور کھلے رہیں گے یہاں تک کہ اگر کوئی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کے قرب میں بڑھنا چاہے تو وہ بڑھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی روک نہیں اگر کوئی بڑھ سکتا ہے تو بڑھ کر دکھا دے۔ مگر جب کسی نے اب تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر نہیں دکھایا اور نہ آئندہ دکھا سکتا ہے تو گو حقیقت یہی ہو گی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل ہیں مگر کہا یہی جائے گا کہ خدا تعالیٰ نے جبراً آپ کو اس مقام پر نہیں پہنچایا اور نہ اُس نے زبردستی طور پر دوسروں کو بڑھنے سے روکا۔ خدا تعالیٰ کے قرب کے راستے کھلے ہیں اور اگر کوئی شخص بڑھنا چاہے تو بڑھ سکتا ہے۔ یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمایا ہے کہ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ہماری طرف سے کوئی روک نہیں قرآن تو ساری دنیا کے لئے ہے۔ امیر کے لئے بھی ہے اور غریب کے لئے بھی ہے۔ عالم کے لئے بھی ہے اور جاہل کے لئے بھی ہے۔ کالے کے لئے بھی ہے اور گورے کے لئے بھی ہے۔ مشرقی کے لئے بھی ہے اور مغربی کے لئے بھی ہے۔ جو چاہے اس سے فائدہ اٹھالے۔

اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ میں ھا کی ضمیر کا مرجع اِنَّهَا میں ھَا کی ضمیر ہدایت اور موعظت کی طرف جاتی ہے گویا اِنَّهَا

تَذْكِرَةٌ کے معنے یہ ہیں کہ اِنَّ الْهِدَايَةَ الَّتِيْ جَآءَتْ مِنَ اللّٰهِ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ اَيِ الْقُرْاٰنَ۔ پس جو چاہے اس کلام سے جو ہم نے نازل کیا ہے فائدہ اٹھالے۔ ھَا کی ضمیر دونوں طرف جاسکتی ہے ذِکْرٰی کی طرف بھی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور قرآن کی طرف بھی۔ مگر اگلی آیات میں چونکہ خصوصیت سے قرآن کریم کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے وہی مراد ہے اور اس امر کو ظاہر کرنے کے لئے ایک جگہ مؤنث کی ضمیر یعنی ھَا کو استعمال کر دیا اور آگے ذَكَرَهٗ میں مذّکر کی استعمال کر کے بتا دیا کہ مراد قرآن کریم ہے ہاں اس کی صفت تذکیر کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا مقصود ہے اس لئے اس کی طرف مؤنث کی ضمیر پھیری گئی ہے۔

ایک نیا نکتہ۔ سورۃ عبس کی پہلی آیت کے ایک اور لطیف معنے آیات مذکورۃ الصدر کے ایک اور لطیف معنے بھی ہو سکتے ہیں۔ اور انہی کے مطابق میں نے ترجمہ کیا ہے اور وُہ معنے یوں ہیں کہ اس جگہ کلام طنز یہ ہے جیسے کہ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (الدخان: ۵۰) یعنی یہ جہنم کا کھانا کھا تُو تو بہت ہی طاقتور اور معزز تھا مطلب یہ کہ تو اپنے آپ کو طاقتور اور معزز کہا کرتا تھا حالانکہ تو نہ طاقتور تھا اور نہ معزز تھا یہ سب تیرے نفس کا فریب تھا اگر تُو اپنے خیال کے مطابق ہوتا تو آج تجھ کو جہنم کی ذلیل غذائیں کیوں کھانی پڑتیں۔ صاحب کشاف کہتے ہیں کہ یہ آیت ھزء اور تہکم کی قسم سے ہے (تفسیر کشاف الجزء الرابع صفحہ ۲۸۲ زیر آیت ذق انک انت۔۔۔) یعنی دشمن کے قول کی بظاہر تصدیق کی گئی ہے لیکن اصل میں اس کی تردید مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہارا یہ قول بالکل خلاف عقل ہے۔ دوسری زبانوں میں بھی یہ کلام طنز استعمال ہوتا ہے چنانچہ اُردو میں بھی اگر کوئی شخص کسی کا دوست ہو اور ہمیشہ اس کی خیر خواہی کرتا رہا ہو اور وہ دوسرا شخص کسی موقعہ پر اس کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کر دے جو خیر خواہی کے خلاف ہو تو وہ دوست اُسے جواب میں کہتا ہے ''ہاں ہاں کیوں نہیں میں تمہارا دشمن جو ہوا'' اور مراد اس کی یہ ہوتی ہے کہ مَیں تو تمہارا دوست ہوں اور ہمیشہ تمہاری خیر خواہی کرتا رہا ہوں تم ایسا الزام مجھ پر کس طرح لگا سکتے ہو۔ غرض مدّنظر تو تردید ہوتی ہے لیکن ظاہر میں انسان اس قول کی تائید کرتا ہے۔ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (الدخان: ۵۰) میں بھی یہی طریق کلام استعمال کیا گیا ہے۔ دشمن کہا کرتا تھا کہ میں عزیز وکریم ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ ذلیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن ہم اُسے دوزخ میں ڈالیں گے اور اُسے کہیں گے لو یہ عذاب چکھو اس لئے کہ تم عزیز وکریم ہو اور مطلب اس کا یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو عزیز وکریم کہنے میں جھوٹے تھے۔ اگر تم عزیز وکریم ہوتے تو یہ عذاب تمہیں کیوں دیا جاتا۔ اسی رنگ کا کلام میرے نزدیک اس سورۃ میں بھی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک اندھا آیا۔ اُس نے

ایک بے موقعہ بات کی اور آپ کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار ظاہر ہوئے۔ لیکن آپ نے اپنی ناپسندیدگی کو دبانے کے لئے اس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ کفار تو مومنوں میں پھوٹ ڈلوانے کی ہمیشہ کوشش کیا ہی کرتے ہیں۔ جب کفار کو اس واقعہ کا علم ہوا اور کیوں نہ معلوم ہوتا کہ خود کفار ہی کی موجودگی میں یہ واقعہ ہوا تھا تو کفار نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے اِس واقعہ سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور یہ مشہور کرنا شروع کیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک غریب ساتھی کی بڑی ہتک کی ہے صرف اس لئے کہ وہ غریب تھا جب آپؐ کے پاس شرفاء مکہ بیٹھے تھے اس کے آنے پر آپؐ ناراض ہو گئے۔ اور اس ذریعہ سے مسلمانوں کے دلوں میں تذبذب اور شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

آنحضرتؐ کے اخلاق کو پیش کر کے آنحضرتؐ پر ابن ام مکتوم کے متعلق اعتراض کرنے والوں کا منہ توڑ جواب

اللہ تعالیٰ اُن کے اِس اعتراض کی کمزوری اور لغویّت ظاہر کرنے کے لئے ھزء اور تحکم کے رنگ میں اس اعتراض کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤى۔ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ہمارے رسول نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا صرف اتنی سی بات پر کہ ابنِ اُم مکتوم اُس کے پاس آیا۔ اور مطلب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ظاہر ہیں اور دوست و دشمن اُن سے واقف ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ہی غرباء کے ساتھ رہتی تھی اور غرباء کی جماعت ہی آپؐ کے ارد گرد بیٹھتی تھی جو شخص غلاموں کی آزادی اور غریبوں، بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کی ترقی کے لئے رات دن مشغول رہتا ہو اس پر یہ الزام لگانا کہ صرف اس وجہ سے کہ ایک اندھا اس کے پاس آیا تھا اُس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔ کوئی عقلمند اِس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ پس یہ الزام خود ہی اپنی ذات میں تردید کر رہا ہے۔ جیسے کہتے ہیں آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ سورج کا نکلنا ہی سورج ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اِس امر کا منسوب کرنا ہی اِس الزام کا کافی جواب ہے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ پھر وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى کہہ کر اس تردید کو دلیل عقلی سے بھی مکمل کر دیا اور فرمایا کہ اندھے یا سوجاکھے کا سوال نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا کیا علم ہو سکتا تھا کہ کون سا شخص ہدایت پائے گا اور کون سا نہیں۔ کون ہدایت پر قائم رہے گا اور کون پھسل جائے گا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ظاہری شریعت کے پابند ہیں اور غیب کے علم میں دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔ غیب کا علم خدا کے پاس ہے اور وہی جانتا ہے کہ جو لوگ آج کافر نظر آتے ہیں وہ مرتے وقت کیا ہوں گے اور جو لوگ آج مومن نظر آتے ہیں وہ مرتے وقت کیا ہوں گے۔ ہماری شریعت کا ظاہری حکم یہی ہے کہ جو شخص ہم سے بات کر رہا ہو ہم پہلے اُس کی

طرف توجہ کریں اور بعد میں آنیوالا اپنے موقع کا انتظار کرے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کے اس حکم پر عمل کیا اور خدا کے حکم کو پورا کر دیا۔ غیب کا آپؐ کو علم نہیں تھا کہ آپؐ کہہ سکتے کہ کس کو تبلیغ کرنا وقت کو ضائع کرنا ہے اور کس کو تبلیغ کرنا وقت کو صحیح طور پر استعمال کرنا ہے ایک وقت وہ تھا کہ بلالؓ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے لئے تکلیفیں اٹھا رہا تھا۔ جلتی ریت پر اُس کو لٹایا جاتا۔ کُھر درے پتھروں پر اس کو گھسیٹا جاتا اور نوجوان اُس کے ننگے سینہ پر چڑھ چڑھ کر کُودتے تا کہ اُسے اسلام سے پھرا دیں (اسد الغابة بلال بن رباح) اور عمرؓ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مارنے کے لئے تلوار لئے پھرتے تھے (السیرة النبویة لابن هشام اسلام عمر بن الخطاب) لیکن بعد کے واقعات نے کیا بتایا۔ بے شک بلالؓ کا انجام بہت ہی اچھا ہوا مگر جس مقام کو عمرؓ پہنچے بلالؓ تو نہیں پہنچے۔ پس محض اس لئے کہ کوئی شخص اُس وقت کافر تھا اور کوئی دوسرا شخص اُس وقت مسلمان تھا اُس کو بناء قرار دیتے ہوئے شریعت کا ظاہری حکم محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح توڑ سکتے تھے۔ آپؐ کو کیا معلوم تھا کہ وہ ظاہر میں کافر نظر آنے والے لوگ آئندہ کیا بننے والے تھے۔ چنانچہ بعض روایات میں آتا ہے کہ اُن میں حضرت عباسؓ بھی تھے (تفسیر فتح البیان الجزء الخامس عشر صفحہ ۷۶)۔ اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ابنِ اُمّ مکتوم عباسؓ کے درجہ کو نہیں پہنچے۔ حضرت عباسؓ سے جو شوکت اسلام کو پہنچی اور خلفاءِ اسلام ان کی زندگی میں جس طرح اُن کا مشورہ لیتے اور اس پر عمل کرتے تھے وہ اُن کے عالی مقام پر شاہد ہے۔ پس وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى۔ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرَى میں خدا تعالیٰ نے عام طریق استدلال سے بھی اِس اعتراض کو ردّ کر دیا پھر أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَى۔ فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّى کہہ کر اسی قسم کے تہکم والے کلام کی طرف دوبارہ رجوع کیا اور کفار کا یہ بقیہ اعتراض دُہرایا کہ لوجی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توجہ نہیں کرتا اُس کی طرف بوجہ اُس کے عالی مرتبہ ہونے کے آپؐ بڑی توجہ کرتے ہیں۔ اِس اعتراض کو بھی ہزء اور تہکم کے طور پر اِس طرح دُہرایا گیا ہے گویا اِس اعتراض کی صحّت کو قبول کر لیا گیا ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح وہ شخص جس کا انصاف ظاہر ہو معترض کے جواب میں کہتا ہے۔ ہاں ہاں مَیں تو ظالم ہوں ہی لیکن اس اعتراض کے دُہرانے کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ مرے وجود کی طرف اِس اعتراض کا منسوب ہونا ہی اِس کے غلط ہونے کا ثبوت ہے۔ اِس جگہ اِس اعتراض کے نقل کرنے سے بھی یہی مراد ہے کہ ایسا ہرگز نہیں۔ چنانچہ پہلے اعتراض کی طرح یہاں بھی بعد میں اس اعتراض کے ردّ کرنے کی عقلی دلیل بیان فرما دی اور فرمایا کہ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّى یہ اعتراض ہی بالبداہت غلط ہے۔ تیرے متعلق یہ کہنا خلافِ عقل بات ہے۔ اگر یہ لوگ سمجھ سے کام لیں تو ان کو معلوم ہوسکتا ہے کہ اُن کفار کا جو مجلس میں بیٹھے تھے ہدایت پانا یا نہ پانا نہ تیرے اختیار میں ہے نہ تیرے سپُرد ہے۔ گویا پہلی

آیات میں تو یہ بتایا گیا تھا کہ ابنِ اُم مکتوم کا ہدایت پر مرنا تیرے علم کی بات نہیں اور اِس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اِن کفار کے ہدایت نہ پانے پر تجھ سے کوئی باز پُرس نہ ہونی تھی پھر کس ذاتی غرض سے تُو نے ابن اُم مکتوم کی طرف توجہ نہ کی اور کس فائدہ کی وجہ سے تُو نے اُن کفار کی طرف توجہ کی نہ تو ابن اُم مکتوم کی طرف توجہ نہ کرنے میں تیرا کوئی فائدہ تھا۔ اور نہ اُن کفّار کی طرف توجہ کرنے میں تیرا کوئی فائدہ تھا پس اِن واقعات کی موجودگی میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس واقعہ کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ (وہ وجہ وہی تھی جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یعنی شریعت کے ظاہری احکام کی پابندی).

اس کے بعد فرماتا ہے وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰى۔ وَ هُوَ یَخْشٰى۔ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى یہ بھی کفار کا ہی قول ہے اور بطور ھزء و تحکم اِسے یوں بیان کیا گیا ہے گویا واقعہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ کفار یہ بھی کہتے ہیں کہ جو شخص تیری طرف دَوڑتا ہوا آتا ہے اور جو خدا سے ڈرتا ہے اس کی طرف سے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) بے اعتنائی کرتے ہیں چونکہ یہ ھزء اور تحکم کے طور پر عبارت ہے اس لئے اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤى کے نئے کئے ہوئے معنے کی تائید كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ سے

میرے اِن معنوں کا قطعی اور یقینی ثبوت اِس بات سے ملتا ہے کہ اِن آیات کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ اور كَلَّا کے معنے ہوتے ہیں جو پہلی بات کہی گئی ہے وہ غلط ہے اب یہ صاف بات ہے کہ پہلی بات جو کہی گئی ہے وہ وہی اعتراض ہیں جو دشمنوں کی طرف سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے گئے ہیں یعنی آپؐ نے ایک اندھے کے معاملہ میں بداخلاقی سے کام لیا اور بعض دولت مندوں کی طرف زیادہ توجہ کی۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ خدا تعالیٰ جس بات کی تردید کرے ہم اس کی تصدیق کریں۔ كَلَّا کے لفظ نے بتادیا ہے کہ یہ سب اعتراضات غلط ہیں۔ پس جتنی باتیں پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض والی بیان ہوئی ہیں وہ بطور ھزء اور تہکم کے بیان کی گئی ہیں اور ظاہر الفاظ تو تصدیق کے ہیں لیکن اصل مراد انکار ہے جیسا کہ اس طریقِ کلام کا قاعدہ ہے۔

كَلَّا کے معنے یہی ہوا کرتے ہیں کہ اس سے پہلے جو بات مذکور ہو اس کا اِس کلام سے سختی سے ردّ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کلیات ابی البقاء میں لکھا ہے قَالَ عَمْرُو بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ اِذَا سَمِعْتَ اللّٰهَ یَقُوْلُ كَلَّا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ كَذَبْتَ یعنی عمرو بن عبداللہ فرماتے ہیں جب تم خدا کے کلام میں كَلَّا کا لفظ پڑھو تو سمجھ لو کہ اُس کے معنے یہ ہیں کہ پہلی باتوں کا کہنے والا جھوٹا ہے۔ پس كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ کے معنے یہ ہوئے کہ پہلے جو اعتراضات بیان کئے گئے ہیں وہ جھوٹے ہیں اور ان کے جھوٹے ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن کریم ایک نصیحت کی کتاب ہے کافر کو سُنانا بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا فرض ہے اور مومن کو سُنانا بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ہے۔ پس اگر آپ قرآن شریف کفار کو سُنا رہے تھے تو ایک مومن کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ درمیان میں بولتا۔ اور اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو بالکل ٹھیک کیا۔

کَلَّا کا استعمال کلام عرب میں مغنی اللبیب میں کَلَّا کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا ہے عِنْدَ سِيْبَوَيْهِ وَ الْخَلِيْلِ وَ الْمُبَرِّدِ وَ الزَّجَاجِ وَ اَكْثَرِ الْبَصْرِيِّيْنَ حَرْفٌ مَعْنَاهُ الرَّدْعُ وَالزَّجْرُ لَا مَعْنٰى لَهَا عِنْدَهُمْ اِلَّا ذَالِكَ حَتّٰى اِنَّهُمْ يُجِيْزُوْنَ اَبَدًا اَلْوَقْفُ عَلَيْهَا وَالْاِبْتِدَاءُ بِمَا بَعْدَهَا وَحَتّٰى قَالَ جَمَاعَةٌ مِّنْهُمْ مَتٰى سَمِعْتَ كَلَّا فِيْ سُوْرَةٍ فَاحْكُمْ بِاَنَّهَا مَكِّيَّةٌ لِاَنَّ فِيْهَا مَعْنَى التَّهْدِيْدِ وَالْوَعِيْدِ وَاَكْثَرُ مَا نَزَلَ ذَالِكَ بِمَكَّةَ لِاَنَّ اَكْثَرَ الْعَتُوِّ كَانَ بِهَا۔ یعنی سیبویہ اور خلیل اور مبرّد اور زجاج اور اکثر بصری کہتے ہیں کہ اس کے معنے زجر اور تردید کے ہوتے ہیں۔ اُن لوگوں کے نزدیک اس کے سوا کَلَّا کے اور کوئی معنے ہی نہیں ہیں یہاں تک کہ وہ لوگ اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ ہمیشہ کَلَّا کے لفظ پر وقف کر لینا اور مابعد کے فقرہ کو ایک نیا جملہ فرض کر لینا چاہیے۔ اور ان میں سے ایک جماعت تو یہاں تک کہتی ہے کہ جب کسی سورۃ میں کَلَّا کا لفظ آئے تو سمجھ لو کہ وہ مکّی ہے کیونکہ اس لفظ کے معنوں میں ڈرانے اور دھمکی دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے اور زیادہ تر یہ لفظ مکّی سورتوں میں اترا ہے کیونکہ اکثر شرارتیں اور زیادتیاں مکّہ میں ہی ہوا کرتی تھیں اس پر صاحبِ مغنی نے بے شک اعتراض کیا ہے کہ قرآن شریف میں جو یہ آتا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ۔ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ۔ فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ۔ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ (الانفطار: ۷ تا ۱۰) اس میں کوئی تہدید یا وعید نظر نہیں آتا مگر یہ اعتراض بالبداہت باطل ہے اس لئے کہ قرآن کریم نے خود ہی بتا دیا ہے کہ کَلَّا کے لفظ سے پہلے اعتراض ہی مراد تھا کیونکہ فرماتا ہے بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ تم جزاء سزا کو جھٹلاتے ہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیات میں ان لوگوں کا ردّ تھا جو جزاء سزاء کے منکر ہیں پس جب ایسے لوگوں کا ذکر تھا جو جزاء سزاء کے منکر تھے اور انہی کی تردید کی جا رہی تھی۔ تو کَلَّا میں وعید اور تہدید مراد نہیں ہوگی تو کیا پیار مراد ہوگا؟

غرض بڑے بڑے نحویوں اور ادیبوں کی نگاہ میں کَلَّا کا لفظ منکرین اور مخالفین کے لئے استعمال ہوتا ہے اور تہدید اور وعید اس میں شامل ہوتی ہے۔ پس كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ سے معلوم ہوا کہ پہلے اقوال خدا تعالیٰ کے مصدقہ نہیں بلکہ منکروں اور دشمنانِ اسلام کے ہیں جن کو ردّ کیا گیا ہے تبھی تو ہر اعتراض کے بعد اللہ تعالیٰ اُن کی تردید کرتا ہے اگر واقعہ اسی طرح ہوتا اور یہ الزام وہ ہوتے جن کی خدا تعالیٰ تصدیق کرتا ہے تو پھر ان آیات کے بعد کَلَّا کے استعمال

کے کیا معنے تھے؟ پھر تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ یہ الزام بالکل سچے ہیں۔ پس پہلے الزام بیان کرنا اور پھر کَلَّا کہنا بتا تا ہے کہ یہ الزام دشمنوں کی طرف سے غلط طور پر لگائے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں محض ھزء اور تہکم کے رنگ میں اُن کا ذکر کیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہمارے رسول کو یوں کہا جاتا ہے۔ مگر یہ بالکل جھوٹ ہے وہ ایسا نہیں بلکہ ان تمام الزامات سے پاک ہے۔

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ﴿۱۴﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ۙ﴿۱۵﴾ بِاَيْدِيْ

(وہ قرآن ایسے) صحیفوں میں ہے (جو) عزت والے ہیں بلند شان (اور) پاک ہیں (لکھنے والوں اور دُور دُور)

سَفَرَةٍ ۙ﴿۱۶﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ؕ﴿۱۷﴾

سفر کرنے والوں کے ہاتھوں میں (ہیں) (ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں جو) معزز ہیں اور اعلیٰ درجہ کے نیکو کار ہیں۔

حَل لُغَات۔**مُكَرَّمَةٌ** مُكَرَّمَةٌ كَرَّمَ سے ہے اور كَرَّمَ کے معنے ہوتے ہیں عَظَّمَ وَنَزَّهَهٗ اس کی بڑائی بیان کی اور اس کو عیوب سے منزّہ قرار دیا (اقرب) اور مُكَرَّمَةٌ کے معنے ہوئے مُعَظَّمَةٌ وَمُنَزَّهَةٌ عَنْ كُلِّ خَطَاءٍ وَنَقْصٍ یعنی وہ جن کی عظمت بیان کی جاتی ہے اور جن کو تمام نقائص خرابیوں اور عیوب سے مبرّا قرار دیا جاتا ہے۔

مَرْفُوْعَةٌ مَرْفُوْعَةٌ رَفَعَ سے ہے اور رَفَعَهٗ (رَفْعًا) کے معنے ہوتے ہیں ضِدُّ وَضَعَهٗ اس کو اوپر کیا۔ بلند کیا۔ اور جب رَفَعَ اِلَى السُّلْطَانِ (رُفْعَانًا) کہیں تو معنے ہوں گے قَرَّبَهٗ کہ اس کو بادشاہ کا مقرب بنا دیا (اقرب)

مُطَهَّرَةٌ مُطَهَّرَةٌ طَهَرَ سے ہے اور طَهَّرَهٗ کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَهٗ طَاهِرًا۔ اُس کو پاک قرار دیا (اقرب)

سَفَرَةٌ سَفَرَةٌ اَلسَّافِرُ کی جمع ہے اور اس کے دو معنے ہوتے ہیں۔ ایک تو مسافر کے۔ ان معنوں میں اس کا کوئی فعل نہیں آتا۔ دوسرے معنی اس کے کاتب کے ہوتے ہیں (اقرب)

كِرَامٌ كِرَامٌ كَرِيْمٌ کی جمع ہے اور اس کے معنے معزز اور بزرگ لوگوں کے ہیں (اقرب) کبھی کبھی لفظ كَرِيْم ایسے سخی آدمی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو لوگوں کو بہت ہی نفع پہنچائے اور كَرِيْمٌ اُس چیز کو بھی کہتے ہیں جو اپنی جنس میں سے بہترین ہو چنانچہ عرب کہتے ہیں اَلْكَرِيْمُ مِنْ كُلِّ قَوْمٍ اور ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ مَا يَجْمَعُ

فَضَائِلَهٗ کہ فلاں شخص ساری قوم میں سے کریم ہے یعنی ساری قوم کی خوبیاں اس میں پائی جاتی ہیں۔ اقرب کے مؤلف لکھتے ہیں ’’اَلْکَرِیْمُ مَنْ یُّوْصِلُ النَّفْعَ بِلَا عِوَضٍ فَالْکَرْم هُوَ اِفَادَةُ مَا یَنْبَغِیْ لَا لِعِوَضٍ‘‘ یعنی کریم ایسے شخص کو کہتے ہیں جو لوگوں کو نفع پہنچائے اور کسی سے معاوضہ کی خواہش نہ کرے (اقرب) پس کِرَامٌ کے معنے ہوں گے (۱) سخی (۲) بزرگ (۳) قوم میں سے بہترین (۴) ایسے لوگ جنہیں لوگوں کو بلا معاوضہ فائدہ پہنچانے کا جنون ہو۔

بَرَرَةٌ بَرَرَةٌ جمع ہے اَلْبَرُّ وَ الْبَارُّ کی جو کہ بَرَّ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور بَرَّ وَالِدَهٗ کے معنے ہیں اَحْسَنَ الطَّاعَةَ اِلَیْهِ وَرَفَقَ بِهٖ وَتَحَرّٰی مَحَابَّهٗ وَتَوَقّٰی مَکَارِهَهٗ (اقرب) کہ اُس نے اپنے والد کی پوری اطاعت کی اور اُس کے ساتھ نرمی سے پیش آیا اور اس کی خوشنودی کے ذرائع کو تلاش کیا اور اُن پر عمل کیا اور ہر ایک اُس بات سے بچا جو اُس کے والد کو ناراض کرے۔

تفسیر۔ فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ میں سورِ قرآن کی طرف اشارہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ قرآن ایسے صحیفوں میں ہے جو مُکَرَّمَةٌ ہیں مَرْفُوْعَه ہیں اور مَطَهَّرَه ہیں۔ اس جگہ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے صُحُف کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو جمع پر دلالت کرتا ہے صَحِیْفَه کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اِس میں درحقیقت قرآن کریم کی سورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے ماتحت الگ الگ ٹکڑوں میں نازل ہوئی ہیں بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ان مختلف ٹکڑوں کو آپس میں یوں ہی جوڑ دیا گیا ہے کسی خاص حکمت کو مدنظر نہیں رکھا گیا مگر قرآن نہ صرف اُن کے علیحدہ علیحدہ نزول کو بلکہ اُن کے علیحدہ علیحدہ وجود کو تسلیم کرتا ہے اور ہر سورۃ کو ایک صحیفہ قرار دیتا ہے۔ گویا صُحُف کہہ کر اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کی ہر سورۃ اپنی ذات میں ایک علیحدہ اور مستقل مضمون رکھتی ہے ورنہ وہ صحیفہ نہیں کہلا سکتی تھی۔

صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ کے الفاظ میں اس طرف اشارہ کہ قرآن مجید میں سب انبیاء کی تعلیم جمع کر دی گئی ہے دوسرے صُحُف کہہ کر اُس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جس کا صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی (الاعلیٰ:۲۰) کے الفاظ میں ذکر آتا ہے یعنی صُحُف کہہ کر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ صحف سابقہ کی تمام اعلیٰ درجہ کی اخلاقی اور روحانی تعلیموں کو جو انسانی فطرت کے مناسب حال تھیں اس قرآن میں جمع کر دیا گیا ہے گویا کتاب تو ایک ہی ہے مگر اس میں تمام انبیاء کے صحیفے جمع ہیں اسی لئے اُس کے لئے جمع کا لفظ لایا گیا اور صحیفہ کی بجائے صحف کہا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کو بھی صحف اِسی لئے کہا گیا ہے کہ اُس میں آپؑ سے پہلے تمام انبیاءؑ

کی تعلیمیں جمع تھیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفہ کو بھی اسی لئے صحف کہا گیا کہ اُس میں نوحؑ اور بعض دوسرے انبیاءؑ کے صحیفے جمع تھے۔ اور پھر قرآن کو بھی صحف کہا گیا کیونکہ قرآن وہ کتاب ہے جس نے آدمؑ سے لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک آنے والے تمام انبیاء کے صحف کو اپنے اندر جمع کر لیا اور کوئی تعلیم ایسی نہیں رہی جس کی بنی نوع انسان کو ضرورت ہو اور اس کا قرآن کریم میں ذکر نہ آتا ہو۔ گویا جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء کہا گیا اِن معنوں میں کہ آپؐ کے وجود میں تمام انبیاءؑ سابقین جمع ہو گئے تھے اسی طرح آپؐ کی کتاب کو صحف کہا گیا کیونکہ اس میں تمام انبیاء سابقین کے صحیفوں کو جمع کر دیا گیا تھا در حقیقت کوئی نبی دُنیا میں ایسا نہیں آیا جو اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی صحیفہ نہ لایا ہو (مگر اس کے معنے یہ نہیں کہ وہ شریعت جدیدہ لایا یا احکام جدیدہ لایا۔ صحیفہ سے مراد ایک پیغامِ حقیقت ہے جو اُس وقت کے مناسب حال ہو) اِسی وجہ سے قرآن کریم میں صُحُفِ ابراہیم کا ذکر ہے۔ حالانکہ وہ حامل شریعتِ جدیدہ نہ تھے۔ حضرت نوحؑ کے تابع تھے جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے اِنَّ مِنۡ شِیۡعَتِہٖ لَاِبۡرٰہِیۡمَ (الصافات: ۸۴) آدمؑ مبعوث ہوا تو وہ اپنے ساتھ پہلا صحیفہ لایا۔ اس کے بعد اگر نوحؑ دوسرا نبی ہوا ہے تو نوحؑ کا صحیفہ صحیفتین کہلائے گا کیونکہ اس میں آدمؑ کا بھی صحیفہ تھا اور نوحؑ کا بھی صحیفہ تھا۔ پھر جوں جوں انبیاءؑ آتے گئے وہ اپنے سے پہلے آنے والے انبیاء کی تعلیموں کے بھی حامل رہے یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور آپؐ کو جو کتاب دی گئی اُس میں تمام پہلے انبیاء کے صحیفوں کو شامل کر دیا گیا۔ اس لئے وہ کتاب کوئی ایک صحیفہ نہیں بلکہ کئی صحف کا مجموعہ ہے اِسی لئے قرآن نے اس کے لئے فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتۡ (المرسلات: ۱۲) کہہ کر مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کی طرف اشارہ کر دیا حالانکہ آنے والا صرف ایک رسول تھا مگر چونکہ اس کی رسالت میں گزشتہ تمام انبیاء کی رسالت بھی شامل ہو جاتی تھی اور وہ ہر گزشتہ نبی کا بروز ہونے والا تھا اُسے رسول کی بجائے رُسل کہا گیا۔ یہی وہ بات ہے جس کا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہام میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جَرِیُّ اللّٰہِ فِیۡ حُلَلِ الۡاَنۡبِیَآءِ (براہین احمدیہ چہار حصص روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۰۱ حاشیہ نمبر ۳) اللہ کا جری جو تمام انبیاء کا لباس پہن کر اس دُنیا میں آیا ہے۔ اسی طرح قرآن ایک صحیفہ نہیں بلکہ وہ مجموعہ ہے اُن تمام تعلیموں کا جو گزشتہ انبیاء کو دی گئیں اور پھر وہ مجموعہ ہے اُس زائد تعلیم کا بھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ۔ مَّرۡفُوۡعَۃٍ مُّطَہَّرَۃٍۭ یہ قرآن ایسے صحف میں ہے جو مکرّمہ ہیں۔ مرفوعہ ہیں اور مطّہرہ ہیں۔

مُّکَرَّمَۃٍ۔ مَّرۡفُوۡعَۃٍ مُّطَہَّرَۃٍ کے مقابل پر سَفَرَۃٍ، کِرَامٍۭ، بَرَرَۃٍ لا کر ایک لطیف مضمون کی

طرف اشارہ یہاں ایک لطیف قرآنی ترتیب کا منظر پیش کیا گیا ہے کہ ایک طرف تو قرآن کی یہ تین صفات بیان کی گئی ہیں (۱) مُکَرَّمَۃ (۲) مَرْفُوْعَۃ (۳) مَطَهَّرَۃ اور دوسری طرف وہ لوگ جنہوں نے حاملینِ قرآن بننا تھا اُن کی بھی تین صفات بیان کی گئی ہیں۔(۱) سَفَرَۃ (۲) کِرَامٍ (۳) بَرَرَۃ۔

قرآن کریم کی پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مُکَرَّمَۃ ہے مُکَرَّمَۃٌ کے معنے عربی زبان میں مُعَظَّمَۃٌ وَمُنَزَّھَۃٌ عَنْ کُلِّ خَطَاءٍ وَنَقْصٍ کے ہوتے ہیں یعنی ہر قسم کی خرابی اور نقص سے پاک۔ گویا پہلی بات قرآن کریم کے متعلق یہ بتائی کہ وہ بزرگ کتاب ہے اور دُنیا میں اس کی عزت کی جائے گی۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ دُنیا میں جو بھی الہامی کتاب موجود ہے اس کی عزت اس کتاب کو ماننے والے لوگوں کے دلوں میں پائی جاتی ہے لیکن اِس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بعض کتابوں کو زیادہ عزت حاصل ہوتی ہے اور بعض کو کم عزت حاصل ہوتی ہے اور جب ہر الہامی کتاب کی اس کے ماننے والے عزت کرتے ہیں تو قرآن کریم کو خاص طور پر مُکَرَّمَۃ کہنا اِس امر کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ یہ وہ کتاب ہے جس کی اور تمام الہامی کتابوں سے زیادہ عزت کی جائے گی۔ کیونکہ وہ کتاب جس کی پہلے ہی عزت کی جاتی ہو جب اُس کے متعلق کہا جائے کہ وہ مُکَرَّمَۃ ہے تو لازمًا اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس کی عزت نسبتی طور پر دوسری کُتب سے بہت زیادہ کی جائے گی۔ چنانچہ دیکھ لو دُنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس کی عزت قرآن کریم سے بڑھ کر کی جاتی ہو۔ اِس کتاب کو لوگ حفظ کرتے ہیں۔ یہ کتاب نمازوں میں پڑھی جاتی ہے۔ اور پھر اس کتاب پر عمل کرنے والی قوم دُنیا میں موجود ہے اور کوئی کتاب ایسی نہیں جس پر عمل کرنے والی قوم دُنیا میں موجود ہو۔ ویدؔ پر عمل کرنے والے کہیں نظر نہیں آتے۔ تورات پر عمل کرنے والے بہت شاذ و نادر دکھائی دیتے ہیں اور جو لوگ عمل کرتے ہیں ان کا عمل اِسی قسم کا ہوتا ہے جسے پنجابی میں ’’اَدھ پچدّھ‘‘ کہتے ہیں یعنی کسی بات پر عمل کیا اور کسی پر نہ کیا۔ انجیل تو عملی لحاظ سے بالکل ختم ہے ابھی گزشتہ دنوں انگلستان میں پادریوں نے انجیل کی تعلیم کے خلاف یہ فتویٰ دے دیا تھا کہ عورتیں ننگے سر گرجا میں جاسکتی ہیں۔ ہمارے مبلغ مولوی جلال الدّین صاحب شمسؔ نے اُن کو پکڑا کہ تم نے یہ کیا فتویٰ دے دیا تمہاری انجیلی تعلیم تو اس کے مخالف ہے۔ مگر انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے کہہ دیا شریعت لعنت ہے (گلتیوں باب ۳ آیت ۱۳) جب شریعت اُن کے نزدیک لعنت بن گئی تو اُس پر عمل کرنے کی تحریک اُن کے دلوں میں کس طرح پیدا ہوسکتی ہے۔ صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس پر اس تنزّل کے زمانہ میں بھی عمل کیا جاتا ہے۔ ہم خواہ غیر احمدیوں کو کچھ کہیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لاکھوں کروڑوں مسلمان آج بھی ایسے نظر آتے ہیں جن کے

دلوں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ وہ قرآن پر عمل کریں اور خواہ کس قدر کوئی بے عمل ہو اُس کے دل کے اندرونی گوشوں میں یہ خواہش موجود ہوتی ہے کہ مَیں قرآن پر عمل کروں اور اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کروں۔ یہ تو اِس زمانۂ تنزّل کا حال ہے۔ اپنے دَور میں تو قرآن پر وہ عمل ہوا ہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ پر قرآن نے حکومت کی اور ایسی شاندار حکومت کی جس کی مثال دُنیا کی تاریخ میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔

مُّكَرَّمَةٍ کے لفظ میں قرآن مجید کے محفوظ رہنے کی پیشگوئی دوسرے معنے مُكَرَّمَة کے مُنَزَّهَة عَنْ كُلِّ خَطَاءٍ وَنَقْصٍ کے ہوتے ہیں کہ وہ چیز ہر قسم کی خرابی اور نقص سے پاک ہو۔ یہ خوبی بھی قرآن میں پائی جاتی ہے کہ اِس میں کوئی غیر بات داخل نہیں۔ اَور تو اَور قرآن کریم میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول کو بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی حدیث ایسی ہو جو صحاح ستّہ میں سے ہر حدیث کی کتاب میں آتی ہو اور ہر محدّث اس حدیث کی صحت پر متفق ہو تو پھر بھی قرآن میں اُس حدیث کو درج نہیں کیا جا سکتا پس خدا نے قرآن کو ایسا بنایا ہے کہ وہ تمام قسم کی غیر باتوں سے پاک ہے یہاں تک کہ ہم دیکھتے ہیں دشمن سے دشمن کو بھی یہ تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا کہ قرآن ہر قسم کی انسانی دست بُرد سے پاک ہے۔ میور جیسا شدید دشمن اسلام بھی جو قرآن پر جگہ جگہ اعتراض کرتا ہے جب اس مقام پر پہنچتا ہے تو اُسے سوائے یہ کہنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ قرآن جس شکل میں آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے تھا اسی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ وہ اپنی کتاب میں ایک جگہ اس امر پر بحث کرتا ہے اور کہتا ہے فلاں پادری نے یہ کہا ہے اور فلاں پادری نے یہ لکھا ہے مگر وہ ان سب کے دلائل کو ردّ کرتا ہے اور کہتا ہے سچی بات یہ ہے کہ قرآن کریم سے متعلق ہم یقینی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس شکل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرآن دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اُسی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ نولڈکے NOLDEKE مشہور جرمن مستشرق بھی قرآن کی اس خوبی کا اعتراف کرتا ہے اور باوجود دشمن ہونے کے اُس نے بھی تسلیم کیا ہے کہ قرآن پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ وہ انسانی دستبرد کا شکار ہو گیا۔ نولڈکے NOLDEKE اسلام کا دشمن ہے مگر تمام مستشرقینِ یورپ میں سب سے زیادہ تحقیق اُس نے کی ہے اور میں نے دیکھا ہے بعض دفعہ صحیح حقیقت پر اُس کی غضب کی نظر پڑتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اُس نے بڑے سچے طور پر قرآن پر غور کیا تھا۔ وہ بھی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ میں یہ قطعاً مان نہیں سکتا کہ قرآن میں کوئی اور بات داخل کر دی گئی ہو وہ اسی طرح دوسرے لوگوں کے دخل سے پاک ہے جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پاک تھا وہ کہتا ہے تم بے شک یہ کہہ لو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرآن بنایا مگر تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس قرآن میں کوئی تبدیلی ہو گئی۔ جس طرح وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے زمانہ میں تھا اُسی طرح وہ اس زمانہ میں بھی ہے (The Encyclopedia Britannica under the word Koran)۔پس یہ قرآن مُکَرَّمَہ ہے یعنی ہر قسم کی خطاء لفظی ومعنوی سے پاک ہے۔اور دنیا کی کوئی کتاب اس خوبی میں قرآن کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

سَفَرَةٍ کے لفظ میں اس طرف اشارہ کہ قرآن یکدم دنیا میں پھیل جائے گا اس کے مقابلہ میں حاملین قرآن کی جو صفات بیان کی گئی ہیں اُن میں سے پہلی صفت سَفَرَة ہے گویا مُکَرَّمَة کے مقابل پر اللہ تعالیٰ نے سَفَرَة کو رکھا ہے اور بتایا ہے کہ اس کی بزرگی کا ذریعہ اللہ تعالیٰ سَفَرَة کو بنائے گا۔سَفَرَة کے معنے یا مسافر کے ہوتے ہیں یا پھر کاتب کے ہوتے ہیں۔پہلے معنوں کے لحاظ سے اس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن دنیا میں یکدم پھیل جائے گا کیونکہ وہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو مسافر ہوں گے۔مطلب یہ کہ مسلمان اس کو لے کر نکل جائیں گے اور دنیا کے کونہ کونہ میں اس کی تعلیم پہنچا دیں گے۔چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معًا بعد کچھ صحابہ ایران میں چلے گئے۔کچھ افغانستان میں چلے گئے کچھ چین کی طرف نکل گئے۔کچھ جزائر کی طرف چلے گئے اور اس طرح ایک طرف چین کے انتہائی کناروں تک اور دوسری طرف الجزائر تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی زندگی میں ہی قرآن پھیل گیا۔گویا جتنی معلومہ دنیا تھی اُس میں قرآن کی تعلیم صحابہؓ کے ہاتھ سے پھیل گئی بلکہ بعض ممالک کے لوگ اب تک اس بات کے مدعی ہیں کہ صحابہؓ کی لائی ہوئی قرآن کی کاپیاں اُن کے پاس موجود ہیں۔تو فرماتا ہے بِاَيْدِيْ سَفَرَة یہ قرآن اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو بڑے سفر کرنے والے ہوں گے اور اس طرح قرآن کی اشاعت کا کام سرانجام دیں گے۔

سَفَرَة کے لفظ میں قرآن کے لکھے جانے کی طرف اشارہ سَفَرَة کے ایک معنے چونکہ کاتب کے بھی ہیں اس لئے بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ کہہ کر قرآن کریم کے لکھنے کی طرف اشارہ کیا گیا اور بتایا گیا کہ یہ قرآن اُن لوگوں کے ہاتھ میں جائے گا جو کاتب ہوں گے اور یہ قرآن صرف زبانوں پر ہی نہیں رہے گا بلکہ فوراً ضبط تحریر میں آجائے گا۔پس اس آیت سے صحابہؓ کے زمانہ میں ہی قرآن کریم کا لکھا جانا ثابت ہوتا ہے۔دشمن اعتراض کرتا ہے کہ قرآن کریم بعد میں لکھا گیا حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ جس قوم کے ہاتھ میں ہم یہ قرآن دیں گے وہ اسے فوراً لکھ لے گی صرف زبانوں پر اسے نہیں رہنے دے گی۔عیسائی قرآن کریم کے متعلق ہمیشہ یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ قرآن کو بہت بعد میں لکھا گیا حالانکہ اُن کی اپنی کتاب انجیل کے متعلق تاریخ سے یہ امر ثابت ہے کہ وہ ایک سو اسی سال کے بعد لکھی گئی۔اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف جن باتوں کو منسوب کیا جاتا ہے وہ بھی بہت

بعد میں لکھی گئیں مگر قرآن کریم وہ کتاب ہے کہ جہاں اسے زبانی یاد کیا جاتا تھا وہاں یہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں بھی تھا جو سَفَرَة تھے اسے فوراً لکھ لیتے تھے۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں ہی سارا قرآن لکھا گیا تھا۔

اس میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن کی تمام دنیا میں عزت کی جائے گی کیونکہ وہ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ہوگا۔ جو تعلیم کسی ایک ملک میں محدود ہوگی لازماً اُس کا اکرام اَور رنگ کا ہوگا۔ اور جو سارے ملکوں میں ہوگی اس کا اکرام اور رنگ کا ہوگا۔ پس چونکہ قرآن سفر کرنے والے لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا اس قرآن کی تکریم بھی ساری دنیا میں ہوگی۔ کسی ایک ملک میں نہیں ہوگی۔ پھر سَفَرَة کے معنے خالی لکھنے کے نہیں ہوتے بلکہ اس کے مادہ میں انکشاف کے معنے بھی پائے جاتے ہیں پس بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ کہہ کر اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ اُسے ایسے لکھنے والے لکھیں گے جو اس کے مطالب کو واضح کریں گے اور اس کے اخلاق کو کھولیں گے گویا بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ کے معنے یہ ہوئے کہ قرآن اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو اس کی تفسیریں کرنے والے ہوں گے۔ اس کے حقائق کو واضح کرنے والے ہوں گے اور اس کی پوشیدہ اور متعلق باتوں پر سے پردہ اٹھانے والے ہوں گے اور اس طرح قرآن نہ صرف خطاء لفظی سے پاک ہوگا بلکہ وہ خطاء معنوی سے بھی پاک ہوگا۔

سَفَرَة چونکہ مُکَرَّمَة کے مقابل میں ہے اس لئے اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم کو ماننے والے اس کی بڑی عزّت کریں گے اور نہ صرف خود عزّت کریں گے بلکہ ساری دنیا میں پھیل کر ساری دنیا سے اس کی عزّت کرائیں گے۔ تیسری طرف اس قرآن کو محفوظ رکھیں گے اور اس طرح قرآن کی عزّت میں اور بھی اضافہ ہوگا۔ جیسے میں نے میور (Muir) اور نولڈکے (Noldeke) کے متعلق بتایا ہے کہ باوجود شدید دشمن اسلام ہونے کے وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ قرآن پوری طرح محفوظ ہے۔ پس قرآن کے ضبط تحریر میں آجانے کی وجہ سے اس کے اعزاز میں اَور بھی اضافہ ہوگیا یہاں تک کہ دشمن بھی اس اعزاز کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکے۔

پھر قرآنی معارف کی تشریح کے لحاظ سے بھی اس کی تکریم میں غیر معمولی اضافہ ہوا کیونکہ قرآن کی نہ صرف ظاہری حیثیت قائم رہی بلکہ اس کی معنوی حیثیت بھی قائم رہی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں قرآن دیا جو اس کے اغلاق کو کھولنے والے اور اس کے مطالب کی وضاحت کرنے والے تھے۔ اس میں اس امر کی طرف بھی اشارہ تھا کہ قرآن کی بولی دنیا میں بولی جائے گی یہ زبان زندہ رہے گی اور اس کے مضامین کو حل کرنے کے لئے لوگوں کو کسی قسم کی دقّت پیش نہیں آئے گی۔

مرفوعۃ کے لفظ کا ظاہری معنے کے لحاظ سے پورا ہونا دوسری صفت اللہ تعالیٰ نے مَرْفُوْعَۃٌ بیان فرمائی ہے۔ رَفَعَ کے معنے ہوتے ہیں اونچا کیا۔ یعنی ذلّت نہ کی بلکہ اعزاز کیا۔ اس کے مقابلہ میں صحابہؓ کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ کِرَامٌ ہوں گے اور کِرَامٌ کے معنے بزرگ کے ہوتے ہیں اس جگہ قرآن کے متعلق مَرْفُوْعَۃٌ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں مَرْفُوْعَۃٌ کے معنے ذی شان ہونے کے ہیں۔ یہ بات ظاہری لحاظ سے بھی قرآن کریم کے متعلق پائی جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو قرآن کو اُمت محمدیہ کبھی نیچا نہیں رکھتی ہمیشہ اُسے اُونچی جگہ پر رکھا جاتا ہے بلکہ اگر کوئی شخص قرآن کریم کو نیچے رکھ دے تو سب مسلمان اس سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کہ تم نے قرآن کریم کی ہتک کی۔ پس ظاہر میں بھی یہ معنے قرآن کریم پر چسپاں ہو جاتے ہیں کیونکہ مسلمان جس طرح قرآن کو اُنچا رکھتے ہیں دُنیا کی کوئی عالمگیر قوم اپنی الہامی کتاب کی اس طرح عزت نہیں کرتی۔ درحقیقت اور کوئی عالمگیر قوم اپنی کتاب کو اونچا رکھنے کی عادی ہی نہیں۔ نہ عیسائی انجیل کو اونچا رکھتے ہیں نہ یہودی تورات کو اونچا رکھتے ہیں۔ یہ شرف صرف قرآن کریم کو ہی حاصل ہے کہ مسلمان اس کو اونچی جگہ پر رکھتے ہیں۔ اس کو نیچے رکھنا وہ برداشت ہی نہیں کر سکتے۔

مَیں نے بتایا تھا کہ قرآن کریم کی تین صفات جو اِس جگہ بیان کی گئی ہیں وہ حاملینِ قرآن کی تین صفات کے مقابل میں رکھی گئی ہیں اور اس طرح بتایا گیا ہے کہ ان میں سے ایک چیز دوسری چیز کا سبب ہے چنانچہ دیکھ لو قرآن مُکَرَّمَۃ ہو گیا اس لئے کہ وہ سَفَرَۃ کے ہاتھ میں تھا جو اُسے لے کر دُنیا کے مختلف مُلکوں میں پھیل گئے اور سَفَرَۃ مُکَرَّم ہو گئے اس لئے کہ اُن کے ہاتھوں میں وہ کتاب تھی جو بڑی عزت والی تھی۔ گویا یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے لازم ملزوم تھیں۔ یہ جوش جو کسی شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ مَیں اس چیز کو اپنے ہاتھ میں لیکر باہر نکل جاؤں اسی لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کو مُکَرَّمَۃ سمجھتا ہے اور اُسے یقین ہوتا ہے کہ اس چیز کو پھیلانا میری عزت کا موجب ہے مگر جب وُہ اسے پھیلا دیتا ہے تو اس کا طبعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خود بھی مکرّم بن جاتا ہے کیونکہ وہ ایسی چیز کو پھیلاتا ہے جو تکریم رکھنے والی ہوتی ہے۔ گویا قرآن کا مُکَرَّم ہونا سَفَرَۃ کی وجہ سے تھا اور سَفَرَۃ کا مُکَرَّم ہونا قرآن کی وجہ سے تھا۔ قرآن مسلمانوں کی عزت کا باعث ہوا۔ اور مسلمان قرآن کی عزت کو بڑھانے کا باعث ہوئے جیسے ایک مشینری چکّر کھاتی چلی جاتی ہے اُسی طرح ایک طرف قرآن نے صحابہؓ کو اونچا کیا اور دوسری طرف صحابہؓ نے قرآن کو اونچا کیا۔ صحابہؓ قرآن کی عزت بڑھانے کا موجب ہوتے تھے اور قرآن صحابہؓ کی عزت بڑھانے کا موجب ہوتا تھا۔

دوسری صفت قرآن کی مَرْفُوْعَۃ بتائی کہ وہ بڑی ذی شان کتاب ہے۔اب یہ لازمی بات ہے کہ جس شخص کے پاس کوئی ذی شان چیز ہوگی وہ ضرور کِرَامٌ بن جائے گا۔مگر دوسری طرف جس چیز کی کِرَامٌ عزت کریں وہ بھی ذی شان اور معزز ہوجاتی ہے چنانچہ دیکھ لو جب کوئی معزز آدمی کسی کی عزت کرے گا لوگ کہیں گے کہ معلوم ہوتا ہے یہ شخص بڑی عزت والا ہے کیونکہ فلاں معزز آدمی نے اس کی عزت کی تھی۔ پس وہ اس کی عزت کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اور جب وہ معزز بن کر پھر دوسرے کی عزت کرے گا تو اس کی شہرت میں بھی اضافہ ہوگا کہ اسے فلاں معزز آدمی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ گویا یہ ایک سِلسلہ ہے جو مشینری کی طرح چکّر کھاتا چلا جاتا ہے۔ جو لوگ خود کسی چیز کے اوصاف سے ذاتی طور پر واقف نہ ہوں وہ اگر اُس چیز سے متاثر ہوتے ہیں تو اُسی وقت جب وہ دیکھیں کہ کوئی بڑا آدمی جس کا اُس کے دل میں احترام موجود ہے اُس چیز کی تعریف کر رہا ہے یہ دیکھ کر وہ خود بھی اُس کے مدّاح بن جاتے ہیں۔ اب جو قرآن کریم پر ایمان رکھتے تھے وہ تو اُس کی عزت کرتے ہی تھے مگر ایک عیسائی کے نزدیک قرآن کریم کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ روم کے بادشاہ کو بھی اس کی عظمت کا احساس ہے اور وہ کہتا ہے یہ بہت بڑی کتاب ہے جسے عمرؓ جیسا عظیم الشان انسان مانتا ہے حالانکہ عمرؓ کیوں بڑے بنے اسی لئے کہ انہوں نے قرآن پر عمل کیا۔ گویا ایک طرف روما کا بادشاہ یہ کہے گا کہ قرآن بڑی کتاب ہے جس کو عمرؓ جیسا انسان مانتا ہے اور دوسری طرف عمرؓ کی حقیقت کو جاننے والا یہ کہے گا کہ قرآن بڑی کتاب ہے کیونکہ اس کو ماننے والا عمرؓ ادنیٰ حالت سے ترقی کر کے اِس قدر بڑا بن گیا۔ غرض جب سچّی باتیں ایک دوسرے کے مقابل میں آجاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اُبھارتی چلی جاتی ہیں۔ اِسی لئے فرمایا کہ قرآن مَرْفُوْعَۃ ہے یعنی بڑی ذی شان کتاب ہے اور اس کے ذی شان ہونے کا ثبوت یہ ہوگا کہ اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے عزت پاتے چلے جائیں گے اور جب وہ عزت پا جائیں گے تو پھر قرآن کو ایک نئی عزت حاصل ہوگی کیونکہ لوگ کہیں گے کہ اِس کتاب کو تو بڑے بڑے معزز آدمی مانتے ہیں پھر یہ بات دوبارہ چکّر کھائے گی کہ قرآن کریم کی نئی حاصل کردہ عزت کی وجہ سے کچھ اور لوگ اس کا عملی تجربہ کرنے کی طرف متوجہ ہوں گے اور اس کی اتباع سے عزّت پائیں گے اور پھر اور لوگ ان کی عزّت کو دیکھ کر قرآن کریم کی عزّت کے قائل ہوں گے اور اِسی طرح یہ سلسلہ چلتا چلا جائے گا۔ قرآن لوگوں کو کرام بنائے گا اور لوگ قرآن کو مرفوعہ بنائیں گے گویا پہلے مُکَرَّمَۃ کے ذریعہ سے قرآن کریم کی ذاتی عزت بتائی پھر مَرْفُوْعَۃ کے ذریعہ سے بتایا کہ قرآن مسلمانوں کو کِرَامٌ بنادے گا اور وہ اسے مَرْفُوْعَۃ بنادیں گے۔ مسلمان سارے عالم پر چھا جائیں گے اور اس طرح پھر دوسری قسم کی عزّت قرآن کریم کو ملے گی یعنی بادشاہوں کا محبوب

ہونے کے سبب سے سب دُنیا میں مَرْفُوْعَة ہو جائے گا کہ سب اسے اپنے سروں پر رکھیں گے۔

تیسری صفت قرآن کریم کی مُطَهَّرَة بیان کی گئی ہے اور مُطَهَّرَة کے معنے پاکیزہ کے ہوتے ہیں اس کے مقابل میں بَرَرَة کو رکھا گیا ہے جو بَرَّ سے ہے اور بَرَّ کے معنے ہوتے ہیں اَحْسَنَ الطَّاعَةَ اِلَیْهِ وَرَفَقَ وَتَحَرَّی مَحَابَّهٗ وَتَوَقّٰی مَکَارِهَهٗ (اقرب) کہ اس کی پوری طرح اطاعت کر۔ اُس کے ساتھ رفق کیا۔ اور اُس کی اچھی چیزوں کو خوب شوق سے حاصل کیا یا اُس کی طرف توجہ سے کام لیا اور اس کی ناپسندیدہ باتوں سے بچا۔ یہ کتنا چھوٹا سا لفظ ہے مگر اس کے اندر کتنے وسیع معنے ہیں اور کس طرح اس ایک لفظ میں ہی حاملین قرآن کے اوصاف کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے بَرَرَة کے معنے یہ ہوئے کہ وہ قرآن کی پوری اطاعت کرنے والے ہوں گے۔ اُس کے ساتھ اپنا پورا تعلق رکھیں گے۔ جو چیزیں اُس نے پسند کی ہیں اُن کو وہ پُورے زور سے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور جن چیزوں سے اُس نے منع کیا ہے اُن سے وہ پُورے زور سے بچیں گے۔

قرآن کریم کے متعلق مُطَهَّرَة اور صحابہ کے متعلق بَرَرَة کا لفظ استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ قرآن کریم اپنے اندر کوئی ایسی بات نہیں رکھتا جو فطرتِ انسانی کے خلاف ہو۔ تمام باتیں جو فطرتِ انسانی کو اُبھارنے والی ہیں وہ اُس کے اندر موجود ہیں اور تمام باتیں جو فطرتِ انسانی کو بگاڑنے والی ہیں اُن سے وہ پاک ہے۔ اِس وجہ سے وہ لوگ جو اس کتاب سے تعلق رکھنے والے ہوں گے وہ بھی ایسے ہی ہوں گے کہ اس کی ساری باتوں پر عمل کریں گے اور اُن ساری باتوں سے بچنے کی کوشش کریں گے جن سے قرآن کریم نے روکا ہے۔ غرض بَرَرَة کہہ کر اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ مومن اپنا پُورا زور اِس بات پر صرف کریں گے کہ قرآن کریم نے جن باتوں پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے اُن پر عمل کریں اور وہ پُورا زور اس بات پر صرف کریں گے کہ قرآن کریم نے جن باتوں سے منع کیا ہے اُن سے مجتنب رہیں اور اِس طرح وہ بَرَرَة ہوں گے یعنی اس کے نتیجہ میں کامل متقی بن جائیں گے۔ جب انسان اِس مقام پر نہیں ہوتا اور وہ اِسی شش و پنج میں مبتلا رہتا ہے کہ مَیں قرآن کریم کی بات کو مانوں یا نہ مانوں تو وہ بَرَرَة میں شامل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور نہ وہ قرآن کو مُطَهَّر سمجھنے والا قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اگر وہ قرآن کریم کو مُطَهَّر سمجھتا اور یقین رکھتا کہ قرآن کریم نے ہر وہ تعلیم دی ہے جس کی فطرتِ انسانی کو پیاس ہے اور ہر اُس بات سے روکا ہے جو فطرت کو مسخ کرنے والی ہے تو وہ اس کے احکام پر عمل بھی کرتا اور اُس کے نواہی سے بچنے کی بھی کوشش کرتا مگر جب وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے معنے یہی ہوتے ہیں کہ نہ وہ قرآن کے مطہر ہونے پر ایمان رکھتا ہے اور نہ اپنے آپ کو بَرَرَة میں شامل کرنا چاہتا ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مُطَهَّرَة کے مقابل میں بَرَرَة رکھا یہ بتانے کے

لئے کہ ان دونوں میں نسبت پائی جاتی ہے۔

جب قرآن پر عمل کرنے کے نتیجہ میں لوگ بَرَرَۃ بن جائیں گے تو وہ قرآن کو نئے سرے سے مطہر بنائیں گے اس لئے کہ جب انسان نیکوکار ہوگا۔ قرآن پر عمل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو مدنظر رکھے گا تو یہ لازمی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اُس پر روحانی فیوض کا نزول ہوگا کیوں کہ جب انسان نیکیوں میں حصّہ لیتا اور اللہ تعالیٰ کے قرب میں بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو اُس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیوض نازل ہوتے ہیں۔ جب بَرَرَۃ پر قرآن کریم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں فیوض نازل ہوں گے تو وہ ان فیوض کو قرآن کریم کی طرف منسوب کریں گے اور اس طرح قرآن کریم کو ایک نئے رنگ کی طہارت حاصل ہو جائے گی جیسے قرآن کریم تو پہلے ہی مطہر تھا مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مبعوث ہو کر اسے جس طرح مطہر کیا اس سے پہلے اور کسی نے نہیں کیا مگر سوال یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کس نے بَرَرَۃ میں سے بنایا تھا؟ اسی قرآن نے گویا قرآن نے مسیح موعودؑ کو پاک کیا اور مسیح موعودؑ نے قرآن کی طہارت کے پوشیدہ اوصاف کو ظاہر کیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے پہلے لوگ قرآن کریم کی طرف کئی قسم کی غلط باتیں منسوب کیا کرتے تھے مگر آپ نے اُن تمام غلط عقائد اور غلط تعلیمات کا باطل ہونا ثابت کر دیا اور اس طرح قرآن کو مطہر بنا دیا۔ جب آپ نے قرآن کو مطہر بنایا تو یہ لازمی بات تھی کہ اس کے نتیجہ میں آپ کی نیکیوں میں اَور بھی اضافہ ہو جاتا پس قرآن کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ مطہر ہے اُس پر عمل کرنے والے بَرَرَۃ میں شامل ہو جاتے ہیں اور بَرَرَۃ میں شامل ہونے والے پھر قرآن کو مطہر کرتے ہیں اور قرآن اُن کو پھر نیکیوں میں بڑھاتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا امور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کلام کی عظمت کسی ظاہری سامان کی محتاج نہیں بلکہ قلوب کی صفائی کے ساتھ قرآن کریم کی عظمت قائم ہوتی ہے۔ گویا بتایا گیا ہے کہ اس قرآن سے وہی لوگ فائدہ اٹھائیں گے جو نیک ہوں مگر وہ لوگ فائدہ نہیں اٹھا سکتے جو نیک نہیں ہیں۔ اور جب یہ بات ہے تو پھر یہ کوئی سوال ہی نہ رہا کہ ظاہر میں فلاں شخص بڑا ہے اور فلاں شخص چھوٹا۔ فلاں شخص عالم ہے اور فلاں شخص جاہل۔ کیونکہ یہاں ظاہری بڑائی یا ظاہری علم یا ظاہری عزّت کا کوئی سوال نہیں۔ قرآن ایسے ہی ہاتھوں میں ترقی کرے گا جو سَفَرَۃ ہوں گے۔ کِرَامٌ ہوں اور بَرَرَۃ کے اوصاف اپنے اندر رکھتے ہوں گے خواہ وہ ظاہری طور پر بڑوں میں سے ہوں یا چھوٹوں میں سے۔ امیروں میں سے ہوں یا غریبوں میں سے۔ چنانچہ مکّہ کے چوٹی کے خاندانوں میں سے بھی اللہ تعالیٰ نے کئی لوگوں کو خدمت کی توفیق دی اور غرباء میں سے بھی کئی لوگوں نے اسلام کی شاندار خدمات سرانجام دیں۔ چنانچہ دیکھ لو

حضرت علیؓ چوٹی کے خاندان میں سے تھے۔ حضرت حمزہؓ چوٹی کے خاندان میں سے تھے۔ حضرت عمرؓ چوٹی کے خاندان میں سے تھے۔ حضرت عثمانؓ چوٹی کے خاندان میں سے تھے اس کے بالمقابل زیدؓ اور بلالؓ اور سمرہؓ اور خُبابؓ۔ صُہیبؓ۔ عامرؓ۔ عمارؓ۔ ابوفکیہہؓ چھوٹے سمجھے جانے والوں میں سے تھے۔ گویا بڑے لوگوں میں سے بھی قرآن کریم کے خادم چُنے گئے اور چھوٹے لوگوں میں سے بھی۔ پس فرماتا ہے تمہارا یہ سوال بالکل غلط ہے کہ یہ لوگ آئیں گے کہاں سے؟ اسی طرح تمہارا یہ خیال بھی غلط ہے کہ فلاں شخص ہی دین کے قابل ہے اور فلاں نہیں۔ یہ معاملہ قلوب سے تعلق رکھتا ہے ظاہر سے نہیں۔ اور اس وجہ سے ہم ان لوگوں کا خود انتخاب کریں گے۔ قرآن کریم میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو اچھے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور اگر کسی شخص کو قرآن کریم کی خوبیاں نہیں کھینچ سکیں تو وہ یقیناً اس زمانہ میں حقیقی بڑائی حاصل کرنے کا مستحق ہی نہیں۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ؕ﴿۱۸﴾

انسان ہلاک ہو وہ کیسا ناشکرا ہے۔

حَلّ لُغَات۔ قُتِلَ قُتِلَ قَتَلَ سے مجہول کا صیغہ ہے اور قَتَلَ اللّٰهُ الْاِنْسَانَ کے معنے ہیں لَعَنَهُ اللّٰه نے اُس پر لعنت کی (اقرب) پس قُتِلَ الْاِنْسَانُ کے معنی ہوں گے۔ اس انسان پر لعنت ہو۔

تفسیر۔ **قُتِلَ الْاِنْسَانُ میں قرآن سے اعراض کرنے والے سے خطاب** جس قسم کا لطیف نقشہ قرآن کریم کی خوبیوں اور اُس کے کمالات کا اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کھینچا ہے اس کی مناسبت سے فرماتا ہے قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ۔ یہ منکر انسان جو قرآن کریم سے اعراض کرنے والا اور اُس کے احکام سے تلخّی اختیار کرنے والا ہے کتنا بڑا ناشکر گزار انسان ہے اس کے سامنے ایک ایسا عظیم الشان کلام پیش کیا جا رہا ہے جو مکرّمہ ہے جو مرفوعہ اور مطہرہ ہے اور جو نہ صرف آپ ہی پاک ہے بلکہ اس کے اندر یہ خصوصیت بھی موجود ہے کہ جو شخص اس کو ہاتھ لگا لے وہ بھی پاک ہو جاتا ہے گویا جیسے سنگ پارس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ جس چیز سے چُھو جائے سونا بن جاتی ہے اسی طرح یہ قرآن ایسی کتاب ہے کہ نہ صرف خود اعزاز رکھنے والی ہے بلکہ جو لوگ اس پر عمل کرتے ہیں وہ بھی معزز بن جاتے ہیں نا صرف خود پاک ہے بلکہ جو اس پر عمل کرتے ہیں وہ بھی پاک بن جاتے ہیں۔ جب یہ ایسی عظیم الشان کتاب ہے تو قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ۔ اس قرآن سے اعراض کرنے والا انسان ہلاک ہو وہ کتنا بڑا

ناشکرا ہے قرآن اس کے سامنے تھا اور اس کے لئے موقع تھا کہ وہ اس کے احکام پر عمل کر کے سَفَرَۃ میں سے بن جاتا۔ کِرَامٌ میں سے بن جاتا۔ بَرَرَۃ میں سے بن جاتا۔ اگر قرآن کے اندر صرف ذاتی خوبیاں ہوتیں تو کوئی شخص کہہ سکتا تھا کہ مجھے تو وہ خوبیاں اس کلام میں نظر نہیں آئیں مگر قرآن کی خوبیان وہ ہیں جو صرف ذاتی نہیں بلکہ متعدی ہیں اور دوسروں کے اندر بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ پس یہ انسان کیسا ناشکرا ہے کہ ہم نے تو اسے بڑھانے اور ترقی دینے کا سامان کیا مگر وہ اُلٹا اس کلام سے دُور بھاگتا ہے۔

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۹﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۲۰﴾

(وہ غور تو کرے) کہ کس چیز سے خدا نے اُسے پیدا کیا ہے نطفہ سے (پیدا کیا ہے) (پہلے تو) اُسے پیدا کیا پھر اس

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۱﴾

کے لئے (ترقی کا ایک) اندازہ مقرر کیا۔ پھر (اس کے) راستہ کو (آسان بنایا) خوب ہی (اُسے) آسان بنایا۔

تفسیر۔ آخر وہ یہ تو سوچے کہ ہم نے اُس کی پیدائش کس طرح کی ہے اور کن اعلیٰ اور بلند اغراض کے لئے اُسے دُنیا میں بھیجا ہے۔ قرآن کریم کا یہ ایک عجیب وصف ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنی شان کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمیں تمہاری کوئی پرواہ نہیں۔ اگر تم مانو گے تو تمہارا اپنا فائدہ ہوگا اور اگر انکار کرو گے تو تمہارا اپنا نقصان ہوگا۔ مگر دوسری طرف جس طرح ماں کے دل میں اپنے بچے کے متعلق رحم اور محبت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح قرآن کریم میں پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر محبت اور پیار سے اُن کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ماں بھی اسی طرح کرتی ہے جب بچہ اس کا کہنا نہیں مانتا تو وہ ناراض ہو کر کہتی ہے کہ میرا کیا ہے میں نے تو تمہارے فائدہ کے لئے یہ بات کہی تھی مگر تھوڑی دیر کے بعد ہی وُہ پھر اُسے پُچکار کر کہنا شروع کر دیتی ہے کہ بچے کھانا کھالے۔ اور اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح بچہ اس کی بات مان لے۔

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ کہہ کر لطیف طریقہ سے قرآن پر غور کرنے کی تلقین اسی طرح قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ میں اللہ تعالیٰ نے استغناء ظاہر کیا تھا کہ انسان ہلاک ہو جائے وہ کتنا بڑا ناشکرا ہے قرآن جیسی کتاب اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے اور وہ پھر بھی تلخی اور اعراض سے کام لیتا ہے مگر یہ کہنے کے معًا بعد فرما دیا مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ۔ مِنْ نُّطْفَةٍ۔ گویا انسان کو پچکارنا شروع کر دیا کہ کسی طرح وہ اُس کی طرف واپس آجائے۔ فرماتا ہے کیا

انسان اس بات پر بھی غور نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ اُسے کس طرح پیدا کرتا ہے مِنۡ نُّطۡفَةٍ وہ اسے ایک چھوٹے سے قطرہ سے پیدا کرتا ہے اور پھر پیدا کرنے کے بعد اُس نے اُسے چھوڑ نہیں دیا بلکہ فَقَدَّرَهٗ اس کا اندازہ مقرر کیا قَدَّرَهٗ کے متعلق مفردات والا لکھتا ہے کہ اَشَارَةٌ اِلٰى مَا اَوۡجَدَهٗ فِيۡهِ بِالۡقُوَّةِ فَيَظۡهَرُ حَالًا فَحَالًا اِلَى الۡوُجُوۡدِ بِالصُّوۡرَةِ کہ وہ مخفی قوتیں جو خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں اور جن کو موقع موقع پر انسان ظاہر کرتا چلا جاتا ہے اُن کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے گویا خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ کے معنے یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور پھر اس میں ایسی طاقتیں اور قوتیں رکھیں جو ہر موقع و محل کے مطابق اس سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ جیسا کام ہوتا ہے ویسی ہی قوتیں اس سے ظاہر ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ گویا ایک وسیع ترقی کا میدان اللہ تعالیٰ نے اُس کے لئے پیدا کیا ہے۔

ثُمَّ السَّبِيۡلَ يَسَّرَهٗ کا مطلب

ثُمَّ السَّبِيۡلَ يَسَّرَهٗ اِدھر اُس نے انسان کے لئے ترقی کا ایک وسیع میدان پیدا کیا ہے اور اُدھر اس کے اندر ایسا مادہ رکھ دیا ہے کہ جب بھی کوئی اہم موقع اُس کے سامنے آئے اس کے مطابق اس کی اندرونی قابلیتیں اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں اور اُسے کوئی قربانی بھی دوبھر محسوس نہیں ہوتی۔ پس ثُمَّ السَّبِيۡلَ يَسَّرَهٗ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایسا مادہ پیدا کر دیا ہے کہ اگر وہ اپنی طبیعت پر ذرا بھی بوجھ ڈال لے تو ہر کام اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے اور وہ بڑی بڑی دشوار گزار گھاٹیاں آسانی سے عبور کر جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ عادت بُری چیز ہے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عادت بھی ہمارے فضلوں میں سے ایک فضل ہے۔ اور جب کسی کام کی عادت انسان کو ہو جائے تو پھر اس کام کے کرتے وقت کوئی دِقّت محسوس نہیں ہوتی۔ پس کسی کام کی عادت ہو جانا ایک خوبی ہے بشرطیکہ اس عادت کا استعمال کسی بُرے موقع پر نہ ہو۔ پس فرماتا ہے ثُمَّ السَّبِيۡلَ يَسَّرَهٗ۔ انسان کو پیدا کرنے اور اس کے اندر ترقی کی قابلیتیں رکھنے کے بعد ہم نے اُس کا راستہ آسان کر دیا ہے۔ نماز پڑھنا پہلے انسان کو بڑا دوبھر معلوم ہوتا ہے مگر کچھ دن باقاعدگی اور التزام سے نمازیں پڑھنے کے بعد ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ نمازوں کا پڑھنا بالکل آسان معلوم ہونے لگتا ہے۔ روزے رکھنے لگیں تو پہلے مشکل معلوم ہوتے ہیں لیکن جب روزوں کی عادت ہو جائے تو پھر محسوس بھی نہیں ہوتا کہ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ یہی حال صدقہ وخیرات اور دوسری نیکیوں کا ہے۔ جن لوگوں کو صدقہ وخیرات کی عادت ہو جائے ہم نے دیکھا ہے کہ جب تک وہ روزانہ کچھ نہ کچھ صدقہ نہ کر لیں انہیں چین ہی نہیں آتا۔ عربوں کو اس بات کی عادت تھی کہ وہ کھانا کھاتے وقت کسی اَور کو اپنے ساتھ ضرور شریک کر لیا کرتے تھے اور پھر یہ عادت رفتہ رفتہ ایسی پختہ ہو گئی کہ جب تک وہ کسی اَور کو اپنے ساتھ دستر خوان پر نہیں بٹھا لیتے تھے وہ کھانا نہیں کھا سکتے تھے اور تلاش کر کر کے دوسروں کو اپنے کھانے میں شریک

کرتے تھے۔ تو فرماتا ہے ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ بظاہر انسان کے سامنے قربانی ایک بہت بڑا وسیع میدان ہے مگر اس کے ساتھ ہی فطرتِ انسانی میں ہم نے یہ مادہ رکھ دیا ہے کہ جب وہ عمل کرنا شروع کر دے تو بجائے اس کے کہ کام بوجھل محسوس ہو وہ اُسے آسان معلوم ہونے لگتا ہے اور اس کی طرف اُسے دلی رغبت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ ایک نیکی کے بعد دوسری نیکی اور دوسری کے بعد تیسری نیکی میں وہ حصہ لینا شروع کر دیتا ہے۔ اگر عادت نہ ہوتی تو ایک نیکی کا کام بھی سرانجام دینا اس کے لئے مشکل ہوتا مگر چونکہ رفتہ رفتہ کاموں کی عادت ہوتی چلی جاتی ہے اس لئے انسان کاموں سے گھبراتا نہیں بلکہ اُن میں ایک لذّت اور سُرور محسوس کرتا ہے۔ پہلے وہ نماز پڑھتا ہے تو اُسے نماز کی عادت ہو جاتی ہے پھر روزے رکھتا ہے تو اُسے روزوں کی عادت ہو جاتی ہے۔ پھر صدقہ وخیرات میں حصہ لیتا ہے تو اُسے صدقہ وخیرات کی عادت ہو جاتی ہے اس طرح وہ ایک ایک نیکی کو فتح کرتا چلا جاتا ہے اور آگے بڑھنا اس کے لئے بالکل آسان ہو جاتا ہے۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۲﴾

پھر (عمر طبعی کے بعد) اُسے مار دیا پھر اُسے (موعود) قبر میں رکھا۔☆

تفسیر۔ فرماتا ہے اس کے بعد ہم نے اُس کو وفات دی یعنی ہمارا طریق یہ ہے کہ اس کے بعد ہم اُس کو وفات دے دیتے ہیں۔ یہاں خدا تعالیٰ نے موت کو اپنے احسان کے طور پر پیش کیا ہے چنانچہ دیکھ لو اِن آیات میں ہر جگہ خدا تعالیٰ نے اپنے احسانات کا ہی ذکر کیا ہے فرماتا ہے مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ۔ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ۔ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ۔ یہ سب احسانات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے شمار کرائے ہیں۔ اِسی ذیل میں فرماتا ہے ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ۔ پس اماتت کو بھی یہاں احسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے جب انسان نیکیوں میں حصہ لیتا اور مسلسل حصہ لیتا چلا جاتا ہے تو آخر ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہم کہتے ہیں اب تم نے بڑی محنت اُٹھالی آؤ ہم تم کو پنشن دیتے ہیں۔ گویا موت کیا ہے ایک پنشن ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے۔ دنیا میں لوگوں کو پنشن ملتی ہے تو وہ گورنمنٹ کے ممنون ہوتے ہیں مگر فرماتا ہے یہ عجیب نادان ہیں کہ ہم ان کو پنشن دیتے ہیں تو لوگ رونا شروع کر

☆ نوٹ۔ اس جگہ قائدہ بیان ہوا ہے اور اس لحاظ سے ترجمہ میں پیدا کرتا ہے۔ اندازہ مقرر کرتا ہے۔ آسان بناتا ہے۔ مار دیتا ہے وغیرہ کے الفاظ آنے چاہئیں لیکن چونکہ یہ الفاظ ترجمہ سے دور چلے جاتے تھے ہم نے ماضی کی جگہ ماضی ہی کے الفاظ رکھے ہیں لیکن مفہوم یہی ہے کہ انسان کی حالت ایسی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کا سلوک اُس سے اس اس طرح کا ہوتا ہے پھر بھی وہ سمجھتا نہیں۔

دیتے ہیں۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ کے معنے فَاَقْبَرَهٗ جب انسان کو ہم موت دیتے ہیں تو اس کے بعد اُسے قبر میں داخل کرتے ہیں۔ اَقْبَرَهٗ کے معنے ہیں جَعَلَ لَهٗ قَبْرًا يُدْفَنُ فِيْهِ (اقرب) کہ اُس کے لئے ایک قبر مقرر کی جس میں وہ دفن کیا جاتا ہے اور یہ بھی اس کے معنے ہو سکتے ہیں کہ جَعَلَهٗ مِمَّنْ يُقْبَرُ اُسے اُن لوگوں میں سے بنایا جن کے لئے قبر میں داخل ہونا مقدّر ہے اور اَقْبَرَ الْقَوْمَ کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ اَمَرَ اَنْ يُّقْبَرَ قَتِيْلُهُمْ (اقرب) اُس نے حکم دیا کہ اُن کے مقتولوں کو قبروں میں دفن کیا جائے۔ پس اَقْبَرَهٗ کے معنے ہوئے قبر میں اس کو داخل کیا یا قبر میں داخل ہونے کا حکم دیا یا اُس کیلئے قبر میں داخل ہونے کا نظام جاری کیا۔ گویا یا تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جَعَلَ لَهٗ قَبْرًا يُدْفَنُ فِيْهِ اور یا اس کے معنے ہوں گے جَعَلَهٗ مِمَّنْ يُقْبَرُ کہ ہم نے اس کو ایسا بنایا کہ اس کو قبر میں ضرور داخل ہونا پڑتا ہے۔ اب اگر فَاَقْبَرَهٗ کے معنے یہ لئے جائیں کہ جَعَلَ لَهٗ قَبْرًا يُدْفَنُ فِيْهِ یعنی ہر انسان قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو یہ معنے اس لحاظ سے یہاں چسپاں نہیں ہوں گے کیونکہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو قبروں میں دفن نہیں ہوتے۔ اور اگر وہ معنے لئے جائیں جو اَمَرَ اَنْ يُّقْبَرَ قَتِيْلُهُمْ سے ظاہر ہیں تو وہ بھی یہاں چسپاں نہیں ہو سکتے۔ پس میرے نزدیک اَقْبَرَهٗ کے معنے اس جگہ یہی مناسب ہیں کہ جَعَلَهٗ مِمَّنْ يُّقْبَرُ یعنی ہم نے اس کو ایسا بنایا ہے کہ وہ قبر میں داخل کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک دلیل ہے جو پچھلی دلیل کے ایک حصہ اور ٹکڑہ کے طور پر اس جگہ بیان ہوئی ہے۔ اگر اَقْبَرَهٗ کے معنے خالی مٹی میں دفن کئے جانے کے ہوں تو یہ الفاظ دلیل کا حصہ نہیں بن سکتے۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ میں بعث بعد الموت کی طرف اشارہ وہ معنے جو عام طور پر ہماری طرف سے اس آیت کے کئے جاتے ہیں کہ اس آیت میں اُس قبر کا ذکر ہے جو عالمِ برزخ میں ہر انسان کو ملتی ہے وہ بھی درست ہیں مگر دشمن کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک ڈھکوسلہ ہے ہمیں تو نظر نہیں آتا کہ اگلے جہان میں ہر مرنے والے کو قبر میں داخل کیا جاتا ہے اس لئے ہم تمہاری اس بے دلیل بات کو کس طرح مان سکتے ہیں اور میرے نزدیک جبکہ یہ ایک دلیل ہے جو گزشتہ دلیل کے جزو کے طور پر بیان ہوئی ہے تو بہرحال اَقْبَرَهٗ کا کوئی حصّہ دنیا میں بھی نظر آنا چاہیے۔ جو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے معنے یہ کریں کہ جَعَلَهٗ مِمَّنْ يُّقْبَرُ یعنی انسانی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ مادہ رکھ دیا ہے کہ وہ اپنے مردے کو قبر میں داخل کرے۔ اگر بعض لوگ اپنے مُردوں کو جلا دیتے ہیں تو درحقیقت وہ بھی اسی لئے جلاتے ہیں کہ وہ پسند نہیں کرتے کہ اُن کے مُردے سڑتے گلتے رہیں اسی لئے وہ ان کو جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔ جو لوگ اپنے مُردے جانوروں کو کھلا دیتے ہیں وہ بھی اسی لئے کہ اُن کے نزدیک مردہ کا احترام یہ تقاضا کرتا

ہے کہ ایسا کیا جائے۔ گو یا مُردوں کی عزت اور اُن کا احترام کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے اور یہی معنے فَاَقْبَرَہٗ کے ہیں کہ کوئی انسان اپنے مُردے کی ہتک برداشت نہیں کر سکتا باوجود اس کے کہ وہ ایک بے جان لاشہ ہوتا ہے فطرتِ انسانی اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی کہ اُسے یونہی پھینک دیا جائے بلکہ ہر انسان خواہ وُہ کسی مذہب وملّت سے تعلق رکھتا ہو اُس کا مناسب اعزاز کرے گا اور اپنے اپنے رنگ میں جو سلوک مناسب ہوگا اُس سے کرے گا۔ اور یہی وہ بات ہے جس میں انسان دوسرے جانداروں سے ممتاز ہے ورنہ اگر کھانے کو لو۔ تو انسان بھی کھاتا ہے اور جانور بھی کھاتا ہے۔ سونے کو لو تو انسان بھی سوتا ہے اور جانور بھی سوتا ہے مرنے کو لو تو انسان بھی مرتا ہے اور جانور بھی مرتا ہے۔ آگے یہ فرق ہو جاتا ہے کہ جانوروں میں یہ مادہ نہیں کہ وہ دوسرے جانوروں کی لاشوں کو دفنائیں لیکن کوئی انسان اپنے مردوں کو ایسی طرز پر نہیں رکھتا جس سے ان کے اعزاز میں فرق آئے۔ یہ مردے کا اعزاز اور اُس کا احترام جو انسانی فطرت میں داخل ہے بتاتا ہے کہ انسانی زندگی موت پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر انسان کی زندگی اُس کی موت پر ختم ہے تو پھر اُس کے جسم کا احترام کون سا رہا یا اُس کے اعزاز کی ضرورت ہی کیا ہے اس صورت میں بیشک اُسے میدان میں پھینک دیا جائے کوئی حرج نہیں ہوگا۔ لیکن فطرتِ انسانی میں اس مادہ کا ہونا کہ مُردے کی عزت کی جائے اور اس کی عظمت میں کوئی فرق نہ آئے اس بات کی دلیل ہے کہ زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔ فرماتا ہے ہم تمہارے سامنے اس فطری دلیل کو پیش کرتے ہیں۔ تم اپنے مردہ کی لاش کو تحقیر کے ساتھ پھینکتے نہیں بلکہ اس کا مناسب احترام کرنا ضروری سمجھتے ہو۔ اگر اس کی آئندہ زندگی کا کوئی امکان نہیں تو تمہارے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوتا ہے کہ مردے کا مناسب احترام کیا جائے۔ خواہ تم اپنے مُردوں کو بجلی سے جلا دو خواہ لکڑیوں کے انبار میں رکھ کر آگ لگا دو۔ خواہ خاص مقام پر رکھ کر سدھائی ہوئی چیلوں اور گدھوں کو کھلا دو۔ بہر حال تم اپنے مُردوں سے وہ معاملہ نہیں کرتے جو جانور کرتے ہیں ایک کُتّا مر جاتا ہے تو دوسرے کُتوں کو خیال بھی نہیں آتا کہ اس کے ساتھ کوئی خاص سلوک کریں وہ اُسی طرح پڑا رہتا ہے یہاں تک کہ گل سڑ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر انسانی زندگی اُس کی موت پر ختم تھی تو پھر چاہیے تھا لوگ اپنے مردوں کو یونہی پھینک دیتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ اپنے اپنے رنگ میں اس کا مناسب اعزاز کرتے ہیں پس فرماتا ہے ثُمَّ اَمَاتَہٗ فَاَقْبَرَہٗ ہم انسان کو موت دیتے ہیں۔ اور پھر اُس کے رشتہ داروں کے دلوں میں ایسی حس پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ اس کی لاش کو یوں ہی نہیں پھینک دیتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں اگر ہم نے ایسا کیا تو مردہ کی عزت اور احترام میں فرق آئے گا۔ یہ دلیلِ فطرت پیش کر کے اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ جب مرنے کے بعد بھی تم عزت کے قائل ہو اور لاش کی عزت کرنا اپنے لئے ضروری سمجھتے ہو تو اس سے معلوم ہوا کہ مرنے

کے بعد کی زندگی کا تمہارے دلوں میں بھی احساس موجود ہے گو یہ احساس ادنیٰ ہے مگر بہرحال یہ ادنیٰ احساس تمہاری روح کو اس اہم امر کی طرف متوجہ کرنے کے لئے کافی ہے کہ آخر وجہ کیا ہے کہ تمہارے دلوں میں مردہ کے احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ تمہارے دلوں میں اس جذبہ کا نمایاں طور پر پایا جانا اور دنیا میں کسی انسان کا بھی اپنے مردہ کی لاش کی ہتک گوارا نہ کرسکنا اس بات کا ثبوت ہے کہ زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ کوئی اور حیات ہے جس کا اس موت سے آغاز ہوتا ہے اور انسان نہیں چاہتا کہ اس زندگی کے کوچہ میں داخل کرتے وقت محض اس خیال سے کہ یہ جسم تو مُردہ ہو چکا ہے اس کی عزت میں کوئی فرق آنے دے۔

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۳﴾

پھر جب چاہے گا اُسے دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا۔

حَلّ لُغَات ۔ اَنْشَرَ اَنْشَرَ اللّٰہُ الْمَیِّتَ کے معنے ہوتے ہیں اَحْیَاہٗ۔ اللہ تعالیٰ نے مردے کو زندہ کیا (اقرب) پس اِذَا شَآءَ اَنْشَرَہٗ کے معنے ہوں گے جب وہ چاہے گا اُسے زندہ کرے گا۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے کہ تم کو ان ساری باتوں سے نتیجہ نکال لینا چاہیے کہ جب خدا چاہے گا تم کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔ ورنہ یہ تمام سلسلۂ پیدائش ہی لغو اور بے معنی قرار دینا پڑتا ہے آخر یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اتنا بڑا کارخانہ جاری کرے اور پھر اس کے اندر کوئی غرض اور حکمت کام نہ کر رہی ہو۔ وہ انسان کو پیدا کرتا ہے ایک ایسی چیز سے جو نہایت ہی ذلیل ہے پھر ادنیٰ حالت سے ترقی دیتے دیتے اُسے اعلیٰ درجہ کے مقامات تک پہنچا دیتا ہے۔ اُس کے اندر ایسی قوتیں رکھتا ہے جو غیر محدود ہیں اور جوں جوں ترقی کے سامان ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں اُس کے مقابلہ میں اُس کی اندرونی قوتیں بھی رُونما ہونی شروع ہو جاتی ہیں پھر نہ صرف انسان کے اندر اس نے مختلف قسم کی قوتیں پیدا کیں بلکہ عادت کے ذریعہ وہ اُس کے کاموں میں بشاشت پیدا کر دیتا ہے اور جب اسی طرح ترقی کرتے کرتے انسان اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو تم یہ خیال کرتے ہو کہ اس کے بعد روح کو فنا کر دیا جاتا ہے حالانکہ اتنے بڑے کام کے بعد انعام ملنے کا حق ہوتا ہے نہ یہ کہ انعام تو کوئی نہ دیا جائے اور روح کو ابدی طور پر فنا کر دیا جائے۔ پھر جب انسان مر جاتا ہے تو تمہاری فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ مادہ پیدا کیا ہوا ہوتا ہے کہ تم اپنے مردہ کی عزت کرو چنانچہ تم اپنے اپنے طریق کے مطابق احترام کے ساتھ اُسے اپنے گھر سے جُدا کرتے ہو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ

مرنے کے بعد بھی تم کسی عزت کے قائل ہو اور تمہارا یہ فعل اس بات پر گواہ ہے کہ زندگی موت پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ایک اور حیات انسان کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ اور وہ جب چاہے گا انسان کو زندہ کر دے گا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ تم اور تو ساری باتیں مانتے چلے آتے ہو مگر یہاں آ کر انکار کر دیتے ہو۔ گویا تم تسلیم کرتے ہو کہ انسان کی پیدائش بغیر کسی حکمت کے نہیں ہوئی۔ اس کا ادنیٰ حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ درجہ تک کی حالت تک پہنچنا۔ اس کے اندر ترقی کی وسیع قابلیتوں کا رکھا جانا۔ اس کے سامنے ترقیات کا ایک وسیع میدان ہونا اور پھر اُن ترقیات کے مطابق انسانی قوتوں کا اُبھر آنا اور پھر عادت کے ذریعہ اس کے اندر بشاشت کا پیدا ہونا اور پھر جب وہ مر جائے تو تمہارا اپنے مردہ کی لاش کا احترام کرنا یہ سب امور اس بات کی ایک کھلی دلیل ہیں کہ مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ مگر تمہاری عجیب حالت ہے کہ تم اور تو سب باتوں کو مانتے چلے آتے ہو مگر ان باتوں کا جو طبعی نتیجہ ہے اُس کو تسلیم کرنے سے نشوز کرتے ہو۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ؕ﴿۲۴﴾

(ایسا) ہرگز نہیں (جو تم سمجھتے ہو) (دیکھتے نہیں کہ) ابھی تک جو اسے حکم ملا تھا اُس نے اُسے پورا نہیں کیا۔

تفسیر۔ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ سے مراد فرماتا ہے كَلَّا ہرگز نہیں لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ اُس نے اب تک وہ کام نہیں کیا جس کا اُسے حکم دیا گیا تھا۔ لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ میں اسی طرف اشارہ ہے جس طرف مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى میں اشارہ کیا گیا تھا اور جس کا قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ میں بھی ذکر تھا۔ کہ انسان کے لئے موقع تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کے قرب میں بڑھے اور اپنی عاقبت کو سنوار لے مگر اب تک اس نے اپنے اس فرض کو ادا نہیں کیا۔ اُس کے لئے روحانی ترقیات حاصل کرنے کا بہت بڑا موقع تھا اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے قرب کا میدان کُھلا تھا مگر افسوس کہ اس نے اپنے اس فرض کو کماحقہٗ اب تک سرانجام نہیں دیا۔ یہی وہ چیز ہے جس پر میں آج کل بار بار زور دے رہا ہوں اور جماعت کو توجہ دلا رہا ہوں کہ وہ آئندہ نسلوں تک اِس امانتِ روحانی کو پہنچانے کے لئے اس قدر تن دہی اور اس قدر جانکاہی سے کام لے کہ شیطان ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جائے اور کفر کے غلبہ کا دنیا میں کوئی امکان نہ رہے۔ آج تک کسی اُمت نے بھی اپنی نسل کو شیطانی حملوں سے محفوظ رکھنے پر زور نہیں دیا اگر ہماری جماعت اس فرض کو سرانجام دے لے تو یقیناً یہ ایک بے مثال کام ہوگا اور اس کی نظیر اَور کسی اُمّت میں نہیں مل سکے

گی ۔اللہ تعالیٰ اسی نکتہ کی طرف توجہ دلاتا ہے اور افسوس کے ساتھ فرماتا ہے کہ لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ہم نے انسان کو جو حکم دیا تھا اس کو اب تک اُس نے ادا نہیں کیا۔فرداً فرداً لوگوں نے اپنی اصلاح کی بہت کوششیں کی ہیں مگر قوم کی قوم کو اُبھار کر ترقی کے میدان میں اس طرح بڑھاتے چلے جانا کہ پھر اس کے گرنے کا کوئی امکان نہ رہے اور شیطان اُس کو ورغلانے سے مایوس ہو جائے یہ کام اَیسا ہے جس کی طرف ابھی تک توجہ نہیں کی گئی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر چونکہ مُختلف دَور آتے ہیں اس لئے ممکن ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دَوروں میں سے کوئی دَور ایسا بھی آجائے جس میں اس فرض کی ادائیگی ہو سکے جس کا كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ میں ذکر کیا گیا ہے۔اب تک الگ الگ کوششیں کر کے اُن کے نتائج کو دیکھا جا چکا ہے صحابہؓ نے تیس سال کوشش کی مگر پھر اُن کی نسلوں میں کمزوری پیدا ہوگئی اور نیکی کا تسلسل جاتا رہا۔اب ہمارے لئے موقع ہے کہ ہم اس کام کو سرانجام دینے کے کوشش کریں تاکہ قومی طور پر اسلام دنیا میں اس طرح قائم ہو جائے کہ پھر اس کے گرنے کا کوئی امکان ہی نہ رہے۔یہ کام ایسا ہے جو پہلے کبھی نہیں ہوا۔انفرادی رنگ میں بے شک بہت کوششیں ہوئیں مگر قومی طور پر اسلام کی برتری کی ایسی کوشش نہیں کی گئی کہ نیکی کا تسلسل قائم رہتا اور اسلام کے گرنے کا کبھی خطرہ پیدا نہ ہوتا۔پس كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ میں اسی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب تک انسان نے وہ بات نہیں کی جس کا ہم نے اسے حکم دیا تھا۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ میں موعود کل ادیان کی بعثت کی ضرورت کی طرف اشارہ اس کے ایک اور معنے بھی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ انسانی قوتیں جس مقامِ عظیم کو حاصل کر سکتی ہیں اب تک انسان نے اُس مقام کو حاصل نہیں کیا پس تم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ابھی موعود کل ادیان آنا باقی ہے جس سے انسانی ترقی کا آخری مقام وابستہ ہے اور بجائے اس کے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو حقارت سے دیکھا جائے اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ کرنی چاہیے۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ ﴿۲۵﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ

پس چاہیے کہ انسان اپنے کھانے کی طرف دیکھے (اور دیکھے) کہ ہم نے (بادلوں سے) پانی کو خوب برسایا ہے۔

صَبًّا ﴿۲۶﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۷﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۸﴾

پھر زمین کو خوب پھاڑا ہے پھر اس میں دانہ اگایا ہے۔

وَّعِنَبًا وَّ قَضْبًا ﴿۲۹﴾ وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ﴿۳۰﴾

اور (اسی طرح) انگور اور ترکاریاں (اور سبز چارہ) اور زیتون اور کھجوریں

وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۱﴾ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ﴿۳۲﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ

اور گھنے باغات اور میوے اور خشک گھانس (اور جھاڑیاں بھی) (یہ سب) تمہارے اور تمہارے

لِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾

جانوروں کے فائدہ کے لئے (کیا گیا ہے)۔

تفسیر۔ چاہیے کہ انسان اپنے کھانے کی طرف دیکھے اور غور کرے کہ ہم اس کی جسمانی پرورش کے لئے کیا کچھ کرتے ہیں۔ ہم نے اس کے لئے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے زمین کو اس کی خاطر پھاڑا۔ پھر ہم نے اُس میں سے دانے نکالے اور انگور پیدا کئے اور قضب پیدا کیا۔ لُغت میں لکھا ہے کہ اَلْقَضْبُ كُلُّ شَجَرَةٍ طَالَتْ وَسَبَطَتْ اَغْصَانُهَا وَالْقَتُّ۔ وَالْقَتُّ: اَلْفِصْفِصَةُ الْيَابِسُ وَالْفِصْفِصَةُ نَبَاتٌ تَعْلُفُهُ الدَّوَابُ وَهِيَ تُسَمَّى بِذَالِكَ مَادَامَتْ رَطْبَةً فَاِذَاجَفَّتْ زَالَ عَنْهَا اِسْمُ الْفِصْفِصَةِ وَسُمِّيَتْ بِالْقَتِّ حَبُّهَا نَحْوُ الْكَرْسَنَّةِ لٰكِنْ فِيْهِ طُوْلٌ (اقرب) قضب کہتے ہیں ہر ایسے درخت کو جو اونچا بھی ہو اور اس کی شاخیں بھی اردگرد پھیلی ہوئی ہوں۔ جانور اس کو شوق سے کھاتے ہیں خصوصًا اونٹ ایسے درخت کی طرف بہت رغبت سے جاتا ہے۔ اسی طرح قتّ کو بھی قضب کہتے ہیں اور قتّ فِصْفِصَة کو کہتے ہیں یہ ایک روئیدگی ہے جس کو جانور کھاتے ہیں جب تک تازہ رہے فِصْفِصَة کہتے ہیں اور جب سُوکھ جائے تو اس کو قتّ کہتے ہیں۔ اس کا دانہ کرسنّہ کی طرح ہوتا ہے مگر اس سے کسی قدر لمبا ہوتا ہے (کرسنّہ گندنے کو کہتے ہیں جسے پنجابی میں بھوکاٹ کہا جاتا ہے) پھر فرماتا ہے ہم نے زیتون نکالا اور کھجوریں پیدا کیں اور باغات پیدا کئے منڈیروں والے۔ ایسے باغات غُلْبًا جو بڑے گھنے ہیں۔ غُلب اُس چیز کو کہتے ہیں جو مُلْتَفٌّ یعنی لپٹی ہوئی ہو۔ پس حَدَائِقَ غُلْبًا کے معنے یہ ہوئے کہ ہم نے ایسے باغات پیدا کئے ہیں جن کی شاخیں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی ہیں یعنی بڑے گھنے ہیں۔ اسی طرح ہم نے میوے پیدا کئے ہیں اور پھر چارہ بھی پیدا کیا ہے۔ اَبٌّ اُن تمام چیزوں کو کہتے ہیں جن کو انسان نہیں کھاتا اور نہ اُن کو بوتا ہے۔ قدرتًا زمین میں سے اُگ آتی ہیں اور جانور اُن کو کھاتے ہیں چنانچہ لکھا ہے اَلْاَبُّ كُلُّ مَا يُنْبِتُ الْاَرْضُ مِمَّا لَا

یَاْکُلُہُ النَّاسُ وَلَا یَزْرَعُوْنَہٗ (فتح البیان زیر آیت ھٰذا)

سورۃ النازعات اور سورۃ عبس کے ایک مضمون کی مشابہت مَتَاعًا لَّکُمْ وَلِاَنْعَامِکُمْ۔ ان تمام چیزوں کو ہم نے تمہارے لئے فائدہ کا موجب بنایا ہے اور تمہارے اَنْعام کے لئے بھی۔ قرآن کریم کے بعض مقامات ایسے ہیں جو لفظی رنگ میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں اسی قسم کی مشابہت اس جگہ بھی پائی جاتی ہے چنانچہ یہی مضمون سورۂ نازعات میں بھی تھا مگر اور رنگ میں۔ وہاں فرمایا تھا ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ط بَنٰھَا۔ رَفَعَ سَمْکَھَا فَسَوّٰھَا۔ وَ اَغْطَشَ لَیْلَھَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰھَا۔ وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰھَا۔ اَخْرَجَ مِنْھَا مَآءَھَا وَ مَرْعٰھَا۔ وَ الْجِبَالَ اَرْسٰھَا۔ مَتَاعًا لَّکُمْ وَ لِاَنْعَامِکُمْ اس سورۃ میں بھی اسی طرح کی چیزیں گنائی ہیں کہ فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِہٖٓ۔ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا۔ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا۔ فَاَنْۢبَتْنَا فِیْھَا حَبًّا۔ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا۔ وَّ زَیْتُوْنًا وَّ نَخْلًا۔ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا۔ وَّ فَاکِھَۃً وَّ اَبًّا۔ مَّتَاعًا لَّکُمْ وَ لِاَنْعَامِکُمْ فرق صرف یہ ہے کہ سورۂ نازعات میں زیادہ تر آسمانی چیزوں کو پیش کیا گیا تھا۔ گو زمینی چیزوں کا بھی اس میں ذکر تھا مگر اصل مقصد نظامِ سماوی کو پیش کرنا تھا لیکن اس جگہ نظامِ ارضی کو خصوصیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ گویا پچھلی سورۃ میں اُس وسیع نظام کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جو آسمان اور زمین دونوں پر حاوی ہے مگر اس سورۃ میں اُس مخصوص نظام کی طرف اشارہ ہے جو زمین میں روئیدگی پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ وہاں خدا تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کیا تھا کہ جس طرح زمین پر آسمان کا وجود ضروری ہے اور بغیر آسمانی نظام کے زمینی نظام قائم نہیں ہوسکتا اسی طرح تمہارے لئے بھی ایک روحانی بلندی کی ضرورت ہے۔ اگر تم یہ خیال کرو کہ اس رُوحانی بلندی کے بغیر تم نظامِ ارضی کو قائم کرسکو گے تو یہ تمہاری غلطی ہوگی جس طرح آسمان کے بغیر زمین کا وجود عبث ہے اسی طرح روحانی نظام کے بغیر جسمانی نظام عبث اور بے کار رہوتا ہے یہاں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانی فطرتوں میں سے بعض ایسی ہیں جو قرآن کریم سے مناسبت رکھتی ہیں اور بعض ایسی ہیں جو قرآن کریم سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ وہ فطرتیں جو قرآن کریم سے مناسبت رکھتی ہیں وہ آپ ہی آپ اس طرف آجائیں گی اور جو اس سے مناسبت نہیں رکھتیں وہ اس طرف توجہ بھی نہیں کریں گی۔ پس سورۂ نازعات میں اور مضمون تھا اور اس سورۃ میں اور مضمون ہے۔ وہاں آسمان کا ذکر کلام الٰہی کے نزول کی ضرورت پر روشنی ڈالنے کے لئے پیش کیا گیا تھا اَور یہاں یہ بتایا ہے کہ بعض طبائع قرآنی تعلیم سے مناسبت رکھتی ہیں اور بعض نہیں رکھتی وہ طبائع جو اس تعلیم سے مناسبت رکھتی ہیں وہ دوڑتی ہوئی اس طرف آجائیں گی اور جن کے قلب میں اس سے کوئی مناسبت نہیں ہوگی وہ اس سے دُور رہیں گی جیسے زمین کو دیکھ لو کہ اس

میں سے دانے بھی اُگتے ہیں۔ انگور بھی پیدا ہوتے ہیں۔ درخت بھی پیدا ہوتے ہیں۔ زیتون بھی پیدا ہوتا ہے۔ کھجوریں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ باغات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ میوے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور چارہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز ایسی ہے جسے انسان مُنہ مارتا ہے اور کوئی چیز ایسی ہے جسے جانور مُنہ مارتا ہے۔ یہی انسانی طبائع کا حال ہے۔ جو قرآن کے مناسب حال ہیں وہ اس طرف آ جائیں گی اور جو کفر کے مناسب حال ہیں وہ اُس طرف چلی جائیں گی۔ گویا فطرتیں خود بخود بول اٹھیں گی اُن کے مناسب حال کون سی چیز ہے۔ جیسے انگور ہوں تو اُن کی طرف انسان جائے گا اونٹ نہیں جائے گا لیکن اگر کیکر کا درخت ہو تو اس کی طرف اونٹ جائے گا انسان نہیں جائے گا۔ تو فرماتا ہے انسان نے بیشک ابھی تک اس قرآن پر عمل نہیں کیا مگر وہ مجبور ہے جس دن قرآن کریم کی روئید گیاں ظاہر ہوئیں اور اس کا حُسن دنیا میں چمکا تم دیکھ لوگے کہ مناسب حال فطرتیں اس کی طرف دوڑتی ہوئی آئیں گی۔ اب تو یہ لوگ تمہیں تھوڑے سے نظر آتے ہیں مگر پھر گروہ در گروہ اور جوق در جوق لوگ اس مذہب میں داخل ہونے شروع ہو جائیں گے۔ چنانچہ مثال دیتے ہوئے فرماتا ہے۔ تم دنیا میں دیکھ لو۔ کچھ دانےؔ۔ انگورؔ۔ زیتونؔ۔ کھجورؔ۔ باغاتؔ۔ اور میوےؔ ہوتے ہیں اور کچھ جھاڑیاں اور چارہ وغیرہ ہوتا ہے۔ تم اُن چیزوں کی طرف چلے جاتے ہو جو تمہارے مناسب حال ہیں اور جانور اُن چیزوں کی طرف چلے جاتے ہیں جو اُن کے مناسب حال ہیں۔ اسی طرح جو نیک فطرتیں ہیں وہ قرآن کی طرف آ جائیں گی اور جو بدفطرتیں ہیں وہ کفر کی طرف چلی جائیں گی۔

یہ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن چیزوں کا تو زیادہ ذکر کیا ہے جو انسانوں کے کھانے کے کام آتی ہیں مگر ان چیزوں کا کم ذکر کیا ہے جو جانوروں کے کھانے کے کام آتی ہیں چنانچہ چھ جگہ انسانوں کے کام آنے والی چیزوں کا ذکر کیا اور دو جگہ جانوروں کے کام آنے والی چیزوں کا۔ اس میں اِس طرف اشارہ ہے کہ قرآن زیادہ آدمی کھینچ لے گا اور کفر اپنی طرف کم آدمی کھینچے گا۔ چنانچہ جانور کے لئے تو صرف قَضْبٌ اور اَبٌّ کا ذکر کیا مگر انسان کے لئے حَبًّا وَّعِنَبًا وَّ قَضْبًا وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّ فَاكِهَةً اتنی چیزوں کا ذکر کر دیا یہ بتانے کے لئے کہ قرآن کی طرف لوگوں کا رجوع زیادہ ہوگا اور کفر کی طرف کم۔ پس فرماتا ہے یہ سوال ہی غلط ہے کہ اسلام کا غلبہ کس طرح ہوگا۔ فطرتیں اپنی مناسب حال چیز کی طرف آپ ہی بھاگتی چلی آئیں گی وہ فطرتیں جو قرآن کریم کے مناسب حال ہیں وہ اس کی طرف آ جائیں گی۔ جیسے حبؔ اور عنبؔ اور زیتونؔ اور نخلؔ اور حدائقؔ اور فاکھتہ کی طرف انسان جاتے ہیں اور جو فطرتیں کفر کے مناسب حال ہیں وہ اُس کی طرف چلی جائیں گی جیسے جانور قضب اور اَبّ کی طرف جاتے ہیں۔ انگوروں اور کھجوروں کی طرف نہیں جاتے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۴﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۵﴾

پھر (یہ بھی تو سوچو کہ) جب کان پھاڑنے والی (مصیبت) آئے گی جس دن کہ انسان اپنے بھائی سے (دُور) بھاگے

وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ ﴿۳۶﴾ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ ﴿۳۷﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ

گا اور (اسی طرح) اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے (بھی) اس دن ہر ایک آدمی کی حالت

مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۸﴾

ایسی ہوگی کہ وہ اُسے اپنی (ہی) طرف اُلجھائے رکھے گی۔

حَلّ لُغَات ۔اَلصَّآخَّةُ اَلصَّاخَةُ صَخَّ سے اسم فاعل کا مؤنث کا صیغہ ہے۔اور صَخَّ الصَّوْتُ الْاُذُنَ کے معنے ہوتے ہیں اَصَمَّهَا۔ اتنے زور کی آواز آئی کہ اُس نے کان پھاڑ دیا اور اُسے بہرہ کر دیا (اقرب) اَلصَّآخَّةُ کے معنے ہیں صَيْحَةٌ تُصِمُّ لِشِدَّتِهَا۔ ایسے زور کی آواز جو کانوں کو بہرہ کر دے نیز اس کے معنے ہیں اَلدَّاهِيَةُ سخت مصیبت۔(اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے جب وہ کان پھاڑنے والی آواز آجائے گی يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ جس دن کہ آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا وَ اُمِّهٖ اور اپنی ماں سے بھاگے گا وَ اَبِيْهِ اور اپنے باپ سے بھاگے گا وَ صَاحِبَتِهٖ اور اپنی بیوی سے بھاگے گا وَبَنِيْهِ اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ۔اُس دن انسان کے حالات ایسے ہوں گے کہ وہ گردو پیش کی طرف نہ دیکھ سکے گا اور دوسروں کی طرف وہ توجہ ہی نہ کرے گا۔قیامت کے دن تو لوگوں کی ایسی حالت ہوگی ہی۔

اَلصَّآخَّةُ سے مراد قرآن کی آواز صحابہؓ کے حالات پر غور کر کے دیکھو جس وقت قرآن کا نزول ہوا کس طرح دنیا نے اپنی آنکھوں سے اس نظارہ کا مشاہدہ کیا کہ باپ نے بیٹے کو چھوڑ دیا بیٹے نے باپ کو چھوڑ دیا۔ ماں بیٹی سے الگ ہوگئی اور بیٹی ماں سے الگ ہوگئی۔ بھائی بھائی سے جدا ہو گیا اور دوست دوست سے علیحدہ ہو گیا۔ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ بھائی بھائی کو چھوڑ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ گیا۔خاوند اپنی بیوی کو چھوڑ کر اور بیوی اپنے خاوند کو چھوڑ کر۔ باپ اپنے بیٹے سے الگ ہو کر اور بیٹا اپنے باپ سے الگ ہو کر۔ ماں اپنی بیٹی کو چھوڑ کر اور بیٹی اپنی ماں سے علیحدہ ہو کر۔ دوست اپنے دوست کو چھوڑ کر اور رشتہ دار اپنے

رشتہ دار سے علیحدہ ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حلقۂ اطاعت میں آ گئے اور انہوں نے کسی دنیوی محبت کی خدا اور اس کے رسول کی رضاء کے مقابلہ میں پروانہ کی۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيْهِ۔ اور پھر وہ اسلام اور قرآن کی محبت میں ایسے محو ہو گئے کہ وہ دُنیا اور اس کی دلچسپیوں کو بالکل بھول ہی گئے۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ کا نظارہ صحابہ کرام میں تاریخ اسلام کے صفحات پر صحابہؓ کرام کی اس قربانی کی کتنی ہی واضح مثالیں موجود ہیں مگر میں اس جگہ صرف دو مثالیں بیان کر دیتا ہوں جن کا میں پہلے بھی کئی دفعہ ذکر کر چکا ہوں۔ ایک نوجوان جو اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا وہ مسلمان ہو گیا۔ اُس کے ماں باپ نے اُسے کئی قسم کی تکلیفیں دینی شروع کیں یہاں تک کہ اس کے برتن الگ کر دئے مگر وہ اسلام کو ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوا آخر کچھ عرصہ کے بعد وہ مکّہ سے ہجرت کر کے چلا گیا۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد وہ پھر مکّہ میں واپس آیا جس پر اُس کے ماں باپ اُسے بڑے شوق اور محبت سے ملے۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ اسلام سے توبہ کر چکا ہے اور بیٹے نے یہ سمجھا کہ یہ میرے بعد اسلام کی دشمنی کو ترک کر چکے ہیں اور اس لئے مجھے محبت سے مل رہے ہیں اور اب اپنے افعال پر پچھتاتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ماں باپ نے کہا بیٹا ہم تو تمہیں پہلے بھی یہی نصیحت کیا کرتے تھے کہ اس صابی کی طرف مت جاؤ۔ اُن کا اشارہ اس صابی کے لفظ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی طرف تھا۔ گویا اس رنگ میں انہوں نے اپنی خیر خواہی جتانی شروع کر دی کہ ہم تو تمہیں پہلے ہی کہا کرتے تھے کہ اسلام میں داخل ہو کر تم نے بڑی غلطی کی۔ اب اچھا ہوا جو اسلام کو چھوڑ کر پھر ہم میں شامل ہو گئے ہو۔ اُس نوجوان نے جب یہ بات سُنی تو وہ اُسی وقت کھڑا ہو گیا اور کہا ماں! تم میری ماں ہو اور باپ! تم میرے باپ ہو مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مجھے اور کوئی پیارا نہیں۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ تمہارے دل میں رحم پیدا ہو چکا ہے اور تم اپنے افعال پر پشیمان ہو لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ اگر تمہارا میرے ساتھ ملنا اسی شرط سے وابستہ ہے کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دُوں تو یہ ناممکن بات ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے باپ ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی میری ماں ہیں۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھا اور پھر اُس نے مرتے دم تک اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا۔ پھر اس عورت کے واقعہ پر غور کرو جو مدینہ کی رہنے والی تھی جو جنگ اُحد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر سُن کر دیوانہ وار اپنے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی اور جب اُسے یکے بعد دیگرے بتایا گیا کہ تیرا باپ اس جنگ میں مارا گیا ہے۔ تیرا خاوند اس جنگ میں مارا گیا ہے تیرا بھائی اس جنگ میں مارا گیا ہے تو اُس نے کہا میں تم سے یہ نہیں پوچھتی کہ میرے باپ اور میرے خاوند اور میرے بھائی کا کیا حال ہے میں تم سے یہ پوچھتی ہوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے

اور جب اس کو بتایا گیا کہ آپ تو خدا کے فضل سے بخیریت ہیں تو اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکلا کہ اگر آپ خیریت سے ہیں تو پھر کوئی مصیبت ایسی نہیں ہوسکتی جو نا قابل برداشت ہو۔ (السیرة النبویة لابن ھشام غزوۃ احد)

غرض یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ۔ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ کا نظارہ ہمیں صحابہ کرام میں نظر آتا ہے۔ اس کے بالمقابل کفار میں بھی ایسا ہی جوش تھا کہ بھائی بھائی پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہوجاتا اور باپ بیٹے کو قتل کرنے کے لئے دوڑتا۔ چنانچہ جب جنگ ہوتی تو اس میں بھائی بھائی کو مارنے کے لئے آگے بڑھتا تھا اور اپنے رشتہ داری تعلقات کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا تھا یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک جنس نہیں ہیں بلکہ دو الگ الگ جنسیں ہیں۔ مومن ہے تو وہ کہتا تھا میرا کافر سے کوئی واسطہ نہیں میرا وہی دوست ہے جو مومن ہے۔ اور کافر ہے تو وہ کہتا تھا میرا مومن سے کوئی واسطہ نہیں۔ میرا وہی دوست ہے جو کافر ہے۔ یہی وہ صَاخَّۃ کی علامت ہے جو سچے مذہب کی آمد پر ظاہر ہوا کرتی ہے اور جس کے بعد کسی قسم کی مداہنت یا کسی قسم کی منافقت برداشت نہیں کی جاسکتی۔ کفر اور ایمان میں ایک بیّن اور کُھلا کُھلا امتیاز ہوجاتا ہے۔ لیکن جھوٹے مذاہب کے درمیان یہ بات نہیں ہوتی۔ اسی طرح اُس قوم میں بھی یہ امتیازی علامت نہیں رہ سکتی۔ جو جھوٹے مذہب کا حصہ بن جائے جیسے غیر مبایعین ہیں کہ وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم کے خلاف غیر احمدیوں کے پیچھے نمازیں پڑھ لیں گے۔ اُن سے رشتہ داری تعلقات قائم کرلیں گے اور اس میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے حالانکہ خدا کی آواز صاخّہ ہوتی ہے اور جب وہ بلند ہوتی ہے تو بھائی کو اپنے بھائی سے اور رشتہ دار کو اپنے رشتہ دار سے جُدا ہونا پڑتا ہے۔

وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۹﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۴۰﴾

کچھ (لوگوں کے) چہرے اُس دن روشن ہوں گے ہنستے ہوئے خوش بخوش۔

حَلّ لُغَات۔ مُسْفِرَةٌ مُسْفِرَةٌ کے معنے ہیں مُضِیْئَةٌ مُشْرِقَةٌ۔ روشن اور چمکنے والی۔ چنانچہ اَسْفَرَ الصُّبْحُ کے معنے ہوتے ہیں اَضَاءَ وَاَشْرَقَ۔ صبح روشن ہوگئی اور اس کی سفیدی پھیل گئی۔ اور اَسْفَرَ وَجْهُهٗ کے معنے ہوتے ہیں۔ حَسُنَ وَاَشْرَقَ کہ اس کا چہرہ خوبصورت ہوگیا اور روشن ہوگیا (اقرب) پس فرماتا اُس دن کچھ چہرے ایسے ہوں گے جو بڑے خوبصورت ہوں گے۔ بڑے روشن اور چمکدار ہوں گے۔ ضَاحِكَةٌ ہنس رہے ہوں گے۔

مُسْتَبْشِرَةٌ۔ مُسْتَبْشِرَةٌ اِسْتَبْشَرَ سے ہے اور اِسْتَبْشَرَ کے معنے خوش ہونے کے بھی ہوتے ہیں اور خوشخبری حاصل کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ (لسان) پس مُسْتَبْشِرَةٌ کے معنے یہ ہیں کہ وہ بڑے خوش ہوں گے اور

انہیں بڑی خوشخبریاں مل رہی ہوں گی۔ کہ ابھی اور فتح آنے والی ہے اور غلبہ ملنے والا ہے اور نصرت نازل ہونے والی ہے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے مومن اور کافر چونکہ دو الگ الگ گروہ ہیں اس لئے ان سے ہمارا سلوک بھی الگ الگ ہوگا جو لوگ ہمارے احکام پر ایمان لائے ہیں ان کو ہم اپنے انعامات سے حصہ دیں گے اور جنہوں نے انکار کیا ہے ان کو اپنے عذاب سے حصہ دیں گے۔ چنانچہ فرماتا ہے اس دن کچھ چہرے ایسے ہوں گے جو روشن ہوں گے اور خوبصورت ہوں گے ہنس رہے ہوں گے اور خوش ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے بشارتیں حاصل کر رہے ہوں گے۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے مُسْتَبْشِرَۃٌ دو معنے رکھتا ہے خوش ہونے کے بھی اور خوشخبری حاصل کرنے والے کے بھی۔ تو مومنوں کو ہر دو امور حاصل ہوں گے۔

وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَىٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۱﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۲﴾

اور کچھ (لوگوں کے) چہرے اُس دن ایسے ہوں گے کہ اُن پر غبار اُڑ رہی ہوگی۔ اُن پر سیاہی چھا رہی ہوگی

حَلّ لُغَات۔غَبَرَۃٌ غَبَرَۃٌ کے معنے ہیں اَلْغُبَارُ یعنی غبار۔ (اقرب)

تَرْهَقُ تَرْهَقُ رَهِقَ سے ہے اور رَهِقَ کے معنے ہوتے ہیں غَشِيَهٗ وَلَحِقَهٗ۔ اس کو جا پکڑا یا جا لیا۔ (اقرب) پس تَرْهَقُهَا قَتَرَۃٌ کے یہ معنے ہوئے قترہ ان کو پکڑ لے گی یا قترہ اُن سے جا ملے گی اور قَتَرَۃٌ کے معنے ہوتے ہیں اَلْغَبَرَۃُ غبار اس کی جمع قَتَرٌ آتی ہے۔ (اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے جس دن یہ افتراق پیدا ہو جائے گا کفر اور اسلام میں ایک بیّن امتیاز قائم ہو جائے گا۔ خدا تعالیٰ کا صور آسمان سے پھونکا جائے گا اور مومن ایک طرف ہو جائیں گے اور کافر دوسری طرف۔ کچھ لوگ ایمان کے باغ پر لٹّو ہو رہے ہوں گے اور کچھ لوگ کُفر کے گھاس پر مُنہ مار رہے ہوں گے اور اونٹ اور بکریاں درختوں کی طرف چلی جائیں گی اور انسان انگوروں اور کھجوروں کی طرف چلے جائیں گے یہ مضمون ہے جو اللہ تعالیٰ نے اِن آیات میں بیان کیا ہے۔ فرماتا ہے اُس دن کچھ چہرے ایسے ہوں گے جن پر غبار پڑا ہوا ہوگا۔ مطلب یہ ہوا کہ پہلے دن اُن کے منہ پر مٹی لگے گی اور پھر اُن کے سارے جسم کو ڈھانپ لے گی۔ جانور کو جب ذبح کرنے کے لئے لٹایا جاتا ہے تو پہلے اُس کے منہ کو مٹی لگتی ہے لیکن جب اُسے ذبح کیا جاتا ہے تو وہ تڑپتا ہے اور اس تڑپنے کی وجہ سے اُس

کے سارے جسم پر مٹی لگ جاتی ہے۔ اسی طرف اِن آیات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کو ذبح کرنے کے لئے پہلے ہم زمین پر لٹائیں گے جس سے اُن کے منہ پر مٹی لگے گی مگر جب انہیں ذبح کیا جائے گا اور یہ تڑپنا شروع کریں گے۔ تو پھر اُن کا سارا جسم مٹی سے ڈھانپا جائے گا گویا کفار کی کامل تباہی کی خبر دی گئی ہے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾ ع

یہی وہ (لوگ) ہوں گے جو کافر اور بدکار ہیں۔

حَلّ لُغَات۔ **كَفَرَةٌ** اَلْكَفَرَةُ كَافِرٌ کی جمع ہے جو كَفَرَ سے اسم فاعل ہے اور كَفَرَ کے معنے ہیں ضِدُّ اٰمَنَ وہ والا ایمان نہ لایا اور جب كَفَرَ نِعْمَةَ اللهِ کہیں تو معنے ہوں گے جَحَدَهَا وَسَتَرَهَا یعنی خدا کی نعمت کی ناقدری و ناشکری کی اور اس کا انکار کیا۔ اور جب كَفَرَ الشَّيْءَ کہیں تو معنے ہوں گے سَتَرَهَا کسی چیز کو چھپا دیا (اقرب) پس كَافِر کے معنے ہوں گے (۱) ایمان نہ لانے والے (۲) اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کرنے والے (۳) کسی بات کو چھپانے والا۔ اقرب کا مصنّف لکھتا ہے کہ كَفَرَةٌ عربی زبان میں عمومًا ان لوگوں کے لئے بولتے ہیں جو خدا کی نعمتوں کی ناقدری کریں۔ (اقرب)

اَلْفَجَرَةُ اَلْفَجَرَةُ اَلْفَاجِرُ کی جمع ہے جو فَجَرَ (يَفْجُرُ) سے اسم فاعل ہے۔ فَجَرَ الرَّجُلُ (فُجُوْرًا) کے معنے ہیں اِنْبَعَثَ فِي الْمَعَاصِيْ وَزَنٰى وَفَسَقَ۔ وہ گناہوں کے ارتکاب میں لگ گیا حتیٰ کے کھلی کھلی بے حیائی کے کام کرنے شروع کر دئے۔ اور جب فَجَرَ الْحَالِفُ کہیں تو معنے ہوں گے كَذِبَ قسم کھانے والے نے جھوٹی قسم کھائی۔ نیز کہتے ہیں فَجَرَ فُلَانًا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ كَذَّبَهٗ وَعَصَاهُ وَخَالَفَهٗ یعنی فلاں شخص کو جھٹلایا اور اس کی مخالفت کی اور اس کے خلاف کہا۔ اور جب فَجَرَ اَمْرُ الْقَوْمِ کا فقرہ کہیں تو معنے ہوں گے فَسَدَ قوم کا معاملہ خراب ہو گیا۔ اور جب فَجَرَ فُلَانٌ عَنِ الْحَقِّ کہیں تو معنے ہوں گے عَدَلَ عَنْهُ۔ حق بات سے پھر گیا (اقرب) پس اَلْفَجَرَةُ کے معنے ہوں گے (۱) حق بات سے پھرنے والا (۲) جھوٹی قسمیں کھانے والے (۳) نافرمان اور خدا کے احکام کو جھٹلانے والے (۴) بے حیائی کے کام کرنے والے (۵) ایسے لوگ جن کا معاملہ خراب ہو چکا ہو۔

تفسیر ۔ یہ سمجھ لو کہ یہ تباہ ہونے والے لوگ ہی کافر اور فاجر ہیں گویا واقعہ تمہیں خود بخود بتا دے گا کہ کون لوگ ایمان لانے والے ہیں اور کون لوگ کفر اور فسق و فجور میں ترقی کرنے والے ہیں۔ اب تم لوگوں کو دیکھ کر یہ نہیں

کہہ سکتے کہ مکّہ میں سے کون سے لوگ ایمان لائیں گے اور کون سے لوگ انکار کریں گے مگر جس وقت اسلام کا باغ لگا آدمی اس طرف بھاگ پڑیں گے جس طرح انگور اور کھجور اور دانے اور زیتون اور میوے وغیرہ ہیں۔ اور جانور اُس طرف بھاگ پڑیں گے جس طرف کیکر کے درخت کھڑے ہیں۔ جو لوگ انگور اور کھجور وغیرہ کی طرف جائیں تم سمجھ لو کہ وہ آدمی ہیں جو کیکر کے درختوں یا چارہ وغیرہ پر مُنہ مارنے کے لئے دوڑ پڑیں اُن کے متعلق تم یہ یقین کر لو کہ وہ بھیڑیں اور بکریاں ہیں۔ ایک دن آئے گا جب ان کو ذبح کر دیا جائے گا۔ اور مسلمان اُن پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔

سُوْرَۃُ التَّکْوِیْرِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ تکویر۔ یہ سورۃ مکّی ہے۔

وَھِیَ تِسْعٌ وَّ عِشْرُوْنَ اٰیَۃً دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَفِیْھَا رُکُوْعٌ وَّاحِدٌ

اوراس کی بسم اللہ کے علاوہ اُنتیس آیات ہیں اورایک رکوع ہے۔

سورۃ تکویر مکی ہے سورۃ التکویر مکّی ہے۔ ۶ نبوی قبل از ہجرت یا اس سے کچھ پہلے کی معلوم ہوتی ہے۔

سورۃ تکویر میں قیامت کا ذکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سورۃ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ کَاَنَّہٗ رَأْیُ عَیْنٍ فَلْیَقْرَأْ اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ وَاِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ اَخْرَجَہٗ اَحْمَدُ وَالتِّرْمَذِیُّ وَحَسَّنَہٗ وَالْحَاکِمُ وَصَحَّحَہٗ (تفسیر روح المعانی سورۃ التکویر ابتدائیہ) یعنی ابن عمرؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جو قیامت کو اس طرح معلوم کرنا چاہے جس طرح آنکھوں دیکھی چیز اُسے اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ وَ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ۔ سے شروع ہونے والی سورتیں پڑھنی چاہئیں۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے اور مسند احمد بن حنبل میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس سورۃ میں ایک یوم القیامۃ کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ ایسا تفصیلی ہے کہ یوم القیامۃ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ اس سے مراد وہ یوم القیامۃ ہے جو تمام بنی نوع انسان کے مرنے کے بعد آئے گا یا کوئی اور ہے۔

قیامت سے مراد بعثت انبیاء سو اس بارہ میں یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم میں قیامت کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہے۔ مرنے کے بعد جب سب لوگ زندہ کئے جائیں گے اس کے لئے بھی قیامت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ نبی کی بعثت کے لئے بھی قیامت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ نبی کے دشمنوں کی تباہی کے لئے بھی قیامت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور نبی پر ایمان لانے والوں کی ترقی کے لئے بھی قیامت کا لفظ استعمال ہوتا ہے نبی کی بعثت بھی قیامت ہے کیونکہ وہ موجب ہوتی ہے ہر ایک چیز کے اُبھر آنے کا۔ نبی جب ظاہر ہوتا ہے تو نیکی کی طاقتیں بھی اُبھر آتی ہیں اور بدی کی طاقتیں بھی اُبھر آتی ہیں اس لئے وہ بھی ایک قیامت ہوتا ہے کیونکہ اُس کے آنے پر دنیا میں ایک حشر برپا

ہو جاتا ہے اور قلوب کی مخفی طاقتیں ظاہر ہو جاتی ہیں چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ابوبکر کے ابوبکرؓ بننے کا اور ابوجہل کے ابوجہل بننے کا موجب ہوئے ورنہ ابوجہل تو پہلے ابوالحکم کہلاتا تھا جب اُس کو وہ روحانی وجود نظر آیا جس کے ظاہر ہونے میں اُس نے اپنی طاغوتی طاقتوں کی موت دیکھی تو یکدم اس نے اپنی طاغوتی قوتوں کو بڑھا دیا تا کہ وہ اس نورانی وجود کو دنیا سے مٹا دے تب اس کی وہ شکل ظاہر ہوئی جس سے آج ہم سب نفرت کرتے ہیں اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہ آئے ہوتے اور لوگ ابوالحکم سے ملتے تو شاید تاریخوں میں وہ یہ ذکر کرتے کہ ابوالحکم عرب کا ایک شریف اور با اخلاق رئیس تھا۔لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غالب نورانی وجود کو دیکھ کر اس کی طاغوتی قوتیں جوش میں آ گئیں اور اس کا اندرونی گند دنیا پر ظاہر ہو گیا۔اسی طرح اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ آئے ہوتے اور لوگ حضرت ابوبکرؓ سے ملتے تو وہ تاریخوں میں ذکر کرتے کہ ابوبکر عرب کا ایک شریف، اچھا اور دیانتدار تاجر تھا۔لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے نتیجہ میں ابوبکر کا حُسن اس رنگ میں ظاہر ہوا کہ آج تک سب دُنیا اُس کی تعریف پر مجبور ہے۔پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے ہی ابوبکر ابوبکرؓ بنا اور ابوجہل ابوجہل بنا۔موجودہ زمانہ میں ہی دیکھ لو مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مخالفت نہ کرتے یا مولوی ثناء اللہ صاحب مخالفت نہ کرتے اور ہمیں اُن کا تاریخوں میں ذکر کرنا پڑتا تو ہم کہتے کہ یہ اپنی قوم کے بڑے عالم تھے۔صداقت سے ان کی اندرونی دشمنی کبھی ظاہر نہ ہوتی مگر اب ان کی تحریروں کو پڑھ کر یوں پتہ لگتا ہے کہ سچ کو دیکھ کر اُن کا دل چاہتا ہے کہ اُسے بالکل ملیا میٹ کر دیں۔یہ انقلاب صرف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے ہوا ورنہ اُن کی یہ طاقت اُبھرنی نہ تھی یا حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کو اگر ہم حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بغیر ملتے تو ہم یہی کہتے کہ آپ ایک بڑے عالم تھے۔طبیب تھے اور غریب پروری کا مادہ اپنے اندر رکھنے والے تھے اس سے زیادہ ہمیں اُن کی نیکی نظر نہ آتی۔

الغرض نبی کی بعثت بھی ایک قیامت ہی ہے پھر وہ گھڑی بھی ایک قیامت ہوتی ہے جب نبی کی بعثت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے دشمنوں کو تباہ کرتا ہے کیونکہ قیامت بمعنی موت بھی آتی ہے۔خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ (مجمع بحار الانوار زیر لفظ قیامة و تشیید المبانی حدیث نمبر ۲۷۶) جو مر جاتا ہے اس کی قیامت اُسی وقت آ جاتی ہے۔اگر ایک شخص کی موت کو قیامت کہہ سکتے ہیں۔تو قوم کی موت اور تباہی قیامت کہلانے کی زیادہ مستحق ہے۔

قرآن اور حدیث میں لفظ قیامت کے تین استعمال علّامہ شیخ محمد طاہر سندھی مصنّف مجمع بحار الانوار لفظ

قیامت کے نیچے لکھتے ہیں وَقَدْ وَرَدَ فِی الْکِتٰبِ وَالسُّنَّۃِ عَلٰی ثَلَاثَۃِ اَقْسَامٍ اَلْقِیَامَۃُ الْکُبْرٰی وَالْبَعْثُ لِلْجَزَاءِ وَالْوُسْطٰی وَھِیَ اِنْقِرَاضُ الْقَرْنِ وَالصُّغْرٰی وَھُوَ مَوْتُ الْاِنْسَانِ یعنی قرآن کریم اور حدیث سے قیامۃ کے تین استعمال ثابت ہیں۔ قیامت کبریٰ جو جزاء سزاء کے لئے بعثِ ثانیہ کے مفہوم میں استعمال ہوتی ہے اور قیامت وسطٰی جس سے مراد پہلی صدی کا خاتمہ ہے یعنی جب مسلمانوں میں تنزّل کے آثار ظاہر ہوں گے اور صغریٰ یعنی موت انسانی۔

قرآن کریم سے اسی امر کی تصدیق ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ روشنی لفظ قیامت اور ساعۃ پر پڑتی ہے (یہ دونوں لفظ ہم معنی استعمال ہوتے ہیں) چنانچہ قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ قیامت (۱) نبی کی قوم کی ترقی (۲) دشمنوں کے تنزّل (۳) اور نبی کی قوم کے زمانۂ ترقی کے بعد تنزّل کے دَور پر بولا جاتا ہے۔ پہلے معنوں کے مطابق قرآن کریم میں سورۂ قمر کی یہ آیت ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (القمر:۲) ساعت یعنی قیامت قریب ہی آ گئی ہے اور چاند پھٹ گیا ہے عام طور پر مسلمانوں میں شق قمر کے معجزہ کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ اس میں شق قمر کے معجزہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے حالانکہ اس آیت میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے معلوم ہو کہ صرف اسی معجزہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ اس آیت میں شق قمر کے مضمون کو ضمنی امر کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور اقتراب ساعۃ کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں قیامت سے مراد کفار کی تباہی پس شق قمر کے کوئی بھی معنے لو خواہ عرب کی حکومت کے زوال کے یا اس معجزہ کے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور کافروں کو اس طرح دکھایا کہ انہیں چاند پھٹتا ہوا نظر آیا بہرحال یہ امر ثابت ہے کہ قرآن کریم اس انشقاق قمر کو اس امر کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے کہ اب قیامت کو آیا سمجھو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وہ قیامتِ کبریٰ جس وقت تمام عالم مرکر دوبارہ اُٹھے گا اب تک کہ اس نشان پر تقریباً تیرہ سو ستر سال گزر چکے ہیں ظاہر نہیں ہوئی اور جبکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت میں مسیح اور مہدی ظاہر ہونے والے ہیں اور ان کے ذریعہ سے اسلام پھر ترقی کرنے والا ہے اگر ان کا زمانہ اور اُن کے بعد کا زمانہ عام مسلمان (کیونکہ ہمارے نزدیک وہ ظاہر ہو چکے ہیں) سات سو سال کا بھی تسلیم کر لیں تو قیامت دو ہزار سال بعد آئے گی ان حالات میں کفار کو اقتراب ساعۃ سے ڈرانے کے کوئی بھی تو معنے نہیں رہتے اور یہ ایک تمسخر ہو جاتا ہے جو قرآن کریم کی شان سے بعید ہے کہ وہ کفّارِ مکہ کو ڈراتا ہے کہ اے کفارِ مکّہ! تم تباہ ہو جاؤ گے اور اسلام غلبہ پالے گا پھر وہ زوال پذیر ہوگا اور اس کے زوال پر صدیاں گزرنے پر ایک مسیح ظاہر ہوگا اور وہ دنیا پر غالب آ کر

اسلام کو غالب کرے گا اور پھر ایک لمبے عرصۂ ترقی کے بعد کفر ترقی کرے گا اور اس وقت دنیا تباہ ہو جائے گی اور ہم تم کو اے کفار جن کا نام و نشان مٹے ہوئے اس وقت تک دو ہزار سال ہو چکے ہوں گے اس دن سے ڈراتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ اب سے صرف دو ہزار سال کے بعد آنے والا ہے کوئی عقلمند آدمی بھی لوگوں کے سامنے ایسی بات پیش کر سکتا ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف جو سب عالموں سے اعلم ہے وہ بات کیوں منسوب کی جاتی ہے جسے خود انسان اپنی نسبت منسوب کیا جانا پسند نہیں کرتا۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اس اقتراب ساعۃ سے مراد اسلام کا غلبہ ہے اور جیسا کہ عرب کے محاورہ سے ظاہر ہے قمر کے معنے عرب کی حکومت یا عرب کے سردار کے ہوتے ہیں (شرح زرقانی علی موطا امام مالک کتاب الجنائز باب ما جاء فی دفن المیت، السیرۃ النبویۃ لابن ھشام امر صفیۃ ام المومنین)۔ پس اللہ تعالیٰ نے پہلے کفار اور مسلمانوں کو انشقاقِ قمر کا معجزہ دکھایا پھر قرآن کریم میں اس معجزہ کی تفسیر بیان فرما دی اور فرمایا کہ تم لوگ انشقاق قمر کا معجزہ دیکھ چکے ہو وہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ عربوں کی حکومت (یعنی کفار عربوں کی حکومت) اب تباہ ہونے والی ہے اور اسلام کی ترقی کا وقت جو دشمنانِ اسلام کے لئے ایک قیامت کا نظارہ پیش کرے گا نزدیک آ گیا ہے اور اس آیت میں ساعت یا قیامت سے مراد اسلام کی ترقی کا دَور ہے نہ کچھ اَور۔ اسی طرح سورۂ ممتحنہ میں بعض مسلمانوں کا ذکر کر کے کہ وہ بعض دفعہ مسلمانوں کی خبریں کفار کو بھجوا دیتے ہیں اور یہ بُرا فعل ہے فرماتا ہے اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ۔ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ ۛۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۛۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (الممتحنۃ: ۳، ۴) یعنی یہ کفار تو تمہارے پکّے دشمن ہیں اگر تم کو پکڑنے کا موقعہ ملے کوئی موقعہ دشمنی کا جانے نہ دیں اور اپنے ہاتھ تمہاری طرف سزا کے لئے بڑھائیں اور اسی طرح زبان درازی سے نہ چوکیں اور ان کا تو دل یہی چاہتا ہے کہ تم کافر ہو جاؤ۔ لیکن یاد رکھو کہ خواہ یہ لوگ تمہارے عزیز ہوں یا اولاد یہ تم کو قیامت کے دن نفع نہ دیں گے اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان اس دن امتیاز قائم کر دے گا اور اللہ تعالیٰ اُسے جو تم کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔ اس آیت میں یوم قیامت سے مراد وہی فیصلہ کا دن ہوا جو اس دنیا میں فتح مکہ اور بعد کے زمانہ میں ظاہر ہوا اور جس نے کافر و مومن کو الگ الگ کر دیا۔ قومی ترقی میں کفار کوئی مدد نہ کر سکے حتی کہ غزوہ حنین میں بجائے فائدہ پہنچانے کے کفار مسلمانوں کے بھاگنے کا موجب ہوئے اور جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عباسؓ نے آواز دی کہ اے انصار! اے بیعتِ رضوان کرنے والو! خدا کا رسول تُم کو بلاتا ہے تو انصار غیر معمولی قربانی کر کے لوٹے اور مسلمانوں کی شکست فتح سے بدل گئی لیکن کفار نے جا کر مکہ ہی میں دم لیا (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام زیر عنوان غزوۃ حنین فی سنۃ ثمان بعد الفتح)۔ پس اس

آیت کا مضمون جب پوری طرح اس دنیا میں پورا ہوا ہے بغیر کسی تاویل یا توجیہہ کے۔ تو اس کو مرنے کے بعد کے زمانہ پر لگانا کوئی معنے نہیں رکھتا۔

اسی طرح سورۂ بقرہ میں فرماتا ہے زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (البقرۃ: ۲۱۳) اس آیت میں بھی يَوْمَ الْقِيامة فتح مکّہ وغیرہ قسم کے واقعات کی نسبت استعمال ہوا ہے۔ یہاں فرمایا گیا ہے کہ کافر ورلی زندگی کو اچھا سمجھتے ہیں یعنی موجودہ وقت کی طاقت پر گھمنڈ رکھتے ہیں حالانکہ انجام مسلمانوں کا اچھا ہوگا اور قیامت کے دن مسلمان کافروں پر غالب ہوں گے اور انہیں بے حساب رزق ملے گا۔ یہ واقعہ اسی دنیا میں فتح مکّہ اور بعد کے واقعات سے پورا ہوا۔ اگر یہ معنے کرو کہ مسلمان مرنے کے بعد قیامت کے دن کافروں پر غالب ہوں گے تو اول تو یہ دلیل و برہان نہیں رہتی کیونکہ مرنے کے بعد کے واقعہ کو حجت کے طور پر پیش کرنا ایک بے فائدہ امر ہے اس سے کون شخص ایمان حاصل کرسکتا ہے؟ مرنے کے بعد تو ایمان کا نفع ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے اس صورت میں آیت قرآنی کا یہ مطلب ہوگا کہ مسلمانوں کو غلبہ اس دنیا میں نہ ملے گا مرنے کے بعد ملے گا اور یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ مسلمانوں کو فتح مکّہ اور بعد کی جنگوں سے اسی دنیا میں غلبہ ملا۔ اگر کہا جائے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بغیر حساب رزق دینے کا ذکر کیا ہے اور یہ بعد از موت زندگی میں ہی ممکن ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بغیر حساب کے دو معنے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ عمل کی نسبت زیادہ ملنا گویا عمل کے حساب سے جس قدر ملنا چاہیے تھا اس سے زیادہ مل گیا۔ دوسرے معنے اس کے یہ ہوتے ہیں کہ جس کو رزق ملے گا وہ اُسے نہایت اچھی طرح خرچ کرے گا اور اُسے اس کا حساب نہ دینا ہوگا۔ حساب اُسی وقت دیا جاتا ہے کہ جب فرض کو صحیح طور پر بجا نہ لایا جائے۔ چنانچہ احادیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس سے حساب لیا گیا تباہ ہوا۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا۔ کہ مومنوں کا بھی حساب ہوگا اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حساب سے مراد یہ ہے کہ پوری طرح حساب لیا جائے ورنہ مومن کا حساب تو یوں ہی سرسری ہے اور نہ ہونے کے برابر ہے (بخاری کتاب الرقاق باب من نوقش الحساب عذّب) پس بغیر حساب کے ایک معنے یہ ہیں کہ مومنوں کو جو ملے گا وہ اُسے نیک طور پر خرچ کریں گے اور اس طرح حساب کی زحمت سے بچ جائیں گے اور یہ دونوں معنے مسلمانوں کی زندگی میں ہی پورے ہو گئے مرنے کے بعد کی قیامت کا انہیں انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جو کچھ مسلمانوں کو ملا بِلا حساب ملا۔ اُن کی قربانیاں بے شک بہت تھیں مگر خدا تعالیٰ کی طرف سے جو اجر انہیں ملا وہ ان کی قربانیوں سے بہت زیادہ

تھا۔ اونٹ اور بکریاں چرانے والے ساری دنیا کے بادشاہ ہو گئے اور مقہور اور مغلوب قوم زبردست بادشاہتوں کی مالک ہو گئی۔ اسی طرح دوسرے معنوں کے رُو سے بھی انہیں بغیر حساب ملا یعنی وہ ایسے تقویٰ کے مالک ہوئے کہ آج تک اُن کی نیکی کی دنیا تعریف کر رہی ہے۔ انہوں نے بہت کچھ کمایا لیکن گنوایا نہیں۔ اُسے اس طرح خرچ کیا کہ اس دنیا میں نیکی اور اگلے جہان میں ثواب کا موجب ہوا (اس بارہ میں دیکھو سورۂ نور آیت ۳۸ و سورۂ ص آیت ۴۹ و سورۂ زمر آیت ۱۰) خلاصہ یہ کہ آیت مذکورہ بالا میں جس یومِ قیامت کا ذکر ہے اس سے مراد غلبۂ اسلام ہے کیونکہ اسی موقعہ پر مسلمانوں کو کفار پر فوقیت حاصل ہو چکی تھی اور بغیر حساب رزق بھی مل گیا تھا۔ اسی طرح سورۃ قیامۃ میں دو قیامتوں کا ذکر ہے ایک اس دنیا کی اور ایک آخرۃ کی چنانچہ ایک قیامت کا یوں ذکر ہے فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَ خَسَفَ الْقَمَرُ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (القیامۃ: ۸ تا ۱۰) یعنی اس وقت چاند گرہن لگے گا اور اس کے بعد سورج گرہن لگے گا اور گرہن مرنے والی قیامت کی علامت نہیں بلکہ مہدی مسعود کی علامت احادیث سے ثابت ہے پس ان آیات میں جس قیامت کا ذکر کیا ہے وہ آخری زمانہ میں اسلام کے احیاء کی قیامت ہے نہ مرنے کے بعد اُٹھنے والی۔ اِن آیات کے سوا متعدد جگہ قرآن کریم میں قیامت اور ساعۃ سے مراد اس دنیا کے کسی عظیم الشان انقلاب کو مراد لیا گیا ہے اور آیات زیر تفسیر میں بھی جس قیامت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (جیسا کہ اگلے مضامین سے ثابت ہوگا) اس سے مراد اس دنیا کی قیامت ہے جبکہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مرنے کے بعد پھر زندہ کرے گا اور اسلام مٹ کر پھر تازہ ہوگا اور اس زمانہ کی علامات اس اور اس سے بعد کی سورۃ میں بیان کی گئی ہیں۔

احادیث میں قیامت سے مراد انقلاب دنیا جیسا کہ قرآن کریم کے محاورہ میں قیامت سے مراد اس دنیا کا انقلاب بھی لیا گیا ہے۔ احادیث نبی کریمؐ میں بھی قیامت اور ساعۃ ان معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں چنانچہ بخاری کتاب الایمان باب سوال جبریل عن علم الساعۃ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت جبریل انسانی شکل میں متمثل ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ کے صحابہ کو بھی نظر آئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مَتَی السَّاعَۃُ قیامت کب آنے والی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْھَا اَعْلَمُ مِنَ السَّائِلِ وَ سَاُخْبِرُكَ عَنْ اَشْرَاطِھَا اِذَا وَلَدَتِ الْاَمَۃُ رَبَّھَا وَاِذَا تَطَاوَلَ رُعَاۃُ الْاِبِلِ الْبُھْمِ فِی الْبُنْیَانِ یعنی اس بارہ میں سائل سے زیادہ مجھے علم نہیں ہاں میں اُس کی علامات بتا دیتا ہوں۔ اس کی علامات یہ ہیں کہ لونڈی اپنے مالک کو جنے گی اور اونٹوں کے چرانے والے اونچے اونچے مکان بنائیں گے چنانچہ یہ بنو عباس کی ترقی کے زمانہ میں ہوا۔ اکثر بادشاہوں نے لونڈیوں کو گھر میں ڈالا اور ان کی اولاد بادشاہ ہوئی اور ان کے رشتہ داروں کے ذریعہ سے

عرب حکومت تباہ ہوگئی۔ اسی طرح اس زمانہ میں بجائے محنت اور قربانی اور سفروں کے عرب لوگوں نے شہری زندگی اختیا کرلی اور بڑی بڑی عمارتیں بنانے میں مشغول ہوگئے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک مجلس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم باتیں کررہے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے ساعت کے بارہ میں سوال کیا آپ بات کرتے رہے اور اُس کی بات کا جواب نہ دیا جب پہلی بات ختم کر چکے تو فرمایا ساعت کے بارہ میں سوال کرنے والا کہاں ہے۔ سوال کرنے والے نے کہا کہ میں حاضر ہوں اس پر آپ نے فرمایا فَإِذَا ضُيِّعَتِ الْأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ یعنی جب امانت میں کمی آجائے گی اُس وقت سے قیامت کا انتظار کرو۔ اِس پر اُس شخص نے کہا فَكَيْفَ إِضَاعَتُهَا؟ یارسول اللہ امانت کس طرح ضائع ہوگی اس پر آپ نے فرمایا إِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ (بخاری کتاب العلم باب من سئل علمًا وھو مشغولٌ فی حدیثہٖ) یعنی امانت سے مراد امانتِ حکومت ہے پس جب حکومت نااہل لوگوں کے سپرد کی جائے گی اس وقت سے قیامت کے منتظر ہو جاؤ۔ اس جگہ قیامت سے مراد مسلمانوں کی تباہی اور تنزّل کا وقت ہے۔

اسی طرح بخاری میں آتا ہے إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يُّرْفَعَ الْعِلْمُ وَيَثْبُتَ الْجَهْلُ وَيُشْرَبَ الْخَمْرُ وَيَظْهَرَ الزِّنَا (بخاری کتاب العلم باب رفع العلم و ظهور الجهل) یعنی قیامت کی علامات میں سے یہ علامات ہیں کہ علم اُٹھ جائے گا اور جہالت قائم ہو جائے گی اور شراب پی جائے گی اور زنا علی الاعلان کیا جائے گا یعنی کنچنیوں کا طریق رائج ہو جائے گا اور لوگ اپنی زنا کاریوں کا مجالس میں فخر سے ذکر کریں گے۔ اِس حدیث میں قیامت سے مراد اسلام کا تنزّل ہے۔

اسی طرح بخاری کی حدیث ہے لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقْبَضَ الْعِلْمُ وَتَكْثُرَ الزَّلَازِلُ وَيَتَقَارَبَ الزَّمَانُ وَتَظْهَرَ الْفِتَنُ وَيَكْثُرَ الْهَرَجُ وَهُوَ الْقَتْلُ وَحَتّٰى يَكْثُرَ فِيْكُمُ الْمَالُ فَيَفِيْضُ (بخاری کتاب الاستسقاء باب ماقیلَ فی الزلازل و الآیات) یعنی قیامت اُس وقت تک نہ آئے گی جب تک علم مٹ نہ جائے اور زلازل کثرت سے نہ آئیں اور علمِ تاریخ ترقی نہ کر جائے اور کثرت سے فتن ظاہر نہ ہوں اور قتل کا رواج ترقی نہ کر جائے اور مال کی اس قدر زیادتی نہ ہو جائے کہ لوگ مسرف ہو جائیں۔ یہ حدیث بھی مسلمانوں کے تنزّل کو قیامت کا نام دیتی ہے۔

اسی طرح بخاری میں حدیث ہے لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُقَاتِلُوْا قَوْمًا نِعَالُهُمُ الشَّعْرُ - وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُقَاتِلُوْا قَوْمًا كَأَنَّ وُجُوْهُهُمُ الْمَجَانُ الْمُطْرَقَةُ (بخاری کتاب الجهاد باب قتال الذین ینتعلون

الشعر) یعنی قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک کہ تم اس قوم سے جنگ نہ کرو کہ ان کی جوتیاں بالوں والی ہوں گی۔ اور ان کے منہ ڈھالوں کی طرح چپٹے ہوں گے یہ ترکوں کے حملوں کی طرف اشارہ ہے اور مراد یہ ہے کہ اسلامی تنزّل کا زمانہ ترکوں کے حملوں سے شروع ہوگا۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ کَهَاتَيْنِ يَعْنِي اِصْبَعَيْنِ (بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی بعثت اَنَا وَ السَّاعَةُ کَهَاتَيْنِ) یعنی آپ نے اپنی دو انگلیوں کو جوڑ کر دکھایا اور فرمایا میرا اور قیامت کا زمانہ اسی طرح ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ پر تو تیرہ سو سال ہو گئے اور اب تک قیامت نہیں آئی۔ پس اس جگہ قیامت کے معنے کچھ اور ہیں اور وہ معنے اسلام کی ترقی کے ہیں اور آپ کا ارشاد یہ ہے کہ بعض نبی ایسے آئے ہیں کہ اُن کی قوم نے اُن کے مرنے کے بہت بعد جا کر ترقی کی ہے مگر مجھ سے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ میرے زمانہ میں ہی اسلام کی ترقی ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اسی طرح ترمذی میں ہے اِقْتِرَابُ السَّاعَةِ هَلَاكُ الْعَرَبِ (جامع الترمذی کتاب المناقب باب فضل العرب) یعنی قیامت کے قریب آنے کے ایک معنے عربوں کی ہلاکت کے ہیں چنانچہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ کے میں نے یہی معنے کئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم اور احادیث میں لفظِ قیامت کے معنے قیامتِ کُبریٰ کے بھی ہیں یعنی اس قیامت کے جو تمام انسانوں کی ہلاکت سے یا اُن کے دوبارہ اُٹھنے سے ظاہر ہوگی اور اس کے معنے کسی قومی ترقی کے بھی ہیں اور کسی قوم کے تنزّل کے بھی اور کسی فرد کی موت کے بھی۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ جو شخص یوم القیامۃ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہے وہ ان سورتوں کو پڑھ لے اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہو سکتا کہ ان سورتوں میں صرف اسی قیامت کا ذکر ہے جو مرنے کے بعد آنے والی ہے اگر قرآن قیامت کے کئی معنے لے سکتا ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس لفظ کو اس کے متعدد معانی میں استعمال فرما سکتے ہیں بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس قیامت کا اِن سورتوں میں ذکر آتا ہے اس قیامت کا ایک تفصیلی نقشہ ان میں کھینچ دیا گیا ہے۔ ایسا تفصیلی کہ اس کو دیکھنے کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے گویا یوم القیامۃ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے چنانچہ بعد میں اس سورۃ کی جو تفصیل کی جائے گی اس سے معلوم ہوگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل درست ہے۔

سورۂ تکویر کا سورۂ عبس اور پہلی سورتوں سے تعلق اس سورۃ کا تعلق پہلی سورۃ بلکہ پہلی سورتوں سے یہ ہے

کہ ان سورتوں میں غلبۂ اسلام اور قیامتِ کُبریٰ کا ذکر تھا اور اسلام کا غلبہ کم سے کم دو دفعہ مقدر تھا جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دو دفعہ مقدر تھی پس وہ قیامت جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ قائم ہوئی تھی اس کے دو بڑے مظہر تھے جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے اور سورۂ جمعہ میں اس کا ذکر آتا ہے پس ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ قیامت آئی تھی اور ایک دفعہ تیرہ سو سال کے بعد یعنی آپ کے دَورِ اوّل پر ایک ہزار سال تنزّل کا زمانہ گزر جانے کے بعد آنی مقدّر تھی۔

مصلح موعود کی پیشگوئی قرآنی آیت کی مصدق قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اسلام پر تنزّل کا بھی ایک دَور آنے والا تھا جیسا کہ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (السجدة:٦) سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ امر اسلام کو آسمان سے زمین پر نازل فرمائے گا پھر ایک ہزار سال کے عرصہ میں وہ واپس اللہ تعالیٰ کی طرف چلا جائے گا چونکہ احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ترقی کا زمانہ تین قرن کا ہے (بخاری کتاب الرقاق باب مایحذر من زهرة الدنیا) اس لئے ہزار سال تنزّل کے مل کر تنزّل کا زمانہ ۱۳۰۰ ہجری پر ختم ہوتا ہے یا اندازاً ۱۸۸۶ء کو۔ ☆ پس جب پہلے یہ بات بتائی کہ اسلام کا غلبہ ہوگا اور پھر اس پر ایک تنزّل کا زمانہ آئے گا تو ضروری تھا کہ یہ بھی بتایا جاتا کہ اس تنزل کے بعد کیا ہوگا تا کہ مسلمان دلبرداشتہ نہ ہو جائیں اور ہمت ہار کر نہ بیٹھ جائیں۔

حدیثوں میں آتا ہے ابو یاسر بن اخطب جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا ایک مشہور یہودی عالم تھا ایک دن کچھ اور یہود سمیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا جب کہ آپ سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ پڑھ رہے تھے وہ یہ سُن کر اپنے بھائی حُیّی بن اخطب کے پاس گیا اور اُسے کہا کہ میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ پڑھتے سُنا ہے۔ وہ کہنے لگا کیا تم سچ کہتے ہو؟ اُس نے کہا ہاں۔ اس

☆ حاشیہ: ۱۸۸۶ء اس طور پر بنتا ہے کہ ۱۳۰۰ ہجری سالوں کو شمسی سالوں میں تبدیل کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت ۶۳۲ء میں ہوئی اور ۱۳۰۰ ہجری سالوں کے شمسی سال ۱۲۶۲ بنتے ہیں۔ جب ان دونوں کو ملایا جائے تو ۱۸۸۶ ہوتے ہیں یا کسروں کو نکال دیا جائے تو ۱۸۸۵ اور ۱۸۸۶ء ہی وہ سال تھا کہ جب بانی سلسلہ احمدیہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام کی فتح کا علم دیا گیا اور آپ کے ذریعے سے ایک سلسلہ کی جو اسالم کی بنیاد کو مضبوط کرنے والا ہوگا خبر دی گئی اور یہ اطلاع دی گئی کہ آپ کی نسل سے ایک ایسا لڑکا بھی پیدا ہوگا جس کے ذریعے سے اسلام کی شہرت دنیا کے کناروں تک پہنچے گی اور وہ لڑکا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق یہ راقم السطور ہی ہے جس کی خبر ۱۸۸۶ء کے شروع ہی میں دی گئی جو قرآنی پیشگوئی کی مصدق اور اس کو پورا کرنے والی ہے۔ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ لَا یُسْئَلُ عَنْهُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ۔

پر حُیّیِ کچھ اور لوگوں کو ساتھ لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور کہا کہ کیا درست ہے کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا کلام نازل ہوا ہے جس میں الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۚۛ فِيْهِ آتا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں۔ وہ کہنے لگا تو پھر ڈر کی کوئی بات نہیں اگر آپ کا غلبہ بھی ہوا تو کل اکتّر سال رہے گا کیونکہ علم ابجد کے لحاظ سے الفؔ کا ایک لامؔ کے تیس اور میم کے چالیس عدد ہیں کل ۷۱ سال ہوئے۔ یہ ۷۱ سال ہم کسی نہ کسی طرح کاٹ لیں گے اس کے بعد آپ کا غلبہ نہیں رہ سکتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے الٓمّٓصٓ بھی الہام ہوا ہے وہ کہنے لگا تو خیر ابجد کے لحاظ سے الفؔ کا ایک لامؔ کے تیس میمؔ کے چالیس اور صؔ کے نوّے کل ایک سو اکسٹھ سال ہوئے یہ مدت پہلے سے زیادہ ہے مگر خیر کوئی زیادہ لمبا عرصہ نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے الٓرٰ بھی الہام ہوا ہے کہنے لگا تو پھر دوسَو اکتیس سال بن گئے کیونکہ الفؔ کا ایک لامؔ کے تیس اور راؔء کے دوسو۔ آپ نے فرمایا اُور سُن لو مجھ پر الٓمّٓرٰ بھی الہام ہوا ہے۔ تب اس نے کہا کہ یہ تو پہلے سے بھی گراں اور لمبا عرصہ ہے۔ الفؔ کا ایک لامؔ کے تیس میمؔ کے چالیسؔ اور راؔء کے دوسَو ہوتے ہیں کل دوسَو اکہتر سال کا عرصہ ہوا۔ پھر اپنے ساتھیوں کو کہنے لگا یہاں سے چلو یہ معاملہ مشتبہ ہو گیا ہے۔ (فتح البیان زیر آیت الم ذالک الکتاب)

آنحضرت صلعم کی زبان سے اسلام کے تنزل کے بعد اس کے عروج کی پیشگوئی

تو تنزّل کی پیشگوئیوں کو سُن کر دشمن بعض دفعہ یہ خیال کر لیتا ہے کہ اگر اس مذہب پر تنزّل ایک دن آنے ہی والا ہے تو کسی طرح درمیانی زمانہ کو ہم برداشت کر لیں گے آخر وقت آئے گا کہ یہ زمانہ گزر جائے گا اور پھر ہمارے غلبہ کے ایام آ جائیں گے۔ اسی لئے نبی کبھی تباہی کی خبر پر اپنے زمانہ کو ختم نہیں کرتا بلکہ وہ ساتھ ہی یہ خبر بھی دیتا ہے کہ میرے بعد ایک اور نبی آنے والا ہے جو تنزّل کے بعد پھر ترقی اور غلبہ کا دروازہ قوم کے لئے کھول دے گا یوں تو ہمیشہ سے یہ قانون چلا آیا ہے کہ ترقی کے ساتھ ہی تنزل کا دور بھی وابستہ ہوتا ہے لیکن نبی کبھی تنزل کے زمانہ کی خبر دینے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اس کے ساتھ ہی ایک نئے دَور کی بھی بشارت دیتا ہے اور اس طرح بتاتا ہے کہ گو میں مر جاؤں گا مگر یہ سلسلہ کبھی مٹ نہیں سکتا۔ اگر درمیان میں عارضی طور پر کوئی تنزل کا زمانہ بھی آیا تو پھر کفر پر دین کے غلبہ کے ایام آ جائیں گے۔ اس طرح کفر کو اپنی ترقی سے ہمیشہ مایوس رکھا جاتا ہے اور مومنوں کے دلوں کو تسلی دی جاتی ہے کہ وہ مایوس مت ہوں بلکہ اپنی ہمت کو مضبوط رکھیں۔ اپنے ارادوں کو بلند کریں اور اپنی نگاہ کو اونچا رکھیں کہ اسلام پھر غالب آئے گا اور کفر پھر تباہی و بربادی کے گڑھے میں گرے گا۔ یہی فرق خدائی کلام اور ایک غیر کے کلام میں ہوتا ہے۔ بھلا کوئی غیر یہ طاقت رکھ سکتا ہے کہ وہ غیر متناہی ترقیات کی خبر دے سکے۔ خدا ہی ہے جو غیب کا علم رکھتا ہے اور پھر ساتھ ہی اپنے منشاء کو پورا

کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے اور اپنے پیاروں کو اس سے اطلاع دیتا رہتا ہے تاکہ وہ اور لوگوں تک ان باتوں کو پہنچا دیں اور اس طرح پیشگوئیاں اُن کے دلوں کی ڈھارس کا موجب بن جائیں۔

یوں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی تنزّل کا دَور آیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی تنزل کا دَور آیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی تنزل کا دَور آیا مگر اس تنزل کا انبیاء کی پیشگوئیوں میں ضرور ذکر ہوتا ہے تاکہ جب یہ زمانہ آئے تو اُس وقت یہ تنزل بھی نبی کی صداقت کا ثبوت بن جائے اگر تنزل بغیر کسی پیشگوئی کے آجائے تو لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک اتفاقی بات ہے لیکن اگر تنزل آنے کی پہلے سے خبر موجود ہو تو مومن کہہ سکتے ہیں کہ یہ تنزل بھی ہماری صداقت کا ثبوت ہے کیوں کہ اس تنزل کی پہلے سے پیشگوئیاں موجود ہیں۔ لیکن اگر تنزل کی ہی خبر ہو تنزل کے بعد ترقی کی خبر نہ ہو تو یہ بھی دلوں کو مایوس کرنے والی بات ہو سکتی ہے اسی لئے جہاں ایک طرف تنزل کی خبر دی جاتی ہے تاکہ جب یہ دَور آئے تو خود تنزل اپنی ذات میں انبیاء کی صداقت کا ایک ثبوت ہو وہاں تنزل کے بعد ایک ترقی کی بھی خبر دی جاتی ہے تاکہ مسلمانوں کو اطمینان رہے اور کفر اپنی دائمی سربلندی کی کبھی امید نہ رکھے۔ اگر یہ ترقی کسی نبی سے وابستہ ہو تو اس نبی کی خبر دی جاتی ہے اور اگر کسی اور شخص سے وابستہ ہو تو اس کی خبر دی جاتی ہے۔ بہرحال یہ ایک عظیم الشان گُر ہے جو دلوں کو بڑھانے اور ان کو ڈھارس دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا ہے میرا اس کے متعلق ذاتی طور پر ایک بڑا زبردست تجربہ ہے میں نے اپنی کتاب ’’دعوۃ الامیر‘‘ میں اس نکتہ کو بیان کیا ہے کہ اسلام پر آج جو مصیبت آئی ہوئی ہے اس کی خبر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں تفصیلاً موجود ہے اور جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے اس تنزل کی خبر دے چکے ہیں۔ بلکہ اس تنزّل کے بعد ایک ترقی کے دَور کی بشارت بھی آپ سُنا چکے ہیں تو مسلمانوں کے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ تنزل جتنا بڑھتا چلا جائے ہم کہیں گے کہ اس سے اسلام کی تکذیب ہونے کی بجائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ثابت ہو رہی ہے کیونکہ آپ کے کلام میں ان کا پہلے سے ذکر موجود ہے۔ قرآن کریم میں اس کی مثال بھی پائی جاتی ہے چنانچہ سورۂ احزاب میں ذکر آتا ہے کہ جب کفار کے لشکر مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے جمع ہو گئے اور منافقوں نے طعنے دینے شروع کر دئے کہ دنیا کی فتوحات کے وعدے کہاں گئے تو اس وقت مومنوں کے ایمان اور بڑھ گئے اور انہوں نے کہا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ؗ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا (الاحزاب: ۲۳) یعنی اس کی خبر تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے دے چکے تھے اس لئے ہمارے لئے خوشی کا مقام ہے کہ خدا کے منہ کی بات پوری ہوئی۔ غم اور فکر کی کون سی بات ہے۔ تو دیکھو اس وعدہ کی وجہ سے وہ ڈرے نہیں

لیکن اگر یہ وعدہ نہ ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ گھبرا جاتے۔پس وہی چیز جس کو دشمن ڈرانے کے لئے استعمال کرتا ہے اسی میں ایمان کی مضبوطی کا سامان اللہ تعالیٰ نے رکھا ہوتا ہے۔اور وہ سمجھتا ہے کہ جب خدا نے اس تنزل کی خبر دی تھی اور خدا تعالیٰ کے کلام میں یہ بات موجود تھی تو پھر میرے لئے اس میں گھبرانے کی کون سی بات ہے۔

غرض مومن کے لئے اُن ابتلاؤں میں جو خدائی پیشگوئی کے ماتحت آئیں بڑی بھاری طاقت ہوتی ہے کیونکہ ان ابتلاؤں اور ان مصیبتوں اور اُن دکھوں سے اللہ تعالیٰ کی باتیں پوری ہوتی ہیں۔اگر وہ ابتلا نہ آئیں تو وہی دشمن جو ان ابتلاؤں کو اسلام کے جھوٹا ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے جھٹ یہ کہنے لگ جائے کہ تمہارے نبی نے تو یہ یہ خبر دی تھی مگر اب تک پوری نہیں ہوئی۔لیکن جب وہ خبر پوری ہو جاتی ہے۔جب پیشگوئیوں کے مطابق ایک تنزل کا دور آ جاتا ہے تو اسی کو مذہب کے جھوٹا ہونے کا ثبوت قرار دے دیتا ہے حالانکہ یہ صداقت کا ثبوت ہوتا ہے۔یہ اس نبی کی راستبازی کا ثبوت ہوتا ہے یہ کفر کی شکست کا ثبوت ہوتا ہے کیونکہ جیسے ترقی کے متعلق خدا تعالیٰ کی بات پوری ہوئی تنزل کے بارہ میں بھی خدا تعالیٰ کی بات پوری ہوئی اور یہی ثابت کرنا مذہب کا اولین کام ہوتا ہے۔پس یہ ایک بڑا بھاری نکتہ ہے جس کو سمجھ لینے کے بعد زمانۂ تنزل میں بھی انسان کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا قدم ایک مضبوط چٹان پر قائم رہتا ہے وہ جانتا ہے کہ میرا مذہب بہر حال سچا ہے غلبہ کے ایام میں بھی وہ سچا تھا اور تنزل کے ایام میں بھی وہ سچا ہے کیونکہ اس تنزل کی وہ پہلے سے خبر دے چکا تھا۔مگر افسوس کے مسلمانوں نے اس نکتہ کو نہ سمجھا اور وہ مایوسی کا شکار ہو گئے۔میں نے اپنی کتاب دعوۃ الامیر میں اس بات کو ایک حد تک تشریح سے بیان کیا ہے اور اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ اسلام کے تنزل کی خبریں بھی اپنے اندر اسلام اور قرآن کی صداقت کا ثبوت رکھتی ہیں کیونکہ ان خبروں کا قرآن اور احادیث میں تفصیل سے ذکر آتا ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی اسلام صرف تنزل کی خبر پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس نے یہ خبر بھی دی ہوئی ہے کہ اس زمانہ میں تنزل کے بعد اسلام پھر اپنے کمال کو پہنچے گا۔پھر کُفر اپنے مُنہ کے بل گرے گا اور پھر ساری دنیا پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا غلبہ ہوگا۔پس یہ تنزل اپنے اندر ایک ترقی کی بشارت رکھتا ہے۔اور یہ تاریکی ایک سورج کے نمودار ہونے کی خبر دے رہی ہے اور جب حالت یہ ہے تو مسلمان کیوں مایوس ہیں اور کیوں وہ خدائی وعدوں کے مطابق غور نہیں کرتے کہ وہ آسمانی روشنی کہاں ظاہر ہوئی اور اس ظلمت کے پردے چاک کرنے والا سورج کس جگہ طلوع ہوا ہے۔

اسی سلسلہ میں مَیں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اس بارہ میں مجھے ایک عجیب تجربہ ہوا ہے۔سرحد کے ایک رئیس چوہدری فقیر محمد صاحب اگزکٹو انجینئر تھے وہ ایک دفعہ دہلی میں مجھے ملے اور انہوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ ہم چار بھائی

ہیں جن میں سے دو بھائی غیر احمدی ہیں اور دو بھائی احمدی ہیں۔ اپنے متعلق انہوں نے کہا کہ میں ابھی تک آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہوا۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ آپ کیوں احمدی نہیں ہوئے کیا آپ کو احمدیت کی صداقت کے متعلق کوئی شبہ ہے؟ ان کی طبیعت میں مذاق تھا وہ میرے اس سوال کے جواب میں کہنے لگے کہ مجھے تو ابھی تک احمدیت پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن بات یہ ہے کہ ہم پورا پورا انصاف کرنے کے عادی ہیں۔ روپیہ میں سے اٹھنّی ہم نے آپ کو دے دی ہے اور اٹھنّی دوسرے مسلمانوں کو دے دی ہے۔ میں نے بھی اُن سے مذاقاً کہا کہ خاں صاحب ہم تو اٹھنّی پر راضی نہیں ہوتے ہم تو پورا روپیہ لے کر چھوڑا کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگے تو پھر اپنی توجہ سے لے لیجئے۔ میں نے کہا ہماری کوشش تو یہی ہے اللہ تعالیٰ جب چاہے گا بقیہ اٹھنی بھی مل جائے گی۔ وہ اُس وقت مع اہل وعیال انگلستان کی سیر کو جا رہے تھے میری اس بات کو سُن کر انہوں نے کہا کہ خان محمد اکرم خان صاحب چارسدّہ والے میرے بھائی ہیں انہوں نے آپ کی بعض کتابیں میرے ٹرنک میں رکھ دی ہیں۔ میں نے اُن سے کہا بھی ہے کہ میں تو وہاں سیر کے لئے جا رہا ہوں ان کتابوں کے پڑھنے کا کہاں موقع ہوگا مگر وہ مانے نہیں اور زبردستی میرے ٹرنک میں انہوں نے کتابیں رکھ دی ہیں مگر اب تک مجھے پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ ولایت چلے گئے۔ ابھی تین مہینے ہی گزرے تھے کہ مجھے ایک چٹھی پہنچی۔ اس کے شروع میں ہی یہ لکھا تھا کہ میں اصل مطلب لکھنے سے پہلے آپ کی شناخت کے لئے یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ میں وہ ہوں جو آج سے تین ماہ پہلے دہلی کے شاہی قلعہ میں آپ سے ملا تھا اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ ہم نے پورا پورا انصاف کیا ہے اٹھنّی آپ کو دے دی ہے اور اٹھنّی غیر احمدیوں کو دے دی ہے جس پر آپ نے کہا تھا کہ ہم تو پورا روپیہ لے کر چھوڑا کرتے ہیں سو آپ کے حکم کے مطابق اب ایک اور چونّی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور اپنے آپ کو بیعت میں شامل کرتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے اسی مضمون کی طرف جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں اشارہ کیا اور لکھا کہ جب میں ولایت میں آیا اور میں نے مختلف مقامات کی سیر کی تو گو میں پٹھان ہوں اور مذہبی جوش میرے دل میں موجود ہے مگر کفر کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر میرا دل پژمردہ ہوتا چلا گیا اور میں نے کہا کہ اسلام اس قدر گر چکا ہے اور کفر اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ اب بظاہر اسلام کے پنپنے اور کفر کے سرنگوں ہونے کا دنیا میں کوئی امکان نہیں۔ اسلام مر چکا ہے اب اُس کے زندہ ہونے کی امید ایک واہمہ سے بڑھ کر حقیقت نہیں رکھتی۔ یہ خیالات تھے جو میرے دل پر غالب آتے چلے گئے اور اس قدر میرے دل میں مایوسی پیدا ہوئی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب اسلام دنیا پر غالب نہیں آ سکتا۔ ایک دن میرے دل پر اس خیال کا بے انتہاء اثر ہوا اور حالت مایوسی میں مَیں نے کہا آؤ ان کتب کو پڑھ کر دیکھو جو میرے بھائی نے میرے ٹرنک میں رکھ دی تھیں چنانچہ پہلے ’’اسلامی اصول کی فلاسفی‘‘ نکلی اور اُسے میں نے پڑھا اس کے

بعد آپ کی کتاب ''دعوۃ الامیر'' نکلی اور اسے میں نے پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے پڑھتے اس کتاب میں وہی ذکر آ گیا جس نے میرے دل میں انتہائی طور پر مایوسی پیدا کر دی تھی یعنی اسلام کے تنزّل اور اس کے ادبار کا اس میں ذکر تھا مگر ساتھ ہی بتایا گیا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے تنزّل کے متعلق یہ پیشگوئی کی تھی جو پوری ہو گئی۔ وہ پیشگوئی کی تھی۔ جو پوری ہو گئی۔ غرض یکے بعد دیگرے اسلامی تنزّل کے متعلق کئی پیشگوئیاں تھیں جو پڑھنے میں آئیں اور جو واقعہ میں پوری ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد آپ نے اسلام کی ترقی کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشگوئیاں پوری ہو گئیں جو اسلام کے تنزل کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں تو وہ پیشگوئیاں کیوں پوری نہیں ہوں گی جو اسلام کے دوبارہ غلبہ کے متعلق ہیں۔ میں نے جب یہ مضمون پڑھا تو میرا دل خوشی سے بھر گیا مایوسی میرے دل سے جاتی رہی۔ امید جگمگا اٹھی اور میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں اُس وقت تک سونے کے لئے اپنے بستر پر نہیں جاؤں گا جب تک آپ کو اپنی بیعت کا خط نہ لکھ لوں چنانچہ سونے سے پہلے میں یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں میری بیعت کو قبول کیا جائے۔

غرض سچی بات یہی ہے کہ جب وہ تکلیفیں اور وُہ دُکھ جو اسلام اور مسلمانوں پر آئے اُن کے متعلق یہ معلوم ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام تکالیف کی خبر پہلے سے دے چکے ہیں تو ان تکالیف میں بھی راحت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور انسان سمجھتا ہے کہ جیسے تنزل کی خبریں پوری ہو گئیں اسی طرح ایک دن اسلام کے غلبہ کی پیشگوئیاں بھی پوری ہو جائیں گی اسی طرح اگلی قیامت کا بھی ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے سے ثبوت مل جاتا ہے کیونکہ جو خدا اس جہان میں مردہ روحوں کا احیاء کر سکتا ہے وہ اگلے جہان میں کیوں نہیں کر سکتا۔ اگر اس دنیا کی روحانی موت اور اس کا احیاء پیشگوئیوں کے مطابق ہو سکتا ہے تو اگلے جہان میں بھی مُردوں کا احیاء پیشگوئیوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)۔

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ﴿۲﴾

جب (نورِ) آفتاب کو لپیٹ دیا جائے گا۔

حَلِّ لُغَات۔ کُوِّرَتۡ کُوِّرَتۡ کَوَّرَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے اور کَوَّرَ الۡعِمَامَۃَ عَلٰی رَأۡسِہٖ

کے معنے ہوتے ہیں لَفَّهَا۔ اُس نے اپنے سر پر عمامہ لپیٹا اور کَوَّرَ فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں صَرَعَهٗ اُس نے فلاں کو گرا دیا۔ اور جب کَوَّرَ الْمَتَاعَ کہیں تو معنے ہوتے ہیں جَمَعَهٗ وَشَدَّهٗ وَلَفَّهٗ عَلٰى جِهَةِ الْاِسْتِدَارَةِ اس نے اپنے مال و اسباب کو جمع کیا۔ اُسے باندھا اور اُسے اس طرح لپیٹا جس طرح گٹھڑی کو گول کر کے باندھتے ہیں (اقرب) اس لحاظ سے اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے معنے ہوئے جبکہ سورج کو لپیٹا جائے گا یا جبکہ سُورج کو گرا لیا جائے گا۔ اگر سورج کے لفظ کا استعمال یہاں مجازاً سمجھ لیا جائے اور سورج سے مادی سورج مراد نہ لیا جائے بلکہ یہ سمجھا جائے کہ اس میں مجازی طور پر کسی انسان کو سورج قرار دیا گیا ہے تو اِن معنوں کا سمجھنا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ میں لفظ شمس کا استعمال مجازی سمجھا جائے گا مگر یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ كُوِّرَتْ کے معنے لغۃً صرف لپیٹے جانے کے نہیں بلکہ اس کے معنے ایسے طور پر لپیٹے جانے کے ہیں جس طرح گٹھڑی کو لپیٹا جاتا ہے۔ پس اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے معنے صرف یہ نہیں کہ جب کہ سورج کو لپیٹا جائے گا بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جبکہ سورج کو گٹھڑی کی طرح باندھ دیا جائے گا اور اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس طرح گٹھڑی باندھ کر الگ رکھ دیتے ہیں اسی طرح سورج کو گٹھڑی کی طرح باندھ کر الگ رکھ دیا جائے گا اور اس سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رکھا جائے گا۔ اسی طرح اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے ایک معنے حذف مضاف کی صورت میں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جبکہ سورج کی روشنی کو دور کر دیا جائے گا یا سورج کی روشنی کو لپیٹ دیا جائے گا اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ سورج کو مٹا دیا جائے گا یعنی جیسے گٹھڑی میں چیز کو باندھ دیا جاتا ہے اور وہ نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے اسی طرح سورج بھی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔

تفسیر۔ اس آیت کے جو معنے ہماری جماعت کی طرف سے کئے جاتے ہیں اُن کو جب اگلی آیات کے معنوں سے ملایا جائے تو یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ جو معنے ہماری جماعت کی طرف سے کئے جاتے ہیں اُن میں کوئی تکلف نہیں بلکہ وہی حقیقی اور صحیح معنے ہیں۔ یہ بات میں نے اس لئے بیان کی ہے کہ ممکن ہے سورۂ تکویر کی اس پہلی آیت کی تفسیر بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہو چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتب میں اس آیت پر بحث کی ہے اور ہماری جماعت کی طرف سے بھی یہ آیت بالعموم پیش ہوتی رہتی ہے اس لئے وہ دوست جو ہماری جماعت کی باتیں سُنتے رہتے ہیں ان کو تو کوئی تکلف نظر نہیں آئے گا لیکن جو لوگ ہماری جماعت کے لٹریچر سے واقفیت نہیں رکھتے یا جن کو ہمارے سلسلہ کی باتیں سننے کا بہت کم موقع ملتا ہے ان کو شاید ان معنوں میں کوئی تکلّف محسوس ہو لیکن جب وہ ساری آیات پر غور کریں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان معنوں میں تکلّف کوئی نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اسی حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ سے مراد آنحضرت صلعم کی اتباع کو ترک کر دیا جانا یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو سورج قرار دیا ہے (الاحزاب: ۴۷) پس جب خدا نے یہ فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب کہ سورج کو لپیٹ دیا جائے گا تو اس کے معنے یہ تھے کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو ترک کر دیا جائے گا۔ لوگ اپنی اپنی رائے پر عمل کریں گے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مسلمان بیزار ہو جائیں گے۔ قلبی طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء اور متابعت کی کوئی ضرورت نہیں سمجھیں گے اور آپ کی تعلیمات سے مُنہ پھیر لیں گے۔ چنانچہ یہ نظارہ آج کل ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی طرف بہت ہی کم توجہ ہے۔ قرآن پر عمل تو پہلے ہی نہیں تھا حدیث پر عمل بھی بہت حد تک اڑ گیا ہے اور اگر کچھ ہے تو وہ صرف لفظی عمل ہے حقیقت اور روح کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نور دنیا پر ظاہر نہیں ہوتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور صرف اس بات میں نہیں کہ وضُو کرتے وقت بازو کو کہنی تک دھونا چاہیے اور سر پر مسح کرنا چاہیے بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بھی بتایا ہے خواہ وہ انسانی زندگی کے کسی شعبہ سے تعلق رکھنے والی بات ہو اس میں سے ہر لفظ بلکہ ہر ایک حرف پر عمل کرنا ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ انسان کا چہرہ سورج کی طرح چمکنے لگتا اور روحانی ترقیات کی طرف اس کا قدم سرعت سے بڑھنے لگتا ہے مگر مسلمانوں کو اس بات کا کوئی احساس ہی نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نور کو وہ کس طرح سے دنیا سے اوجھل کر رہے ہیں بے شک ظاہر میں اہل حدیث کا ایک طبقہ موجود ہے جو اپنے آپ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کرنے والا قرار دیتا ہے مگر وہ بھی اُن برکات کو ظاہر نہیں کرتا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ہمراہ لائے تھے ان کا بھی زیادہ تر زور ظاہر پر ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم کے مغز اور اس کی روح کی طرف ان کی کوئی توجہ نہیں۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ دنیا کی ہدایت کے لئے جو سب سے اہم چیز لائے وہ قرآن کریم ہے مگر اہلحدیث کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ قرآن کو حدیث کے تابع کر دیں۔ گویا انہوں نے اگر ایک چہرہ کو ظاہر کیا تھا تو دوسرے چہرہ کو انہوں نے مٹا دیا حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سورج ہونے کے لحاظ سے قرآن کے بھی مظہر تھے اور حدیث کے بھی مظہر تھے مگر وہ ایک حصہ کو بالکل مٹا دیتے ہیں اور اس طرح نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کے ذریعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نور دنیا پر ظاہر ہو رہا ہے۔ غرض وہ روحانی سورج جو دنیا کو روشنی پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تھا اس کی اتباع کو ترک کر دیا گیا ہے۔ سُنّیوں میں اگر کہیں قرآن پر بحث ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حدیث کو باطل کر دیں اور صرف قرآن کی اس تفسیر کو جو اُن کے ذہنوں نے پیدا کی ہے رہنے دیں۔ اور اگر اہل حدیث کی طرف سے حدیث پر بحث ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ

ہوتا ہے کہ قرآن کو راویوں کے خیالات کے تابع کر دیں اور یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں جن سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نور دنیا پر ظاہر نہیں ہوسکتا۔ بہرحال اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے دو معنے ہیں (۱) اتباع محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ترک کر دیا جائے گا۔ اور لوگ اپنی اپنی رائے پر عمل کرنے لگیں گے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ سے مراد انوارِ محمدیہ کے نزول کا بند ہو جانا (۲) یا یہ کہ انوارِ محمدیہ کا نزول بند ہو جائے گا اور مسلمان جن کا کام یہ تھا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور دنیا میں زیادہ سے زیادہ پھیلائیں وہ آپ کے نور کو ظاہر کرنے کی بجائے اس کو کم کرنے کا موجب ہوں گے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ میں سورج گرہن کی پیشگوئی چونکہ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے ایک معنے روشنی کے مٹ جانے کے بھی ہیں اس لئے اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ جب سورج اندھیر ہو جائے گا یعنی اُسے گرہن لگے گا۔ یہ وہی پیشگوئی ہے جس کا حدیثوں میں بھی ذکر آتا ہے کہ اِنَّ لِمَهْدِيِّنَا اٰيَتَيْنِ لَمْ تَكُوْنَا مُنْذُ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تَنْكَسِفُ الْقَمَرُ لِاَوَّلِ لَيْلَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ وَتَنْكَسِفُ الشَّمْسُ فِي النِّصْفِ مِنْهُ (دارقطنی کتاب العیدین باب صفة صلاة الخسوف و الکسوف و هیئتهما) یعنے ہمارے مہدی کے دو نشان ہیں۔ جب سے آسمان و زمین پیدا ہوئے ہیں کسی شخص کے زمانہ میں وہ نشان ظاہر نہیں ہوئے یعنی چاند گرہن کی راتوں میں سے پہلی رات کو رمضان میں چاند گرہن لگے گا اور سورج گرہن کی تاریخوں میں سے درمیانی تاریخ کو اسی رمضان میں سورج گرہن لگے گا۔ گو اس سورۃ میں خالی سورج کا لفظ آتا ہے مگر حدیثوں میں سورج اور چاند دونوں کا ذکر ہے۔

اس کے متعلق یہ امر سمجھ لینا چاہیے کہ یہ قرآن کا محاورہ ہے اور عربی زبان کا بھی۔ کہ جو چیزیں آپس میں لازم ملزوم ہوں ان میں سے بعض دفعہ ایک چیز کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور دوسری کا ذکر حذف کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ ایک اور جگہ اس پیشگوئی کے ضمن میں سورج اور چاند دونوں کا اکٹھا ذکر آتا ہے (دیکھو سورۃ قیامۃ) اس لئے یہاں صرف سورج کا ذکر کر دیا اور چاند کا ذکر چھوڑ دیا کیونکہ چاند سورج کے تابع ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گرمی سردی کا اکٹھا ذکر کرنا ہو تو بعض دفعہ سردی کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور مراد یہ ہوتی ہے کہ گرمی کا ذکر اس کے ساتھ ہی سمجھنا چاہیے یا گرمی کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور سردی کا ذکر اس کے ساتھ ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس جگہ چونکہ پیشگوئی کے ایک حصہ کو بیان کر دیا گیا ہے اس لئے دوسرے حصہ کی طرف خود بخود اشارہ ہو گیا اور یہ ضرورت نہ رہی کہ اس کا بھی نام لے کر ذکر کیا جاتا۔

وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۳

اور جب ستارے دُھندلے ہو جائیں گے۔

حَلّ لُغَات۔اَلنُّجُوْمُ اَلنُّجُوْمُ : اَلنَّجْمُ کی جمع ہے اور اَلنَّجْمُ کے معنے ہیں (۱) اَلْكَوْكَبُ۔ ستارہ (۲) اَلنَّبَاتُ عَلٰی غَیْرِ سَاقٍ وَھُوَ خِلَافُ الشَّجَرِ بے جڑ والی بوٹی جس کو ہمارے ملک میں بیل کہتے ہیں (۳) اَلْاَصْلُ کسی چیز کی جڑ۔ کہتے ہیں ھُوَمِنْ نَجْمِ صِدْقٍ۔ وہ سچائی کی جڑ سے ہے یعنی اس کی بات سچی ہوتی ہے یا وہ اعلیٰ خاندان سے ہے۔ نیز کہتے ہیں لَیْسَ لِھٰذَا الْحَدِیْثِ نَجْمٌ اَیْ اَصْلٌ۔ اس بات کی کوئی جڑ نہیں یعنی حقیقت نہیں۔ نَجْمٌ کی جمع اَنْجُمٌ وَ اَنْجَامٌ وَ نُجُوْمٌ وَ نُجُمٌ آتی ہے (اقرب)

اِنْكَدَرَتْ اِنْكَدَرَتْ اِنْكَدَرَ سے مؤنث کا صیغہ ہے (جو كَدَرَ سے بنا ہے) اور اِنْكَدَرَ فِیْ سَیْرِہٖ کے معنے ہوتے ہیں اَسْرَعَ وَ انْقَضَّ۔ اس نے جلدی جلدی حرکت کی اور گر گیا۔ کہتے ہیں اِنْكَدَرَ یَعْدُوْا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ تیزی سے دوڑا اور جب اِنْكَدَرَ عَلَیْہِ الْقَوْمُ کہیں تو معنے ہوتے ہیں اِنْصَبُّوْا۔ لوگ اس پر جا پڑے۔ اور اِنْكَدَرَتِ النُّجُوْمُ کے معنے ہوتے ہیں تَنَاثَرَتْ ستارے جھڑ گئے (اقرب) اور كَدَرَ (یَكْدُرُ) یا كَدِرَ (یَكْدَرُ جو اِنْكَدَرَ کا اصل ہے) كَدَرًا وَ كَدَارَةً وَ كُدُوْرًا وَ كُدُوْرَةً وَ كُدْرَةً۔ صَفَا کے مقابل کے الفاظ ہوتے ہیں یعنی وہ گدلا ہو گیا (اقرب) جیسے ہمارے ملک میں بھی کہتے ہیں کہ طبیعت مکدّر ہو گئی یا خراب ہو گئی پس ان معنوں کے اعتبار سے وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ کے معنے ہوں گے۔ جب ستارے گدلے ہو جائیں گے۔ اور نجوم سے مجازی طور پر وہ وجود لئے جائیں گے جن سے دنیا کو ہدایت مل رہی تھی اور جو لوگوں کے لئے راہنمائی کا مؤجب ہو رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب کہ یہ نجوم گدلے ہو جائیں گے یعنی اُن کا سلسلۂ فیض جاتا رہے گا اور لوگ اُن سے ہدایت پانا بند کر دیں گے۔

تفسیر۔ النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ سے مراد صحابہ کی اتباع کا مفقود ہو جانا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ (تشحید المبانی حدیث نمبر ۵۹) میرے صحابہؓ ستاروں کی طرح ہیں بِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ تم جس کے پیچھے بھی چلو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ جب شمس سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود مراد لیا گیا ہے تو نجوم سے مراد آپ کے صحابہؓ ہوئے۔ پس وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ کے یہ معنے ہوئے کہ نہ صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع مفقود ہو جائے گی بلکہ صحابہ کی اتباع بھی جاتی رہے

گی اور اُن کے بتائے ہوئے علوم متروک ہو جائیں گے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں اس زمانہ میں ایسا ہی نظارہ نظر آ رہا ہے لوگ جب بھی کوئی مثال پیش کریں گے بجائے اس کے کہ صحابہؓ کا ذکر کریں وہ کہیں گے ہٹلر نے یوں کہا ہے یا نپولین نے یوں کہا ہے یا ابراہیم لنکن نے یوں کہا ہے۔ لیکن پُرانے زمانہ میں لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ ابوبکرؓ نے یوں کہا ہے۔ عمرؓ نے یوں کہا ہے۔ عثمانؓ نے یوں کہا ہے۔ علیؓ نے یوں کہا ہے۔ غرض مسلمانوں میں صحابہ کے نقش قدم پر چلنے کی اہمیت بالکل جاتی رہی ہے۔ انگریزی میں کہتے ہیں کہ کسی قوم کی زندگی اس کی ٹریڈیشن Tradition پر چلتی ہے یعنی قوم کا ہر فرد جب تک اپنے دل میں یہ احساس نہ رکھتا ہو کہ اُس نے اپنی قومی روایات کو زندہ رکھنا ہے اس وقت تک قوم کی زندگی کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ زندہ قوموں کا یہی دستور ہے کہ اُن کا ہر فرد اپنے باپ دادا کے نیک افعال کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے باپ نے یوں کیا تھا میرا دادا اس طرح کیا کرتا تھا۔ جب تک قوم اس روح کو اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے اس کی زندگی کی گھڑیاں لمبی ہوتی چلی جاتی ہیں اور جب یہ رُوح مر جاتی ہے تو قوم بھی اس کے ساتھ ہی مر جاتی ہے۔ پس وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ کے یہ معنے ہوئے کہ صحابہؓ کی خوبیاں اور اُن کے کمالات عمل کے لحاظ سے مٹ جائیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قومی ٹریڈیشن Tradition یعنی قومی برتری کی روایات بھی قوم کے حافظہ سے جاتی رہیں گی اور وہ روایات زندہ نہیں رہیں گی جن سے اخلاق ترقی کرتے اور امنگوں میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ جب قوم کے افراد کے سامنے بار بار یہ بات آتی رہے کہ ہمارے باپ دادا اپنے اندر بہت بڑی خوبیاں اور کمالات رکھتے تھے تو وہ خود بھی ترقی کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر انہیں کہا جائے کہ تمہارے باپ دادا بالکل نالائق تھے۔ انہیں ترقی سے کوئی لگاؤ نہیں تھا تو آگے بڑھنے کی قابلیت اُن میں مفقود ہو جاتی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں پر سب سے بڑی تباہی اسی وجہ سے آئی ہے کہ اُن کی شاندار قومی روایات طاقِ نسیان پر رکھ دی گئی ہیں اور ماضی سے اُن کا تعلق مٹ گیا ہے۔ اور صحابہؓ اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والے لیڈروں کی خوبیاں مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ اس ٹریڈیشن کے تباہ کرنے میں یوروپین لوگوں کی لکھی ہوئی تاریخوں نے خصوصیت سے حصہ لیا ہے۔ کوئی مسلمان بادشاہ ایسا نہیں جس پر انہوں نے الزام نہ لگایا ہو اور اُسے بُری سے بُری اور بھیانک سے بھیانک صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مسلمان طالب علم جو اُن تاریخوں کو پڑھتا ہے یہ سمجھنا شروع کر دیتا ہے کہ اس کے آباء میں کوئی خوبی نہ تھی وہ ہر خوبی دوسروں کی طرف منسوب کرتا اور ہر نقص اپنے بزرگوں کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح قومی ترقی کی جڑ کھوکھلی ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ بغیر ٹریڈیشن کے بغیر قومی روایات کو زندہ رکھنے کے دنیا میں

کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔آسان سے آسان طریق کسی قوم کو تباہ کرنے کا یہ ہے کہ اُسے اپنی پچھلی تاریخ سے بدظن کر دیا جائے۔اگر اُسے اپنی پچھلی تاریخ سے بدظن کر دیا جائے تو وہ اُجۡتُثَّتۡ مِنۡ فَوۡقِ الۡاَرۡضِ مَا لَهَا مِنۡ قَرَارٍ (ابراھیم:۲۷) کا مصداق بن جاتی ہے اور کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔یوروپین لوگوں نے اس آسان حربہ سے کام لیا اور تمام اسلامی تاریخ کو انہوں نے بگاڑ کر رکھ دیا۔بڑے بڑے مسلمان بادشاہوں کا ذکر کریں گے تو کہیں گے فلاں میں یہ نقص تھا اور فلاں میں وہ نقص تھا۔اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ وہ اس کا نام تحقیقات رکھتے ہیں اور دعوے سے کہتے ہیں کہ تحقیق کے بعد یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ فلاں مسلمان بادشاہ ایسا تھا حالانکہ وہ سراسر جھوٹ ہوتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کسی مسلمان سے پوچھ کر دیکھو اُسے اپنے اسلاف میں کوئی خوبی نظر ہی نہیں آئے گی۔وہ کہے گا محمود غزنوی ڈاکو تھا اورنگزیب ظالم تھا۔فلاں ایسا تھا اور فلاں ایسا تھا۔گویا عیب شماری اور الزام تراشی ہی اُن کا کام رہ گیا ہے۔اُن کے اندر یہ حس ہی نہیں رہی کہ وہ کسی کی خوبیوں کو بھی دیکھ سکیں۔اس نقص کی وجہ سے مسلمانوں میں ٹریڈیشن کا وجود ہی باقی نہیں رہا اور اُن کی قومی ترقی کی جڑ کو کاٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔وہ مسلمانوں کو اپنے آباء کے خلاف مشتعل کرنے کے لئے ایسے ایسے حربوں سے کام لیتے ہیں جو قطعاً کوئی شریف انسان استعمال نہیں کر سکتا۔مثلاً کسی مسلمان بادشاہ کا ذکر کریں گے تو کہیں گے کہ وہ تو شراب پیتا تھا اور وہ اِس الزام کا ذکر محض اس لئے کریں گے کہ مسلمانوں کی طبیعتوں میں جوش پیدا ہو جائے اور وہ اُسے بُرا بھلا کہنے لگ جائیں۔حالانکہ یہ الزام لگانے والے وہ ہیں جو خود دن رات شرابیں پیتے اور کئی قسم کے ناروا افعال کرتے رہتے ہیں مگر یہ شرابی قوم اپنے افعال کی طرف تو نہیں دیکھتی اور کسی مسلمان بادشاہ کا ذکر آ جائے تو اس کے متعلق لکھ دیتی ہے کہ وہ شراب پیتا تھا۔محض اس لئے کہ مسلمان بھڑک اٹھیں اور وہ اس سے متنفّر ہو جائیں حالانکہ یہ قوم وہ ہے جس کا ہر فرد شراب پیتا ہے جس کا بادشاہ بھی شراب پیتا ہے اور جس کا وزیراعظم بھی شراب پیتا ہے۔چرچل بھی شراب پیتا ہے اور روزویلٹ بھی شراب پیتا ہے۔مگر وہ مسلمان بادشاہ کے کے متعلق یہ ضرور ذکر کریں گے کہ وہ شراب پیتا تھا چلو ہم نے مان لیا کہ وہ شراب پیتا تھا مگر تم تو وہ ہو جو ہمیں اُس مسلمان بادشاہ سے متنفّر کر کے اُن لوگوں کی خوبیوں کا ہمیں قائل کرنا چاہتے ہو جو اس سے ہزاروں گُنے زیادہ شراب پیا کرتے تھے اور ہزاروں گُنا زیادہ بُرے افعال کیا کرتے تھے۔غرض فرماتا ہے کہ وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ یعنی تاریخ اسلامی مکدّر ہو جائے گی۔اُس کی خوبیاں مٹا دی جائیں گی اور یُوں معلوم ہوگا کہ نجوم میں انکدار واقع ہو گیا ہے۔

(۲) نَجۡمٌ کے ایک معنے چونکہ اَصۡلٌ کے بھی ہیں اس لئے اَلنُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ کے معنے یہ بھی ہیں کہ جڑیں خراب

ہو جائیں گی یعنی قومی برتری کے جو اصول رائج ہیں کہ فلاں آدمی فلاں قوم سے ہے اور فلاں آدمی فلاں قوم سے یہ مٹ جائیں گے چنانچہ اس زمانہ میں نسلی برتری کا احساس بالکل مٹا دیا گیا ہے۔ یورپ میں تو یہ امتیاز بالکل رہا ہی نہیں ہمارے ملک میں بھی آہستہ آہستہ یہ احساس مٹتا چلا جا رہا ہے اور جو لوگ خاندانی سمجھے جاتے تھے اُن کا رسوخ اب مفقود ہو رہا ہے۔ پس اس کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ قومی برتری کے جو عام قواعد دنیا میں رائج ہیں وہ اُس وقت نہیں رہیں گے چنانچہ دیکھ لو آج کل اچھوت اقوام کو اُبھارنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ بھی اسی لئے ہیں کہ ان نسلی امتیازات کو بالکل مٹا دیا جائے۔

اِذَاالنُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ میں اس امر کی پیشگوئی کہ علماء اور امراء کا اثر جاتا رہے گا

(۳) وَ اِذَاالنُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ کے یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ اُس زمانہ میں علماء اور امراء دونوں کا اثر جاتا رہے گا۔ قوم کی راہنمائی کی باگ دوڑ انہی دو طبقوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ امراء سیاسی راہنمائی کرتے ہیں۔ اور علماء مذہبی راہنمائی کرتے ہیں پس وَ اِذَاالنُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ کے یہ معنے ہوئے کہ پبلک کا تعلق علماء اور امراء دونوں سے کمزور ہو جائے گا۔ امراء کا اثر دنیوی لوگوں پر سے اُٹھ جائے گا اور علماء کا اثر دینی میلان رکھنے والوں پر سے اٹھ جائے گا۔ گویا امراء کی طاقت بھی ٹوٹ جائے گی اور علماء کی طاقت بھی ٹوٹ جائے گی۔

اِذَاالنُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ میں شہب کے گرنے کی طرف اشارہ

(۴) اِنْکَدَرَتْ کے ایک معنے تَنَاثَرَتْ کے بھی ہیں پس اس معنے کے اعتبار سے جب ہم پہلی آیت کے ساتھ ملاتے ہیں تو چونکہ اِذَاالشَّمْسُ کُوِّرَتْ کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ سورج اور چاند کو گرہن لگے گا اس لئے اس مناسبت سے اِذَاالنُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ کے یہ معنے ہوں گے کہ موعود زمانہ میں شہب بڑی کثرت سے گریں گے چنانچہ یہ پیشگوئی بھی بڑی واضح طور پر پوری ہوئی اور ۲۸ رنومبر ۱۸۸۵ء کو اس کثرت سے شُہب گرے کہ فضاء آسمان میں ہر طرف شعلے جلتے ہوئے نظر آتے تھے اور یورپ اور امریکہ اور ایشیا کی اخبارات نے اس نظارہ قدرت کو عجوبہ سمجھ کر بہت کچھ لکھا اور حیرت ظاہر کی (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۱۰۔ Patrick Moore The Guinness Book of Astronomy 5th edition pg.132)۔ اگر ہم شمس کے روحانی معانے کریں تو نُجُوْم کے بھی روحانی معنے کریں گے اور اگر شمس سے ظاہری سورج مراد لیا جائے تو نجوم کے انکدار سے بھی شُہب کا کثرت سے گرنا مراد لیا جائے گا۔ غرض وَ اِذَاالنُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ کے یہ معنے ہوئے (۱) کثرت سے شُہب کی بارش ہوگی (۲) یا یہ کہ صحابہؓ کی اتباع بھی جاتی رہے گی۔ اُن کے بتائے ہوئے علوم متروک ہو جائیں گے یا یہ کہ اُن کی اتباع نیکی اور تقویٰ میں لوگ چھوڑ دیں گے (۳) یا یہ کہ جو لوگ

خاندانی سمجھے جاتے تھے اُن کا رسوخ جاتا رہے گا (۴) یا امراء کا اثر عوام پر سے اُٹھ جائے گا (۵) یا یہ کہ علماء مذہبی کا رسوخ مٹ جائے گا۔ یہ سب علامات ایسی ہیں جو آج کل پوری ہو چکی ہیں۔

وَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ﴿۴﴾

اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔

حَلِّ لُغَات۔ **اَلْجِبَالُ** اَلْجِبَالُ اَلْجَبَلُ کی جمع ہے اور اَلْجَبَلُ کے معنے ہیں کُلُّ وَتَدٍ فِی الْاَرْضِ عَظُمَ وَطَالَ۔ یعنی اونچے ٹیلے کو جَبَل کہتے ہیں اور جِبَالَ خِلَافُ السَّاحِلِ کو بھی کہتے ہیں۔ یعنی اندرونِ ملک کو۔ اور جَبَل کے ایک معنے سَیِّدُ الْقَوْمِ وَعَالِمُھُمْ کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ عرب کہتے ہیں فُلَانٌ جَبَلَ قَوْمِہٖ کہ فلاں اپنی قوم کا جبل ہے یعنی اس قوم کا سردار اور بڑا عالم ہے۔ (اقرب)

سُیِّرَتْ سُیِّرَتْ سَیَّرَ سے مؤنث کا مجہول کا صیغہ ہے اور سَیَّرَ کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَہٗ سَائِرًا۔ اس کو چلایا اور سَیَّرَ الْجُلَّ عَنْ ظَھْرِ الدَّآبَّۃِ کے معنے ہوتے ہیں اَلْقَاہُ۔ جانور کا جھول اتار کر پیٹھ پر سے نیچے پھینک دیا اور سَیَّرَ الْمَثَلَ کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَہٗ یَسِیْرُ بَیْنَ النَّاسِ۔ کسی محاورہ کو پھیلا دیا اور سَیَّرَہٗ مِنْ بَلَدِہٖ کے معنے ہیں اَخْرَجَہٗ وَاَجْلَاہُ۔ اس کو اپنے شہر سے نکال دیا اور جلاوطن کر دیا (اقرب) پس وَ اِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ کے معنے ہوں گے (۱) جب پہاڑ چلائیں گے (۲) جب علماء اور لیڈر اپنے ملکوں سے نکالے جائیں گے۔

تفسیر۔ **اِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ کی پیشگوئی کے مطابق پہاڑوں کا اڑایا جانا** اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ جب پہاڑ اپنی جگہ سے چلائے جائیں گے یعنی پہاڑوں کو اُڑا اُڑا کر رستے بنائے جائیں گے۔ اس صورت میں سُیِّرَتْ کے لفظ کا استعمال ایسا ہی سمجھا جائے گا جیسے کہتے ہیں پرنالے چلتے ہیں حالانکہ پرنالہ نہیں چلتا بلکہ پانی چل رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح سُیِّرَتْ الْجِبَالُ کے یہ معنے لئے جائیں گے کہ پہاڑوں کو ڈائنامیٹ سے اُڑا اُڑا کر راستے تیار کئے جائیں گے چنانچہ اس کا ثبوت ہر پہاڑ پر موجود ہے پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر اور ڈائنامیٹ سے اُڑا اُڑا کر سڑکیں اور راستے بڑی کثرت سے تیار کئے گئے ہیں۔ اور ڈلہوزی۔ شملہ۔ مری۔ کشمیر۔ منصوری وغیرہ تمام پہاڑوں پر یہ راستے دیکھے جا سکتے ہیں۔ پس اِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ کے یہ معنے ہوئے کہ پہاڑوں پر رستے تیار کئے جائیں گے جن پر لوگ چلیں گے گویا ان معنوں کی صورت میں یہاں سیّر کی نسبت مقام کی جگہ صاحب مقام کی

طرف سمجھی جائے گی یعنی لفظاً تو یہ کہا گیا ہے کہ پہاڑ چلائیں جائیں گے مگر مراد یہ ہے کہ پہاڑوں پر لوگ کثرت سے چلیں گے کیونکہ پہاڑوں پر اچھے راستے تیار ہو جائیں گے۔ موجودہ زمانہ میں اس کثرت سے پہاڑ اُڑائے گئے ہیں کہ کوئی حد ہی نہیں رہی۔ شاید ہی کوئی پہاڑ ایسا رہ گیا ہو جہاں سڑکیں اور رستے تیار نہ کر لئے گئے ہوں۔ ورنہ ہر پہاڑ پر چلنے کے لئے راستے بن گئے ہیں۔ پہاڑ کے نیچے ڈائنامیٹ رکھ دیتے ہیں اور وہ فوراً ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ پھر لڑائیوں میں بھی کثرت سے پہاڑ اڑائیں جاتے ہیں۔ اوپر دشمن کی فوج موجود ہوتی ہے اور نیچے بارود رکھ کر اُسے اُڑا دیا جاتا ہے پہلے زمانوں میں تو اتنا بارود ہی نہیں تھا کہ پہاڑوں کو اڑایا جا سکتا۔ ضمناً اس آیت میں بارود کی کثرت کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کیونکہ سڑکیں وغیرہ تیار نہیں ہوسکتی تھیں جب تک ڈائنامیٹ نہ ہوتا۔ اگر ڈائنامیٹ نہ ہوتا تو چٹانوں کا اڑانا بڑا مشکل ہوتا۔ اسی طرح بعض مشینیں ایسی ایجاد ہو چکی ہیں جو رستوں کو بالکل صاف کر دیتی ہیں۔ پس ضمناً اس آیت میں بارود کی کثرت اور ایسی مشینری کی ایجاد کی طرف بھی اشارہ تھا جن سے پہاڑوں پر سڑکیں وغیرہ تیار ہو سکیں۔

اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ میں علماء اور سادات قوم کو ملکوں سے نکالے جانے کی پیشگوئی

(۲) جَبَلٌ کے ایک معنے چونکہ سَیِّدُ الۡقَوۡمِ وَعَالِمُهُمۡ کے بھی ہوتے ہیں اس لئے وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ کے یہ معنے بھی ہیں کہ علماء و سادات قوم کو ملکوں میں سے نکال دیا جائے گا۔ اس کی مثال بھی پہلے کہیں نظر نہیں آتی۔ موجودہ زمانہ ہی ہے جس میں ایک طرف تمام رُوس سے ایسے مذہبی لوگوں کو نکال دیا گیا ہے جو مذہب کو سیاست پر مقدم رکھتے ہیں۔ دوسری طرف ترکوں نے مذہب پر ایسا ہاتھ صاف کیا ہے کہ حکم دے دیا ہے کہ اگر نماز پڑھی جائے تو ترکی میں ہی پڑھی جائے۔ قرآن پڑھا جائے تو ترکی میں پڑھا جائے اور اگر کوئی شخص ایسا نہ کرے تو وہ اُسے اپنے ملک سے نکال دیتے ہیں یا قید کر دیتے ہیں۔

اگلی آیات پر بحث تو بعد میں آئے گی انہی تین آیات پر غور کر کے دیکھو اور سوچو کہ کیا اس زمانہ سے قبل دنیا میں کسی زمانہ میں بھی ان باتوں کا اجتماع ہوا ہے؟ اگر دنیا کی ساری تاریخ کو جمع کر لیا جائے تب بھی کسی زمانہ میں ان علامات کا تیسرا حصہ تو کیا دسواں حصہ بھی نظر نہیں آئے گا۔ سورج چاند کو گرہن لگنا۔ شہب کا کثرت سے گرنا اور پھر قومی روایات کا مٹ جانا یہ اتنی بیّن علامات ہیں کہ اس سے پہلے کسی زمانہ میں نظر نہیں آتیں۔ چھ ہزار سال تو کیا اگر ایک لاکھ سال کی تاریخ کو بھی جمع کر لیا جائے تو کہیں یہ دکھائی نہیں دے گا کہ مغلوب اقوام کی قومی روایات کو اس طرح مٹا دیا گیا ہو جس طرح آج مٹایا گیا ہے۔ یورپ کا ہر جاہل۔ شرابی۔ ظالم بادشاہ اچھی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور ہر

اچھے اخلاق کا مسلمان بادشاہ کریہہ شکل میں دکھایا جاتا ہے اور مغربی لوگوں کے ہاتھ میں تعلیم ہونے کی وجہ سے مسلمان بھی اسی خیال کے ہو گئے ہیں۔ یہ تو پہلے زمانوں میں بھی نظر آئے گا کہ زید اپنے اَسلاف کے کارناموں کو بُھول گیا یا بکر اپنے آباء کی خوبیوں سے غافل ہو گیا مگر یہ کہیں دکھائی نہیں دے گا کہ قوم کی قوم اپنی شاندار قومی روایات کو نہ صرف بُھلا دے بلکہ اپنے اَسلاف کی خوبیاں بھی اُسے عیب نظر آنے لگ جائیں۔ آج لاکھوں لوگ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ فلاں مسلمان بادشاہ ایسا گندہ تھا اور فلاں مسلمان بادشاہ ایسا خبیث تھا حالانکہ اُن سے زیادہ گندے اور ان سے زیادہ خبیث بادشاہوں کی وہ تعریف کر رہے ہوتے ہیں۔ وُہ یہ تو کہہ دیتے ہیں کہ محمود غزنوی ایسا تھا مگر وہ اتنا نہیں سوچتے کہ وہ خود جن کی تعریف کر رہے ہوتے ہیں وہ اُن سے زیادہ گندے اور ناپاک ہوتے ہیں۔ کوئی مسلمان بادشاہ تو چوری چھپے شراب پیتا ہو گا مگر یہ جن کی تعریف کرتے ہیں وہ رات دن شرابیں پیتے تھے۔ اگر شراب پینا نقص ہے تو یہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے نقص ہے عیسائیت کے نقطہءِ نگاہ سے تو یہ ایک اچھا کام ہے پس انہیں تو چاہیے تھا کہ وہ خوش ہوتے کہ ایک مسلمان بادشاہ بھی شراب پینے پر مجبور ہوا مگر وہ اُلٹا اُس کو بُرا بھلا کہتے ہیں جس کی غرض سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتی کہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنے بادشاہوں کی نسبت نفرت اور حقارت کے جذبات پیدا ہوں حالانکہ انہیں اس سے کیا واسطہ ہے کہ کوئی شراب پیتا تھا یا نہیں۔ اُنہیں تو نظامِ حکومت کے لحاظ سے تبصرہ کرنا چاہیے کہ اس نے حکومت سے تعلق رکھنے والے کام کس طرح سرانجام دیئے۔

میں گزشتہ دنوں لاہور میں تھا کہ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ محمود غزنوی کے فلاں فلاں افعال آیا اسلام کے مطابق تھے یا اس کی تعلیم کے خلاف تھے؟ میں نے اُس سے کہا کہ ان امور کا تعلق مذہبی نقطۂ نگاہ کے ساتھ ہے لیکن تم جس وقت کسی مسلمان بادشاہ کو بُرا کہتے ہو تو تمہارا منشاء یہ ہوتا ہے کہ تم یہ ثابت کرو کہ یہ مُسلمان بادشاہ تو بُرا تھا لیکن فلاں یوروپین بادشاہ بہت اچھا تھا حالانکہ اُس یوروپین بادشاہ میں بھی ہزاروں عیوب ہوتے ہیں۔ پس یہ طریق درست نہیں تمہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ محمود غزنوی نے جو اخلاق دکھائے وہ اُس زمانہ کے اور بادشاہوں کے مقابلہ میں کیسے تھے۔ اگر اپنے زمانہ کے بادشاہوں کے مقابلہ میں اُس نے اعلیٰ درجہ کے اخلاق دکھائے ہیں تو گو اس میں بعض کمزوریاں بھی ہوں پھر بھی تاریخی نقطۂ نگاہ سے وہ ایک اعلیٰ درجہ کا بادشاہ سمجھا جائے گا اور اُس کا مقابلہ موجودہ زمانہ کے کسی بادشاہ سے نہیں کیا جائے گا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ ایڈیسن نے کئی ایجادات کی تھیں اس کے بعد ایجادات کا سلسلہ ایڈیسن کی ایجادات سے کئی گناہ بڑھ گیا مگر اس سے ایڈیسن کی عزت میں کمی نہیں آ سکتی۔ اس لئے کہ اپنے زمانہ میں اُس نے ایسا کام کیا جو نہایت شاندار تھا۔ اسی طرح اگر محمود غزنوی نے اپنے زمانہ کے بادشاہوں

کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کے اخلاق دکھائے ہیں تو بہرحال وہ ایک قابلِ تعریف بادشاہ سمجھا جائے گا اور اسی نقطۂ نگاہ سے ہمیں اس کے افعال کو دیکھنا پڑے گا۔ غرض قومی روایات کے گدلا ہو جانے کی مثال موجودہ زمانہ میں اتنی واضح اور اس قدر نمایاں ہے کہ قومی طور پر اس سے پہلے کسی زمانہ میں یہ مثال نظر نہیں آتی۔

اسی طرح علماء اور امراء کا زور ٹوٹ جانا بھی اتنا واضح ہے کہ پہلے کسی زمانہ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ روس سے مذہب پر سختی سے پابند ہونے والے علماء کو نکال دیا گیا۔ ٹرکی سے ان کو نکال دیا گیا۔ جرمنی اور اٹلی سے انہیں نکال دیا گیا۔ اسی طرح بعض اور ممالک میں اُن سے یہ سلوک کیا گیا اور مقامِ عزت سے اتار کر اُنہیں اس طرح نیچے پھینک دیا گیا جس طرح جانور کا جھول اتار کر پھینک دیا جاتا ہے۔ غرض یہ علامات جو ان تین آیات میں بیان کی گئی ہیں اور وہ علامات جو اگلی آیات میں بیان ہیں اگر ان سب کو بیان کیا جائے تو یقیناً کسی زمانہ میں یہ باتیں اکٹھے طور پر نظر نہیں آئیں گی۔ بلکہ اگر یہ سب باتیں ایک نقشہ کے طور پر شائع کر دی جائیں اور ساتھ ہی یہ انعام مقرر کر دیا جائے کہ اگر کوئی شخص اِن علامات کو گزشتہ زمانہ پر چسپاں کر کے دکھا دے تو اُسے لاکھ یا دو لاکھ روپیہ بطور انعام دیا جائے گا تب بھی کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکے گا کہ پہلے کسی ایک زمانہ میں یہ علامات پوری ہو چکی ہیں دنیا کے کسی مؤرخ کے سامنے ان علامات کو رکھ دو اور پھر اس سے پوچھو کہ یہ علامات کس زمانہ پر صادق آتی ہیں تو وہ فوراً کہہ اٹھے گا کہ یہ تو اسی زمانہ کی علامات بیان کی جارہی ہیں پہلے کسی زمانہ میں ایسے حالات پیدا نہیں ہوئے۔ غرض ہر شخص کی انگلی اِن آیات کو پڑھ کر موجودہ زمانہ کی طرف ہی اٹھے گی کسی اور زمانہ کی طرف نہیں اُٹھ سکتی اور یہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ان سورتوں میں ایک یوم القیامۃ کا ایسا واضح نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اُس یوم القیامۃ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے تو وہ اِن سورتوں کو پڑھ لے۔

وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۪ۙ﴿۵﴾

اور جب دس مہینے کی گابھن اونٹنیاں آوارہ چھوڑ دی جائیں گی۔

حَلّ لُغَات۔ عِشَارٌ عِشَارُ عُشَرَاءُ کی جمع ہے۔ عربی زبان میں مفردات میں عُشَرَاءُ کی اپنے وزن میں کوئی نظیر نہیں۔ صرف نُفَسَاءُ ہی ایک لفظ ہے جو اس کے ہم وزن ہے گویا عُشَرَاءُ اور نُفَسَاءُ دو ہی لفظ اس وزن میں پائے جاتے ہیں تیسرا کوئی لفظ ان وزنوں کے لحاظ سے عربی زبان میں نہیں ہے۔ لکھا ہے اَلْعُشَرَاء

کَنُفَسَاءَ وَلَا ثَالِثَ لِهٰذَیْنِ الْاِسْمَیْنِ (اقرب) عِشَار اُن اونٹنیوں کو کہتے ہیں جن کے حمل پر دس مہینے گزر جائیں یا آٹھ مہینے گزر جائیں اکثر لوگوں کے نزدیک عشار انہی اونٹنیوں کو کہتے ہیں جن کے حمل پر دس مہینے گزر جائیں مگر بعض نے کہا ہے کہ جن کے حمل پر آٹھ مہینے گذر جائیں ان کو بھی عِشَار کہتے ہیں (اقرب) اس لفظ کی بناوٹ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کا خیال زیادہ صحیح ہے جو عشار دس ماہ کی گابھن اونٹنیوں کو کہتے ہیں۔ اُن اونٹنیوں کے گلّہ کو بھی عِشَار کہتے ہیں جن میں سے بعض بچہ جَن چکی ہوں اور بعض کا بچہ قریب میں ہونے والا ہو۔ (اقرب) گویا عِشَار دس ماہ کی گابھن اونٹنیوں کو بھی کہتے ہیں اور اونٹنیوں کا وُہ گلّہ بھی عِشَار کہلاتا ہے جن میں سے بعض بچہ جن چکی ہوں اور بعض انتظار کر رہی ہوں۔

عُطِّلَتْ عُطِّلَتْ عَطَّلَ سے مجہول مؤنث کا صیغہ ہے اور عَطَّلَ الْاِبِلَ کے معنے ہوتے ہیں خَلَّاہُ بِلَا رَاعٍ یعنی بغیر گلّہ بان اور چرواہے کے اُونٹ کو چھوڑ دیا وَ کُلُّ مَا تُرِكَ ضِیَاعًا فَقَدْ عُطِّلَ۔ اور ہر وہ چیز جسے یونہی ضائع ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے اس کے لئے عَطَّلَ کا لفظ آتا ہے (اقرب) پس وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ کے معنے یہ ہوئے (۱) جبکہ دس ماہ کی گھابن اُونٹنیوں کو یونہی چھوڑ دیا جائے گا یعنی خواہ وہ مریں یا جئیں اُن سے کوئی تعلق نہیں رکھا جائے گا (۲) ایسی اونٹنیوں کے گلّوں کو جن میں سے بعض بچہ دے چکی ہوں اور بعض ابھی بچہ دینے والی ہوں چھوڑ دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ چاہے مریں یا رہیں ہمارا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

تفسیر۔ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ میں لفظ عشار استعمال کرنے کی وجہ قرآن کریم عرب میں نازل ہوا ہے اس لئے قرآن کریم میں عرب کی ضروریات اور اہلِ عرب کے جذبات کو سب سے مقدّم رکھا گیا ہے تا کہ پہلے وہ خود قرآن کریم کو اچھی طرح سمجھ لیں اور پھر اُسے دنیا میں پھیلائیں۔ جو قوم الہامِ الٰہی کی اوّلین مخاطب ہوتی ہے اس کے محاورات اور اس کے جزبات وغیرہ کو کلام میں مقدم رکھا جاتا ہے کیونکہ اگر وہ اس کلام کو سمجھے گی نہیں تو اُسے پھیلائے گی کس طرح۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ عرب میں سواری اور غذا دونوں چیزیں اونٹ سے وابستہ تھیں اونٹ ہی پر وہ سواری کرتے تھے اور اُونٹنی کا دودھ ہی غذا کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح اونٹ کا گوشت کھایا کرتے تھے اور ان تینوں باتوں کے لحاظ سے دس ماہ کی گھابن اونٹنی خواہ وہ بچہ جَن چکی ہو یا بچہ جَننے والی ہو ان کی نگاہ میں بہت بڑی وقعت رکھتی تھی اس لئے کہ بچہ جَننے والی نہ صرف خود سواری کے قابل ہوتی تھی بلکہ اس کے متعلق یہ امید بھی ہوتی تھی کہ اس کا جو بچہ پیدا ہو گا وہ بھی سواری کے یا غذا کے کام آئے گا۔ پھر وہ اونٹنی کا دُودھ پیتے تھے اور دُودھ کے لحاظ سے بھی دس ماہ کی گھابن اونٹنی کو وہ بہت قیمتی سمجھتے تھے کیوں کہ جانتے تھے کہ یہ عنقریب بچہ دے گی اور

ہم اُس کا دُودھ خُوب پئیں گے۔ پھر وہ گوشت کھایا کرتے تھے اس لحاظ سے دس ماہ کی گابھن اونٹنی بہت اعلیٰ خیال کی جاتی تھی کیونکہ چھوٹے بچے کا گوشت بہت اچھا ہوتا ہے۔ پشاور کی تجارت کا ایک بڑا حصہ دُنبہ کے بچہ کے گوشت سے وابستہ ہے وہ دو ماہ کا دُنبہ ذبح کر کے اس کا گوشت بیچتے ہیں اور لوگ دُور دُور سے اس دنبہ کا گوشت چکھنے کو پشاور جاتے ہیں۔ بکری کے چھوٹے بچے کا گوشت بھی بہت مزیدار ہوتا ہے۔ غرض وہ ایسی اونٹنی کو بہت قیمتی سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ ہم اونٹنی کا دودھ پئیں گے اور بچے کا گوشت کھائیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ایک زمانہ آنے والا ہے جب ایسی اونٹنیاں بیکار چھوڑ دی جائیں گی جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے لُغت کے لحاظ سے عَطَّلَ کے معنے یہ ہوئے کہ کسی چیز کو ضائع ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے اور اس سے کسی قسم کا واسطہ نہ رکھا جائے۔ اس لحاظ سے عُطِّلَتْ کے دو ہی معنے ہو سکتے ہیں کہ (۱) اونٹ کو بیکار کرنے والی سواریاں نکل آئیں گی جس سے ایسی اونٹنیوں کی قیمت بھی کہ دس ماہ سے گابھن ہوں اور جلد بچہ دینے والی ہوں گر جائے گی اور لوگ اُن کو چھوڑ دیں گے (۲) یا یہ کہ اس قدر تیز سواریاں نکل آئیں گی کہ اُن کی وجہ سے ہر قسم کی غذائیں عرب میں پہنچنے لگیں گی اور اونٹ کے دودھ کی چنداں ضرورت نہ رہے گی جس کی وجہ سے جنی ہوئی اور جننے کے قریب پہنچی ہوئی اونٹنی کی قدر پہلے جیسی نہ رہے گی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں اس زمانہ میں یہ دونوں باتیں پوری ہو چکی ہیں۔ سواری کے لئے دخانی جہاز۔ ریل۔ موٹر اور ہوائی جہاز ایجاد ہو چکے ہیں اور ان نئی ایجادات کی وجہ سے عرب میں جہاں اونٹوں پر سفر کیا جاتا تھا وہاں اب موٹروں پر سفر کیا جاتا ہے۔ جب شروع شروع میں عرب میں موٹریں جاری کی گئیں تو بدوؤں نے بغاوت کر دی کہ اس طرح ہماری تجارت کو نقصان ہوگا مگر آخر موٹریں ہی جاری رہیں اور اونٹ کی سواری متروک ہو گئی چنانچہ اب مکّہ میں جانے والے موٹروں پر سفر کر کے ہی جاتے ہیں۔ مولوی ثناء اللہ صاحب نے ایک دفعہ اعتراض کیا تھا کہ مکّہ میں تو اب تک ریل نہیں گئی حالانکہ ریل کیا اور موٹر کیا مطلب تو یہ تھا کہ اونٹ کی سواری جاتی رہے گی اور اس کی بجائے ایسی نئی سواریاں نکل آئیں گی جن کو لوگ زیادہ ترجیح دیں گے چنانچہ موٹروں نے اونٹ کی سواری کی اہمیت بالکل گرا دی ہے۔ ریل تو مقررہ وقت پر چلتی ہے مگر موٹریں ہر وقت چل سکتی ہیں اس لئے جہاں موٹر چلتی ہے وہاں دوسری سواریاں بالکل رہ جاتی ہیں کیوں کہ وہ ہر وقت چل سکتی ہے غرض اس پیشگوئی کو اللہ تعالیٰ نے اس رنگ میں پورا کر دیا کہ اب جدّہ سے مکّہ اور مکّہ سے مدینہ کی طرف موٹر چلتی ہے اُونٹ کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔

اس پیشگوئی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ ایسے تیز رفتار جہاز پیدا ہو جائیں گے کہ جن کی وجہ سے ہر قسم کی سبزی ترکاری عرب میں پہنچنے لگ جائے گی چنانچہ پیشگوئی کا یہ حصہ بھی پورا ہوا۔ وہ قوم جس کی غذا ہی اونٹ کا دُودھ اور اُس کا

گوشت تھا اب اس کو دنبے کا گوشت بھی میسر آ رہا ہے۔ سبزیاں اور ترکاریاں بھی مل رہی ہیں اور اُسے اونٹ کا دودھ یا اُس کا گوشت کھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اونٹ کا دودھ آخر ضرورت کے ماتحت ہی پیا جاتا تھا یہ تو نہیں کہ وہ کوئی مزیدار شے ہے مَیں نے خود اسے پی کر دیکھا ہے ایسا بدمزہ ہوتا ہے کہ اس کے پینے سے قے آتی ہے جس شخص کو کھانے کے لئے اَور کچھ نہ ملے وہ بے شک یہ دُودھ پی سکتا ہے مگر جسے اور چیزیں کھانے کے لئے مل جائیں وہ اُونٹنی کا دُودھ کیوں پیئے گا۔ اسی طرح اونٹ کا گوشت بھی بڑا سخت ہوتا ہے اور گو عرب لوگ اُسے کھایا کرتے تھے مگر جب اُنہیں دُنبے کا گوشت کھانے کو مل جائے تو وہ اُونٹ کا گوشت کیوں کھائیں۔ اور جب سبزی ترکاری انہیں میسر آ جائے تو وہ اونٹنی کے دودھ کی طرف کیوں رغبت کریں۔ یہی بات اس آیت میں بیان کی گئی تھی کہ نقل وحرکت کے سامان اس قدر کثرت سے نکل آئیں گے اور اتنی تیز رفتار سواریاں ایجاد ہو جائیں گی کہ ہر چیز عرب میں پہنچنے لگ جائے گی اس وجہ سے نہ اونٹ کی سواری کی کوئی اہمیت رہے گی اور نہ اونٹنی کے دُودھ اور اس کے بچہ کے گوشت کی قدر رہے گی۔ ہم دیکھتے ہیں عرب میں پان بھی پہنچ گیا ہے حالانکہ عرب کا پان سے کوئی تعلق نہیں لیکن جہازوں میں لد کر اب پان بھی عرب میں پہنچنے لگ گیا ہے اور ہندوستانی تو الگ رہے بعض عرب بھی شوق کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح اور کئی قسم کا سامان خورد ونوش جو پہلے عرب کے واہمہ میں بھی نہیں آ سکتا تھا اب وہاں آسانی سے پہنچ رہا ہے اور اس طرح اونٹ کے دودھ اور اس کے گوشت کی ضرورت بہت کم ہوگئی ہے اور روز بروز کم ہوتی جائے گی یہاں تک کہ اونٹ کی ضروت وہاں اسی طرح رہ جائے گی جس طرح دوسرے ملکوں میں ہے اور پہلی سی بات اب بھی نہیں رہی آئندہ اور بھی تبدیل ہو جائے گی۔

وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۪ۙ﴿۶﴾

اور جب وحشی اکٹھے کئے جائیں گے۔

حَلّ لُغَات۔ اَلْوُحُوْشُ اَلْوُحُوْشُ حَیَوَانُ الْبَرِّ اَوْ مَا لَا یَسْتَأْنِسُ مِنْ دَوَابِّ الْبَرِّ جنگلی جانور یا وہ چوپایہ جو انسانوں سے مانوس نہ ہو وَحْشِیٌّ کہلاتا ہے اور وُحُوْشُ اس کی جمع ہے۔ (اقرب)

حُشِرَتْ حُشِرَتْ حَشَرَ سے مؤنث مجہول کا صیغہ ہے اور حَشَرَ النَّاسَ (حَشْرًا) کے معنے ہوتے ہیں جَمَعَھُمْ لوگوں کو جمع کیا۔ اور حَشَرَ السِّنَانَ کے معنے ہوتے ہیں دَقَّقَہٗ وَلَطَّفَہٗ اُس نے نیزے کی نوک کو خوب

تیز کیا اور حَشَرَ فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں جَلَاهُ عَنْ وَطَنِهٖ اس کو اپنے وطن سے نکال دیا۔ اور حَشَرَ الْجَمْعَ کے معنے ہوتے ہیں اَخْرَجَهٗ مِنْ مَّكَانٍ اِلٰى اٰخَرَ۔ لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل کر دیا اور حُشِرَ مجہول کے صیغہ میں اس کے ایک زائد معنی بھی ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں حُشِرَتِ الْوُحُوْشُ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ مَاتَتْ وَاُهْلِكَتْ یعنی وحشی مر گئے یا ان کو مار دیا گیا۔ (اقرب) پس وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ کے ایک معنے یہ ہوں گے کہ وحشیوں کو ہلاک کر دیا جائے گا۔

تفسیر ۔ یہ بھی ایک زبردست پیشگوئی ہے جو موجودہ زمانہ میں پوری ہوئی۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ایک زمانہ میں وحشی جانور جمع کئے جائیں گے۔ چنانچہ دیکھ لو آجکل چڑیا گھروں میں جس قدر وحشی جانور اکٹھے کئے گئے ہیں اس کی مثال پہلے زمانوں میں کہاں ملتی ہے کوئی صوبہ اور کوئی ملک ایسا نہیں جہاں کوئی چڑیا گھر نہ ہو اور اس میں وحشی جانوروں کو اکٹھا نہ کیا گیا ہو پہلے زمانہ میں شائد ساری دنیا میں بھی کوئی ایک مقام ایسا نہیں مل سکتا تھا جہاں اس طرح جانور اکٹھے کئے گئے ہوں مگر اب کوئی ملک ایسا نہیں جس میں چڑیا گھر نہ ہوں۔ بلکہ کوئی صوبہ ایسا نہیں جس میں چڑیا گھر نہ ہو۔ اور پھر اس بارہ میں ملکوں اور صوبوں کی آپس میں رقابت پائی جاتی ہے اور ہر ملک یہ چاہتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ وحشی جانور اکٹھا کرے یہ تو چڑیا خانوں کا حال ہے جہاں زندہ وحشی جانور اکٹھے ہوتے ہیں عجائب گھروں میں مُردہ جانوروں کی کھالوں میں بھوسہ بھر بھر کر ان کو رکھا جاتا ہے تا کہ لوگ آئیں اُن کو دیکھیں اور اپنے معلومات میں اضافہ کریں۔ اسی طرح علم حیات کی تحقیقات کے لئے سائنٹفک ریسرچ انسٹیٹیوشن Research Institution میں مردہ جانوروں کے لاشے اور اُن کے ڈھانچے لا لا کر جمع کئے جاتے ہیں اور دیکھا جاتا ہے کہ یہ ڈھانچے کتنے سال کے ہیں یا کتنا زمانہ ان پر گزر چکا ہے یا اُن کی مختلف حالتوں کو دیکھنے اور دوسروں کو یاد کرانے کے لئے اُن ڈھانچوں پر غور کیا جاتا ہے غرض کیا چڑیا گھروں کے لحاظ سے اور کیا عجائب گھروں کے لحاظ سے اور کیا علم حیات کی تحقیق کے لحاظ سے اس پیشگوئی کی صداقت پوری طرح ثابت ہے اور جس طرح موجودہ زمانہ میں وحشی جانوروں کو زندہ یا مردہ اکٹھا کیا گیا ہے اس کی مثال پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔

(۲) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وُحُوْشُ سے مجازاً وحشی انسان مراد لئے جائیں۔ عربی زبان میں کثرت سے یہ لفظ اِن معنوں میں استعمال ہوتا ہے (المنجد)۔ اُردو زبان میں بھی کہتے ہیں فلاں آدمی تو وحشی ہے اُس سے باتیں نہ کیجئے۔ یا فلاں لوگ تو وُحُوش ہیں۔ اسی لحاظ سے وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ کے یہ معنے ہوں گے کہ وحشی انسان یعنی جنگلی یا غیر تعلیم یافتہ اقوام جمع کی جائیں گی اور اُن کا تعلق بوجہ اشاعت تمدّن اور راستوں کے کھل جانے کے متمدن اقوام

سے ہوجائے گا۔ پنجاب کے بار کے علاقہ میں چلے جاؤ تمہیں جگہ جگہ یہ سنائی دے گا کہ فلاں نئی آبادی ہے اور فلاں جانگلیوں کا گاؤں ہے اور جانگلی کے معنے وحشی کے ہی ہیں۔ گویا وہ ادنیٰ یا وحشی اقوام جو پہلے الگ رہا کرتی تھیں اب متمدن لوگوں میں بالکل مل گئی ہیں۔ پہاڑی لوگوں کو بھی وحشی سمجھا جاتا تھا مگر اب ہر جگہ پہاڑوں پر سیر گاہیں بن گئی ہیں جن کی وجہ سے دنیا کے اکثر مالدار لوگ گرمی کا موسم پہاڑوں پر گزارتے ہیں اور اس طرح پہاڑی لوگوں کا تعلق بھی متمدن لوگوں سے ہوگیا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ ہم نور پور آرہے تھے جو پٹھانکوٹ سے پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مولوی یار محمد صاحب مرحوم وکیل ہمارے ساتھ تھے ہم نے دیکھا کہ پگڈنڈی پر ایک عورت کھڑی ہے چونکہ ہم نے بھی اسی پگڈنڈی پر سے گزرنا تھا اِس لئے مولوی یار محمد صاحب نے اس عورت سے کہا کہ مائی ذرا ایک طرف ہوجاؤ۔ اُس نے یہ سُنتے ہی شور مچانا اور گالیاں دینا شروع کر دیا کہ میری ہتک کر دی گئی ہے۔ مولوی صاحب حیران تھے کہ میں نے اس کی کیا ہتک کی ہے اور ہم بھی حیرت زدہ تھے کہ یہ بات کیا ہوئی۔ مگر وہ برابر شور مچاتی اور گالیاں دیتی چلی گئی۔ آخر مولوی صاحب نے اس کی منتیں کیں کہ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیا جائے اور کہا کہ ہمارے ہاں مائی کا لفظ عزت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اِسی لئے میں نے یہ لفظ استعمال کیا تھا میری غرض تمہاری ہتک کرنا نہیں تھی۔ مگر وہ کہتی جاتی تھی کہ تم نے تو مجھے اپنے باپ کی بیوی بنا دیا ہے۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ مائی کے معنے وہ عورت کیا سمجھتی تھی اور کیوں اُس نے گالیاں دیں اور شور مچایا۔ کچھ عرصہ گزرا کہ مجھے ڈلہوزی آتے ہوئے معلوم ہوا کہ ہماری موٹر کا ڈرائیور نور پور کا ہے مَیں نے ڈرائیور کو راستہ میں یہ لطیفہ سُنایا۔ وہ سُن کر کہنے لگا یہ بُہت پرانے زمانہ کی بات ہے اب عورتوں کو بے شک مائی کہہ کر دیکھ لیں انہیں بُرا محسوس نہیں ہوگا کیوں کہ اب پنجابی اُن سے ملنے لگ گئے ہیں اور وہ سب سمجھتی ہیں کہ مائی کے کیا معنے ہوتے ہیں مگر آج سے چالیس سال پہلے یہ کیفیت تھی کہ پندرہ بیس منٹ تک مولوی صاحب اس کی منتیں کرتے چلے گئے اور وہ عورت کہتی جاتی تھی کہ تُو نے مجھے اپنے باپ کی بیوی بنا دیا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ایک زمانہ میں ادنیٰ یا وحشی اقوام بھی متمدن لوگوں میں ملا دی جائیں گی اور عالمگیر سیاسی نظام شروع ہوجائے گا جس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنے ہوں گے کہ زمین کا چپّہ چپّہ آباد کر دیا جائے گا۔ ادنیٰ اقوام میں بھی بیداری پیدا ہوجائے گی اور اُن میں بھی تعلیم کا چرچا شروع ہوجائے گا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں افریقہ کے باشندے پہلے ننگے پھرا کرتے تھے مگر اب وہی لوگ ولایت میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جاتے اور وہاں سے ڈاکٹر یا بیرسٹر وغیرہ بن کر واپس آتے ہیں۔ ہماری جماعت کے مبلغ مولوی عبدالرحیم صاحب نیّر افریقہ

کے حبشیوں کی تصویریں دکھایا کرتے ہیں کہ جب تک احمدی مبلّغ وہاں نہیں پہنچے تھے وہ لوگ ننگے پھرا کرتے تھے مگر اب احمدی مبلّغین کے جانے کے بعد وہ لباس پہننے لگ گئے ہیں۔غرض جس طرح اس زمانہ میں تمام وحشی اقوام کی تربیت ہورہی ہے اس سے پہلے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔انسان کسی ایک چیز کو اتفاق کہہ سکتا ہے مگر وہ ان سب علامتوں کو جو قرآن کریم نے ایک جا اور ایک زمانہ کے متعلق بیان فرمائی ہیں کس طرح اتفاقی قرار دے گا۔

(۳) یہ معنے بھی اس آیت کے ہو سکتے ہیں کہ جو اقوام نزول قرآن کے وقت وحشی سمجھی جاتی تھیں وہ اُبھار دی جائیں گی اور دنیا میں پھیل جائیں گی یعنی یورپ اور امریکہ کا غلبہ ہوگا۔رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یورپ بالکل وحشی تھا اور یورپ کے اکثر ممالک کے باشندے افریقہ کے حبشیوں کی طرح قریباً ننگے پھرا کرتے تھے۔بلکہ آج سے پانچ چھ سو سال پہلے کی اگر تصویریں دیکھی جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت بھی وہ لوگ کھال کا لباس پہنا کرتے تھے۔اُن کے گھٹنوں تک کھال ہوتی تھی۔ہاتھ میں تیر کمان ہوتا تھا اور سر پر عجیب قسم کی ٹوپی ہوتی تھی۔پس وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ جو قومیں نزول قرآن کے وقت وحشی سمجھی جاتی تھیں اُن کو اُبھار دیا جائے گا۔وہ اجتماع اور طاقت اپنے اندر پیدا کرلیں گی اور دنیا میں پھیلا دی جائیں گی (۴) یا یہ کہ ایسی قوموں کی حکومت ہو جائے گی جو بے دین ہو جائیں گی کیونکہ انس وہ ہے جس میں دین ہو اور وحشی وہ ہے جس میں دین نہ ہو پس وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ کے ایک یہ معنے ہوں گے کہ بے دین حکومتیں قائم ہو جائیں گی جیسے رُوس میں یا اَور بعض دُوسرے ممالک میں ایسی حکومتیں قائم ہیں جن کو دین سے کوئی مس ہی نہیں۔گویا دہریہ قوموں کے حاکم ہو جانے کے متعلق ان میں پیشگوئی پائی جاتی ہے۔

(۵) اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ بداخلاقی عام طور پر پھیل جائے گی اور دین دار لوگ دب جائیں گے۔

(۶) اس آیت کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وحشی اقوام کو اُن کے علاقوں سے نکال دیا جائے گا جیسا کہ افریقہ میں ہو رہا ہے۔کینیا کالونی میں چلے جاؤ۔یوگنڈا میں چلے جاؤ۔ہر جگہ یہی نظارہ نظر آئے گا۔انگریز وہاں گئے اور انہوں نے اصل باشندوں کو نوٹس دے دیا کہ یا تو اس زمین کو سنبھالو اور یا اس میں سے نکل جاؤ۔وہاں ایک ایک شخص کی پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ میل پر ریاست ہوتی تھی مگر یوروپین قوموں نے جاتے ہی اُن سب کو اپنی زمینوں اور جائدادوں سے بے دخل کر دیا اور خود اُن پر قبضہ کرلیا۔چنانچہ افریقہ میں بعض انگریزوں کے پاس ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ ایکڑ زمین ہے۔اور گو انگریز بھی اس زمین کو بسا نہیں رہے مگر جب یہ وہاں گئے تو انہوں نے تمام لوگوں کو نوٹس دے دیا کہ اپنی اپنی زمین کو سنبھالو یا اسے چھوڑ دو۔اب ایک شخص اتنی بڑی زمین کہاں سنبھال سکتا تھا نتیجہ یہ

ہوا کہ انگریزوں نے اُن کو بے دخل کر دیا اور خود زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ یہی حال امریکہ کا ہے وہاں ریڈ انڈینز RED INDIANS کی حکومت ہوا کرتی تھی اور شمالی اور جنوبی امریکہ سب اُن کے قبضہ میں تھا مگر انہوں نے سو سال میں اُن سب کو بے دخل کر دیا اور خود تمام علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

(۷) حُشِرَتْ کے ایک معنے چونکہ اُهْلِكَتْ کے بھی ہیں اس لئے اس آیت کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اُنہیں قسم قسم کی تدابیر سے ہلاک کر دیا جائے گا۔ چنانچہ قدیم باشندوں کو یوروپینز نے قِسم قِسم کی اذّیتیں دے کر ہلاک کر دیا۔ اب ایک ریاست کے متعلق میں نے پڑھا ہے کہ اُس میں صرف تیرہ[۱۳] قدیم باشندے باقی ہیں حالانکہ پہلے لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ اسی طرح آسٹریلیا کے پُرانے باشندوں کا اب کہیں پتہ نہیں چلتا ان سب کو جو لاکھوں کی تعداد میں تھے یوروپین لوگوں نے قسم قسم کی تکالیف اور دُکھوں سے ایسا مٹایا کہ اب معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں گئے۔

وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۷

اور جب دریاؤں (کے پانیوں) کو (نکال کر دوسری طرف) بہایا جائے گا۔

حَلِّ لُغَات۔ بِحَارٌ۔ بِحَارٌ جمع ہے بَحْرٌ کی اور اَلْبَحْرُ کے معنے ہیں خِلَافُ الْبَرِّ یعنی بحر کا لفظ خشکی کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے معنے ہیں۔ اَلْمَآءُ الْمِلْحُ۔ نمکین پانی والی جگہ یعنی سمندر۔ وَكُلُّ نَهْرٍ عَظِيْمٍ۔ ہر بڑا دریا۔ كُلُّ مُتَوَسِّعٍ فِيْ شَيْءٍ۔ ہر چیز میں وسعت رکھنے والا وجود۔ فَالرَّجُلُ الْمُتَوَسِّعُ فِي الْعِلْمِ بَحْرٌ وَالْفَرَسُ الْمُتَوَسِّعُ فِيْ جَرْيِهٖ بَحْرٌ۔ ہر وہ آدمی جس کا علم وسیع ہو اسے بحر کہتے ہیں اور ہر وہ گھوڑا جو بہت تیز دوڑتا ہو اُسے بھی بحر کہتے ہیں (اقرب) غرض جس چیز میں بھی غیر معمولی وسعت پائی جاتی ہو عربی زبان میں اُسے بحر کہا جاتا ہے بُحُوْرٌ وَ اَبْحُرٌ وَ بِحَارٌ اس کی جمع ہیں۔

سُجِّرَتْ سُجِّرَتْ سَجَّرَ سے مجہول مؤنث کا صیغہ ہے اور سَجَّرَ الْمَآءُ کے معنے ہوتے ہیں فَجَّرَهٗ اس نے پانی کو پھاڑا اور سَجَّرَ التَّنُّوْرَ کے معنے ہوتے ہیں مَلَأَهٗ بِالْحَطَبِ لِيَحْمِيَهٗ۔ تنور کو لکڑیوں سے بھر دیا تا کہ اُس کو گرم کرے۔ وَفِي الْقُرْاٰنِ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ قِيْلَ اَيْ اُحْمِيَتْ بِتَفْجِيْرِ بَعْضِهَا اِلٰى بَعْضٍ حَتّٰى يَعُوْدَ بَحْرًا وَّاحِدًا۔ لُغت میں جو لکھا ہے کہ قرآن میں جو آتا ہے اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ۔ اس کے یہ معنے کئے جاتے ہیں کہ بعض

دریاؤں کو بعض میں پھاڑ کر ملا دینے سے پانی میں جوش پیدا کر دیا جائے گا یہاں تک کہ ایک بڑا دریا نظر آنے لگ جائے گا (اقرب)

تفسیر۔ دریاؤں کا پھاڑنا دو طرح ہو سکتا ہے۔ اوّل اس طرح کہ اس کا پانی کسی اور طرف لے جایا جائے۔ دُوسرے اس طرح کہ اس میں کوئی اور پانی ملا دیا جائے۔ پس اس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ یا تو دریا نہریں نکال نکال کر خشک کر دئے جائیں گے یا دریاؤں میں اور پانی ملا کر اُن کو بڑھا دیا جائے گا۔ یہ دونوں نظّارے آج کل دنیا میں نظر آتے ہیں چنانچہ کئی دریا ایسے ہیں جن میں سے نہریں نکال نکال کر ان کو خشک کر دیا گیا ہے اور کئی دریا ایسے ہیں جن میں دوسرے دریاؤں کا پانی ملا کر اُن کو وسیع کر دیا گیا ہے۔ ہمارے ملک میں دریاؤں کو جہاز رانی کے قابل نہیں سمجھا گیا لیکن یورپ میں اس کا بڑا رواج ہے اور وہ دریاؤں کو درست کر کے اندرون ملک میں بھی جہاز چلاتے ہیں تا کہ رسل و رسائل میں آسانی رہے۔ اب تک کے تجربہ سے یہی ثابت ہوا ہے کہ ریل نقل اسباب کے لحاظ سے مہنگی ہے لیکن جہاز سستا ہے اس وجہ سے یوروپین لوگ تجارت کے لئے جہازوں سے زیادہ کام لیتے ہیں اور جہاں دریا سمندر سے ملتے ہیں اس علاقہ کو صاف اور ہموار کر کے دریا کو جہاز رانی کے قابل بنا دیتے ہیں جس کی وجہ سے تیس تیس چالیس چالیس پچاس پچاس بلکہ بعض جگہ سَو سَو میل تک وہ اندرون ملک میں جہاز لے جاتے ہیں اور اس طرح اُن کو تجارت میں بہت آسانی رہتی ہے۔ ہمارے ملک میں اس کا رواج نہیں لیکن وہاں اس کا کثرت سے رواج ہے۔

اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ میں دریاؤں سے نہریں نکالے جانے کی پیشگوئی اور پھر یہ بھی ہو رہا ہے کہ دریاؤں میں سے نہریں نکالی جاتی ہیں بلکہ بعض جگہ وسیع نہریں نکالنے کے لئے ایک دریا کا پانی دوسرے دریا کے پانی میں ملا دیتے ہیں اور اس طرح بحار کی تسجیر عمل میں آ رہی ہے۔

وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ عالم جاہل ہو جائیں گے اور ان کا علم مفقود ہو جائے گا کیونکہ بحر کے ایک معنے عالم کے بھی ہیں اور چونکہ بحر کے معنے اَلۡمَاءُ الۡمِلۡحُ کے بھی ہیں یعنی صرف دریا مراد نہیں بلکہ اس کے معنے سمندر کے بھی ہیں اس لئے اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ سمندر آپس میں ملا دئے جائیں گے جیسے نہر سویز کے ذریعہ سے قلزم اور روم کو یا نہر پانامہ کے ذریعہ سے دو امریکن سمندروں کو آپس میں ملا دیا گیا۔

وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝۸

اور جب (مختلف) نفوس جمع کئے جائیں گے۔

تفسیر ۔ اس آیت میں رسل ورسائل اور سفر کی آسانیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آخری زمانہ میں بعض ایسی چیزوں کی ایجاد عمل میں آجائے گی جن سے لوگ ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو جائیں گے۔ چنانچہ پہلی چیز جو اس زمانہ میں قرآن کریم کی اس پیش کردہ صداقت کو ظاہر کر رہی ہے وہ ریل ہے۔ ریل کا ایک ڈبہ ہوتا ہے لیکن اگر غور کرو تو اسی ایک ڈبہ میں کوئی چینی بیٹھا ہوتا ہے کوئی انگریز بیٹھا ہوتا ہے۔ کسی طرف بنگالی بیٹھا دکھائی دیتا ہے اور کسی طرف پٹھان بولتا نظر آتا ہے۔ اِسی طرح پنجابی بھی اسی ڈبہ میں موجود ہوتا ہے۔ غرض مختلف علاقوں کے رہنے والے اور مختلف زبانوں کے بولنے والے لوگ ریل کے ایک ڈبہ میں موجود ہوتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں بڑی مشکل سے دوسرے علاقہ یا دوسرے ملک کے لوگ نظر آیا کرتے تھے مگر اب ذرائع رسل ورسائل اور آمدورفت میں اس قدر آسانی اور سہولت پیدا ہوگئی ہے کہ ہندوستان کے آدمی امریکہ میں نظر آجاتے ہیں اور امریکہ کے ہندوستان میں نظر آجاتے ہیں۔ پھر تار۔ ریڈیو اور ڈاک خانہ یہ تو ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ کی پیشگوئی کو نہایت واضح طور پر پورا کر دیا ہے۔ ہم گھر میں آرام سے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اور ریڈیو پر کبھی چینیوں کی تقریریں سن رہے ہوتے ہیں کبھی جاپانیوں کے لیکچر سُن رہے ہوتے ہیں۔ کبھی جرمنوں اور کبھی انگریزوں کی باتیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی ہوتی ہیں گویا دوسرے الفاظ میں ہم اور ایک چینی ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں یا ہم اور ایک جاپانی ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں یا ہم اور ایک انگریز ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں یا ہم اور ایک جرمن ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔

وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا کہ اس زمانہ میں ایک قسم کے علوم پھیل جائیں گے چنانچہ دنیا میں مغربی علوم کا اب اس قدر غلبہ ہوگیا ہے کہ نفوس انسانی کا آپس میں جوڑ اور اتحاد پیدا ہونا بالکل آسان ہوگیا ہے۔ اس زمانہ میں یہ علوم اتنے غالب آگئے ہیں کہ ساری دنیا پر چھا گئے ہیں۔ بالخصوص یوروپین فلسفہ نے انسانی دماغ کو ایک خاص رنگ میں ڈھال دیا ہے اب اگر ایک چینی سوچتا ہے تو مغربی رنگ میں سوچتا ہے جاپانی سوچتا ہے تو مغربی رنگ میں سوچتا ہے عرب سوچتا ہے تو مغربی رنگ میں اور پٹھان سوچتا ہے تو وہ بھی مغربی رنگ میں۔ حالانکہ جُدا جُدا قومیں ہیں۔ جُدا جُدا زبانیں ہیں مگر مغربی فلسفہ اور مغربی تہذیب سب پر چھا گئی ہے۔ اور مختلف

اقوام کے افراد علمی طور پر آپس میں ملا دئے گئے ہیں۔ اسی طرح اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ مختلف اقوام کے افراد کا آپس میں شادی بیاہ کرنے کا رواج ہو جائے گا۔ چنانچہ حبشی عورتیں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے ساتھ بیاہی جاتی ہیں اور انگریز عورتیں دوسری اقوام کے مردوں سے شادی کر لیتی ہیں۔ فرانس میں چلے جاؤ تو تمہیں نظر آئے گا کہ ایک فرانسیسی اپنی حبشی بیوی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جا رہا ہے اُسے یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ میں فرانسیسی ہوں اور یہ حبشی ہے اس طرح انٹر میرج بلز Inter marriage bills پاس ہونے شروع ہو گئے ہیں تا کہ غیر مذاہب والوں کے ساتھ شادی بیاہ میں کوئی روک نہ ہو پہلے اس قسم کی شادیاں لوگ بہت رُک رُک کر کرتے تھے مگر اب زور دے کر انٹر میرج بلز پاس کرائے جاتے ہیں تا کہ اس قسم کی شادیوں میں کوئی روک پیدا نہ ہو سکے۔ لاہور میں اُمّ طاہرؓ کی بیماری کے سلسلہ میں جب مَیں مقیم تھا تو ایک بہت بڑے لیڈر مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ اُن کی بیوی بھی ان کے ساتھ تھیں باتوں باتوں میں ان کی بیوی نے جو مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوئی تھی بتایا کہ ہم تین بہنیں ہیں جن میں سے دو ہندوؤں میں بیاہی ہوئی ہیں اور ایک کی مسلمان کے ساتھ شادی ہو چکی ہے۔ پشاور میں ایک دفعہ اسی بات پر بہت شور اٹھا تھا کیونکہ ڈاکٹر خان کی بیٹی نے ایک سکھ ہوا باز سے شادی کر لی تھی۔ غرض مختلف قوموں میں اس قسم کی شادیوں کا رواج بہت ترقی کر چکا ہے جو قرآن کریم کی پیشگوئی وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ کی صداقت کا ثبوت ہے۔

اسی طرح اس کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ مختلف قسم کے نفوس مل جائیں گے اور وہ اپنی اپنی الگ سوسائٹیاں بنائیں گے چنانچہ دیکھ لو کہیں لیبر پارٹی بنی ہوئی ہے۔ کہیں فاشسٹ پارٹی بنی ہوئی ہے۔ کہیں کمیونسٹ پارٹی بنی ہوئی ہے۔ اور کہیں سوشلسٹ پارٹی بنی ہوئی ہے۔ چند ہم خیال لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور پھر وہ اپنی اپنی پارٹیاں بنا لیتے ہیں۔ مزدور اپنے حق کے لئے لڑتا ہے۔ صنّاع اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرتا ہے اور مدرس اور تاجر اپنے اپنے رنگ میں کوشش کرتا ہے غرض قومی سوسائٹیاں بڑی کثرت سے بن گئی ہیں اور ہر سوسائٹی کوشش کرتی ہے کہ اس کے ہم پیشہ افراد کے حقوق پامال نہ ہوں۔ اور ترقی کی دوڑ میں وہ دوسروں سے پیچھے نہ رہے۔

یہ تمام علامات ایسی ہیں جو اس زمانہ کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور اِسی زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو پورا کیا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اور کوئی زمانہ ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جس میں یہ علامات پوری ہوئی ہوں۔ ہر شخص جس کے سامنے ان علامات کو رکھا جائے وہ یہی کہے گا کہ ان میں موجودہ زمانہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اَور کسی زمانہ کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ خطبہ پڑھا اور کہا وَاِذَا النُّفُوْسُ

زُوِّجَتۡ پھر آپ نے فرمایا تَزَوَّجُهَا اَنۡ تُؤَلِّفَ كُلُّ شِيۡعَةٍ اِلٰى شِيۡعَتِهِمۡ (رواہ بن ابی حاتم عن نعمان بن بشیر بحوالہ ابن کثیر) یعنی اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایک خیال یا پیشہ کے لوگ آپس میں سوسائٹیاں بنالیں گے۔ سو جیسا کہ موجودہ زمانہ کے حالات سے ظاہر ہے یہ پیشگوئی بڑی وضاحت سے پوری ہو چکی ہے۔

وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَةُ سُئِلَتۡ ۝۹

اور جب زندہ گاڑی جانے والی (لڑکی) کے بارے میں سوال کیا جائے گا

بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۝۱۰

(کہ آخر) کس گناہ کے بدلہ میں اُس کو قتل کیا گیا (تھا)۔

حل لغات۔ مَوۡءٗدَةٌ مَوۡءٗدَةٌ وَاَدَ سے نکلا ہے اور وَاَدَبِنۡتَهٗ (يَئِدُهَا) وَاۡدًا کے معنے ہوتے ہیں دَفَنَهَا فِي الۡقَبۡرِ وَهِيَ حَيَّةٌ اُس نے اپنی لڑکی کو زندہ ہی قبر میں دفن کر دیا۔ وَعِبَارَةُ الۡاَسَاسِ اَثۡقَلَهَا بِالتُّرَابِ (اقرب) اور زمخشری اپنی کتاب اساس میں لکھتے ہیں کہ اِس کے معنے اَثۡقَلَهَا بِالتُّرَابِ کے ہوتے ہیں یعنی اُس پر مٹی کا بوجھ ڈال دیا۔ پھر لکھا ہے فَهِيَ وَئِيۡدَةٌ وَمَوۡءٗدَةٌ یعنی مَوۡءٗدَةٌ کو وَئِيۡدٌ اور وَئِيۡدَةٌ بھی کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَةُ سُئِلَتۡ کے معنے پہلے مفسرین کے نزدیک اور ان کے معنی کی تغلیط وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَةُ سُئِلَتۡ کے معنے یہ ہیں کہ زمین میں زندہ دفن کی جانے والی لڑکی کے بارہ میں سوال کیا جائے گا۔ لیکن مفسّرین اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ مَوۡءٗدَةُ سے سوال کیا جائے گا۔ لیکن میرے نزدیک یہ معنے قرآن کریم کے محاورہ کے لحاظ سے درست نہیں ہیں۔ مفسّرین نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ موؤدہ سے پوچھنے میں زجر زیادہ ہے کیونکہ اُس سے گواہی طلب کی جارہی ہوگی (الکشاف زیر آیت ھذا) لیکن میں سمجھتا ہوں یہ معنے قرآن کریم کے اسلوبِ بیان اور متعارف طریقِ عمل کے خلاف ہیں۔ قرآن کریم سے صاف پتہ لگتا ہے کہ سوال مجرم سے ہی کیا جاتا ہے نہ کہ اُس سے جس پر ظلم کیا گیا ہو چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا يُسۡئَلُ عَمَّا يَفۡعَلُ وَهُمۡ يُسۡئَلُوۡنَ (الانبیاء:۲۴) یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ کرتا ہے اُس کے متعلق اُس سے نہ پوچھا جائے گا ہاں یہ لوگ جو کچھ عمل کرتے ہیں اُس کے متعلق اُن سے سوال کیا جائے گا۔ اسی طرح پھر فرماتا ہے لِيَسۡئَلَ الصّٰدِقِيۡنَ عَنۡ صِدۡقِهِمۡ (الاحزاب:۹) یعنی تا کہ اللہ تعالیٰ سچ بولنے والوں سے ان کی سچائی کا سوال کرے سورۂ عنکبوت میں فرماتا ہے

وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (العنکبوت:۱۴) اور ضرور اِن لوگوں سے قیامت کے دن اس کا سوال کیا جائے گا جو یہ افتراء کرتے تھے۔ پھر فرماتا ہے وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَ يُسْئَلُوْنَ (الزخرف:۲۰) یعنی اِن لوگوں نے فرشتوں کو جو رحمٰن کے بندے ہیں لڑکی بنا دیا۔ کیا انہوں نے اُن کی پیدائش کو دیکھا ہے۔ عنقریب ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور اُن سے اس کا سوال کیا جائے گا۔ اِن آیات سے ہم کو پتہ لگتا ہے کہ جہاں جہاں سوال کا ذکر آتا ہے وہاں مجرم سے ہی پوچھے جانے کا ذکر آتا ہے نہ کہ غیر مجرم سے۔ البتہ ایک مقام ایسا ہے جہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ وہاں ایک غیر مجرم سے سوال کیا گیا ہے اور وہ مقام وہ ہے جہاں حضرت مسیح ناصری ؑ سے سوال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (المائدۃ:۱۱۷) یعنی جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لو؟ عیسیٰ کہیں گے کہ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اور تُو پاک ہے۔ مجھے یہ ہرگز سزاوار نہیں کہ مَیں وہ بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ اگر میں نے یہ کہا ہو گا تو بے شک تُو اسے جانتا ہو گا کیوں کہ تُو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے علم میں ہے اس لئے کہ بے شک چھپی ہوئی باتوں کا جاننے والا تُو ہی ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ نصاریٰ کہتے تھے کہ حضرت مسیح ؑ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے اس لئے نصاریٰ کو جھوٹا کرنے کے لئے حضرت مسیح ؑ سے اس سوال کا پوچھا جانا ضروری تھا۔ لیکن یہاں یہ بات کس طرح چسپاں ہوسکتی ہے کہ موؤدہ کہتی تھی کہ مجھے بے شک زمین میں دفن کر دو۔ اگر کفار کا دعویٰ ہوتا کہ موؤدہ نے ہمیں کہا ہے کہ مجھے زندہ گاڑ دیا جائے تو اس صورت میں بے شک اس سے سوال ہوسکتا تھا اور گاڑنے والا کہہ سکتا تھا کہ آپ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں خود اُس سے پوچھ کر دیکھ لیجئے اس نے خود کہا تھا کہ مجھے زندہ گاڑ دیا جائے۔ لیکن جب موؤدہ کی نسبت ایسی کوئی بات نہیں کہی جاتی تو موؤدہ سے سوال کرنے کے بھی کوئی معنے نہیں ہو سکتے۔

میرے نزدیک اس جگہ حذف ہے اور وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ درحقیقت وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ عَنْهَا ہے یعنی جب کہ موؤدہ کے بارہ میں سوال کیا جائے گا اور چونکہ موؤدہ کسی حق سے نہیں گاڑی جاتی اس لئے جب اس کے بارہ میں مجرم سے سوال کیا جائے گا تو مجرم پھنس جائے گا۔ یوں تو مومن سے بھی حساب لیا جائے گا اور کافر سے بھی حساب لیا جائے گا مگر مومن اور کافر کے حساب میں فرق یہ ہے کہ مومن سے آسان حساب لیا جائے گا جیسا کہ فَسَوْفَ

یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا (الانشقاق:۹) سے ظاہر ہے ایک دوسرسری باتیں پوچھ کر اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔لیکن جب کافر سے حساب لیا جائے گا تو بڑی سختی سے لیا جائے گا۔احادیث میں بھی آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ عُذِّبَ (بخاری کتاب الرقاق باب مَن نوقش الحساب عُذِبَ) یعنی جس سے سختی سے حساب لیا گیا وہ ضرور عذاب میں مبتلا ہوگا۔درحقیقت مجرم سے جب کوئی سوال کیا جاتا ہے اور اس میں سختی سے کام لیا جاتا ہے تو اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ حساب لے کر اُسے سزا دی جائے لیکن مومن کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات سے حصہ دینا ہے اس لئے اُس کے اچھے اچھے اعمال نکال کر اُس کے سامنے رکھے جائیں گے اور پوچھا جائے گا کہ بتاؤ۔کیا تم نے یہ کام کئے تھے اور جب وہ اقرار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل کر دے گا۔ گویا کافر کے حساب کی غرض اُسے ذلیل کرنا ہے لیکن مومن کے حساب کی غرض یہ ہوگی کہ اس کے اچھے اچھے کام لوگوں پر ظاہر کئے جائیں اور انہیں پتہ لگے کہ اُس نے کیسے کیسے نیک اعمال کئے ہیں۔اسی طرح فرماتا ہے اُس دن موؤدہ کے بارہ میں مجرموں سے سختی سے سوال کیا جائے گا اور اُن سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ تم نے جوان کو زندہ درگور کیا تھا تو اُن کا کیا قصور تھا؟

یہاں مفسّرین نے ایک بحث کی ہے جو گو ایک ضمنی مضمون کے طور پر نکلتی ہے لیکن وہ ایک نہایت ہی اہم مضمون ہے۔اگرچہ جہاں تک عقائد کا سوال ہے وہ مضمون غیر اہم ہے اور اس لحاظ سے بھی اس کا چندہ فائدہ نہیں کہ اگلے جہان کے متعلق اُس میں بحث کی گئی ہے جس کا اس جہان میں کوئی زیادہ فائدہ نہیں ہوسکتا۔لیکن بہرحال چونکہ وہ ایک علمی مضمون ہے اس لئے میں اُس مضمون کو اس جگہ بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سے زمخشری کا یہ خیال کہ مشرکین کے بچے نجات پا جائیں گے مفسّرین لکھتے ہیں وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ سے زمخشری نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مشرکوں کے بچے نجات پا جائیں گے۔انہوں نے یہ استدلال اس رنگ میں کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں اس آیت میں یہ ذکر آتا ہے کہ مَوْءٗدَۃُ سے یا مَوْءٗدَۃُ کے بارے میں (ان دونوں میں سے کوئی سمجھ لو) یہ سوال کیا جائے گا بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ کہ وہ کس گناہ کے بدلہ میں ماری گئی ہے (تفسیر کشاف زیر آیت ھذا)۔وہ کہتے ہیں اس آیت سے یہ پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اُسے صَاحِبَۃُ الذَّنب قرار نہیں دیا اگر وہ صَاحِبَۃُ الذَّنب ہوتی تو اس کے متعلق یہ نہ کہا جاتا کہ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ اسی بحث میں دوسرے مفسّرین بھی پڑ گئے ہیں کہ زمخشری نے اس آیت سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں یا یہ مسئلہ اپنی ذات میں غلط ہے یا درست۔جہاں تک اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ مجرموں کے بچے بَری ہیں اور وہ جنت میں جائیں گے

اس میں زمخشری نے حضرت ابن عباسؓ کی اتباع کی ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ بعض لوگ کہتے ہیں مشرکین کے بچے جہنمی ہوں گے۔ آپ نے فرمایا وہ جھوٹ بولتے ہیں قرآن کریم میں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ کفار کے بچے جہنم میں جائیں گے وہ جھوٹ بولتا ہے (مگر صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ یہ اثر ضعیف ہے) اس میں حضرت ابن عباس نے بھی اسی آیت سے استدلال کیا ہے مگر حضرت ابن عباسؓ نے وجہ استدلال نہیں بتائی صرف آیت بتا دی ہے لیکن زمخشری نے وجہِ استدلال بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ کو قرار دیا ہے۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کفار کے بچوں کو بری قرار دیا گیا ہے۔

زمخشری کے استدلال کی تردید مگر جہاں تک زمخشری کا استدلال اس آیت سے ہے وہ بالکل غلط ہے بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکل سکتا کہ کفّار کے بچے جنت میں جائیں گے۔ اس لئے کہ کسی خاص شخص کا اگر کسی خاص پہلو میں مجرم ہونا ثابت نہ ہو تو یہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ وہ کسی لحاظ سے بھی مجرم نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور لحاظ سے مجرم اور گنہگار ہو۔ بے شک جہاں تک بچے کا سوال ہے اور جہاں تک صرف اس جرم کا تعلق ہے یہ استدلال درست ہے لیکن عام طور پر نہیں کیوں کہ ایک جرم کے نہ ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ دوسرا کوئی جُرم بھی نہیں ہے۔ پس میں زمخشری کے اس نتیجہ سے اختلاف کرتے ہوئے اس سلسلۂ مضامین کی بعض اور کڑیاں بیان کرتا ہوں۔ آخر میں مَیں اس بارہ میں اپنے نقطۂ نگاہ کی بھی وضاحت کر دوں گا۔

زمخشری کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ کا بھی ایک قول پیش کیا جاتا ہے مگر چونکہ انہوں نے وجہ استدلال بیان نہیں کی اس لئے ہمیں دوسری نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیے زمخشری نے کہا ہے کہ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ مگر جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اس آیت سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ کیوں کہ کسی ایک جرم میں کسی کا مجرم نہ ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ کسی لحاظ سے بھی مجرم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بعض اور وجوہ سے مجرم ہو۔ لیکن ایک بات ضرور ہے جو زمخشری کے حق میں ہے اور وہ یہ کہ یہ سوال ایک بچہ کے متعلق ہے اور جب بچہ کے متعلق سوال ہے تو چونکہ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ایک نابالغ بچہ کے متعلق ہے اور وہ شریعت کا مکلّف نہیں اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر اُس نے یہ گناہ نہیں کیا تو کوئی اور گناہ کیا ہوگا۔ گو عام طور پر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جب اُس نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا جو اُسے اس سزا کا مستحق بناتا تو معلوم ہوا وہ بالکل بری ہے درست نہیں۔ لیکن بہرحال جب یہ سوال ایسے بچہ کے متعلق ہوگا جو بالغ نہیں تو بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ میں مَوْءٗدَةُ کے گناہ کا ذکر نہیں سمجھا جائے گا بلکہ اُسے مارنے والے کے گناہ کا اس میں ذکر سمجھا جائے گا کہ تو نے یہ فعل کس بناء پر کیا تھا۔

مشرکین کے بچوں کے جنت میں جانے کے بارہ میں علماء کا اختلاف مشرکین کی اولاد کے بارہ میں علماء میں سخت اختلاف ہے کہ وہ جنّتی ہے یا نہیں۔ اس بارہ میں احادیث بھی اور آثار بھی بعض لوگوں نے نقل کئے ہیں جو یہ ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے سلمة بن یزید الجعفی سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْوَائِدَۃُ وَالْمَوْءٗدَۃُ فِی النَّارِ اِلَّا اَنْ تُدْرِكَ الْوَائِدَۃُ الْاِسْلَامَ فَیَعْفُوَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھَا (بحوالہ روح المعانی وابن کثیر) کہ زندہ گاڑنے والی اور زندہ گاڑی ہوئی دونوں جہنمی ہیں سوائے اس کے کہ جو گاڑنے والی زندہ رہ جائے وہ اسلام کا زمانہ پالے تو اسلام قبول کرنے سے اس کو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا۔ نسائی نے بھی یہ حدیث بیان کی ہے مگر نسائی کے راوی داؤد بن ہند بہ ہیں۔ اور ابن ابی حاتم نے بھی ابن مسعود سے یہ روایت کی ہے کہ اَلْوَائِدَۃُ وَالْمَوْءٗدَۃُ فِی النَّارِ (ابن کثیر) یعنی زندہ گاڑنے والی اور زندہ گاڑی ہوئی دونوں جہنمی ہیں۔ اسی طرح ابوداؤد اور نسائی حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّ اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ اَوْلَادِ الْمُشْرِکِیْنَ۔ فَقَالَ ''اَللّٰہُ تَعَالٰی۔ اِذْخَلَقَھُمْ۔ اَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا عَامِلِیْنَ'' یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کی اولاد کے بارہ میں سوال کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب اُن کو پیدا کیا تھا تو وہ خوب جانتا تھا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔ اس سے بھی وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دوزخیوں کے گھر میں پیدا کیا تھا اس لئے وہ جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔ ان معنوں کی تائید میں وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت بھی نقل کرتے ہیں جو ابوداؤد میں آتی ہے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ذَرَارِی الْمُؤْمِنِیْنَ میں نے کہا یا رسول اللہ! مومنوں کی اولاد کے متعلق کیا فتویٰ ہے؟ فَقَالَ مَنْ اٰبَآءِ ھِمْ۔ آپ نے فرمایا وہ اپنے آباء کے ساتھ ہیں قُلْتُ بِلَاعَمَلٍ میں نے کہا یا رسول اللہ! کیا بغیر عمل کے؟ قَالَ۔ اَللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا عَامِلِیْنَ۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ وہ کرنے والے تھے۔ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ فَذَرَارِی الْمُشْرِکِیْنَ میں نے کہا یا رسول اللہ! مشرکین کی اولاد کے متعلق کیا حکم ہے؟ فَقَالَ مَعَ اٰبَآءِ ھِمْ۔ آپ نے فرمایا وہ اپنے آباء کے ساتھ ہیں قُلْتُ بِلَا عَمَلٍ میں نے کہا یا رسول اللہ کیا بغیر عمل کے؟ قَالَ۔ اَللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا عَامِلِیْنَ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اُس کو بہتر جانتا ہے جو کچھ وہ کرنے والے تھے (سنن ابو داؤد کتاب السنة باب ما فی ذراری المشرکین) اس حدیث کو پہلی حدیث سے ملا کر وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ اولاد مشرکین نے آئندہ مشرک ہی ہونا تھا اس لئے ضروری ہے کہ ان کو دوزخ میں داخل کیا جائے اس کے علاوہ مسند احمد بن حنبل میں حضرت خدیجہؓ کی طرف منسوب کر کے ایک روایت آتی ہے کہ اُنہوں نے رسول کریم صلے اللہ

علیہ وسلم سے اپنے دو بچوں کے متعلق پوچھا جو جاہلیت کے زمانہ میں فوت ہوئے تھے کہ اُن کا کیا حال ہے؟ آپ نے فرمایا هُمَا فِي النَّارِ وہ دونوں دوزخ میں ہیں۔ (مسند احمد بن حنبل مسند حضرت عبداللہ بن مسعودؓ)

یہ وہ احادیث اور آثار ہیں جن سے مشرکوں کے بچوں کے دوزخ میں جانے کے متعلق استدلال کیا جاتا ہے۔ امام نووی شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں کہ تمام علماء جن کی رائے وقعت رکھتی ہے اس امر پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کے بچے جنت میں جائیں گے کیونکہ وہ مکلّف نہیں (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج كتاب القدر باب معنى كل مولود يولد على الفطرة) لیکن بعض نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مندرجہ ذیل حدیث کی وجہ سے توقف کیا ہے۔

حدیثوں میں آتا ہے ایک انصاری بچہ ایک دفعہ مر گیا جب یہ خبر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں پہنچی تو آپ نے فرمایا طُوْبٰى لَهٗ عُصْفُوْرٌ مِنْ عَصَافِيْرِ الْجَنَّةِ کہ کیا برکت والا انجام ہے یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی لَمْ يَعْمَلِ السُّوْٓءَ وَلَمْ يُدْرِكْهُ۔ کہ نہ کوئی بُرا عمل کیا اور نہ کسی بُرے عمل کی عمر تک پہنچا۔ قَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَغَيْرَ ذَالِكَ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر فرمایا کہ یا پھر وہ دوزخی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا يَا عَائِشَةُ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ لِلْجَنَّةِ اَهْلًا خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِيْ اَصْلَابِ اٰبَآءِهِمْ وَخَلَقَ لِلنَّارِ اَهْلًا خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِيْ اَصْلَابِ اٰبَآءِهِمْ۔ یعنی اے عائشہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے مناسب حال کچھ لوگوں کو پیدا کیا ہے اور اُن کو اس وقت سے اُس نے جنت کا اہل بنا دیا ہے جبکہ وہ ابھی اپنے باپ دادا کی پیٹھوں میں تھے اور کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں داخل کرنے کے لئے پیدا کیا ہے اور ان کو اُس وقت سے دوزخ کا مستحق قرار دے دیا ہے جب کہ وہ ابھی اپنے آباء کی پیٹھوں میں تھے (مسلم كتاب القدر باب معنى كل مولود يولد على الفطرة)۔ جو لوگ اِس بات کے قائل ہیں کہ مومنوں کی اولاد مرنے کے بعد جنت میں جاتی ہے وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ شاید رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب ہوگا کہ بے دلیل بات سے قطعی نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے۔ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک استدلال ہے اس استدلال پر اپنے عقیدہ کی بنیاد کیوں رکھتی ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ شائد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے انکشاف حقیقت سے پہلے یہ فرمایا ہو۔ جب آپ پر انکشاف حقیقت ہو گیا۔ اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا کیا منشاء ہے تو آپؐ نے اپنے اس عقیدہ کو بدل لیا چنانچہ وہ اس انکشافِ حقیقت کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ بعد میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَّمُوْتُ لَهٗ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْوَلَدِ لَمْ يَبْلُغُوا الْحِنْثَ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ تَعَالَى الْجَنَّةَ بِفَضْلِ رَحْمَتِهٖ اِيَّاهُمْ کہ کوئی ایسا مسلمان نہیں کہ جس کے تین بیٹے مرے

ہوں اور وہ ایسی عمر کو ابھی نہ پہنچے ہوں جس میں انسان گنہگار رہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحمت سے ان سب کو جنت میں داخل کر دے گا (سنن نسائی کتاب الجنائز باب من یتوفی له ثلاثة۔ روح المعانی زیر آیت ھذا)۔ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى الْجَنَّةَ بِفَضْلِهٖ وَبِرَحْمَتِهٖ اِيَّاهُمْ وہ بھی اور اس کی اولاد بھی سب جنت میں چلے جائیں گے۔ یہ حدیث صاف بتاتی ہے کہ مومنوں کی اولاد جنت میں جائے گی۔ جب آپؐ نے انصاری لڑکے کے متعلق فرمایا کہ تم کیوں کہتی ہو وہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے تو معلوم ہوتا ہے اُس وقت تک ابھی آپ پر اس کے متعلق انکشاف نہیں ہوا تھا۔

کفار و مشرکین کے بچوں کی نجات و عدم نجات کے متعلق تین مذاہب باقی رہے کفار و مشرکین کے بچے۔ سو اُن کے متعلق تین مذاہب ہیں۔ اکثر کہتے ہیں کہ وہ دوزخ میں جائیں گے اور اُن کا استدلال اسی حدیث سے ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ۔ دوسرا گروہ اس کی نسبت خاموش ہے وہ کہتا ہے ہمیں کیا پتہ کہ کیا ہوگا۔ یہ قیامت سے تعلق رکھنے والی بات ہے اس لئے ہم اس میں دخل نہیں دے سکتے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ جنّتی ہیں اور وہ کئی دلیلوں سے استدلال کرتے ہیں۔ اُن میں سے زیادہ تر انحصار اُن کا اس حدیث پر ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ بچوں کو لے کر ایک بڑے درخت کے نیچے جنت میں بیٹھے ہیں اور ان بچوں کو کھلا رہے ہیں لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ! وَاَوْلَادُ الْمُشْرِكِيْنَ کہ کیا مشرکوں کی اولاد بھی اس میں شامل ہے؟ قَالَ وَاَوْلَادُ الْمُشْرِكِيْنَ آپ نے فرمایا ہاں مشرکین کی اولاد بھی اس میں شامل ہے (بخاری بحوالہ روح المعانی زیر آیت ھٰذا) اسی طرح اس آیت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل:۱۶) یعنی جب تک بعثتِ رسول نہ ہو جائے عذاب نازل نہیں ہو سکتا اور چونکہ بچوں کی طرف رسول کی بعثت نہیں ہوتی کیونکہ وہ مکلّف نہیں۔ بعثتِ رسول اُسی کی طرف ہوتی ہے جو مکلّف ہو اس لئے معلوم ہوا کہ اُن کو کوئی عذاب نہیں ہوگا۔

اِن تین مذاہب کے علاوہ بعض اور مذاہب بھی ہیں۔ چنانچہ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ بچے جنّت اور دوزخ کے درمیان عالمِ برزخ میں رہیں گے اور ایک یہ مذہب ہے کہ اُن کا دوبارہ امتحان ہوگا اور اس کے نتیجہ کے مطابق وہ جنت و دوزخ میں جائیں گے اور وہ امتحان اس طرح ہوگا کہ انہیں کہا جائے گا کہ جاؤ دوزخ میں چلے جاؤ۔ جو دوزخ میں جانے پر راضی ہو جائیں گے وہ مطیع ہوں گے اور جنت میں بھیج دیئے جائیں گے اور جو دوزخ میں جانے سے انکار کریں گے وہ کافر قرار دیئے جا کر دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔ چنانچہ وہ لوگ اس حدیث سے بھی جو اُوپر گزر چکی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کے متعلق فرمایا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ یہی

استدلال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ان الفاظ میں ابہام سے کام لیا گیا ہے آخری نتیجہ بیان نہیں کیا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے محض یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ اگر انہیں تبلیغ پہنچتی تو وہ کیا کرتے یعنی اُس وقت انہوں نے جو جو اعمال کرنے تھے وہ خدا تعالیٰ کے علم میں ہیں اور وہ جانتا ہے کہ اُن کا انجام کیا ہوتا۔ پس اس حدیث سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اُن کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے بلکہ حدیث اپنے الفاظ کے ذریعہ اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ ان کو موقعہ ملنے پر جو کچھ انہوں نے کرنا تھا اللہ تعالیٰ اُسے جانتا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے اسی جواب کو ترجیح دی ہے (روح المعانی زیر آیت ھذا)۔ اس خیال کی ان احادیث سے بھی تائید ہوتی ہے کہ پاگل، فاترالعقل اور وہ بڈھے جن کے ہوش وحواس ٹھکانے نہیں رہتے اُن کی طرف اللہ تعالیٰ اگلے جہان میں دوبارہ نبی مبعوث کرے گا (مسند احمد بن حنبل حدیث الاسود بن سریع)۔ امام سیوطی نے بھی اسی خیال کو ترجیح دی ہے مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے ایک اور خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ بچوں کا حشر تو ہوگا لیکن بچہ چونکہ مکلّف نہیں اس لئے وہ کہتے ہیں مشرکین کے بچے زندہ تو کئے جائیں گے لیکن پھر جانوروں کی طرح مٹی کر دئے جائیں گے۔ اس استدلال پر وہ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ والی آیت سے ہی مجبور ہوئے ہیں کیوں کہ اس میں یہ ذکر آتا ہے کہ مَوْءٗدَةُ کے بارہ میں سوال کیا جائے گا اور یہ سوال اُس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک اُسے زندہ نہ کیا جائے پس وہ اس امر کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ بچوں کو بھی دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اُن کے بارہ میں مجرموں سے دریافت کیا جائے گا کہ انہوں نے ان کو کس قصور کی بناء پر زندہ درگور کیا تھا۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے حدیثوں میں آتا ہے کہ ایک بکری جس نے دوسری بکری کو دنیا میں سینگ مارا ہوگا قیامت کے دن ان کو بھی زندہ کیا جائے گا اور جسے سینگ مارا گیا ہوگا اُسے کہا جائے گا کہ وہ دوسری کو سینگ مارے (مسلم کتاب البر و الصلۃ الآداب۔ باب تحریم الظلم)۔ پس وہ اس آیت سے یہ بات ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ بچوں کا بھی حشر ہوگا مگر وہ کہتے ہیں چونکہ بچے اپنی ذات میں جنّت کے مستحق نہیں ہوں گے اس لئے ان سوالات کے بعد ان کو مٹی کر دیا جائے گا جیسے جانوروں کو اُن کا حق دلانے کے بعد فنا کر دیا جائے گا۔ حضرت امام احمد صاحب سرہندی نے امام سیوطی کی آخری رائے کی تائید کی ہے کہ بچے زندہ تو ہوں گے مگر پھر انہیں فنا کر دیا جائے گا۔ (تفسیر روح المعانی زیر آیت ھذا)

جن لوگوں نے بچوں کو جنتی قرار دیا ہے اُن میں اِس بات پر بحث ہوئی ہے کہ بچے جو جنّتی ہوں گے تو آخر کسی استحقاق کے ماتحت تو نہیں ہوں گے کیوں کہ انہوں نے کوئی عمل نہیں کیا ہوگا پھر جنت میں اُنہیں کیوں رکھا جائے گا۔ اس پر بعض کہتے ہیں کہ یہ خدا کی دین ہے وہ جس طرح چاہے کرے اس میں کسی انسان کو دخل دینے کا کیا حق ہے اور

بعض کہتے ہیں کہ وہ جنت میں خدّام کے طور پر ہوں گے اور ماں باپ اُن کو دیکھ دیکھ کر خُوش ہوں گے پس وہ وہاں بطور استحقاق کے نہیں جائیں گے بلکہ کام اور خدمت کے لئے جائیں گے۔ (اوپر کے اقوال و احادیث تفسیر روح المعانی سے نقل کی گئی ہیں)

اسی طرح مسند امام احمد بن حنبل میں ایک روایت آتی ہے جس کی آخری راویہ ایک عورت ہیں یعنی خنساء کی چچی یا پھوپھی ان سے روایت ہے کہ وہ کہتی ہیں قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَنْ فِی الْجَنَّۃِ۔ میں نے کہا یا رسول اللہ جنت میں کون کون جائے گا؟ قَالَ اَلنَّبِیُّ فِی الْجَنَّۃِ آپ نے فرمایا نبی جنت میں جائے گا وَالشَّھِیْدُ فِی الْجَنَّۃِ اور شہید جنت میں جائے گا وَالْمَوْلُوْدُ فِی الْجَنَّۃِ اور چھوٹا بچہ بھی جنت میں جائے گا وَالْمَوْءٗدَۃُ فِی الْجَنَّۃِ اور موؤدۃ بھی جنت میں جائے گی۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے حسن سے مرسل روایت کی ہے قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَنْ فِی الْجَنَّۃِ قَالَ اَلْمَوْءٗدَۃُ فِی الْجَنَّۃِ آپ سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ جنت میں کون جائے گا؟ آپ نے فرمایا موءٗدہ جنت میں جائے گی۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے ابن عباسؓ سے بھی یہ روایت کی ہے کہ اَطْفَالُ الْمُشْرِکِیْنَ فِی الْجَنَّۃِ فَمَنْ زَعَمَ اَنَّھُمْ فِی النَّارِ فَقَدْ کَذَبَ یَقُوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَاِذَا الْمَوْءٗدَۃُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (ابن کثیر زیر آیت ھذا)۔

یہ وہ پرانے اقوال ہیں جو مومنوں اور مشرکوں کے بچوں کے متعلق ہمیں احادیث اور آئمہ سابقین کی کتب میں سے ملتے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ مومنوں کے بچوں کے جنت میں جانے کے متعلق قریباً قریباً تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ صرف دو حدیثیں ایسی ہیں کہ اگر وہ صحیح ہوں تو اس مسئلہ کو کسی قدر مشتبہ کر دیتی ہیں۔ جن میں سے ایک وہ حدیث ہے جس میں حضرت خدیجہؓ کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے دو بچے جو جاہلیت میں مر گئے تھے اُن کا کیا حال ہے آپ نے فرمایا وہ دوزخ میں ہیں۔ پس یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مومنوں کے بچے بہرصورت جنت میں جائیں گے تو حضرت خدیجہؓ کے ایک سوال کے جواب میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں فرمایا کہ وہ دونوں بچے دوزخ میں ہیں۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق روایت آتی ہے کہ جب آپ نے ایک انصاری بچے کے متعلق فرمایا کہ اس کا انجام بڑا مبارک ہوا ہے وہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَوْ غَیْرَ ذَالِکَ یا شاید وہ دوزخی ہو اور پھر یہ دلیل بھی دی کہ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَلَقَ لِلْجَنَّۃِ اَھْلًا خَلَقَھُمْ لَھَا وَھُمْ فِیْ اَصْلَابِ اٰبَآءِھِمْ وَخَلَقَ لِلنَّارِ اَھْلًا خَلَقَھُمْ لَھَا وَھُمْ فِیْ اَصْلَابِ اٰبَآءِھِمْ (مسلم کتاب القدر باب معنی کل مولود یولد علی الفطرۃ و

حکم موت اطفال) جب تک اِن دونوں حوالوں کو ہم حل نہ کرلیں اُس وقت تک کسی صحیح نتیجہ پرنہیں پہنچ سکتے۔

اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت کہ بعض لوگ جنت کے لئے پیدا کر دیئے گئے ہیں اور بعض لوگ دوزخ کے لئے درست ہے، تو ہم ایک مومن کے بچہ کے متعلق بھی یہ یقینی طور پرنہیں کہہ سکتے کہ وہ جنّتی ہے یا دوزخی ۔اوراس طرح سارا استدلال باطل ہوجا تا ہے۔جیسا کہ میں بتا چکا ہوں محدثین نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ یہ پہلے کی بات ہوگی ۔جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ابھی انکشاف حقیقت نہیں ہوا تھا جب انکشاف ہو گیا تو آپ نے اپنے عقیدہ کو بدل دیا۔مگر اس میں ایک اور مشکل یہ پیش آجاتی ہے کہ حدیثوں میں ہی ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ بچوں کو لے کر ایک جگہ جنت میں بیٹھے ہیں اور آپ نے فرمایا کہ ان بچوں میں مشرکین کے بچے بھی تھے۔ یہ واقعہ معراج سے تعلق رکھتا ہے اورمعراج کی حدیث ۵ سنہ بعد دعویٰ نبوت کی ہے گویا ہجرت سے آٹھ سال پہلے یہ انکشاف آپ پر ہو چکا تھا۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شادی ہجرت سے ایک سال بعد ہوئی ہے اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نو سال قبل اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر یہ انکشاف ہو چکا تھا اور جب اس کی طرف سے انکشاف ہو چکا تھا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کس طرح ایسی بات کہہ سکتے تھے جو اس انکشاف کے خلاف ہوتی ۔پس یہ جواب بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

بہر حال جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہ ہمیں ایک دوسری سے ٹکراتی ہوئی ملتی ہیں اور جب وہ ایک دوسری سے ٹکراتی ہوئی نظر آتی ہیں تو ہمیں قرآن شریف کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ اس بارہ میں وہ کیا تعلیم پیش کرتا ہے کیونکہ قرآن شریف وہ کلام ہے جو خدا تعالیٰ نے نازل کیا اور جسے بغیر کسی خطرہ کے ہم قبول کرنے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں ۔ بے شک حدیثوں میں سے بعض ایسی ہیں جو صحاح میں آئی ہیں اور وہ بڑے پایہ کی ہیں مگر بہر حال حدیثوں میں یا تو خلط ہو گیا ہے اور یا پھر وضاعین نے وضع کی ہیں اس لئے ہم اس مسئلہ کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے قرآن شریف کی طرف توجہ کرتے ہیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (آل عمران: ۱۸۳) کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔اور جب وہ ظلم نہیں کرتا تو یہ کس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ بچوں کو بغیر قصور کے دوزخ میں داخل کر دے گا۔ وہ شخص جس نے کوئی فعل کیا ہی نہیں اور جو مکلّف ہی نہیں ہوا اس کو سزا دینا تو قطعی طور پر ظلم ہے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل: ۱۶) کہ ہم بغیر بعثتِ رسول کے لوگوں کو عذاب نہیں دیا کرتے محدثین نے بھی اس آیت سے استدلال کر کے بچوں کو بری قرار دیا ہے۔ پس ایک طرف اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ہم اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتے اور

دوسری طرف یہ فرمانا کہ جب تک ہم رسول بھیج کر لوگوں پر اپنی حجت تمام نہ کرلیں ان کو اپنے عذاب میں مبتلا نہیں کرتے بتلا رہا ہے کہ بچے عذاب کے مورد نہیں ہو سکتے کیونکہ نہ انہوں نے کوئی جرم کیا اور نہ ان کی طرف بعثتِ رسول ہوئی۔اسی طرح فرماتا ہے وَ لَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى (طٰهٰ:۱۳۵) یعنی اگر ہم قرآن اتارنے سے پہلے کسی عذاب سے ان لوگوں کو ہلاک کر دیتے۔تو بے شک یہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے ہم تیرے حکم پر چلتے۔اسی مضمون کو ایک اور جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (المائدة:۲۰) یعنی اے اہل کتاب جب رسولوں کے آنے میں مدتوں تک ناغہ رہا تو ہمارا رسول تمہارے پاس آیا جو احکام الٰہی تم سے صاف صاف بیان کرتا ہے اور ہم نے یہ رسول اس غرض سے بھیجا کہ مبادا کل کو کہیں تم کہنے لگو کہ ہمارے پاس نہ تو کوئی نجات کی خوشخبری سنانے والا اور نہ عذاب الٰہی سے ڈرانے والا آیا تو اب تو تم کو اس عذر کی بھی گنجائش نہیں رہی۔کیونکہ تمہارے پاس خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا آچکا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ حجتِ صحیحہ اس بات کو قرار دیتا ہے کہ کسی نبی کی پہلے بعثت ہو اور پھر لوگ یا اُس کی تکذیب کریں اور یا اس پر ایمان لے آئیں۔کیوں کہ فرماتا ہے ہم نے اسی لئے تمہاری طرف نبی بھیجے ہیں تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ دو کہ ہماری طرف کوئی رسول نہیں آیا تھا۔گویا باوجود اس کے کہ ان میں عقل موجود تھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر ہم تمہاری طرف نبی نہ بھیجتے تو ہم تم کو بری سمجھتے جب بڑی عمر کے آدمی بھی نبی کی بعثت کے بغیر بری سمجھے جا سکتے ہیں تو اُن بچوں کو جو نبی کی حقیقت سمجھنے کے قابل ہی نہیں اور جو احکامِ شریعت کے مکلّف ہی نہیں اُن کو ملزم قرار دینا اور کہنا کہ وہ دوزخ میں جائیں گے یقیناً قرآن کریم کے خلاف ہے۔قرآن کریم نے یہ اصول رکھا ہے کہ جس شخص میں عقل موجود ہے مگر نبی اس کی طرف نہیں آیا وہ بھی مجرم نہیں۔پھر جس میں عقل وفہم کا مادہ بھی نہ ہو وہ کس طرح مجرم قرار دیا جاسکتا ہے؟ بہر حال قرآن ان معنوں کو ردّ کرتا ہے۔جب اللہ تعالیٰ عقلمندوں کو بھی نبی کی بعثت کے بغیر قابلِ سرزنش قرار نہیں دیتا تو جن پر رسول کی موجودگی میں بھی حجت نہیں ہوسکتی تھی ان کو کس طرح عذاب مل سکتا ہے۔پس قرآن کریم کی آیات سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ عقیدہ بالکل غلط ہے کہ بچے دوزخ میں جائیں گے۔اب رہا یہ سوال کہ اگر بچے مکلّف نہیں ہیں تو پھر مومنوں اور کفار کے بچوں کا کیا حال ہوگا؟ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ جہاں تک مومنوں کے بچوں کا سوال ہے حدیث معراج اس کی تائید میں ہے کہ وہ جنت میں

جائیں گے اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ حدیثِ معراج بڑے پایہ کی ہے اور بڑے تواتر سے آتی ہے اور مختلف اَسناد سے آتی ہے اور گو اس میں بعض مقامات پر اضطراب بھی پایا جاتا ہے لیکن اصولی طور پر حدیثِ معراج کی طرف محدثین کی بڑی نظر پڑی ہے۔ پس حدیثِ معراج اس بات کی دلیل ہے کہ مومنوں کے بچے جنت میں رکھے جائیں گے۔ دوسرے عقلی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ مومن کی تسلّی اور اسکی خوشی کے لئے جنت میں اُس کے بچوں کا ہونا نہایت ضروری ہے اللہ تعالیٰ جنّتیوں کے متعلق فرماتا ہے لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ (النحل:۳۲) وُہ اُس میں جو کچھ چاہیں گے اُن کو مل جائے گا اور جب یہ صورت ہے تو ایک ماں تو سب سے پہلے یہ خواہش کرے گی کہ میرا بچہ مجھے واپس دے دو۔ ہم نے دیکھا ہے جب کوئی عورت مرنے لگتی ہے تو وہ اُس وقت کہتی ہے کہ میرا بچہ جو مر چکا ہے میں اب اُس سے جا کر ملوں گی۔ پس عقل بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ عورتوں کی تسلّی اور ان کے اطمینان کے لئے اُن کے بچے اُنہیں ملنے چاہئیں چاہے وہ کسی صورت میں ملیں۔ یہ بحث نہیں وہ خواہ خدم کے طور پر ملیں یا کھلونے کے طور پر، بہرحال ملنے چاہئیں سوائے اس کے جو دوزخی ہو اور خُدا اور اس کے رسول کا مخالف ہو کیونکہ ایسے لڑکے سے مومن اپنے تعلق کو کاٹ دے گا اور اس کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ وُہ اس سے ملے۔ بہرحال اگر کوئی لڑکا بالغ ہے اور پھر کافر اور مشرک ہے تب تو کوئی اعتراض نہیں اللہ تعالیٰ اُسے جہاں چاہے رکھے ایک مومن کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا اور نہ اُسے کوئی دُکھ ہوسکتا ہے کیونکہ اُس کی محبت وہ اپنے دل سے نکال دیتا ہے لیکن جو بچہ بالغ نہیں جو معصومیت کی حالت میں فوت ہوا ہے۔ عقل اور فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اُسے اپنے ماں باپ کے پاس جنت میں رکھا جائے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جنت اسی صورت میں جنت ہوسکتی ہے جب ماں کے پاس اس کے بچے موجود ہوں۔ اس عقلی تائید کی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حدیثِ معراج عین فطرت کے مطابق ہے۔ باقی رہے کفار و مشرکین کے بچے سو گو بعض حدیثیں اس بات کی تائید میں ہیں کہ وہ دوزخ میں جائیں گے لیکن بعض ایسی بھی حدیثیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے جیسا کہ حدیثِ معراج میں ہی اولاد المشرکین کا بھی ذکر آتا ہے مگر یہ مسئلہ ایسا اہم نہیں۔ جہاں تک مومن کی اولاد کا مسئلہ ہے بیشک وہ اہم ہے۔ لیکن جہاں تک مشرکوں کی اولاد کا مسئلہ ہے وہ اپنے اندر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر یہ فیصلہ ہو کہ اولادِ مشرکین کے جنت میں جانے والی حدیثیں بھی صحیح ہیں اور دوزخ میں جانے والی حدیثیں بھی صحیح ہیں تو رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف:۱۵۷) کے مطابق ہم اُن کے جنت میں جانے والی حدیثوں کو ترجیح دے دیں گے کیونکہ قرآن نے یہ اصول بتا دیا ہے کہ جب دو چیزیں ٹکرا جائیں تو جس میں رحمت کا پہلو زیادہ ہو وہ لے لو۔ کیونکہ خدا کی رحمت اُس کے

غضب پر غالب ہوتی ہے۔ پس اگر دونوں حدیثیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوں اور ہم کوئی فیصلہ نہ کر سکیں کہ ان میں سے کن کو ترجیح دی جائے تو درائت یہی کہے گی کہ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ کے اصول کے مطابق جنت میں جانے والی حدیثوں کو ترجیح دے دو۔ لیکن اگر یہ نہ ہو تو میرے نزدیک اس بات کو مدنظر رکھ کر کہ دوزخی جب جنت میں جائے گا تو اس کا وہ مقام نہیں ہو سکتا جو براہِ راست جنت میں جانے والے کا ہو سکتا ہے یہ ممکن ہے کہ شروع سے جنتی اور بعد میں جنت میں جانے والے میں یہ ایک امتیاز ہو کہ شروع سے جنتی کی صغیر اولاد بھی اُس کے پاس رکھی جائے خواہ ایک تابع کی شکل میں۔ اور بعد میں آنے والے کی صغیر اولاد فنا کر دی جائے کیونکہ وہ اپنی ذات میں مستحق نہیں اور بالواسطہ استحقاق کا فائدہ اُسے پہنچا نہیں۔

قیامت کو بچوں کی طرف نبی کی بعثت اگر اس حدیث کو اصل قرار دے لو جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بچوں کی طرف دوبارہ نبی مبعوث ہو گا (دیکھو مسند احمد بن حنبل حدیث اسود بن سریع بحوالہ روح المعانی زیر آیت مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا) تو پھر یہ بحث ہی فضول ہے کیونکہ اس کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں نہ مومنوں کے بچوں کا سوال رہتا ہے اور نہ کافروں کے بچوں کا سوال رہتا ہے۔ پھر حدیث معراج کے یہ معنے ہوں گے کہ یوم البعث تک تو تمام بچے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس رہیں گے اور وہ جنت کا کھلونا بنے رہیں گے پھر ان کی طرف نبی مبعوث کیا جائے گا اور وہ اس پر ایمان لا کر یا اس کی تکذیب کر کے جنت یا دوزخ میں چلیں جائیں گے۔ لیکن اگر اس حدیث کے کوئی دوسرے معنے کئے جائیں۔ جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ فطرتی ایمان پر وہاں فیصلہ کر دیا جائے گا تو پھر اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ دوزخی نے تو بہرحال دوزخ میں جانا ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کی صغیر اولاد کو بطور ترحم مٹا دیا جائے گا تو اس میں کوئی ظلم نہیں۔ مومنوں کے بچوں کا ان کی دلجوئی کے لئے کسی شکل میں جنت میں جانا عین رحم ہے لیکن کافر چونکہ اپنے دل کا چین دوزخ میں پہلے ہی کھو چکا ہو گا اس لئے اس کی صغیر اولاد کو مٹا دیا جائے گا اور یہ اس پر رحم ہو گا ظلم نہ ہو گا گویا مومنوں کی صغیر اولاد تو اپنے ماں باپ کے ساتھ جنت میں رکھی جائے گی لیکن کفار کی صغیر اولاد جانوروں کی طرح مٹی کر دی جائے گی ان معنوں کو تسلیم کرنے کی صورت میں دونوں اقوال میں تطبیق ہو جاتی ہے اور حضرت امام احمد صاحب سرہندی کی رائے سب سے زیادہ صحیح اور درست معلوم ہوتی ہے۔

مومنوں کے چھوٹے فوت شدہ بچوں کا جنت میں مقام باقی رہا یہ کہ وہ جنت میں کس حیثیت سے رہیں گے؟ یہ صرف ایک علمی سوال ہے۔ ورنہ جس طرح خدا چاہے رکھے اس میں ہمارا کیا دخل ہو سکتا ہے مگر مجھے قرآن کریم

کی دو آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ نعماء جنت سے پوری طرح متمتع ہونے والے وجود صرف بالغ ہی ہوں گے۔ دوسرے صرف دلجمعی کے لئے جنتیوں کے پاس رکھے جائیں گے پہلے میں سمجھتا تھا کہ جس طرح ماں باپ جنت میں جائیں گے اسی طرح بچے جنت میں رکھے جائیں گے مگر اب مجھے قرآن پر غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ گو چھوٹے بچے بھی جنت میں رکھے جائیں گے مگر ان کی حیثیت میں کسی قدر فرق ہوگا۔ اِن دو آیتوں میں سے جن سے مومنوں کے بچوں کے جنت میں مختلف حیثیت میں جانے کا پتہ ملتا ہے پہلی یہ ہے وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (الطور: ۲۲) یعنی جو لوگ ایمان لے آئے اور اُن کی اولاد ایمان میں اُن کی تابع ہو چکی ہے ان کی اولاد کو بھی ہم اُن سے ملا دیں گے اور اُن کے عمل سے ہم کچھ کم نہ کریں گے۔ اسی طرح فرماتا ہے جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ (الرعد: ۲۴) یعنی ہمیشگی کے باغات ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے اور اُن کے باپ دادا میں سے جنہوں نے اعمال صالحہ کئے تھے وہ بھی ان باغات میں داخل ہوں گے اور ان کی بیبیاں اور ان کی اولاد جو نیک ہوں گے وہ بھی وہاں ہوں گے۔ اسی طرح ملائکہ کی دعا ہے رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ اِلَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ (المومن: ۹) یعنی اے ہمارے رب انہیں ہمیشہ رہنے کے باغوں میں داخل کر جن کے دینے کا تُو نے وعدہ کیا ہے اور اُن کے باپ دادا اور اُن کی بیبیوں اور اولاد میں سے جو نیک ہوں اُن کو بھی جنت میں داخل فرما۔ اِن ساری جگہوں میں مَنْ صَلَحَ یا بِاِيْمَانٍ وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بچوں اور دوسروں کا جنت میں جانا اپنے اندر کچھ فرق ضرور رکھتا ہے۔ چونکہ اُن کی ارواح کو پورا ارتقاء حاصل نہیں ہوگا اس لئے ان کا جنت میں جانا بطور استحقاق نہیں ہوگا بلکہ اپنے ماں باپ کی خوشی کے لئے ہوگا اس لئے مفسرین کا ذہن اس طرف گیا ہے کہ اُن بچوں کو وہاں خدم کے طور پر رکھا جائے گا لیکن میں ان کا نام خدم نہیں رکھتا بلکہ کھلونا رکھتا ہوں۔ میرے نزدیک ان کی ارواح ایسی ترقی یافتہ نہیں ہوں گی کہ وہ جنت کی لذتوں سے پوری طرح متمتع ہو سکیں۔ دوسرے جنتیوں کے متعلق تو آتا ہے کہ ملائکہ جنت کے ہر دروازہ سے ان کے پاس آئیں گے اور کہیں گے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (الرعد: ۲۵) کہ تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے میں جو دنیا میں تم صبر کرتے رہے ہو یہ سب انعام اُسی کا صلہ ہے۔ پس دیکھو دار آخرت کا بدلہ کیسا اچھا ہے۔ مگر ملائکہ کا یہ سلام انہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو مَنْ اٰمَنَ میں داخل ہوں یا مَنْ صَلَحَ میں داخل ہوں۔ پس چونکہ ان آیات میں اِتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اور مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآءِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں۔ اور چھوٹے بچے نہ ایمان لاتے ہیں نہ اعلیٰ

درجہ کی صلاحیتیں اُن میں ہوتی ہیں اس لئے ان کو جنت میں وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا جو دوسروں کو حاصل ہوگا۔ پس جو بالغ ہوں گے یا بڑی عمر کے ہوں گے وہ تو جنت میں استحقاق کے طور پر جائیں گے مگر جو بچے چھوٹی عمر میں فوت ہو چکے ہوں گے وہ اگر بغیر کسی مزید امتحان کے جنت میں گئے تو صرف اپنے ماں باپ کا دل خوش کرنے کے لئے وہاں رکھے جائیں گے اور ان کی دلجمعی کا سامان ہوں گے خواہ کسی شکل اور کسی درجۂ روحانیت میں اُن کو داخل کیا جائے یہ ایک الٰہی راز ہے اس میں پڑنے کی ہم کو ضرورت نہیں۔ پہلے میرا ذہن اِدھر نہیں جاتا تھا اور میں حیران ہوتا تھا کہ وہاں بچوں کو خدم کے طور پر کیوں رکھا جائے گا مگر اِن آیات پر غور کرنے سے مجھے معلوم ہوا کہ خواہ ان کا نام خدم رکھ لو۔ خواہ کھلونا کہہ لو بہر حال چونکہ پورے طور پر اُن کی ارواح کا ارتقاء نہیں ہوا ہوگا اس لئے گو وہ مومنوں کے ساتھ ہی رکھے جائیں گے مگر اُن کی کیفیت جُدا گانہ ہوگی۔

اس جگہ ایک اور بات یاد رکھنے والی ہے کہ ضمنی طور پر یہاں سے ایک اور مسئلہ کا بھی استنباط ہوتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص مسلمان ہو جائے اس کے کفر کے سارے گناہ مٹ جاتے ہیں یہ ایک عام مشہور مسئلہ ہے اور احادیث سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے مگر اس مسئلہ میں کچھ ترمیم کی ضرورت ہے خواہ وہ ترمیم اصلاحی نہ ہو بلکہ تکمیلی کی ہو۔ حدیثوں میں آتا ہے عبدالرزاق نے نعمان بن البشیر سے اور انہوں نے عمر بن الخطاب سے نقل کیا ہے کہ قیس ابن عاصم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں نے کچھ لڑکیاں جاہلیت میں زندہ دفن کی ہیں آپ نے فرمایا ہر موؤدہ کے بدلہ میں ایک غلام آزاد کر دو۔ اُس نے کہا یا رسول اللہ اِنِّیْ صَاحِبُ اِبِلٍ مَیں تو صاحب الابل ہوں غلام کہاں سے لاؤں اُونٹوں کے متعلق فرمائیں تو اُن کو نحر کرنے کے لئے تیار ہوں آپ نے فرمایا فَانْحَرْ عَنْ کُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُنَّ بُدْنَةً (ابن کثیر سورۃ التکویر زیر آیت ھذا) کہ ہر ایک کے بدلہ میں ایک اونٹ قربان کر دو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے گناہ جو انسان کی فطرت پر بھاری ہوں باوجود اُن کی بخشش کے اور باوجود اسلام نصیب ہو جانے اور توبہ قبول ہو جانے کے پھر بھی اگر انسان کفارہ ادا کرتا ہے تو تکمیل روحانیت کے لئے یہ بات بہت مفید ہوتی ہے۔

مسئلہ عزل کے متعلق بعض احادیث اس جگہ ایک اور حدیث بھی نقل کی جاتی ہے جس پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ امام احمد روایت کرتے ہیں کہ جذامہ بنت وہب اُخت عکاشہ نے بیان کیا قَالَتْ حَضَرْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ نَاسٍ وَھُوَ یَقُوْلُ لَقَدْ ھَمَمْتُ اَنْ اَنْھٰی عَنِ الْغَیْلَةِ کہ میں ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوئی کچھ اور لوگ بھی ساتھ تھے آپ اُس وقت فرما رہے تھے کہ میں نے ارادہ کیا

تھا کہ لوگوں سے کہہ دوں کہ جب عورت بچے کو دُودھ پلا رہی ہو تو مرد اُس سے صحبت نہ کیا کرے فَنَظَرْتُ فِي الرُّوْمِ وَفَارِسَ فَإِذَا هُمْ يَغِيلُوْنَ أَوْلَادَهُمْ وَلَا يَضُرُّ أَوْلَادَهُمْ ذَالِكَ شَيْئًا۔ لیکن پھر میں نے روم اور فارس کو دیکھا کہ وہاں کے رہنے والے برابر یہ کام کرتے ہیں مگر ان کے بچوں کو کوئی نقصان نہیں ہوتا اس لئے میں نے اس ممانعت کا خیال ترک کر دیا ثُمَّ سَأَلُوْهُ عَنِ الْعَزْلِ۔ پھر انہوں نے آپ سے عزل کے متعلق پوچھا کہ اس بارہ میں آپ کا کیا حکم ہے فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَالِكَ الْوَأْدُ الْخَفِيُّ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ بھی ایک وأدِ خفی ہے۔ (مسلم کتاب النکاح باب جواز الغیلۃ وھی وطی المرضع)

یہ روایت مسلم نے سعید بن ابی ایوب سے اور مالک بن انس سے بھی نقل کی ہے اور ابوداؤد اور الترمذی اور النسائی نے یہ روایت ابی الاسود سے روایت کی ہے۔ اس روایت سے بعض لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب عزل بھی وأدِ خفی ہے تو یہ فعل بھی کسی سزا کا مستحق ہونا چاہیے لیکن یہ بات روایت سے درست معلوم نہیں ہوتی۔

مسئلہ عزل اور اس کا جواز و عدم جواز اوّل تو اگر عزل منع ہے اس وجہ سے کہ عزل وأدِ خفی ہے تو پھر حاملہ سے جماع بھی منع ہونا چاہیے مگر حمل کے ایام میں جماع کی حرمت کہیں سے ثابت نہیں حالانکہ وہ وأدِ قطعی اور یقینی ہے۔ دوسرے عزل کے جائز ہونے کے متعلق بھی احادیث آتی ہیں مثلاً ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے عزل کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا بے شک کرو جس متنفّس کو خدا نے پیدا کرنا ہے وہ تو اُسے بہرحال پیدا کر کے رہے گا (بخاری کتاب القدر باب کان امر اللہ قدراً مقدوراً) پس چونکہ عزل کا جواز بعض دوسری احادیث سے ثابت ہے اس لئے گو یہ حدیث بڑے بلند پایہ کی ہے مگر میرے نزدیک اس کے یہی معنے ہیں کہ بلاضرورت ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔ اگر کوئی شخص بلاضرورت ایسا کرتا ہے تو وہ وأدِ خفی سے کام لیتا ہے یعنی وہ شخص جس کی عزل سے غرض نسل انسانی کا انقطاع ہو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجرم اور گنہگار ہے ورنہ اور کئی صورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن میں عزل ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کی بیوی بیمار ہے۔ وہ دوسری شادی کی توفیق نہیں رکھتا لیکن خود اُس میں خدا نے قوائے شہوانیہ پیدا کئے ہیں۔ دوسری طرف ڈاکٹر کہتا ہے کہ اگر عورت کو حمل ہو گیا تو اس کی جان کا خطرہ ہو گا ایسی حالت میں نہ صرف عزل جائز ہو گا بلکہ اگر حمل ہو جائے تو اُس کا نکلوا دینا بھی جائز ہو گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے میں نے خود سنا ہے کہ ایسی حالت میں اگر کوئی عورت حمل نہیں نکلواتی اور وہ مر جاتی ہے تو ہمارے نزدیک وہ خودکشی کرنے والی ہے۔ آپ نے فرمایا ایسی حالت میں ضروری ہے کہ بچہ کو نکلوا دیا جائے۔ کیوں کہ بچہ کے متعلق تو ہمیں کچھ علم نہیں کہ اُس نے کیسا بننا ہے مگر ایک زندہ وجود ہمارے سامنے ہوتا ہے اور اُس کی جان کی حفاظت اس

بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ اس کو بچایا جائے اور اس کے بچہ کو تلف ہونے دیا جائے۔ لیکن اگر کوئی خشیۃ املاق کی وجہ سے عزل کرتا یا حمل کو نکلواتا ہے تو وہ ایک ناجائز فعل کا ارتکاب کرتا ہے۔ بہرحال عزل کے جواز یا عدم جواز کا فتویٰ عورت کے حالات کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اگر ضرورت کے موقع پر ایسا کیا جاتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اگر بلاضرورت کیا جاتا ہے تو ناپسندیدہ ہے اور اگر نسل انسانی کے انقطاع کے لئے ایسا کیا جاتا ہے تو حرام ہے۔ مثلاً یوروپ والے صرف نسل انسانی کے انقطاع کے لئے ایسا کرتے ہیں اور چونکہ اس کے نتیجہ میں قوم تباہ ہوتی ہے اس لئے یہ فعل یقیناً ناجائز اور حرام ہوگا۔ اور اگر کوئی بلاضرورت کرتا ہے تو وہ ایک مکروہ کام کرتا ہے اور اگر ضرورت حقہ پر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ ایک جائز کام کرتا ہے۔ بہرحال اس مسئلہ کے تینوں پہلو ہیں۔ جب عزل کو قومی تباہی کا موجب بنادیا جائے تو یہ حرام ہوجاتا ہے۔ جب عزل قومی تباہی کا موجب نہ ہو لیکن اس کی کوئی ضرورت بھی نہ ہو تو یہ مکروہ ہوتا ہے۔ اور جب کسی عورت کی جان بچانے کے لئے یا کسی ایسی ہی ضرورت کے لئے جسے شریعت جائز قرار دیتی ہو ایسا کیا جائے تو یہ جائز ہوتا ہے۔ پس ہر عزل وأدِ خفی کے ماتحت نہیں آسکتا۔ وہی عزل اس جرم کا مرتکب بناتا ہے جو قومی تباہی کا موجب بن جائے جیسے فرانس وغیرہ ممالک میں اس کا رواج ہو رہا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ وہاں کی آبادی خطرناک طور پر کم ہوگئی ہے اور وہ قوم دوسروں کے مقابلہ میں بالکل مقہور اور ذلیل ہوگئی ہے اسی لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ (نسائی کتاب النکاح باب کراھیۃ تزویج العقیم) کہ جو عورتیں کثرت سے بچے جننے والی ہوں اُن سے شادیاں کیا کرو کیوں کہ اس طرح قوم کی ترقی ہوتی ہے۔

وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ کو اگر قیامت پر چسپاں کیا جائے تو سُىِٕلَتْ کے دونوں معنے ہوسکتے ہیں (۱) وائد سے پوچھا جائے گا (۲) یا موءدہ کو دوبارہ زندہ کر کے پوچھا جائے گا خواہ بعد میں وحوش کی طرح اُسے فنا کردیا جائے مگر بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وائد سے پوچھا جائے گا۔

وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ کی پیشگوئی کا ظہور جس طرح اس سورۃ کی اور تمام پیشگوئیاں موجودہ زمانہ میں پوری ہوچکی ہیں اسی طرح اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ کی پیشگوئی بھی پوری ہوچکی ہے۔ کیونکہ اس میں بتایا گیا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جبکہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی قانوناً ممانعت کردی جائے گی اور اگر کوئی ایسا کرے گا تو اُسے سزا دی جائے گی۔ چنانچہ ۱۸۷۲ء میں ایسا قانون حکومت انگریزی نے جاری کردیا اور اس طرح یہ علامت بھی جو آخری زمانہ سے تعلق رکھتی تھی پوری ہوگئی۔

وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿۱۱﴾

اور جب کتابیں پھیلا دی جائیں گی۔

حَلِّ لُغَات۔ نُشِرَتْ نُشِرَتْ نَشَرَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے اور نَشَرَ الْخَبَرَ (نَشْرًا) کے معنے ہیں اَذَاعَهٗ۔ اُس کو پھیلا دیا۔ اور نَشَرَ الثَّوْبَ وَالْكِتٰبَ کے معنے ہیں بَسَطَهٗ۔ خِلَافُ طَوَاهُ۔ اُس نے کپڑے اور کتاب کو کھولا۔ اور نَشَرَ اللّٰهُ الْمَوْتٰى کے معنے ہوتے ہیں اَحْيَاهُمْ۔ اللہ نے مُردوں کو زندہ کیا اور نَشَرَ الْمَوْتٰى کے معنے ہیں حَيُّوْا۔ مردے زندہ ہو گئے اس لحاظ سے یہ لازم بھی ہے اور متعدّی بھی (اقرب) پس وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ کے معنے ہوں گے جبکہ صحیفے پھیلائیں جائیں گے یا جبکہ وہ کھولے جائیں گے یا جبکہ مردہ صحیفے پھر زندہ کئے جائیں گے۔

تفسیر۔ **اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ سے مراد اخبارات اور رسالوں کی اشاعت** یہ تینوں معنے اس زمانہ میں بڑی شان کے ساتھ پورے ہو رہے ہیں وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ کے پہلے معنے یہ تھے کہ صحیفے پھیلائے جائیں گے۔ یہ پیشگوئی اس طرح پوری ہوئی کہ کتابوں اور اخبارات کی اشاعت کے لئے مطابع نکل آئے ہیں۔ پھر ریل گاڑیاں ایجاد ہو چکی ہیں جن سے شائع شدہ اخباریں اور کتابیں سارے جہان میں پھیل جاتی ہیں دنیا میں پچاس پچاس لاکھ روزانہ چھپنے والے اخبارات موجود ہیں۔ اسی طرح کتابیں چھپتی ہیں تو دس دس بیس بیس لاکھ نسخہ ایک ایک کتاب کا نکل جاتا ہے۔ یہی خبر اس آیت میں دی گئی تھی کہ صحیفے دنیا میں پھیلا دئے جائیں گے۔

دوسرےؔ معنے اس کے یہ تھے کہ صحیفے کھولے جائیں گے یہ پیشگوئی بھی پوری ہو چکی ہے کیونکہ کتابوں کے پڑھنے کا رواج موجود زمانہ میں بہت بڑھ گیا ہے۔ پھر بڑی بڑی لائبریریاں کھل گئی ہیں جہاں لوگ آتے اور کتابیں وغیرہ پڑھتے رہتے ہیں اور جو لوگ لائبریریوں کے ممبر ہوتے ہیں وہ اپنے گھر پر بھی اُن کتابوں کو پڑھنے کے لئے لے جاتے ہیں۔ غرض کتابیں بجائے بند رہنے کے کھل گئی ہیں اور علم کا چرچا دنیا میں چاروں طرف ہو گیا ہے۔ پھر یہ پیشگوئی اس رنگ میں بھی پوری ہوئی ہے کہ بڑی بڑی پُرانی لائبریریاں آثار قدیمہ والوں نے نکال کر رکھ دی ہیں۔ بختؔ نصر کی لائبریری جو اینٹوں پر لکھی ہوئی تھی وہ سب کی سب نکال لی گئی ہے۔ اور اس طرح مُردہ صحیفوں کو بھی زندہ کر دیا گیا ہے۔ گویا وہ کتابیں جن کو لوگ بھول چکے تھے اور جو عملی طور پر بالکل متروک ہو چکی تھیں آثار قدیمہ والے

ان کو بھی کھود کھود کر نکال رہے ہیں اور لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اسی طرح مصر میں فرعون موسیٰ سے پہلے کے آثار نکال کر ان کو پڑھا جا رہا ہے۔ مصریوں کی پُرانی زبان جو ہیلوگرافی کہلاتی تھی بالکل مٹ گئی تھی۔ مگر آثار قدیمہ والوں نے اپنی عمریں صرف کر کے آخر اس زبان کا پتہ لگا لیا۔ چنانچہ وہ ان آثار کو پڑھ کر یہ بتا دیتے ہیں کہ موسیٰ ؑ سے دو ہزار سال پہلے یہ ہوا اور تین ہزار سال پہلے یہ ہوا(The Encyclopedia Britanica Hieroglyphic writing)۔ غرض مُردہ صحیفے اس زمانہ میں زندہ کئے جا رہے ہیں اور اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ کی پیشگوئی بڑی صفائی سے پوری ہو رہی ہے۔

وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتۡ ﴿۱۲﴾

اور جب آسمان کی کھال اُتاری جائے گی۔

حَلّ لُغَات۔ كُشِطَتۡ كُشِطَتۡ كَشَطَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے اور كَشَطَ کے معنے ہوتے ہیں رَفَعَ شَيْئًا عَنۡ شَيۡءٍ قَدۡ غَشَّاهُ وَنَحَّاهُ۔ کسی چیز کو دوسری چیز پر سے اٹھانا جس نے اس کو ڈھانکا ہوا ہو۔ كَشَطَ الْجُلَّ عَنِ الْفَرَسِ وَالْغِطَاءَ عَنِ الشَّيۡءِ کے معنے ہوتے ہیں قَلَعَهُ وَنَزَعَهُ وَ كَشَفَهُ عَنۡهُ یعنی جھول کو گھوڑے پر سے یا کسی اور چیز سے اُتارا یا کسی چیز کو اکھیڑ دیا اور كَشَطَ الْبَعِيۡرَ کے معنے ہوتے ہیں نَزَعَ جِلۡدَهُ۔ اُس کی جلد کو کھینچ کر اُتارا (اقرب) چنانچہ عربی زبان میں سَلۡخُ الْبَعِيۡرِ نہیں کہتے بلکہ کہتے ہیں كَشۡطُ الْبَعِيۡرِ یعنی سَلَخَ کا لفظ بکری کے متعلق استعمال ہوتا ہے اُونٹ کے متعلق استعمال نہیں ہوتا۔ پس وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتۡ کے معنے ہوں گے جب آسمان کی کھال کھینچی جائے گی (۲) آسمان کا پردہ اُتارا جائے گا۔

تفسیر۔ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتۡ میں آسمان سے مراد چونکہ آسمانی علوم بھی لئے جا سکتے ہیں اس لئے اس آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ آسمانی علوم پر سے پردے اُٹھا دئے جائیں گے یعنی اُس وقت آسمانی علوم دب گئے ہوں گے اور اُن پر پردے پڑ چکے ہوں گے تب اللہ تعالیٰ ایک ایسے آدمی کو مبعوث کرے گا جو آسمانی علوم کو کھول کر رکھ دے گا اور قرآن کریم کے وہ اسرار جو چھپے ہوئے تھے یا احادیث کے وہ علوم جو مخفی چلے آتے تھے اُن سب کو ظاہر کر دے گا۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ آسمان کی کھال کھینچی جائے گی یعنی علم ہیئت میں حیرت انگیز ترقی ہوگی۔ ہماری

زبان میں بھی کہتے ہیں کہ تم تو بال کی کھال اتارتے ہو جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم تو بہت باریکیاں نکالتے ہو۔ چنانچہ اس زمانہ میں علمِ ہیئت میں خیال و وہم سے بھی زیادہ ترقی ہوئی ہے اور سیرِ نجوم اور وسعتِ عالم اور خلقِ عالم اور اجرامِ فلکی وغیرہ کے بارہ میں غیر معمولی علوم کا اضافہ ہوا ہے جو گزشتہ ہزاروں سال میں بھی نہ ہوا تھا۔ آج سے سو ڈیڑھ سو سال سے پہلے جو مہندس اور حساب دان تھے وہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے تھے کہ تھوڑے عرصہ کے بعد ہی کیا سے کیا ہو جائے گا پہلے زمانہ میں زیادہ سے زیادہ دو تین فٹ قطر کی دُوربینیں ہوتی تھیں مگر اب امریکہ میں ایک سو فٹ قطر کی دُوربین ایجاد کی گئی ہے۔ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ دُوربین کا جتنا قطر بڑھتا جاتا ہے اُتنی ہی اس کی طاقت بڑھتی چلی جاتی ہے کہتے ہیں کہ اِس دُوربین پر ایک کروڑ ڈالر سے زیادہ خرچ ہوا ہے ہر شخص غور کر سکتا ہے کہ اتنی بڑی دُوربین کتنے سالوں میں تیار ہوئی ہوگی اور اس کے لئے کس قدر ماہرین ساری دنیا سے جمع کئے گئے ہوں گے۔ بہرحال یہ دُوربین تیار ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمِ ہیئت میں حیرت انگیز ترقی ہوگئی۔ دو ستاروں کے باہمی فاصلے کا اندازہ لگانے کے لئے علمِ ہیئت والوں کا طریق یہ ہے کہ وہ رفتارِ نور سے باہمی فاصلے کا اندازہ لگاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نور کی رفتار فی سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے ایک لاکھ چھیاسی ہزار کو ساٹھ سے ضرب دیں گے تو ایک منٹ کی رفتار نکل آئے گی پھر ساٹھ سے ضرب دیں گے تو ایک گھنٹہ کی رفتار نکل آئے گی پھر اُسے چوبیس سے ضرب دیں تو ایک دن کی رفتار نکل آئے گی اور پھر اُسے تین سو ساٹھ سے ضرب دیں گے تو ایک سال کی رفتار نکل آئے گی۔ اس بنیاد پر جب وہ ایک ستارے کا دوسرے ستارہ سے فاصلہ بتانا چاہیں تو یہ نہیں کہیں گے کہ وہ ستارہ اتنے میل دُور ہے بلکہ کہیں گے کہ وہ بیس سالِ نوری کے فاصلہ پر ہے یا ایک ہزار سالِ نوری کے فاصلہ پر ہے مطلب یہ کہ ایک سالِ نوری کا جس قدر فاصلہ بنتا ہے اُسے اُتنے سالوں سے ضرب دے لو اور پھر خود ہی اندازہ لگا لو کہ ان میں کتنا فاصلہ ہے۔ پس دُوربینوں کی ایجاد کے ذریعہ ایک تو سَیرِ نجوم میں بہت بڑی ترقی ہوئی ہے پھر اس سے وسعتِ عالم کے متعلق سابقہ علوم میں بھی بہت بڑی تبدیلی ہوئی ہے۔ گزشتہ زمانے کا ذکر تو جانے دو جنگِ عظیم سے پہلے ہیئت دان دو ہزار سالِ نوری عالم کی وسعت سمجھتے تھے مگر پچھلی جنگ کے خاتمہ پر انہوں نے اعلان کیا کہ یہ عالم بارہ ہزار سالِ نوری تک پھیلا ہوا ہے اور اب کہتے ہیں کہ اس عالم میں اتنی وسعت ہے کہ ہم اس کا اندازہ لگانے سے قطعی طور پر قاصر ہیں۔ اور جو لوگ کچھ اندازے بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ چھتیس یا چالیس ہزار سال نوری تک یہ عالم پھیل گیا ہے۔ اور اب جب کہ میں اس نوٹ کی نظرِ ثانی کر رہا ہوں پہلے سے بھی اور فاصلہ کے ستاروں کا پتہ لگنے کا اعلان ہوا ہے۔

پھر نئے حساب کے ذریعہ انہوں نے اپنی تحقیق میں اس قدر ترقی کر لی ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم نے اس سارے عالم کا مرکز دریافت کر لیا ہے جس میں یہ سورج اور چاند وغیرہ ایسے ہی نظر آتے ہیں جیسے ایک چھوٹا سا ذرہ ہوتا ہے وہ کہتے ہیں اس عالم کے اوپر ایک اَور عالم ہے پھر اَور عالم ہے پھر اور عالم ہے اور آخر میں ایک بہت بڑا مرکز ہے جس کے اردگرد یہ سب سیّارے اور ستارے اور سورج اور چاند وغیرہ چکّر کھا رہے ہیں۔ اُن کو اپنی اس تحقیق پر اس قدر ناز ہے کہ ماہرینِ حساب یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے خدائی کا راز دریافت کر لیا ہے گویا وہ مرکز اُن کے نزدیک خدا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہاں سے اللہ تعالیٰ ساری دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ اسی طرح پیدائشِ عالم کے متعلق پُرانے اور موجودہ نظریہ میں بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے اب ایسے آلے نکل آئے ہیں جن سے شعاؤں کو پھاڑ کر بتا دیا جاتا ہے کہ وہ شعائیں جن ستاروں سے نکل رہی ہیں اُن میں کون کون سا مادّہ ہے کیونکہ ہر شعاع جو کسی ستارہ سے لوٹتی ہے اس ستارہ کو ساخت دینے والی دھاتوں کا اثر اپنے اندر رکھتی ہے۔ پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ تمام روشنیاں ایک ہی قسم کی ہیں مگر اب ماہرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہر روشنی الگ قسم کی ہوتی ہے پلاٹینم سے نکلنے والی روشنی کو اگر پھاڑا جائے تو وہ بتا دے گی کہ وہ پلاٹینم میں سے نکلی ہے۔ اور اگر ریڈیم سے نکلی ہوئی روشنی کو دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ریڈیم کی ہے۔ غرض ہر روشنی کو پھاڑ کر وہ بتا دیتے ہیں کہ اس کے ساتھ کن کن چیزوں کا تعلق ہے۔ اس علمی ترقی کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ سائنس دان یہاں بیٹھے ہوئے سورج کی روشنی لیں گے اور اس کا تجزیہ کر کے بتا دیں گے کہ سورج میں فلاں فلاں عناصر ہیں۔ مریخ کی روشنی پھاڑ کر بتا دیں گے کہ اس میں فلاں فلاں عناصر ہیں۔ غرض علمِ ہیئت میں ایسے عظیم الشان تغیّرات ہوئے ہیں کہ اُن کو دیکھ کر حیرت آتی ہے۔

پھر ایک اور انکشاف بھی ہوا ہے جو اسلام کی بہت بڑی تائید کرتا ہے۔ پہلے تمام یورپ پر ڈارون تھیوری کا غلبہ تھا۔ مگر اب کہا جاتا ہے کہ اس دنیا کی کل اڑتالیس ہزار سال عمر ہے اور سورج جوں جوں اپنے مرکز کے قریب آتا جاتا ہے اس کی گرمی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے یہاں تک کہ جب اڑتالیس ہزار سال پورے ہو جائیں گے تو سورج کی گرمی اتنی شدید ہو جائے گی کہ زمین اور اردگرد کے تمام سیّاروں کو پگھلا کر رکھ دے گی۔ یہ وہی بات ہے جس کا حدیثوں میں ذکر آتا ہے کہ جب قیامت آئے گی تو سورج بالکل قریب آ جائے گا اور اُس کی گرمی زمین کو تباہ کر دے گی (ترمذی کتاب صفة القیامة باب ما جاء فی شان الحساب و القصاص) غرض علمِ ہیئت کے ذریعہ آسمان کی کھال اُدھیڑ دی گئی ہے اور اس علم میں ایسی عظیم الشان ترقی ہوئی ہے کہ جس کی مثال پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔

آسمانی کتب کی تحقیقات تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ سماء سے مراد سماوی علوم لئے جائیں۔ اس صورت

میں اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ لوگ دین کو پھاڑ کر رکھ دیں گے اور اُس کی ایسی چھان بین کریں گے کہ اپنے خیال میں اس کی کھال اُدھیڑ دیں گے۔ چنانچہ دیکھ لو اس زمانہ میں دین کے متعلق ایسی ایسی بحثیں ہوئی ہیں جو پہلے کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ پھر ہر مذہب والے نے اپنے اپنے مذہب کا ایسا تجزیہ کیا ہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں رہی۔ مثلاً بائیبل ہے عیسائیوں نے اس کی کھال اُدھیڑ کر رکھ دی ہے اور ثابت کیا ہے کہ فلاں بات موسیٰؑ کی نہیں بلکہ ہارونؑ کی ہے۔ یا یہ لفظ فلاں زبان کا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فلاں زبان تھی اس لئے معلوم ہوا کہ یہ لفظ بعد میں ملایا گیا ہے۔ غرض ایسا تجزیہ کیا ہے کہ ایک ایک بات کو خود عیسائیوں نے کھول کر رکھ دیا ہے۔ اس چیر پھاڑ میں اگر کوئی زندہ وجود بچا ہے تو وہ صرف قرآن ہے۔ ویدوں کے متعلق بھی خود ہندو محققین نے بہت بڑی تحقیقاتیں کی ہیں اور انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ویدوں میں فلاں فلاں زبان شامل ہے اور یہ زبان فلاں فلاں سنہ میں بولی جاتی تھی۔ اسی طرح ویدوں کی تاریخ اور اُن کی ترتیب کے متعلق ایسا تجزیہ کیا ہے کہ اُن کی کھال اُدھیڑ دی ہے۔ اس چیر پھاڑ سے صرف قرآن ہی محفوظ رہا ہے اور کوئی کتاب محفوظ نہیں رہی۔ مگر چونکہ پیشگوئی تھی کہ بہرحال آسمانی علوم کی کھال اُتاری جائے گی اور اُن کے اسرار کو منکشف کیا جائے گا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ کے ماتحت اور کتابوں کی چیر پھاڑ کا کام تو یورپ والوں کے سپرد کر دیا اور قرآنی علوم کے انکشاف کا کام حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے سپرد کر دیا۔ کیونکہ وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ کی پیشگوئی نے سب پر چسپاں ہونا تھا مگر باقی کتب کا چونکہ اعزاز مدنظر نہیں تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو قصابوں کے سپرد کر دیا کہ تم اُن کی کھالیں اُدھیڑو۔ اور قرآن کا چونکہ اعزاز مدنظر تھا اس لئے اُسے بجائے غیروں کے ہاتھوں میں دینے کے اپنے ایک برگزیدہ کے ہاتھ میں دے دیا کہ تم اس کے معارف ظاہر کرو اور اس کے حقائق دنیا پر روشن کرو۔

وَ اِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ﴿۱۳﴾

اور جب جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔

حَلّ لُغَات۔ سُعِّرَتْ سُعِّرَتْ سَعَّرَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور سَعَّرَ النَّارَ وَالْحَرْبَ کے معنے ہوتے ہیں اَوْقَدَهُمَا وَاَشْعَلَهُمَا وَهَيَّجَهُمَا کہ جنگ کو یا آگ کو بھڑکایا (اقرب) پس اِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ کے معنے ہوں گے جب جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔

تفسیر ۔جَھَنَّمَ کے معنے خود آگ کے ہیں۔ پس جو پہلے ہی آگ ہے اس کا بھڑکایا جانا اور بھی خطرناک حالت پر دلالت کرتا ہے یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہتے ہیں ''کریلہ اور پھر نیم چڑھا''۔ جہنم کے بھڑکائے جانے کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ اُس زمانہ میں گناہ کی زیادتی ہو جائے گی کیونکہ جب کوئی مہمان آیا ہوا ہو تو اس کا کھانا پکانے اور ضیافت کرنے کے لئے آگ کو بھڑکایا جاتا ہے۔ پس جہنم جن لوگوں کا گھر ہے اور جن کا نُزل واقعہ ہوا ہے جب وہ کثرت سے اُس گھر میں جائیں گے تو یہ لازمی بات ہے کہ اُس کی آگ بھی بھڑکائی جائے گی۔ پس اس کے ایک معنے یہ ہیں کہ گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے اُس زمانہ میں دوزخیوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔

اِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ میں نبی کے آنے کی پیشگوئی وَ اِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ اُس وقت خدا تعالیٰ کا ایک نبی آئے گا جس کی مخالفت کی وجہ سے خدا تعالیٰ کا غضب بھڑک اُٹھے گا کیونکہ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل:۱۶) ہم اُس وقت تک لوگوں پر عذاب نازل نہیں کرتے جب تک اپنا رسول بھیج کر اُن پر حجت تمام نہ کرلیں۔ پس اس آیت میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ اُس وقت خدا تعالیٰ کا ایک مامور آئے گا کیونکہ جب اس کی طرف سے کوئی مامور آتا ہے تو اس کے آنے کے ساتھ جہاں مومنوں کے لئے رحمت کے دروازے کھلتے ہیں وہاں کفار کے لئے عذاب کے دروازے بھی کھول دئے جاتے ہیں۔

وَ اِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۪ۙ﴿۱۴﴾

اور جب جنت کو قریب کر دیا جائے گا۔

حَلّ لُغَات۔ اُزْلِفَتْ اَزْلَفَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے اور اَزْلَفَ کے معنے ہیں قَرَّبَهٗ اُس کو قریب کیا (اقرب) پس وَ اِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ کے معنے ہوں گے جب جنت قریب کی جائے گی۔

تفسیر ۔ یہ اِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ کا ایک طبعی نتیجہ ہے جو بیان کیا گیا ہے کیونکہ جب گناہ بڑھ جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں رہتی تو اُس وقت جنت بھی لوگوں کے قریب کر دی جاتی ہے اور تھوڑی سی محنت اور تھوڑی سی قربانی سے وہ اُس کو حاصل کر لیتے ہیں۔ جس زمانہ میں نیکی کی کثرت ہو جنت کا حصول اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا اُس زمانہ میں جب لوگوں میں عام طور پر بے دینی پائی جاتی ہو۔ کیونکہ اُس وقت خدا تعالیٰ کی طرف ادنیٰ

توجہ بھی اُس کی خوشنودی کا مستحق بنا دیتی ہے۔

اِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ کے دو معنے اس آیت کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ جنت کے حصول کے لئے اس زمانہ کی قربانیاں نسبتاً آسان ہوں گی جہاد بند ہوگا اور اس طرح جانی قربانی کے مواقع پیش نہیں آئیں گے صرف مالی قربانی کر کے یا وقت کی قربانی کر کے یا جذبات و احساسات کی قربانی کر کے وہ جنت کو حاصل کر سکیں گے پہلا زمانہ وہ تھا جب اَلْجَنَّةُ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ (بخاری کتاب الجهاد باب الجنة تحت بارقة السيوف) کا سبق مومنوں کے سامنے دُہرایا جاتا تھا مگر اِس زمانہ میں تلوار کا جہاد اللہ تعالیٰ کی حکمت کے ماتحت بند ہے اس لئے اب وہ تکالیف برداشت نہیں کرنی پڑتیں جو پہلے زمانوں میں برداشت کرنی پڑتی تھیں اب جہاد بالسیف کے بغیر ہی مالی قربانیوں میں حصہ لے کر جنت مل سکتی ہے۔

اس آیت کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مامور من اللہ کی بیعت کی وجہ سے جنت کا پانا اُن سے پہلے لوگوں کی نسبت آسان ہو جائے گا جنہوں نے کسی مامور کا زمانہ نہیں دیکھا۔ آج سے سو سال پہلے ساری عمر بزرگانِ دین کی صحبت میں گزار کر جو نور حاصل ہوتا تھا وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک نکتۂ معرفت سے انسانی قلب میں پیدا ہو جاتا ہے پھر جو نشانات اور معجزات اس وقت ہمارے سامنے ہیں اور جن کے ذریعہ ایک زندہ خدا ہمیں نظر آ رہا ہے یہ پہلے کہاں تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے تازہ الہامات ہمارے ایمانوں میں جو تازگی پیدا کرتے ہیں وہ پہلے لوگوں کو کہاں نصیب ہوتی تھی۔ پس حق یہی ہے کہ اس زمانہ میں ایک مامور من اللہ کی بعثت اور پھر اُس کی بیعت کی وجہ سے جنت کا حصول پہلے لوگوں کی نسبت بہت زیادہ آسان ہو گیا ہے اور یہی مامور کے زمانہ کی علامت ہوتی ہے کہ اُس وقت جنت بالکل قریب کر دی جاتی ہے۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ؕ﴿۱۵﴾

(اُس دن) ہر جان جو کچھ اُس نے حاضر کیا ہے جان لے گی۔

تفسیر۔ عَلِمَتْ نَفْسٌ سے خدا کی تقدیر خاص کا اجراء فرماتا ہے اُس دن الٰہی تقدیر خاص طور پر جاری ہوگی اور نتائج اعمال خاص طور پر نکلنے شروع ہوں گے مطلب یہ کہ عام زمانہ میں فردی محاسبہ ہوتا ہے لیکن انبیاء کے زمانہ میں قومی محاسبہ ہوتا ہے جیسا کہ آیت وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل:۱۶) سے ظاہر ہے اور قومی محاسبہ بڑا سخت ہوتا ہے فردی محاسبہ نظر نہیں آتا کیونکہ اس کا تعلق انفرادی طور پر الگ الگ لوگوں

سے ہوتا ہے لیکن قومی محاسبہ ایسی چیز ہے جو سب کو نظر آ جاتی ہے کیونکہ اس کا تعلق تمام قوم کے ساتھ ہوتا ہے چنانچہ زلازل اور جنگوں کی کثرت سے اس قومی محاسبہ کے دن کا اب اظہار ہو رہا ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ زلازل سے زمین اس طرح ہلائی جائے گی کہ انسان پکار اٹھے گا مَا لَهَا (سورۂ زلزال) زمین کو کیا ہو گیا ہے کہ عذاب پر عذاب اور تباہی پر تباہی آتی جا رہی ہے۔ چنانچہ اب عام طور پر یہی احساس لوگوں کے قلوب میں پیدا ہو رہا ہے کہ یہ خدائی عذاب ہے جو دنیا پر مسلّط ہے اور اسی کی طرف سے اِن زلازل اور جنگوں اور وباؤں کے ذریعہ دنیا میں تغیر پیدا کیا جا رہا ہے پس فرماتا ہے ایک دن آئے گا جب اِن زلازل اور جنگوں کے نتائج قومی طور پر نکلنے شروع ہو جائیں گے۔ اور تقدیر الٰہی دنیا میں خاص طور پر جاری ہو جائے گی۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۙ﴿۱۶﴾

پس ایسا نہیں (جو تم خیال کرتے ہو) میں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۙ﴿۱۷﴾

چلتے چلتے پیچھے ہٹ جانے والوں کو (جو ساتھ ہی) ناک کی سیدھ چلنے والے (بھی ہیں اور پھر) گھروں میں بیٹھے رہنے والے بھی۔

حَلِّ لُغَات۔ اَلْخُنَّسُ اَلْخُنَّسُ خَانِسٌ کی جمع ہے جو خَنَسَ سے اسم فاعل ہے۔ اور خَنَسَ عَنْهُ کے معنے ہوتے ہیں تَاَخَّرَ وَانْقَبَضَ۔ اس سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور خَنَسَ بَيْنَ اَصْحَابِهٖ کے معنی ہوتے ہیں اِسْتَخْفٰى اپنے ساتھیوں میں چھپ گیا۔ اور جب خَنَسَ الْقَوْلَ کہیں تو معنے ہوتے ہیں اَسَاءَهٗ۔ اسے بُری بات سے مخاطب کیا (اقرب) گویا خَانِسٌ کے معنے ہوئے جو پیچھے ہٹ جاتا ہے یا مخفی ہو جاتا ہے۔ یا بُری باتیں کہنے لگ جاتا ہے تو خُنَّس ہوئے بُری بات کہنے والے۔ پیچھے ہٹ جانے والے چھپ جانے والے۔

اَلْجَوَارِ اَلْجَوَار اَلْجَارِيَةُ کی جمع ہے۔ جو اَلْجَارِي سے مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور جَارِيَة چلنے والی کو کہتے ہیں۔ نیز اس کے معنی ہیں (۱) اَلصَّبِيَّةُ بچہ (۲) اَلْاَمَةُ لونڈی (منجد) (۳) اَلشَّمْسُ سورج (۴) اَلسَّفِيْنَةُ کشتی (۵) اَلْحَيَّةُ۔ اور سانپ کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب) پس جَوَارِ سے مراد لونڈیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ لڑکیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ سورج بھی ہو سکتا ہے۔ کشتیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ سانپ بھی ہو سکتا ہے اور پھر سیدھے چلنے والے وجود بھی اس

سے مراد ہو سکتے ہیں۔

اَلْکُنَّسُ اَلْکُنَّسُ اَلْکَانِسُ کی جمع ہے اور اَلْکَانِسُ اُس ہرن کو کہتے ہیں۔ جو اپنی غار میں داخل ہو جاتا ہے۔ (اقرب) کیونکہ کناس ہرن کی رہائش کی جگہ کو کہتے ہیں۔

تفسیر - فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ۔ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ میں مسلمانوں کے اندر آخری زمانہ میں تین صفات پیدا ہو جانے کی پیشگوئی فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ۔ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ اس میں گواہ کے طور پر ان ہستیوں کو پیش کیا گیا ہے جن کی تین صفات ہیں۔ وہ خُنّس ہیں یعنی پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ آگے کو چلتی ہیں۔ اور چھپ جاتی ہیں۔ ان صفات والی ہستیوں سے مراد اس زمانہ کے مسلمان ہیں۔ یہ تین صفات وُہ ہیں جو قوم کی تباہی کا مؤجب ہوتی ہیں۔ (۱) خطرہ کے وقت پیچھے ہٹ جانا (۲) بلا غور وفکر آگے بڑھتے چلے جانا (۳) سب کام چھوڑ چھاڑ کر گھروں میں نکمّے بیٹھ جانا۔ چونکہ پہلی آیت میں عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ فرمایا تھا۔ یعنی انسان نے جو کچھ کیا ہے اس کا نتیجہ ضرور دیکھ لے گا۔ اس کے اس زمانہ کے اعمال کو بتاتا ہے۔ کہ وہ اس وقت تین پہلو رکھتے ہوں گے۔ یعنی اوّل مسلمان مغربیت سے ڈر کر میدان سے بھاگ جائیں گے۔ اور غلط راستہ اختیار کر لیں گے۔ پھر اس کے ساتھ ہی عقل و دانش کو ترک کر کے رسمی اسلام کو بھی پیش کرتے رہیں گے۔ لیکن باوجود اس کے حقیقی قربانی ان سے مفقود ہو گی۔ وہ چھپ کر گھروں میں بیٹھ جائیں گے۔ اور دشمن کا روحانی مقابلہ نہ کریں گے۔ بھلے بُرے سے کچھ تعلق نہ رکھیں گے۔ اس وجہ سے اسلام کمزور ہو جائے گا۔ اور دشمنانِ اسلام غالب آتے چلے جائیں گے۔ ادنیٰ تدبر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی حالت ایسی ہی ہے اور یہی زمانہ اس سورۃ میں مذکور ہے۔ اوّل تو سب کے سب مسلمان خُنّس ہیں یعنی سیدھے راستہ سے بھٹک گئے ہیں۔ اور نقطہء صداقت سے واپس ہٹ گئے ہیں یعنی انہوں نے کفر کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اسی طریق کو وہ خدمت قوم و خدمت ملک سمجھتے ہیں۔ یورپ کے طریق اور یورپ کے رویہ کو اور اس کے فلسفہ کو ان لوگوں نے اپنا راہ نما بنا لیا ہے اور اس کے خلاف کو موجب خسران و تباب سمجھتے ہیں۔ درحقیقت وُہ نام کے مسلمان ہیں اور انہوں نے مغربیت کا نام اسلام رکھ لیا ہے۔ اب یہ حال ہے کہ ایک ہی طور وطریق رکھ کر ایک آدمی عیسائی کہلاتا ہے اور ویسا ہی طور وطریق رکھ کر دوسرا آدمی مسلمان کہلاتا ہے۔ محقّق دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ کہ یہ کیا عجیب بات ہے کہ وہی طور وطریق مسیحیت بھی کہلاتا ہے۔ اور اسلام بھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی یہ حالت ہے کہ جہاں وہ حقیقت میں اسلام سے ہٹ گئے ہیں۔ ظاہر میں وہ اُسی راستہ پر چلے جا رہے ہیں۔ اور کہلاتے مسلمان ہی ہیں۔ گویا ایک طرف اسلام کو چھوڑ رہے ہیں۔ اور

دوسری طرف اسلام کی طرف رغبت بھی ظاہر کر رہے ہیں۔ اور یہ دکھاتے ہیں کہ وہ اسلامی راستہ پر چل رہے ہیں۔ لیکن ان کا یہ جوش وخروش صرف رسمی اور زبانی ہے۔ کیونکہ جہاں ایک رسمی اسلام کی اتباع کا ان کو دعویٰ ہے۔ وہاں یہ بھی نظر آتا ہے کہ کام کے وقت وہ اپنے گھروں میں چھپ جاتے ہیں۔ اور اسلام کی خاطر کوئی قُربانی نہیں کرتے۔ یہ نقشہ لفظاً لفظاً اس وقت کے مسلمانوں پر چسپاں ہوتا ہے۔ وہ اسلام کی تعلیم کو چھوڑ چکے ہیں۔ مگر باوجود اس کے اسلام پر چلنے کے دعویدار بھی ہیں۔ اور اس کی تائید میں خوب نعرے بھی لگاتے ہیں۔ لیکن عملاً وہ ہر سچی قربانی سے گریز بھی کر رہے ہیں۔ اس گری ہوئی حالت میں بھی اگر مسلمان سچی قربانی کریں جس طرح یورپ کے لوگ کرتے ہیں۔ تو وہ اپنی دنیوی عزت کا کثیر حصہ واپس لے سکتے ہیں۔ مگر حقیقی عمل کے وقت وُہ کُنّس ہو جاتے ہیں۔ یعنی اپنی غاروں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور دشمن اسلام کی متاع لوٹ کر لے جاتا ہے۔ یورپ تو الگ رہا ہندوستان کی غلام اقوام کے مقابلہ پر بھی مسلمان باوجود بعض قوموں سے زیادہ ہونے کے ان کے مقابلہ پر دلیری سے نہیں کھڑا ہو سکتا۔ کیونکہ دائمی اور مستقل قربانی سے وہ گھبراتا ہے۔ اس لئے پہلی بھبکی کے بعد وہ پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتا ہے۔ اور میدان ہمیشہ اس سے کمزور لیکن زیادہ منظم جماعت کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔

وَالَّيۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ ۙ﴿۱۸﴾ وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ﴿۱۹﴾

اور رات کو (شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں) جب وہ خاتمہ کو پہنچ جاتی ہے۔ اور صبح کو جب وہ سانس لینے لگتی ہے۔

حَلِّ لُغَات۔ عَسۡعَسَ عَسۡعَسَ الَّيۡلُ کے معنے ہیں مَضٰی رات گزر گئی۔ چل گئی۔ نیز اس کے معنے ہیں اَظۡلَمَ۔ رات کی تاریکی پورے زور سے چھا گئی۔ (اقرب)

تَنَفَّسَ تَنَفَّسَ کے اصل معنے ہیں اَدۡخَلَ النَّفَسَ اِلٰی رِئَتِهٖ کہ سانس کو پھیپھڑوں میں داخل کیا۔ یعنی سانس لیا۔ اور جب تَنَفَّسَ الصُّبۡحُ کہیں تو معنی ہوتے ہیں تَبَلَّجَ صبح روشن ہو گئی۔ (اقرب)

تفسیر۔ پہلی آیت میں جو بھیانک نقشہ اس زمانہ کے مسلمانوں کا کھینچا گیا تھا۔ اور جسے دیکھ کر تباہی کے سوا کوئی انجام نظر نہ آتا تھا۔ اب ان آیات میں تسلی دلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ تاریکی کا یہ دور دائمی نہ ہوگا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ رات کو بھی بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ جب وُہ چلی جائے گی۔ اور خاتمہ کے قریب پہنچ جائے گی۔ اور صبح کو بھی بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ جب وہ سانس لے گی۔ یعنی اپنے وجود کو ظاہر کرنے لگے گی۔ رات کا جانا اور صبح کا

آنا تنزّل کے دَور کے خاتمہ اور ترقی کے نئے دَور کے ظہور پر دلالت کرتا ہے۔ اور اسی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اسلام کے اس دَورِ تنزل پر اللہ تعالیٰ خاموش نہ رہے گا۔ بلکہ اسے دُور کرنے کے سامان پیدا کرے گا۔ اور اس وقت صبح کا ستارہ اس کی طرف سے طلوع ہوگا۔ یعنی وقت کا مصلح اور امام جو ہر تاریک رات کے بعد صبح کے ستارہ کی طرح ظاہر ہوتا ہے۔ اس وقت ظاہر ہوگا۔

جب ظلمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور انسان روشنی کے ظہور سے مایوس ہوجاتا ہے۔ اس وقت اگر روشنی کے ہلکے سے آثار نمودار ہوں تو وہ نظارہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ایک انسان بظاہر مرا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن دراصل ابھی زندہ ہوتا ہے۔ اس وقت جب اس کے مونہہ پر پانی کے چھینٹے دئے جاتے ہیں تو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی جدوجہد کے بعد وہ ایک ہلکی سی سُبکی لیتا ہے جس پر گھر والے خُوش ہوجاتے ہیں کہ یہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔

تَنَفَّسَ الصُّبۡحُ میں اسلام کی نازک حالت کا نقشہ اسی طرح فرماتا ہے وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ۔ اس وقت ایسا تاریکی کا زمانہ ہوگا کہ ہر شخص کہے گا اسلام اب مر چکا۔ اس کی زندگی کے کوئی آثار باقی نہیں رہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اسلام کے مردہ کو چھوڑ کر چلے جائیں گے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو بیٹھ کر رونے لگ جائیں گے۔ مگر کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اپنے کام میں لگے رہیں گے اور وُہ اس کے مونہہ پر چھینٹے دیتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک اسلام ذرا سا سانس لے گا۔ اس وقت سب کہیں گے کہ لو اسلام زندہ ہوگیا۔ پس فرماتا ہے وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ہم شہادت کے طور پر صبح کو پیش کرتے ہیں جب وہ کوشش سے ایک سانس لے گی۔

تَنَفَّسَ الصُّبۡحُ کے معنے ہوتے تَبَلَّجَ اَیۡ اَشۡرَقَ وَاَنَارَ یعنی روشن ہوگئی یا اس نے روشن کر دیا۔ اس مفہوم کو اور طرح بھی ادا کیا جا سکتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے الفاظ ایسے رکھے ہیں جو مایوسی کی حالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ اسلام کی ترقی اس وقت ناممکن خیال کی جاتی ہوگی۔ بہرحال فرماتا ہے وقت آئے گا جب رات دُور ہو جائے گی۔ اور صبح کوشش سے ایک سانس لے گی جس پر مسلمانوں کے حوصلے بلند ہوجائیں گے۔ اور ان کے دلوں میں یہ یقین پیدا ہوجائے گا کہ اسلام اب ضرور غالب آ کر رہے گا اور خدام اسلام جیت جائیں گے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۰﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ

یقیناً وہ ایک بزرگ رسول کا کلام ہے۔ (جو) قوت والا اور صاحب عرش کے حضور بڑا درجہ رکھنے والا (ہے)

مَكِيْنٍ ﴿۲۱﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿۲۲﴾

(جو) مطاع (بھی) ہے (اور) اس کے ساتھ امین بھی۔

حَلّ لُغَات۔ مَكِيْنٌ مَكِيْنٌ مَكُنَ سے ہے۔ اور مَكُنَ فُلَانٌ عِنْدَ السُّلْطَان کے معنے ہوتے ہیں عَظُمَ عِنْدَهٗ وَارْتَفَعَ وَصَارَذَا مَنْزِلَةٍ کہ فلاں شخص کا رتبہ بادشاہ کے ہاں بڑھ گیا۔ اور بادشاہ کے حضور مقرب اور معزز ہو گیا (اقرب) پس مَكِيْنٌ کے معنے ہوں گے بادشاہ کے ہاں معزز مقرب اور رتبہ رکھنے والا۔

تفسیر۔ **آخری زمانہ میں اسلام کی ترقی کی پیشگوئی پر تین اعتراضات اور ان کے جوابات** اسلام کی ترقی اور اس کے تنزل کے متعلق اور آخر میں اسلام کے دوبارہ غلبہ اور عروج کے متعلق ان آیات میں جس تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسے شخص کے دل میں جس کے سامنے ابھی ان واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی رُونما نہیں ہوا تھا تین اعتراض پیدا ہوتے تھے۔ اول یہ کہ آپ اسلام کے تنزل کی خبر دے رہے ہیں۔ حالانکہ اس تنزل کی خبر کے معنی ہی کیا ہیں۔ اسلام کی تو دنیا میں کہیں بھی ترقی نظر نہیں آتی۔ اور جب آپ کے مذہب کا دنیا میں کہیں نام ہی نہیں اور نہ لوگ کثرت سے اس میں شامل ہیں تو اس کے تنزل کی خبر دینے کے کیا معنی ہیں۔ (۲) پھر جب اسلام ترقی کر گیا اور مسلمانوں کو حکومتیں حاصل ہو گئیں۔ اس وقت اگر ان سے کوئی پوچھتا کہ کیا تمہارا ابھی کبھی تنزل ہوگا۔ تو وہ سب اس کو ناممکن بتاتے۔ اور کہتے کہ اسلام کی شان وشوکت کو کون توڑ سکتا ہے۔ بنوامیہ اور بنوعباس کے کیا وہم وگمان میں بھی یہ بات آسکتی تھی کہ وُہ عیسائی جو ان کی ماتحتی میں اپنی زندگی کے دن بسر کرتے تھے کسی دن غالب آجائیں گے اور اس قدر طاقت حاصل کر لیں گے کہ مسلمان اگر سارے مل کر بھی شور مچائیں گے تو وُہ اُس آواز کو نہیں سُنیں گے۔ گویا جس طرح ابتداء اسلام میں لوگوں کے لئے یہ بات ماننی ناممکن تھی کہ اسلام کسی زمانہ میں ترقی کر جائے گا۔ اسی طرح اسلام کے دَور ترقی میں لوگوں کے لئے یہ بات ماننی مشکل تھی کہ اسلام کسی وقت گر جائے گا (۳) پھر جب اسلام کا تنزّل ہوا تو ایسا ہوا کہ اب مسلمانوں کو لاکھ سمجھاؤ کہ وُہ پھر ترقی کر جائیں گے ان کی سمجھ میں ہی یہ بات نہیں آتی کہ اتنے عظیم الشان تنزل کے بعد وُہ کس طرح ترقی کر سکیں گے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے کے بعد یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ اسلام غالب آئے گا۔لیکن اگر آپ سے تعلق نہ ہوتو اس یقین کے پیدا ہونے کا کوئی ذریعہ ہی نظر نہیں آتا۔یہی وجہ ہے کہ مسلمان جب بھی اپنے غلبہ کے لئے کوشش کرتے ہیں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ عیسائیوں سے صلح ہو جائے۔ یا ہندوؤں سے مل کر ان کو حکومت حاصل ہوجائے۔ان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات کبھی نہیں آتی۔کہ جو آج اسلام کا حال ہے وہی حال اب عیسائیت کا ہونے والا ہے اور جس طرح آج مسلمان عیسائیوں کے مقابلہ میں بالکل بے بس ہیں اسی طرح عیسائی مسلمانوں کے سامنے بے حیثیت ہو جائیں گے یہ پروگرام صرف ہماری جماعت کا ہی ہے کیونکہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے نشانات کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھا۔اور ہم ایک ایسے خدا پر ایمان لائے ہیں جو زندہ اور طاقتور خدا ہے۔غرض ہر قدم پر دوسرے قدم کا وہم بھی نہیں آسکتا تھا۔جب یہ سورۃ نازل ہوئی اس وقت اسلام کی ترقی کا خیال ناممکن تھا۔جب اسلام کی ترقی کا دَور آیا تو اس کے تنزل کا خیال ناممکن تھا۔اور جب اس پر تنزل آیا تو اب اس کی ترقی کو ناممکن بتایا جا رہا ہے۔اور چونکہ اس پیشگوئی کا ہر قدم ایسا تھا جس پر لوگوں کو یقین ہی نہیں آسکتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۔تم قدم بقدم چلو۔اور پھر دیکھو کہ ہمارے رسول کی باتیں کس طرح پوری ہوتی ہیں آج تم ہمارے رسول کو تحقیر کی نگاہوں سے دیکھتے ہو۔لیکن ہم تمہارے سامنے اس پیشگوئی کا اعلان کرتے ہیں کہ پہلا قدم یہ ہوگا کہ یہ رسول کریم تسلیم کیا جائے گا۔ یہ ایک قریب کی پیشگوئی ہے جس کے پورا ہونے پر بعید زمانہ سے تعلق رکھنے والی پیشگوئیوں کے بھی پُورا ہونے کی بھی امید کی جاسکتی ہے۔اِس وقت یہ تمہیں غیر معزز نظر آرہا ہے اور تم اسے اپنے رحم پر سمجھتے ہو لیکن عنقریب تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ اس کا رسول کریم ہونا ثابت ہو جائے گا۔اور جب یہ بات ثابت ہوجائے گی کہ اگر ایک ناممکن بات ہوگئی ہے تو دوسری ناممکن باتیں بھی وقوع میں آجائیں گی۔

یہاں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے قرآن خدا کا کلام نہیں بلکہ بندے کا کلام ہے۔مگر یہ اعتراض کلام کے طریق کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے جب کوئی شخص ہم سے آکر بات کرتا ہے تو ہماری اس سے دو بحثیں ہوتی ہیں۔اول یہ کہ وہ جو کچھ کہتا ہے آیا لفظاً لفظاً درست ہے یا نہیں۔دوم بعض دفعہ الفاظ کا سوال نہیں ہوتا۔صرف اتنا دریافت کیا جاتا ہے کہ آیا اس نے پیغام کا مفہوم درست طور پر ادا کیا ہے یا نہیں۔ یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔اور ان کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے دونوں کا آپس میں فرق بھی بہت بڑا ہے۔مثلاً ایک شخص ہمارے پاس آکر کہتا ہے کہ مجھے فلاں شخص نے بتایا ہے کہ تم کو

فلاں عہدہ دے دیا گیا ہے۔ اب کبھی تو اس شخص کو خود بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجھے فلاں عہدہ دے دیا گیا ہے۔ مگر اس کے آرڈر کے الفاظ کا علم نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں وہ خبر دینے والے سے پوچھتا ہے کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ آرڈر کے الفاظ کیا تھے۔ اگر اسے علم ہوتو بتا دیتا ہے۔ اور اگر علم نہ ہوتو معذرت کر دیتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسے پہلی دفعہ نئے عہدہ کی خبر ملتی ہے ایسی حالت میں وہ یہ دریافت کرتا ہے کہ بتاؤ تم نے جو مجھے پیغام آ کر دیا ہے آیا یہ اپنے مفہوم کے لحاظ سے درست ہے؟ اس وقت اسے الفاظ سے اتنی غرض نہیں ہوتی۔ جتنی مفہوم کے درست ہونے سے غرض ہوتی ہے۔ تو یہ الگ الگ صورتیں ہیں جو عام طور پر پیش آتی رہتی ہیں۔ اب ہمیں غور کرنا چاہیے کہ دشمن کا مطالبہ کیا تھا جس کے متعلق اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کہا گیا۔ سو اگر کوئی شخص غور کرے تو ادنیٰ فکر سے بھی یہ بات معلوم کر سکتا ہے کہ دشمن کا سوال یہ نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کہا ہے یا نہیں یا اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ اس نے کہا ہے یا نہیں۔ بلکہ دشمن تو یہ پوچھتا تھا کہ الفاظ چاہے کچھ ہوں سوال یہ ہے کہ ان کا جو مفہوم ہے وہ کب پورا ہوگا۔ اسے اِذَا یا اَلشَّمْسُ یا كُوِّرَتْ یا اَلنُّجُوْمُ وغیرہ الفاظ سے کوئی بحث نہیں تھی۔ وہ کہتا تھا کہ الفاظ خواہ کچھ رکھ لو۔ سوال یہ ہے کہ یہ باتیں کب ہوں گی؟ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ میں اس سورۃ کے الفاظ کی طرف اشارہ نہیں۔ بلکہ اس کے مفہوم کی طرف اشارہ ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دشمن کی طرف سے الفاظ کے متعلق بھی بحث کی جاتی ہے مگر جہاں پیشگوئیوں کے متعلق بحث ہو وہاں یہ بحث نہیں ہوتی کہ الفاظ کون سے نازل ہوئے ہیں بلکہ وہاں یہ بحث ہوتی ہے کہ ان الفاظ کا مفہوم کب پورا ہوگا اللہ تعالیٰ دشمنوں کے اس مطالبہ کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ یہ بات جو کہی گئی ہے ایک معزز رسول نے کہی ہے۔ اور معزز رسول جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ اس لئے یہ مفہوم ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔ پس یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ اس جگہ کفار کی طرف سے الفاظ کے متعلق اعتراض نہیں کہ آیا وہ خدا کی طرف سے ہیں یا نہیں۔ بلکہ مفہوم کے متعلق اعتراض ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ یہ پیغام جو تم کو دیا گیا ہے ایک رسول کریم نے دیا ہے۔

اِس جگہ اللہ تعالیٰ نے رسول امین نہیں کہا بلکہ رسول کریم کہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں الفاظ کے ضبط کی بحث ہوتی ہے وہاں رسول امین کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور جہاں مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کا ذکر ہو وہاں رسول کریم کے الفاظ لائے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہی پیغامبر عزت کا مستحق ہوتا ہے جو پیغام کو صحیح طور پر دوسرے تک پہنچا دیتا ہے۔ اگر آقا کچھ کہے اور نوکر جا کر کچھ کہہ دے۔ آقا تو یہ کہے کہ مَیں فلاں جگہ کل آؤں گا۔ اور وُہ جا کر یہ کہہ دے کہ وہ کہتے ہیں میں نہیں آؤں گا۔ تو وہ آقا کی نگاہوں میں ذلیل ہو جائے گا۔ عزت کے قابل وہی رسول

ہوتا ہے جو پیغام کو صحیح طور پر پہنچانے والا ہو۔ دشمن کو الفاظ سے اتنی بحث نہیں ہوتی جتنی اس کے مطالب اور معانی سے بحث ہوتی ہے۔ اس لئے رسول کا کام ہوتا ہے کہ الفاظ کے صحیح معانی لوگوں کے سامنے بیان کر دے۔ اگر وہ بیان نہ کرے تو خطرہ ہوتا ہے کہ لوگ دھوکا کھا جائیں۔ پس یہاں اصل سوال الفاظ کا نہیں بلکہ مفہوم کا سوال ہے کہ آیا وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ہمارا معزز رسول ہے۔ اگر اس میں یہ قابلیت نہ ہوتی کہ صحیح پیغام لوگوں تک پہنچاتا تو ہم اسے اتنی بڑی عزت کیوں دیتے۔ پس خالی الفاظِ قرآن نہیں۔ بلکہ الفاظ قرآن کی تشریح بھی اس میں شامل ہے۔

رسولٍ کریمٍ سے مراد جبریل نہیں بلکہ آنحضرت صلعم ہیں یہاں ایک ذوقی لطیفہ بھی ہے مفسرین نے رسول کریم سے جبریل مراد لیا ہے۔ (روح المعانی، الکشاف زیر آیت ھذا) مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا ردّ ایک ایسے عجیب طریق سے کیا ہے کہ لطف آ جاتا ہے۔ مسلمانوں میں عام طور پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو رسول کریم ہی کہا جاتا ہے۔ اور جہاں بھی رسول کریم لکھا ہوا ہو ہر مسلمان کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اس سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی مراد نہیں۔ پس مفسرین نے تو اس سے جبریل مراد لیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں اس لفظ کا استعمال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس قدر کثرت سے کر دیا۔ کہ اب رسول کریم کے الفاظ دیکھنے کے بعد کسی کا ذہن جبریل کی طرف منتقل ہی نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جبریل کا کام تشریح کرنا نہیں بلکہ صاف الفاظ پہنچانا ہے اگر یہاں خالی الفاظ پہنچانے کا ذکر ہوتا تو امین کا لفظ رکھا جاتا کیونکہ الفاظ کو اُن کی اصل صورت میں لوگوں تک پہنچا دینا انسان کی امانت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن یہاں کریم کا لفظ رکھا گیا۔ جو عزت پر دلالت کرتا ہے۔ اور پیغامبر کی عزت اسی وقت ظاہر ہو سکتی ہے جب وہ پیغام کی صحیح اور درست تشریح لوگوں تک پہنچا دے۔

فرماتا ہے اول تو تم دیکھو گے کہ یہ معزز اور برگزیدہ سمجھا جائے گا۔ بڑا عقلمند اور سمجھدار قرار پائے گا۔ پھر ذِیْ قُوَّۃٍ تم دیکھو گے کہ ایک دن یہ ذی قوۃ ہو جائے گا۔ آج یہ تمہیں کمزور نظر آتا ہے۔ اور تمہیں اس کی سچائی کا کوئی ثبوت نظر نہیں آتا۔ لیکن ہم تمہیں بتاتے ہیں ایک دن یہ بڑا طاقتور ہو جائے گا۔ چنانچہ دیکھ لو یا تو یہ حالت تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہلاک کرنے کے لئے آپ کے ارد گرد گھیرے ڈالے جاتے تھے اور یا صلح حدیبیہ کے معًا بعد آپ میں اتنی بڑی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ آپ بڑے بڑے بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور انہیں تبلیغی خطوط بھجواتے ہیں۔ ان کے لئے یہ امر بالکل حیرت کا موجب تھا۔ کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا انقلاب واقعہ ہو گیا۔ کہ عرب کا وہ اُمّی انسان جسے بالکل حقیر سمجھا جاتا تھا اس قدر طاقت پکڑ گیا ہے کہ وہ ہمیں مخاطب کرتا اور اسلام

میں داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے آج کل اور زمانہ ہے۔ آج کل بادشاہوں کے پاس خط جائیں تو وہ اُن کو پڑھ کر اسی وقت پھینک دیں گے اور پروا بھی نہیں کریں گے۔ کہ کس نے کیا لکھا ہے۔ مگر اس وقت بڑے بڑے جابر بادشاہ تھے اور ان کو خط لکھنا کسی معمولی انسان کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ کسریٰ نے جب یہ خط پڑھا تو وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ اسے اپنی ہتک محسوس ہوئی۔ اور اس نے نہایت غصہ کا اظہار کیا (تاریخ طبری زیر عنوان ذکر خروج رسل رسول اللہ الی الملوک)۔ آج کل قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانہ میں بادشاہوں کو خط لکھنا کتنا مشکل کام تھا۔ کیونکہ اب زمانہ اور ہے آج جو شخص چاہے بادشاہوں کو خط لکھ سکتا ہے۔ بلکہ جنگ سے پہلے اگر کوئی ہٹلر، میسولینی یا روزویلٹ کو خط لکھنا چاہتا تو آسانی سے لکھ سکتا تھا۔ مگر وہ زمانہ ایسا نہیں تھا اس زمانہ میں بادشاہوں کو کسی معمولی آدمی کا خط لکھنا اپنی موت کو خود بلانے کے مترادف تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت دفعہ دھوکا لگ جاتا ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اسی بات پر بہت فخر کیا کرتے تھے کہ میں وائسرائے کو خط لکھتا ہوں تو وُہ میرے خط کا جواب دے دیتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ اُسے تو اگر ایک چوڑھا بھی خط لکھے تو وہ جواب دے دے گا ڈیئر سَر !Dear Sir مخصوص الفاظ ہیں جو ہر خط پر لکھے جاتے ہیں۔ پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ میری بڑی عزت ہو گئی حالانکہ یہ عام الفاظ ہوتے ہیں مگر مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اس دھوکہ میں رہے کہ وائسرائے مجھے خط لکھتے ہیں تو مہربانِ من کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ہاں اس کے سوا اور کوئی لفظ ہی نہیں۔ وُہ ایک چوڑھے کو بھی خط لکھیں گے تو اوپر یہی الفاظ لکھیں گے۔ ڈپٹی کمشنر کو لکھیں گے تو اُسے بھی یہی لکھیں گے تو بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اسی رنگ کی ایک اور مثال مجھے یاد آ گئی۔ مَیں نے ایک دفعہ ایک احمدی کو دیکھا کہ وہ دُوسرے سے بحث کر رہا تھا۔ کہ کیا تم نے مجھے کبھی جھوٹ بولتے دیکھا۔ اور اس کے متعلق وُہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس: ۱۷) کو بار بار پیش کرتا کہ مَیں تم میں اتنا عرصہ رہا ہوں۔ کیا تم نے مجھے جھوٹ یا فریب سے کام لیتے دیکھا۔ حالانکہ یہ استدلال اس کے لئے ہوتا ہے جو قوم کے سامنے آ چکا ہوتا ہے۔ نہ کہ جو شخص اٹھے اس سے اپنی صداقت کا استدلال کرنا شروع کر دے۔ جو شخص قوم کی نظروں کے سامنے آ جائے۔ اس کے لئے بے شک یہ دلیل ہے لیکن دوسرے کے لئے نہیں۔

آنحضرت صلعم کے ذِیْ قُوَّةٍ اور ذِی الْعَرْش مکین ہونے کا ایک نظارہ اسی طرح کسی بڑے آدمی کو چٹھی بھیج دینے کی اہمیت موجودہ زمانے میں نہیں رہی اور یہی وجہ ہے کہ بعض مسلمان جب ان باتوں کو

پڑھتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں کہ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کو چٹھیاں بھجوا دیں تھیں۔ تو اس میں کون سی عجیب بات ہوگئی۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اُس زمانہ میں بادشاہوں کو چٹھی لکھنا بڑی خطرناک بات ہوا کرتی تھی اور بادشاہ بعض دفعہ ناراض ہو کر چٹھی بھجوانے والے کو مروا دیا کرتے تھے۔ لیکن آج کل کا زمانہ اور ہے۔ اب اگر روزانہ بھی چٹھیاں لکھی جائیں تو کوئی اہم بات نہیں سمجھی جاسکتی۔ پھر اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خطوط جب مختلف بادشاہوں کو پہنچے تھے تو انہوں نے ان خطوط کا لکھنا ایک معمولی بات سمجھی تھی۔ یا اس کا ان کے قلوب پر خاص اثر ہوا تھا تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا خط قیصر کو پہنچا تو اس نے ابو سفیان کو بلایا۔ اور اس سے کئی باتیں دریافت کیں۔ جب سب باتیں دریافت کر چکا تو ابوسفیان کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے کہ لَقَدْ اَمِرَ اَمْرُ ابْنِ اَبِیْ کَبْشَۃَ اِنَّہٗ یَخَافُہٗ مَلِکُ بَنِی الْاَصْفَرِ (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ) کہ اس شخص کا معاملہ تو بہت بڑھ گیا ہے کہ رومیوں کا بادشاہ بھی اس سے خوف کھاتا ہے اسی طرح قیصر کو جبکہ وہ شام پر اپنی فوجیں لے کر آیا ہوا تھا۔ یہ لکھنا کہ اگر تو ایمان نہیں لائے گا تو اِنَّ عَلَیْكَ اِثْمُ الْاَرِیْسِیِّیْنَ (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ) یعنی تیرے ماتحت جس قدر لوگ ہیں ان سب کا گناہ تیرے سر پر ہوگا بتا رہا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا خط یہ جانتے ہوئے لکھا تھا کہ ممکن ہے وہ فوج لے کر ہم پر چڑھائی کر دے۔ اور ممکن ہے وہ مجھے مارنے کا فیصلہ کرے۔ مگر آپ نے اس بات کی کوئی پروا نہ کی۔ اور بڑے بڑے بادشاہوں کو کھلے طور پر سنا دیا کہ اگر تم ایمان لاؤ گے تو اس میں تمہارا فائدہ ہے اور اگر انکار کرو گے تو خدا تعالیٰ کے حضور ایک مجرم کی حیثیت میں کھڑے ہو گے۔ تو فرماتا ہے آج محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو۔ لیکن عنقریب تم دیکھو گے کہ وُہ ذِیْ قُوَّۃٍ ہو جائے گا بڑے بڑے بادشاہ اس کے خوف سے کانپیں گے اور غیر معمولی عظمت اسے حاصل ہو جائے گی۔

ذِیْ قُوَّۃٍ کہہ کر عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ کہنے کی وجہ

عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ پھر ذِیْ قُوَّۃٍ ہونے کے بعد تم اس میں ایک زائد بات بھی دیکھو گے۔ ذِیْ قُوَّۃٍ ہونے والے عام طور پر دین اور مذہب کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور وُہ طاقتور ہو کر ضعیفوں کے حقوق غصب کر لیتے ہیں مگر فرمایا یہ ایسا نہیں ہوگا۔

دراصل مکہ والوں کے دلوں میں بھی وہی شبہ تھا۔ جو یورپ والوں کو پیدا ہوا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بڑائی حاصل کرنے یا بادشاہت اور حکومت اپنے قبضہ میں لینے کے لئے سب کچھ کر رہے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پیغام بھجوایا تھا کہ اگر آپ دولت چاہتے ہیں تو ہم اتنی دولت آپ کے

لئے جمع کر دیتے ہیں کہ عرب میں اور کسی کے پاس اتنی دولت نہ ہوگی۔ اور اگر آپ حکومت چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ ماننے کے لئے تیار ہیں۔ مگر ہمارے بُتوں کو بُرا بھلا نہ کہا جائے (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام زیر عنوان قول عتبۃ بن ربیعۃ فی امر رسول اللہ)۔ تو مکّہ والے سمجھتے تھے کہ یہ سب پیشگوئیاں اس لئے کی جاتی ہیں کہ حکومت حاصل کرنے کی خواہش دل میں پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم یہ خیال کرتے ہو کہ اس نے اپنے ذی قوۃ ہونے کے متعلق اس لئے خبریں دینی شروع کر دی ہیں کہ یہ بادشاہ بننا چاہتا ہے یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ بادشاہ ہوگا مگر اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق نہیں ہوگا بلکہ جب یہ بادشاہ ہوگا تو تم دیکھو گے کہ یہ تقویٰ میں پہلے سے بھی بڑھ جائے گا۔ اور جو شخص بادشاہت کے بعد نیکی اور تقویٰ میں پہلے سے بھی بڑھ جائے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وُہ حکومت کی ذاتی طور پر خواہش رکھتا تھا۔ بلکہ اس کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ خدا نے خود اس مقام پر اسے کھڑا کیا ہے۔ فرماتا ہے ہم بھی جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بادشاہت دیں گے تو وہ غریب پرور ہوگا۔ منکسر المزاج ہوگا۔ وہ خدمت خلق کرنے والا ہوگا۔ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا کرنے والا ہوگا۔ گویا بادشاہت اس کی نماز کو بڑھا دے گی۔ اس کے روزہ کو ترقی دے گی۔ اس کے صدقہ اور اس کے حج اور اس کی دوسری نیکیوں میں اضافہ کر دے گی۔ پس ذِيْ قُوَّةٍ کے ساتھ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ رکھ کر دونوں کا جوڑ بتا دیا۔ لیکن ذِيْ قُوَّةٍ میں ایک خوبی تھی اور ایک نقص تھا۔ خوبی تو یہ تھی کہ جو شخص ذی قوۃ ہو وہ دوسروں پر غالب آجاتا ہے اور نقص یہ ہوتا ہے کہ طاقت حاصل کرنے کے بعد انسان دوسروں کے حقوق کو دلیری سے دبا لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم ہمارے رسول میں یہ بات نہیں دیکھو گے۔ اس کی ذی قوۃ والی حالت اسے مغرور نہیں کرے گی۔ بلکہ وہ اسے عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ بنا دے گی۔ اس کی بادشاہت اسے نیکیوں میں اَور بڑھا کر اسے خدا تعالیٰ کا اور بھی مقرب بنا دے گی۔ اس کا تقویٰ میں بڑھنا اس کا دین میں ترقی کرنا اس کا لوگوں کے حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھنا سب باتیں اس کا ثبوت ہوں گی کہ اس کی بادشاہت دنیوی بادشاہت نہیں۔ اور اسکی بادشاہت اسے دین سے بے بہرہ کرنے کا موجب نہیں بلکہ اسے تقویٰ اور طہارت اور عرفان میں ترقی دینے کا موجب ہے۔

مطاع کے ساتھ امین کا لفظ لانے میں حکمت پھر فرماتا ہے مَطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ دو متضاد باتیں لے آیا ہے۔ اول مُطاع اور پھر ساتھ ہی اَمِین۔ مُطاع کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ سب لوگ اس کی باتیں ماننے پر مجبور ہوں گے۔ مگر فرمایا گو یہ لوگوں کا مطاع ہوگا لیکن ساتھ ہی اَمِین بھی ہوگا۔ جو شخص مطاع ہو جاتا ہے اس کے اندر بعض دفعہ غرور اور کبر پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ کوئی شخص میرے

فیصلے کے خلاف اپنی زبان نہیں کھول سکتا۔ مگر فرماتا ہے جب خدا اس کے ہاتھ میں لوگوں کی گردنیں دے گا۔ ان کی عزتیں دے گا۔ ان کے مال دے گا۔ تو تم دیکھو گے یہ ہر شخص کا حق پُوری دیانتداری کے ساتھ ادا کرے گا۔ گویا جہاں خدا کا حق پوری طرح ادا کرنے کے لحاظ سے یہ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ ہوگا۔ وہاں بندوں کے حقوق ادا کرنے کے لحاظ سے یہ امین بھی ہوگا۔

ان چار الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے حکومتی اخلاق کا ایسا زبردست نقشہ کھینچا ہے کہ جس کی مثال دنیا کے پردہ پر نہیں مل سکتی۔ فرماتا ہے یہ بادشاہ ہوجائے گا۔ مگر خدائی بادشاہت کا جوا اپنی گردن پر رکھے گا۔ یہ حاکم ہوجائے گا مگر سب لوگوں کے حقوق پورے انصاف کے ساتھ ادا کرے گا۔ گویا اطاعت اللہ اس میں اس وقت پائی جائے گی جب اس کے پاس طاقت ہوگی۔ اور شفقت علیٰ خلق اللہ اس میں اس وقت پائی جائے گی۔ جب بندے اس کے رحم پر ہوں گے۔ غرض کَرِیْمٍ۔ ذِیْ قُوَّۃٍ۔ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ۔ مُطَاعٍ۔ اَمِیْنٍ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صفات ہیں جو ان آیات میں بیان کی گئی ہیں۔

ان آیات کے ایک اور معنے بھی ہیں۔ اور وہ یہ کہ آپ نے وہ عزت پائی کہ کسی نے کیا پانی ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کو بھی وہ نصیب نہیں ہے۔ ذِیْ قُوَّۃٍ ایسے ہوئے کہ قیصر و کسریٰ کی بادشاہتوں کو الٹ دیا۔ مگر ساتھ ہی مَکِیْنٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ بھی ہیں کہ آج تک آپ کی ہتک کرنے والے ذلیل کئے جاتے ہیں۔ مُطَاعٍ ہیں کہ جب سب بادشاہوں کے تخت الٹے جا رہے ہیں۔ آپ کے تخت کو دوبارہ ایک مامور کے ذریعہ سے قائم کیا جا رہا ہے۔ اَمِیْنٍ ہیں کہ جس کلام کو پہنچانا آپ کے ذمہ لگایا گیا تھا آج تک محفوظ ہے۔ اور روحانی طور پر اس کی حفاظت کا سامان کیا جا رہا ہے۔ اس میں اگر آپ کی قوتِ قدسیہ کا دخل نہیں تو اور کیا ہے۔

وَ مَا صَاحِبُکُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۳﴾

اور تمہارا ساتھی ہرگز مجنون نہیں۔

تفسیر۔ چونکہ ایسی پیشگوئیوں کو سن کر بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں۔ کہ یہ شخص جو ایسی باتیں کرتا ہے پاگل ہے۔ اِس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا اخلاق کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ وَ مَا صَاحِبُکُمْ بِمَجْنُوْنٍ تم اس شبہ میں مبتلا نہ ہونا کہ یہ پاگل ہے۔ کیونکہ وہ صَاحِبُکُمْ ہے۔ تمہارے ساتھ رہا ہے۔ کہیں باہر سے

نہیں آیا۔ اور تم خود اس کی نیکی اور تقویٰ اور عقل اور اصابت رائے کے گواہ رہے ہو۔ پھر اب کس وجہ سے اسے پاگل قرار دیتے ہو۔ آخر عقل سے جنون کی طرف رجوع یا کسی صدمہ سے ہوتا ہے یا بیماری سے یا تدریجی طور پر ہوتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تمہارے ساتھ رہے ہیں اور ان میں سے کوئی بات بھی آپ میں نہیں پائی جاتی۔ پھر ان کو پاگل تم کس طرح کہتے ہو۔ یہ قرآن کریم کا معجزانہ کمال ہے کہ ایک لفظ میں دلیل بیان کر دیتا ہے۔ اس جگہ صرف صَاحِبُکُمْ کے مختصر سے لفظ سے مجنون ہونے کے الزام کی نفی کر دی۔ یعنی اس طرف توجہ دلا کر کہ یہ تو تمہارا صاحب یعنی دوست اور مشیر کار اور امانتدار کہلاتا تھا یکدم اسے جنون آخر کہاں سے آیا۔ اور اس دعویٰ کے بعد اس کے مجنون ہونے کا فتویٰ کیوں لگانے لگ گئے۔ اس سے پہلے تو اسے اپنا آقا اور سردار کہا کرتے تھے۔ اور اپنا لیڈر تسلیم کرتے تھے۔ اور بڑا عقلمند اور سمجھدار قرار دیتے تھے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ﴿۲۴﴾

اور اس نے اس (غیب) کو یقیناً کھلے اُفق میں دیکھا ہے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ ﴿۲۵﴾

اور وہ غیب (کی خبریں بتانے) میں ہرگز بخیل نہیں۔

حَلّ لُغَات۔ اَلْاُفُقُ اَلْاُفُقُّ وَالْاُفُقُ اَلْاٰفَاقُ کا مفرد ہے۔ اور اَلْاٰفَاقُ کے معنے ہیں اَلنَّوَاحِیْ اطراف (اقرب) اور اُفُقُ الْمُبِیْنِ۔ نَاحِیَةُ الْمَشْرِقِ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ سورج مشرق سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔

ضَنِیْنٍ مَا هُوَ عَلَى الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ اَیْ مَا هُوَ بِبَخِیْلٍ یعنی ضَنِیْنٍ کے معنی ہیں بخیل اور مَا هُوَ عَلَى الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ کے معنے ہیں کہ وہ غیب بیان کرنے پر بخیل نہیں۔ (مفردات)

تفسیر۔ مجنون کے الزام کو ردّ کر کے اب بتاتا ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دَورِ نبوت ایک لمبے عرصہ تک کے لئے ہے تو وہ اس لمبے عرصہ کے متعلق پیشگوئیاں کیوں نہ کرے۔ وہ اپنے دعویٰ کی وجہ سے مجبور ہے کہ جو باتیں تم کو دُور اور خلاف عقل نظر آتی ہیں اُن پر روشنی ڈالے کیونکہ وُہ باتیں اس کے زمانۂ بعثت کے اندر شامل ہیں تمہارے لئے وہ زمانۂ غیب ہے لیکن اس کے جہان پر وہ ظاہر ہے اور اس کی دنیا کے لئے بطور افقِ مبین کے ہے جسے وہ دیکھ رہا ہے اور جن خبروں کو وہ بتا رہا ہے وہ مشرق سے تعلق رکھتی ہیں۔

افق مبین سے مراد مشرق مشرق کا استدلال اس سے ہوتا ہے کہ گو افق تو ہر جہت بعیدہ کو کہتے ہیں لیکن حدنظر جہاں آسمان اور زمین کو ملتے ہوئے دیکھتی ہے وہ ہر سمت افق تو ہوتی ہے مگر افق مبین نہیں ہوتی یعنی کھولنے اور ظاہر کرنے والی افق۔ کھولنے اور ظاہر کرنے والی افق مشرق ہی کی ہوتی ہے جدھر سے سورج نکلتا ہے اور اندھیروں کو پھاڑ دیتا ہے پس افق مبین کے الفاظ ادا کر کے نہ صرف زمانہ بعیدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بلکہ مشرق کی طرف کے ظہور کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ اس کی بتائی ہوئی خبریں گو تم کو عجیب معلوم ہوتی ہیں مگر تمہیں اِسے مجنون کہنے کا حق نہیں ہے کیونکہ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ اس نے غیب کی ایک ہی خبر نہیں دی کہ تم کہہ دو یہ تو پاگل ہے بلکہ یہ غیب پر بخیل نہیں ہے یعنی اس نے آئندہ حالات سے تعلق رکھنے والی بہت سی اہم خبریں دی ہیں جن میں سے کئی پوری بھی ہو چکی ہیں۔ اگر ایک ہی خبر ہوتی جو اس نے دی ہوتی اور اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ کہا ہوتا کہ چونکہ تیرہ سو سال کے بعد ایسا ہو جائے گا اس لئے تم مجھے مان لو تو تم کہہ سکتے تھے کہ یہ پاگل ہے مگر اب تم یہ بات نہیں کہہ سکتے کیونکہ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ۔ یہ پہلی خبر نہیں ہے جو اس نے دی ہو بلکہ اور بھی یہ بہت سی خبریں دے چکا ہے اور وہ خبریں پوری بھی ہو چکی ہیں پس تم ان خبروں پر قیاس کر کے کہہ سکتے ہو کہ یہ بات بھی ایک دن پوری ہو جائے گی۔ تمہارا یہ حق نہیں ہے کہ تم اسے پاگل کہو۔ آج کل جو جھوٹے مدعی کھڑے ہو گئے ہیں اُن سے جب ہماری بحث ہوتی ہے کہ بتاؤ تمہاری کون کون سی پیشگوئی پوری ہوئی تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ تم مرزا صاحب کی فلاں بات مانتے ہو یا نہیں جس نے ابھی تین سو سال کے بعد پورا ہونا ہے جب تم اس بات کو مانتے ہو تو ہماری بات کیوں نہیں مان لیتے۔ ہم اُنہیں یہی کہا کرتے ہیں کہ اگر مرزا صاحب کی صرف یہی ایک پیشگوئی ہوتی کہ تین سو سال کے بعد ایسا ہو جائے گا تو یقیناً یہ آپ کی صداقت کا کوئی قطعی ثبوت نہ تھا۔ آپ کی صداقت کا ثبوت تو یہ ہے کہ آپ نے اس کے علاوہ اور بھی کئی پیشگوئیاں کیں جو پوری ہو گئیں اُن پر قیاس کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ پیشگوئی بھی ایک دن پوری ہو جائے گی مگر تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تمہاری اب تک کوئی پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ جتنی پیشگوئیاں ہیں سب آئندہ زمانوں سے تعلق رکھتی ہیں چنانچہ جس قدر مدعی ہیں اُن کا سارا زور اسی پر ہوتا ہے کہ اگر مَیں اُن کو مان لوں تو اسلام کو ترقی حاصل ہو جائے گی مگر وہ یہ نہیں سوچتے کہ میں ان کو کس طرح مان لوں جب کہ اُن کی صداقت کا کوئی ثبوت ہی نہیں۔ تو فرماتا ہے وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ۔

سچے مدعی کو پہچاننے کا ایک اصول سچے مدعی کو پہچاننے کا یہ ایک زبردست اصول ہے کہ اس کی بعض پیشگوئیاں قریب زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض بعید زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیشگوئی

فرمائی ہے کہ روس کا عصا مجھے دیا جائے گا یا تین سو سال میں جماعت احمدیت کا ساری دنیا پر غلبہ ہو جائے گا (تذکرۃ الشہادتین روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۶۷)۔ اِن پیشگوئیوں کو دشمن دیکھتا ہے تو وہ کہتا ہے یہ محض ڈھکو نسلے ہیں کون ان باتوں کو مان سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے کہ یہ غیب پر بخیل نہیں ہے اس نے صرف ایک یا دو خبریں نہیں دیں جو ابھی صدیوں بعد پوری ہونے والی ہیں بلکہ یہ اور بھی کئی قسم کی خبریں دے چکا ہے جو پوری ہو چکی ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے تم کیوں یہ تسلیم نہیں کرتے کہ جب وہ باتیں پوری ہو گئی ہیں تو یہ باتیں بھی پوری ہو جائیں گی مجھے اچھی طرح یاد ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پاس آ کر جب کوئی شخص کہتا کہ مجھے کوئی نشان دکھایا جائے تو آپ فرماتے پہلے نشانات سے تم نے کیا فائدہ اٹھایا ہے کہ تمہیں اور نشان دکھایا جائے (ملفوظات جلد ۵ صفحہ ۶۴۳، ۶۴۴)۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمائی ہے کہ وَ مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ۔ بظاہر تم اسے ایک پاگل کی بڑ قرار دیتے ہو کہ دُور مشرق میں ایک مامور آئے گا جس کے ساتھ اسلام کی ترقی وابستہ ہوگی لیکن اگر یہ پاگلوں والی بات ہوتی تو اس کی صداقت کا کوئی اور ثبوت نہ ہوتا۔ لیکن جب اس کی پیشگوئیاں بکثرت ایسی موجود ہیں جو پوری ہو چکی ہیں تو تمہیں ماننا پڑے گا کہ یہ پاگل نہیں ہے اور پھر جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے اس کے اخلاق اور اس کی پہلی زندگی کے حالات مزید ثبوت ہیں اس بات کا کہ یہ مجنون نہیں ہے۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۟ۙ﴿۲۶﴾

اور نہ وہ (یعنی اس پر نازل ہونے والا کلام) دھتکارتے ہوئے شیطان کی (کہی ہوئی) بات ہے۔

حَلّ لُغَات۔ رَجِيْمٌ رَجِيْمٌ رَجَمَ میں سے ہے اور رَجَمَهٗ کے معنے ہوتے ہیں رَمَاهُ بِالْحِجَارَةِ۔ اُسے پتھر سے مارا (۲) قَتَلَهٗ۔ اس کو قتل کر دیا (۳) قَذَفَهٗ۔ اس پر تہمت لگائی (۴) لَعَنَهٗ۔ اس پر لعنت کی (۵) شَتَمَهٗ۔ اس کو گالی دی (۶) هَجَرَهٗ۔ اس کو چھوڑ دیا (۷) طَرَدَهٗ۔ اس کو دھتکار دیا (اقرب) پس رَجِيْم کے معنے ہوں گے دھتکارا ہوا (۲) چھوڑا ہوا (۳) ملعون (۴) تہمت لگایا ہوا (۵) گالی دیا ہوا (۶) پتھراؤ کیا ہوا۔

تفسیر۔ یہاں ایک نہایت لطیف اور زبردست ثبوت پیش کیا گیا ہے جو صادق اور کاذب مدعی میں مابہ الامتیاز کا کام دیتا ہے مگر چونکہ یہ ثبوت باریک ہوتا ہے اس لئے جب تک ایک ماہر فن اس دلیل کو صحیح طور پر پیش نہ کرے دوسرا شخص سمجھ نہیں سکتا۔ رَجِيْم کے معنے ہوتے ہیں دھتکارا ہوا پس وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ کے یہ

معنے ہوئے کہ یہ دھتکارے ہوئے شیطان کا قول نہیں ہے۔ یعنی دو ہی الزام کفار لگا سکتے ہیں ایک یہ کہ نعوذ باللہ آپ پاگل ہیں اس کا جواب اوپر گزر چکا ہے دوسرے یہ کہ نعوذ باللہ آپ بد اور شیطان سے تعلق رکھتے ہیں اس کا بھی وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ سے رد ہو گیا کیونکہ جس کی کئی پیشگوئیاں پوری ہو چکی ہوں وہ شیطان سے تعلق رکھنے والا کس طرح کہلا سکتا ہے شیطان کو علم غیب کہاں سے آیا وہ تو دھتکارا ہوا ہے چنانچہ قرآن کریم نے دوسری جگہ اس مضمون کو یوں بیان فرمایا ہے اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ اِۨلْكَوَاكِبِ۔ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ۔ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ۔ دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ۔ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (الصّٰفّٰت: ۷ تا ۱۱) یعنی ہم نے ورلے آسمان کو ستاروں کے ساتھ مزین کیا ہے اور ہم نے اسے ہر سرکش شیطان سے محفوظ کیا ہے وہ خُدا کے مقربوں کی بات نہیں سُن سکتے (کجا یہ کہ خدا تعالیٰ کی بات سُنیں) اور ہر طرف سے اُن پر پتھراؤ ہوتا ہے تاکہ انہیں دُور کر دیا جائے اور انہیں مستقل عذاب ملتا ہے۔ ہاں اگر کوئی بات (مقربین سے) اُچک لے تو اللہ تعالیٰ اُس پر ایک چھید دینے والا ستارہ پھینکتا ہے جو اُسے تباہ کر دیتا ہے پس اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ علمِ غیب شیطانوں کو نہیں ہوتا۔ اگر جھوٹے ملہمین کسی کی بات کو اپنی طرف منسوب کر کے وہ غیب دان بننا بھی چاہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو سزا دے کر تباہ کر دیتا ہے۔ پس جبکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غیب کے بیان کرنے میں بخیل نہیں یعنی کثرت سے غیب بیان کرتے ہیں تو ان کا تعلق شیطان سے کس طرح ہو سکتا ہے وہ تو لازمًا خدا تعالیٰ کے مامور ہی سمجھے جا سکتے ہیں۔ ایک دلیل اور بھی اس جگہ دی گئی ہے اور وہ یہ کہ رَجِيْم دھتکارے ہوئے کو کہتے ہیں۔ پس اس جگہ کفار کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ مدعی تو روز بروز ترقی کر رہا ہے جو شخص شیطان سے تعلق رکھتا ہے وہ تو ذلیل ہوا کرتا ہے نہ کہ ترقی کرتا جاتا ہے۔

ضمنی طور پر اس جگہ یہ ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اس دلیل کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور اُن کے لئے سچے اور جھوٹے مدعی میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو مدعی بھی کھڑا ہو گا خواہ وہ جھوٹا ہی ہو کچھ نہ کچھ لوگ اس کے ساتھ ضرور مل جاتے ہیں اور پھر عام طور پر وہ اس بات کو اپنی صداقت کے ثبوت کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھو ہم اکیلے تھے اب ہمارے ساتھ اس قدر آدمی شامل ہیں۔ میں نے دیکھا ہے عام طور پر ہماری جماعت کے آدمی بھی بعض دفعہ ایسے موقع پر گھبرا جاتے ہیں مثلاً میاں عبد اللہ تیماپوری کہہ دیتے ہیں کہ میں پہلے اکیلا تھا مگر اب مجھے ماننے والے اتنے ہو گئے ہیں یا میاں غلام محمد کہہ دیتے ہیں میرے ساتھ اتنے لوگ ہیں اور یہ میری سچائی کا ثبوت ہے اگر میں جھوٹا ہوتا تو اللہ تعالیٰ مجھے یہ کامیابی کیوں عطا کرتا۔ درحقیقت یہ

دلیل بہت نازک ہے اور جس طرح چٹانوں میں سے جہاز کو حفاظت سے گزارنا پڑتا ہے اسی طرح اس دلیل کے متعلق یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں کوئی شخص دھوکا نہ کھا جائے اور وہ اپنے ایمان کو برباد نہ کر لے۔

انبیاء کی جماعتوں کی تین صفات درحقیقت اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ دلیل اس وقت مکمل ہوتی ہے جب تین باتیں اس میں پائی جائیں۔ بغیر ان تین پہلوؤں کے یہ دلیل کسی مدعی کی طرف سے اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش نہیں کی جاسکتی۔

اوّل اُس کی جماعت میں تقویٰ وطہارت اور نیکی کا ایک معیار ہونا چاہیے۔ خالی چند آدمیوں کا ساتھ مل جانا یا دعویٰ پر ایمان لے آنا کسی مدعی کی صداقت کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔ صداقت کے ثبوت کے لئے ضروری ہے کی تقویٰ و طہارت اور نیکی کا معیار پیش کیا جائے جس سے پتہ لگے کہ اس مدعی پر ایمان لانے والوں کا خدا سے تعلق ہو گیا ہے۔ یہ تو لوگ مان سکتے ہیں کہ ایک شخص کو نیکی کا خیال تھا اور اس کے دل میں یہ احساس تھا کہ میں ترقی کروں مگر ایک دن اس کا دماغ خراب ہو گیا لیکن یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ اُس سے جو شخص بھی جُڑتا جائے اُس کی زندگی میں ایک تغیر پیدا ہوتا چلا جائے اور نیکی اور تقویٰ اس کے قلب میں سرائت کر جائے۔ پس کسی مدعی کو ماننے والوں کی نیکی اور تقویٰ کا معیار ایسا بلند ہونا چاہیے اور اُن کے اندر اللہ تعالیٰ کی خشیت اور بنی نوع انسان کے لئے قربانی اور ایثار کا اس قدر مادہ ہونا چاہیے کہ اسے دیکھ کر انسان خود بخود کہہ اُٹھے کہ جو لوگ خود ایسے ایسے ہیں ان کا مطاع تو بہر حال خدا کا راستباز انسان ہو گا۔ جب تک یہ علامت کسی جماعت کے اندر نہ ہو اس وقت تک اس کے شیطانِ رجیم سے الگ ہونے کا کوئی یقینی ثبوت نہیں ہوسکتا۔

دوسرے شیطان رجیم کے معنے ہیں ایسا شیطان جو ذلیل ہو کیونکہ جس کو رجم ہوتا ہے وہ لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہو جاتا ہے مگر سچے نبی کی یہ علامت ہوتی ہے کہ اس کی جماعت بالقوہ اعزاز اپنے اندر رکھتی ہے اور اس کے افراد کے اندر ترقی کی ایسی قابلیتیں پائی جاتی ہیں کہ ہر دیکھنے والا اس یقین سے پُر ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ ایک دن دنیا پر غالب آجائیں گے۔ جیسے حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق قرآن کریم میں ذکر آتا ہے کہ انہیں کفار نے یہ کہا کہ یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ (ھود: ٦٣) اے صالح تجھ پر تو ہماری بڑی امیدیں تھیں اور ہم سمجھتے تھے کہ تُو قوم کو ترقی کی طرف لے جائے گا۔ یہ امید تو لوگ رکھتے ہی ہیں دعویٰ کے بعد جب ایک جماعت اس کے ساتھ کھڑی ہو جاتی ہے اُس وقت اُن کے دماغوں میں ایسی تازگی اور ان کے دلوں میں ایسی ہمت بلند پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کسی روک کی پروا نہیں کرتے۔ مگر اس ہمت بلند سے مراد خیالی پلاؤ پکانا نہیں۔ جیسا کہ بعض مدعیوں نے کہہ دیا کہ دنیا کی

حکومت ہمیں ملے گی اور جب اُن کے ایک مرید نے کہا کہ مجھے کیا ملے گا تو اُسے کہا گیا کہ پنجاب کی بادشاہت۔ بلکہ ہمت بلند سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسے طریق اختیار کرتے ہیں جن سے دنیا یہ سمجھنے پر مجبور ہوتی ہے کہ اُن کی طرف سے دنیا کو فتح کرنے کے ذرائع عمل میں لائے جارہے ہیں اور وہ اس غلبہ کے لئے معقول جدوجہد کررہے ہیں۔ پس سچے مدعی کی دوسری علامت یہ ہوتی ہے کہ اس کی جماعت میں رجم نہیں پایا جاتا بلکہ اقدام پایا جاتا ہے۔ رجم کے معنے ہیں بھاگنا۔ جس پر پتھراؤ ہوتا ہے وہ اس سے بچنے کے لئے بھاگتا ہے۔ مگر صادق مدعی کی جماعت دشمنوں سے بھاگا نہیں کرتی بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے وہ حملہ کر کے اُن کو کھا جانے کی کوشش کر رہی ہے۔

تیسری بات اس کے اندر یہ بتائی گئی ہے کہ جس پر پتھراؤ ہو وہ سامنے نہیں آتا بلکہ اِدھر اُدھر چُھپتا پھرتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں مومنوں سے فرماتا ہے کہ وہ خنّاس کے وسوسوں سے بچنے کے لئے ہمیشہ دعا کرتے رہا کریں اور خنّاس وہی ہوتا ہے اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ۔ مِنَ الْجِنَّۃِ وَ النَّاسِ جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے پیدا کرتا اور خود چھپ جاتا ہے اِسی مناسبت سے ان آیات میں خُنَّس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر انبیاء کی جماعتوں میں کوئی اخفا نہیں ہوتا وہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی تعلیم کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم نے اس تعلیم پر جو جو اعتراض کرنا ہے وہ بے شک کر لو مگر دوسروں میں یہ ہمت نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ اُن کی تعلیم کا لوگوں کو علم نہ ہو۔ جیسے بہائی ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنے مذہب کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ کبھی سپاہی بھی لوگوں سے چھپتا ہے۔ سپاہی تو وردی پہن کر لوگوں کے سامنے پھرتا ہے مگر چور اِدھر اُدھر چھپتا پھرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کوئی اُسے دیکھ نہ لے۔ پس جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھڑے کئے جاتے ہیں وہ اپنی کسی بات کو چھپاتے نہیں۔ بلکہ علی الاعلان لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ ہمارے عقائد ہیں۔ ان باتوں پر ہمارا ایمان ہے اور یہ یہ ہماری شریعت کے احکام ہیں۔ اگر تمہیں ان پر کوئی اعتراض ہے تو بے شک کر لو۔ مگر جھوٹے لوگ اپنے مذہب اور اس کی تعلیم کو کسی نہ کسی رنگ میں ضرور چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پس فرماتا ہے وَمَا ھُوَ بِقَوْلِ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ یہ شیطان رجیم کا قول نہیں اگر شیطان رجیم کا قول ہوتا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے ضرور چھپاتے مگر اُسے تو ہم نے حکم دیا ہوا ہے کہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (الحجر:۹۵) کہ اے نبی جس چیز کے ظاہر کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اُسے ظاہر کرو۔ اور بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (المائدۃ:۶۸) کہ جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کو تم لوگوں تک پہنچا دو۔ اور جب کوئی بات تم سے نہیں چھپائی جاتی تو یہ شیطان رجیم کا کلام کس طرح ہوسکتا ہے؟ تم بے شک اعتراض کر لو۔ اس تعلیم کے متعلق جو کچھ کہنا چاہتے ہو کھلے طور پر کہہ لو

تمہاری ایک ایک بات کا جواب دیا جائے گا اور ثابت کیا جائے گا کہ تمہارے اعتراضات محض غلط ہیں اصل تعلیم وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے پیش کی جارہی ہے۔ اور جب کہ کوئی بات بھی اس کلام میں ایسی نہیں جو خدا کی طرف منسوب نہ ہوسکتی ہو یا لوگوں کے اعتراضات کے ڈر سے اُسے چھپانے کی ضرورت محسوس ہو۔ تو یہ چیز اپنی ذات میں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شیطان رجیم کا قول نہیں ہے۔ یہ صادق اور کاذب مدعی نبوت میں امتیاز کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ عام طور پر ہر مدعی کاذب اپنی تعلیم میں کسی حد تک ضرور اخفا سے کام لیتا ہے مگر صادق مدعیٔ نبوت جو کچھ کہتا ہے علی الاعلان کہتا ہے۔ ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے۔ اور کسی اعتراض کی پروا نہیں کرتا۔ اسی طرح شیطانی جماعتوں میں قوتِ اقدام نہیں ہوتی۔ کوئی ایسی سکیم اُن کے سامنے نہیں ہوتی جس پر عمل کر کے وہ ترقی کی امید کر سکیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی جماعت کی ترقی کے لئے غیر معمولی سامان بھی پیدا کر دیا کرتا ہے مگر بہر حال جماعتی تدابیر کا بھی بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ وہ کُنج کہہ کر اپنے نبی کے ماننے والوں کو دنیا پر غالب نہیں کر دیا کرتا بلکہ کئی قسم کی دنیوی تدابیر سے کام لیتا ہے گویا تقدیر اور تدبیر دونوں کا ایک چکّر ہے جو چلتا چلا جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (آل عمران:۵۵) کہ کفار نے بھی تدابیر سے کام لیا اور اللہ نے بھی تدابیر سے کام لیا اور آخر خدا اپنی تدابیر میں غالب آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی سلسلوں کی کامیابی میں بھی تدبیر کا دخل ہوتا ہے گو تدبیر اور تقدیر دونوں کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اُسی کی مشیّت کا دنیا میں نفاذ ہوتا ہے۔ مگر الٰہی جماعتوں کا یہ اوّلین فرض ہوتا ہے کہ وہ ترقی کی تدابیر اختیار کریں اور ایسی سکیمیں سوچیں جو اُن کے قدم کو آگے کی طرف بڑھانے والی ہوں۔

ہماری جماعت کو دیکھ لو اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہر فرد کے اندر ایسی قوتِ اقدام رکھ دی ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ جماعت ایک دن دنیا کو کھا جائے گی۔ ''زمیندار'' جیسے اشد معاند اخبار نے بھی ایک دفعہ لکھا تھا کہ ''میری آنکھیں یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہیں کہ وہ لوگ جو کینٹ اور ہیگل کے فلسفہ تک کو خاطر میں نہیں لاتے وہ بھی مرزا غلام احمد قادیانی کے ماننے والوں میں شامل ہوتے جاتے ہیں'' (زمیندار ۹/اکتوبر ۱۹۳۲ء) اُس کا یہ اقرار درحقیقت اعلان تھا اس امر کا کہ وُہ بھی محسوس کر رہا ہے کہ جماعت احمدیہ دنیا پر چھا جائے گی۔

پھر سچے مدعی کی تعلیم میں کوئی اخفا نہیں ہوتا۔ وہ کھلم کھلا اپنی باتوں کو پیش کرتا اور ساری دنیا کو پکار کر کہتا ہے کہ اگر تم نے کوئی اعتراض کرنا ہے تو آؤ اور اعتراض کرو مَیں اس کا جواب دینے کے لئے تیار ہوں شیطان رجیم میں یہ جرأت کہاں ہوسکتی ہے وہ تو کوشش کرتا ہے کہ لوگوں کی نگاہ سے چُھپے اور خنّاس بن کر مخفی رہے۔ اسی طرح سچے مدعی کی

جماعت کو نیکی کا جو بلند مقام حاصل ہوتا ہے وہ کاذب مدعی کے ماننے والوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ غرض شیطان بزدل ہوتا ہے مگر مومنوں کے اندر اقدام پایا جاتا ہے۔ شیطان بدی کی طرف لے جاتا ہے اور اُن میں نیکی کا مادہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ شیطان بے اصول ہوتا ہے مگر اُن کے سامنے ایک معیّن پروگرام ہوتا ہے جو اُن کی کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔ شیطان چھپ چھپ کر باتیں کرتا ہے اور وہ علی الاعلان باتیں کرتے ہیں۔ پھر تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ یہ کلام جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں یہ شیطانِ رجیم کا کلام ہے۔

بعض دفعہ الفاظ تھوڑے سے ہوتے ہیں مگر اُن میں مضامین بڑے وسیع طور پر پائے جاتے ہیں یہاں بھی شیطان رجیم کا لفظ رکھ کر اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑا مضمون بیان کر دیا ہے اور اُن آیات کی طرف اشارہ کر دیا ہے جن میں شیطان رجیم کا ذکر آتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ شیطان رجیم کی جو جو عادتیں قرآن کریم میں بیان کی گئی ہیں وہ سب دیکھ لو اور پھر ایک ایک بات کے متعلق غور کرو آخری تم اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ یہ شیطان رجیم کا کلام نہیں ہے۔

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۷﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾

پھر (باوجود اس کے) تم کہاں جاتے ہو۔ یہ تو صرف (تمام) جہانوں کے لئے ایک نصیحت ہے۔

حَلّ لُغَات۔ ذِکْرٌ ذِکْرٌ کے معنے ہیں اَلتَّلَفُّظُ بِالشَّيْءِ۔ کسی چیز کا زبان سے تلفّظ کرنا۔ اِحْضَارُهٗ فِي الذِّهْنِ بِحَيْثُ لَا يَغِيْبُ عَنْهُ کسی چیز کو ذہن میں اس طرح مستحضر کرنا کہ وہ ذہن سے غائب نہ ہو جائے۔ الصِّيْتُ۔ شہرت۔ اَلشَّرَفُ۔ بزرگی۔ شرف۔ اَلْكِتَابُ فِيْهِ تَفْصِيْلُ الدِّيْنِ وَوَضْعُ الْمِلَلِ۔ ایسی کتاب جس میں دین کی تفصیل ہو۔ اَلذِّكْرُ مِنَ الْقَوْلِ۔ اَلصُّلْبُ الْمَتِيْنُ۔ پکی اور مضبوط بات (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے اب بولو۔ کیا تمہارے لئے کوئی بھی رستہ باقی ہے۔ اگر تم کہو کہ اس کی ذات میں نقص ہے تو ہم نے تمہارے سامنے یہ بات پیش کر دی ہے کہ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ۔ یہ تمہارا ساتھی ہے دن رات تمہارے ساتھ رہتا اور تمہارے ساتھ ہی اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ تم خود اس بات کی گواہی دے سکتے ہو کہ یہ مجنون نہیں ہے۔ پھر اگر تم کہو کہ اس نے جو کلام پیش کیا ہے یہ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ شیطان کی طرف سے ہے تو اس کا بھی ہم نے تفصیلاً جواب دے دیا ہے اب جواب دو کہ تمہارے لئے کون سا رستہ باقی ہے سوائے اس کے اب تمہارے لئے اور کوئی

چارہ نہیں کہ تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف ہو جاؤ اور ان کی بیعت میں شامل ہو جاؤ۔ اگر تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل جاؤ گے تو جنت میں جاؤ گے اور اگر انکار کرو گے تو جہنم میں داخل کئے جاؤ گے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ باقی تمہارا یہ جو سوال ہے کہ اگلے زمانہ سے تعلق رکھنے والی خبریں ابھی سے کیوں دی جا رہی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے مخاطب صرف مکّہ والے نہیں بلکہ وہ بھی ہیں جو تیرہ سو سال کے بعد آئیں گے اور وہ بھی ہیں جو قیامت تک آئیں گے۔ تم تو مکہ کے کنوئیں کے مینڈک ہو تم یہ بات کہاں سمجھ سکتے ہو کہ قرآن صرف مکہ کے لئے نہیں۔ صرف عرب کے لئے نہیں بلکہ وہ ساری دنیا اور قیامت تک آنے والے سب زمانوں کے لئے ہے اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ باتیں بھی بیان کرنی پڑتی ہیں جو اگلے زمانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ تم ان باتوں پر ہنستے ہو مگر اس کی وجہ یہی ہے کہ تمہاری نظر وسیع نہیں۔ تم اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ قرآن کو ہم نے تمام دنیا کی ہدایت کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس میں آئندہ زمانوں میں رُونما ہونے والے واقعات کے متعلق بھی خبریں موجود ہوں۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿۲۹﴾

(خصوصًا) تم میں سے اس کے لئے جو سیدھے راستہ پر چلنا چاہے۔

تفسیر۔ قرآن مجید ہر فطرت کے لئے فرماتا ہے اس قرآن کی صرف یہی خوبی نہیں کہ یہ تمام زمانوں کی ہدایت کے لئے نازل کیا گیا ہے بلکہ اس کی ایک اَور خوبی یہ ہے کہ اس کے احکام میں ہر فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ہر قسم کی فطرت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس شریعت کو نازل کیا ہے جس فطرت کا آدمی بھی اللہ تعالیٰ کے قرب کا راستہ اختیار کرنا چاہے وہ آسانی سے اختیار کر سکتا ہے اور اُسے جس قدر سامانوں کی ضرورت محسوس ہو وہ سب سامان قرآن میں موجود ہیں جس طرح تم میں سے ہر امیر اور غریب۔ عورت اور مرد۔ بچہ اور جوان۔ مالک اور مزدور۔ حاکم اور ماتحت کے متعلق قرآن کریم میں احکام موجود ہیں اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق مکمل ہدایات اس میں نہ ہوں۔ اسی طرح کوئی فطرت ایسی نہیں جس کے لئے قرآنی احکام پر عمل کرنا بوجھ محسوس ہو ہر نوع کا اس میں لحاظ رکھا گیا ہے ہر فطرت کا اس میں لحاظ رکھا گیا ہے اور پھر ہر زمانہ کا اس میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ پس ہماری طرف سے یہ کھلا اعلان ہے کہ بنی نوع انسان میں سے جو چاہے فائدہ اُٹھالے۔ لفظ مِنْكُمْ میں صرف مکہ

والوں سے خطاب نہیں بلکہ تمام اہل زمین سے خطاب ہے اور لِمَنْ شَآءَ سے مراد لِمَنْ شَآءَ مِنْ سُکَّانِ الْعَالَمِیْنَ ہے کہ کسی زمانہ میں کسی فطرت کا آدمی آجائے قرآن میں اُس کی ہدایت کا سامان موجود ہوگا۔ بے شک اس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو تمہاری فطرت یا تمہارے زمانہ کے مطابق نہیں ہیں اور تمہیں یہ پاگل پن کی باتیں نظر آتی ہیں مگر ہم اُن کا ذکر چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ قرآن صرف تمہارے لئے نہیں بلکہ ہر زمانہ کے لئے ہے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾ ع

اور تم یہ نہیں چاہ سکتے مگر اسی صورت میں کہ اللہ (جو) سب جہانوں کا رب (ہے) ایسا ہی چاہے۔

تفسیر۔ پہلے میں وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کے صرف یہ معنے سمجھا کرتا تھا کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ میں واوٴ حالیہ ہے اور میں پچھلی آیت سے ملا کر اس کے یہ معنے کیا کرتا تھا کہ جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہے درآنحالیکہ اس کی مشیت خدا کی مشیت کے مطابق ہو جائے وہ ہدایت پا جائے گا لیکن اب میں اس کے ایک اور معنے سمجھتا ہوں جو ترتیبِ مضمون کے اعتبار سے بھی پہلے معنوں پر مقدّم ہیں۔ اس ضمن میں ایک بات پہلے ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ کہ پہلے فرمایا تھا اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ اور یہاں فرمایا ہے وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ اِن الفاظ نے میری توجہ کو اس بات کی طرف پھیرا کہ یہاں درحقیقت ایک وسیع مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وہ مضمون یہ ہے کہ دنیا میں دو زمانے آیا کرتے ہیں ایک زمانہ وہ ہوتا ہے جب افراد کے سامنے ہدایت موجود ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ وہ اس ہدایت کی طرف توجہ کریں یا نہ کریں۔ لیکن دوسرا زمانہ وہ ہوتا ہے جب ہدایت کلّی طور پر دنیا سے مٹ جاتی ہے اور بحیثیت قوم دین پر زوال آجاتا ہے ایسے وقت میں افراد کے دل میں صحیح طریق کی طرف رغبت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ آخر کسی چیز کی طرف رغبت اچھے نمونہ کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ انسان کہتا ہے فلاں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے مجھے بھی کوشش کرنی چاہیے کہ میرے اندر یہ خوبی پیدا ہو۔ فلاں بڑا نمازی ہے میں بھی نمازی بنوں یا فلاں بڑا روزہ دار ہے میں بھی روزے رکھا کروں غرض نیکیوں کی طرف رغبت اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک نمونہ سامنے موجود نہ ہو۔ اسی لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبۃ:۱۱۹) اگر تم نیکیوں میں ترقی کرنا چاہتے ہو تو صادقین کی صحبت میں رہا کرو۔ لیکن جب نمونہ کوئی نہ رہے اور بحیثیت قوم

زوالِ دین ہو جائے تو لوگ نیکیوں کی طرف کس طرح توجہ کر سکتے ہیں ایسے زمانہ میں جب تک پہلے اللہ تعالیٰ کی مشیّت ظاہر نہ ہو۔ وہ اپنی طرف سے کسی کو لوگوں کی اصلاح کے لئے کھڑا نہ کرے اور آسمان سے ہدایت نازل نہ ہو اس وقت تک لوگوں کے قلوب میں نیکی کی رغبت اور اس پر عمل کرنے کا احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ گویا ایک وقت تو وہ ہوتا ہے جب بندے کے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ دین کی طرف رغبت کرے اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو یہ اس کا اپنا قصور ہوتا ہے ورنہ خدا نے اس کی ہدایت کا سامان پیدا کیا ہوا ہوتا ہے لیکن دوسرا وقت وہ ہوتا ہے کہ اگر خدا ہدایت کا سامان کرے تو لوگ ہدایت پا سکتے ہیں ورنہ صراط مستقیم کا پانا تو الگ رہا اُس کی سچی خواہش بھی لوگ اپنے دل میں پیدا نہیں کر سکتے۔

مامور کے آنے کی ضرورت پس ایسے زمانہ کا واحد علاج مامور کی بعثت ہوتی ہے۔ جب تک کسی مامور کی بعثت نہ ہو لوگ ہدایت کی راہوں کو اختیار نہیں کر سکتے یہ زمانہ جس کی ان آیات میں خبر دی جا رہی تھی چونکہ ایک مامور کا زمانہ تھا اور جس وقت یہ خبر دی جا رہی تھی وہ بھی ایک مامور کا زمانہ تھا۔ گویا اس سورۃ کے شروع میں جن لوگوں کی خبر دی گئی تھی وہ بھی ایسے تھے جن میں ایک مامور نے آنا تھا اور جن کی خبر آخری آیات میں ہے وہ بھی وہ تھے جن میں ایک مامور آیا ہوا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے والو! تم جو کہتے ہو کہ ہمیں محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ یا اے لوگو! جنہیں ایک مامور کی بعثت کی خبر افقِ مبین میں دی گئی ہے۔ تم کہتے ہو کہ ہمیں مامور کی ضرورت نہیں ہم خود اللہ تعالیٰ کے قرب کے راستوں کو اختیار کر لیں گے۔ تمہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اس زمانہ میں ہدایت بالکل مٹ چکی ہے اس لئے تمہارا حال اب اُن لوگوں کی طرح نہیں ہے جو نبی کے زمانہ میں ہوتے ہیں جن کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب چاہیں ہدایت پر چلنا شروع کر دیں۔ تم کہتے ہو کہ ہم اپنے زور سے ترقی حاصل کر لیں گے ہمیں کسی مامور کی اتباع کی ضرورت نہیں۔ مگر یاد رکھو تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ آ جائے تو پھر دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہو سکتی جو اس پر ایمان لانے کے بغیر ترقی کر سکے۔ اگر کوئی فرد یا کوئی قوم ایسی امید اپنے دل میں رکھے تو یہ محض اس کی جہالت ہوگی۔ جب دلوں میں سے کلّی طور پر ایمان مٹ جاتا ہے تو پھر جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نازل نہ ہو وہ نہ صرف ہدایت سے ہی محروم نہیں ہوتی بلکہ ہدایت کے متعلق رغبت ابھی اس کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یاد رکھو یہ بالکل ناممکن ہے کہ تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بغیر ترقی کر سکو۔ اس زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں بڑے بڑے مولوی مسلمانوں میں موجود ہیں اور وہ خیال کرتے

ہیں کہ مسلمانوں کو کسی مسیح یا مہدی کی کیا ضرورت ہے۔علماء راہنمائی کا فرض سرانجام دینے کے لئے بالکل کافی ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے پہلے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کو جوش آئے گا کہ میں اپنا کلام دنیا میں بھیجوں اس کے بعد بنی نوع انسان میں قرب الٰہی کی سچی خواہش پیدا ہوگی۔اس کے بغیر یہ خواہش کبھی پیدا نہیں ہوسکتی۔

غرض اس آیت میں یہ اصول بتایا گیا ہے کہ جب ہدایت دنیا سے کلّی طور پر مٹ جاتی ہے گمراہی چاروں طرف چھاجاتی ہے اور خدا تعالیٰ کا نور لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہوجاتا ہے۔اُس زمانہ میں جب بھی ترقی ہوگی آسمانی نشانات اور ماموراِلٰہی کی بعثت کے ذریعہ ہوگی۔گویا پہلے خدا کی مشیّت آسمان سے ظاہر ہوگی اور اس کے بعد لوگوں کے دلوں میں نیکی کی طرف رغبت پیدا ہوگی اسی لئے ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ کو وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کے ساتھ ملا کر بیان کیا کہ ایک ایسا زمانہ ہوتا ہے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ جب ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ نازل کرے تب ہی افراد کے دلوں میں نیکی کی خواہش پیدا ہوتی ہے ورنہ نہیں۔جو شخص اس نکتہ سے غافل ہوتا ہے وہ ہدایت پانے سے محروم رہ جاتا ہے۔

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ انفطار۔ یہ سورۃ مکی ہے

وَهِيَ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ تِسْعَ عَشَرَةَ اٰيَةً

اور اس کی بسم اللہ کے علاوہ اُنیس ۱۹ آیات ہیں۔

سورۃ الانفطار کا تعلق پہلی سورۃ سے سُورۃ الانفطار کا مضمون پہلی سورۃ کے مضمون کے تسلسل میں ہے اسے الگ اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں اسی سلسلہ کی ایک مستقل کڑی کو بیان کیا گیا ہے۔ گو یا مضمون تو وہی ہے مگر اُس کی ایک دوسری قسم بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی علامتیں جو مسیحیت کے ساتھ خاص ہیں وہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں۔ اِس بات کی حکمت کہ کیوں دو ٹکڑے کر دئے گئے ہیں ایک تو یہی ہے کہ بعض حصّے بعض مضمونوں کے خاص ہوتے ہیں اُن پر زور دینے کے لئے اُن کو الگ کر دیا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی ایک خصوصیت دوسری حکمت جو قرآن کریم کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے اور گو وہ ایک چھوٹی سی بات ہے مگر اس سے قرآن کریم کے ماننے والوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے یہ ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ تھا اور قرآن کریم آخری الہامی کتاب تھی جس کی وجہ سے اس کے مضامین کو اس کے ماننے والوں کے قلوب میں پختہ کرنا نہایت ہی اہم سوال تھا پہلی کتابوں کو اگر اُن کے ماننے والے بُھول بھی جاتے تو اس میں کوئی حرج نہ تھا۔ کیونکہ اُن کی جگہ اور کتابیں آنے والی تھیں لیکن قرآن کریم آخری شرعی کتاب تھی اگر لوگ اس کو بھول جاتے تو دُنیا میں تباہی آ جاتی۔ اور لوگ ہمیشہ کی گمراہی میں مبتلا ہو جاتے۔

قرآن کریم کو مختلف ٹکڑوں میں اتارے جانے کی وجہ پس اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جو بظاہر بالکل چھوٹی سی ہے مگر نتیجہ کے لحاظ سے اتنی اہم ہے کہ اُس کی قیمت کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کو مختلف ٹکڑوں میں بیان کیا گیا۔ اور پھر وہ ٹکڑے ایسی ترتیب سے بنائے گئے کہ چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑہ سے لے کر بڑے سے بڑے ٹکڑہ تک اس کو تقسیم کر دیا گیا جس کی وجہ سے چھوٹا بچہ بھی اُس کا کچھ حصہ یاد کر سکتا ہے اُس سے بڑا بھی یاد کر سکتا ہے اُس سے بڑا بھی اور اُس سے بڑا بھی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ حافظہ والا بھی اس کا کچھ حصہ یاد کر سکتا ہے اور پھر اس سے اوپر جیسے جیسے حافظے بڑھتے چلے جائیں وہ اس کے مختلف ٹکڑے

یاد کر سکتے ہیں۔ سورۃ اخلاص اور سورہ کوثر کتنی چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں پوری دو دو سطر کی بھی نہیں ہیں بلکہ اگر باریک لکھی جائیں تو ایک سطر میں ختم ہو جاتی ہیں اور معمولی حافظہ کا چار سال کا بچہ بھی اُس کو یاد کر سکتا ہے۔ سورۂ بقرہ اڑھائی پاروں کی ہے اور ان کے درمیان مختلف درجوں کی سورتیں ہیں کوئی تین پانچ دس یا پندرہ آیت کی۔ کوئی بیس تیس اور ساٹھ آیت کی اور کوئی سو آیت کی۔ اِسی طرح سورتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں پس کسی لیاقت اور حافظہ کا آدمی نہیں جو قرآن کریم کی کوئی سورۃ یاد نہ کر سکتا ہو۔ اور جس کا حافظہ تیز ہو وہ تو سارا قرآن یاد کر لیتا ہے چنانچہ اس پر عمل ہو رہا ہے اور وہ مسلمان جو تعلیم یافتہ ہیں آخری دو تین پاروں کی سورتیں علیٰ قدر مراتب یاد کر لیتے ہیں۔ اِس طرح ایک ہی وقت میں قرآن کریم کے مختلف ٹکڑوں کے لاکھوں حافظ موجود ہوتے ہیں سارے قرآن کے حافظ الگ رہے۔ بظاہر یہ کتنی چھوٹی سی بات ہے مگر دنیا کی زندگی چھ ہزار سال کی سمجھو یا لاکھ کی یا دس لاکھ کی۔ اگر کسی انسان نے یہ بات بنائی ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی انسان کو یہ بات نہیں سوجھی آخر دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو قرآن مجید کو انسانی کلام سمجھا جائے یا خدائی کلام سمجھا جائے۔ اگر کہو کہ یہ انسانی کلام ہے تو پھر دنیا میں جو انسانی کلام ہیں ان میں سے کسی میں بھی یہ بات نہیں اور آج تک کسی انسان کو یہ بات نہیں سوجھی بلکہ قرآن کریم کے نازل ہونے کے بعد بھی نہیں سوجھی۔ اور اگر یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ اس کتاب کے متعلق اس کا منشا تھا کہ اسے یاد کیا جائے تبھی اُس نے یہ تدبیر کی۔ اگر انسانی کلام سمجھ لو تب بھی اس کی فوقیت ثابت ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک چھوٹے سے گُر کے ذریعہ اُس نے کایا پلٹ دی۔ اور اگر خدائی کلام سمجھ لو تو تب بھی ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ اس کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

قرآن مجید کا مختلف ٹکڑوں میں اترنا اس کی فوقیت کا موجب اگر کوئی کہے کہ کوئی ٹکڑہ تو جس کتاب میں سے چاہے انسان یاد کر سکتا ہے پس اس طرح ٹکڑے کرنے سے قرآن کریم کو کون سی خصوصیت حاصل ہو گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک کتاب میں سے کوئی ٹکڑہ انسان یاد کر سکتا ہے مگر کیا ہر شخص اس بات کا بھی فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ ٹکڑہ اپنے اندر کامل مضمون رکھتا ہے۔ یہ تو مصنّفِ کتاب یا منزلِ کتاب ہی بتا سکتا ہے کہ اُس کا کون کون سا ٹکڑہ اپنی ذات میں مکمّل ہے قرآن شریف کا ہر ٹکڑہ صرف چند آیتوں کا نام نہیں بلکہ ایک مکمّل مضمون کا نام ہے کوئی تین آیتیں سورہ بقرہ کی انسان یاد کر لے تو اسے کیا فائدہ ہو سکتا ہے بسا اوقات وہ تین آیتیں کسی مکمّل مضمون پر مشتمل نہ ہوں گی اور جب تک سیاق وسباق کو نہ ملایا جائے گا وہ اپنے مفہوم کو واضح نہیں کریں گی لیکن سورۂ اخلاص کو لے لو تو گو وہ دو سطر کی بھی سورۃ نہیں مگر اُس میں ایک سارا مضمون بیان کر دیا گیا ہے اسی طرح سورۂ کوثر لے لو یا سورۂ لہب کو لے لو سب

اپنے اپنے مضامین کے اعتبار سے بالکل مکمّل ہیں لیکن اور سورتوں کا اگر اتنا ہی کوئی ٹکڑہ لے لیا جائے تو جہاں تک مضمون کا تعلق ہے ضروری نہیں کہ اُس میں مکمّل مضمون آ جائے مگر جب مصنف یا منزلِ کتاب ٹکڑوں کو الگ الگ کر دے تو پھر اس میں سہولت ہو جاتی ہے پس قرآن کا صرف کوئی ٹکڑہ یاد کر لینا وہ فائدہ نہیں دے سکتا تھا جو فائدہ موجودہ صورت میں پہنچ رہا ہے اور وہ تحریک بھی پیدا نہیں کر سکتا تھا جو موجودہ صورت میں قلوب میں پیدا ہوتی ہے چنانچہ اس بات کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر عیسائیوں سے پوچھا جائے کہ انہیں انجیل کے کتنے ٹکڑے یاد ہیں تو شائد چند معروف ٹکڑے انہیں یاد ہوں تو ہوں ورنہ ساری انجیل مختلف ٹکڑوں کی صورت میں ان کو یاد نہیں ہوگی۔ لیکن اگر قرآن کے متعلق پوچھا جائے تو سارا قرآن مختلف ٹکڑوں کی صورت میں غیر حافظ لوگوں کو بھی یاد ہوگا۔ کسی کو سورۃ بقرہ یاد ہوگی کسی کو سورۂ آل عمران یاد ہوگی کسی کو سورۂ نساء یاد ہوگی اور کسی کو آخری سورتوں میں سے کوئی سورتیں یاد ہوں گی تو علیحدہ تقسیم کی وجہ سے حفظ میں جو مدد ملی ہے وہ اکٹھا لکھنے کی صورت میں نہیں مل سکتی تھی اور اسی حکمت کے ماتحت ان کی تقسیم کی گئی ہے۔

غرض گو اس سورۃ کا مضمون پہلی سورۃ کے مضمون کے تسلسل میں ہے مگر اسے الگ اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں بعض جدید مضامین کی طرف توجہ دلائی گئی جو گو تعلق تو اسی سلسلہ سے رکھتے ہیں مگر ان کی نوعیت اور رنگ کی ہے اور جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ مضمون جہاں مختلف ہوتا ہے وہاں الگ سورۃ بنا دی جاتی ہے تا کہ اس کا پڑھنا اور یاد کرنا کمزوروں پر بھی گراں نہ گزرے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝۱

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ۝۲

جب آسمان پھٹ جائے گا۔

حَلِّ لُغَات۔ اِنۡفَطَرَتۡ اِنۡفَطَرَتۡ اِنۡفَطَرَ سے مؤنث کا صیغہ ہے اور اِنۡفَطَرَ الشَّیۡءُ کے معنے ہیں اِنۡشَقَّ کوئی چیز پھٹ گئی (اقرب) پس اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ کے معنے ہوں گے جب آسمان پھٹ جائے گا۔

تفسیر۔ **اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ میں عیسائیت کے تمام دنیا میں چھا جانے کی طرف اشارہ**

اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ میں آخری زمانہ کے اُس تغیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو عیسائیت سے وابستہ ہے یعنی عیسائیت

کے غلبہ کی طرف اس سورۃ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم: ۹۱، ۹۲) قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اور زمین بھی پھٹ جائے اور پہاڑ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گر جائیں۔ اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے رحمٰن کا ایک بیٹا تسلیم کیا ہے جس وقت قرآن کریم نازل ہوا ہے اس وقت عیسائیت کو دنیا کے بہت تھوڑے حصہ پر غلبہ حاصل تھا اور وہ عام تبلیغ بھی نہیں کرتے تھے اُس وقت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جتنا شرک عیسائیوں کی طرف سے اس وقت کیا جاتا ہے قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائیں پھر اگر کوئی ایسا زمانہ آجائے جب اُس سے دس بیس بلکہ سو گُنا زیادہ شرک پھیل جائے تو لازمی طور پر قرآنی محاورہ کے مطابق ہم یہی کہیں گے کہ آسمان پھٹ گیا چنانچہ دیکھ لو روما کی حکومت عیسائی تھی مگر ساری دُنیا اُس کے ماتحت نہیں تھی صرف ترکی۔ مصر۔ حبشہ اور یونان اس کے ماتحت تھا گویا وسطی ایشیا کا ایک جزو تھا جس پر وہ حکمرانی کررہی تھی مگر آج عیسائیت کو ساری دنیا پر غلبہ حاصل ہو چکا ہے۔ پھر عیسائیت کی تبلیغ کے لئے جن تدابیر کو اس زمانہ میں اختیار کیا گیا ہے وہ پہلے کبھی اختیار نہیں کی گئیں کروڑوں کروڑ انجیل کے نسخے دُنیا کے کونے کونے میں پھیلا دئے گئے ہیں۔ لاکھوں روپیہ اپنے مشنوں کی کامیابی پر خرچ کیا جاتا ہے مدرسے بنائے جاتے ہیں تاکہ اُن کے ذریعہ لڑکوں کو عیسائیت کا شکار بنایا جاسکے۔ کالج بنائے جارہے ہیں تاکہ عیسائیت کا زہر نوجوانوں کے قلوب میں داخل کیا جائے، کوڑھی خانے بنائے جارہے ہیں۔ شفاخانے تیار ہورہے ہیں اور ان سب کی غرض صرف یہی ہے کہ لوگ ایک خدا کی پرستش چھوڑ دیں اور تین خداؤں کو ماننے لگ جائیں پس جب عیسائیت کے قلیل غلبہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں کیونکہ یہ لوگ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دے رہے ہیں تو اب جبکہ شرک تمام دنیا میں پھیل چکا ہے اور عیسائیت کا غلبہ اپنے کمال تک جا پہنچا ہے یہ کیوں نہیں کہا جائے گا کہ وہ آسمان جو پھٹنے کے قریب تھا اب شدّت شرک کی وجہ سے پھٹ گیا ہے۔

جو چیز اپنی انتہاء کو پہنچ چکی ہو اس پر اگر ذرا بھی زور لگ جائے گا تو وہ سلامت نہیں رہ سکتی بلکہ پھٹ جاتی ہے۔ پس فرماتا ہے اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وہ جو ہم نے کہا تھا کہ آسمان اور زمین عیسائیوں کے مشرکانہ عقیدہ کی وجہ سے پھٹنے کے قریب ہیں اگر شرک ذرا بھی بڑھا تو وہ پھٹ جائیں گے وہ زمانہ آئندہ آنے والا ہے کہ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا پر یہ لوگ زور دینا شروع کردیں گے اور آسمان پھٹ جائے گا کیونکہ ظلم اپنی انتہاء کو پہنچ جائے گا پس آسمان پھٹ جائے گا سے مراد یہ ہے کہ عیسائیت غالب آجائے گی اور شرک بڑی کثرت سے دنیا میں پھیل جائے گا۔

اسلام کی ترقی اور عیسائیت کی ترقی میں ایک فرق چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ جس قسم کی ترقی اور جس قسم کا

غلبہ عیسائیت کو حاصل ہوا ہے اس قسم کی ترقی اور غلبہ کی مثال درحقیقت اسلام کے زمانہ میں بھی نہیں ملتی۔ فرق یہ ہے کہ اسلام نے ایک چھلانگ میں ترقی کی ہے اور انہوں نے بیسیوں چھلانگوں میں ترقی کی ہے پھر اسلام کی ترقی تو معجزانہ تھی مگر ان کی سب ترقیات غیر معجزانہ ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک مادیات کا سوال ہے اسلام کے غلبہ سے یہ غلبہ بڑھ گیا ہے کیونکہ اسلام اپنے ہر ماننے والے کو انصاف سکھا تا ہے اور وہ ظلم اور بے انصافی کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ مگر یہ لوگ وہ ہیں جو نہ انصاف کی پروا کرتے ہیں نہ ظلم سے ڈرتے ہیں نہ حقوق غصب کرنے سے گھبراتے ہیں۔ مغرب سے مشرق کے انتہائی کناروں تک یہ لوگ پھیلتے چلے گئے اور مسیحؑ کی عظمت دلوں میں قائم کرتے گئے۔ یہ اثر لوگوں کے قلوب پر اس حد تک ہے کہ عیسائیوں میں ایسے کئی لوگ مل جائیں گے جو تین خداؤں کے قائل نہیں ہوں گے مگر مسیح ناصریؑ کی عظمت اُن کے دلوں میں برابر قائم ہو گی مجھے ایک دفعہ انگلستان میں ایک دہریہ ڈاکٹر ملنے کے لئے آیا اور مَیں نے دیکھا کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر حملہ کر دیتا۔ مَیں نے اسے سمجھایا کہ یہ طریق درست نہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر تمہیں حملہ نہیں کرنا چاہیے مگر وہ آریوں کی طرح برابر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات پر حملے کرتا چلا گیا۔ آخر جب مَیں نے دیکھا کہ وہ میرے صبر سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات پر حملہ کرنے میں بڑھ رہا ہے تو مَیں نے یسوع کی حقیقت اس کے سامنے کھولنی شروع کر دی۔ ابھی مَیں نے چند ہی باتیں کی تھیں کہ اس کا رنگ سُرخ ہو گیا اور کہنے لگا۔ آپ مسیحؑ کا ذکر کیوں کرتے ہیں مَیں نے کہا مَیں سمجھ گیا ہوں کہ گو تم دہریہ ہو مگر تمہارے دل میں عیسائیت باقی ہے اس لئے میں مسیحؑ کا ضرور ذکر کروں گا۔ وہ کہنے لگا مَیں مسیحؑ کے خلاف کوئی بات نہیں سُن سکتا۔ مَیں نے کہا تو میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی بات نہیں سُن سکتا۔ اگر تم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر حملہ جاری رکھو گے تو تمہیں مسیحؑ کے خلاف بھی میری زبان سے باتیں سننی پڑیں گی اس پر غصہ میں اس نے بات بند کر دی اور چلا گیا تو مَیں نے دیکھا ہے بعض لوگ اس بات پر خوش ہو جاتے ہیں کہ یورپ میں دہریت پائی جاتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ لوگ عیسائیت سے بیزار ہو چکے ہیں حالانکہ دہریہ ہونے کے باوجود اُن کے دلوں سے مسیح ناصریؑ کی عظمت نہیں گئی۔ یہی رگ تھی جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پکڑی اور جس کی وجہ سے مسلمانوں نے آپ پر کفر کے فتوے لگانے شروع کر دئے آپ نے فرمایا جب تک مسیحؑ کو دفن نہیں کیا جائے گا عیسائیت کبھی مر نہیں سکتی۔ (ازالہ اوہام روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۰۲) یہ صرف مسیحؑ کے پرستار ہیں اور عقائد سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ آسمان پھٹ جائے گا۔ آسمان پھٹ جانے کے معنے یہ ہیں کہ بڑی سخت آفت

آ جائے گی اور اتنا شدید ظلم ہوگا کہ اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

آسمان کے پھٹنے سے مراد آسمانی لوگوں کے دلوں کا زخمی ہونا آسمان پھٹ جانے کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ آسمانی وجودوں کے دل اس شرک کو دیکھ کر زخمی ہوجائیں گے۔ خدا تعالیٰ کو یہ بات سخت بُری لگے گی فرشتوں کو اس سے تکلیف ہوگی اور انبیاء کے دل اس کو دیکھ کر تڑپ اٹھیں گے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے لکھا بھی ہے کہ مَیں نے حضرت مسیحؑ کو کشفی حالت میں دیکھا کہ وہ اس تکلیف سے تڑپ رہے ہیں کہ میرے نام پر دُنیا میں اس طرح ظلم ہورہا ہے۔ (نور الحق، روحانی خزائن جلد ۸ صفحہ ۵۶، ۵۷) غرض اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ عیسائیت کا غلبہ ہوجائے گا اور آسمان پر جوش پیدا ہوجائے گا کہ دُنیا پر اتنا بڑا ظلم ہورہا ہے جس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی گویا یہ ایک ایسی آفت ہوگی جو بے مثال ہوگی۔ حضرت خلیفہ اوّلؓ کسی بزرگ کا ایک ذوقی لطیفہ سُنایا کرتے تھے کہ انہوں نے کہا کہ ضَآلِّیْن پر جو شدّ اور مدّ اکٹھی ہیں اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی فتنہ بڑا سخت ہوگا۔ اور پھر بڑا لمبا ہوگا۔

وَ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۙ﴿۳﴾

اور جب ستارے جھڑ جائیں گے۔

حَلّ لُغَات۔ كَوَاكِبُ كَوَاكِبُ كَوْكَبٌ کی جمع ہے۔ اور جب كَوْكَبَ الْحَدِيْدُ کہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں بَرِقَ وَتَوَقَّدَ یعنی لوہا آگ میں گرم کرنے پر سُرخ ہوگیا۔ اور چمکنے لگ پڑا۔

كَوْكَبٌ کا لفظ اپنے اندر کثیر معنے رکھتا ہے جو یہ ہیں:۔ (۱) اَلنَّجْمُ۔ ستارہ (۲) نُقْطَةٌ بَيْضَاءُ تَحْدُثُ فِي الْعَيْنِ۔ آنکھ کا پھولا۔ (۳) مَا طَالَ مِنَ النَّبَاتِ۔ جو روئیدگی لمبے قد کی ہو۔ اس کو بھی کوکب کہتے ہیں۔ (۴) سَيِّدُ الْقَوْمِ وَفَارِسُهُمْ۔ قوم کا سردار اور ان کا جرنیل۔ (۵) شِدَّةُ الْحَرِّ۔ گرمی کی شدّت۔ (۶) اَلسَّيْفُ۔ تلوار (۷) اَلْمَاءُ۔ پانی (۸) اَلْمَجْلِسُ۔ مجلس کو بھی کوکب کہتے ہیں جہاں لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ (۹) اَلْمِسْمَارُ۔ کیل کو بھی کوکب کہتے ہیں (۱۰) اَلْخِطَّةُ يُخَالِفُ لَوْنُهَا لَوْنَ اَرْضِهَا۔ کوکب اس زمین کو بھی کہتے ہیں جس کا رنگ پاس کی زمینوں سے مختلف ہو (۱۱) اَلطَّلْقُ مِنَ الْاَوْدِيَةِ۔ وسیع وادی کو بھی کوکب کہتے ہیں (۱۲) اَلرَّجُلُ بِسِلَاحِهٖ۔ مسلّح آدمی کو بھی کوکب کہتے ہیں (۱۳) اَلْجَبَلُ۔ پہاڑ کو بھی کہتے ہیں۔ (۱۴) اَلْغُلَامُ

اَلْمُرَاهِقُ اُس لڑکے کو بھی کوکب کہتے ہیں جو جوانی کے قریب پہنچا ہوا ہو (۱۵) اَلْفُطْرُ کھمبی کو بھی کوکب کہتے ہیں (۱۶) مُعْظَمُ الشَّيْءِ کسی چیز کے بڑے حصے کو بھی کوکب کہتے ہیں۔ (۱۷) نُوْرُ الرَّوْضَةِ باغ کی کلی کو بھی کوکب کہتے ہیں (۱۸) بَرِيْقُ الْحَدِيْدِ وَتَوَقُّدُہٗ۔ گرم ہو کر جو لوہے میں چمک پیدا ہوتی ہے اسے بھی کوکب کہتے ہیں (۱۹) كَوْكَبٌ مِنَ الْبِئْرِ عَيْنُهَا الَّذِيْ يَنْبَعُ الْمَاءُ مِنْهُ۔ کنوئیں کے سوتے کو بھی کوکب کہتے ہیں جس میں سے پانی نکلتا ہے (۲۰) کہر کو بھی کوکب کہتے ہیں۔ نیز عربی زبان کا محاورہ ہے ذَهَبُوْا تَحْتَ كُلِّ كَوْكَبٍ جس کے معنے ہیں تَفَرَّقُوْا۔ وہ الگ الگ ہو گئے (۲۱) يَوْمٌ ذُوْ كَوَاكِبَ کے معنے ہوتے ہیں ذُوْ شَدَائِدَ یعنی ایسا دن جو بلاؤں اور مصیبتوں سے پُر ہو (اقرب) غرض كَوْكَب کے وسیع معنے ہیں۔ کوکب ستاروں کو بھی کہتے ہیں سردارانِ قوم کو بھی کہتے ہیں اور قوم کے جرنیل کو بھی کہتے ہیں۔

اِنْتَثَرَتْ اِنْتَثَرَتْ نَثَرَ سے ہے اور نَثَرَ الشَّيْءَ کے معنے ہوتے ہیں رَمَاهُ مُتَفَرِّقًا اُس نے کسی چیز کو اس طرح پھینکا کہ وہ بکھر گئی اور تَنَاثَرَ وَتَنَثَّرَ وَانْتَثَرَ الشَّيْءُ کے معنے ہوتے ہیں۔ تَسَاقَطَ مُتَفَرِّقًا کوئی چیز متفرق ہو کر گر گئی۔ عرب کہتے ہیں۔ تَفَرَّقَ الْقَوْمُ وَتَنَثَّرُوْا۔ یعنی قوم منتشر ہو گئی اور بکھر گئی (اقرب)

تفسیر۔ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ اور اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ہر دو آیات کے مضمون میں ایک فرق

اس جگہ یہ امر ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ اس سے پہلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ اور یہاں فرمایا ہے وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ درحقیقت یہ دو الگ الگ باتیں ہیں جو ایک خاص فرق کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ اسی لئے وہاں نجوم کا لفظ رکھا گیا تھا اور یہاں کواکب کا لفظ رکھا گیا ہے۔ پھر وہاں انکدار کا لفظ رکھا گیا تھا اور یہاں اِنْتِثَار کا لفظ رکھا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انکدار کے معنے بھی انتشار کے ہی ہوتے ہیں مگر یہاں الفاظ اللہ تعالیٰ نے بدل دیئے ہیں۔ حالانکہ لفظوں کا بدلنا ضروری نہیں قرآن کریم میں ایک ایک آیت تین تین چار چار جگہوں میں آئی ہے۔ پس یہ نہیں کہ قرآن کریم نے یہ اصول مقرر کیا ہوا ہو کہ جب وہ دوسری دفعہ وہی مضمون بیان کرے تو الفاظ کو ضرور بدل دیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم الفاظ کو دہرا بھی دیتا ہے اس لئے ان آیات میں الفاظ کے بدلنے میں ضرور کوئی حکمت ہونی چاہیے اگر انکدار کا لفظ اِنْتِثَار کے معنوں میں واقعہ ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ اِنْكَدَرَتْ کی بجائے اِنْتَثَرَتْ بھی کہہ سکتا تھا اور اگر یہاں انتشار بمعنے انکدار ہے تو یہاں انتثرت کی بجائے انکدرت بھی کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ قرآن کریم میں کئی آیتیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک ہی مضمون بیان کرنے کے لئے پہلے ہی الفاظ کو دُہرایا گیا ہے پس قرآن کریم کے اس طریق عمل کو دیکھتے ہوئے کہ وہ

الفاظ کے دُہرانے سے اجتناب کرنے کو ضروری نہیں سمجھتا یہاں الفاظ کا بدل دینا بتا رہا ہے کہ ان دونوں کے مفہوم میں کوئی فرق ہے۔

نجم اور کوکب کے معنے میں فرق اس تمہید کے بعد میں یہ بتاتا ہوں کہ نجم کی تشریحات کو جب ہم لغت میں دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زور اصل کے معنوں پر ہوتا ہے چنانچہ نجم کے ایک معنے یہ بتائے جا چکے ہیں کہ جس کی ساق نہ ہو اور یہ لازمی بات ہے کہ جس چیز کی ساق نہ ہوگی وہ لمبی نہیں ہو سکے گی۔ وہ پودہ جس کی جڑ نہ ہو وہ اونچا کس طرح ہو سکتا ہے مگر کوکب کے ایک معنے لغت میں یہ لکھے ہیں کہ مَاطَالَ مِنَ النَّبَاتِ وہ روئیدگی جو لمبے قد کی ہو۔ پھر کوکب کے ایک معنے سَيِّدُ الْقَوْمِ وَفَارِسُهُمْ کے کئے گئے ہیں گویا اس میں فن اور مہارت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ فارِس جرنیل کو کہتے ہیں پس نجم میں ہنر کی طرف نہیں بلکہ نسل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور کوکب میں نسل کی طرف اتنا اشارہ نہیں پایا جاتا جتنا ہنر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ اِدھر کوکب کے ایک معنے شِدَّةُ الْحَرِّ کے بھی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کواکب سے مراد ایسے لوگ ہوتے ہیں جن میں کام کرنے کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے اُن کی طبیعت میں تیزی ہوتی ہے اور وہ سیف ماضی کے طور پر قوم میں اثر اور رسوخ رکھتے ہیں۔ یہ فرق بتا رہا ہے کہ پہلی آیت اور نجوم اور اِس آیت میں کواکب اور اسی طرح پہلی آیت میں انکدرت اور اس آیت میں انتثرت کے الفاظ کا استعمال بلا وجہ نہیں بلکہ ان میں بہت بڑی حکمت پائی جاتی ہے۔

انکدار اور انتثار کے معنے میں فرق اصل بات یہ ہے کہ انکدار کے معنے گدلا ہو جانے کے ہیں اور انتثار کے معنے ٹوٹ کر متفرق ہو جانے کے ہیں پس سورۂ تکویر کی آیت وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ میں اس طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ نسلی رؤسا کا پبلک میں رسوخ کمزور ہو جائے گا اور وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ صاحبِ فن اور ہنر لوگ بھی محض اپنے فن اور ہنر کے زور سے وہ رسوخ جو پہلے پیدا کر لیا کرتے تھے نہ کر سکیں گے یعنے یورپ کی ترقی کے سلسلہ میں جو تغیّرات پیدا ہوں گے اُن کے نتیجہ میں بڑے بڑے ماہرین فن کی طاقتیں بالکل ٹوٹ جائیں گی چنانچہ دیکھ لو یہ دونوں باتیں اس زمانہ میں پوری ہو گئی ہیں غیر عیسائی ممالک میں علماء تو موجود ہیں مگر ان کا رسوخ زائل ہو چکا ہے یا بڑے بڑے فنکار تو پائے جاتے ہیں مگر اُن کا اثر باقی نہیں رہا اور عیسائی ممالک میں اِن تغیّرات کی وجہ سے پارلیمنٹیں بن گئی ہیں۔ اُمراء اور رؤسا کی طاقتیں بالکل ٹوٹ گئی ہیں اور امراء اور ماہرین فنوں کی جگہ لیبر پارٹیوں اور کمیونسٹ پارٹیوں وغیرہ نے لے لی ہے پس یہ علامت بھی اس تغیّر پر دلالت کرتی ہے جو یورپ کی ترقی کے سلسلہ میں ظاہر ہوا ہے۔ غیر عیسائی ممالک میں بھی یوروپین ممالک کی نقل میں یہ تغیر

پیدا ہو رہا ہے مگر وہ کامل نہیں اس جگہ چونکہ یوروپین اقوام کا ذکر ہے اس لئے فرماتا ہے کہ یوروپین قوموں میں جو تغیّر پیدا ہوگا وہ ایسا ہوگا کہ قوم پر اثر رکھنے والے لوگ خواہ نسلی سردار ہوں یا فنّی سردار ہوں بالکل گر جائیں گے اور دوسری قومیں اُن کی جگہ لے لیں گی لیکن غیر اقوام میں یہ تغیّر پیدا ہوگا کہ اُن میں صرف بڑے لوگوں کا رسوخ کمزور ہو جائے گا۔

وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝۴

اور جب سمندر پھاڑ (کر ملا) دیئے جائیں گے۔

حَلّ لُغَات۔ فُجِّرَتْ فُجِّرَتْ فَجَّرَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے اور فَجَّرَ کے معنے وہی ہیں جو فَجَرَ کے ہیں اور اِن دونوں میں سوائے اس کے اور کوئی فرق نہیں کہ فُجِّرَ میں تشدید مبالغہ کے لئے استعمال کی جاتی ہے ورنہ فَجَرَ بھی متعدی ہے اور فَجَّرَ بھی متعدی ہے فَجَرَ الْمَاءَ کے معنے ہوتے ہیں فَتَحَ لَهٗ طَرِيْقًا فَجَرٰی اس نے پانی کے لئے راستہ کھولا اور وہ بہنے لگ گیا اور فجر الْقَنَاةَ کے معنے ہوتے ہیں شَقَّهَا وَقِيْلَ شَقًّا وَاسِعًا پانی کی نالی کو خوب کھلا بنایا اور جب فَجَّرَ الرَّجُلُ کہیں تو اس کے معنی ہوں گے اَنْسَبَهٗ اِلَى الْفَجُوْرِ اُس کو فجور کی طرف منسوب کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اِس آیت کے الفاظ بھی قریباً وہی ہیں جو پہلی سورۃ میں تھے وہاں فرمایا تھا وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ اور یہاں فرمایا ہے وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ مَیں بتا چکا ہوں کہ سورۂ انفطار میں ایک مخصوص مضمون کی طرف اشارہ ہے جو عیسائیت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اس لئے یہ سب علامات عیسائیوں پر چسپاں ہوں گی۔

اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ میں سمندروں کے آپس میں ملائے جانے کی پیشگوئی مَیں سمجھتا ہوں اس آیت کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ عیسائی اپنی ترقی کے زمانہ میں سمندروں کو پھاڑ کر آپس میں ملا دیں گے چنانچہ اِس کی نمایاں مثال نہر سویز اور نہر پانامہ پیش کرتی ہیں اور یہ دونوں عیسائیوں کی بنائی ہوئی نہریں ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا میں بڑی بڑی شاندار نہریں پائی جاتی ہیں۔ ایرانیوں نے بھی نہریں بنائی ہیں۔ پٹھانوں نے بھی بنائی ہیں اور مغلوں نے بھی بنائی ہیں مگر اس فن میں گو یورپ نے بڑی ترقی کی ہے مگر وہ منفرد اور موجد نہیں مگر اس آیت میں جو علامت بتائی گئی ہے کہ سمندر پھاڑ کر آپس میں ملا دئے جائیں گے اس میں یورپ منفرد ہے اس سے پہلے دو سمندروں کو زمین

پھاڑ کر نہیں ملایا گیا۔ سورۃ تکویر کی آیت وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ کی تشریح میں دریاؤں سے نہریں نکالے جانے کا مفہوم اس بناء پر بیان کیا گیا تھا کہ وہ سورۃ آخری زمانہ سے تعلق رکھنے والے عام حالات کی طرف راہنمائی کرتی تھی لیکن یہ سورۃ ایسی ہے جس کا عیسائیوں کے ساتھ خاص طور پر تعلق ہے اور اس سورۃ میں انہی علامات کا ذکر پایا جاتا ہے جو مخصوص طور پر عیسائی اقوام میں پائی جانے والی تھیں اور چونکہ سمندروں کو پھاڑ کر آپس میں ملا دینے کی اس سے پہلے اور کوئی مثال دنیا میں نہیں ملتی اس لئے پہلی آیت میں جہاں عام حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بحار سے دریا مراد لئے گئے تھے وہاں اس جگہ عیسائیوں کے مخصوص حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بحار سے سمندر مراد لئے جائیں گے اور معنے یہ ہوں گے کہ وہ سمندروں کو چیر کر ایک دوسرے سے ملا دیں گے۔

اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ میں یہ اشارہ کہ کلیسیا گندہ ہو جائے گا

دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں اور ہیں کہ بحر اس جگہ وسیع علم رکھنے والے انسان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اس صورت میں وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ کے یہ معنے ہوں گے کہ جس وقت مسیحی پادریوں کی طرف سے کثرت سے فسق و فجور منسوب کیا جائے گا گویا اِدھر عیسائیت دنیا پر غالب آجائے گی اور شرک کی تعلیم لوگوں میں پھیلا دے گی اور دوسری طرف کلیسیا بالکل گندی ہو جائے گی۔ گویا جسمانی لحاظ سے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ سمندروں کو پھاڑیں گے اور روحانی لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ کلیسیا بالکل خراب ہو جائے گی۔

اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ کے یہ معنے کہ دریاؤں کے دہانے کھولے جائیں گے

تیسرے معنی اس کے یہ ہیں کہ اس زمانہ میں دریاؤں کو وسیع کر دیا جائے گا اور ان کا راستہ کھلا کر دیا جائے گا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں یورپ اور امریکہ کے بہت سے دریاؤں کے دہانے اس طرح کھول دئے گئے ہیں کہ بڑے بڑے جہاز ان میں سے گزر جاتے ہیں پہلے سمندروں کے قریب جا کر دریا پھٹ جاتے تھے۔ اور پھیل کر چھوٹی چھوٹی نالیوں میں سمندر ملتے تھے مگر اس زمانہ میں بہت سے دریا فرانس، جرمنی، آسٹریا، انگلینڈ اور امریکہ کے دہانوں کے پاس ایک گہرے نالے کی صورت میں بدل دیئے گئے ہیں جن کی وجہ سے وہاں جہاز بھی چلنے لگے ہیں اور بعض جگہ تو سو سو دو دو سو میل تک جہاز سمندر کے دہانہ سے دریا کے ذریعہ سے اندرون ملک میں چلے جاتے ہیں اور اس طرح اموال تجارت بہ سہولت اور تھوڑے خرچ پر مُلک سے باہر بھی جاتا ہے اور اندر بھی آجاتا ہے۔

وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۙ﴿۵﴾

اور جب قبریں اکھیڑ کر (اِدھر اُدھر) بکھیر دی جائیں گی۔

حَلّ لُغَات۔ بُعْثِرَتْ بُعْثِرَتْ بَعْثَرَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے اور بَعْثَرَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں فَرَّقَهٗ وَبَدَّدَهٗ کسی چیز کو پراگندہ کر دیا۔ اور بَعْثَرَ الْقَبْرَ کے معنے ہوتے ہیں اِسْتَخْرَجَهٗ فَكَشَفَهٗ وَاَثَارَ مَا فِیْهِ۔ اُس نے قبر کی مٹی کو نکالا اور جو اس کے اندر تھا اسے ننگا کر دیا اور پھر اسے باہر نکال کر پھیلا دیا (اقرب) پس وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ کے معنے ہوں گے جبکہ قبریں اُکھیڑی جاویں گی (۲) اور ان کے اندر سے جو کچھ نکلے گا اسے پھیلا دیا جائے گا۔

تفسیر۔ یہ چیز بھی ہم کو اس زمانہ میں عیسائیوں میں بڑی شدّت سے نظر آتی ہے۔ پہلے زمانوں میں قبرستانوں کی اس قدر عزّت کی جاتی تھی کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر سامنے قبرستان آجاتا تھا تو لوگ اپنے شہر کا رُخ بدل دیا کرتے تھے اور یہ برداشت نہیں کرتے تھے کہ قبرستانوں کے احترام میں کوئی فرق آئے مگر اس قوم میں قبرستانوں کا ادب بالکل نہیں رہا دِلّی بناتے وقت اُنہوں نے سینکڑوں قبرستان اُکھیڑ دیئے اور اُن کی ذرا بھی پروانہ کی۔ پُرانی تاریخ کو ہم پڑھتے ہیں تو حیرت آتی ہے کہ اُن کے دلوں میں کس قدر مرنے والوں کا احترام تھا کہ قبرستان سامنے آنے پر وہ شہر کا رُخ بدل دیتے۔ مگر یہ لوگ جب کسی جگہ شہر بسانے کا ارادہ کریں اور وہاں قبرستان ان کو دکھائی دے تو یہ بڑی جرأت سے اس کو اُکھیڑ کر پھینک دیتے ہیں اور جس رنگ میں چاہتے ہیں عمارت بنا لیتے ہیں پس اس کے ایک معنے یہ ہیں کہ کثرت آبادی کی وجہ سے قبرستان اُکھیڑ دیئے جائیں گے۔

بعثرۃ قبور سے مراد پھر بَعْثرۃ قبور سے مراد پُرانے مقبروں کا کھولنا بھی ہے جیسے مصر میں ہو رہا ہے کہ پُرانی قبریں کھود کھود کر ممّی بنائی ہوئی لاشیں نکالتے رہتے ہیں لغت نے اس لفظ کے کیا ہی اچھے معنے بتائے ہیں اِسْتَخْرَجَهٗ فَكَشَفَهٗ وَاَثَارَ مَا فِیْهِ کہ قبر کی مٹی کو نکالا اور اسے ننگا کر دیا اور جو کچھ اس میں سے ملا اس کو پھیلا دیا۔ عیسائی لوگ بھی قبریں کھودتے ہیں۔ ممیوں کو نکالتے ہیں اور ان میں سے کوئی فرانس کے میوزم میں بھیج دیتے ہیں کوئی انگلستان کے میوزیم میں بھیج دیتے ہیں کوئی امریکہ اور روس کے میوزیم میں بھیج دیتے ہیں گویا جس طرح جائیدادیں تقسیم کی جاتی ہیں اِسی طرح وہ لاشوں کو آپس میں تقسیم کرتے اور اپنے اپنے ممالک کے عجائب گھروں میں رکھتے ہیں پس یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے پُرانے لوگوں کی لاشوں کو ان کی قبروں میں سے نکال نکال کر ننگا کر دیا ہے اور پھر

مختلف ممالک میں پھیلا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جب مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو ان کا فرض ہے کہ وہ ان لاشوں کو پھر قبروں میں دفن کر دیں کیونکہ یہ بڑی گندی بات ہے کہ لاشیں نکال نکال کر لوگوں کے سامنے رکھی جائیں اور ان کی تحقیر و تذلیل کی جائے۔ فرعونِ مصر کی لاش کو بھی وہ اِسی طرح زمین میں دفن کر دیں اور اس پر ایک کتبہ لگا کر لکھ دیا جائے کہ یہاں فرعون مصر کی لاش دفن ہے۔ قبر کا لفظ چونکہ عام دفن شدہ چیزوں کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے اس لئے اس کے ایک یہ معنی بھی ہیں کہ اس زمانہ میں پُرانے شہر زمین میں سے نکالے جائیں گے چنانچہ اب اُن کے دفینے نکال نکال کر مختلف عجائب گھروں میں تقسیم ہو رہے ہیں اسی طرح اس کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ پُرانے کتب خانے باہر آ جائیں گے اور پُرانی عمارات اور قبرستانوں کا پتہ لگ جائے گا۔

عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَ اَخَّرَتۡ ؕ﴿۶﴾

وہ بڑی (خطا کار) جان (جس کا یہاں ذکر ہے) جان لے گی۔ کہ کیا (کچھ) اُس نے آگے بھیجا ہے۔ اور کیا (کچھ) پیچھے چھوڑا ہے۔

تفسیر ۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے عَلِمَتۡ کُلُّ نَفۡسٍ نہیں فرمایا بلکہ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ فرمایا ہے۔ ایسا کیوں فرمایا؟ اس کے متعلّق بعض مفسّرین کہتے ہیں کہ دوسری جگہ کُلُّ نَفۡسٍ آ گیا ہے اس لئے اس جگہ کُلُّ کا لفظ چھوڑ دیا گیا ہے وہ دوسری جگہ یہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَوۡمَ تَجِدُ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ مِنۡ خَیۡرٍ مُّحۡضَرًا (آل عمران: ۳۱) یعنی اُس دن سے ڈرو جس دن ہر شخص جو کچھ نیکی اس نے کی ہوگی اسے اپنے سامنے موجود پائے گا۔ اور جو بدی اس نے کی ہو گی اسے بھی پس مفسّرین کہتے ہیں کہ چونکہ اس جگہ کُلُّ نَفۡسٍ کا ذکر آ گیا ہے اس لئے اس آیت میں صرف نَفۡسٌ کہا گیا ہے کُلُّ نَفۡسٍ نہیں کہا گیا میں تو یہ نہیں کہتا کہ قرآن کریم میں ایسا طریق تسلیم نہیں کیا جا سکتا اگر ایک جگہ صرف اشارہ ہو اور دوسری جگہ تفصیلاً ذکر ہو تو ایسا درست ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی میں اُن کے استدلال کو درست تسلیم نہیں کر سکتا۔

عَلِمَتۡ نَفۡسٌ میں نکرہ کا استعمال برائے حقارت میرے نزدیک یہاں تنوین تحقیر کی ہے یعنی یہ نَفس جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے یعنی نفس عیسائیت۔ یہ ذلیل جان (جو اپنا بُرا بھلا بھی نہیں سمجھتی یا یہ بھی نہیں سمجھتی کہ کس کام کو کرنا چاہیے تھا اور کس کام کو نہیں کرنا چاہیے تھا) جان لے گی اُس کو جو اس نے آگے بھیجا تھا اور جو کچھ اُس نے

پیچھے کیا تھا چونکہ قبور کا اُکھیڑنا بڑا گندہ کام تھا اور دوسری طرف انہوں نے اتنا بڑا شرک کیا تھا جس سے آسمان پھٹ گیا اور یہ دونوں کام ایسے ہیں جس سے فطرت کو گھن آتی ہے اس لئے ان کی تحقیر کرتے ہوئے فرماتا ہے یہ حقیر جان جان لے گی مَا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ جو کام اسے آگے کرنا چاہیے تھا اُسے اُس نے پیچھے کر دیا اور جو کام پیچھے کرنا چاہیے تھا اُسے اُس نے پہلے کر دیا۔ یہ الفاظ بھی اس کی حقارت کے لئے استعمال کئے گئے ہیں چنانچہ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ کی ذات جسے مقامِ عالی دینا چاہیے تھا اُسے تو ان لوگوں نے نیچا کر دیا اور مسیحؑ جو خدا تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک بندہ تھا اُسے خدا کے تخت پر بٹھا دیا چنانچہ عیسائی حضرت مسیحؑ سے ہی دُعائیں مانگتے ہیں خدا سے نہیں مانگتے گویا خدا تعالیٰ اُن کے نزدیک نعوذ باللہ پنشن پر چلا گیا ہے اب خدائی کا کام صرف مسیح کے ہاتھ میں ہے پس قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ کا ایک نمونہ انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ خدا کو ایک بندے کا درجہ دے دیا اور بندے کو خدا کا درجہ دے دیا اور دوسرا نمونہ یہ کہ گزشتہ وفات یافتہ لوگوں کی لاشوں کو نکال کر ایک تماشہ کے طور پر عجائب گھروں میں رکھتے ہیں اور چونکہ قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ میں آگے پیچھے کا مفہوم ہوتا ہے اِس لئے اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ جان لیں گے کہ انہوں نے کس کام کو کیا اور کس کو نہ کیا۔ محاورہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ تم نے کس کام کو اختیار کر لیا اور کس کو نہ کیا کس کو ترجیح دے دی اور کس کو نہ دی پس مطلب یہ ہوا کہ اِس ذلیل جان کو علم ہو جائے گا کہ کون سا کام کرنے والا تھا اور کون سا کام کرنے والا نہیں تھا یعنی وہ کام جو کرنے والے تھے وہ تو انہوں نے نہ کئے اور جو کام نہ کرنے والے تھے وہ انہوں نے کر لئے۔

ایک معنے اس آیت کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جب اُوپر کے واقعات ظاہر ہوں گے شرک پھیل جائے گا اور بادشاہوں اور سرداروں کی طاقت توڑ کر رکھ دی جائے گی اور سمندر ملا دیئے جائیں گے اور قبریں کھود کر بکھیر دی جائیں گی تو اس وقت اللہ تعالیٰ ایسے سامان پیدا کر دے گا کہ اس جان ناتوان کو جو اس طرح خدائی اپنے ہاتھ میں لینی چاہے گی معلوم ہو جائے گا کہ کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا نہیں یعنے شرک کی بُرائی اور دنیا کے انہماک کی غلطی ان پر کھل جائے گی اور یہ پھر ایک دفعہ توحید کی طرف لوٹیں گے اور اپنی غلطیوں پر نادم ہوں گے۔

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۙ﴿۷﴾

اے انسان تجھے کس نے تیرے محسن رب کے بارے میں مغرور بنا دیا ہے۔

حل لغات۔ اَلْكَرِيْمُ اَلْكَرِيْمُ کے معنے ہیں ذُو الْكَرَمِ۔ احسان والا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ میں الانسان سے مراد یہاں بھی اَلْاِنْسَان سے مراد ہر انسان نہیں بلکہ وہی عَلِمَتْ نَفْسٌ والا انسان مراد ہے کہ نفس دنی رکھنے والے انسان مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ آخر یہ تو بتا تجھے تیرے رب کریم پر جرأت کس نے دلائی۔

مَا غَرَّكَ کے معنے مَا غَرَّكَ بِفُلَانٍ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے جس کے معنے ہوتے ہیں کَيْفَ اِجْتَرَأْتَ عَلَيْهِ (اقرب) تُو نے کس طرح اس کے خلاف جرأت سے کام لیا پس مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ کے معنے ہوں گے کَيْفَ اِجْتَرَأْتَ عَلٰى مَعْصِيَةِ اللهِ وَاَمِنْتَ مِنْ عِقَابِهٖ وَلَمْ تَكُنْ هٰذِهِ الْجُرْأَةُ جَائِزَةً لَّكَ کہ تُو نے کس طرح اُس کی معصیت پر جُرأت کی اور اُس کے عذاب سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھ لیا حالانکہ یہ جرأت تیرے لئے مناسب نہیں تھی۔

رب کے ساتھ کریم کا لفظ لانے کی وجہ كَرِيْم کا لفظ یہاں اُن کی اس جرأت کی عدم مناسبت کے اظہار کے لئے لایا گیا ہے۔ ایک فعل ایسا ہوتا ہے جو دوسرے کی شان کے لحاظ سے مناسب ہوتا ہے مگر بِرَبِّكَ کہہ کر بتایا کہ تجھے اپنے رب پر کس طرح جرأت ہوئی اور كَرِيْم کہہ کر بتایا کہ تمہارا یہ فعل تو کسی صورت میں بھی مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ نہ صرف تمہارا رب تھا بلکہ رب کریم تھا اپنے رب کو کریم دیکھ کر تو تمہارے اندر شرم اور حیا کا مادہ پیدا ہونا چاہیے تھا نہ یہ کہ اُلٹا اس کے احسانات سے نافرمان بن جاتے اور محسن کی ہتک کا موجب ہو جاتے۔ جائز موقع پر اگر کوئی جُرأت سے کام لیتا ہے تو اُس میں شرافت کا مادہ سمجھا جاتا ہے اور ناجائز موقع پر اگر کوئی جرأت دکھاتا ہے تو وہ تہوّر سے کام لینے والا سمجھا جاتا ہے لیکن فرماتا ہے تمہارا یہ فعل تو تہور بھی نہیں۔ اس میں تو کمینگی اور رذالت پائی جاتی ہے کہ تم نے محسن کشی کی اپنے رب کو کریم دیکھ کر بجائے اس کے کہ اس کی اطاعت کرتے تم نے اس کی نافرمانی کرنی شروع کر دی اور ایسے عقائد اختیار کر لیے جو خدا تعالیٰ کی شان کے بالکل خلاف ہیں۔

آیت مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ میں لفظ کریم پر پہلے مفسرین کی ضمنی بحثیں یہاں بھی مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ کے ماتحت ضمنی بحث کے طور پر مفسّرین نے عجیب عجیب باتیں بیان کی ہیں۔ بعض صوفیاء نے لکھا ہے کہ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ تمہارے جرموں کے متعلق تم سے سوال کرے تو تم اُسے کیا جواب دو۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ ہمارا رب چونکہ کریم ہے اس لئے ہمیں غرور پیدا ہوا اور ہم نے یہ گناہ کئے۔ چنانچہ بقول ان کے حضرت فضیلؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ خدا تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے تو انہوں نے کہا میں تو خدا تعالیٰ سے یہ کہوں گا کہ تیرے عفو اور احسانات کے پردوں نے مجھے مغرور کر دیا (الکشاف زیر آیت ھذا)۔ مگر اس طرف اُن کا ذہن اس وجہ سے گیا ہے کہ انہوں نے ساری سورۃ کے معنے نہیں سمجھے۔ صرف ایک ٹکڑہ لے لیا اور

اُس سے انہوں نے استدلال کرلیا۔ اگر وہ دیکھتے کہ اس سورۃ میں صرف دشمنانِ اسلام کا ذکر ہو رہا ہے تو وہ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ کو کبھی مسلمانوں پر چسپاں نہ کرتے۔ ہمارے ملک میں بھی لوگ کہتے ہیں کہ ع

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

اگر اس فقرہ کو استعارۃً کسی وقت استعمال کرلیا جائے اور ''کرد گستاخ'' سے مراد گستاخی نہ لی جائے بلکہ بے تکلّفی مراد لی جائے اور یہ سمجھا جائے کہ جس سے انسان بے تکلّف ہوتا ہے اس سے بے تکلّفی میں بعض دفعہ ایسی بات بھی کہہ لیتا ہے جو دوسری حالت میں نہیں کہی جا سکتی تو اور بات ہے لیکن اگر گستاخی سے حقیقی گستاخی مراد ہو تو یہ قطعاً غلط ہے۔ کرم انسان کو گستاخ نہیں بنایا کرتا بلکہ اس کے اندر محبت اور اطاعت کا مادہ زیادہ پیدا کر دیا کرتا ہے۔ یُوں تو اس فقرہ کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی استعمال کیا ہے (براہین احمدیہ، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۶۲) اور ہم بھی بعض دفعہ یہ فقرہ استعمال کر لیتے ہیں مگر واقعہ یہی ہے کہ جہاں کرم ہو وہاں کرم انسان کو حقیقی طور پر گستاخ نہیں بنا سکتا۔

اس آیت کے ضمن میں مفسّرین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بھی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک دفعہ اپنے ایک نوکر کو آواز دی مگر وہ نہ بولا۔ آپ نے بار بار آواز دی مگر پھر بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکا اتفاقاً آپ کو سامنے نظر آ گیا تو آپ نے اس سے پُوچھا مَالَكَ لَمْ تُجِبْنِيْ کہ تجھے کیا ہو گیا کہ مَیں نے تجھے اتنی بار بلایا مگر تُو پھر بھی نہیں بولا۔ قَالَ لِثِقَتِيْ بِحِلْمِكَ وَاَمْنٍ مِنْ عَقُوْبَتِكَ فَاسْتَحْسَنَ جَوَابَهٗ وَاُعْتَقَهٗ (الکشاف زیر آیت ھٰذا) اس نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ مجھے آپ کی نرمی کا یقین تھا اور آپ کی سزا سے میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہوں اِس لئے میں نے آپ کی بات کا جواب نہ دیا حضرت علیؓ کو اس لڑکے کا یہ جواب پسند آیا تو آپ نے اسے آزاد کر دیا۔ وہ کہتے ہیں یہ واقعہ بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ عنایات اور عفو کا سلوک بھی انسان کو گناہوں پر دلیر کر دیتا ہے اگر یہ محض ذوقی بات ہے واقعہ بڑا عمدہ ہے مگر اس کا مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ والی آیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس لڑکے نے جب دیکھا کہ حضرت علیؓ اب مجھ پر ناراض ہوں گے تو اُس نے یہ لطیفہ بنالیا جو حضرت علیؓ کو پسند آ گیا۔ اس سے یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ زیر بحث آیت میں بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ یہ محض ذوقی باتیں ہیں سعدی نے لکھا ہے کہ ع

پادشاہاں گاہے بسلامے برنجند دگاہے بہ دشنام خلعت دہند

(گلستان سعدی صفحہ ۴۹، ۵۰)

بادشاہ کبھی تعریف سے ناراض ہوجاتے ہیں اور کبھی گالی پر خلعت دے دیتے ہیں۔مگر ایسی باتوں سے کوئی اصول مستنبط نہیں ہوسکتا یہی کہنا پڑتا ہے کہ مختلف انسان مختلف رنگ کا مذاق رکھتے ہیں اور پھر ان کی حالتیں بھی مختلف اوقات میں بدلتی رہتی ہیں اس لئے کبھی کسی بات سے وہ خوش ہوجاتے ہیں اور کبھی کسی بات سے بگڑ جاتے ہیں جہانگیر کا واقعہ ہی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے نور جہان کے ہاتھ میں دو کبوتر پکڑا دیئے اتفاقاً ایک کبوتر نور جہاں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔تھوڑی دیر کے بعد جہانگیر واپس آیا تو اس نے پوچھا کہ دوسرا کبوتر کہاں گیا۔اس نے کہا اُڑ گیا ہے۔ جہانگیر نے غصّہ سے پوچھا کس طرح اُڑ گیا۔اُس نے دوسرا کبوتر بھی اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا اور کہا کہ اس طرح۔ جہانگیر کو اس کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ وہ اسی وقت سے اس پر عاشق ہو گیا اور چونکہ باپ کی مخالفت کی وجہ سے اس سے شادی نہ کر سکا باپ کے مرنے کے بعد اس کے بیوہ ہونے پر اس سے شادی کر لی (تاریخ ہندوستان مولوی ذکاءاللہ جلد ششم صفحہ ۳۷ زیرعنوان نور جہان و جہانگیر کا نکاح)۔تو بعض دفعہ ایسا ہوجاتا ہے کہ کسی کی بُری بات بھی اچھی لگتی ہے لیکن یہ آیت کی تفسیر نہیں کہلاسکتی۔ممکن ہے حضرت علیؓ نے ایک بچہ کے مُنہ سے جب یہ بات سُنی ہو تو خواہ یہ گستاخی کا ہی رنگ رکھتی ہو مگر آپ نے یہ دیکھ کر کہ اس نے اپنے بچاؤ کے لئے کیسا عجیب طریق اختیار کیا ہے آپ نے اسے آزاد کر دیا مگر بہرحال یہ ایک انفرادی واقعہ ہے۔قرآن کریم کی تفسیر ایسے واقعات سے نہیں کی جاسکتی۔

ایک سبق آموز واقعہ اسی سلسلہ میں امام قشیری نے اپنی کتاب شرح الاسماء میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے جس سے نصیحت کا پہلو بھی نکلتا ہے مجھے یہ واقعہ بہت پسند آیا اور گو یہ واقعہ بھی میرے نزدیک ہرگز یہاں چسپاں نہیں ہوتا مگر یہ بتانے کے لئے کہ انسانی فطرت سزا سے بچنے کے لئے کیا کیا حیلے نکال لیتی ہے اس کو بیان کرتا ہوں وہ لکھتے ہیں کسی بزرگ نے بیان کیا ہے کہ مَیں بصرہ کے بازار میں سے گزر رہا تھا کہ اچانک مَیں نے ایک جنازہ دیکھا جس کے ساتھ صرف چار آدمی تھے مَیں نے کہا بصرہ میں ایک مسلمان مرجائے اور اُس کے جنازہ کے ساتھ صرف چار آدمی اور وہ بھی چارپائی اُٹھانے والے ہوں یہ تو بہت بُری بات ہے۔مَیں اس کے جنازہ کے ساتھ ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ مَیں بھی ساتھ ہولیا جب وہ لوگ نعش کو دفن کر کے واپس آنے لگے تو مَیں نے اُن سے کہا یہ کیا بات ہے کہ بصرے جیسے بڑے شہر میں ایک مسلمان مرتا ہے اور اس کے جنازہ کے ساتھ صرف چار آدمی آتے ہیں وہ کہنے لگے ہم چاروں بھی جنازہ کی نیت سے نہیں آئے ہم تو مزدور ہیں یہ عورت جو سامنے کھڑی ہے ہمیں مزدوری پر لائی ہے پس ہم بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں آئے بلکہ مزدوروں کی حیثیت سے آئے ہیں۔وہ کہتے ہیں اس جواب سے میری حیرت اور بھی بڑھ گئی کہ پہلے تو میں سمجھتا تھا بصرہ کے کم از کم چار مسلمان تو اس جنازہ کے ساتھ آئے ہیں مگر اب

معلوم ہوا کہ ایک بھی نہیں آیا کیونکہ جو ساتھ آئے ہیں وہ صرف مزدور ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے یہ جواب دے کر وہ مزدور تو چلے گئے اور اُس عورت نے جو اُن کو لائی تھی آسمان کی طرف اپنے ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگنی شروع کر دی۔ جب دُعا مانگ چکی تو اس نے قہقہہ لگایا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ وہ کہتے ہیں میں یہ نظارہ دیکھ کر مبہوت سا ہو گیا کہ یہ تماشہ کیا ہو رہا ہے چنانچہ مَیں نے اس عورت کا دامن پکڑ لیا اور کہا کہ مائی مَیں نے تجھے جانے نہیں دینا پہلے مجھے بتاؤ کے اصل حقیقت کیا ہے۔ اوّل تو اس جنازہ میں کوئی مسلمان شامل نہیں ہوا۔ پھر تُم نے دعا کی اور دُعا کے بعد ہنس پڑیں اِس کی وجہ بھی میری سمجھ میں کوئی نہیں آتی مجھے سچ سچ بتاؤ کہ یہ ماجرا کیا ہے اس نے کہا لو سنو یہ میرے لڑکے کا جنازہ تھا اور وہ سخت بدکار اور گنہ گار تھا قسم قسم کے گناہوں میں وہ مبتلا رہتا تھا اور باوجود سمجھانے کے اپنی حرکات سے باز نہیں آتا تھا چند دن گزرے کہ یہ بیمار ہو گیا۔ جب اس کی بیماری پر تین دن ہو گئے تو اس نے مجھے بلایا اور کہا امّاں مَیں اب بچتا نظر نہیں آتا۔ جب میں مر جاؤں تو ہمساؤں کو خبر نہ دینا کیونکہ وہ میری موت سے خوش ہوں گے اور کہیں گے کہ اچھا ہوا وہ مر گیا ہے اور پھر جنازہ میں بھی انہوں نے شامل نہیں ہونا اس لئے انہیں اطلاع دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مزدور لے کر مجھے دفن کرا دینا صرف اتنی مہربانی کرنا کہ ایک انگوٹھی پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لکھ کر میری انگلی میں ڈال دینا اور میری لاش کو نہلا دُھلا کر میرے چہرہ پر اپنا پَیر رکھ کر کہنا کہ خدا کے گنہ گاروں کی یہی سزا ہوتی ہے پھر جب مجھے دفن کر چکو تو ہاتھ اُٹھا کر میرے لئے دُعا کرنا اور کہنا اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ رَضِیْتُ عَنْہُ فَارْضِ عَنْہُ اے اللہ میں اس سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا۔ وہ کہنے لگی مَیں نے اس کی موت کے بعد جس طرح اُس نے کہا تھا اسی طرح کیا۔ نہلا دُھلا کر اس کے مُنہ پر مَیں نے اپنا پاؤں رکھا اور کہا کہ یہی جزا اس شخص کی ہے جو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرے اور مَیں نے محلہ والوں کو بھی اطلاع نہ دی اور پھر چار مزدور اُجرت پر لے لئے اور انہیں ساتھ لے کر اپنے بیٹے کو دفن کر دیا جب میں دفن کر چکی تو مَیں نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ یا اللہ مَیں نے اس کے سب گناہ بخش دیئے ہیں تو تو بہت زیادہ رحیم و کریم ہے تُو بھی اپنے فضل سے اس کو بخش دے۔ جب میں یہ دُعا کر چکی تو یکدم مجھ پر کشفی حالت طاری ہوئی اور مَیں نے اپنے لڑکے کی یہ آواز سنی جو نہایت صاف طور پر مجھے سنائی دی کہ اِنْصَرِفِیْ یَآ اُمِّیْ فَقَدْ قَدِمْتُ عَلٰی رَبٍّ کَرِیْمٍ فَرَضِیَ عَنِّیْ اس پر خوش میں میری ہنسی زور سے نکل گئی۔ (روح البیان زیر آیت ھذا)

یہ واقعہ اللہ بہتر جانتا ہے صحیح ہے یا غلط۔ امام قشیری بڑے پایہ کے آدمی ہیں اس لئے ممکن ہے یہ واقعہ انہوں نے تحقیق سے ہی لکھا ہو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اس رنگ میں فرمایا ہے کہ بعض دفعہ ایک آدمی دوزخیوں کے کام کرتا چلا جاتا ہے مگر اُس کے اندر کوئی نیکی مخفی ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب بُرے اعمال کرتے کرتے

وہ جہنّم میں گرنے کے قریب پہنچ جاتا ہے تو یکدم اللہ تعالیٰ کے فضل کا ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے اور وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور ایک دوسرا آدمی جنّت کے مستحق بنانے والے اعمال کرتا چلا جاتا ہے مگر اُس کے دل میں کوئی بدی مخفی ہوتی ہے جب نیک اعمال کرتے کرتے وہ ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ قریب ہوتا ہے وہ جنّت میں داخل ہو جائے تو یکدم اُس کی چھپی ہوئی بدی ظاہر ہو جاتی ہے اور وہ جہنّم میں جا پڑتا ہے (صحیح بخاری کتاب القدر باب ما جاء فی القدر)۔ پس یہ روایت خواہ بناوٹی ہے یا حقیقی لیکن بہرحال سبق آموز ہے اور چونکہ مجھے یہ روایت بہت پسند آئی ہے اس لئے گو میرے نزدیک اس آیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں مگر مَیں نے اسے بیان کر دیا ہے۔ اس کا اپنی ماں کو یہ کہنا کہ مرنے کے بعد میرے چہرہ پر اپنے پیر رکھ کر کہنا کہ یہ سزا اُس شخص کی ہے جو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے بتاتا ہے کہ اُس کے دل میں نیکی تھی اس نے سمجھا کہ مَیں بدی کے ایسے مقام پر پہنچا ہوا ہوں کہ اب میری زبان سے یہ بھی نہیں نکل سکتا کہ خدایا مَیں توبہ کرتا ہوں لیکن میرے نزدیک جب اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ میرے چہرہ پر اپنے پیر رکھ کر یہ الفاظ کہنا تو عملی طور پر اُس نے توبہ کر لی معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کو اس کی یہی ادا پسند آ گئی اور اُس نے اسے جنّت میں داخل کر دیا۔ پس یہ روایت خواہ بناوٹی ہو یا واقعہ صحیح ہو بڑی عمدہ روایت ہے اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا کرشمہ انسان کی آنکھوں کے سامنے لے آتی ہے۔

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ میں لفظ کریم کی تشریح صحابہؓ کے نزدیک تفاسیر کی ان ذوقی باتوں کے مقابلہ میں صحابہؓ نے وہی طریق اختیار کیا ہے جو اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ایک سمجھدار انسان اختیار کر سکتا ہے اور اس آیت کا جو مفہوم ثابت ہوتا ہے صرف اُس کو انہوں نے بیان کیا ہے ذوقی باتوں کی طرف وہ نہیں گئے چنانچہ سفیان بیان کرتے ہیں اَنَّ عُمَرَ سَمِعَ رَجُلًا يَقْرَءُ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ فَقَالَ عُمَرُ اَلْجَهْلُ (ابن ابی حاتم۔ حوالہ ابن کثیر زیر آیت ھذا) کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو یہ پڑھتے سُنا کہ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ اے انسان تجھے کس نے رب کریم پر جرأت دلا دی۔ حضرت عمرؓ نے کہا جہالت نے۔ اور کس نے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی روایت ہے چنانچہ ابن ابی حاتم کہتے ہیں قَالَ ابْنُ عُمَرَ غَرَّهٗ وَاللّٰهِ جَهْلُهٗ (ابن کثیر زیر آیت ھذا) کہ حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اسے جہالت نے مغرور کر دیا۔ ابن عباس اور الربیع ابن خثیم اور حسن بصری سے بھی یہی مروی ہے (ابن کثیر زیر آیت ھذا) اور قتادہ سے آیت مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ کے متعلق روایت ہے وہ کہتے ہیں مَا غَرَّ ابْنَ اٰدَمَ غَيْرُ هٰذَا الْعَدُوِّ الشَّيْطٰنُ۔ (ابن کثیر) کہ ابن آدم کو کسی نے جرأت نہیں دلائی سوائے اُس دشمن کے جس کا نام شیطان ہے صوفیاء نے جو معنے کئے ہیں وہ اس بنا پر کئے

ہیں کہ وہ کہتے ہیں یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ میں انسان سے سوال کیا گیا ہے کہ تجھے کس چیز نے مغرور کیا تھا مگر آگے الْكَرِيْمِ کا لفظ استعمال فرما کر اللہ تعالیٰ نے خود ہی جواب سکھا دیا ہے کہ کہہ دینا کریم خدا کی بخشش اور عفو نے ہمیں یہ جرأت دلا دی تھی۔لیکن مشاہدہ بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی بخشش اور عفو کی وجہ سے انہیں گناہوں پر دلیری نہیں ہوئی بلکہ ان کی دلیری کی وجہ یہ تھی کہ وہ شیطان کے پیچھے چل پڑے اور خدا تعالیٰ کے نافرمان بن گئے یا یہ کہ اُن سے یہ گناہ ان کی جہالت کی وجہ سے سرزد ہوئے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو سمجھتے اس کی اطاعت کی قدر و قیمت کو جانتے اور بصیرت سے کام لیتے تو ایسے افعال کے وہ مرتکب نہ ہوتے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مومن خدا تعالیٰ کو کریم سمجھتا ہے اور وہ اس کی بخشش اور عفو پر ہر لحظہ یقین رکھتا ہے مگر گناہوں کے ارتکاب کی اسے وجہ قرار دینا کسی صورت میں بھی درست نہیں ہوسکتا۔اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں صاف طور پر فرماتا ہے کہ گناہوں کے ارتکاب کی بڑی وجہ انسان کی جہالت ہوتی ہے فرماتا ہے مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (الانعام:۵۵) یعنی جو کوئی تم میں سے نادانی سے کچھ برائی کا کام کرے گا۔ پھر اس کے بعد توبہ کر لے گا۔اور نیک کام کرنے لگے گا تو اللہ اس کے گناہ بخش دے گا کیونکہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔پس جو شخص بھی گناہ کرتا ہے درحقیقت جہالت سے کرتا ہے۔ دیدہ ودانستہ تو وہی گناہ کرے گا جو کافر ہوگا۔ اس لئے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو شیطان کی اتباع مغرور کر دیتی ہے یا اس کی جہالت اسے دھوکا دے دیتی ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس جرأت اور غرور کا موجب خدا تعالیٰ کا کرم اور بخشش ہوتی ہے سوائے اس کے کہ اسے ایک غیر طبعی نتیجہ قرار دیا جائے جو خود ایک نفس کی بیماری کہلائے گا۔خدا تعالیٰ کے کرم کے نتیجہ میں انسان اپنے ایمان اور اپنے عرفان میں ترقی کیا کرتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ وہ گناہوں پر دلیر ہو جائے پس یہ بالکل غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کرم انسان کے لئے گناہوں پر جرأت کرنے کا موجب ہو جائے بے شک مومن خدا تعالیٰ کے کرم پر بڑا یقین رکھتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی رحمت کا ہمیشہ امیدوار رہتا ہے۔

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ کا مخاطب مومن نہیں بلکہ کافر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں اس بات کے بیان کرنے کا کون سا موقع تھا یہاں تو کفار کا ذکر ہو رہا ہے لیکن ہمیں بتایا یہ جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کفّار سے کہے گا کہ جب میں تمہارے گناہوں کی تم سے پرسش کروں تو تم مجھے کہہ دینا۔آپ جو کریم خدا تھے آپ کے کرم نے ہی ہمیں مغرور کر دیا تھا۔کیا کوئی عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ ایک طرف کفّار کے متعلق ناراضگی کا اظہار کیا جا رہا ہو اور دوسری طرف یہ راز و نیاز کی باتیں بھی ہو رہی ہوں مومنوں کا ذکر ہوتا تب تو کسی حد تک یہ بات معقول بھی قرار دی جاسکتی تھی مگر

یہاں تو کفار کا ذکر ہے خدا تعالیٰ اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں نے اتنا بڑا جرم کیا ہے جس سے آسمان پھٹ گیا ہے مگر بنایا یہ جا رہا ہے کہ خدا نے آگے انہیں خود ہی جواب سکھا دیا ہے کہ تمہارا جرم بے شک سخت ہے مگر مجھے یہ جواب دے دینا تو مَیں تمہیں معاف کر دُوں گا ایسے خطرناک عذاب کے وقت تو اس قسم کی راز و نیاز کی باتوں کی طرف خیال بھی نہیں کیا جا سکتا مگر نہ معلوم صوفیاء کو کیا سوجھا کہ اس آیت سے انہوں نے یہ نکتہ نکال کر پیش کر دیا حالانکہ اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ربّ کریم کے سامنے تو تمہیں شرم کرنی چاہیے تھی مگر تم ایسے گستاخ اور بے ادب نکلے کہ تم نے اپنے رب کریم کی بھی پروا نہ کی۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کریم سے شرم کی جاتی ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں لیٹے ہوئے تھے اور آپؐ کی ٹانگوں کا کچھ حصہ ننگا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ آئے اور بیٹھ گئے پھر حضرت عمرؓ آئے اور بیٹھ گئے مگر آپؐ نے کوئی پرواہ نہ کی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ حضرت عثمانؓ نے دستک دے دی۔ آپ فوراً اٹھ بیٹھے اور اپنی ٹانگوں کو کپڑے سے ڈھانک لیا اور فرمایا عثمانؓ بہت شرمیلا ہے اُس کے سامنے ٹانگ کا کچھ حصہ ننگا رکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ چنانچہ حدیث کے یہ الفاظ ہیں اَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُضْطَجِعًا فِيْ بَيْتِهٖ كَاشِفًا عَنْ فَخِذَيْهِ اَوْسَاقَيْهِ فَاسْتَاْذَنَ اَبُوْ بَكْرٍ فَاَذِنَ لَهٗ وَهُوَ عَلٰى تِلْكَ الْحَالِ فَتَحَدَّثَ ثُمَّ اِسْتَاْذَنَ عُمَرُ فَاَذِنَ لَهٗ وَهُوَ كَذٰلِكَ فَتَحَدَّثَ ثُمَّ اسْتَاْذَنَ عُثْمَانُ فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَوّٰى ثِيَابَهٗ فَلَمَّا خَرَجَ قَالَتْ عَائِشَةُ دَخَلَ اَبُوْ بَكْرٍ فَلَمْ تَهْتَشَّ لَهٗ وَلَمْ تُبَالِهٖ ثُمَّ دَخَلَ عُمَرُ فَلَمْ تَهْتَشَّ لَهٗ وَلَمْ تُبَالِهٖ ثُمَّ دَخَلَ عُثْمَانُ فَجَلَسْتَ وَسَوَّيْتَ ثِيَابَكَ فَقَالَ اَلَا اَسْتَحْيِ مِنْ رَجُلٍ تَسْتَحْيِيْ مِنْهُ الْمَلَائِكَةُ (مسلم کتاب فضائل الصحابة باب من فضائل عثمان بن عفان) یعنی حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم گھر میں لیٹے ہوئے تھے۔ اور اپنی پنڈلیوں سے کپڑا ہٹایا ہوا تھا اسی حالت میں ابوبکرؓ نے اندر آنے کی اجازت چاہی تو آپؐ اسی طرح لیٹے رہے۔ اور آپؐ نے اجازت دے دی اور ان سے گفتگو فرماتے رہے۔ پھر عمرؓ آئے۔ اور انہوں نے اجازت طلب کی اور آپؐ نے اجازت دے دی اور اسی طرح لیٹے رہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد عثمانؓ آئے تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اٹھ کھڑے ہوئے اور کپڑے کو درست کر لیا اور ان کو اندر آنے کی اجازت دے دی جب سب چلے گئے تو حضرت عائشہ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ابوبکر آئے اور عمر آئے تو آپؐ نے ان کی آمد پر خاص پروا نہ کی اور اسی طرح لیٹے رہے جیسے لیٹے تھے۔ لیکن عثمان کی آمد پر آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور کپڑے ٹھیک کر لئے۔ آپؐ نے جواب دیا

اے عائشہ کیا مَیں اس سے شرم نہ کروں جس سے فرشتے بھی شرم کرتے ہیں۔ تو دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عثمانؓ کی شرم کا لحاظ کیا کہ وہ لوگوں سے شرماتے تھے آپ اُن سے شرمائے۔ پھر ہم اس آیت سے یہ کس طرح مراد لے سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے کریم ہونے نے لوگوں کو گناہوں پر جرأت دلائی تھی۔ میرے نزدیک رب کریم کے الفاظ سے اسی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو اپنے کریم خدا کی بات تو ماننی چاہیے تھی نہ یہ کہ اُلٹا اس کی نافرمانی کرنے لگ جاتا۔

آیت مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ میں کریم کہہ کر عیسائیت کے عقائد پر چوٹ

میرے نزدیک مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ میں عیسائیت کی طرف نہایت لطیف پیرایہ میں اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ عیسائیت خدا تعالیٰ کے رحم پر بڑا زور دیتی ہے اور اُس کی بنیاد ہی اِس مسئلہ پر ہے کہ خدا محبت ہے۔ خدا مہربان ہے (یوحنا کا پہلا خط باب ۴ آیت ۸، لوقا باب ۶ آیت ۳۵۔۳۶)۔ گو تفصیلات میں وہ خدا تعالیٰ کو نعوذ باللہ بڑا ظالم بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کے گناہ معاف ہی نہیں کرسکتا۔ مگر بہر حال وہ خدا تعالیٰ کی رحمت پر زور دیتے ہیں اور پھر ساتھ ہی یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ وہ لوگوں کے گناہ معاف نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو تم اللہ تعالیٰ کو کریم کہتے ہیں اور دوسری طرف ایسی صفات اُس کی طرف منسوب کرتے ہو جو اُس کے کریم ہونے کے خلاف ہیں اور تم اس کا ایک بیٹا تسلیم کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اُس نے لوگوں کے گناہ معاف کرنے کی جب کوئی اور صورت نہ دیکھی تو اپنے بیٹے کو لوگوں کے گناہوں کے بدلہ میں قربان کر دیا (یوحنا کا پہلا خط باب ۴ آیت ۸ تا ۱۰)۔ پس اس جگہ مومنوں کا ذکر نہیں بلکہ ایسے دشمن کا ذکر ہے جو ایک طرف خدا تعالیٰ کو رب کریم کہتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہتا ہے کہ وہ گناہ معاف نہیں کرسکتا مجھے اِس وقت اچھی طرح یاد نہیں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے عیسائی کتابوں میں خدا تعالیٰ کے متعلق رحیم و کریم کا اکٹھا ذکر ہوتا ہے اور اگر نہ بھی ہو تب بھی کرم میں رحم شامل ہے بہر حال رب کریم کے الفاظ لا کر اس قوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو خدا تعالیٰ کو ایک طرف ربِّ کریم قرار دیتی ہے اور پھر دوسری طرف اُس پر اتّہام بھی لگاتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ گنہ معاف نہیں کرسکتا۔ فرماتا ہے اے انسان تجھے کس نے یہ جرأت دلائی کہ ایک طرف تو اسے رب کریم کہتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہتا ہے کہ خدا گناہ معاف نہیں کرسکتا تھا اس وجہ سے اُس نے اپنے بیٹے کو صلیب پر قربان کر دیا۔

الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ ﴿۸﴾ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ

(اس رب کے بارے میں) جس نے تجھے پیدا کیا پھر تجھے (یعنے تیری اندرونی قوتوں کو) درست کیا۔ پھر

مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ﴿۹﴾

(دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں) تجھے مناسب قوتیں بخشیں (پھر) جو صورت اس نے پسند کی اس میں تجھے ڈھالا۔

حل لغات۔سَوّٰی سَوّٰی کے معنے ہوتے ہیں سب عیبوں اور نقصوں کو دُور کیا (اقرب) عَدَلَ کے ایک معنے نقص دور کرنے کے بھی ہوتے ہیں جیسے کہتے ہیں عَدَلَ السَّھْمَ: اَقَامَہٗ تیر کو بالکل سیدھا کیا اور اس کے نقص کو دُور کر دیا اور عَدَلُوْہُ کے معنے ہوتے ہیں قَوَّمُوْہُ اس کے نقص کو دُور کر دیا اِسی طرح عَدَلَ کے معنے موازنہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ عَدَلَ فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں وَازَنَہٗ اس کا موازنہ کیا (اقرب) فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ کی لوگ کئی ترکیبیں کرتے ہیں آسان تر صورت یہ ہے کہ مَا کو زائدہ قرار دے دیا جائے اور معنے یہ لئے جائیں کہ رَکَّبَکَ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ شَآءَ یعنی اُس نے اپنی مرضی کے مطابق تجھ کو صورۃ بخشی جسمانی بھی اور روحانی بھی۔ گویا شَآءَ سے مراد وہ صورت ہوگی جو اُس نے خود پسند کی اور جسے اُس کی مشیّت نے ترجیح دی یعنے ایسا نہیں ہوا کہ اتفاقی طور پر انسان کو اِس صورت میں پیدا کر دیا گیا ہے بلکہ یہ وہ صورت ہے جسے خدا نے انسان کے لئے پسند کیا۔

تفسیر۔اس آیت میں چار باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اوّل خدا تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ دوم اس کا تسویہ کیا یعنی ہر ذاتی نقص اور عیب کو دُور کیا۔ سوم پھر اس کی تعدیل کی یعنی دوسری اشیاء کی نسبت سے اس کی اصلاح کی۔ چہارم پھر اسے ایسی صورت دی جو خدا تعالیٰ کی چنندہ صورت تھی اس چنندہ صورت کے مطابق اس نے انسان کی تخلیق کی۔ یعنی اعلیٰ درجہ کے کمالات اس میں رکھے۔ یہ چار باتیں مسیحیوں کی گستاخی کو اور زیادہ بھیانک بنانے کے لئے ہیں۔

مسیحیت میں دو خطرناک عیب مسیحی تاریخ دو خطرناک عیبوں پر مشتمل ہے (۱) اللہ تعالیٰ کی گستاخی پر جس کی تفصیل یہ ہے (الف) اللہ تعالیٰ کا شرک (ب) اللہ تعالیٰ پر عیب لگانا کہ وہ معاف نہیں کر سکتا (ج) اللہ تعالیٰ پر الزام کہ آدم کا گنہ اس نے اولاد میں رکھ دیا (د) اللہ تعالیٰ پر الزام کہ وہ بے گناہ کو دوسروں کی خاطر سزا دیتا ہے اور اس

طرح ظالم ہے (۲) بنی نوع انسان کے متعلق (الف) غرور اور کبر اپنے آپ کو ہر بات میں دوسری اقوام پر فضیلت دینا۔ (ب) دوسروں کی نیکیوں کو چھپانا اور ان کے احسانات کا انکار کرنا (۳) بنی نوع انسان کی فطرت کو گندہ قرار دینا اور اس کے مقابل پر اپنے اندر خدائی طاقتوں کا دعویٰ۔ اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتا ہے اے اوپر ذکر کئے ہوئے انسان یعنی مسیحی بتا تو کہ آخر کس بات نے تجھے مغرور کیا ہے اور پھر مغرور بھی رب کریم کے مقابل پر۔ یعنی ایک طرف تو خدا تعالیٰ کو گراتا ہے دوسری طرف اپنے آپ کو بڑھاتا ہے ایک طرف تو یہ تسلیم کرتا ہے کہ تیرا رب کریم ہے اور دوسری طرف تیری یہ حالت ہے کہ تو ایک بندے کو خدا کا بیٹا بنا رہا ہے جس کی بُنیاد اس دلیل پر ہے کہ خدا لوگوں کے گناہ معاف نہیں کرسکتا۔ اور چونکہ وہ معافی دینے کی طاقت نہیں رکھتا تھا اس لئے معافی کی قائمقام کوئی اور چیز ہونی چاہیے تھی سو وہ قائم مقام خدا تعالیٰ نے اپنے بیٹے کو بنا کر بھیج دیا۔ جس نے لوگوں کے گناہوں کی خاطر اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ یہی کفّارے کے مسئلہ کی بنیاد ہے جس پر عیسائی مذہب کی بنیاد ہے اور جس کی بناء پر وہ لوگوں میں حضرت مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے کا پراپیگنڈہ کرتے ہیں حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ تورات میں اور بھی کئی انبیاء کو بلکہ یہود کی قوم کو بھی خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ خروج باب ۴ آیت ۲۱، ۲۲ میں لکھا ہے ”خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ جب تو مصر میں پُہنچے تو دیکھو وہ سب کرامات جو مَیں نے تیرے ہاتھ میں رکھی ہیں فرعون کے آگے دکھانا۔ لیکن میں اس کے دل کو سخت کروں گا اور وہ ان لوگوں کو جانے نہیں دے گا۔ اور تُو فرعون سے کہنا کہ خداوند یُوں فرماتا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا بیٹا ہے اور میں تجھے کہہ چکا ہوں کہ میرے بیٹے کو جانے دے۔“

مسیح کو ابن اللہ کہے جانے کا مطلب پھر سلیمان کے متعلق خدا تعالیٰ کہتا ہے ”وہ میرا بیٹا ہوگا اور مَیں اس کا باپ ہونگا اور میں اسرائیل پر اس کی سلطنت کا تخت ابد تک قائم رکھوں گا۔“ (تواریخ باب ۲۲ آیت ۱۰) پس یہ سوال ہوسکتا تھا کہ جب اور انبیاء بلکہ صلحاء بھی خدا تعالیٰ کے بیٹے کہلاتے تھے تو حضرت مسیحؑ کو بھی اگر ابن اللہ کہہ دیا گیا تو اس میں کون سی زائد خصوصیّت پیدا ہوگئی۔ اس لئے مسیحیوں نے یہ بات بنالی کہ مسیحؑ کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس کی قربانی کے ساتھ لوگوں کے گناہوں کی معافی وابستہ تھی اور چونکہ یہ خصوصیّت کسی اور نبی کو حاصل نہیں ہوئی اس لئے گو اُن کو بھی ابن اللہ کہا گیا ہے مگر وہ اَور معنوں میں ہے اور مسیح کو ابن اللہ اور معنوں میں کہا گیا ہے اسی طرح آہستہ آہستہ انہوں نے مسیحؑ کی الوہیت کا مشرکانہ عقیدہ لوگوں کے قلوب میں راسخ کر دیا (قاموس الکتاب صفحہ ۷۹۲ زیر لفظ کفارہ)۔

مسیحیوں کے گھمنڈ کی وجہ دوسری چیز جو عیسائیوں کے گھمنڈ کا موجب ہوئی وہ اُن کی طاقت اور قوت اور اعلیٰ

درجہ کی مادی ترقیات ہیں اور یہ ترقیات اُن کو اس وجہ سے حاصل ہوئیں کہ انہیں اسلامی علوم بیج کے طور پر مل گئے تھے جن پر وہ اور عمارت بنا کر ترقّی کر گئے۔ مسلمانوں کو یونانی علم ملا تھا جس پر مزید تحقیق کر کے وہ ترقی کر گئے اور عیسائیوں کو مسلمانوں کا علم مل گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں سے زیادہ ترقی کر جاتے۔ جب انہیں ترقی حاصل ہوئی تو ان کے دماغ میں غرور پیدا ہونا شروع ہو گیا کہ جو ایجادات ہم نے کی ہیں وہ اب تک اور کسی قوم نے نہیں کیں اس طرح انہیں اپنی ترقیات کے متعلق فخر پیدا ہو گیا حالانکہ یہ اشیاء تو اُنہیں اور بھی اللہ تعالیٰ کی طرف جُھکانے والی ہونی چاہیے تھیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَكَ کہہ کر عیسائیوں کو توحید کی طرف متوجہ کرنا اَلَّذِیْ خَلَقَكَ کہہ کر اللہ تعالیٰ عیسائیوں کو اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ تمہیں اس خدا کا تو خیال کرنا چاہیے تھا جس نے تمہیں پیدا کیا۔ بائبل میں لکھا ہے ''خدا نے ساتویں دن کو برکت دی اور اسے مقدّس ٹھہرایا۔ کیونکہ اس میں خدا ساری کائنات سے جسے اس نے پیدا کیا اور بنایا فارغ ہوا۔ یہ ہے آسمان اور زمین کی پیدائش جب وہ خلق ہوئے جس دن خداوند خدا نے زمین اور آسمان کو بنایا'' (پیدائش باب ۲ آیت ۳ تا ۵) پھر لکھا ہے ''اور کہو خداوند ہمارا خدا ازل سے ابد تک مبارک ہے تیرا جلالی نام مبارک ہو جو سب حمد و تعریف سے بالا ہے تو ہی اکیلا خداوند ہے تُو نے آسمان اور آسمانوں کے آسمان کو اور ان کے سارے لشکر کو اور زمین کو اور جو کچھ اس پر ہے اور سمندروں کو اور جو کچھ ان میں ہے بنایا اور تُو اُن سبھوں کا پروردگار ہے۔'' (نحمیاہ باب ۹ آیت ۵، ۶) گویا آیت مذکورہ میں یہ توجہ دلائی ہے کہ جب وہی تمہارا خالق ہے تو تُم اس کی بادشاہت کو دوسروں کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو۔ پھر خَلَقَكَ کے بعد سَوّٰكَ کہہ کر اسی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اس نے تم کو تمام معائب اور نقائص سے پاک بنایا ہے انسانی فطرت میں جس قدر کمزوریاں تھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے اُن کا علاج بھی انسانی فطرت کے اندر ہی رکھ دیا ہے انسان پر بڑی بڑی مشکلات آتی ہیں مگر ساتھ ہی اُن مشکلات کو برداشت کرنے کا مادہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ بیماریوں کے جراثیم حملہ کر کے آتے ہیں تو اُن کا توڑ انسانی نفس میں پہلے ہی موجود ہوتا ہے اور کئی قسم کی بیماریاں ہیں جو اندر ہی اندر فنا ہو جاتی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ جسمانی طور پر اس نے تمہارے علاج کے سامان تمہارے خون میں پیدا کئے ہیں اور روحانی اور اخلاقی علاج بھی تمہارے نفس میں پیدا کئے ہیں لیکن تمہاری نجات کے لئے اس نے ایک غیر طبعی طریقہ ایجاد کیا کہ ایک بے گنہ پھانسی پر لٹکا دیا تا تم کو نجات دلائے گویا وہ خون کا پیاسا ہے جب تک خون نہ پی لے کسی کو چھوڑتا نہیں۔ العیاذ باللہ۔

اسی طرح فَعَدَلَكَ فرما کر اس طرف توجہ دلائی کہ اس نے تمہارے نفس کی ہی اصلاح نہیں کی بلکہ تمہارے

وجود کو بیرونی دنیا کی نسبت سے بھی ایسا بنایا ہے کہ وہ اس پر حکومت کا اہل ہے گویا جہاں ذاتی کمال بخشا تھا وہاں نسبتی کمال بھی بخشا ہے پھر خدا تعالیٰ کے اس فعل کے بعد یہ خیال کرنا کہ انسان نجات پانے کے لئے خدا تعالیٰ کے بیٹے کی قربانی کا محتاج ہے کہاں تک درست ہوسکتا ہے اور اسی طرح خدائی قانون کے ماتحت ترقی کرنے والی اقوام کو دوسروں پر فخر کرنا اور انہیں ذلیل سمجھنا اور ذلیل قرار دینا کس طرح زیب دیتا ہے۔

عَدَلَكَ اور سَوّٰكَ میں امتیازی فرق یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ فَسَوّٰكَ میں صرف معمولی تسویہ کی طرف اشارہ نہیں جو جسم کے ساتھ تعلق رکھتا ہو بلکہ فَسَوّٰی سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے انسان کے اندر ایسے اعلیٰ درجہ کے کمالات پیدا کر دیئے ہیں جن سے اگر وہ کام لے تو خدا تعالیٰ سے بھی مل سکتا ہے۔

فَعَدَلَكَ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس کام کے لئے اس نے انسان کو پیدا کیا تھا یعنے زمین پر خدا تعالیٰ کا نائب بننے کے لئے اس کے متعلق اس نے موازنہ کیا کہ وہ طاقتیں انسان کے اندر موجود ہیں یا نہیں یعنے وہ دوسری مخلوق پر حکومت کرنے کا اہل ہے یا نہیں اور موازنہ کر کے اُس نے انسان کو وہ سب طاقتیں بخشیں جن سے وہ مادی دنیا پر حکومت کر سکتا ہے۔ عَدَلَ کے دو معنے بتائے جا چکے ہیں ایک تو تقویم کے معنے ہیں جو فَسَوّٰكَ میں آ چکے ہیں پس یہاں دوسرے معنے ہی مُراد ہیں ورنہ تکرار فضول ہو جاتی ہے جو قرآن کریم کی شان کے خلاف ہے وہ دوسرے معنے موازنہ کے ہیں یعنی دوسری چیزوں کے قویٰ کو مدنظر رکھ کر اس میں طاقتیں رکھی ہیں تا کہ وہ ان پر حکومت کر سکے اور خدا تعالیٰ کا نائب ہو سکے اور اس مضمون سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ دُنیا پر اگر کسی قوم کو حکومت ملے اور علوم سائنس پر وہ غالب آئے تو اسے اللہ تعالیٰ کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اس نے اسے یہ قویٰ بخشے ہیں نہ کہ اُلٹا مغرور اور متکبّر ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی حکومت سے آزادی کا دعویٰ کرنے لگے اور دوسرے انسانوں پر جائز فضیلت کا مدعی بن جائے اور بجائے خدا تعالیٰ کی مغفرت حاصل کرنے کے اُس کی ناراضگی کو سُہیڑ لے۔

فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ میں صورت سے مراد روحانی صورت فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ اس جملہ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو وہ صورت دی جو اس کی پسندیدہ اور چنندہ صورت تھی یعنے صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرنے کی صلاحیت۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صورت سب سے اعلیٰ ہے جسے خدا تعالیٰ کی تصویر کھینچنے کا موقع ملے اس سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہوسکتا ہے بائبل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ چنانچہ لکھا ہے ”پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہہ کی مانند بنادیں۔ (پیدائش باب ا آیت ۲۶) اس حوالہ کا یہی مطلب ہے کہ انسان کے اندر ایسے قویٰ رکھے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے اور

گویا صفاتی طور پر خدا تعالیٰ کا مظہر بن سکتا ہے احادیث میں بھی اس مضمون کی طرف اشارہ ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کہ تم اللہ تعالیٰ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو یعنے خدا جیسے بنو۔

فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ کا جملہ یا تو تفسیر سمجھا جائے گا خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ کا یعنی اُس نے خلق وہ کیا جو اس کا پسندیدہ تھا۔ اس نے تسویہ وہ کیا جو اس کا پسندیدہ تھا۔ اس نے عدل وہ کیا جو اس کا پسندیدہ تھا۔ اور یا پھر اس کے یہ معنے ہوں گے اور انہی معنوں کو مَیں نے اوپر ترجیح دی ہے کہ اس نے تمام ضروری طاقتیں انسان کے اندر پیدا کر کے اُسے وہ صورتِ روحانی بخشی جو اُس کی پسندیدہ تھی یعنی تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کی قابلیت اس میں پیدا کی۔ (تفسیر کبیر امام رازی زیر آیت واتخذوا اللہ ابراھیم۔۔۔)

یہاں صورتِ روحانی کے معنے جو مَیں نے لئے ہیں وہی درست ہیں اس لئے کہ صورت جسمانی کا ذکر پہلے خلق میں آ چکا ہے اور جو ذکر پہلے آ چکا ہے اسے دوبارہ دُہرانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس جملہ میں صورتِ رُوحانی کی تکمیل کا ذکر ہے یہ معنے اس لئے بھی مرجح ہیں کہ انسان کا ناک، کان اور منہ وغیرہ ایسی چیزیں نہیں ہیں جو خدا تعالیٰ کو پیاری لگیں۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک تو انسان کی روحانی صورت ہی پسندیدہ ہوتی ہے خواہ جسمانی لحاظ سے اُس کے ناک کان کا تناسب کیسا ہی کیوں نہ ہو پس فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ کے معنے یہ ہیں کہ تمام قوتیں پیدا کرنے کے بعد ہم نے اُسے وہ رُوحانی اُصول بتائے جو ہمارے نہایت ہی پسندیدہ تھے اور جن کے ماتحت وہ ہماری صورت پر بننے کا اہل ہو گیا فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ میں اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ جب جب جو صورت تیری ہم نے پسند کی تجھ کو بخشی جو صورت رُوحانی نوح کے زمانہ میں مناسب تھی اس کے اُصول نوحؑ کے ذریعہ سے بتائے۔ جو صورت ابراہیمؑ کے زمانہ کے مطابق مناسب تھی اُس کے اصول ابراہیمؑ کے ذریعہ سے بتائے۔ جو صورت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے زمانہ کے مناسب تھی اُس کے اصول اُن کے ذریعہ سے بتائے اور جو صورت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے مناسب تھی اس کے اُصول محمدؐ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بتائے۔ اسی طرح ہر قوم نے اپنے ماحول کے مطابق دنیوی ترقیات حاصل کیں اور علوم میں ایجادیں کیں۔ گویا ہم نے روحانی اور جسمانی علوم زمانہ اور حالات کے مطابق نازل کئے۔ تورات اس وقت نازل کی جب تورات کی ضرورت تھی اور قرآن اس وقت نازل کیا جب قرآن کی ضرورت تھی۔ علوم یونانی اس وقت نازل کئے جب انسانی دماغ اُن کو سمجھنے کی قابلیت رکھتا تھا اور علوم عربیہ اس وقت نازل کئے جب انسان ان کو سمجھنے کی طاقت رکھتا تھا اور علوم مغرب اس وقت نازل کئے جب انسان ان کو سمجھنے کی طاقت رکھتا تھا۔ پھر خدا تعالیٰ کے احسانات کی ناشکری کر کے دینِ حقیقی سے اجتناب اور

بنی نوع انسان پر تفاخر کے معنے ہی کیا ہوئے۔

میری عمر کوئی بیس سال کی تھی اور میں ان دنوں لاہور میں تھا کہ میاں محمد شریف صاحب ای۔اے۔سی جن سے میرے دوستانہ تعلّقات تھے مجھے ایک پادری مسٹر وُڈ کے پاس لے گئے جو مشنری کالج کا پرنسپل تھا۔اور کہنے لگے کہ چلو اس سے مذہبی مسائل پر گفتگو کریں مَیں نے کہا چلیں مَیں تیار ہوں۔اسے اُردو پوری طرح نہیں آتی تھی اور مجھے انگریزی پوری طرح نہیں آتی تھی مگر پھر بھی ہم نے آپس میں کچھ گفتگو کر ہی لی۔کچھ وہ میری مدد کر دیتا اور کچھ مَیں اس کی مدد کر دیتا اور اس طرح باتوں کا سلسلہ جاری رہا مَیں نے اس سے یہ سوال کیا کہ تم بتاؤ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کی نجات کس طرح ہوئی ہے۔جس ذریعہ سے ان کی نجات ہوگئی ہے اسی ذریعہ سے اب بھی لوگوں کی نجات ہوسکتی ہے اس نے کہا ابراہیمؑ اور موسیٰؑ حضرت مسیح پر ایمان لا چکے تھے مَیں نے کہا وہ ایمان کس طرح لا چکے تھے وہ تو حضرت مسیح سے پہلے ہوئے ہیں۔قرآن کریم نے بھی اس سوال کو لیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ نصاریٰ میں سے تھے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے وہ تو پہلے گزر چکے تھے ان کو نصاریٰ میں سے کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے پس مَیں نے کہا کہ یہ بات تو بالکل غلط ہے۔

حضرت مسیح کے داؤد کی اولاد میں سے ہونے کا بے بنیاد دعویٰ اگر حضرت مسیح پر ان کے ایمان لانے کا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہو تو اسے پیش کریں اس نے کہا داؤد نے پیشگوئی کی تھی کہ اس کی اولاد سے ایک ایسا شخص ہوگا جو خدا کا بیٹا ہوگا مَیں نے کہا حضرت مسیح تو داؤد کی اولاد میں سے تھے ہی نہیں یہ پیشگوئی ان پر کس طرح چسپاں ہوسکتی ہے کیونکہ انجیل میں دو جگہ مسیح کا نسب نامہ درج ہے (۱) متی باب ۱ آیت ۱ تا ۱۸۔اور پھر لوقا باب ۲ آیت ۲۳ ہر دو میں لکھا ہے کہ یوسف جس نے مریم سے شادی کی وہ داؤدؑ کی اولاد میں سے تھا تو نہ معلوم یسُوع مسیح کس طرح داؤد کی اولاد میں سے بن گیا۔حالانکہ یوسف اس کا باپ نہ تھا۔ بلکہ وہ تو بے باپ پیدا ہوا۔اور ماں کی طرف سے اسرائیلیوں کا نسب نامہ ہو نہیں سکتا۔اصل بات یہ ہے کہ بے باپ کے پیدا ہونے کا دعویٰ ابن داؤدؑ ہونے کے دعویٰ کے بالکل خلاف ہے اور پھر اس سے ابراہیمؑ کا ایمان کہاں سے ثابت ہوا پیشگوئی تو کرے داؤدؑ اور ایمان ثابت ہو ابراہیم کا اس نے کہا ابراہیمؑ کی نسبت آتا ہے کہ اُس سے اولاد کی ترقی کا وعدہ تھا مَیں نے کہا کہ مسیحؑ تو ابراہیم کی نسل سے نہ تھے اگر اولاد کی پیشگوئی ہے تو وہ اس کی نسبت سمجھی جائے گی جو یقیناً نسل ابراہیمؑ سے ہے یعنے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات نہ کہ مسیح کی نسبت جو اگر خدا کا بیٹا تھا۔تو ابراہیمؑ کا نہ تھا اور اگر ابراہیم کا بیٹا تھا تو بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔آخر لمبی بحث کے بعد تنگ آ کر اُس نے کہا کہ یونانی میں ایک مثل ہے کہ سوال ہر بے وقوف

کرسکتا ہے مگر جواب دینے کے لئے عقلمند انسان چاہیے میری طبیعت بھی ان دنوں تیز تھی مَیں نے جھٹ کہا کہ مَیں تو آپ کو عقلمند سمجھ کر ہی آیا تھا اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ میری غلطی تھی۔ اُس نے مجھے بیوقوف بنایا تھا مَیں نے اس کا حملہ اس پر اُلٹ دیا۔

پس فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم ہر زمانہ کے لحاظ سے انسان کو تعلیم دیتے چلے آئیں ہیں کبھی ہم نے اس کی ہدایت کے لئے کوئی تعلیم نازل کی اور کبھی کوئی۔ اور وہ تعلیم ایسی تھی جو انسان کے مطابق حال تھی اور جس پر چل کر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرسکتا تھا اس کے باوجود پہلے انبیاء کی تنقیص اور دوسری اقوام کی تنقیص (جو مسیحیوں کا شیوہ ہے) خلافِ عقل ہے اسی طرح مسیح کے بعد آنے والی مکمّل تعلیم کا انکار بھی خلافِ عقل ہے۔

غرض الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ۔ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اے انسان پہلے تو خدا نے تجھے کرم کے ساتھ پیدا کیا یعنی تیری پیدائش کو اپنے کرم کے نیچے رکھا پھر اپنے کرم کے ساتھ تجھے ہر ایسے نقص سے جو تیری ذمّہ واریوں میں حائل ہوسکتا تھا دُور کیا۔ پھر دوسری چیزوں کے مقابل پر تیری تکمیل کی جب مَیں نے یہ سب کچھ کرلیا تو تُو نے اس مقصد کو ہی چھوڑ کر اَور طرف رُخ کرلیا یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ بادشاہ ایک لشکر کو تیار کرے پہلے ان کو بھرتی کرے پھر تربیت دے پھر سامان جمع کرے۔ پھر سامان دے کر سواریاں حوالے کرے اور جنگ کی طرف بھجوا دے مگر وہ شہر سے باہر نکل کر ایک شراب خانہ میں جمع ہو جائیں اور جوا کھیلنے لگیں۔ کیا یہ لوگ اپنے آقا کو شرمندہ کرنے والے نہ ہوں گے۔ کیا ان سے بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ کہہ کر خطاب کرنا زجر اور افسوس کے طور پر ہوگا یا جواب سکھانے کے لئے۔ ہاں یہ ضرور ظاہر ہے کہ یہ افسوس اور ناراضگی ایک محسن کی ہے جو اپنے احسان جتا کر افسوس کرتا ہے کہ ہم نے کیا چاہا تھا اور تم نے کیا کر دیا۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ﴿۱۰﴾

ایسا ہرگز نہیں (جو تم خیال کرتے ہو) بلکہ تم جزا سزا کو جھٹلاتے ہو۔

حَلّ لُغَات۔ اَلدِّيْنُ اَلدِّيْنُ کے معنی ہیں اَلْجَزَاءُ وَالْمُكَافَأَةُ۔ جزا اور بدلہ۔ اَلْحِسَابُ۔ حساب کرنا۔ اَلْقَضَاءُ۔ فیصلہ کرنا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ عیسائیت بعث بعد الموت کی منکر ہے فرماتا ہے کہ ہم تمہیں سچی بات بتاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ خیال کہ ہم مسیح پر ایمان لاکر بخشے جائیں گے یہ تو محض ایک بہانہ ہے اصل بات یہ ہے کہ تمہیں بخشے جانے یا نہ بخشے جانے پر ایمان ہی نہیں اور قیامت کے تم قائل ہی نہیں ہو چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ ایک عیسائی پادری کو بھی قیامت کے وجود پر حقیقی ایمان نہیں ہوتا میں نے دیکھا ہے جب بھی وہ قیامت پر بحث کرتے ہیں اس سے ان کا منشاء صرف اتنا ہوتا ہے کہ حضرت مسیح دوبارہ آسمان سے اُتریں گے اور یہی قیامت ہوگی ☆ ورنہ موت کے بعد جو قیامت آنے والی ہے اُس پر اُن کو کوئی یقین نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودی مذہب میں قیامت کا کوئی ذکر نہیں۔ ہمیں اس بات پر یقین ہے کہ تورات میں قیامت کا ضرور ذکر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا کلام اس ذکر سے خالی نہیں ہو سکتا مگر موجودہ تورات سے قیامت کے وجود کا کوئی قطعی ثبوت نہیں مِلتا۔ قرآن کریم میں یہ ذکر آتا ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے ہمیں صرف چند دن عذاب دیا جائے گا۔ اس کے بعد ہم کو معاف کر دیا جائے گا۔ (البقرۃ:۸۱) مگر اس کے لئے بھی ہمیں پُرانی کتب میں سے حوالے محنت سے تلاش کرنے پڑتے ہیں کہ یہودیوں کا یہ عقیدہ ہوا کرتا تھا اگر قیامت کا کثرت سے یہودی کتب میں ذکر ہوتا تو اس قسم کی تلاش کی کوئی ضرورت نہ ہوتی بات یہ ہے کہ یہودی مذہب میں قیامت کا اس قدر کم ذکر کیا گیا ہے کہ یہود میں سے اکثر کا یہ خیال ہے کہ قیامت کا عقیدہ درست ہی نہیں اس وجہ سے وہ اپنا سارا زور دنیا کمانے پر صرف کر دیتے ہیں یہی حال عیسائیوں کا ہے پس فرماتا ہے کَلَّا بَلْ تُکَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ کیوں باتیں بناتے ہو سیدھی بات یہ ہے کہ قیامت پر تمہیں ایمان ہی نہیں۔

کَلَّا بَلْ تُکَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ صفات نیک اگر استعمال ہوں تو انسان کے لئے سکھ کا موجب بن جاتی ہیں اور اگر بُری صفات اختیار کی جائیں تو وہ انسان کے لئے دُکھ کا موجب بن جاتی ہیں

☆ ان کا یہ عقیدہ ان کی کتاب میں پایا جاتا ہے ’’دعائے عام‘‘ جو کرسچن نالج سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں صبح کی دعاؤں کے ضمن میں لکھا ہے کہ ہر ایک دعا کرنے والا مندرجہ ذیل عبارت دہرائے ’’میں ایمان رکھتا ہوں۔ خدا قادر مطلق باپ پر جو آسمان وزمین کا خالق ہے اور یسوع مسیح پر جو اس کا اکلوتا بیٹا ہمارا خداوند ہے وہ روح القدس کی قدرت سے پیٹ میں پڑا۔ کنواری مریم سے پیدا ہوا۔ پیلاطوس کے عہد میں دکھ اٹھایا۔ مصلوب ہوا۔ مر گیا اور دفن ہوا۔ عالم ارواح میں اتر گیا۔ تیسرے روز مردوں میں سے جی اٹھا۔ آسمان پر چڑھ گیا اور خدا قادر مطلق باپ کے دہنے بیٹھا ہے وہاں سے وہ زندوں اور مردوں کی عدالت کے لئے آنے والا ہے۔‘‘ نیز دیکھیں کتاب مذکورہ۔ زیر عنوان بچوں کا علانیہ بپتسمہ وہ وہاں سے (یعنی مسیح) دنیا کے آخر میں زندوں اور مردوں کی عدالت کرنے کے لئے آنے والا ہے۔ پس روشن کی طرح اس عبارت کے آخری فقرہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھتی ہیں کہ مسیح کی آمد ثانی ہی قیامت ہے۔

رب کریم کو چھوڑ کر اُس کی دی ہوئی طاقتوں کو استعمال کرو گے تو راستہ سے بھٹک ہی جاؤ گے اور ایک دن اس کے بدانجام کو دیکھ لو گے۔

وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ﴿۱۲﴾

اور یقیناً تم پر (تمہارے خدا کی طرف سے) نگران مقرر ہیں (جو) شریف (اور) ہر بات کو لکھنے والے (ہیں)

يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔

تفسیر۔ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ میں اعمال محفوظ کئے جانے کی طرف اشارہ قرآن کریم کے بعض دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانی اعمال کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اور فرشتے اس کام پر مقرر ہیں احادیث صحیحہ میں بھی اِس کا ذکر آتا ہے پس وہ تو ہے ہی اور اس میں مسلمانوں کی کوئی تخصیص نہیں عیسائیوں کے اعمال بھی لکھے جاتے ہیں۔ یہودیوں کے اعمال لکھے جاتے ہیں۔ زرتشتیوں کے اعمال بھی لکھے جاتے ہیں اور اسی طرح دوسری اقوام کے اعمال بھی لکھے جاتے ہیں۔ غرض ہر کافر، دیندار، مومن، مشرک سب کے اعمال محفوظ رکھے جاتے ہیں اور قیامت کے دن وہ ہر انسان کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ اب وائرلیس کی ایجاد نے قرآن کریم کے اس بیان کی صحت کا مزید ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کیونکہ وائرلیس کی ایجاد نے ثابت کر دیا ہے کہ ہر حرکت جو انسان کرتا ہے خواہ وہ خفیف سے خفیف تر کیوں نہ ہو سارے جوّ میں پھیل جاتی ہے پس اس سے اتنا پتہ لگ گیا کہ انسان جو بھی حرکت کرتا ہے وہ فوری طور پر جوّ میں لکھی جاتی ہے لکھے جانے کے معنے یہی ہیں کہ وہ اُدھر منتقل ہو جاتی ہے۔ اب صرف یہ سوال رہ گیا ہے کہ وہ حرکت یا وہ آواز جوّ میں کتنی دیر تک محفوظ رہتی ہے۔ مجھے ہمیشہ امید رہتی ہے کہ ممکن ہے کوئی زمانہ ایسا بھی آجائے کہ ہم گزشتہ لوگوں کی آوازوں کو کسی آلہ کے ذریعہ سے سُن سکیں مثلاً ہم نپولین کے مُنہ سے اس کی باتیں سُن لیں یا اگر پچھلے لوگوں کی باتوں کو ہم نہ سن سکیں تو آئندہ کے لئے ہی کوئی ایسا انتظام ہو جائے کہ ہم اُن آوازوں کو جو جوّ میں منتقل ہو جائیں دو دن چار دن دس دن کے بعد سُن سکیں۔ ریڈیو اور فونوگراف دونوں مل کر اب بھی یہ کام کرتے ہیں چنانچہ بادشاہ تقریر کرتا ہے تو وہ تقریر دو دو چار چار دن کے بعد دوسرے ملکوں میں سنا دی جاتی ہے تو وائرلیس اور فونوگراف دونوں نے مل کر قرآن کریم کی اِس بیان کردہ صداقت کا ثبوت مہیا کر

دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ انسان کا کوئی عمل ضائع نہیں جاتا وہ ضرور کوئی نہ کوئی نشان چھوڑ جاتا ہے حتیٰ کے بعض دفعہ آنے والی نسلوں پر جا کر وہ عمل ظاہر ہوتا ہے پہلے لوگ حیران ہوتے تھے کہ اعمال کس طرح لکھے جاتے ہیں مگر اب وائرلیس اور فونوگراف کی ایجاد نے ایک نیا ثبوت اس امر کا مہیا کر دیا ہے کہ انسانی اعمال محفوظ رکھے جاسکتے ہیں۔

قیامت کے دن ہاتھ پاؤں کا گواہی دینا قرآن کریم نے قیامت کے دن کے متعلّق جو کچھ کہا ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اس دن ایسا ہی ہوگا انسان کے ہاتھ اور پیر گواہی دیں گے کہ وہ کیا کرتا رہا ہے اور کیسے اعمال اس سے سرزد ہوتے رہے ہیں ممکن ہے کوئی آلہ ایسا ہو جس پر قیامت کے دن انسان کے ہاتھ پیر اور زبان وغیرہ رکھ دئے جائیں اور یہ اعضاء تمام گزشتہ باتوں کو دہرانا شروع کر دیں گویا ایک ریکارڈ اُس وقت لگ جائے اور انسان سے کہا جائے کہ لو اب سُن لو تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔ اُس وقت وہ کہیں گالیاں دیتا نظر آئے گا۔ کبھی تسبیح کرتا دکھائی دے گا کہیں جھوٹ بولتا دیکھا جائے گا اور وہ اپنے ہی اعمال کو دیکھ کر شرمندہ ہوگا کہ مَیں کیا کرتا رہا ہوں۔

قیامت کے دن مومنوں کا سرسری حساب قرآن کریم میں مومنوں کے متعلق آتا ہے کہ اُن سے حِسَابًا یَّسِیْرًا (انشقاق:۹) لیا جائے گا اس کا مطلب مَیں یہی سمجھتا ہوں کہ چونکہ مومن کو اللہ تعالیٰ نے معاف کرنا ہوگا اس لئے وہ اسے بدنام نہیں کرے گا اور اس کے اعمال کی تفصیلات دریافت نہیں کرے گا صرف اتنا پوچھ لے گا کہ ٹوٹل ٹھیک ہے یا نہیں۔ جب کہا جائے گا کہ ٹوٹل ٹھیک ہے تو اللہ تعالیٰ کہے گا اسے لے جاؤ جنت میں۔ اس طرح اس کی بدیوں پر پردہ پڑا رہے گا لیکن جس کا ٹوٹل ٹھیک نہیں ہوگا اس کے متعلق خدا کہے گا کہ نکالو اس کا اعمال نامہ۔ اور اس کا ایک ایک عمل اس کے سامنے پیش کرو۔ اس طرح اس کی بدیاں ایک ایک کر کے سامنے لائی جائیں گی اور وہ اوّلین و آخرین میں شرمندہ اور ذلیل ہوگا۔

اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ میں ماموراوراس کی جماعت کی طرف اشارہ لیکن اگر اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ کو عیسائیت کے لئے مخصوص قرار دیا جائے تو پھر میں سمجھتا ہوں اس سے مراد وقت کا مامور اور اس کی جماعت ہے۔ فرماتا ہے وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ہم ایسے لوگ پیدا کریں گے جو تمہاری مشرکانہ باتوں کو نوٹ کریں گے اُن کو محفوظ کریں گے اور ان کو یاد رکھیں گے کیوں کہ اُن کا کام یہ ہوگا کہ وہ تمہاری ان باتوں کا ردّ کریں اور تمہارے اس زہر کا ازالہ کریں پس چونکہ وہ تمہارے ان مشرکانہ عقائد کی تردید کے لئے کھڑے ہوں گے اس لئے وہ ان باتوں کو نوٹ کرتے چلے جائیں گے یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ اور جو کچھ تم کرو گے اس سے وہ خوب واقف ہوں

گے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عیسائیوں کے تمام اعمال کو جانتے ہوں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اُن کے اعمال کی حقیقت سے خوب واقف ہوں گے عیسائیت دھوکا دے گی وہ اپنے بُرے کاموں کو بھی اچھی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرے گی مگر وہ لوگ اس دھوکا میں نہیں آئیں گے وہ ان کی نیتوں کو خوب سمجھتے ہوں گے اور جانتے ہوں گے کہ یہ لوگ اندرونی طور پر کیسے ہیں۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ﴿۱۴﴾ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ﴿۱۵﴾

یقیناً نیکیوں میں بڑھ جانے والے لوگ (ہمیشہ) نعمت میں (رہتے) ہیں اور بدکار لوگ بھی یقینا (ہمیشہ) جہنم میں

یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۱۶﴾

(رہتے) ہیں وہ (خصوصیت کے ساتھ) اس میں جزا سزا کے دن داخل ہوں گے۔

حَلّ لُغَات۔ اَلْاَبْرَارُ اَلْاَبْرَارُ بَرٌّ کی جمع ہے جو بَرَّ سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ اور بَرَّ کے معنے ہیں اَحْسَنَ الطَّاعَةَ اِلَیْهِ وَرَفِقَ بِهٖ وَتَحَرَّی مَحَابَّهٗ وَتَوَقّٰی مَکَارِهَهٗ یعنی اچھی طرح اس کی اطاعت کی اور اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا نیز اس کی خوشنودی کو حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کی ناراضگی کی باتوں سے بچا۔ (اقرب)

پس اَلْاَبْرَار کے معنے ہوں گے اچھی طرح اطاعت کرنے والے اور نرمی کا برتاؤ کرنے اور خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے والے اور اس کی ناراضگی سے بچنے کی کوشش کرنے والے۔

اَلنَّعِیْمُ اَلنَّعِیْمُ اَلْمَالُ یعنی نَعِیْم کے معنے مال کے ہوتے ہیں۔ اور نیز اس کے معنے ہیں اَلدَّعَةُ آرام۔ کہتے ہیں رَجُلٌ نَعِیْمُ الْبَالِ اور معنے ہوتے ہیں هَادِئُ الْبَالِ مُرْتَاحُهٗ آسودہ حال شخص۔ اور نَعِیْمُ اللّٰہِ کے معنے ہیں عَطِیَّتُهٗ۔ اللہ کا دیا ہوا عطیہ۔ (اقرب)

نَعِیْمٌ کے لفظ کی بناوٹ ایسی ہے کہ میں مدتوں ابتدائی عمر میں اسے جمع سمجھتا رہا۔ حالانکہ یہ واحد ہے جمع نہیں۔ مولوی محمد علی صاحب نے بھی اس کا ترجمہ ''نعمتیں'' کیا ہے۔ حالانکہ نَعِیْمٌ کے معنے صرف نعمت کے ہیں نعمتوں کے نہیں ہیں۔ مگر اس لفظ کی بناوٹ ایسی ہے کہ دھوکا لگ جاتا ہے اور غیر عرب اسے جمع سمجھنے لگ جاتا ہے۔

تفسیر۔ یہاں اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ۔ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومن نعیم میں ہیں اور فجّار جحیم میں ہیں۔ لیکن آگے چل کر فرمادیا یَصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ کہ وہ جزا سزا کے وقت اس میں

داخل ہوں گے گو صَلٰی کے معنے آگ میں داخل ہونے کے ہوتے ہیں (اقرب)۔ اور کفّار کی نسبت یہ فرمایا گیا ہے مگر چونکہ عربی زبان کا محاورہ ہے کہ کبھی دو باتوں کے ذکر میں ایک کی تشریح کر دی جاتی ہے اور دوسری کی تشریح اس میں آجاتی ہے اس لئے یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مومنوں کے داخل ہونے کے ذکر کو اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ کفّار کے جہنم میں داخلہ پر ان کے جنّت میں داخلہ کو قیاس کر لو۔ اس صورت میں اس آیت کے یہ معنے کئے جائیں گے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مرنے کے بعد کے انتظار کی ضرورت ہی نہیں۔ مومن اسی دُنیا میں جنّت میں نظر آئیں گے اور کافر اسی دنیا میں دوزخ میں نظر آئیں گے یعنے وہ اطمینان جو دلوں کو سکون بخشتا ہے کفّار کے دلوں سے کوسوں دُور ہے اور باوجود دولت وثروت رکھنے کے وہ اپنی تمام کوششوں کا نتیجہ ٹیڑھا نکلتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اس کے بالمقابل مومن باوجود ظاہری مشکلات اور مصائب اور تباہیوں کے یقین اور امید سے پُر ہیں اور اپنے مستقبل کو شاندار اور اپنے دین کو کامیاب دیکھ کر جنّت کے مزے لے رہے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جس شخص کو خدا تعالیٰ پر سچا ایمان نہ ہو اسے خواہ کتنی دولت مل جائے وہ اس کے سکون و اطمینان کا موجب نہیں بن سکتی۔ یورپ کے جس قدر فلاسفر ہیں وہ اس بات پر متفق ہیں کہ اطمینان یورپ والوں کے دلوں سے اُڑ چکا ہے۔ باجود ظاہری شان وشوکت کے قلوب میں ایسی بے چینی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے نہ انہیں دولت کا مزہ آتا ہے نہ انہیں راحت وآرام کے سامانوں میں لذت محسوس ہوتی ہے ایک جہنم ہے جو ہر وقت ان کے دلوں پر شعلہ زن رہتی ہے۔ لیکن مومن اس دنیا میں اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرتا ہے۔ وہ دنیوی لحاظ سے مال و دولت اپنے پاس نہیں رکھتا لیکن اس کا دل مطمئن ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی جنت میں پاتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ ایک مجسٹریٹ جس کے پاس آپ کا ایک مقدمہ تھا۔ اس کے متعلق آپ کو یہ خبر پہنچی کہ اس نے آپ کو سزا دینے کا پختہ فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ خبر خواجہ کمال الدین صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو پہنچائی اور اس خیال کے ماتحت پہنچائی کہ نہ معلوم اب کیا ہوگا۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے یہ بات سنی تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا۔ وہ خدا تعالیٰ کے شیر پر ہاتھ ڈال کر تو دیکھے۔ اگر وہ ہاتھ ڈالے گا تو خود زخمی ہو جائے گا مگر ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تو مومن چونکہ خدا تعالیٰ پر کامل یقین رکھتا ہے اس لئے اس کے دل میں اطمینان ہوتا ہے کہ خواہ کیسی مصیبت آ جائے میرا رب میری مدد کرے گا۔ اور اس طرح اسی دنیا میں وہ جنت میں داخل ہوتا ہے۔ (حیات طیبہ صفحہ ۲۶۱، ۲۶۲)

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی ایک واقعہ اس جنتِ ارضی کا بے مثال نمونہ پیش کرتا ہے۔ غارِ ثور میں آپ

اور حضرت ابوبکرؓ دونوں چھپے بیٹھے تھے۔ دشمن اس غار کے سر پر آ پہنچا اور اس قدر قریب آ گیا کہ حضرت ابوبکرؓ کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ اب دشمن اتنا قریب ہے کہ اگر وہ ذرا جھک کر اندر کی طرف دیکھے تو وُہ ہمیں پکڑ سکتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی اس خطرے کا اظہار کر دیا۔ جس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نہایت اطمینان کے ساتھ فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (الروض الانف زیر عنوان حدیث غار) غم مت کر خدا ہمارے ساتھ ہے۔

تو مومن ہر وقت جنت میں رہتا ہے اور کافر ہر وقت دوزخ میں رہتا ہے۔ اور اس طرح دوزخ اور جنت ہر انسان کے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے اور وہ ہر وقت یا دوزخ میں جلتا ہے یا جنت میں اطمینان سے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر آنکھیں ہوں تو انسان اس دنیا میں یہ دوزخ اور جنت دیکھ سکتا ہے۔ مگر فرماتا ہے ان کفار کو یہ جہنم ابھی نظر نہیں آتی۔ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید مومن دوزخ میں ہیں اور وہ جنت میں لیکن گھبراؤ نہیں اس کا اظہار يَوْمُ الدِّيْنِ کو ہو جائے گا اور ہم انہیں ایک دن اپنی آنکھوں سے یہ جہنم دکھا دیں گے جس میں وہ اب مخفی طور پر جل رہے ہیں۔ جب وہ دن آئے گا تو دشمن بھی کہہ اٹھے گا کہ ہاں میں جہنم میں ہوں اور مومن جنت میں۔

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ؁۱۷

اور وہ کسی طرح بھی اس سے (بچ کر) غائب نہیں ہو سکتے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ یہ پورا زور لگائیں گے کہ اس جہنم میں داخل ہونے سے بچ جائیں مگر بچ نہیں سکیں گے۔ آخر وہ دن آئے گا جب ان کی طاقتیں توڑ دی جائیں گی جب ان کی حکومتیں مٹا دی جائیں گی اور جب زمین اِن کے پیروں تلے سے نکل جائے گی۔ چنانچہ وہ جنگ جو آج کل ہو رہی ہے یہ خود ایک جہنم ہے جس نے ان کی طاقتوں میں تزلزل پیدا کر دیا ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ اب یورپ کے تنزّل کا وقت آ رہا ہے۔ اور ابھی جیسا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بتایا اور میں اسے دو سال سے شائع کر چکا ہوں ایک اور عظیم الشان جنگ کی تیاریاں آسمان پر ہو رہی ہیں اور اس کے نتیجہ میں ایک وہ دن آئے گا جب وہ یہ نہیں کہیں گے کہ یورپ کے تنزّل کا وقت آ رہا ہے بلکہ وہ کہیں گے یورپ کے تنزل کا وقت آ گیا۔ قیامت کے دن تو دینِ حقیقی کے منکر جہنم میں جائیں گے ہی مگر اس دنیا میں بھی وہ جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ اور یہ اس سے بچ نہیں سکیں گے۔ یہ اس سے بچنے کے لئے پورا زور لگائیں گے۔ کوشش کریں گے کہ جہنم کے دروازے ان پر بند ہو جائیں۔ جیسے آج کل کہیں

لیگ آف نیشنز بنائی جارہی ہے۔اور کہیں اس آگ کو فرو کرنے کے لئے اَور تدابیر اختیار کی جارہی ہیں۔مگر یہ سب تدابیر رائیگاں جائیں گی۔سب کوششیں اکارت ثابت ہوں گی۔یہ اس دن سے غائب ہونا چاہیں گے مگر غائب نہیں ہوسکیں گے۔اپنا سارا زور اس بات پر صرف کریں گے کہ اس جہنم سے بچ جائیں مگر بچ نہیں سکیں گے۔جو کوشش بھی اس غرض کے لئے کریں گے الٹ پڑے گی اور وہ انہیں اور زیادہ اس جہنم کی طرف دھکیل کرلے جائے گی جس میں داخل ہونا ان کے لئے مقدّر ہوچکا ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۸﴾

اور (اے مخاطب) تجھے کس نے اس بات کا علم دیا ہے کہ جزا سزا کا وقت کیا ہے۔

ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۹﴾

پھر (ہم تجھے کہتے ہیں کہ) تجھے کس نے علم دیا ہے کہ جزا سزا کا وقت کیا ہے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے کس نے تم کو بتایا کہ يَوْمُ الدِّيْنِ کیا چیز ہے۔ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ پھر ہم کہتے ہیں۔کس نے تم کو بتایا کہ يَوْمُ الدِّيْنِ کیا چیز ہے؟

مَآ اَدْرٰىكَ کا لفظ قرآن کریم میں جس مقام پر بھی دوہرایا گیا ہے وہاں اس بات کی تشریح کرنے کے لئے اسے دوہرایا گیا ہے جس کا اس مقام پر ذکر آتا ہے۔یہاں چونکہ يَوْمُ الدِّيْنِ کا بیان ہے۔اس لئے ایک دفعہ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ کہنے کے بعد ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ کہنا صاف طور پر بتارہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اس جگہ جس يَوْمُ الدِّيْنِ کا ذکر کررہے ہیں اس سے کیا مراد ہے۔یعنی يَوْمُ الدِّيْنِ تو کئی ہیں۔سوال یہ ہے کہ ان آیات میں ہم نے جس يَوْمُ الدِّيْنِ کا ذکر کیا ہے اس سے ہماری مراد کیا ہے۔ورنہ اگر مَآ اَدْرٰىكَ کا دوبارہ آنا تشریح کے لئے نہ ہو تو پھر اس کے دوہرانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہوسکتا۔کیوں کہ پہلے جو کچھ بتایا ہے وہ بھی خدا نے ہی بتایا ہے۔انسان نے خود تو معلوم نہیں کیا۔اور جب وہ بھی خدا نے بتایا ہے تو یہ کہنا کہ تجھے کیا پتہ کہ يَوْمُ الدِّيْنِ کیا ہے۔اپنے اندر کوئی معنے نہیں رکھ سکتا۔یا تو پہلی باتیں انسان نے خود معلوم کی ہوتیں۔تو کہا جاسکتا تھا کہ پہلی باتیں تو تمہیں معلوم تھیں اب تمہیں کیا پتہ کہ يَوْمُ الدِّيْنِ کیا چیز ہے۔مگر جب اِن باتوں کا علم بھی انسان کو خدا تعالیٰ کے بتانے کے بعد ہوا۔تو اس بات کا علم بھی خدا تعالیٰ کے بتائے بغیر کس طرح ہوسکتا ہے۔اس سے صاف پتہ لگتا ہے۔کہ

مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ کو دوہرانا محض اس لئے ہے کہ تم کو کیا پتہ ہے کہ یہ یَوْمُ الدِّيْنِ جس کا ہم ان آیات میں ذکر کر رہے ہیں یہ کیا چیز ہے؟ آؤ ہم تم کو بتاتے ہیں کہ جس یَوْمُ الدِّيْنِ کا ہم نے ذکر کیا ہے اس سے ہماری مراد کیا ہے؟

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ

(یہ وقت) اس دن (ہوگا) جس میں کوئی جان کسی جان کو فائدہ پہنچانے کے لئے کوئی اختیار نہ رکھے گی۔

وَ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۠ ﴿۲۰﴾ ع

اور سب فیصلہ اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔

تفسیر ۔ یہاں نَفْسٌ لِّنَفْسٍ سے مَیں اپنے ذوق کے مطابق پھر وہی نفسِ عیسائیت مراد لیتا ہوں جس کا عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ میں ذکر کیا گیا تھا کہ یورپ کی جتھے بازیاں اس کے کسی کام نہیں آئیں گی۔ وہ جتھے بنا بنا کر اور لیگ آف نیشنز قائم کر کے اس عذاب سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ مگر نہ ان کے جتھے ان کے کام آئیں گے اور نہ ان کی سوسائیٹیاں ان کو اس عذاب سے بچا سکیں گی۔

عیسائیت کی بنیاد چونکہ کفارہ پر ہے اس لئے يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ تمہارا کفارہ دھرے کا دھرارہ جائے گا اور وہ تمہارے کسی کام نہیں آئے گا۔

وَ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ کے معنے اس دنیا کے لحاظ سے وَ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ قیامت کے لحاظ سے تو اس آیت کا مفہوم ظاہر ہی ہے۔ اس دنیا کے لحاظ سے اِس آیت کے یہ معنے ہیں کہ اُنیس سو سال سے عیسائی یہ دعا کرتے چلے آئے ہیں کہ اے خدا تیری بادشاہت جس طرح آسمان پر ہے اسی طرح زمین پر بھی آئے (متی باب ۶ آیت ۱۰)۔ مگر انیس سو سال تک خدا کی بادشاہت زمین پر لانے والے اپنے مقصد میں ناکام رہے اور وہ خدا تعالیٰ کی بادشاہت کو زمین پر اس طرح نہ لا سکے جس طرح وہ آسمان پر قائم ہے۔ لیکن جب کبھی بھی وہ اس امر میں ناکام رہیں گے تو اللہ تعالیٰ ایک دوسری جماعت کو کھڑا کر دے گا جو امرِ الٰہی کو آسمان سے زمین پر لانے میں کامیاب ہو جائے گی اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت کو زمین پر قائم کر کے دکھا دے گی۔ گویا جس کام کو یہ لوگ اُنیس سو سال میں نہ کر سکے وہ کام ہماری ایک اَور جماعت کر کے دکھا دے گی اور اللہ تعالیٰ کا حکم زمین پر جاری ہو جائے گا۔

خدا تعالیٰ مجسّم نہیں کہ وہ دنیا میں آجائے۔ خدا تعالیٰ کے آنے سے مراد اس کی بادشاہت کا قیام ہوتا ہے۔ اور

اس آیت میں یہی خبر دی گئی ہے کہ آخر وہ بادشاہت قائم ہو جائے گی۔حق آ جائے گا اور باطل بھاگ جائے گا۔اس طرح وہ مایوسی جو پہلی آیتوں کے مطالعہ سے دلوں میں پیدا ہو سکتی تھی۔اللہ تعالیٰ نے اس کو دُور کر دیا اور مومنوں سے کہہ دیا کہ ڈرو نہیں۔قرآن کا زمین سے اٹھ جانا۔ایمان کا ثریّا پر چلا جانا۔کفر کا دنیا پر غالب آ جانا۔شرک اور معصیت کا لوگوں میں پھیل جانا۔رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا روشن چہرہ لوگوں سے اوجھل ہو جانا۔صحابہؓ کی اتباع کا شوق دلوں سے جاتے رہنا تمہارے دلوں میں مایوسی مت پیدا کرے۔ہم تمہیں بشارت دیتے ہیں کہ اَلْاَمْرُ یَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ۔گو عیسائی فتنہ بڑا سخت ہے۔مگر ہم قرآن اور اسلام کی حکومت دنیا میں قائم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارے اس فیصلہ کو بدل نہیں سکتی۔ہم پھر اسلام کو قائم کریں گے۔پھر قرآن کو قائم کریں گے۔پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت ساری دنیا میں قائم کریں گے۔اس لئے تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔تمہارے لئے مایوسی کا کوئی مقام نہیں۔بلکہ خوشی اور مسرّت کا مقام ہے۔کہ اسلام پھر اپنی گم گشتہ عزت کو حاصل کرے گا۔اور ساری دنیا پر غالب آ جائے گا۔

سُوْرَۃُ التَّطْفِیْفِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ تطفیف ۔ یہ سورۃ مکی ہے

وَھِیَ سِتٌّ وَّ ثَلٰثُوْنَ اٰیَۃً دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ

اور بسم اللہ کے علاوہ اس کی چھتیس ۳۶ آیات ہیں ۔

سورۃ تطفیف مکی ہے اس سورۃ کے مکّی یا مدنی ہونے کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سورۃ کی پہلی چھ آیات مدنی ہیں۔ گویا یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تک مدنی آیات ہیں اور بعض کے نزدیک یہ ساری سورۃ ہی مدنی ہے (اتقان فی علوم القرآن، الدرمنثور) لیکن اکثر مفسّرین کی یہ رائے ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں جو قرآن شریف شائع ہوتے ہیں اُن پر سُوْرَۃُ التَّطْفِیْفِ مَکِّیَّۃٌ ہی لکھا ہوتا ہے۔

جن یوروپین محققین نے اس پر بحث کی ہے تعجب ہے کہ اپنے اصول کے خلاف انہوں نے بھی اسے مکّی قرار دیا ہے حالانکہ اُن کے معترضانہ میلانات کو مدنظر رکھتے ہوئے اُنہیں اسے زبردستی بھی مدنی قرار دینا چاہیے تھا خصوصاً جبکہ بعض مفسّرین کی تصدیق انہیں حاصل ہوگئی تھی۔ لیکن یہ خدا تعالیٰ کا تصرّف ہے کہ انہوں نے اِسے مکی ہی قرار دیا ہے اور پھر مکی بھی ابتدائی سورتوں میں سے۔ چنانچہ نولڈکے Noldeke جرمن پروفیسر اور میور Muir دونوں اِسے چوتھے سال قبل ہجرت کے قریب کی بتاتے ہیں (تفسیر القرآن از وہیری جلد ۴ صفحہ ۲۲۶) اور یہی رائے درست ہے کہ یہ مکّی اور ابتدائی زمانہ کی ہے۔

سورۃ کو مکی یا مدنی قرار دیئے جانے کے اصول اور ان کی حقیقت سورتوں کے مکی یا مدنی قرار دینے کی بنیاد اول تو روایات پر ہوتی ہے جن کو بیان کرنے والے بعض دفعہ تو اُس وقت کے مسلمان ہوتے ہیں جس وقت وہ سورۃ نازل ہوئی اور وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے علم میں یہ سورۃ فلاں وقت نازل ہوئی ہے اور بعض لوگ اپنا علم نہیں بتاتے بلکہ اس امر پر قیاس کر کے رائے لگاتے ہیں کہ ہم فلاں وقت مدینہ میں گئے تھے اور یہ سورۃ پڑھی گئی تھی اس لئے اُس وقت کی نازل شدہ ہے۔ حالانکہ پہلے کی نازل شدہ سورۃ بھی تو اُس وقت پڑھی جاسکتی ہے۔ تیسرے بعض واقعات جو سورۃ میں مذکور ہوں اُن کی بناء پر زمانہ نزول مقرر کیا جاتا ہے۔ چوتھے بعض الفاظ کی بناء پر جن کی نسبت مفسرین یا مستشرقین یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ صرف مکی یا مدنی زمانہ میں استعمال ہوتے تھے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ سورۃ

مکی ہے یا مدنی۔ پانچویں تفصیلی مسائل کی بناء پر مستشرقین سورتوں کو مدنی قرار دیتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک تفصیلی مسائل مدنی سورتوں میں ہوتے ہیں۔ چھٹے طرز کلام کی بناء پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً لمبی آیتیں ہوں تو مستشرقین اُن کو مدنی اور چھوٹی آیات ہوں تو مکی قرار دیتے ہیں۔ ساتویں یہود کا ذکر آجائے تو مستشرقین کہہ دیتے ہیں کہ یہ مدنی سورۃ ہے۔ آٹھویں اگر کفار کے خلاف کوئی سخت حکم آجائے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ مدنی ہے۔ ان دلیلوں میں سے صرف پہلی دلیل یقینی ہے۔ باقی صرف ظنی ہیں اور انہیں مستشرقین اسلام کے خلاف حربہ کے طور پر استعمال کرنے سے کبھی نہیں چُوکتے۔ اور بعض دلائل ان میں سے قطعاً غلط بھی ہیں مگر یہ موقعہ ان پر بحث کا نہیں ہے۔ خود مستشرقین کا اپنا طریق عمل ان دلائل کے خلاف پڑتا ہے کیونکہ بعض دفعہ وہ خود (جب اُن کا مطلب اس طرح پورا ہوتا ہو) ان دلائل کے خلاف رائے دے جاتے ہیں جیسا کہ مختلف مقامات پر اس کی طرف تفسیر میں اشارہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

درحقیقت مستشرقین بعض دلائل سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم کی تعلیم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں اور یہودیوں سے مل کر سیکھی تھی۔ پس اگر یہ ثابت ہوجائے کہ مکی سورتوں میں عیسائیوں اور یہودیوں کی تعلیمات کا کوئی تفصیلی ذکر نہیں تو وہ کہتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ مدنی سورتوں میں اِن کا اس لئے ذکر ہے کہ آپ نے مدینہ میں غیروں سے مل کر ان باتوں کو سیکھ لیا۔ جو مسلمان مفسرین ان امور میں کمزور دلائل کی بناء پر رائے قائم کرتے ہیں۔ وہ نادانستہ طور پر عیسائیت کو تقویت پہنچا دیتے ہیں حالانکہ یہ اصول بالکل قیاسی ہیں اور تاریخی مسئلہ کو قیاس سے طے کرنا غلط طریق عمل ہوتا ہے صرف قطعی تاریخی شہادت یا داخلی قیاس ہی ایسے موقعہ پر صحیح ہوتے ہیں اور وہ بھی اُس صورت میں جبکہ خود قرآن کا دوسرا مضمون اُن کی تائید کرتا ہو۔ یہ مضمون بہت لمبا ہے جس کو اس وقت بیان نہیں کیا جاسکتا۔

سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کے متعلق صحیح رسالہ لکھے جانے کی ضرورت ضمناً میں نے اس طرف توجہ دلا دی ہے ورنہ یہ مضمون تقاضا کرتا ہے کہ اس پر ایک مستقل رسالہ لکھا جائے۔ سورتوں کے مکّی یا مدنی ہونے کے متعلق جہاں تک روایاتِ صحیحہ کا تعلق ہے یا تاریخی تحقیق کا تعلق ہے ان کو ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن جو حصہ قیاس سے تعلق رکھتا ہے اس میں بعض غلط اصول قرار دے دیئے گئے ہیں جن کی وجہ سے غلط نتائج پیدا ہوتے ہیں اور اُن غلط نتائج سے دشمنانِ اسلام ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں انہیں تسلیم کرنے کو ہم تیار نہیں۔ بہرحال یہ مضمون ایک مستقل رسالہ کا طالب ہے تاکہ تفصیلی طور پر بحث کرکے یہ بتایا جائے کہ قرآن کریم کی ترتیب کے متعلق جو استدلال کئے جاتے ہیں اُن میں کیا کچھ غلطیاں ہیں اور کن بنیادوں پر ان نقائص کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری جماعت

میں سے کسی کو توفیق دے یا خود مجھے ہی توفیق دے دے تو اس کے متعلق ایک مستقل رسالہ لکھا جانا ضروری ہے درحقیقت امام سیوطی نے جو اتقان کتاب لکھی تھی وہ اس سلسلہ کی پہلی کوشش تھی جس میں اُن سے بہت سی غلطیاں بھی ہوئیں۔ اب ضرورت ہے کہ ایک حقیقی اتقان لکھی جائے کیونکہ اتقان کے معنے ہیں مضبوط اور پکّی باتیں۔ لیکن غلطی سے اُس میں کچھ کچی باتیں بھی آ گئی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ حقیقی معنوں میں ایک اتقان کتاب لکھی جائے جس میں صحیح اصول پر اس مسئلہ کو بیان کیا جائے اور غلط باتوں کی تردید کی جائے۔

ترتیب۔ پہلی سورۃ سے سورۃ التطفیف کے دو تعلق پہلی سورۃ سے اس سورۃ کے دو تعلق ہیں ایک قریب کا اور ایک بعید کا۔ یعنی ایک تو قریب مضمون سے اس کا تعلق ہے اور ایک سلسلۂ کلام سے اس کا تعلق ہے۔ میرا تجربہ یہی ہے کہ قریباً ہر سورۃ کا دوسری سورۃ سے تعلق ہوتا ہے اور پھر میرے علم کے مطابق ہر سورۃ کا دوسری سورۃ سے ایک تعلقِ قریب ہوتا ہے اور ایک تعلقِ بعید ہوتا ہے یعنی ایک تعلق تو ایسا ہوتا ہے جو اسے پہلی سورۃ کی آخری آیتوں سے ملا دیتا ہے لیکن ایک تعلق ایسا ہوتا ہے جو سلسلۂ مضمون سے متعلق ہوتا ہے پھر آگے یہ تعلق دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تعلق تو سورۃ کا قریب کی سورۃ یا اس کے ساتھ کی سورۃ سے ہوتا ہے اور مضمون میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے اور ایک تعلق ایسا ہوتا ہے جو چھ چھ سات سات بلکہ دس دس سورتیں پیچھے جا کر اس سورۃ کو پچھلی سورتوں سے ملا دیتا ہے یہ بھی ایک ایسا مضمون ہے جو خدا تعالیٰ کے فضل سے ایک حد تک میں نے سمجھا ہے۔ سورتوں کے آپس کے قریب کے تعلقات اور تسلسل مضمون کے اعتبار سے اُن کے آپس کے تعلقات بالعموم میں نے اخذ کئے ہیں لیکن مجھ پر اثر یہ ہے کہ سورتوں کا ایک تعلق بعید یا ابعد بھی ہوتا ہے۔ مجھے اس کے متعلق ایسی فرصت نہیں ملی کہ اس مضمون کو مکمل طور پر حل کر سکوں۔ چونکہ میرے پاس پہلے ہی کاموں کی کثرت ہے اور اس کے لئے فرصت نکالنا بہت مشکل ہے اِس لئے میں اس مضمون کو حل کرنے کی ایک تجویز بتا دیتا ہوں۔

سورتوں کے آپس میں تعلقات کو سمجھنے کا ایک طریق میری رائے یہ ہے کہ قرآن کریم کی سورتیں الگ الگ خوشخط لکھوا کر اُن کے چارٹ بنوائے جائیں اور پھر اُن الگ الگ ٹکڑوں کو انسان ایک کمرے میں لٹکا دے اور فرصت کے وقت اُن کو دیکھتا رہے۔ اس کے نتیجہ میں اُسے سورتوں کے باہمی تعلقات کا ضرور نشان مل جائے گا جب ایک چارٹ حل ہو جائے تو دوسرے پر غور کرنا شروع کر دے۔ دوسرا حل ہو جائے تو تیسرے کو مدنظر رکھ لے۔ جس شخص کو فرصت ہو اور قرآن کریم پر غور کرنے کا وہ شوق رکھتا ہو اگر وہ ایسا کرے تو اس کو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے قریب کا تعلق تو یہ ہے کہ سورۂ انفطار کے آخر میں فرمایا تھا يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ

لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا ؕ وَ الۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ گویا وہاں ایک محاسبے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا تھا اور بتایا تھا کہ تمہیں یہ گھاٹا اپنے پاس سے پورا کرنا پڑے گا دوسرا کوئی شخص اس کمی کو پورا نہیں کرسکتا۔ پس چونکہ وہاں محاسبے کا ذکر تھا اس لئے وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ۔ میں اللہ تعالیٰ نے ادھر اشارہ فرما دیا کہ جس نے حساب دینا ہو اس کو اپنا حساب بالکل صاف رکھنا چاہیے۔ یہی بات ہے جو حضرت مسیح ناصری ؑ نے کہی مگر مسیحیوں کی نظر سے پوشیدہ ہوگئی۔ حضرت مسیح ؑ نے کہا

''مبارک وے جو رحم دل ہیں کیونکہ اُن پر رحم کیا جائے گا'' (متی باب ۵ آیت ۷)

اسی طرح ایک دوسری جگہ ان کی بات بیان کی گئی ہے۔ لکھا ہے

''اگر تم آدمیوں کے گناہ بخشو گے تو تمہارا باپ بھی جو آسمان پر ہے تمہیں بخشے گا پر اگر تم آدمیوں کو اُن کے گناہ نہ بخشو گے تو تمہارا باپ بھی تمہارے گناہ نہ بخشے گا'' (متی باب ۶ آیت ۱۴، ۱۵)

اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ اس جگہ بیان فرماتا ہے کہ تم نے خدا کے سامنے پیش ہونا ہے اگر تم وہاں گھاٹے سے بچنا چاہتے ہو تو بندوں کو بھی کسی قسم کا گھاٹا نہ دو۔

عجیب بات یہ ہے کہ عیسائیوں کو جو کچھ تعلیم دی گئی تھی اس کے بالکل اُلٹ انہوں نے نتیجہ نکال لیا یعنی اُنہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم تو رحم کر سکتے ہیں لیکن خدا رحم نہیں کرسکتا حالانکہ خدا ہمارے رحم کو اپنے رحم کی وجہ قرار دیتا ہے اور حضرت مسیح ؑ بھی یہی فرماتے ہیں کہ تم لوگوں پر رحم کرو تا آسمانی باپ تم پر رحم کرے۔ گویا ہمیں رحم کرنے کی اس لئے ضرورت ہے تا کہ خدا ہم پر رحم کرے مگر دوسری طرف عیسائیت یہ کہتی ہے کہ تم تو رحم کر سکتے ہو لیکن خدا رحم نہیں کرسکتا۔ یہ کتنی متضاد تعلیم ہے جو عیسائیت میں پائی جاتی ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمہارا معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے اگر تم چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ تمہارے ساتھ نرمی اور محبت کا سلوک کرے تو تم بھی اس کے بندوں کے ساتھ نرمی اور محبت کے ساتھ پیش آؤ۔

یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا ؕ وَ الۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ میں خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کے معاملے کا ذکر کیا گیا ہے اور وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ۔ میں بنی نوع انسان کے باہمی معاملات کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ ٹھیک ٹھیک معاملہ کیا کرو تا کہ خدا تمہارے ساتھ نیک سلوک کرے۔ گویا سورۂ انفطار کا آخری حصہ حضرت مسیح ناصری ؑ کے ایک قول کی تائید کرتا ہے اور اس سورۃ کا پہلا حصّہ حضرت مسیح ناصری ؑ کے دوسرے قول کی تائید کرتا ہے۔

اس سورۃ کا پہلی سورتوں سے تعلق بلحاظ مضمون ترتیبِ بعید یہ ہے کہ گزشتہ دو سورتوں سے عیسائیت کا ذکر

ہورہا ہے اور عیسائیوں کے اعمال کے دو حصّے بڑے خطرناک ہیں۔ وہ حصہ بھی جو مذہب کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور وہ حصہ بھی جو غیر اقوام کے ساتھ تعلق رکھتا ہے مذہبی نقطۂ نگاہ سے اُن کے اعمال کی بُرائی اس سے ظاہر ہے کہ وہ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں مسیح ناصریؑ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی توحید کو مٹا رہے ہیں۔ اسی کی طرف پہلی سورۃ میں اشارہ کیا گیا تھا کہ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ یعنی ہم نے جو کہا تھا کہ اِن لوگوں کے شرک سے قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائے وہ وقت آ گیا ہے اور انہوں نے اس قدر شرک سے کام لیا ہے کہ آسمان واقعہ میں پھٹ گیا ہے۔ پس اُن کے اعمال کا ایک حصّہ تو یہ ہے۔ دوسرا حصّہ اُن کے اعمال کا آپس کی جتھہ بندی اور باقی تمام غیر قوموں سے انتہائی بدسلوکی سے پیش آنا ہے۔ پس پہلی سورۃ میں عیسائیوں کی مذہبی بُرائی بتانے کے بعد اس سورۃ میں یہ بیان کرتا ہے کہ اُن کا معاملہ دوسری اقوام سے بہت بُرا ہوگا۔ وہ اُن کو لوٹیں گے۔ اُن کے معاہدات اور معاملات ہمیشہ دو رُخے ہوں گے۔ آپس میں اُن کا اور سلوک ہوگا اور دوسری اقوام سے اُن کا اور سلوک ہوگا۔ غرض تطفیف عیسائیت کا ایک نہایت ہی نمایاں پہلو ہے۔ اِن سے پہلے تاریخ میں قوموں کی جتھہ بندی کی اور کوئی مثال ایسی نہیں ملتی جیسی یوروپین اقوام میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ لوگ دہریہ ہیں۔ عقائد کے اعتبار سے ان کا عیسائیت سے کوئی تعلق نہیں لیکن جہاں عیسائیت کا سوال آ جائے وہاں یہ ضرور اس کا لحاظ کر جائیں گے۔ اور دہریہ ہوتے ہوئے بھی عیسائیت کی رعایت کریں گے۔ جرمن ہیں وہ بھی دہریہ ہیں مگر عیسائیوں سے اُن کا معاملہ اَور رنگ کا ہوگا۔ اور دوسری اقوام سے اَور رنگ کا ہوگا۔ وہ یہودیوں پر سخت سے سخت ظلم کریں گے مگر عیسائیوں کا سوال آ جائے تو اُن سے نرمی کا برتاؤ کریں گے۔ یہی حال انگریزوں اور امریکن باشندوں کا ہے اُن کے اندر کوئی مذہب نہیں لیکن عیسائیت کے نام کا مٹنا وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اب لڑائی ہو رہی ہے مسلمانوں اور ہندوؤں کو وہ اس جنگ میں کٹوا رہے ہیں مگر کہہ یہ رہے ہیں کہ ہم کرسچن سویلزیشن قائم کریں گے حالانکہ کرسچن سویلزیشن کا کوئی مفہوم نہیں سوائے زمانہ حاضرہ کی تہذیب کے اور عیسائیت سے اس کا دُور کا بھی تعلق نہیں۔ مگر وہ کہتے یہی ہیں کہ ہم عیسائی تہذیب دنیا میں قائم کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔

پھر یہ عجیب معاملہ ہے کہ عیسائی قومیں آپس میں بھی ایک دوسرے پر ظلم کرتی ہیں مگر اس ظلم کا دائرہ محدود ہوتا ہے گویا انہوں نے ظلم کے دو دائرے بنا لئے ہیں۔ ایک ظلم عیسائیت پر اور ایک ظلم غیر عیسائیت پر۔ جب غیر پر ظلم ہو تو تمام عیسائی قومیں اکٹھی ہو جاتی ہیں اور آپس کے تعلقات کو بھلا دیتی ہیں پس یہ لوگ دو ظلم کر رہے ہیں ایک خدا پر ظلم ہے اور ایک اس کی مخلوق پر ظلم ہے۔ چونکہ مخلوق پر ظلم عیسائیوں کے اعمال کا دوسرا حصہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے

اس کے لئے دوسرا باب باندھ دیا یعنی دوسری سورۃ میں اس کا ذکر کیا۔ جیسے زمانہ کے تغیّرات میں سے عیسائیت کا تغیّر اتنا اہم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک الگ سورۃ نازل فرما دی۔ اسی طرح عیسائیت کے دو بہت بڑے ظلم تھے۔ ایک وہ ظلم تھا جس کا خدا سے تعلق تھا اور ایک وہ ظلم تھا جس کا مخلوق کے ساتھ تعلق تھا۔ خدا تعالیٰ پر عیسائیت کا جو ظلم تھا اس کو سورۂ انفطار میں بیان کر دیا گیا اور جو ظلم انسانوں پر تھا اس کو سورۂ تطفیف میں بیان کر دیا گیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ ۙ﴿۲﴾

وزن میں کمی کرنے والوں کے لئے عذاب (ہی عذاب) ہے۔

حَلّ لُغَات - **وَیۡل** کلمہ وَیۡل عذاب کے لئے اور دکھ کے لئے بیان کیا جاتا ہے (اقرب)۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَیۡلٌ یعنی عذاب ہوگا۔ دکھ ہوگا۔

مُطَفِّفِیۡن لِلۡمُطَفِّفِیۡن: مطفّفین کے لئے۔ مُطَفِّفِیۡنَ مُطَفِّفٌ سے جمع کا صیغہ ہے اور مُطَفِّفٌ طَفَّفَ سے اسم فاعل ہے۔ طَفَّفَ الۡمِکۡیَالَ کے معنے ہیں نَقَصَہٗ اس کو کم ماپ کر دیا۔ اور طَفَّفَ الۡوَزۡنَ کے بھی یہی معنے ہیں کہ نَقَصَہٗ اس کو کم وزن کر کے دیا۔ گویا تطفیف کا لفظ کَیۡل کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے اور وزن کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے۔ نیز کہتے ہیں طَفَّفَ عَلٰی عِیَالِہٖ اَیۡ قَتَّرَ عَلَیۡہِمۡ اس نے اپنے عیال کو تنگ رزق مہیا کیا اور کہتے ہیں طَفَّفَ عَلَی الرَّجُلِ اَیۡ اَعۡطَاہُ اَقَلَّ مِمَّا اَخَذَ مِنۡہُ یعنی جو کچھ اس سے لیا تھا اُس سے کم اس کو دیا (اقرب) پس مُطَفِّفٌ کے معنے ہوں گے کسی کو وزن یا ماپ میں کم دینے والا۔

تفسیر - **یوروپین اقوام کا غیر قوموں کے حقوق کو غصب کرنے کا خلاصہ** یہ یوروپین اقوام کا خاصہ ہے کہ وہ غیر قوموں کے حقوق کو غصب کرنا اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ اُن کی ساری سیاسی اور اقتصادی پالیسی کا بنیادی اصول یہی ہے کہ غیر قوموں کے حقوق کو غصب کر لیا جائے۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ ایک بات بیان فرمایا کرتے تھے جس کا میری طبیعت پر بڑا گہرا اثر ہے آپ فرماتے تھے دنیا میں کوئی قوم سود لے کر ذلیل ہو جاتی ہے اور کوئی قوم سود دے کر ذلیل ہو جاتی ہے مگر یہ عیسائی قوم ایسی ہے کہ یہ سود لے کر بھی لُوٹتی ہے اور سود دے کر بھی لُوٹتی

ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ سُود لے کر لوٹنا تو ان کے بنکوں سے ظاہر ہے اور سُود دے کر دوسروں کو لُوٹ لینے کے ذکر میں آپ اودھ کی حکومت کی مثال دیا کرتے تھے۔ بعد میں مَیں نے حوالے دیکھے تو آپ کی یہ بات درست معلوم ہوئی کہ واقعہ میں انہوں نے اودھ کی حکومت کو سود دے کر لوٹا ہے انہوں نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ کلکتہ بنک میں اگر اپنا روپیہ جمع کرا دو تو تمہیں بڑا نفع ملے گا۔ چنانچہ لوگوں نے روپیہ جمع کرانا شروع کر دیا اور انہوں نے ان کو خوب سود دیا یہاں تک کہ عورتوں نے اپنے زیورات بیچ بیچ کر روپیہ اس بنک میں جمع کرانا شروع کر دیا اور سمجھا کہ انگریز بڑے خیر خواہ ہیں یہ تو ہمیں خوب منافع دیتے ہیں جب اودھ کے بادشاہ سے انگریزوں کا اختلاف پیدا ہوا اور انگریزی فوجیں لکھنؤ کی طرف بڑھنی شروع ہوئیں تو امراء نے بادشاہ کو انگریزی فوج کے اس حملہ سے بالکل غافل رکھا جب انگریزی فوجیں لکھنؤ کے قریب آئیں تو اودھ کے تمام امراء کو نوٹس مل گیا کہ اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو تمہارا بنک میں جس قدر روپیہ ہے وہ سب ضبط کر لیا جائے گا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خاموش بیٹھے رہے اور بادشاہ کو تب پتہ لگا جب انگریزی فوجیں شہر کے دروازہ پر پہنچ گئیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بادشاہ کو غافل رکھنے کے لئے امراء نے ناچ کی تحریک کر دی تھی چنانچہ وہ اسی ناچ میں مشغول رہا یہاں تک کہ انگریزی فوجیں اُس کے سر پر جا پہنچیں۔ (حقائق الفرقان زیر آیت الذین یأکلون الربا۔۔)

غرض عیسائی قوم ایسی ہے جس نے روپیہ لے کر بھی دوسروں کو لوٹا ہے اور روپیہ دے کر بھی دوسروں کو لوٹا ہے یہ صحیح معنوں میں مُطَفِّف ہیں اور ہر بات میں اپنا حق فائق رکھتے ہیں۔ لیکن اگر دوسروں کے حق کا سوال ہو تو اُس پر سوسو اعتراض کر دیتے ہیں آخر یہ موٹی بات ہے کہ وجہ کیا ہے کہ ساری دنیا اُن کے قبضہ میں آ گئی۔ کون سے جائز دلائل اور معقول وجوہ تھے جن کی بناء پر انہوں نے اتنا بڑا تسلّط حاصل کر لیا کہ چینؔ ہے تو اس میں ان کا دخل ہے۔ ہندوستانؔ ہے تو وہاں ان کا دخل ہے۔ افغانستانؔ ہے تو اس پر اُن کا دباؤ ہے۔ اسی طرح بخاراؔ کیا اور چینیؔ ترکستان کیا اور کاکیشیاؔ کیا اور جارجیاؔ کیا ہر جگہ ان کا دخل ہے۔ عربؔ ہے تو وہاں ان کا تصرّف ہے۔ ترکیؔ ہے تو اس کے معاملات میں ان کا دخل ہے۔ مصرؔ ہے تو وہ ان کے قبضہ میں ہے۔ افریقہؔ ہے تو وہ ان کے ماتحت ہے آخر لوگوں نے کون سے قصور کئے تھے کہ جن کی وجہ سے یہ جہاں بھی گئے وہ مغلوب ہوتے گئے اور یہ غالب آتے چلے گئے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ اِن کی مثال بالکل اس بندر کی سی ہے جو دو بلّیوں کا پنیر وزن کرنے کے بہانہ سے کھا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ دو بلّیوں نے کہیں سے پنیر کا ایک ٹکڑہ چُرایا جس پر اُن دونوں میں لڑائی ہوگئی۔ ایک کہتی تھی کہ مَیں اتنا حصّہ لوں گی اور دوسری کہتی تھی کہ مَیں اتنا حصّہ لوں گی۔ آخر انہوں نے ایک بندر سے کہا

کہ یہ پنیر ہم میں بانٹ دو۔ بندر نے ترازو لیا اور اندازاً اُسے دو ٹکڑوں میں کاٹ کر الگ الگ پلڑے میں رکھ دیا۔ جب اُس نے ترازو کو اٹھایا تو دونوں پلڑوں میں کچھ فرق پڑ گیا۔ اس پر بجائے دوسری طرف سے چھوٹا سا ٹکڑہ کاٹ کر کسی ہلکے پلڑے میں رکھنے کے اُس نے مُنہ مار کر بھاری ٹکڑے میں سے ایک بڑا سا ٹکڑہ کاٹ لیا۔ اور جب دوبارہ دوسرا پلڑا جھک گیا تو اُس طرف سے ایک بڑا سا ٹکڑہ کاٹ کر مُنہ میں ڈال لیا اور اسی طرح وہ کبھی ایک طرف سے پنیر کا ٹکڑہ کاٹ کر کھا لیتا اور کبھی دوسری طرف سے۔ یہاں تک کہ بہت تھوڑا سا پنیر رہ گیا۔ اتنے میں بلّیوں کو بھی سمجھ آ گئی کہ ہم نے یہ کیا حماقت کی کہ ایک بندر کے سپرد پنیر کر دیا وہ تو اسی طرح تمام پنیر کھا جائے گا چنانچہ بلیوں نے کہا کہ حضور اب ہمیں پنیر عنایت فرما دیجئے ہم خود ہی بانٹ لیں گی۔ اس پر بندر نے کہا اب تو صرف میری محنت کا بدلہ باقی رہ گیا ہے اور یہ کہہ کر اُس نے پنیر کا آخری ٹکڑہ بھی اپنے مُنہ میں ڈال لیا۔ یہی ان لوگوں کا حال ہے جب بھی یہ کسی قوم کا کوئی معاملہ طے کرنے لگتے ہیں یہی کہتے ہیں کہ ہمارا حق اتنا بنتا ہے اور اس حق پر بحث کرتے کرتے سارا ملک ہضم کر جاتے ہیں اور آخر میں جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ حق مانگنے والے محروم رہ جاتے ہیں اور یہ لوگ اُن کے تمام حقوق غصب کر کے اُن پر قبضہ جما لیتے ہیں۔

الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝۳

(ان کے لئے) جو لوگوں سے تول کر لیتے ہیں تو خوب پورا کر کے لیتے ہیں۔

حلّ لُغات۔ اِكْتَالُوْا اِكْتَالُوْا اِكْتَالَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اِكْتَالَ کے دو صلے آتے ہیں مِنْ اور عَلٰی چنانچہ عربی زبان میں اِكْتَالَ مِنْهُ اور اِكْتَالَ عَلَيْهِ دونوں استعمال ہوتے ہیں اور اِكْتَالَ مِنْهُ وَعَلَيْهِ اِكْتِيَالًا کے معنے ہوتے ہیں اَخَذَ مِنْهُ وَتَوَلَّى الْكَيْلَ بِنَفْسِهٖ اس نے دوسرے سے اپنا حق وزن کر کے لیا اس خصوصیت کے ساتھ کہ پیمانہ اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھا دوسرے کے ہاتھ میں اُسے جانے نہیں دیا۔ (اقرب) پس الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ کے یہ معنے ہوئے کہ جب وہ لوگوں سے اپنا حق لینے کے لئے پیمانہ کے ذریعہ فیصلہ کرتے ہیں تو پیمانہ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں اور پھر جو کچھ لیتے ہیں پورا پورا لیتے ہیں۔

تفسیر۔ **یوروپین اقوام کا ہر فیصلے میں اپنا اختیار رکھنا** اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عیسائی قوم کے جس نقص کو بیان فرمایا ہے اس کے اظہار کے لئے بعض اور الفاظ بھی استعمال ہو سکتے تھے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ یہ بھی کہہ

سکتا تھا کہ جب وہ سودا کرتے ہیں تو اپنا حق پوری طرح لے لیتے ہیں مگر اُس نے یہ نہیں کہا بلکہ الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ۔ وَ اِذَا کَالُوۡهُمۡ اَوۡ وَّ زَنُوۡهُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں یہ بتانے کے لئے کہ سارا معاملہ ان لوگوں کے اپنے ہاتھ میں ہوگا اور فیصلہ کا اختیار صرف اُنہی کو حاصل ہوگا خواہ انہوں نے لوگوں سے حق لینا ہو یا انہوں نے لوگوں کا حق دینا ہو چنانچہ آج واقعات اس کی تصدیق کر رہے ہیں۔ کوئی معاملہ ہو فیصلہ کا اختیار انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی آزادی کا سوال ہی لے لو یہ نہیں ہوسکتا کہ ہندوستانی لیڈر آپس میں بیٹھ کر کوئی فیصلہ کرسکیں۔ انگریز یہی کہتے ہیں کہ بیشک تم اکٹھے ہو کر غور کرو مگر تمہارا آخری کام یہ ہوگا کہ اپنے مطالبات کو ہمارے سامنے پیش کرو پھر ہمارا اختیار ہوگا کہ ہم اُن میں سے جس مطالبہ کو چاہیں منظور کریں اور جس مطالبہ کو چاہیں ردّ کردیں۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ اس قوم کو دنیا پر ایسا غلبہ حاصل ہو گا کہ لوگوں کو حقوق دینے یا اُن سے اپنے حقوق لینے کا تمام اختیار انہی لوگوں کو حاصل ہوگا۔ دنیا میں گاہک اپنی جگہ اختیار رکھتا ہے اور تاجر اپنی جگہ اختیار رکھتا ہے لیکن یہ اگر گاہک ہوں گے تب بھی کہیں گے کہ تمہیں تولنے کا اختیار نہیں۔ چیز تول کر ہم خود لیں گے اور اگر یہ تاجر ہوں گے تب بھی یہ کہیں گے کہ جو کچھ ہم مانگتے ہیں وہ تم دو اس سے کم ایک پائی بھی لینے کے لئے ہم تیار نہیں ہیں۔ غرض تمام اختیارات لینے اور دینے کے ان کو حاصل ہوں گے دوسروں کا اختیار نہیں ہوگا کہ وہ اس میں دخل دے سکیں۔

اس اعتراض کا جواب کہ حق کا پورا لینا تو انصاف پر دلالت کرتا ہے لیکن پھر یَسۡتَوۡفُوۡنَ کیوں فرمایا یہاں اللہ تعالیٰ نے یَسۡتَوۡفُوۡنَ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے معنے پورا لینے کے ہیں (اقرب) اور پورا لینا بظاہر انصاف پر دلالت کرتا ہے لیکن درحقیقت اس جگہ یَسۡتَوۡفُوۡنَ الۡحَقَّ مراد نہیں یعنی یہ مطلب نہیں کہ جتنا ان کا حق تھا وہ لیتے ہیں بلکہ یَسۡتَوۡفُوۡنَ الۡمُطَالَبَةَ ہے یعنی جتنا مانگتے ہیں اتنا لے کر چھوڑتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس جگہ اُن کی برائی ہو رہی ہے تعریف نہیں۔ اور بُرائی کا پہلو یہی ہے کہ لے تو زیادہ لے اور دے تو کم دے۔ پس یَسۡتَوۡفُوۡنَ سے مراد حق پورا لینا مراد نہیں بلکہ اپنا مطالبہ پورا لینا مراد ہے ہاں بطور تنزل یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ ہمیشہ حق پورا لیتے ہیں کبھی دوسرے پر رحم نہیں کرتے اور اپنے حق کا کوئی حصہ معاف نہیں کرتے یعنی روائتی شائیلاک کا سا سلوک کرتے ہیں۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ اس جگہ اِکۡتِیَال کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنے ترازو اپنے ہاتھ میں لے کر خود تول کر لینے کے ہوتے ہیں یہ نہیں کہ کوئی دوسرا تول کر دے۔ ان لفظوں کے استعمال سے بھی ظاہر ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنا حق لیتے ہیں اور دوسرے کا کوئی دخل اس میں آنے نہیں دیتے۔

یوروپین اقوام پر شائیلاک کی کہانی کا صادق آنا شائیلاک کی کہانی حقیقت میں عیسائیوں پر پوری طرح چسپاں ہوتی ہے یہ لوگ بھی جب کسی سے کچھ لینا ہوتا ہے تو ایسی سختی سے مطالبہ کرتے ہیں کہ کسی چیز کی بھی پروانہیں کرتے لیکن جب دینے کا سوال آئے تو سوسو بہانے بنانے لگ جاتے ہیں۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ اِکْتَالَ کے دو صلے آتے ہیں۔ مِنْ اور عَلٰی چنانچہ اِکْتَالَ مِنْہُ اور اِکْتَالَ عَلَیْہِ دونوں عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں اور دونوں کے ایک ہی معنے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن بعض علماء ادب نے کہا ہے کہ صلہ کے تغیّر سے اس لفظ کے مفہوم میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ صحیح ہے کہ اِکْتَالَ مِنْہُ اور اِکْتَالَ عَلَیْہِ دونوں صلے آتے ہیں لیکن جب اِکْتَالَ کے ساتھ عَلٰی کا صلہ آئے تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَخَذْتُ مَا عَلَیْہِ کَیْلًا کہ جو کچھ میرا اُس کے ذمہ تھا وہ میں نے اُس سے وزن کر کے لے لیا۔ فرّاء جو مشہور نحوی ہے اُس نے یہ تشریح کی ہے اور کہا ہے کہ عَلٰی کے صلہ کے ساتھ جب اِکْتَالَ کا لفظ آئے تو اس کے معنے اَخَذْتُ مَا عَلَیْہِ کَیْلًا کے ہوتے ہیں یعنی میں نے اس سے وہ چیز جو اس کے ذمہ تھی لے لی۔ لیکن اگر اِکْتَلْتُ مِنْہُ کہا جائے تو اس کے معنے اِسْتَوْفَیْتُ مِنْہُ کَیْلًا کے ہوتے ہیں کہ مَیں نے ماپ کر اس سے پورا پورا لے لیا یعنی زور پورا لینے پر ہوتا ہے (روح المعانی زیر آیت ھذا) گویا عَلٰی کے صلہ میں تو یہ مراد لی گئی ہے کہ جو کچھ دوسرے کے ذمہ ہو اس سے لے لیا جائے یعنی لے لینے پر زور ہوتا ہے اور مِنْ کے صلہ کے ساتھ اس لفظ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ ماپ کر اس سے پورا پورا لے لیا یعنی پورا پورا لینے پر زور ہوتا ہے۔ غرض اس آیت میں اس امر پر زور ہے کہ وہ لوگ حق لے کر اور اپنے اندازہ کے مطابق پورا لے کر چھوڑتے ہیں بات یہ ہے کہ ایک حق کا لینا تو اس طرح ہوتا ہے کہ دوسرے شخص سے ہم گفتگو کرتے ہیں اُس کے دلائل سنتے ہیں اور پھر باہمی مشورہ سے فیصلہ کرتے ہیں کہ اس کا اتنا حق بنتا ہے لیکن ایک زبردستی کا حق ہوتا ہے کہ دوسرے کو تحکمانہ طور پر کہا جائے کہ میرے نزدیک تمھارے ذمہ یہ حق نکلتا ہے اور اب تم سے میں اس حق کو لے کر رہوں گا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ یہ عیسائی لوگ ایسے ہوں گے کہ دوسروں سے کہیں جو کچھ ہم تم سے مانگتے ہیں وہ ہمیں دے دو پیمانہ اُن کے اپنے ہاتھ میں ہوگا۔ اپنے حق کے فیصلہ کا اختیار بھی اُن کے اپنے ہاتھ میں ہوگا اور وہ جو جی چاہے گا اپنا حق جتا کر دوسروں سے لے لیں گے اور پھر اصرار کر کے لیں گے گویا حق کی مقدار کی تعیین وہ دوسرے پر نہیں چھوڑیں گے بلکہ اس کی مقدار معین کرنے کا حق اپنے پاس رکھیں گے اور بجائے تراضئ فریقین سے ایک حق مقرر کرنے کے جو حق اپنے لئے خود مناسب سمجھیں گے وہ تجویز کر لیں گے مطلب یہ ہوا کہ رحم اور شفقت اُن میں بالکل نہیں ہوگی اور حق کے نام کے ماتحت ان کی کارروائیاں جبری اور ظالمانہ ہوں گی۔ اس تشریح کو سمجھ لینے کے بعد

اس اعتراض کا جواب دینا آسان ہو جاتا ہے جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ اس آیت میں ذم کا کوئی پہلو ہے ہی نہیں پھر وَیْلٌ کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ کہہ کر آگے یہ کہا گیا ہے کہ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وہ مطفّف جو لوگوں سے اپنا حق پورا پورا لیتے ہیں اُن کے لئے عذاب ہے حالانکہ اپنا حق لینا محلِ ذم نہیں ہے پھر اپنا حق لینے پر اُن کے لئے وَیْل جو کلمۂ عذاب ہے کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اعتراض اُن معنوں کے رو سے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں بالکل جاتا رہتا ہے۔ کیونکہ حق خود مقرر کرنے پر اصرار اور پھر حق لینے میں انتہائی سختی اور عدم رحم خود محلِ ذم ہے اور رحم اور شفقت جس قوم میں نہ ہو وہ وَیل کے نیچے ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں عَلٰی کا صلہ خلاف کے معنوں میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے پس اگر لوگوں کو ضرر اور نقصان پہنچانا اس کے مفہوم میں شامل سمجھا جائے تو یہ بھی محلِ ذم ہے۔ اس صورت میں الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ لوگوں سے تول کر لیتے ہیں ایسی صورت میں کہ اُن کو ضرر پہنچتا ہو۔ اس صورت میں بھی وَیل کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔

اس موقعہ پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اگر عَلٰی بمعنے خلاف اس جگہ استعمال ہوا ہے تو پھر یَسْتَوْفُوْنَ کے کیا معنے ہوئے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں استیفاء سے مراد استیفاء مطابق خواہش ہے نہ کہ استیفاء مطابق واقعہ۔ یہ نہیں کہ دوسرا اگر یہ سمجھتا ہو کہ میرے ذمہ دو سیر حق نکلتا ہے تو یہ دو سیر لے کر ہی راضی ہو جائیں گے بلکہ یہ اگر تین سیر لینا چاہیں گے تو تین سیر ہی لیں گے اس سے کم نہیں لیں گے۔ پس یہاں استیفاء سے مراد استیفاء مطابق واقعہ نہیں بلکہ استیفاء مطابق خواہش ہے گویا یَسْتَوْفُوْنَ کے معنے یہ ہیں یَسْتَوْفُوْنَ کَمَا یَشَآءُوْنَ یا یَسْتَوْفُوْنَ حَسْبَ مُطَالَبَتِهِمْ اور ان معنوں میں یَسْتَوْفُوْنَ کا مفہوم عَلٰی کے مفہوم کے خلاف نہیں پڑتا بلکہ عین مطابق ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ عَلٰی اِکْتَالُوْا کا صلہ ہی نہیں بلکہ عَلٰی یَسْتَوْفُوْنَ کا صلہ ہے اور مراد یہ ہے کہ ان کا استیفاء اپنے حق میں اور دوسروں کے خلاف ہوتا ہے یعنی ایسی صورت میں استیفاء کراتے ہیں جس کا اثر دوسروں کے خلاف پڑتا ہے اور اصل جملہ یہ ہے اِذَا اکْتَالُوْا یَسْتَوْفُوْنَ عَلَی النَّاسِ یعنی وہ لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہوئے اپنی خواہش کے مطابق پورا لیتے ہیں گویا اپنے حق میں تو استیفاء ہوتا ہے لیکن لوگوں کے خلاف ہوتا ہے۔

اکتال منہ اور اکتال علیہ میں فرق میں بتا چکا ہوں کہ لغت والوں نے لکھا ہے کہ اِکْتَالَ کا صلہ مِنْ اور عَلٰی دونوں طرح آتا ہے اور معنوں کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں لیکن مفسّرین نے اس پر بحث کی ہے کہ یہاں اِکْتَالُوْا عَلٰی کیوں آیا ہے اِکْتَالُوْا مِنْ کیوں نہیں آیا۔ مَیں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ فرّاء کے

نزدیک اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عَلٰی کا صلہ استعمال کیا ہے اور مِنْ کے صلہ کی بجائے یَسْتَوْفُوْنَ کا لفظ لے آیا ہے کیونکہ جب اِکْتَلْتُ مِنْہُ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں اِسْتَوْفَیْتُ مِنْہُ کَیْلًا۔ گویا اس کے نزدیک دونوں صلے استعمال ہو گئے ہیں۔ پس یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اِکْتَالُوْا عَلٰی کیوں آیا ہے اور اِکْتَالُوْا مِنْ کیوں نہیں آیا۔ یَسْتَوْفُوْنَ کا لفظ مِنْ کا قائم مقام ہے اور عَلٰی کا صلہ تو ظاہر ہی ہے۔ فراءؔ کی اس توجیہہ کے مطابق اعتراض کا جواب تو آ گیا لیکن یہ توجیہہ ہمیں قرآن کریم کے محاورہ کے خلاف نظر آتی ہے۔ قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عَلٰی اور مِنْ کے استعمال میں کچھ فرق ہے اور یہ درحقیقت الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں آتا ہے فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (یوسف:۶۴) ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دے کہ ہم تول کر لیں گے اور اس کی حفاظت بھی کریں گے۔ دوسری جگہ آتا ہے فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ (یوسف:۸۹) اے آقا ہمیں پورا پورا تول کر دے۔ جس سے ظاہر ہے کہ یوسف کے بھائیوں نے خود نہیں ماپا بلکہ دوسرے سے مپوایا۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام خود فرماتے ہیں اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْۤ اُوْفِی الْكَيْلَ (یوسف:۶۰) کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پورا پورا ماپ دیتا ہوں۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِکْتیال کرنے والے حضرت یوسف علیہ السلام تھے اور وہ غلّہ ماپ کر دیتے تھے بھائی ماپ نہیں کرتے تھے۔ مگر باوجود اس کے بھائی نَكْتَلْ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اِکْتَالَ کا لفظ جب بھی بولا جائے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس شخص نے آپ تولا یہ غلط ہے کیونکہ قرآن کریم میں آتا ہے فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دے کہ ہم اِکْتِیَال کریں گے مگر باوجود اس کے بھائی بھی مانتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام ہی ماپا کرتے تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام بھی کہتے ہیں کہ اَنِّیْۤ اُوْفِی الْكَيْلَ میں ماپ کر دوں گا جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ درحقیقت اِکْتَالَ مِنْہُ کا لفظ استعمال ہو تو اس کے دونوں معنے ہوتے ہیں خواہ خود ماپ کرے یا دوسرے سے کروائے اور جب اِکْتَالَ عَلَیْہِ ہو تو صرف خود ماپ کر لینے کے معنے ہوتے کیونکہ عَلٰی کا صلہ خلاف کے معنے دیتا ہے۔

وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّ زَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ؕ۴

اور جب (کسی چیز کو) اُنہیں تول کر یا وزن کر کے دیتے ہیں تو تھوڑا دیتے ہیں۔

حَلّ لُغَات۔ كَالُوْهُمْ كَالُوْا كَالَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے کہتے ہیں كَالَ الطَّعَامَ وَغَيْرَهٗ وَ اَكْثَرُ اِسْتِعْمَالِهٖ فِي الطَّعَامِ یعنی كَالَ کا لفظ بالعموم کھانے کی اشیاء کے ماپنے اور تولنے پر بولا جاتا ہے لیکن غیر کے لئے بھی استعمال کر لیتے ہیں نیز اس کے معنے ہیں حَقَّقَ كَمِيَّتَهٗ اَوْمِقْدَارَهٗ بِوَاسَطَةِ الْتِ مُعَدَّةٍ لِذَالِكَ كَالصَّاعِ وَالْاِرْدَبِّ وَالذِّرَاعِ وَنَحْوَ ذَالِكَ (اقرب) کسی چیز کی کمیّت یا اُس کی مقدار اس آلہ کے ذریعہ سے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا ہو معلوم کرنا جیسے ہمارے ہاں ایک خاص پیمانہ کو ٹوپہ کہتے ہیں اور اس کے ذریعہ ماپ کر چیزیں لیتے دیتے ہیں یا عرب میں صاع ہوا کرتا تھا اسی طرح سیروں کے ذریعہ کسی چیز کا وزن کرنا اور کہنا کہ فلاں چیز اتنے سیر ہے یا گز کے ذریعہ کسی چیز کو ماپنا۔ سب کے لئے كَالَ کا لفظ استعمال ہوتا ہے گویا كَالَ کے لفظ کے معنے یہ ہیں کہ اندازہ کے لئے جو چیز مناسب حال مقرر ہو اُس سے کوئی چیز لینا۔ اگر وزن کی چیز ہے تو باٹوں کے ذریعہ وزن کر کے لینا۔ اگر پیمانہ کے ذریعہ ماپنے والی چیز ہے تو پیمانہ سے ماپ کر لینا اور اگر گز سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہو تو گز سے اندازہ کر کے لینا۔ پس كَالَ میں تینوں چیزیں شامل ہیں صاعؔ سے ماپنا۔ باٹوںؔ سے وزن کرنا اور گزؔ وغیرہ سے اندازہ کرنا۔ مگر چونکہ قرآن کریم نے كَالُوْهُمْ کے بعد اَوْوَّزَنُوْهُمْ کے الفاظ بھی استعمال فرمائے ہیں اس لئے ہمیں وزن کو الگ رکھنا پڑے گا اور كَالُوْهُمْ میں صرف صاع کے ذریعہ یا گز کے ذریعہ جو اندازہ لگایا جاتا ہے اسی کو شامل سمجھنا پڑے گا۔ اگر قرآن کریم اَوْوَّزَنُوْهُمْ کے الفاظ زائد نہ کرتا تو كَالُوْهُمْ میں وزن بھی شامل ہوتا۔ جیسا کہ لُغت والوں نے وزن کو بھی اس میں شامل کیا ہے مگر چونکہ وزن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے الگ کر دیا ہے اس لئے كَالُوْهُمْ میں صرف دو چیزیں رہ جائیں گی۔ صاع کے ذریعہ ماپنا یا ذراع کے ذریعہ ماپنا۔ اسی طرح لُغت والے لکھتے ہیں وَقَدْ يَتَعَدّٰى اِلٰى مَفْعُوْلَيْنِ فَيُقَالُ كِلْتُ لِزَيْدٍنِ الطَّعَامَ (اقرب) یعنی کبھی اس کے دو مفعول بھی آجاتے ہیں جیسے کہتے ہیں میں نے زید کو غلّہ اندازہ کر کے دیا۔ اور کبھی مفعولِ اوّل پر لام بھی آجاتا ہے چنانچہ کہتے ہیں كِلْتُ لِزَيْدٍنِ الطَّعَامَ یہ لفظ وزن کے لئے بھی استعمال ہوجاتا ہے جیسے کہتے ہیں كَالَ الصَّيْرَفُ الدَّرَاهِمَ اَيْ وَزَنَهَا (اقرب) صرّاف نے درہم تول کر دئے۔ پھر كَالَ کا لفظ اس سے بھی وسیع معنوں میں استعمال ہوجاتا ہے کہتے ہیں كَالَ الشَّيْءَ بِالشَّيْءِ: قَاسَهٗ کسی چیز کو کسی چیز پر قیاس کیا۔ نیز کہتے ہیں كِلْتُ فُلَانًا بِفُلَانٍ اَيْ قِسْتُهٗ

بِہٖ یعنی میں نے اس شخص پر فلاں شخص کا اندازہ اور قیاس کیا اور کہتے ہیں کَالَ الْفَرَسُ بِغَیْرِہٖ: قَاسَہٗ بِہٖ فِی الْجَرْیِ (اقرب) یعنی گھوڑا دیکھا۔ اس کی دَوڑ دیکھی اَور پھر قیاس کِیا کہ فلاں گھوڑا زیادہ اچھا ہے کیونکہ اس کی دوڑ اچھی ہے اور فلاں گھوڑا کمزور ہے کیونکہ اس کی دوڑ خراب ہے، گویا ظاہری ماپ تول کے علاوہ باطنی اندازہ بھی اس سے استعارۃً مراد لے سکتے ہیں۔

تفسیر۔ مسیحی اقوام کا وزن اور کیل میں غیر اقوام کو لوٹنا اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ بیان فرماتا ہے کہ جب یہ کسی قوم کو ماپ کر دیتے ہیں یا اسے وزن کر کے دیتے ہیں تو اس میں ہمیشہ دوسرے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یعنی ظاہری شکل ماپ اور تول کی ہوگی اور وہ دوسرے کو یہی دکھائیں گے کہ ہم تمہیں جو کچھ دے رہے ہیں۔ ماپ تول کر دے رہے ہیں اور اندازہ کے مطابق بالکل صحیح صحیح دے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسروں کو نقصان ہوگا اور اِن کو فائدہ ہوگا۔

یہ خرابی ایسی ہے جو خصوصیت کے ساتھ مسیحیوں میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ وزن کو لیں تب بھی یہ قوم دوسروں کو لوٹتی ہے اور کیل کو لیں تب بھی یہ قوم دوسروں کو لوٹتی ہے اس قوم کو بڑا غلبہ تجارت سے حاصل ہوا ہے اور تجارت میں یہ لوگ حد درجہ کی چالاکی اور ہوشیاری سے کام لیتے ہیں۔ جہاں تک انفرادی تجارت کا سوال ہے یوروپین لوگوں میں سے سو میں سے ایک بھی دھوکا نہیں کرے گا بلکہ ہزار میں سے ایک بھی دھوکا نہیں کرے گا۔ اس کے مقابلہ میں ایشائی لوگوں کی یہ حالت ہے کہ سو میں سے ننانوے دھوکا کریں گے بلکہ ننانوے کیا سو میں سے سو ہی دھوکا باز ہوں گے۔ ہزار میں سے ایک شاید کوئی ایسا نکل آئے جو انفرادی تجارت میں دھوکا بازی نہ کرے لیکن بالعموم ایشائی اس پہلو میں نہایت بُرا نمونہ دکھاتے ہیں۔ اگر چیز کو تولتے ہوئے وہ تھوڑی سی بے ایمانی نہ کرلیں اور دوسرے کو کسی قدر کم چیز نہ دیں تو ان کا دل دھڑکنے لگ جاتا ہے اور وہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح ڈنڈی مار کر ہم کچھ فائدہ اٹھا لیں۔ پس جہاں تک انفرادی تجارت کا سوال ہے یوروپین لوگوں کا نمونہ اس بارہ میں نہایت اعلیٰ ہے مگر جب قومی تجارت کا سوال آجائے تو یہ قوم اتنی لوٹ کرتی ہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں ایسے کئی واقعات ہیں کہ انہوں نے کروڑوں کروڑ روپیہ کا سامان اور توپیں وغیرہ غیر ملکوں کو بنا کر دئے۔ مگر نہ وہ توپیں اچھی تھیں نہ وہ جہاز اچھے تھے نہ وہ سامان اچھا تھا۔ بالکل ردّی اور گندہ سامان انہوں نے بھجوادیا اور کروڑوں کروڑ روپیہ وصول کرلیا۔ بے شک خوردہ فروشی میں ان کی دیانت سے کوئی لگّا نہیں کھا سکتا۔ لیکن جہاں بڑی تجارت کا سوال آجائے وہاں اس قدر لُوٹ مچاتے ہیں کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ ملکوں کے ملک غارت کر جاتے ہیں اور تجارت میں پالیٹکس کو شامل کر دیتے ہیں۔ پس

درحقیقت وہ تجارت نہیں ہوتی بلکہ ایک رنگ کی سیاست ہوتی ہے جس کے ذریعہ یہ دوسرے ملک پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔

فرض کرو الف اور باء دو یوروپین قومیں ہیں اور ان کی آپس میں دشمنی ہے الف سمجھتا ہے کہ اگر میری باء سے لڑائی ہوگئی تو ج اس لڑائی میں ضرور باء کی طرف سے شامل ہوگا لیکن اسے سامان جنگ کے لئے ہماری امداد کی ضرورت ہے جب ایسی صورت پیدا ہو تو الف۔ ج کے لئے سامانِ جنگ کے ریٹ گرا دے گا اور اس کے لئے سامان جنگ تیار کرنے پر آمادگی ظاہر کرے گا مگر کوئی چیز وقت پر تیار کر کے نہیں دے گا۔ یہاں تک کہ لڑائی کا وقت آجائے گا اور ج سامان نہ ہونے کی وجہ سے یا باء کی مدد نہ کر سکے گا یا دشمن کے ہاتھوں پیسا جائے گا۔

تو جہاں تک بڑی تجارتوں کا سوال ہے یا قومی تجارتوں کا سوال ہے یہ قوم خطرناک تطفیف کرتی ہے۔ اور اس سورۃ میں ان کی اسی خرابی کا ذکر کیا گیا ہے۔

کَیل کے ساتھ لفظ وزن کا اضافہ کرنے کی وجہ یہاں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ پہلے فرمایا تھا الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ مگر اس کے بعد وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّ زَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ فرمایا ہے۔ یعنی کَیل کے ساتھ وزن کے لفظ کا اضافہ کر دیا ہے۔ حالانکہ جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کَیل کے لفظ میں ماپ تول وغیرہ سب شامل ہے۔ اگر تو کَیل کے وہی معنے لئے جائیں جو لغت میں آتے ہیں تو اس صورت میں كَالُوْهُمْ کے بعد اَوْ وَّ زَنُوْهُمْ کے لفظ کی زیادتی کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ کَیل کے معنوں میں ہی وزن کے معنے شامل ہیں۔ اور اگر یہ توجیہ کی جائے کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے کَالَ کے زیادہ معروف معنوں کو لیا ہے جو ماپنے کے ہیں تو پھر یہ اعتراض پڑتا ہے کہ اس صورت میں پہلی آیت میں بھی وزن کا لفظ بڑھانا چاہیے تھا مگر وہاں یہ لفظ نہیں رکھا گیا۔ خلاصہ یہ کہ یا تو پہلی آیت میں یوں کہا جاتا اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا وَاتَّزَنُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ یا پھر دوسری آیت یوں ہوتی کہ وَاِذَا كَالُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ۔

زجاج نے یہ سوال اٹھا کر اتنا جواب دیا ہے کہ چونکہ کَیل اور وزن معنوں میں مقاربت اور مشارکت رکھتے ہیں اس لئے ایک کو بیان کر کے دوسرے کو چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ ذہن خود اس کا اندازہ کر لیتا ہے پس پہلی آیت سے بھی مراد یہ ہے کہ اِكْتَالُوْا وَاتَّزَنُوْا گویا دو قریب المعنیٰ الفاظ میں صرف ایک پر حصر کر لیا گیا ہے۔ یہ جواب ایک حد تک درست ہے اور قرآن کریم میں اس قسم کی اَور بھی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ جہاں دو الفاظ اپنے معنوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے قرابت اور اتصال رکھتے ہوں وہاں ایک کو بیان کر دیا جاتا ہے اور دوسرے کا ذِکر چھوڑ دیا

جاتا ہے مثلاً گرمی سردی کا اکٹھا ذکر کرنا ہو تو خالی گرمی یا خالی سردی کا ذکر کر دیا جائے گا۔ یا سورج چاند کا اکٹھا ذکر کرنا ہو تو صرف سورج کا ذکر کر دیا جائے گا اور چاند کا ذکر اسی میں شامل سمجھ لیا جائے گا۔

مفسرین کی اس بات پر بحث کہ كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ میں کیل کے ساتھ وزن کے لفظ کا کیوں اضافہ کیا گیا ہے پس یہ صحیح ہے کہ دو قرابت رکھنے والے الفاظ میں سے بعض دفعہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے پر حصر کر لیا جاتا ہے لیکن اس جواب سے تسلی نہیں ہوتی۔ کیونکہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر دوسری آیت میں كَالُوْهُمْ کے ساتھ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ کیوں بڑھایا گیا وہاں بھی کیل کے ذکر پر ہی کفایت کی جاتی اور وزن کا ذکر ساتھ نہ کیا جاتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کیل میں نقصان کا خطرہ بہت کم ہوتا ہے لیکن وزن میں نقصان کا خطرہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں چیزیں ماپنے کے لئے ٹوپہ ہوتا ہے یا بعض لوگوں نے آدھ آدھ سیر یا پاؤ پاؤ وزن کے گلاس رکھے ہوئے ہوتے ہیں یا بعض گڈویاں ایسی ہوتی ہیں جن میں معیّن اندازہ کی چیز آ جاتی ہے۔ ایسے اندازہ کے جو برتن ہوتے ہیں خواہ ٹوپہ ہو یا گلاس یا گڈویاں ہوں ان میں کمی صرف ایسی ہی ہو سکتی ہے جو نظری ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ سیر میں سے پاؤ کم ہو جائے۔ اِتنا تو ہو سکتا ہے کہ ماپتے وقت ذرا سے کنارے نیچے رہ جائیں مگر اس سے زیادہ کمی نہیں آ سکتی لیکن وزن میں بڑی بھاری کمی کی جا سکتی ہے اور ڈنڈی مارنے کا فن ایسا ہے کہ سیر کی جگہ بعض دفعہ تین تین پاؤ چیز رہ جاتی ہے اور لینے والے کو بھی معلوم بھی نہیں ہوتا کہ میرے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے لیکن صاع میں یا ٹوپہ میں یا پڑوپی میں سیر میں پاؤ کا فرق کبھی نہیں پڑے گا پس چونکہ وزن میں بہت زیادہ نقصان ہو سکتا ہے اس لئے جہاں لینے کا سوال تھا وہاں صرف اِکْتَالَ کا لفظ استعمال کر دیا اور بتا دیا کہ جب وہ ماپ کے ذریعہ لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اس میں آپ ہی یہ مضمون بھی آ گیا کہ جو لوگ تھوڑا نقصان برداشت نہیں کر سکتے وہ بڑا نقصان کب برداشت کر سکتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ کہ وہ لوگ ایسے ہیں کہ جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں تو اس سے آپ ہی یہ نتیجہ نکل آیا کہ جو لوگ کم نقصان بھی جو ماپ سے تعلق رکھتا ہے برداشت نہیں کر سکتے وہ بڑا نقصان تو کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر اِکْتَال کے بالمقابل جب كَالُوْهُمْ کہا تو تھوڑا دینے کے لفظ سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ زیادہ بھی لوٹ لیتے ہیں کیونکہ اگر کوئی شخص چھوٹا نقصان پہنچائے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ وہ بڑا نقصان بھی پہنچا سکتا ہے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص چھوٹا گناہ کر لے مگر جب بڑا گناہ آئے تو اس سے ڈر جائے پس چونکہ كَالُوْا کا لفظ اصل حقیقت پر پوری طرح روشنی نہیں ڈالتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ہی اَوْ وَّزَنُوْهُمْ کا لفظ استعمال کر کے بتا دیا کہ جہاں تھوڑا

نقصان پہنچا سکیں وہاں تھوڑا نقصان پہنچاتے ہیں اور جہاں بس چلے وہاں زیادہ نقصان پہنچا دیتے ہیں۔

پس اَلَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ۔ وَ اِذَا کَالُوۡہُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡہُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ کے معنے یہ ہوئے کہ جب انہوں نے لوگوں سے اپنا کوئی حق لینا ہوتا ہے تو چھوٹا نقصان نہیں اٹھاتے لیکن جب دینے کا سوال آئے تو اگر چھوٹا نقصان پہنچا سکیں تو چھوٹا نقصان پہنچا دیتے ہیں اور اگر بڑا نقصان پہنچا سکیں تو بڑا نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ پس ان معانی کی جو فطرتی ترتیب ہے اُس کے لحاظ سے اِکۡتَالُوۡا کے بعد اِتَّزَنُوۡا کا حذف مطابق بلاغت تھا لیکن کَالُوۡہُمۡ کے بعد وَزَنُوۡا کا لفظ حذف کرنا خلاف اصولِ بلاغت تھا۔

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّہُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ۙ﴿۶﴾

کیا یہ (لوگ) یقین نہیں کرتے کہ وہ اٹھائے جائیں گے اس عظیم الشان وقت (کا فیصلہ دیکھنے) کے لئے

تفسیر۔ فرماتا ہے اب تو یہ قومیں ایک دائرہ میں بیٹھی ہوئی ہیں اور یوں سمجھتی ہیں کہ دُنیا کی کوئی طاقت اُن کا کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتی۔ لیکن ایک دن آئے گا جب ایک دوسری قسم کا بعث ہوگا۔

لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ سے مراد۔ لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ سے قیامت بھی مراد ہوسکتی ہے اور وہ دن بھی اس سے مراد ہوسکتا ہے جب موجودہ دَور کا نتیجہ نکلے گا۔ درحقیقت ہر قوم کا الگ الگ دَور ہوتا ہے اور ہر دَور کی الگ الگ قیامت ہوتی ہے بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ سے مراد لِحِسَابِ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ہے یعنی یوم عظیم کے حساب کے لئے۔

یَّوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ؕ﴿۷﴾

جس وقت (تمام) لوگ سب جہانوں کے رب (کا فیصلہ سننے) کے لئے کھڑے ہوں گے۔

تفسیر۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس نے ترقی کی ہو اور پھر اس پر ایک محاسبہ کا دن نہ آیا ہو مگر عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح افراد کو اپنی موت بھولی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح اقوام اپنی موت کے دن سے غافل اور بے پرواہ ہوتی ہیں دنیا میں سب سے زیادہ یقینی اور قطعی چیز اگر کوئی ہے تو وہ موت ہے مگر موت ہی انسان کو سب سے زیادہ بھولی ہوئی ہوتی ہے ہر شخص جانتا ہے کہ اُس کا باپ مرا۔ اُس کا دادا مرا۔ اُس کا پڑدادا مرا ہر شخص جانتا ہے کہ اُس کا فلاں فلاں رشتہ دار مر چکا ہے اور جو باقی ہیں وہ بھی ایک دن مر جائیں گے مگر پھر سب سے زیادہ اگر کسی چیز سے وہ

غافل ہوتا ہے تو وہ موت ہی ہے۔ اسی طرح یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کی ہر قوم مر چکی ہے اور جو قومیں آج موجود ہیں وہ بھی ایک دن مر جائیں گی مگر قومیں سب سے زیادہ اس موت سے غافل رہتی ہیں۔ قرآن کریم نے اس امر پر بڑا زور دیا ہے اور بار بار فرمایا ہے کہ بتاؤ کہ کیا کوئی قوم ایسی بھی ہے جو موت سے بچی ہو۔ تاریخی لحاظ سے اگر تحقیق کی جائے تو ایک ہزار سے کم اُن اقوام کی تعداد نہیں نکلے گی جنہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں دنیا پر اس قدر غلبہ پایا کہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ان قوموں نے میدان کو جیت لیا ہے اور اُن فاتح اقوام نے بھی اپنے غرور میں یہ خیال کرنا شروع کر دیا کہ گزشتہ قومیں تو مر گئیں۔ عروج کے بعد زوال سے ہمکنار ہو گئیں۔ عزت کے بعد ذلّت کے گڑھے میں گر گئیں مگر ہم اس ترقی کے بعد مر نہیں سکتیں مگر آخر وہ وقت آیا جب وہ فاتح اقوام بھی مٹ گئیں وہ بھی تباہ اور برباد ہو گئیں اور اُن کا نام بھی دنیا سے ناپید ہو گیا۔

مسیحی اقوام کا اپنی موت سے غافل ہونا پس فرماتا ہے یہ مغربی اقوام جنہوں نے ظلم پر اپنی کمر باندھی ہوئی ہے جو دنیا پر آفت ڈھا رہے ہیں اور جو لوگوں کے حقوق کو دباتے چلے جا رہے ہیں اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ۔ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ کیا اُن کو کبھی خیال نہیں آتا کہ ہمارا ایک اور بعث بھی ہونے والا ہے اُس بڑے دن کے لئے جس دن وُہ رب العالمین خدا کے سامنے پیش ہوں گے اور خُدا اُن سے کہے گا کہ کیا ایشیائی میرے بندے نہیں تھے۔ کیا افریقن میرے بندے نہیں تھے۔ پھر تم نے کیا کِیا کہ اُن سے ظالمانہ سلوک روا رکھا؟ جب یہ یوم البعث آئے گا تو رب العالمین خدا ان کو نیچے کر دے گا اور جو نیچے ہوں گے اُن کو اوپر کر دے گا اسی کی طرف بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ (العٰدیٰت:۱۰) میں اشارہ کیا گیا ہے۔ بَعْثَرَ کے معنے ہوتے ہیں زمین کو اُلٹ دینا اُوپر کی چیز کو نیچے اور نیچے کی چیز کو اوپر کر دینا۔ اللہ تعالیٰ بھی اُس دن ایسا ہی کرے گا کہ ان حاکم اقوام کو تختِ حکومت سے محروم کر دے گا۔ اور اُن لوگوں کو جنہیں یہ ذلیل قرار دیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ حکومت کے تخت پر بٹھا دے گا۔

غالب اقوام کا مغلوب ہو جانا درحقیقت قوموں کی ترقی اور اُن کا تنزل ایک دَوری کیفیت رکھتا ہے۔ جس طرح بچے آپس میں کُشتی کرتے ہیں تو ایک بچہ دوسرے کو گرا کر اُس کے سینہ پر چڑھ جاتا ہے۔ ماں باپ یہ نظّارہ دیکھتے رہتے ہیں آخر جب دیکھتے ہیں کہ اُوپر والا اُترتا نہیں تو اُس کی ٹانگ گھسیٹ کر کھینچ لیتے ہیں اور پھر دوسرا بچہ اس کے سینہ پر چڑھ جاتا ہے۔ یہی حال قوموں کا ہے اللہ تعالیٰ جب دیکھتا ہے کہ ایک قوم اپنے غلبہ سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے تو اُسے گھسیٹ کر حکومت کے تخت سے اُتار لیتا ہے اور محکوم قوموں کے ہاتھ میں بادشاہت کی باگ دوڑ دے دیتا ہے۔ دُنیا میں قوموں کے بڑے بڑے لمبے غلبے ہوئے ہیں۔ عیسائیت کا غلبہ تو صرف تین سو سال ہے۔

مسلمانوں کا ہزار سال تک غلبہ رہا مگر وہ بھی مٹ گیا۔ پس فرماتا ہے کیا ان کے دلوں میں یہ کبھی خیال نہیں آتا کہ ہمارا بھی ایک بعث ہوگا۔ ہم پر بھی وہ دن آنے والا ہے جو ہمارے محاسبہ کا دن ہوگا بعث کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ نتیجہ کے دن صرف قوم کے موجود افراد کے اعمال کا ہی نتیجہ نہیں نکلتا بلکہ اُن کے آباء کے اعمال کا نتیجہ بھی نکلتا ہے جب ایک قوم دوسری قوم کے خلاف اُٹھتی ہے تو صرف زندہ لوگوں کے اعمال کا محاسبہ نہیں لیتی بلکہ اُن کے آباء کے سلوک کا بدلہ بھی لیتی ہے۔ اس طرح گویا قوم کے سب افراد زندہ ہو کر اپنا حساب پیش کرتے ہیں۔

يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں درحقیقت يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اب تو یہ مشرقی اور مغربی۔ گورے اور کالے۔ یوروپین اور ایشیائی میں فرق کرتے ہیں مگر ایک دن آئے گا جب یہ لوگ اُس خدا کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے جو رب العالمین ہے۔ وہ اس وقت ان لوگوں سے ان مظالم کے بارہ میں باز پُرس کرے گا اور کہے گا کہ کیوں تم نے ایک طبقہ کو ذلیل کیا۔ اور کیوں اُس کو محکوم و مغلوب رکھا۔ آخر خدا کسی ایک قوم کا نہیں بلکہ وہ رب العالمین ہے۔ وہ ایشیائیوں کا بھی خدا ہے اور افریقنوں کا بھی خدا ہے اور چینیوں کا بھی خدا ہے اور جاپانیوں کا بھی خدا ہے اور انگریزوں کا بھی خدا ہے اور امریکنوں کا بھی خدا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو اُسی کے ماتحت دیکھ کر خوش ہوسکتا ہے جو رب العالمین کی صفت اپنے اندر لے لے اور اُس کی ربوبیت کا کامل مظہر بن جائے۔ عارضی حکومتیں دنیا میں بے شک ہوتی چلی آئی ہیں اور وہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد مٹتی بھی رہی ہیں۔ لیکن مستقل طور پر وہی قوم دنیا پر حکومت کرسکتی ہے جو لوگوں سے زائد حقوق نہ مانگے۔ اور اُن سے کہے کہ یہ ہماری نہیں بلکہ تمہاری حکومت ہے۔ جو قوم دُنیا میں بنی نوع انسان کی خدمت کا احساس لے کر کھڑی ہوگی اور پھر زائد حقوق مانگنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوگی وہ ہمیشہ رہے گی۔ اُس کے خلاف لوگوں کو بغاوت کرنے کی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آسکتی۔

خدا تعالیٰ کے حساب لینے سے مراد خدا تعالیٰ کے حساب لینے کے یہ معنے نہیں کہ وہ خود براہ راست حساب لے۔ قیامت کے دن وہ خود حساب لے گا اور اس دنیا میں وہ انسانوں میں سے ہی کسی فرد یا قوم کو حساب لینے کے لئے کھڑا کر دیتا ہے اس قوم کا حساب لینا خدا تعالیٰ کا حساب لینا ہی کہلاتا ہے۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝۸ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا

ایسا نہیں (جو یہ سمجھتے ہیں) بدکاروں (کی جزا) کا حکم یقیناً سجّین میں ہے اور تجھے کس نے بتایا ہے کہ سجین کیا ہے۔

سِجِّيْنٌ ۝۹ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝۱۰

وہ ایسا حکم ہے جس (کے اٹل ہونے) پر مُہر لگائی گئی ہے۔

حَلِّ لُغَات۔ سِجِّيْنٌ سِجِّيْنٌ کے لغت میں دو معنے لکھے ہیں (۱) اَلدَّائِمُ (۲) اَلشَّدِيْدُ (اقرب) یعنی سجّین کے لفظ کے معانی عربی زبان میں دائم اور شدید کے ہوتے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں اس لفظ کے کوئی بھی معنے نہیں ہیں کیونکہ یہ عربی لفظ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں اصل میں سجّین کا نون۔ لام سے بدلہ ہوا ہے اور یہ لفظ سجل سے نکلا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (الانبیاء:۱۰۵) اس صورت میں اس کے معنے تحریر کرنے کے ہیں اور یا پھر یہ لفظ سِجِّيْل بمعنی اَن گھڑے پتھر کے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ (الفیل:۵) لیکن یہ استدلال درست نہیں اس لئے کہ سجّین کے معانے فرآء اور زجاجؔ اور ابوعبیدہؔ نے کئے ہیں اور یہ لوگ علم ادب میں بہت بلند مرتبہ رکھنے والے تھے یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ ایک لفظ عربی زبان کا تو نہ ہو اور وہ اس کے معنے کرنے لگ جاتے۔ اپنے معنوں کی تائید میں انہوں نے بعض اشعار بھی نقل کئے ہیں (روح المعانی) جن میں سجّین کا لفظ پُرانے شعراء نے استعمال کیا ہے پھر جب ہم ذاتی طور پر غور کرتے ہیں تو ہمیں عربی زبان میں اس لفظ کے اَور مادے بھی مل جاتے ہیں مثلاً سَجَنَهٗ سَجْنًا کے معنے ہوتے ہیں حَبَسَهٗ فِي سِجْنٍ اس کو قید خانہ میں بند کر دیا۔ اور سَجَنَ الْهَمَّ کے معنی ہوتے ہیں اَضْمَرَهٗ اس نے اپنے غم کو چھپا لیا۔ (اقرب) پس جب کہ اس لفظ کے دوسرے مادے عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں اور جب کہ عربی زبان کے ماہرین نے اس کے معنے دائم اور شدید کے کئے ہیں تو یہ خیال کر لینا کہ یہ لفظ عربی زبان کا نہیں بلکہ کسی اَور زبان کا ہے جسے عربی زبان میں شامل کر لیا گیا ہے قطعاً غلط اور بے بنیاد بات ہے۔

درحقیقت یہ ایک غلطی ہے جو بعض عرب مفسّروں کو لگی ہے۔ جب وہ ایک لفظ کو جو عام طور پر عربی میں استعمال نہیں ہوتا دیکھتے ہیں تو فوراً یہ خیال کر لیتے ہیں کہ یہ عربی کا لفظ نہیں حالانکہ دوسرے ماہرین لغت اسے عربی کا لفظ قرار دیتے ہیں۔ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر آج کل کے عیسائی ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ اعتراض کرتے

رہتے ہیں کہ قرآن کریم میں غیر زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور غیر زبانوں کے الفاظ کی وجہ سے وہ نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ قرآن کریم کے متعلق جو یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ میں نازل کیا گیا ہے یہ غلط ہے حالانکہ اگر ان مفسرین کی بات کو جو کہتے ہیں کہ قرآن کریم کا فلاں فلاں لفظ عربی نہیں تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی یہ اعتراض عقل کے بالکل خلاف ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں غیر زبان کا کوئی لفظ نہ پایا جاتا ہو۔ دو چار فقرے کہہ لینا اَور بات ہے، مگر متمدن زمانہ کی کوئی بڑی تحریر ایسی نہیں ہوسکتی جس میں غیر زبان کا کوئی لفظ نہ آئے۔ بائبل میں بھی غیر زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔ ویدوں پر بھی یہ اعتراض عائد ہوتا ہے کہ اس میں غیر زبانوں کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ صرف ایک شخص ایسا گزرا ہے جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ میں اپنی کتاب میں غیر زبان کے الفاظ استعمال نہیں کروں گا۔ اور اس نے اپنے دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بڑا زور لگایا وہ بڑا بھاری ادیب تھا اور بڑا مشہور عالم تھا۔ مگر وہ بھی اس دعویٰ میں پورا نہیں اترا اور اِسے بیسیوں غیر زبان کے الفاظ اپنی کتاب میں استعمال کرنے پڑے۔ میری مراد فردوسیؔ سے ہے اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ مَیں پہلوی زبان میں شاہنامہ لکھوں گا۔ مگر شاہنامہؔ میں بیسیوں الفاظ غیر زبانوں کے پائے جاتے ہیں۔ بعض عربی کے ہیں بعض تازہ فارسی کے ہیں اور بعض دوسری زبانوں کے ہیں۔

مختلف زبانوں میں غیر زبانوں کے الفاظ درحقیقت کوئی متمدن زبان ہو ہی نہیں سکتی جس میں آپس کے میل جول کی وجہ سے دوسری زبانوں کے الفاظ داخل نہ ہو جائیں اور بعض دفعہ تو چسکا پیدا ہو جاتا ہے کہ فلاں زبان کا یہ لفظ ہم اپنی زبان میں ضرور شامل کر لیں اور اس طرح رفتہ رفتہ وہ لفظ زبان میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً انگریزی زبان میں پکّا کا لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے حالانکہ یہ اُردو زبان کا لفظ ہے مگر آپس کے میل جول کی وجہ سے یہ لفظ انگریزوں کو ایسا پسند آیا کہ انہوں نے اسے اپنی زبان میں شامل کر لیا یہاں تک کہ انگریزی لغت کی کتابوں میں بھی پکا کا لفظ درج ہوتا ہے اور اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہوتا ہے کہ یہ اردو زبان کا لفظ ہے جو انگریزی زبان میں آ گیا ہے۔ اسی طرح بکواسؔ کا لفظ ہے جو انگریزوں کو پسند آ گیا۔ چنانچہ بہت سے انگریز جب دوسرے پر ناراض ہوتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں do not buck یعنی بکواس مت کرو۔ یہ بک کا لفظ بھی اردو سے ہی انگریزی میں منتقل ہوا ہے۔ اِسی طرح اور سینکڑوں الفاظ ہیں جو عربی یا اردو سے لے کر انگریزی زبان میں شامل کر لئے گئے ہیں مثلاً ایڈمرل Admiral کا لفظ انگریزی میں استعمال ہوتا ہے جو امیر البحر سے بگڑا ہوا ہے ایڈمرل امیر البحر کو کہا جاتا ہے انگریزوں نے الامیر کا لفظ رہنے دیا اور بحر کو چھوڑ دیا۔ تو یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر زبان کے الفاظ دوسری

زبانوں میں استعمال ہوتے رہتے ہیں مگر اس وجہ سے ان الفاظ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس دوسری زبان کے لفظ ہی نہیں ہیں۔ وہ کثرت استعمال کی وجہ سے دوسری زبان کا جزو بن جاتے ہیں اور اسی زبان کا لفظ سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً اردو میں اگر متداول اور رائج العام لفظ انگریزی کا بولا جائے تو یہی کہیں گے کہ اس لفظ کا بولنے والا فصیح اردو بول رہا ہے یہ نہ کہیں گے کہ انگریزی الفاظ کی وجہ سے اس کی اردو خراب ہوگئی ہے۔ ہاں کثرت سے اور غیر مروج الفاظ کا استعمال ہو تو وہ قابل اعتراض ہوتا ہے۔ عربی زبان کے اُم الاَلسنہ ہونے کی وجہ سے اس کے الفاظ کثرت سے غیر زبانوں میں پائے جاتے ہیں لیکن اس کے علاوہ آپس کے میل جول کی وجہ سے بھی ہر زبان میں دوسری زبان کے الفاظ آجاتے ہیں اور عربی زبان اس سے مستثنٰی نہیں ہوسکتی۔ اور اگر ایسا لفظ عربی زبان میں پایا جائے تو اس کا استعمال غیر فصیح نہ ہوگا نہ اس کلام کو جس میں وہ پایا جائے وہ غیر عربی بنا دے گا۔

شیکسپیئر مشہور انگریز ادیب ہے اس کی کتب میں بھی بہت سے فرانسیسی زبان کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں مگر اس کی وجہ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شیکسپیئر کی کتب غیر فصیح انگریزی میں ہیں۔ اسی طرح اگر قرآن کریم کسی غیر زبان کا لفظ لے آئے۔ جو عربوں میں استعمال ہو چکا ہو اور عربوں نے اس کو پسند کر لیا ہو تو یہ بات اس لفظ کے عربی ہونے کے خلاف ہرگز نہیں ہوسکتی۔ درحقیقت یہ مخالفت کا ایک مجنونانہ مظاہرہ ہے جس کے ماتحت بعض پرانے منافقین نے قرآن کریم پر اعتراض کیا۔ اور جس کے ماتحت آجکل کے یورپین مستشرق بھی اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہونے کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس میں غیر زبانوں کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں اور پھر وہ ایسے الفاظ کی ایک فہرست پیش کر دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے متعلق ہم یقیناً یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ وہ عربی زبان کے الفاظ نہیں ہیں۔ مثلاً توراتؔ کا لفظ عربی زبان کا نہیں اور ہم اسے تسلیم کرتے ہیں یا کون مسلمان کہتا ہے کہ جبریل عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ لفظ اپنی موجودہ شکل میں عربی زبان کا لفظ نہیں۔ اِسی طرح میکائیلؔ کا لفظ عربی زبان کا نہیں۔ یا اِسحٰق کا لفظ ہے ہم کب اس کے غیر عربی ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ اسی طرح عیسیٰؔ کا لفظ ہے یہ بھی عربی زبان کا نہیں بلکہ جیسس Jesis کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔

قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ کے استعمال ہونے کی وجہ پس ہمیں اس سے ہرگز انکار نہیں ہے کہ قرآن کریم میں غیر زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اور اگر وہ ایسے الفاظ کی تلاش میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ قرآن اور اسلام پر حملہ کر سکیں گے تو وہ اپنے وقت کو بالکل ضائع کرتے ہیں۔ ہم اگر اُن کی بعض باتوں کا انکار کرتے ہیں تو محض اس لئے کہ بعض الفاظ عربی زبان کے ہی ہوتے ہیں مگر وہ زبردستی ان کو غیر زبانوں

کے الفاظ قرار دے دیتے ہیں۔ اس وجہ سے انکار نہیں کرتے کہ قرآن مجید میں غیر زبان کا کوئی لفظ پایا ہی نہیں جا سکتا۔ ہمیں اُن پر اگر شکوہ پیدا ہوتا ہے تو اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں یا حد سے زیادہ غلُوّ کرتے ہیں اور عربی الفاظ کے متعلق بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں کہ وہ غیر عربی الفاظ ہیں اُن کا یہ فعل ہمارے لئے باعثِ اعتراض ہوتا ہے ورنہ ہم خود تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں غیر زبانوں کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں اور ہمارے نزدیک یہ بات ہرگز قابل اعتراض نہیں ہے۔ اس قسم کے الفاظ میں سے جن کو زبردستی غیر زبان کا قرار دیا جاتا ہے ایک سِجّیْن کا لفظ بھی ہے ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے مگر وہ بلا وجہ اسے غیر زبان کا لفظ قرار دے دیتے ہیں یہ بات ہے جو وجہ اعتراض ہے ورنہ اگر ایک لفظ تو کیا اگر وہ پانچ سو لفظ بھی قرآن کریم میں سے ایسے نکال کر لے آئیں جو غیر زبانوں کے ہوں تو ہم کہیں گے کہ ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ جب عربوں نے ان الفاظ کو اپنی زبان میں شامل کر لیا اور اُن کو انہوں نے کثرت سے استعمال کرنا شروع کر دیا تو اس کے بعد عربی میں ان الفاظ کا پایا جانا ہرگز قابلِ اعتراض امر نہیں ہو سکتا۔ لوگ روزانہ سٹیشن پر جاتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں ٹکٹ دو۔ مگر کیا ٹکٹ ہماری زبان کا لفظ ہے؟ یا لوگ بازار میں جاتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں فونٹن پن دکھاؤ۔ کیا فونٹن پن اُردو زبان کا لفظ ہے؟ مگر باوجود اس کے کہ یہ دونوں الفاظ ہماری زبان کے نہیں جب کوئی شخص کہتا ہے کہ مجھے ٹکٹ دو یا فونٹن پن دکھاؤ تو سب لوگ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ یہ اردو زبان بول رہا ہے کوئی اور زبان نہیں بول رہا۔ تو جو الفاظ زبان میں رائج ہو جاتے ہیں اُن کا استعمال کرنا ہرگز قابلِ اعتراض نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو الفاظ اصطلاحی ہوتے ہیں یا جو الفاظ کسی قوم پر حُجّت کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں ان کا بھی اصل صورت میں استعمال کرنا ہرگز قابل اعتراض امر نہیں ہوتا۔ یا مثلاً اسماء کو اُن کی اصل زبان میں ہی بیان کر دینا قطعًا کوئی ایسا امر نہیں ہے جو قابلِ اعتراض ہو۔ اگر کسی شخص کا نام کرشن چند ہو تو یہ نہیں ہوگا کہ دوسری زبان میں ہم کرشن چند کا ذکر کرتے وقت اس نام کا ترجمہ کرنے لگ جائیں بلکہ ایسی حالت میں ہم کرشن چند نام ہی لکھیں گے اور یہ پروا نہیں کریں گے کہ یہ کسی اور زبان کا لفظ ہے اور ہم کسی اور زبان میں بات کر رہے ہیں پس یہ ایک غلط اور بے معنی اعتراض ہے جو قرآن کریم پر کیا جاتا ہے۔ بالخصوص سِجّیْن کے متعلق ان کا اعتراض کرنا سراسر غلط ہے۔ سِجّیْن عربی زبان کا لفظ ہے۔ لُغت میں اس کے معنے موجود ہیں۔ عربی زبان میں اس کے اور اشتقاق بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مجھے تحقیق کا موقع نہیں ملا ورنہ ممکن ہے اشتقاق کبیر میں بھی اس کا ثبوت مل جائے۔ بہر حال سِجّیْن کو غیر زبان کا لفظ قرار دینا ہرگز درست نہیں ہے۔

مَرْقُوْمٌ مَرْقُوْمٌ رَقَمَ سے اسم مفعول ہے اور رَقَمَ الْكِتَابَ کے معنے ہیں اَعْجَمَهٗ وَبَيَّنَهٗ۔ اس نے کتاب کو لکھا اور اس پر زیر زبر لگائی۔ اور رَقَمَ الثَّوْبَ کے معنے ہوتے ہیں خَطَّطَهٗ وَاَعْلَمَهٗ۔ اس نے کپڑے پر دھاریاں بنائیں اور نشان لگائے۔ نیز کہتے ہیں فُلَانٌ يَرْقُمُ فِي الْمَآءِ يُضْرَبُ مَثَلًا لِلْحَذِقِ فِي الْاُمُوْرِ یعنی فلاں شخص معاملات میں بڑا حاذق ہے۔ (اقرب)

ضحاک کہتے ہیں کہ مَرْقُوْم کے معنے لغت حمیر میں مختوم کے بھی ہیں یعنی جس پر مُہر لگی ہوئی ہو۔ وَاَصْلُ الرَّقْمِ: اَلْكِتَابَةُ اور یہ کہ رقم کے اصل معنے کتابت کے ہیں۔ (فتح البیان)

تفسیر۔ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ کے متعلق ایک اشکال اور اس کی تشریح یہاں بعض لوگوں نے سوال اٹھایا ہے کہ كِتَابُ الْفُجَّارِ فِيْ كِتَابٍ مَّرْقُوْمٍ کے معنے ہی کیا ہوئے؟ یعنی بتایا یہ گیا ہے کہ کتاب فجار سجّین میں ہے اور پھر سجّین کی یہ تشریح کی گئی ہے کہ وہ کتاب مرقوم ہے گویا دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ فجّار کی کتاب۔ کتاب میں ہے اور یہ ایک ایسا فقرہ ہے جو بالکل بے معنی ہے جس کا کوئی مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ علامہ زمخشری نے بھی یہ سوال اٹھایا ہے اور پھر اپنی کتاب میں انہوں نے اس کا جواب بھی دیا ہے چنانچہ وہ کشاف میں لکھتے ہیں سجّین عام ہے اور کتاب الفجّار اس کا ایک باب ہے یعنی سجّین وہ کتاب ہے جس میں مشرک۔ کافر۔ منافق۔ فجّار سب کے اعمال لکھے جاتے ہیں اور اسی کو بغیر کسی قید کے کتاب مرقوم کہا گیا ہے کیونکہ اس میں ہر برے آدمی کا ذکر ہے (الکشاف زیر آیت ھذا) خواہ وہ فاجر ہو یا منافق ہو یا کافر ہو یا مشرک ہو لیکن کتاب الفجار میں صرف ایک خاص قسم کے گروہ کی شرارتوں اور ان کی بداعمالیوں کا ذکر ہے اور بتایا یہ گیا ہے کہ کتابِ فجّار بھی کتابِ سجّین میں شامل ہے گویا جزو کو کل کی طرف منسوب کیا گیا ہے پس اُن کے نزدیک کتاب الفجار میں جو کتاب کا لفظ آیا ہے وہ باب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور کتاب مرقوم میں جو کتاب کا لفظ ہے وہ زیادہ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ فجّار کا اعمال نامہ کتاب مرقوم کا ایک حصہ اور باب ہے۔

الواحدی کہتے ہیں کہ کتابِ مرقوم کو سجّین کی تفسیر قرار دینا درست نہیں کیونکہ روایات سے سجّین کتاب معلوم نہیں ہوتی اس لئے کتابٌ مرقوم کو اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ کا بیان سمجھنا چاہیے اور جملہ کی تقدیر یوں سمجھی جائے کہ هُوَ كِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ۔ (فتح البیان زیر آیت ھذا) گویا وہ لَفِيْ سِجِّيْنٍ۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ کو درمیان میں ایک جملۂ معترضہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں اصل فقرہ صرف اتنا ہے کہ اِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ كِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ مگر یہ معنے درست نہیں ہیں کیونکہ اس صورت میں سِجِّيْن بلا تفسیر رہ جائے گا جو محاورۂ قرآنی کے خلاف ہے۔

سجّین کے متعلق مفسّرین نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:۔

لفظ سجین کی تشریح پہلے مفسرین کے نزدیک بعض نے اِنَّ کِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ کے یہ معنے کئے ہیں کہ سات زمینوں کے نیچے ایک بہت بڑی چٹان ہے جس کا نام سجّین ہے اس چٹان کے نیچے کفار کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں اور بعض کہتے ہیں سجّین کسی چٹان کا نام نہیں بلکہ سجّین نام ہے شیطان کے کلّوں کا۔ شیطان زمین کے نیچے لیٹا رہتا ہے جب کوئی کافر مر جاتا ہے تو فرشتے اُس کی روح کو آسمان پر لے جاتے ہیں۔ کافر کی روح دیکھ کر آسمان والے کہتے ہیں ہم اس روح کو نہیں رکھ سکتے اسے واپس لے جاؤ (فتح البیان زیر آیت ھذا) چنانچہ وہ اسے زمین کے نیچے لے جاتے ہیں جہاں شیطان لیٹا ہوا ہوتا ہے۔ شیطان نے تمام کفار کے اعمال نامے اپنے کلّے کے نیچے رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور اُس کا کلّہ اُن اعمال ناموں کی وجہ سے پُھولا ہوا ہوتا ہے جب کافر کی روح اس کے پاس پہنچتی ہے تو وہ اس کا اعمال نامہ بھی پہلے اعمال ناموں سے نتھی کر کے اپنے کلّے کے نیچے رکھ کر لیٹ جاتا ہے۔ اس قسم کی اَور بھی بعض لغو اور بے ہُودہ روایات تفسیروں میں پائی جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہود بعض مسلمانوں سے تمسخر کیا کرتے تھے اور وہ مسلمان اپنی سادہ لوحی کے سبب اُن کی بتلائی ہوئی روایات کو آگے بیان کر دیتے تھے یہاں تک کہ بعض مفسّر انہیں اپنی تفاسیر میں درج کر لیا کرتے تھے حالانکہ یہود اسلام کے شدید دشمن تھے اُن سے قرآن کریم کی کسی آیت کے معنے پوچھنا کسی صورت میں درست نہ تھا مگر وہ یہودیوں کے پاس چلے جاتے اور پوچھتے کہ اس آیت کے معنے کیا ہیں وہ تمسخر کرتے ہوئے ایسی باتیں کہہ دیتے جو سرتا پا غلط اور بے بنیاد ہوتیں۔ چنانچہ تفاسیر میں ایسی بہت سی روایات پائی جاتی ہیں جن کا یہودی کتب میں بھی کوئی نشان نہیں ملتا۔ لیکن بعض روائتیں ایسی ہیں جو یہودی کتب سے مل جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض دیانتدار یہودی تھے اور اپنی کتابوں میں سے جو کچھ بتاتے تھے سچ سچ بتا دیتے تھے لیکن بعض بالکل جُھوٹی باتیں مسلمانوں کو بتا دیا کرتے تھے اور مُسلمان اپنی جہالت سے اُن کو قرآن کریم کی آیات کی تفسیر سمجھ لیتے تھے۔ ابن کثیر والے نے ایک جگہ اسی قسم کی روایات کا ذکر کرتے ہوئے ایک نہایت ہی لطیف فقرہ لکھا ہے۔ وہ ایک روایت کے ذکر پر لکھتے ہیں کہ یہ ایسی ہی روایت ہے جیسے ابن عباسؓ سے بعض یہودی روایات مروی ہیں وہ یہودیوں سے اُن پر اعتماد کر کے سوال کر لیا کرتے تھے اور یہودی انہیں جو کچھ بتا دیتے تھے اس کو وہ حسن ظنّی کر کے سچا سمجھ لیتے تھے۔ مجھے ابن کثیر کے مصنّف کی یہ بات بڑی پسند آئی کہ اُس نے بڑی دلیری اور جرأت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ سجّین کے متعلق جو روایات تفسیروں میں پائی جاتی ہیں وہ بھی ایسی ہی ہیں کہ ان کا یہودی کتب سے بھی پتہ نہیں چلتا۔

عجیب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس جگہ صاف طور پر فرماتا ہے کہ سجّین کتاب مرقوم ہے مگر بعض مفسر کہتے ہیں کہ یہ سات زمینوں کے نیچے ایک چٹان ہے یا شیطان کے کلّوں کو سجّین کہا گیا ہے۔ جہاں خدا تعالیٰ نے کوئی بات نہیں بتائی وہاں تو وہ جو چاہیں کہہ جائیں مگر جہاں خدا تعالیٰ سجّین کے معنے بتا رہا ہے وہاں بھی یہ کہنا کہ اس کے معنے وہ نہیں جو قرآن نے بتائے ہیں بلکہ اس کے کچھ اَور معنے ہیں بہت بڑی غلطی ہے حالانکہ لُغت میں سجّین کے معنے موجود ہیں اور کتاب کے معنے بھی موجود ہیں۔ سجّین کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے معنے دائم اور شدید کے ہیں اور کتاب کے متعلق لکھا ہے مَا يُكْتَبُ فِيْهِ۔ یعنی لکھی ہوئی تصنیف (۲) اَلدَّوَاةُ۔ دوات (۳) اَلتَّوْرَاةُ۔ تورات (۴) اَلصَّحِيْفَةُ۔ صحیفہ (۵) اَلْفَرْضُ۔ فرض (۶) اَلْحُكْمُ۔ حکم (۷) اَلْقَدَرُ۔ قضاء آسمانی۔ اندازہ (۸) وَفِي الْمِصْبَاحِ ''وَ يُطْلَقُ الْكِتَابُ عَلَى الْمُنَزَّلِ'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب (اقرب) ان معنوں کے لحاظ سے اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ کا ایک تو یہ مفہوم ہوگا کہ فُجّار کے متعلق ہمارا جو حکم ہے وہ سجّین نامی کتاب میں ہے۔ دنیا میں بھی کتابوں کے مختلف نام رکھے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس رجسٹر میں ان کا ذکر کیا گیا ہے اس کا نام سجّین ہے یعنی ان فجّار کا جو اعمال نامہ ہوگا اُس پر یہ ہیڈ ینگ ہوگا کہ ان کے ساتھ معاملہ دائمی اور سخت کیا جائے گا کیونکہ سجّین کے معنے دائم کے بھی ہیں اور شدید کے بھی۔ اور اگر کتاب کے معنے اَلْقَدَرُ کے لیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اُن کے متعلق ایک ایسا اندازہ کیا گیا ہے جو لَفِيْ سِجِّيْنٍ حالت دائمی اور شدّت میں ہوگا۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ اور یہ حالت دائمی اور شدّت کیا چیز ہے كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا فیصلہ ہے جو لکھا ہوا ہے یعنی وہ ٹلے گا نہیں پس كِتٰبُ الْفُجَّارِ کے معنے ہوئے قَضَاءُ اللّٰهِ فِيْ حَقِّ الْفُجَّارِ یا حُكْمُ اللّٰهِ فِيْ حَقِّ الْفُجَّارِ یا قَدَرُ اللّٰهِ فِيْ حَقِّ الْفُجَّارِ یعنی اللہ تعالیٰ کا فیصلہ فجّار کے حق میں سجّین میں ہے یعنی اس دفتر میں ہے جس میں دائمی اور شدید عذاب والوں کا ذکر ہے ان معنوں کو جو لغت کے لحاظ سے ثابت شدہ ہیں اگر لے لیا جائے تو اس امر کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ شیطان کے کلّے کو چیر چیر کر اُس میں کفار کے نامۂ اعمال کو رکھا جائے یا زمین کے نیچے چٹانیں تلاش کی جائیں یہ سب بے معنی اور لغو باتیں ہیں۔

قتادہ۔ سعید بن جبیر۔ مقاتل اور کعب کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا سجّین ساتویں زمین کے نیچے ایک چٹان ہے اُسے ہٹا کر اُس کے نیچے کتابِ فجّار رکھی جاتی ہے۔ اس صورت میں وہ کہتے ہیں کہ كِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ میں حذفِ مضاف ہے اور مراد یہ ہے کہ سِجِّيْنٌ مَّحَلُّ كِتَابٍ مَّرْقُوْمٍ ہے یعنی کفار کے اعمال ناموں کی جگہ سجّین ہے مگر ابو عبیدہؔ اور اخفشؔ اور مبرّدؔ اور زجّاجؔ جیسے نحویوں اور ادیبوں نے جن میں سے ابو عبیدہ اور مبرّد ادب کے

بہت بڑے ماہر گزرے ہیں اور اخفش اور زجّاج نحو کے بہت بڑے ماہر گزرے ہیں لَفِيْ سِجِّيْنٍ کے معنے لَفِیْ حَبْسٍ وَّضِیْقٍ شَدِیْدٍ کئے ہیں۔یعنی فجّار کی منزل حبس وضیق شدید میں ہوگی۔ وہ کہتے ہیں لَفِيْ سِجِّيْنٍ اَیْ لَفِیْ مَکَانِ خَسَاسَۃٍ وَذِلَّۃٍ۔ خساست اور ذلّت اُن کا مقام ہوگا۔(تفسیر القرطبی زیرآیت ھذا) اس صورت میں کِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ سجّین کی صفت ان معنوں میں ہوگی کہ یہ شدّت اور حبس کا مقام ایک کتابِ مرقوم میں ہے یعنی ایک لکھا ہوا فیصلہ ہے جو ٹل نہیں سکتا۔

میرے نزدیک اس آیت کے جو صاف معنے ہیں وہ یہی ہیں کہ فجّار کا فیصلہ سجّین میں ہے جو ایک اٹل فیصلہ ہے یا یہ کہ سجّین ایک ایسا فیصلہ ہے جو کتاب مرقوم ہے یعنی اٹل ہے۔

اِس آیت کے معنے اِس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ غیروں سے معاملات کرنے کے لحاظ سے ہی جس کا اس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے۔عیسائی قوم خراب نہ ہوگی بلکہ اس قوم میں فسق وفجور بھی ہوگا کیونکہ نام تبھی رکھا جاتا ہے جب کسی چیز کی کثرت پائی جائے پس فجّار کہہ کر بتایا کہ اس قوم میں صرف یہی عیب نہیں ہوگا کہ وہ دوسری اقوام سے بے انصافی کرے گی بلکہ اور بھی کئی قسم کے معائب اور فسق وفجور میں یہ مبتلا ہوگی۔اور اُن کے متعلق جو فیصلہ ہوگا وہ بڑا سخت اور لمبا ہوگا جس طرح ان کا معاملہ دوسری اقوام سے لمبا اور سخت تھا اور جس طرح ان کی فتح اور کامیابی لمبی ہوگی اسی طرح اُن کے ساتھ معاملہ بھی لمبا اور سخت کیا جائے گا۔

سجین اور علیین کا صحیح مفہوم پھر میرے نزدیک اس آیت کے ایک اور معنے بھی ہیں جس کی طرف پہلے کسی مفسر کا خیال نہیں گیا اور وہ یہ کہ قرآن کریم کے دو حصّے ہیں۔ایک حصّہ انذاری ہے اور ایک حصّہ تبشیری ہے کچھ حصہ میں تو دشمنانِ صداقت کی تباہیوں اور ان کی بربادیوں کا ذکر ہے اور کچھ حصہ میں مومنوں کی ترقیات اور اُن رحمتوں اور برکات کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے لئے مقدّر ہیں۔پس میرے نزدیک سجّین اور علّیّین قرآن کریم کے دو حصّوں کا نام رکھا گیا ہے۔علّیّین قرآن کریم کے وہ حصّے ہیں جن میں مومنوں کا ذکر ہے اور سجّین قرآن کریم کے وہ حصے ہیں جن میں کافروں کا ذکر ہے۔اس لحاظ سے اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ کے یہ نہایت ہی لطیف معنے ہوں گے کہ کس طرح ہوسکتا ہے یہ قوم تباہ نہ ہو۔ان لوگوں کی تباہی اور بربادی کا فیصلہ تو قرآن کریم کے اُن حصوں میں موجود ہے جن میں آئندہ زمانہ کی تباہیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اُن حصوں میں اس قوم کی تباہی اور بربادی کی خبریں دی جا چکی ہیں۔ضحاک کہتے ہیں کہ مَرْقُوْم کے معنے لغت حمیر میں مَخْتُوْمٌ کے ہیں اور یہ معنے اس مقام پر نہایت عمدگی سے چسپاں ہوتے ہیں کیونکہ کتابِ مختوم وہ ہے جو بدلتی نہیں جس کے فیصلے آخری اور قطعی ہوتے ہیں اور جن

میں کسی قسم کی تبدیلی کا امکان نہیں گویا وہ خاتم الکتب ہے اور یہ خوبی قرآن کریم میں ہی پائی جاتی ہے۔ اگر یہ فیصلے کسی ایسی کتاب میں بیان ہوتے جو منسوخ ہو چکی ہوتی یا جس نے آئندہ کسی زمانہ میں منسوخ ہو جانا ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ جب یہ کتاب منسوخ ہو چکی یا آئندہ منسوخ ہونے والی ہے تو اس کے فیصلوں سے کیا خوف ہو سکتا ہے مگر یہ سجّین تو وہ ہے جو کتاب مرقوم ہے۔ یعنی یہ فیصلے اُس کتاب میں لکھے ہوئے ہیں جو کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی اس لئے یہ فیصلے اٹل ہیں۔ اس صورت میں اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ میں کتاب کو حکم کے معنوں میں لیا جائے گا اور مراد یہ لی جائے گی کہ اِن فجّار کا حکم سجّین میں ہے اور سجّین کے معنے قرآن کریم کے انذاری حصہ کے ہوں گے۔ اسی طرح علّیّین سے مراد قرآن کریم کا وہ تبشیری حصہ لیا جائے گا جس میں مومنوں کی ترقیات کا ذکر آتا ہے۔ پس میرے نزدیک یہ ایک نہایت ہی لطیف اور واضح معنے ہیں جو اس مقام پر پوری طرح چسپاں ہوتے ہیں کیونکہ جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خاتم النبیّین ہیں اسی طرح قرآن خاتم الکتب ہے اُس کے فیصلے اٹل اور قطعی ہیں خواہ وہ کفار کی تباہی کے متعلق ہوں یا مومنوں کی ترقی کے متعلق ہوں۔

مَآ اَدْرٰىكَ اور مَا يُدْرِيْكَ کے استعمال میں فرق اب مَآ اَدْرٰىكَ کے متعلق بھی ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ عربی زبان میں وَمَآ اَدْرٰىكَ اور مَا يُدْرِيْكَ دونوں کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ مَا تَدْرِيْ تُو اس بات کو نہیں جانتا۔ لیکن قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن دونوں الفاظ کے استعمال میں فرق ہے۔ قرآن کریم میں مَآ اَدْرٰىكَ اور مَا يُدْرِيْكَ دونوں ہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مَآ اَدْرٰىكَ بارہ جگہ آیا ہے اور مَا يُدْرِيْكَ تین جگہ آیا ہے۔ چنانچہ مَآ اَدْرٰىكَ جن بارہ مقامات پر آیا ہے وہ یہ ہیں (۱) الحاقہ (۲) مدثّر (۳) مرسلات (۴) انفطار (۵) تطفیف (۶) تطفیف (۷) طارق (۸) بلد (۹) قدر (۱۰) قارعہ (۱۱) قارعہ (۱۲) ہُمزہ۔

ان سب مقامات پر مَآ اَدْرٰىكَ کے بعد اسم آیا ہے جیسے مَا الْحَآقَّةُ۔ مَا سَقَرُ۔ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ مَا سِجِّيْنٌ۔ مَا عِلِّيُّوْنَ۔ مَا الطَّارِقُ۔ مَا الْعَقَبَةُ۔ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ۔ مَا الْقَارِعَةُ۔ مَا هِيَهْ مَا الْحُطَمَةُ۔

اس کے برخلاف مَا يُدْرِيْكَ جتنی جگہ آیا ہے کسی فعل کی طرف اُس میں اشارہ ہے۔ چنانچہ مَا يُدْرِيْكَ قرآن کریم میں تین جگہ آیا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں۔ احزاب میں۔ اور عبس میں۔

سورۂ شوریٰ میں آتا ہے وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ (الشوریٰ:۱۸) سورۂ احزاب میں آتا ہے وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا (الاحزاب:۶۴) سورۂ عبس میں آتا ہے وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى (عبس:۴) اِن سب مقامات پر کسی وقوعہ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ جہاں بھی مَآ اَدْرٰىكَ آیا ہے وہاں اللہ

تعالیٰ نے کسی سوال کا جواب دیا ہے مثلاً مَا الْقَارِعَةُ کے بعد یہ بتایا ہے کہ قارعہ کیا چیز ہے۔ مَا سَقَرُ کے بعد بتایا ہے کہ سقر کیا چیز ہے اور مَا یَوْمُ الْفَصْلِ یا مَا یَوْمُ الدِّیْنِ کے بعد بتایا ہے کہ یوم الفصل یا یوم الدین کیا چیز ہے گویا جہاں بھی مَا اَدْرٰكَ آیا ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی سوال کا جواب دیا ہے۔ مثلاً (۱) سورۃ الحاقہ میں مَا الْحَاقَّةُ کے بعد فرماتا ہے کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌ بِالْقَارِعَةِ۔ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ۔ وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ (آیت ۴ تا ۷) یعنی ثمود اور عاد قوموں نے موعود عذاب کو جھٹلایا۔ سو اس کے بعد ثمود تو ایک بڑے زور کی کڑک کے صدمہ سے ہلاک کر دئے گئے۔ اور رہے عاد سو وہ بھی ایک سخت آندھی سے ہلاک کر دئے گئے۔ الغرض ان آیات میں اور بعد کی آیات میں فرعون اور پہلے معذّب لوگوں کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ الحاقہ سے مراد وہ اٹل عذاب جن کو زبردست اقوام ساری کوششوں کے باوجود ٹلا نہیں سکتیں (۲) پھر سورۂ مدثّر میں مَآ اَدْرٰكَ مَا سَقَرُ کے بعد اس کی تفسیر بھی کر دی کہ لَا تُبْقِيْ وَ لَا تَذَرُ۔ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ۔ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (المدثر: ۲۹ تا ۳۱) یعنی سقر ایسی چیز ہے کہ نہ وہ باقی رکھتی ہے اور نہ جلائے بغیر چھوڑتی ہے اور آدمی کے تن بدن کو جُھلس دیتی ہے اس پر اُنیس فرشتے متعیّن ہیں (۳) سورۂ مرسلات میں فرمایا ہے کہ وَ مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ اور پھر اس کا لمبا جواب دیتے ہوئے فرمایا هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ۔ وَ لَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۔ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَ الْاَوَّلِيْنَ (المرسلات: ۳۶ تا ۳۹) یعنی یوم الفصل وہ دن ہوگا جب کہ گنہگار کوئی بات نہ کر سکیں گے اور نہ ان کو اجازت دی جائے گی کہ وہ کوئی عذر پیش کریں۔ خوب یاد رکھو کہ عذاب کو جھٹلانے والوں کے لئے تباہی ہی تباہی ہے اُس دن ہم اُن سے کہیں گے کہ یہی تو وہ یوم الفصل ہے جس میں تم کو اور پہلے لوگوں کو فیصلے کے لئے ہم نے جمع کیا ہے (۴) پھر سورۂ انفطار میں وَ مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ کہا اور اس کی تفسیر یوں کہہ دی کہ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا (الانفطار: ۱۸ تا ۲۰) یعنی یوم الدین وہ دن ہے جس دن کوئی جان کسی جان کے کچھ کام نہ آسکے گی (۵) اسی طرح سورۂ تطفیف میں فرمایا وَ مَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ اور اس کا جواب دیا کہ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (التطفیف: ۹ تا ۱۱) یعنی سجّین ایک اٹل حکم ہے (۶) پھر اسی سورۃ میں دوسری جگہ فرمایا وَ مَآ اَدْرٰكَ مَا عِلِّيُّوْنَ اور اس کی تفسیر یوں فرما دی کہ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ۔ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (التطفیف: ۲۰ تا ۲۲) یعنی علّیّون ایک ایسا حکم ہے جو ضرور پورا ہوگا اور اس کو مقرب لوگ دیکھیں گے۔ گویا سجّین وہ ہے کہ اُسے دیکھ کر کافر روئیں گے اور علّیّن وہ ہے کہ اس کو دیکھ کر مومن اُس کی طرف شوق سے جائیں گے۔ (۷) پھر سورۂ طارق میں مَا الطَّارِقُ کہہ کر اس کا جواب دیا النَّجْمُ الثَّاقِبُ (الطارق: ۳، ۴) کہ طارق ایک روشن چمکنے والا ستارہ ہے (۸) پھر سورۂ بلد میں فرمایا مَا الْعَقَبَةُ اور

اس کا جواب یہ دیا کہ فَكُّ رَقَبَةٍ ۔ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۔ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۔ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (البلد: ۱۴ تا ۱۷) یعنی عقبہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ گردن کا غلامی یا قرض کے پھندے سے چھڑا دینا یا بھوک کے دن قرابت دار یتیم کو یا خاک افتادہ مسکین کو کھانا کھلانا (۹) اسی طرح اس بات کو حل کرنا تھا کہ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ یعنی لیلۃ القدر کی کیا شان ہے۔ اِس لئے اس کے آگے جواب دے دیا کہ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۔ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (القدر: ۴ تا ۶) یعنی لیلۃ القدر خیر و برکت میں ہزار مہینے سے بھی بہتر ہے اس لیلۃ القدر میں ہر ایک انتظام کے لئے فرشتے اور روح خدا تعالیٰ کے حکم سے اُترتے ہیں اور وہ رات امن و سلامتی کی رات ہے اور یہ خیر و برکت صبح کے طلوع ہونے تک رہتی ہے۔ (۱۰) اسی طرح سورۂ قارعہ میں مَا الْقَارِعَةُ کہہ کر اس کے جواب میں فرمایا يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۔ وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ (القارعة: ۵ تا ۶) یعنی قارعہ سے ہماری مراد ایک عظیم الشان حادثہ ہے اور جب وہ آئے گا اُس دن لوگ ایسے پڑے ہوئے ہوں گے جیسے پَردار چونٹیاں اور پہاڑ دُھنکی ہوئی رُوئی کی طرح ہوں گے (۱۱) پھر اسی سورۃ میں وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ کہہ کر هَاوِيَة کے بارے میں سوال کیا تھا اس کا یہ جواب دیا کہ نَارٌ حَامِيَةٌ یعنی ہاویہ ایک شعلے مارنے والی آگ ہے (القارعة: ۱۱، ۱۲) (۱۲) پھر سورۂ ہُمزہ میں فرمایا وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ اور اس کا یہ جواب دیا کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۔ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (الھمزہ: ۷ تا ۸) یعنی حطمہ سے مراد اللہ کی وہ جلائی ہوئی آگ ہے جو داخل ہونے والوں کے دلوں کو جھانک رہی ہے۔

مَاۤ اَدْرٰىكَ کے بعد کسی سوال کے جواب کا ذکر ہوتا ہے اور مَاۤ يُدْرِيْكَ کے بعد جواب کو مبہم رکھا جاتا ہے

پس قرآن کریم میں جہاں بھی مَاۤ اَدْرٰىكَ کا ذکر آیا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی سوال کا ضرور جواب دیا ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل وَ مَا يُدْرِيْكَ کے جواب میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ نے بات کو لَعَلَّ سے شروع کیا ہے اور جواب کو مبہم اور ذوالوجوہ رکھا ہے۔ چنانچہ سورۂ شوریٰ میں فرمایا وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ پھر احزاب میں فرمایا وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا اور عبس میں فرمایا وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى ۔ گویا تینوں جگہ لَعَلَّ کا لفظ رکھا۔ دو جگہ تو ساعت کا ذکر کر کے فرمایا کہ تم نہیں جانتے وہ کب آنے والی ہے۔ اُس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ اپنے بندوں کو اس کا علم نہیں دے سکتا۔ تیسری جگہ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى کہہ کر پھر وہی صورت اختیار کی گئی ہے جو اوپر کے دو مقامات میں اختیار کی گئی تھی۔ لیکن مَاۤ اَدْرٰىكَ جہاں جہاں کہا گیا ہے وہاں سوال کا معیّن جواب دیا گیا ہے۔

مَآ اَدْرٰىكَ اور مَا يُدْرِيْكَ کے اس فرق سے قرآن کریم کی فصاحت کا پتہ چلتا ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک لغت کا سوال ہے اُس نے دونوں کو ہم معنیٰ قرار دیا ہے اور دونوں کے معنے یہ لکھے ہیں کہ مَا تَدْرِيْ تُو نہیں جانتا۔اور یہ بات درست بھی ہے کہ دونوں کے یہی معنے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ وجہ کیا ہے کہ قرآن کریم نے ایک سے عدمِ علم کی طرف اشارہ کر کے علم عطا کر دیا ہے اور دوسرے سے عدم علم کی خبر دے کر ابہام کو قائم رکھا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ گو لغت نے دونوں کو ایک قرار دیا ہے مگر صیغہ کے لحاظ سے مَآ اَدْرٰىكَ ماضی کا صیغہ ہے اور مَا يُدْرِيْكَ مضارع کا صیغہ ہے۔اور گو استعمالِ عام میں اَدْرٰى اور يُدْرِيْ دونوں کے ایک معنیٰ کر دئے گئے ہیں مگر قرآن کریم نے ان دونوں میں فرق کیا ہے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی کا صیغہ یقین پر دلالت کرتا ہے کیونکہ جو واقعہ ہو چکا وہ بہرحال قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔لیکن مضارع محض توقع پر دلالت کرتا ہے اس لئے قرآن کریم نے بھی ان دونوں صیغوں کے استعمال میں اس فرقِ لطیف کو ملحوظ رکھا اور جس امر کو بتانا تھا اُسے ماضی کے صیغہ وَمَآ اَدْرٰىكَ کے بعد رکھا اور جسے ابھی کچھ عرصہ کے لئے مبہم رکھنا تھا اُسے مَا يُدْرِيْكَ کے الفاظ کے بعد رکھا۔تا کہ مضارع کی طرح اُس کا علم بھی مبہم اور غیر یقینی رہے کیونکہ مضارع کا صیغہ اپنے اندر یقین نہیں رکھتا بلکہ محض توقع رکھتا ہے۔چنانچہ دیکھ لو ہم کہتے ہیں يَذْهَبُ وہ جائے گا مگر اس میں یقینی خبر نہیں ہوتی کہ وہ ضرور جائے گا کیونکہ ہمیں کیا پتہ کہ وہ جائے گا یا مر جائے گا یا بیمار ہو جائے گا یا قید ہو جائے گا پس جس خبر کو یقینی کرنا مقصود نہ تھا اُسے اللہ تعالیٰ نے مضارع کے الفاظ کے بعد رکھا اور جس بات کا یقینی علم دینا تھا اُسے ماضی کے الفاظ کے بعد رکھا۔گویا اس طرح لُغت میں ایک لطیف فرق جو الفاظ کے مناسب حال ہے پیدا کر دیا جسے پہلے ادیب مدنظر نہ رکھتے تھے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ

اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے عذاب (ہی عذاب) ہے (اُن کے لئے)

الدِّيْنِ ﴿۱۲﴾

جو جزاء سزا کے دن کا انکار کرتے ہیں۔

تفسیر۔اس آیت میں پہلی سورۃ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔وہاں چونکہ فرمایا تھا کہ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ اس لئے یہاں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس قسم کے ظلم ہمیشہ انجام سے استغناء اور انکار کے نتیجہ

میں پیدا ہوتے ہیں جب کوئی سمجھ لے کہ میرے بُرے اعمال کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا تو وہ ہمیشہ عاجل فائدہ کو مقدم کر لیتا ہے اور بُرائیوں میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ اگر ہر فرد اور قوم کو اپنا انجام یاد رہے تو یہ حالت کبھی پیدا نہ ہو۔ مگر افسوس اسی یقینی سبق سے بھی دنیا فائدہ نہیں اٹھاتی۔ افراد اپنے اعمال سے برباد ہوتے ہیں۔ اقوام اپنے اعمال سے برباد ہوتی ہیں اور اُن کی آنکھوں کے سامنے پہلے لوگوں کی تباہی اور بربادی کے نظّارے ہوتے ہیں مگر باوجود اس کے بار بار افراد اور اقوام اس کے خلاف چل کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ جیسے کہانیوں میں مقناطیس کے پہاڑ کا ذکر آتا ہے کہ جب جہاز اُس کے قریب پہنچتا تھا تو وہ رُک نہیں سکتا تھا جب تک اُس سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جاتا۔ اسی طرح معلوم ہوتا ہے یَوْمُ الدِّیْنِ کی تکذیب اور انجام کو بھول جانا روایتی مقناطیس کا پہاڑ ہے کہ اُس کے سامنے آ کر انسانی یا قومی زندگی کا جہاز مقابلہ کر ہی نہیں سکتا ضرور اُدھر کھنچا چلا جاتا ہے اور آخر اُس سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتا ہے۔ درحقیقت ظالموں کو تباہ کرنے کا خدا تعالیٰ نے یہ سامان پیدا کیا ہے کہ وہ یَوْمُ الدِّیْنِ کو بھول کر اپنے ظلم میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور آخر اُسی ظلم کی چٹان سے ٹکرا کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے کافر کی جہنم اُس کے قلب اور دماغ میں ہی پیدا کی ہوئی ہوتی ہے اور آخر ایک دن اُس کو تباہ کرنے کا اسی میں سے سامان پیدا ہو جاتا ہے۔

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۳﴾

اور اس کا انکار نہیں کر سکتا مگر وہی جو حد سے نکلا ہوا (اور) سخت گنہگار ہو۔

حَلّ لُغَات۔ اِعْتِدَاء اِعْتِدَاء کے معنے ظلم کرنے اور حد سے نکل جانے کے ہوتے ہیں چنانچہ اِعْتَدٰی عَلَیْہِ اِعْتِدَاءً کے معنے ہوتے ہیں ظَلَمَہٗ۔ اُس نے فلاں پر ظلم کیا (اقرب) مُعْتَدٍ۔ اِعْتَدٰی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اس لئے مُعْتَدٍ کے معنے ہوں گے ظلم کرنے والا۔

اَثِیْمٌ اَثِیْمٌ اَثِمَ سے اسم فاعل کا مبالغہ کا صیغہ ہے اور اَثِمَ کے معنے عَمِلَ مَالَا یَحِلُّ کے ہوتے ہیں یعنی اس نے ایسا کام کیا جو جائز نہیں تھا اور وضعِ لُغت کے لحاظ سے اَثِمَتِ النَّاقَۃُ الْمَشْیَ اِثْمًا کے معنے ہوتے ہیں اَبْطَأَتْ (اقرب) اونٹنی سُست چلی۔ پس اَثِیْم وہ ہوا جس نے وہ کام جو کرنا تھا نہ کیا۔ گویا اِثْم کا لفظ کمی پر دلالت کرتا ہے اور اِعْتِدَاء کا لفظ زیادتی پر دلالت کرتا ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے تَکْذِیْبُ یَوْمُ الدِّیْنِ کے متعلق جو بات ہم نے بیان کی ہے وہ ایسی نہیں کہ ہم یونہی ظلماً کر دیتے ہوں۔ یوم الدین کو بھول جانا کوئی اتفاقی امر نہیں ہوتا اور پھر یہ بھی نہیں کہ ہم نے اُن کو علم نہ دیا ہو ہم نے

انہیں علم بھی دیا ہوتا ہے وہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے اعمال کا نتیجہ اچھا نہیں نکل سکتا مگر پھر وہ کیوں یوم الدین کو بھول جاتے ہیں۔

مُعۡتَدٍ اور اَثِیۡمٍ میں فرق فرماتا ہے اس کی دو وجوہ ہیں اِعۡتِدَاء اور اِثۡم۔ یہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے انسان یوم الدین کو بھول جاتا ہے یعنی جو کام نہ کرنے والے ہوں ان کو وہ کر لیتا ہے اور جو کام کرنے والے ہوں اُن کو وہ نہیں کرتا۔ معتدؔ وہ ہے جو نہ کرنے والے کاموں کو کرے اور اثیمؔ وہ ہے جو کرنے والے کاموں کو نہ کرے۔ یوں اِثم کے عام معنے گناہ کے ہی ہوتے ہیں مگر کسی لفظ کے وضعِ لغت کے لحاظ سے مخصوص معنے اس جگہ ہوتے ہیں جہاں اُس کے مقابل کا لفظ آ جائے۔ اگر خالی مُعۡتَدٍ کا لفظ یہاں آ جاتا تو ہم اس کے معنے گناہ کے کرتے۔ چاہے وہ گناہ کسی بات میں زیادتی کا نتیجہ ہوتا یا کسی بات میں کمی کا نتیجہ ہوتا۔ اسی طرح اگر خالی اِثِیۡمٍ کا لفظ آ جاتا تو اس کے معنے بھی ہم گناہ کے ہی کرتے۔ چاہے یہ گناہ زیادتی پر دلالت کرتا اور چاہے کمی پر۔ مگر چونکہ معتد اور اثیم دونوں لفظ اکٹھے آ گئے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ دونوں کو ہم الگ الگ مفہوم کا حامل قرار دیں اور وہ مفہوم جیسا کہ اُوپر بتایا جا چکا ہے یہ ہے کہ اِثۡم کا لفظ کمی پر دلالت کرتا ہے اور اعتداء کا لفظ زیادتی پر دلالت کرتا ہے اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ یوم الدین کی تکذیب ہمیشہ اعتداؔء اور اثمؔ سے پیدا ہوتی ہے۔ پہلے انسان گناہ کرتا ہے اور جب اسے اپنے گناہ کے متعلق گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے کہ کہیں میں پکڑا نہ جاؤں یا میری بدنامی نہ ہو اور اس فکر میں اس کی جان گھلنی شروع ہوتی ہے تو اس کا دوسرا قدم یہ ہوتا ہے کہ وہ کوشش کرتا ہے مَیں اپنے انجام کو بھول جاؤں اور اس طرح میں اپنے دل کی خلش سے بچ جاؤں۔ گویا یوم الدین کی تکذیب ایک شراب ہے جس کے نشہ میں مدہوش ہو کر وہ اپنے انجام سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ جیسے غالب نے کہا ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

(دیوان غالب صفحہ ۶۸)

یعنی انجام کا خیال اب میرے دل پر ہر وقت مستولی رہتا ہے اور اس فکر میں میری جان گھل رہی ہے۔ میں اس فکر سے بچنے کے لئے شراب پیتا ہوں تا کہ مجھ پر ہر وقت ایک بے خودی کی حالت طاری رہے اور انجام میری آنکھوں کے سامنے نہ آئے۔ اسی طرح تکذیب یوم الدین ایک قسم کی شراب ہے جب انسان اعتداء اور اِثم میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ ان اعمال کا انجام وہ بھول جائے۔ چنانچہ وہ کبھی افیون کھا کر۔ کبھی شراب پی

کر کبھی بھنگ اور چرس اور گانجا استعمال کر کے چاہتا ہے کہ ہر وقت مدہوش رہے اور اُس کا بُرا انجام اس کی آنکھوں کے سامنے نہ آئے یا اگر وہ شراب اور افیون استعمال نہیں کرتا تو علمی طور پر تکذیب یوم الدین شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ محض وہم ہے کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اپنے اعمال کے متعلق اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دِہ ہونا پڑے گا۔ گویا یا تو وہ مادی نشوں کے ذریعہ سے اپنے علم کو کمزور کرتا ہے اور یا پھر فلسفی نشوں سے وہ اپنے علم کو کُند کر دیتا ہے تا کہ وہ اس عذاب سے بچ جائے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ واقعہ میں اگر انسان اس پر غور کرے تو اُسے حیرت آجاتی ہے کہ کروڑوں لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں اور اُن کے اس مرض کی وجہ سوائے اعتدآء اور اثم کے اور کچھ نہیں۔ وہ اعتداء اور اِثم میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ اُن کا انجام بھیانک ہے تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے اس انجام کو بُھول جائیں۔ چنانچہ یا تو وہ افیون اور شراب وغیرہ سے وہ اپنے اوپر مدہوشی طاری کر لیتے ہیں اور یا پھر فلسفی نشوں سے وہ یوم الدین کی تکذیب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ محض جھوٹ ہے کہ انسان مر کر دوبارہ زندہ ہوگا۔ غرض فرماتا ہے وہ پہلے اعتداء اور اثم کرتے ہیں اور جب اعتداء اور اثم میں بڑھ جاتے ہیں تو مادی یا دماغی نشوں سے یوم الدین کو بُھلا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اَور زیادہ اعتدآء اور اَور زیادہ اثم کرتے ہیں گویا اُن کی مثال بالکل اُس چیتے کی سی ہوتی ہے جس نے بھوک میں اپنی زبان چاٹنی شروع کر دی تھی اور رفتہ رفتہ اس کی تمام زبان کھائی گئی تھی۔ یہ لوگ بھی پہلے اعتدآء اور اثم کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یوم الدین کو بُھلا دیتے ہیں۔ جب یوم الدین کو بھول جاتے ہیں تو اَور زیادہ اعتداء اور اثم کرتے ہیں اور یہ چکّر چلتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اُن کے اعمال کا جہاز اس کی ظلم کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۴﴾

جب ایسے لوگوں کے سامنے ہمارے نشانات پڑھے جائیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کی نقل کردہ باتیں ہیں۔

حَلّ لُغَات۔ اَسَاطِير اَسَاطِير جمع ہے اور اس کا واحد اَلْاِسْطَارُ وَالْاُسْطَارُ وَالْاُسْطُوْرُ وَالْاُسْطِيْرُ ہے اور اسکے معنے ہوتے ہیں مَا يُسْطَرُ اَیْ يُكْتَبُ ہر وہ چیز جو لکھی جائے (اقرب) پس اَسَاطِيْر کے معنے ہوئے لکھی ہوئی باتیں وَتُسْتَعْمَلُ فِی الْحَدِيْثِ لَا نِظَامَ لَهٗ عام محاورہ میں اَسَاطِيْر بے جوڑ باتوں کو بھی کہتے ہیں۔ اِسی طرح ایک معنے حکایت کے ہیں (اقرب) یہ وہی لفظ ہے جس سے انگریزی میں سٹوری بنا ہے اور سپین سے

انگریزی زبان میں بدل کر آ گیا ہے پس اس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں یعنی مُعْتَدٍ اور اَثِیْم کے سامنے۔ تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں سے نقل کی ہوئی کچھ بے جوڑ سی باتیں ہیں یا یوں کہو کہ لغت کے لحاظ سے اس کے تین معنے بن جائیں گے (۱) پہلے لوگوں سے لکھی ہوئی یعنی نقل کی ہوئی کچھ باتیں ہیں (یہ معنی یَکْتُبُ سے لئے جائیں گے) (۲) یا پہلے لوگوں کے متعلق کچھ بے جوڑ سی باتیں ہیں (۳) یا پہلے لوگوں کی حکائتیں اور کہانیاں ہیں۔

تفسیر۔ قرآن کریم میں اساطیر الاولین کا الزام نو مقامات پر قرآن کریم میں اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْن کا الزام نو مقامات پر آتا ہے جو یہ ہیں (۱) انعام ع ۳ (۲) انفال ع ۴ (۳) نحل ع ۳ (۴) مومنون ع ۵ (۵) فرقان ع ۱ (۶) نمل ع ۶ (۷) احقاف ع ۲ (۸) ن والقلم ع ۱ (۹) تطفیف ع ۱

(۱) سورۂ انعام میں پہلے اہل کتاب کا ذکر کیا ہے پھر کفار کا ذکر ہے اور فرماتا ہے حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (الانعام:۲۶)

(۲) سورۂ انفال میں ہے وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَاۤ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (الانفال: ۳۲)

(۳) سورۂ نحل میں وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّا ذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔ لِيَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ (النحل:۲۵،۲۶)

(۴) سورۂ مومنون میں ہے قَالُوْۤا ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ۔ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (المؤمنون:۸۳،۸۴)

(۵) سورۂ فرقان میں ہے وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ اِفْتَرٰىهُ وَ اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا۔ وَ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (الفرقان:۵،۶)

(۶) سورۂ نمل میں ہے وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّ اٰبَآؤُنَاۤ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ۔ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (النمل:۶۸،۶۹)

(۷) سورۂ احقاف میں ہے وَ الَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَاۤ اَتَعِدٰنِنِيْۤ اَنْ اُخْرَجَ وَ قَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ وَ هُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (احقاف:۱۸)

(۸) سورۂ ن والقلم میں ہے اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ پھر فرماتا ہے سَنَسِمُهٗ عَلَى

الْخُرْطُوْمِ ۔ (القلم:۱۶، ۱۷)

(۹) آخری مقام یہی سورۂ تطفیف ہے جو زیر بحث ہے۔ اِس میں فرماتا ہے وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۔ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (التطفیف: ۱۴)

قرآن مجید کو اساطیر الاولین کہنے والوں کی تردید اِن آیات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ انعام کی آیت میں اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اِس ذکر میں ہے کہ پُرانی کتب کی پیشگوئیاں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نئے نشانات جب اُن کو دکھائے جاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو پُرانے زمانہ کی باتیں دُہرائی جاتی ہیں گو یا پیشگوئیاں نہیں ہیں بلکہ پُرانی کتب کی باتوں کو دھوکا دینے والے طریق سے پیش کر کے مطلب حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ موسیٰ ؑ کی بات کو دیکھو جو فرعون کے سامنے ہوئی اور پھر فرعون کا انجام۔ گویا ہمیں ڈرایا جاتا ہے کہ فرعون نے موسیٰ ؑ کا مقابلہ کیا اور وہ تباہ ہو گیا اگر ہم بھی مقابلہ کریں گے تو تباہ ہو جائیں گے۔ حالانکہ تمہاری موسیٰ ؑ سے کیا نسبت ہے۔ یا ابراہیمؑ کا ذکر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے دشمن تباہ ہوئے حالانکہ تمہاری ابراہیمؑ سے کیا نسبت ہے۔ اللہ تعالیٰ اِس کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب آخری نتیجہ نکلے گا اُس وقت یہ لوگ کہیں گے کہ کاش ہم مخالفت نہ کرتے جیسا کہ فتح مکّہ کے وقت ہوا۔ مَیں نے اس کی مثال بھی دی تھی کہ عرب کے بڑے بڑے سرداروں کے بیٹے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے وہاں اُن کی موجودگی میں پے در پے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے غلام صحابہؓ حضرت عمرؓ کے ملنے کے لئے آئے۔ جب بھی کوئی صحابی آتا جو کسی وقت اُن کا یا اُن کے باپ دادا کا غلام رہ چکا تھا اور وہ لوگ اُس سے کئی قسم کے مشقّت طلب کام لیا کرتے تھے۔ تو حضرت عمرؓ اُن رؤساء مکّہ سے کہتے اِن کے لئے جگہ چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ وہ ہٹتے ہٹتے جُوتیوں میں جا پہنچے اور پھر ناراض ہو کر وہاں سے اُٹھے اور باہر آ کر انہوں نے آپس میں کہا کہ آج ہماری کیسی ذلّت ہوئی ہے ایک نوجوان جو اُن میں سے زیادہ سمجھدار تھا کہنے لگا کہ یہ کس وجہ سے ذلّت ہوئی ہے آخر ہمارے باپ دادا کے کاموں کی وجہ سے ہی ہوئی ہے اگر ہمارے باپ دادا مخالفت نہ کرتے اور یہ لوگ اسلام کے لئے قربانیاں نہ کرتے تو ان کو عزّت کس طرح ملتی اور ہمیں یہ ذلّت کا دن آج کیوں دیکھنا پڑتا۔ یہی مضمون سورۂ انعام میں بیان کیا گیا ہے کہ اُس وقت یہ لوگ کہیں گے کہ کاش ہم مخالفت نہ کرتے مگر اُس وقت اِس افسوس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

سورۂ انفال میں پیشگوئیوں کا ذکر نہیں بلکہ تعلیمات کا مقابلہ ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ یہ تو پہلی کتب کی نقل ہے چاہیں تو ہم بھی ایسا کہہ سکتے ہیں۔

سورۂ نحل میں بھی یہی مضمون ہے کہ گزشتہ لوگوں کی باتوں کی نقل کرتے ہیں کیونکہ وہاں مضمون یہ آتا ہے کہ وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ مَّاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّكُمۡ ۙ قَالُوۡۤا اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ اللہ تعالیٰ اُن کی توجہ اس طرف پھیرتا ہے کہ یہ نقل ہی سہی مگر محمد رسول اللہؐ اچھوں کی نقل کرتا ہے اور تُم بُروں کی نقل کر رہے ہو کیونکہ آگے فرماتا ہے قَدۡ مَكَرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَاَتَى اللّٰهُ بُنۡيَانَهُمۡ ۔ (النحل: ۲۷) ایسی باتیں پہلے لوگ بھی کرتے چلے آئے ہیں۔ گویا فرماتا ہے بیشک تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہہ دو کہ وہ موسیٰؑ کی نقل کرتا ہے یا ابراہیمؑ کی نقل کرتا ہے یا کسی اور نبی کی نقل کرتا ہے بہرحال اِس سے یہ ثابت ہوگا کہ وہ موسیٰؑ یا ابراہیمؑ کی نقل کر رہا ہے مگر تم اپنے اعمال کو دیکھو تم وہ کچھ کر رہے ہو جو فرعون نے کیا تھا یا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے دشمنوں نے کیا تھا یا نوحؑ کے دشمنوں نے کیا تھا۔ سو جس طرح پہلوں نے مخالفت کر کے نقصان اُٹھایا تھا تم بھی اُن کی نقل کر کے نقصان اُٹھاؤ گے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر الزام تو اُن لوگوں کی نقل کا ہے جو مقبولانِ بارگاہِ الٰہی تھے۔ اِس جگہ قیامت کا بھی ذکر ہے اور ساتھ ہی توحید کی تعلیم کا بھی۔ اور بتایا یہ گیا ہے کہ توحید اور قیامت کے متعلق محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو تعلیم دیتے ہیں تم اُسے بے شک نقل کہہ لو مگر بہرحال یہ وہی تعلیم ہے جو مُوسیٰؑ اور عیسیٰؑ نے دی۔ تم اس تعلیم کی مخالفت کرتے ہو اس لئے تمہاری مثال وہی ہے جو فریسیوں اور فقیہوں اور نمرود اور شدّاد وغیرہ کی تھی۔ نقل کرنے والا آخر اُس کے ساتھ ہی رہے گا جس کی وہ نقل کرتا ہے پھر تمہیں خوشی کس بات کی ہے۔

سورۂ مومنون سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہاں قیامتِ اُخروی کا ذکر ہے۔ کافر کہتے ہیں کہ قیامت کا ذکر پہلے لوگ بھی کرتے چلے آئے ہیں مگر اب تک آئی نہیں۔ جب پہلے لوگ بھی اس کا ذکر کرتے رہے اور اُن کے کہنے سے آئی نہیں تو تمہارے کہنے سے قیامت کس طرح آجائے گی۔ اللہ تعالیٰ اِس کا جواب دیتا ہے کہ خدا قدرتوں والا ہے یہ سوال کہ قیامت نہیں آئی اس کے دو ہی معنے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا قیامت نہیں لا سکتا دوسرے یہ کہ قیامت اب تک کیوں نہیں آئی۔ فرماتا ہے خدا کے فعل تمہارے سامنے ہیں اُن کو دیکھ کر تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قیامت نہیں آ سکتی۔ باقی رہا یہ کہ وہ نہیں آئی سو جب آئے گی آجائے گی یہ کیا سوال ہے کہ وہ اب تک نہیں آئی اپنے وقت پر یہ بات پُوری ہو جائے گی۔

سورۂ مومنون کی اِس آیت سے قیامت کے وعدے کا بھی ثبوت ملتا ہے اور وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ صرف اِس دُنیا کی قیامت کا ذکر قرآن کریم میں ہے اُن کی بھی تردید ہوتی ہے کیونکہ اِس دنیا کی قیامت کا وعدہ قرآن کریم میں تھا۔ مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ لَقَدۡ وُعِدۡنَا نَحۡنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ گویا وہ اپنے اباء کا بھی

ذکر کرتے ہیں جس سے دوسری قیامت ہی مراد ہو سکتی ہے۔قرآن کریم یہ نہیں کہتا کہ بعث بعد الموت کا کوئی وعدہ نہ تھا تم غلط کہتے ہو یا قیامتِ کُبریٰ کا کوئی وعدہ نہ تھا تم غلط کہتے ہو۔ بلکہ وہ اُن کے اعتراض کو اس جہت سے تسلیم کرتا ہے کہ ایسا وعدہ تھا اور دوسری جہت سے اس کی تردید کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں یہ بات ہے اور خدا بڑی قدرتوں والا ہے۔ پس اپنے وقت پر جا کر یہ بات پوری ہو جائے گی۔

سورۂ فرقان کی آیتوں سے ظاہر ہے کہ وہاں تعلیمات کا ذکر ہے اور الزام یہ لگایا گیا ہے کہ پُرانی تعلیمات کو نقل کر کے پیش کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس تعلیم میں جو قرآن کریم پیش کرتا ہے رازِ کائنات اور رازِ فطرت مخفی ہیں۔ اسرارِ آسمانی اور اسرارِ زمینی دونوں کو اِس میں کھول دیا گیا ہے یعنی خدا کا معاملہ جو بندوں سے ہوتا ہے اور بندوں کا معاملہ جو خدا سے ہوتا ہے اُس پر پُوری تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف مواقع پر بندے جس فطرت کا اظہار کرتے ہیں اُس کا اس تعلیم میں اظہار ہے۔ پھر جس تعلیم میں تمام قسم کی فطرتوں کے راز بیان ہیں خواہ وہ عرب میں ہوں یا ہندوستان میں ہوں۔ یا امریکہ میں ہوں یا یورپ میں ہوں۔ اور ہر قسم کی فطری ضروریات کا سامان اُس میں موجود ہے۔ اُدھر خدا تعالیٰ کے تمام قسم کے سلوک جو بندوں سے ہوتے ہیں چاہے وہ پہلے ہوئے ہیں یا نہیں اُن سب کو اس میں بیان کیا گیا ہے تو تم ان میں سے کس کس تعلیم کو نقل قرار دو گے۔ اور کون سی سابق تعلیم ایسی ہے جس میں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں۔ پہلی کتابیں وہ تھیں جن کا دائرۂ ہدایت بہت محدود تھا۔ وہ محدود الزمان اور محدود الاوقات تعلیمات تھیں اور پھر صرف ایک ایک علاقہ کے لئے تھیں ساری دُنیا کے لئے نہیں تھیں۔ اِسی لئے اِن کتب میں ہر فطرت کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ تورات میں صرف یہودی قوم کو مدنظر رکھا گیا ہے باقی قوموں کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ اِسی طرح سارے زمانوں کو مدنظر نہیں رکھا گیا مگر قرآن وہ کتاب ہے جو ساری قوموں اور سارے زمانوں کے لئے ہے۔ وہ یہودیوں کے لئے بھی ہے۔ وہ عیسائیوں کے لئے بھی ہے وہ مسلمانوں کے لئے بھی ہے وہ ہندوؤں کے لئے بھی ہے۔ وہ یوروپین لوگوں کے لئے بھی ہے۔ وہ چینیوں کے لئے بھی ہے۔ وہ جاپانیوں کے لئے بھی ہے۔ وہ وحشیوں کے لئے بھی ہے اور غیر وحشیوں کے لئے بھی ہے۔ غرض کوئی قوم ایسی نہیں جس کی ہدایت کے لئے قرآن نہ آیا ہو اور کوئی زمانہ ایسا نہیں ہے جس میں قرآن کی ضرورت سے انکار کیا جا سکتا ہو۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نہایت جامع ہدایات نازل فرمائی ہیں جو ہر فطرت کے مطابقِ حال ہیں اور ہر زمانہ میں اُن پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ جب قرآن کریم کی یہ شان ہے تو یہ لوگ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ یہ قرآن پہلی کتابوں کی نقل ہے۔

سورۂ نمل میں فرمایا ہے وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّ اٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ۔ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اِس آیت میں اُس طرح کا مضمون بیان ہوا ہے جس طرح سورۂ مومنون میں بیان کیا گیا تھا وہاں بھی فرمایا گیا تھا کہ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ۔ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ پس جو مضمون سورۂ مومنون میں بیان کیا گیا تھا وہی ایک ادنیٰ تغیر سے سورۂ نمل میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اُن کے اعتراض کو ردّ نہیں کیا بلکہ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ (النمل:۷۰) کہہ کر وہی جواب دیا گیا ہے جو سورۂ مومنون میں دیا تھا۔ اور اعتراض کو صحیح تسلیم کر کے اس کا ردّ بتایا ہے کہ یومِ آخر لازم وملزوم ہے دُنیوی قیامت سے۔ جب یہ ہوگئی تو سمجھو کہ وہ بھی ضرور ہوگی۔

ساتویں آیت سورۂ احقاف کی ہے اُس میں آتا ہے فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ مگر اس سے پہلے ہے وَ الَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِيْٓ ..... قَبْلِيْ وَ هُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ۔ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ اِس جگہ پر بھی قیامت کبریٰ کا ذکر ہے اور اس کا انکار کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ پہلے لوگوں نے بھی کہہ دیا تھا کہ قیامت آئے گی قیامت آئے گی اور اب تم نے بھی اُس ذکر کو دُہرا دیا۔

آٹھویں آیت سورۂ ن والقلم کی ہے۔ اِس میں کفّار کی طرف سے پیشگوئیوں کا انکار کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ گزشتہ نبیوں کے ذکر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ہمیں ڈرایا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اِس کا جواب یہ دیتا ہے کہ جب عملاً تم پر عذاب آجائے گا پھر تو نہ کہو گے یہ صرف گزشتہ نبیوں کے واقعات سے ہمیں ڈراتا ہے پھر تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ پیشگوئیاں ہیں یعنی جب یہ پیشگوئیاں ہیں تو نقل کس طرح ہوگئی۔ جب تمہاری ناک پر نشانِ ذلّت لگے گا۔ تم پر آسمان سے عذاب نازل ہوگا۔ تم دُنیا میں بالکل ذلیل اور حقیر ہو جاؤ گے اور اسلام ترقی کر جائے گا تب تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ گزشتہ لوگوں کی کہانیاں ہیں یا پیشگوئیاں ہیں۔

نویں آیت یہی سورۂ تطفیف کی آیت ہے جو اِس وقت زیر بحث ہے۔ اِس میں تینوں باتوں کا ذکر ہے۔ تعلیمات کا بھی اور بعثِ قریب اور بعثِ بعید کا بھی کہ ان کو یہ لوگ غلط قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پُرانی تعلیمات ہیں یا پُرانی حکایات ہیں یا پُرانے لوگوں نے بھی اِسی طرح ڈرایا تھا مگر ہوا اس طرح نہیں۔ فرماتا ہے یہ دونوں امور پُورے ہو کر رہیں گے۔ بعثِ قریب بھی اور بعثِ بعید بھی اور اُن کا نقل کا الزام بھی درست نہیں ہے کیونکہ نقّال تو یہ بھی ہیں چنانچہ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ کہہ کر اس بات کو واضح کیا ہے کہ جو پہلے انبیاء کے دُشمنوں کے حالات ہیں وہ

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے کفار سے ملاؤ تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہی کے حالات لکھے ہوئے ہیں۔ پس فجّار جو کچھ کر رہے ہیں وہ پہلے کفار کی کتابوں میں مل جائیں گے۔ اس لئے نقل تو وہ بھی کرتے ہیں مگر سجّین کی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی بے شک نقل کرتے ہیں مگر عِلّیّین کی۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اعمال پر اگر تم غور کرو تو وہ تمہیں موسیٰ ؑ اور اور عیسیٰ ؑ اور ابراہیم ؑ اور نوح ؑ اور دوسرے انبیاء میں نظر آجائیں گے اور یہ سیدھی بات ہے کہ نیک نیک کی نقل کرے گا اور بُرا بُرے کے پیچھے چلے گا۔ پس یہ الزام بے حقیقت ہے اس میں گویا یوں جواب دیا کہ نقل کرنا بھی تو آسان کام نہیں۔ آخر وجہ کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تو موسیٰ ؑ کی نقل کر لی۔ عیسیٰ ؑ کی نقل کر لی۔ ابراہیم ؑ کی نقل کر لی۔ نوح ؑ کی نقل کر لی۔ مگر تم نے نہ کی؟ آخر تم جو کہتے ہو کہ اُس نے نقل کر لی۔ نقل کر لی۔ تم بھی نقل کر لو۔ مگر تمہارا سجّین والوں کی نقل کرنا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عِلّیّین والوں کی نقل کرنا یہ خود اپنی ذات میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک خوبی کا ثبوت ہے الزام کی بات نہیں۔ اِس سوال کا ایک اور جواب سورۂ فرقان میں آچکا ہے۔

اُوپر کے جوابات سے ظاہر ہے کہ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ کفّار نے تین مواقع پر کہا ہے۔ ایک انکارِ قیامت کے موقع پر یعنی جب بھی قیامت کا ذکر کیا جاتا وہ کہتے تھے کہ پہلے لوگ بھی ایسا ڈراوا جھوٹے طور پر دیتے رہے ہیں اور تم بھی یہ ڈراوا جھوٹے طور پر دے رہے ہو۔ پہلوں کی بات بھی جھوٹی نکلی اور تمہاری بات بھی جُھوٹی ہے اب تک تو قیامت آئی نہیں۔ اس موقع پر کفار پہلوں کو بھی جُھوٹا کہتے تھے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جھوٹا کہتے تھے کہ نہ پہلوں کی بات پُوری ہوئی اور نہ تمہاری بات پوری ہوگی۔

دوسرا موقعہ جب کفار اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ کہہ کر الزام لگایا کرتے تھے وہ ہوتا تھا جب بعثِ قریب کا اُن کے سامنے ذکر کیا جاتا۔ جب اسلام کی ترقی اور اُس کے غلبہ کا ذکر کیا جاتا اور کُفر کی تباہی کی پیشگوئیاں کی جاتیں تو اِس موقعہ پر بھی وہ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ کہہ دیا کرتے تھے۔ مگر اس موقعہ پر وہ پہلوں کو جُھوٹا نہیں قرار دیتے تھے بلکہ یہ کہتے تھے کہ پہلے راستبازوں کی زندگی کی مثالیں تم اپنے اُوپر چسپاں کر لیتے ہو اور اس طرح لوگوں کو مرعوب کرتے ہو حالانکہ تم سے وہ معاملہ نہ ہوگا کیونکہ وہ سچے تھے اور تم نعوذ باللہ جھوٹے ہو یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آج کل غیر احمدیوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ تم مرزا صاحب ؑ کی صداقت ثابت کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام کیوں لیتے ہو یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مثالیں کیوں پیش کرتے ہو اُن کا اور تمہارا آپس میں جوڑ ہی کیا ہے کہ تم پہلے راستبازوں کی مثالیں دینی شروع کر دیتے ہو اور کہتے ہو کہ موسیٰ ؑ نے بھی یوں کیا اور عیسیٰ ؑ نے بھی یوں کیا اور محمد رسول

اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی یوں کیا۔ یہی طریق رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کے مخالفین کا تھا۔ وہ بھی کہتے کہ تم تو لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے پہلے مقدس لوگوں کی زندگی کی مثالیں اپنے اُوپر چسپاں کر لیتے ہو حالانکہ تم سے وہ معاملہ نہیں ہوگا۔ وہ سچّے تھے اور تم نعوذ باللہ جُھوٹے ہو۔

تیسرا موقعہ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہہ کر الزام لگانے کا یہ ہوتا تھا کہ کفّار اسلام کی تعلیم کی مشابہت پہلے نبیوں کی تعلیم سے دیکھ کر کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ تو پہلے لوگوں کی باتوں کی نقلیں ہیں۔ مثلاً قرآن کو دیکھا کہ اُس میں ایک تعلیم دی گئی ہے اور پھر وہی تعلیم اُنہیں یا موسٰیؑ یا عیسٰیؑ کی کتاب میں نظر آ جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ پہلے بزرگوں کی تعلیمات کو تم نقل کر کے پیش کر دیتے ہو تمہاری اِس میں کیا خوبی ہے۔ گویا تعلیمات کی خوبی وہ تسلیم کرتے تھے۔ ان تعلیمات کے پیش کرنے والوں کی بزرگی کو بھی وہ تسلیم کرتے تھے۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کا انکار کرتے تھے محض اس لئے کہ نقل سے کسی کی برتری ثابت نہیں ہوتی۔ اگر تم نے موسیٰؑ کی تعلیم کی نقل کر لی ہے یا عیسٰیؑ کی تعلیم کی نقل کر لی ہے تو یہ کس طرح ثابت ہو گیا کہ تم اپنے دعویٰ میں سچّے بھی ہو۔ غرض اِن تین مواقع پر الگ الگ اعتراض ہیں اور الگ الگ معنوں میں کفّار نے اِس دلیل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کبھی وہ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کے یہ معنے لیتے تھے کہ یہ پہلوں کی نقل کی ہوئی حکایتیں ہیں۔ کبھی کہتے کہ یہ پہلوں کے متعلق بے جوڑ باتیں ہیں یُونہی ان انبیاء کے واقعات اپنے اُوپر چسپاں کرنا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ نہ کوئی تعلق ہوتا ہے نہ جوڑ ہوتا ہے نہ واسطہ ہوتا ہے۔ پھر کبھی اِن معنوں میں وہ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہا کرتے کہ یہ پہلوں کی لکھی ہوئی باتیں ہیں۔ یعنی جو تعلیمیں پیش کی جا رہی ہیں وہ وہی ہیں جو موسیٰؑ یا عیسٰیؑ یا اور انبیاء نے دیں کوئی نئی تعلیم اُن میں نہیں ہے۔

جب انکارِ قیامت کے موقعہ پر وہ ایسا کہتے تھے تو اُن کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ پہلے لوگوں نے بھی ایسے قصّے بنا لئے تھے اب تم نے بھی ویسی باتیں کہنی شروع کر دی ہیں نہ پہلے لوگوں کے کہنے کے بعد قیامت آئی اور نہ اب قیامت آسکتی ہے۔ وہ بھی جُھوٹا ڈراوا دیتے رہے اور تم بھی جُھوٹا ڈراوا دے رہے ہو۔ گویا وہ بھی جھوٹے اور تم بھی جھوٹے۔

جب وہ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کا الزام اِس طور پر لگایا کرتے تھے کہ پہلے لوگوں کے متعلق بے جوڑ باتیں کہی جاتی ہیں تو ان کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ یہ باتیں تو سچّی ہیں اور پہلے راستباز بھی سچّے تھے مگر تم یونہی اُن باتوں کو اپنے اُوپر چسپاں کرنے لگ گئے ہو حالانکہ وہ سچّے تھے اور تم جھوٹے ہو۔

تیسرے اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کا الزام وہ اِن معنوں میں لگایا کرتے تھے کہ پہلے بزرگوں کی تعلیمات کو نقل کر کے

پیش کر دیا جاتا ہے اِس میں تمہاری کیا خوبی ہے۔

غرض کفار کے یہ تین اعتراض اساطیرؔ کے تین معنوں کے مطابق ہیں اور قرآن کریم نے بھی اُن کے الگ الگ جواب دیئے ہیں۔ اس جگہ چونکہ تعلیمات کا بھی ذکر تھا اور بعث بعد الموت کا بھی اور بعث قومی کا بھی اس لئے یہاں جو جواب دیا گیا ہے وہ اِن تینوں مضمونوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ بعثِ قریب کا جو انکار تھا اُس کے متعلق فرماتا ہے کہ اقوامِ مغرب جو سمجھتی ہیں کہ اُن کو کوئی تنزل نہیں آئے گا آخر اِسی دُنیا میں گر جائیں گی۔ ذلیل ہوں گی اور اسلام اُن کی جگہ لے لے گا اور یہ ثبوت ہو گا بعثِ بعد الموت کے قائم ہونے کا۔ گویا اِس ایک بعث سے دوسرے بعث کا ثبوت مل جائے گا۔

تیسری بات یہ تھی کہ یہ لوگ اسلام پر نقل کا الزام لگاتے تھے اس کا جواب یہ دیا کہ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ محمد رسول اللہؐ بیشک نقل کرتا ہے مگر جب بھی کرتا ہے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی ہی کرتا ہے۔ یہ مان لو کہ وہ نقل کرتا ہے مگر آخر یہ کیا بات ہے کہ وہ جب بھی نقل کرتا ہے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاءؑ کی ہی کرتا ہے اور تم جب بھی نقل کرتے ہو فرعون اور اس کے ساتھیوں کی ہی کرتے ہو۔ پھر تمہارے مُنہ پر یہ زیب کس طرح دیتا ہے کہ تم کہتے ہو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جھوٹے ہیں آخر بات کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ جب بھی پڑتا ہے موسیٰؑ کے ہاتھ پر پڑتا ہے اور تمہارا ہاتھ جب بھی پڑتا ہے فرعون پر پڑتا ہے۔ وہ نبیوں کی تعلیمات پر چلتا ہے اور تم اُن نبیوں کی تعلیمات سے دُور بھاگتے اور شیاطین کے پیچھے جاتے ہو آخر کوئی مشابہت صحیحہ ہی ہے جو دونوں میں کام کر رہی ہے۔ اگر دونوں کی باتیں علّیّین کے ہمرنگ ہوتیں اور کفّار بھی انبیاءؑ کی سی باتیں کہتے تو معاملہ مشتبہ ہو جاتا کہ دونوں میں سے کون سچا ہے کیونکہ وہ بھی موسیٰؑ کی بات کہتے اور یہ بھی موسیٰؑ کی بات کہتا وہ بھی عیسیٰؑ کی بات کہتے اور یہ بھی عیسیٰؑ کی بات کہتا۔ اُن کے اعمال بھی موسیٰؑ کی طرح کے ہوتے اور اُس کے اعمال بھی موسیٰؑ کی طرح کے ہوتے۔ اُن کے اعمال بھی عیسیٰؑ کی طرح کے ہوتے ہیں اور اُس کے اعمال بھی عیسیٰؑ کی طرح کے ہوتے۔ مگر یہاں تو ایک بیّن فرق اور نمایاں امتیاز نظر آتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اعمال موسیٰؑ سے ملتے ہیں اور تمہارے اقوال اور تمہارے اعمال فرعون سے ملتے ہیں۔ یہ ابرارؔ کے قدم پر چلتا ہے اور تم فجّارؔ کے قدم پر چلتے ہو اور خود اپنے نبیوں کے خلاف تعلیمات دیتے ہو یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نبیوں کے نقشِ قدم پر ہے اور تم اُس کے دشمنوں کے قدم پر ہو۔ پس نقل کا الزام بالکل غلط ہے یہ نقل نہیں بلکہ مشابہت ہے اور مشابہت بھی علّیّین کی۔ اس لئے یہ مشابہت اس کی سچائی کی علامت ہے۔

اِس جگہ پر یہ بھی یاد رکھنے والی بات ہے کہ جہاں کفّارِ مکہ نے اساطیر الاوّلین کا الزام قرآن کریم پر لگایا تھا وہاں آج تیرہ سو سال کے بعد یوروپین لوگوں نے بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر یہی الزام لگایا ہے (ینابیع الاسلام) اور پادری ٹسڈل نے ''ماخذ قرآن'' لکھ کر ثابت کیا ہے کہ قرآن دوسری کتابوں سے نقل کیا گیا ہے۔

سورۂ تطفیف میں چونکہ یوروپین قوموں کا ذکر ہے اس لئے یہ بھی ایک مشابہت ہے جو یوروپین لوگوں کی کفّارِ مکّہ سے ہے۔ کہ جو باتیں کفّار مکّہ نے کہی تھیں وہی اُنہوں نے کہنی شروع کر دیں اور اُن سے بھی خدا تعالیٰ نے ایسی کتابیں لکھوا دیں جن میں وہی اعتراض دُہرایا گیا ہے جو کفّارِ مکّہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر کیا کرتے تھے۔

گو یا اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ میں یہ پیشگوئی مخفی تھی کہ آئندہ زمانہ میں جب عیسائی غالب آ جائیں گے یہی الزام اسلام اور قرآن پر عائد کریں گے۔ چنانچہ ''ماخذ قرآن'' میں خصوصیّت سے اِسی موضوع پر بحث کی گئی ہے کہ قرآن دوسری کتابوں کی نقل ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی کتابیں عیسائیوں کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں جن میں قرآن کریم پر یہی الزام لگایا گیا ہے۔

الغرض فرماتا ہے اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ یعنی جب اُن کے سامنے ہماری باتیں پیش کی جائیں گی تو وہ کہیں گے کہ یہ اساطیر الاوّلین ہیں یعنی یہ لوگ جو مکذّب بالدین ہیں جب اُن کے سامنے قرآن کریم کی تعلیم پیش کی جائے گی تو وہ کہیں گے کہ یہ کیا کتاب ہے اِس میں کچھ باتیں ویدؔ سے نقل کی گئی ہیں۔ کچھ تورات سے نقل کی گئی ہیں۔ کچھ انجیل سے نقل کی گئی ہیں۔ کچھ ژندؔ اوستا سے نقل کی گئی ہیں۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں دیا ہے۔ لیکن اگر کوئی غور کرنے والا ہو تو یہی جواب کتنا واضح ہے کہ تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر کیا الزام لگاتے ہو۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو وہ ہیں جنہوں نے پہلے سے تمہاری نسبت یہ خبر دے رکھی تھی کہ تم ایک زمانہ میں ایسا الزام لگاؤ گے۔ پس یہ الزام اُن کو جھوٹا ثابت کرنے والا نہیں بلکہ اُن کی صداقت کو اور بھی واضح کرنے والا ہے۔

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۱۵

ہرگز (ایسا) نہیں (جو وہ کہتے ہیں) بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) اُن کے دلوں پر اُس نے جو وہ کما چکے ہیں۔ زنگ لگا دیا ہے۔

حَلِّ لُغَات۔ كَلَّا: مَعْنَاهُ الرَّدْعُ وَالزَّجْرُ یعنی كَلَّا کے معنے زجر کے بھی ہوتے ہیں اور دھتکارنے

کے بھی ہوتے ہیں۔ اُردو میں اس کا ترجمہ کیا جائے تو یہ ہوگا کہ بس بس رہنے دو! یا اس کا ترجمہ ہوگا۔ ہوش سے بات کرو۔ کُلّیات ابی البقاء میں لکھا ہے وَقَدْ تَجِيءُ بَعْدَ الطَّلَبِ لِنَفْيِ إِجَابَةِ الطَّالِبِ۔ یہ کسی مطالبہ کے جواب میں آیا کرتا ہے یہ بتانے کے لئے کہ مطالبہ کرنے والے کی بات ہم ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یعنی کبھی کبھی کَلَّا کا لفظ اِن معنوں میں استعمال ہوتا ہے یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ استعمال اُس وقت ہوتا ہے جبکہ مثلاً کسی نے تجھے کہا کہ اس اس طرح کام کرو۔ اور تم آگے سے جواب دو کہ کَلَّا أَيْ لَا يُجَابُ لِذَالِكَ۔ یہ بات ایسی نہیں جسے کوئی مان نہ سکے۔ اور کبھی یہ بمعنے حقًّا بھی استعمال ہوتا ہے جیسے آتا ہے کَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغٰى (اقرب) یعنی سچّی بات یہ ہے کہ انسان تو سرکشی کرتا ہے۔

رَانَ: رَانَ الشَّيْءُ فُلَانًا وَعَلَيْهِ وَبِهٖ (يَرِيْنُ رَيْنًا وَرُيُوْنًا) کے معنے ہوتے ہیں غَلَبَ عَلَيْهِ (اقرب) گویا لفظ رَیْن تین طرح استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ رَانَ الشَّيْءُ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ رَانَ عَلَى الشَّيْءِ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ رَانَ بِهٖ اور ان تینوں صورتوں میں اس کے معنے ہوں گے۔ اس پر غالب آ گیا۔ نیز کہتے ہیں رَانَتِ النَّفْسُ۔ جس کے معنے ہوتے ہیں خَبُثَتْ وَغَثَتْ نفس گندہ ہو گیا یا فریب میں مبتلا کر دیا گیا۔ (اقرب) اَلرَّيْنُ کے معنے ہوتے ہیں صَدَأٌ يَعْلُوا الشَّيْءَ الْجَلِيَّ۔ وہ زنگ جو کسی چیز پر لگ جاتا ہے (مفردات) پس رَانَ کے معنے ہوں گے۔ زنگ لگ گیا۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے۔ اے قرآن مجید کو اساطیر الاوّلین کہنے والو! ہوش کی دوا کرو! سنبھل کر بات کرو! اِس بات کا احساس کرو کہ تم کس چیز کے متعلق الزام لگا رہے ہو!۔

بل کا عربی زبان میں دو معنوں کے لئے استعمال بَلْ کا لفظ جو اس آیت میں استعمال ہوا ہے یہ تدارک کے لئے آتا ہے اور اس کے دو معنے ہوتے ہیں۔

اوّل۔ بَلْ کا لفظ ان معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے کہ (الف) اس سے پہلے بیان کی تردید اور بعد میں بیان ہونے والے مضمون کی تصدیق مقصود ہوتی ہے۔ اور (بَاء) کبھی بَلْ سے پہلے بیان کردہ مضمون کی تصدیق اور بعد میں بیان کردہ مضمون کی تردید مقصود ہوتی ہے۔ بَلْ سے پہلے بیان کردہ مضمون کی تردید اور بعد میں بیان کردہ مضمون کی تصدیق کی مثال یہی سورۂ تطفیف کی آیت ہے۔ اِس میں بَلْ سے پہلے جو مضمون بیان ہوا ہے یعنی کفّار کا الزام کہ قرآن کریم اساطیر الاوّلین ہے اس کی تردید کی گئی ہے اور بَلْ کے بعد جو مضمون بیان ہوا ہے۔ یعنی رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ اس کی تصدیق کی گئی ہے اور دوسرے استعمال یعنی پہلے کی تصدیق اور دوسرے کی تردید کی

مثال سورۂ صٓ کی یہ آیت ہے۔ صٓ وَ الْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ۔ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ (ص:۲، ۳) یعنی قرآن کریم کا ذِی الذِّكْر ہونا تو سچا ہے مگر ان کا انکار جھوٹا ہے۔ اُن کے انکار کی یہ وجہ نہیں کہ قرآن کریم میں ذکر کی اہلیت نہیں بلکہ اُن کے انکار کی یہ وجہ ہے کہ یہ تکبّر اور صداقت سے تنفّر کی مرض میں مبتلا ہیں۔ دوسری مثال اس کی سورۂ ق کی آیت قٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۔ بَلْ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ (ق:۲، ۳) کی ہے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے مجید ہونے میں شبہ نہیں لیکن اُن کا انکار اُن کی جہالت کی وجہ سے ہے اور وہ جہالت یہ ہے کہ یہ اپنے میں سے ایک مُنذر کے آنے پر متعجب ہیں اور اصل کلام پر غور ہی نہیں کرتے۔

دوم۔ دوسری قسم بَلْ کی یہ ہوتی ہے کہ وہ نہ پہلے مضمون کی تردید کرتا ہے نہ دوسرے کی بلکہ بغیر پہلے مضمون کی تردید کرنے کے وہ بَلْ کے بعد ایک زائد صداقت بتاتا ہے۔ جیسے سورۂ انبیاء رکوع ۱ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۔ (الانبیاء:۶) اِس میں ہر بَلْ پہلے کی بھی تصحیح کرتا ہے اور بعد کی بھی مثلاً پہلے بَلْ کے بعد ہے قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ اِس سے پہلے قرآن کریم میں کفّار کا یہ اعتراض مذکور ہوا ہے کہ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ کہ کیا تم سحر پر ایمان لاتے ہو ایسی حالت میں کہ تم اپنی آنکھوں سے اُس کو دیکھ رہے ہو۔ اِس کے بعد فرماتا ہے بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ یہاں بَلْ کا لفظ لا کر اللہ تعالیٰ نے پہلے مضمون کی تردید نہیں کی۔ یہ نہیں کہا کہ وہ سحر کا الزام نہیں لگاتے بلکہ ایک مزید بات یہ کہی ہے کہ وہ قرآن پر صرف سحر کا الزام ہی نہیں لگاتے بلکہ ایک زائد الزام یہ بھی لگاتے ہیں کہ وہ پراگندہ خوابیں ہیں۔ اس کے بعد پھر بَلْ کو دُہرایا ہے اور اس کے ساتھ ایک اور الزام بھی بیان کیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ پراگندہ خوابوں کا ہی الزام نہیں لگاتے بلکہ اِفْتَرٰىهُ بھی کہتے ہیں یعنی نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے افتراء کر کے یہ کلام بنا لیا ہے۔ پھر بَلْ کا لفظ تیسری دفعہ دُہرایا ہے اور اس کے بعد ایک چوتھا الزام بیان کیا ہے کہ هُوَ شَاعِرٌ وہ چوتھا الزام یہ لگاتے ہیں کہ یہ تو شاعر ہے دل لبھانے والی باتیں کر کے نوجوانوں کو ورغلا لیتا ہے۔ گویا ہر دفعہ بَلْ لا کر پہلے مضمون کی تردید کئے بغیر اُس پر ایک زائد بات بتائی کہ وہ صرف ایک الزام نہیں لگاتے۔ بلکہ یہ الزام بھی لگاتے ہیں اور وہ الزام بھی لگاتے ہیں اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے لَوْ یَعْلَمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا حِیْنَ لَا یَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَ لَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ۔ بَلْ تَاْتِیْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ (الانبیاء:۴۰، ۴۱) اس میں بھی بَلْ سے پہلے مضمون کی تصدیق کرتے ہوئے آگے ایک مزید بات بتائی ہے کہ علاوہ اس کے کہ عذاب اِس قدر سخت ہوگا کہ وُہ اُسے دُور نہیں کر سکیں گے۔ وہ ایسا اچانک آئے گا کہ دل دھڑک جائیں گے اور عقلیں ماری جائیں گی۔

اِس سورۃ میں بَلْ ﷺ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ میں لفظ بَلْ کا استعمال اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ کے الزام کی تردید کرنے کے لئے آیا ہے کہ قرآن کریم کے متعلق یہ الزام لگانا بالکل غلط ہے اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ خود جہالت میں مبتلا ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں پر رَیْن لگ گیا ہے۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے رَیْن کے معنے غالب آجانے اور زنگ لگ جانے کے ہی ہیں۔

دلوں پر رین لگنے کی تشریح فراء کے نزدیک فرّاء کہتے ہیں کَثُرَتْ مِنْھُمُ الْمَعَاصِیْ وَالذُّنُوْبُ فَاَحَاطَتْ بِقُلُوْبِھِمْ فَذَالِکَ الرَّیْنُ یعنی رین کا مفہوم یہ ہے کہ اُن کے گناہ یا اُن کی نافرمانیاں اتنی بڑھ گئیں کہ اُن گناہوں اور نافرمانیوں نے اُن کے دلوں کا احاطہ کر لیا اور اُن کی اصلاح ناممکن ہو گئی۔ حسنؔ کہتے ہیں کہ ھُوَ الذَّنْبُ عَلَی الذَّنْبِ حَتّٰی یَعْمَی الْقَلْبُ یعنی رَین کے معنے گناہ پر گناہ کئے جانے کے ہیں یہاں تک کہ دل اندھا ہو جائے (فتح البیان زیر آیت ھذا)۔ گویا فراء کے نزدیک قرآن کریم نے رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کے الفاظ اِن معنوں میں استعمال فرمائے ہیں کہ اُن کے گندے اعمال نے اُن کے دلوں کا احاطہ کر لیا اور حسن بصری یہ کہتے ہیں کہ اُن کے بُرے اعمال کی وجہ سے یعنی اس وجہ سے کہ بار بار گناہوں کا عمل اُن سے صادر ہوا۔ اُن کے دل صداقت کو معلوم کرنے کی قوت سے محروم ہو گئے۔

رین کے لفظ کا اس وقت استعمال جب کوئی گندے اعمال میں پھنس جائے اور نکل نہ سکے

ابوزیدؔ کہتے ہیں کہ یُقَالُ قَدْرِیْنَ بِالرَّجُلِ رَیْنًا اِذَا وَقَعَ فِیْمَا لَا یَسْتَطِیْعُ الْخُرُوْجَ مِنْہُ وَلَا قِبَلَ لَہٗ بِہٖ (فتح البیان زیر آیت ھذا) یعنی قَدْرِیْنَ بِالرَّجُلِ رَیْنًا ایک محاورہ ہے اور یہ محاورہ اُس وقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی شخص ایسے گند میں مبتلا ہو جائے کہ نہ اُس سے نکل سکے اور نہ اُس کا مقابلہ کر سکے۔ اِس لحاظ سے رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کے معنے یہ ہوں گے کہ اُن کے اعمالِ بد کی وجہ سے آخر وہ دن آ گیا کہ اگر وہ چاہیں بھی کہ ہم بدی سے نکل جائیں تو وہ نہیں نکل سکتے تھے۔

رین، طبع اور اقفال میں فرق ابومعاذ نحوی کہتے ہیں کہ اَلرَّیْنُ اَنْ یَّسْوَدَّ الْقَلْبُ مِنَ الذُّنُوْبِ وَالطَّبْعُ اَنْ یُّطْبَعَ عَلَی الْقَلْبِ وَھُوَ اَشَدُّ مِنَ الرَّیْنِ وَالْاِقْفَالُ اَشَدُّ مِنَ الطَّبْعِ (تفسیر فتح البیان زیر آیت ھذا) یعنی رَین کے معنے گناہوں کی وجہ سے انسان کا دل سیاہ ہو جانے کے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں رَین کی جگہ طبعؔ کا لفظ بھی آتا ہے اور طبعؔ کے معنے یہ ہیں کہ اُن کے دلوں پر مہر لگ گئی ہے۔ اِسی طرح قرآن کریم میں کفّار کے دلوں کے متعلق اقفالؔ یعنی تالوں کا لفظ بھی آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ طبعؔ کا لفظ رَینؔ سے زیادہ سخت ہے اور اقفالؔ کا لفظ طبعؔ سے

زیادہ سخت ہے۔لیکن میرے نزدیک یہ بات درست نہیں۔ یہ تینوں لفظ یعنی رَینؔ طبعؔ اور اقفالؔ الگ الگ مضمون بیان کرنے کے لئے آئے ہیں۔رَین اصل میں زنگ کو کہتے ہیں اور زنگ اس بات کا نام ہوتا ہے کہ جس چیز پر زنگ لگا ہے وہ اپنی ذات میں گُھلنی شروع ہوگئی ہے۔زنگ اسی کو کہتے ہیں کہ کوئی باہر کی چیز اثر کر کے دوسری چیز میں تغیّر پیدا کر دیتی ہے۔لوہے کو زنگ لگتا ہے تو اس کا بھی یہی مطلب ہوتا ہے کہ باہر سے نمی پہنچی اور اُس کا آکسائیڈ بننا شروع ہو گیا یا تانبہ Copper کو زنگ لگتا ہے تو اس کا بھی یہی مطلب ہوتا ہے کہ اُس میں بیرونی اثرات کی وجہ سے تغیّر پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔پس رَینؔ کا لفظ اس مفہوم پر دلالت کرتا ہے کہ کسی چیز کے اندر تغیّر پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے اور وہ اپنی ماہیت کو چھوڑ بیٹھی ہے۔اس تغیّر کا اظہار کرنے کے لئے رینؔ کا لفظ بولا جاتا ہے لیکن طبعؔ کا لفظ اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُس نے دوسرے کے نقش کو قبول کر لیا کیونکہ طبعؔ کے معنے مُہر کے ہوتے ہیں۔پس جب ہم طبعؔ کا لفظ بولتے ہیں تو ہمارا اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اُس نے دوسرے کے نقش کو قبول کر لیا۔اس کے مقابلہ میں جب ہم اقفالؔ کا لفظ بولتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب یہ چیز اپنے زور سے نہیں کُھل سکتی۔خدا ہی اس کو کھولے تو یہ کُھل سکتی ہے۔پس یہ تین قسم کی الگ الگ کیفیّتیں ہیں جن کے لئے رینؔ، طبع اور اقفالؔ کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔یہاں رینؔ کا لفظ یہ بتانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے کہ اُن پر بیرونی گناہوں کا اس قدر اثر ہوا ہے کہ قلب جو نیکی کا منبع تھا اُس کی ماہیت ہی بدل گئی ہے اور وہ اب بدی پر دلیر ہو گیا ہے لیکن طبعؔ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اُن کے دلوں پر گناہوں کا ٹھپّہ لگ گیا ہے یعنی وہ چوٹی کے گنہگار ہو گئے ہیں کیونکہ ٹھپّہ والی چیز معیاری چیز ہوتی ہے۔اور اقفال کے لفظ نے یہ بتایا کہ اُن کی حالت ایسی ہو چکی ہے کہ اب اللہ تعالیٰ ہی اُن کے دلوں کے تالے کھولے تو وہ کُھلیں گے کوئی انسان اُن کو کھولنے کی طاقت نہیں رکھتا یعنی آپ اپنی اصلاح کرنی اُن کے اختیار سے باہر ہو گئی ہے۔

رینؔ کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی ایک حدیث مروی ہے جو یہ ہے عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اَذْنَبَ ذَنْبًا نُکِتَتْ فِیْ قَلْبِهٖ نُکْتَةٌ سَوْدَاءُ فَاِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُهٗ وَاِنْ عَادَ زَادَتْ حَتّٰی تَغْلُفَ قَلْبُهٗ فَذَالِكَ الرَّیْنُ الَّذِیْ ذَکَرَهُ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ فِی الْقُرْاٰنِ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ۔ احمد۔ترمذی۔نسائی۔ابن ماجہ اور ابن جریر وغیرہ سب نے بتغیّر الفاظ اس روایت کو بیان کیا ہے۔حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو نُکِتَتْ فِیْ قَلْبِهٖ نُکْتَةٌ سَوْدَاءُ اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ ڈال دیا جاتا ہے۔مطلب یہ کہ بدی کی رغبت

اُس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے فَاِنْ تَابَ اگر وہ توبہ کر لے وَنَزَعَ اور اپنے نفس کو پیچھے کھینچ لے وَاسْتَغْفَرَ اور استغفار کرے تو صُقِلَ قَلْبُهٗ اُس کا دل صاف ہو جاتا ہے وَاِنْ عَادَ اور اگر وہ پھر گناہ کرے توزَادَتْ حَتّٰی تَغْلُفَ قَلْبُهٗ یہ سیاہی بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک دن اُس کے دل کو بالکل ڈھانپ لیتی ہے اس کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا فَذَالِكَ الرَّيْنُ الَّذِيْ ذَكَرَهُ اللهُ سُبْحَانَهٗ فِي الْقُرْاٰنِ۔ یعنی اسی حالت کی طرف قرآن کریم نے رین کے لفظ سے اشارہ فرمایا ہے۔

بَلْ ٞ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ الخ میں ایک نفسیاتی نکتہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک زبردست نفسیاتی و اخلاقی نکتہ بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر عمل اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ ہر عمل کا اثر وہی نہیں جو اُس عمل کے ساتھ متعلق ہے بلکہ اس کے علاوہ اُس کا اثر انسان کے اخلاق اور اُس کی عقل اور اُس کے علم کے آئندہ ظہور پر بھی پڑتا ہے۔

جھوٹ بولنے کے چار اثر ایک شخص جھوٹ بولتا ہے تو جھوٹ سے تعلق رکھنے والا جو اثر ہے وہ یہ ہے۔ کہ اوّل وہ دوسروں میں بدنام ہو جاتا ہے اس کا اعتبار جاتا رہتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے عاجل یا آجل عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ جس کے خلاف جھوٹ بولا جاتا ہے وہ اس کا دشمن ہو کر اُس کے نقصان کے درپے ہو جاتا ہے پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض راستباز دوست اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ تم جھوٹے آدمی ہو ہم تمہارے ساتھ دوستی نہیں رکھ سکتے یہ تو اُس جھوٹ کے طبعی اور منفرد اثرات ہیں مگر ان کے علاوہ ہر گناہ کا ایک اور اثر بھی ہوتا ہے جو انسان کے دماغ اور اُس کے دل پر پڑتا ہے۔ مثلاً میں نے جھوٹ کی مثال دی تھی۔ جب کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو اُسکے دماغ اور دل پر اس کا پہلا اثر یہ پڑتا ہے کہ جھوٹ سے نفرت کم ہو جاتی ہے اور آئندہ جھوٹ بولنا اُس کے لئے آسان ہو جاتا ہے یہی حال اَور گناہوں کا ہے۔ پہلی دفعہ چوری کرتے ہوئے یا پہلی دفعہ جھگڑا کرتے ہوئے یا پہلی دفعہ گالیاں دیتے ہوئے یا پہلی دفعہ فساد کرتے ہوئے یا پہلی دفعہ قتل کرتے ہوئے انسان ڈرتا ہے کہ اگر میں نے ایسا کیا تو کہیں پکڑا نہ جاؤں یا لوگوں میں بدنام نہ ہو جاؤں مگر جب ایک دفعہ وہ ایسا فعل کر لیتا ہے تو اُس کے دماغ پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ نہ صرف بدی کی نفرت اُس کے دل سے کم ہو جاتی ہے بلکہ دوسری دفعہ جھوٹ بولنا یا دوسری دفعہ چوری کرنا یا دوسری دفعہ گالیاں دینا اور فساد کرنا اُس کے لئے آسان ہو جاتا ہے اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اِن افعال کو کرنا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرا اثر انسان کے دماغ اور اُس کے دل پر یہ پڑتا ہے کہ بوجہ ایک بدی کے ارتکاب کے دوسری بدیوں سے بھی اُس کی نفرت کم ہو جاتی ہے جو شخص چوری کرتا ہے اُس کے لئے اور جرائم کا ارتکاب نسبتاً آسان ہو جاتا ہے کیونکہ چوری کا فعل خدا تعالیٰ کی نافرنی کا احساس کم کر دیتا ہے۔ یہی حال

جھوٹ اور دوسرے گناہوں کا ہے ہر گناہ اپنی ذات میں بھی بُرا ہوتا ہے لیکن ہر گناہ کا ایک خارجی اثر یہ ہوتا ہے کہ اور گناہوں سے نفرت کم ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی نافرمانی میں انسان بڑھتا چلا جاتا ہے۔

تیسرا اثر اس کا یہ پڑتا ہے کہ بوجہ خود ارتکابِ بدی کے انسان دوسروں پر بھی بدظنی کرنے لگ جاتا ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ جب میں نے یہ فعل کیا ہے تو دوسرے بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے۔ ایک شخص سچ بول رہا ہوتا ہے مگر وہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں سچ کون بولتا ہے یہ بھی جھوٹ ہی بول رہا ہے اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ خود جھوٹ بولنے کا عادی ہوتا ہے۔ اس طرح وہ صداقت کے معلوم کرنے سے محروم ہو جاتا ہے اور بجائے سچ سے فائدہ اٹھانے کے غلط محرّکات دوسروں کے افعال کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ سچائی اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے مگر وہ اس پر غور کرنے کی بجائے اس کو ردّ کر دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جس طرح میں جھوٹ بول رہا ہوں اسی طرح یہ بھی جھوٹ بول رہا ہے جس طرح میں فریب سے کام لیتا ہوں اسی طرح فلاں بھی فریب کرتا ہے۔

چوتھا اثر اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ گناہوں کے نتیجہ میں صادقوں کی معیّت سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ اُس کے نزدیک کوئی صادق ہوتا ہی نہیں۔ سب لوگوں کو وہ اپنی طرح جھوٹا سمجھتا ہے اور صادق بھی اس کی معیّت سے پرہیز کرنے لگ جاتے ہیں۔

یہ وسیع مضمون جو ساری دنیا کی نیکی اور بدی کے لئے بطور جڑ کے ہے اور جو دنیا کے اخلاق کی تباہی کا انکشاف کر رہا ہے۔ قرآن کریم نے اس چھوٹے سے فقرہ میں بیان کر دیا ہے کہ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ ہر کسب اپنے براہ راست نتیجہ کے علاوہ ایک اور نتیجہ بھی پیدا کر دیا کرتا ہے جو یہ ہے کہ وہ کسب انسان کی قوتِ عقلیہ اور قوتِ علمیہ اور قوتِ فکریّہ کو مار دیتا ہے اور اسی کا نام رینؔ ہے۔

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ

یوں نہیں (جس طرح وہ کہتے ہیں بلکہ) اس دن وہ یقیناً اپنے رب کے سامنے آنے سے روکے

اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ

جائیں گے۔ پھر وہ ضرور جہنّم میں داخل ہوں گے۔ پھر (اُن سے) کہا جائے گا یہی تو وہ (انجام) ہے

بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝۱۸

جس کا تم انکار کرتے تھے۔

تفسیر ۔ یہاں کَلَّا تیسری دفعہ آیا ہے۔ پہلے فرمایا تھا کَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّيْنٍ۔ پھر فرمایا تھا کَلَّا بَلْ ٜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ اب فرماتا ہے کَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ اس کے بعد آگے آئے گا کَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّيِّيْنَ شاید اتنا قریب قریب کَلَّا کا استعمال قرآن کریم میں اور کسی جگہ نہیں ہوا۔ یہ چند آیات ہیں مگر ان چند آیات میں ہی چار جگہ کَلَّا استعمال کیا گیا ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ کَلَّا کے معنے ردعؔ اور زجرؔ کے ہیں پس کَلَّا کا جو اس جگہ تکرار کیا گیا ہے اُس میں شدّتِ عذاب کی طرف اشارہ ہے۔

مسیحیوں کے متعلق حضرت مسیح کی دعا اور اس کا نتیجہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسیحیوں کی نسبت فرمایا تھا کہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (المائدہ: ۱۱۶) یعنی جب حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے مائدہ مانگا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں دے تو دوں گا مگر اس نعمت کا انکار نہایت خطرناک نتائج پیدا کرنے والا ہوگا۔ چونکہ تم نے یہ دعا کی ہے کہ تمہاری قوم کو دنیا میں ترقیات نصیب ہوں اس لئے مَیں انہیں ترقیات تو دوں گا اور بہت بڑی ترقیات دُوں گا لیکن اگر میری نعمتوں کا انہوں نے انکار کیا دین سے نفرت کی ۔ خدا تعالیٰ سے بعد اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے منہ موڑ لیا تو فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ مَیں عیسائی قوم کو وہ عذاب دُوں گا جو آج تک کبھی کسی قوم کو نہیں دیا گیا۔ پس چونکہ سورۂ مائدہ میں مسیحی اقوام کو دنیوی ترقیات عطا کرنے کا وعدہ تھا اور پھر اس کے ساتھ ہی یہ خبر تھی کہ اگر انہوں نے کفر کی طرف رجوع کیا تو مَیں اُن پر وہ عذاب نازل کروں گا جو دنیا میں کسی قوم پر نازل نہیں ہوا۔ اس لئے یہاں کَلَّا کا تکرار اِسی عذاب شدید کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے کہ اے عیسائیو اب ہوشیار ہو جاؤ! تم مطفّف بنے ہوئے لوگوں کے حقوق کو غصب کر رہے ہو اور دنیا کی ترقیات کے مزے لُوٹ رہے ہو۔ میں نے تمہیں کہہ دیا تھا کہ اگر دنیا ملنے کے بعد تم نے نافرمانی کی، میرے اس احسان کو بھلا دیا اور میری طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر دنیا پر گر گئے تو پھر میں تمہیں وہ عذاب دُوں گا جو آج تک کسی کو نہیں دیا گیا سو وہ عذاب کی خبر جو میں پہلے سے دے چکا تھا اب اُس کا وقت قریب آ رہا ہے اور خدا تعالیٰ کی گرفت تم پر نازل ہونے والی ہے جو نہایت شدید اور ہیبت ناک ہوگی ۔

عیسائیت کی تباہی کے لئے تین جھٹکے پھر کَلَّا کے اس تکرار پر غور کرنے سے ایک اور بات بھی معلوم ہوتی

ہے کہ یہاں تین دفعہ کَلَّا کفر کے ذکر کے بعد آتا ہے اور ایک دفعہ کَلَّا مومنوں کے ذکر سے پہلے ہے۔اس میں اس طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تین جھٹکے عیسائیت کی تباہی کے لئے لگیں گے اور چوتھا جھٹکا اسلام کے قیام کا موجب ہوگا بظاہر جہاں تک عقل کام دیتی ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی پہلا جھٹکا تھا جو عیسائیت کو لگا۔اب دوسری جنگ جو شروع ہے یہ دوسرا جھٹکا ہے اس کے بعد ایک تیسری جنگ عظیم ہوگی جو مغرب کی تباہی کے لئے تیسرا اور آخری جھٹکا ہوگا۔اس کے بعد ایک چوتھا جھٹکا لگے گا جس کے بعد اسلام اپنے عروج کو پہنچ جائے گا اور مغربی اقوام بالکل ذلیل ہو جائیں گی کیونکہ چوتھے کَلَّا کے بعد ہی یہ ذکر آتا ہے کہ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ۔ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ۔ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ۔

خدا تعالیٰ سے محجوب ہونے کا مطلب اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ میں يَوْمَئِذٍ سے مراد يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ والا یوم ہی ہے۔فرماتا ہے یہ لوگ اُس دن اپنے رب سے محجوب ہوں گے اس آیت میں رب کا لفظ لا کر اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ربوبیت کا رشتہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ماں اور بچہ میں ہوتا ہے۔ بچے کو ماں پالتی ہے، دُودھ پلاتی ہے، اُس کی غور و پرداخت کرتی ہے۔اس کی ضروریات کا خیال رکھتی ہے اور اس کو بڑا کرتی ہے۔ربّ کے بھی یہی معنے ہیں کہ وہ انسان کی جسمانی اور روحانی پرورش کے سامان مہیّا کرتا ہے۔پس جو رب ہوتا ہے وہ بھی اس شخص کے پاس آنے کی کوشش کرتا ہے جس کی وہ ربوبیت کرتا ہے اور جس کی ربوبیت کی جاتی ہے وہ بھی ربّ کے پاس آنے کی کوشش کرتا ہے۔ ماں بھی بچہ سے محبت کرتی ہے اور بچہ بھی ماں سے محبت کرتا ہے پس فرماتا ہے ہمارا اور ان کا رشتہ وہ ہے کہ ہم ان سے محبت کرتے ہیں اور انہیں ہم سے محبت کرنی چاہیے۔مگر باوجود اس رشتہ کے اُنہیں گناہوں سے ایسی وابستگی ہو جائے گی کہ یہ اپنے رب سے محجوب ہو جائیں گے۔ محجوب اس کو کہتے ہیں جو پردہ سے کسی دوسری چیز سے روکا گیا ہو اور جو شخص اپنے رب سے محجوب ہو اُس کی بدقسمتی میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا پس فرماتا ہے یہ لوگ کیسے بدقسمت ہیں کہ ربوبیت کے رشتہ کے بعد بھی اپنے رب سے یہ اُس دن محجوب رہیں گے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس دن محجوب ہونے کے کیا معنے ہیں (۱) کیا باقی انسان خدا تعالیٰ کو دیکھتے ہیں کہ اُن کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنے رب سے محجوب ہوں گے (۲) دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُس دن سے پہلے عیسائی خدا تعالیٰ کو دیکھتے تھے کہ فرماتا ہے کہ اُس دن وہ اپنے رب سے محجوب ہوں گے؟

رویئت الٰہی کے درجے اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک رویئتِ قلب کا تعلق ہے ہر انسان جو بے دین نہ ہو خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى

(بنی اسرائیل: ۷۳) جو شخص اس دنیا میں خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھتا وہ آخرت میں بھی اُس کو نہیں دیکھے گا اس سے معلوم ہوا کہ جتنے مومن نجات پانے والے ہیں اُن سب کو خدا تعالیٰ نے اپنا دیکھنے والا قرار دیا ہے مگر دنیا میں ہر مومن یہ نہیں کہتا کہ میں نے خدا تعالیٰ کو دیکھا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ایک درجہ رویتِ الٰہی کا محض ایمان لانا ہے۔ جب کسی شخص کو ایمان نصیب ہو جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُسے رویت الٰہی نصیب ہو گئی اور ایمان بغیر خدا تعالیٰ کی صفات کا علم رکھنے کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ آخر خدا کسی مادی چیز کا نام تو نہیں بلکہ خدا کا نام ہے اس ہستی کا جو ربّ ہے، جو رحمٰن ہے، جو رحیم ہے اور جو مالک یوم الدین ہے اور اسی طرح اور صفاتِ حسنہ سے متصّف ہے۔ پس جب کسی نے خدا تعالیٰ کی ربوبیت، اُس کی رحمانیت، اُس کی رحیمیت اور اُس کی مالکیت وغیرہ کو سمجھ لیا اور اس کی دوسری صفات پر یقین رکھا تو اُس کو ایک درجہ روٴیتِ الٰہی کا نصیب ہو گیا۔ پس ایک رویت وہ ہے جو ہر مومن کو نصیب ہوتی ہے خواہ وہ ادنیٰ درجے کا مومن ہو یا اعلیٰ درجے کا، اِس میں کوئی استثناء اور امتیاز نہیں ہے۔

پھر سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۔ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْۤ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى (طٰہٰ: ۱۲۵ تا ۱۲۷) کہ جو شخص ہمارے ذکر سے اعراض کرتا ہے، ہماری صفات پر غور نہیں کرتا، اُن کا مطالعہ نہیں کرتا، اُس کی زندگی بڑی تنگ زندگی ہوتی ہے۔ کیونکہ وسعتِ عمل پیدا ہوتی ہے خدا تعالیٰ کی صفات کی وجہ سے جسے خدا تعالیٰ پر سچا ایمان حاصل ہو اُس کے اندر سخاوت ہوتی ہے، سچائی ہوتی ہے، دیانتداری ہوتی ہے، امانت ہوتی ہے، رأفت ہوتی ہے، محبت ہوتی ہے اور وہ اپنے اِن نیک اعمال میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے مگر جو صفاتِ الٰہیہ پر ایمان نہ رکھتا ہو اُس کا دائرہ عمل نہایت محدود ہوتا ہے۔ درحقیقت دائرہ عمل اعلیٰ مطمحِ نظر Ideal سے وسیع ہوتا ہے جب کوئی اعلیٰ مطمحِ نظر سامنے نہ ہو تو اعمال محدود ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کے مقابلہ میں فلاسفروں کے اخلاق بالکل ہیچ ہوتے ہیں اور پھر اُن کے اندر جو تھوڑے بہت اخلاق پائے جاتے ہیں اُن کا دائرہ عمل بھی بہت تنگ ہوتا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اخلاق کو دیکھا جائے یا حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے اخلاق کو دیکھا جائے یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اخلاق کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے اعمال کا دائرہ غیر معمولی طور پر وسیع تھا۔ اُن کے اندر سچائی بھی شاندار طور پر پائی جاتی تھی، اُن کے اندر امانت بھی شاندار طور پر پائی جاتی تھی، اُن کے اندر سخاوت بھی شاندار طور پر پائی جاتی تھی، اُن کے اندر بشاشت بھی شاندار طور پر پائی جاتی تھی، اُن کے اندر رحم بھی شاندار طور پر پایا جاتا تھا، اُن کے اندر غریبوں کی پرورش کا مادہ بھی شاندار طور پر پایا جاتا تھا، اُن کے اندر انصاف

بھی شاندار طور پر پایا جاتا تھا، اُن کے اندر توکّل بھی شاندار طور پر پایا جاتا تھا، غرض بیسیوں قسم کے اخلاق اُن میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔لیکن اس کے مقابلہ میں اگر تم فلاسفروں کو دیکھو تو ممکن ہے کوئی ایک فلاسفر ایسا نکل آئے جو امین ہو یا جود وسخا کا مادہ اپنے اندر رکھنے والا ہو۔لیکن ایک فلاسفر بھی ایسا نہیں نکل سکتا جو سارے اخلاق کا جامع ہو۔اس کی وجہ یہی ہے کہ جب تک کوئی اعلیٰ مطمح نظر سامنے نہ ہو۔جب تک کوئی ایسی تصویر سامنے نہ ہو جس کی نقل اتاری جا سکے اُس وقت تک اعمال نہایت محدود دائرہ میں چکّر کھاتے رہتے ہیں اور اُن میں وسعت پیدا نہیں ہوسکتی۔اور جب کسی کے اعمال نہایت تنگ اور محدود دائرہ کے اندر ہوں تو اُس کے عمل میں وسعت پیدا نہیں ہوسکتی اور جب کسی نے اپنے اعمال میں وسعت ہی پیدا نہیں کی تو وہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کو کس طرح دیکھ سکتا ہے وہ شخص جس نے اپنے آپ کو رب نہیں بنایا وہ اپنے رب خدا کو کس طرح پہچان سکتا ہے۔جس نے اپنے آپ کو رحیم نہیں بنایا وہ رحیم خدا کو کس طرح پہچان سکتا ہے۔جس نے اپنے آپ کو رحمٰن نہیں بنایا وہ رحمٰن خدا کو کس طرح پہچان سکتا ہے۔جس نے اپنے آپ کو غفور نہیں بنایا، ستار نہیں بنایا، مہیمن نہیں بنایا، وہ غفور اور ستار اور مہیمن خدا کو کس طرح پہچان سکتا ہے اور وہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کو دیکھنے کی اہلیت ہی کس طرح رکھ سکتا ہے۔جس نے خربوزہ نہیں دیکھا وہ خربوزے کو دیکھ کر اُسے پہچان کس طرح کر سکتا ہے وہ تو اُس کی حقیقت معلوم کرنے سے قاصر ہی رہے گا۔ایسی صورت میں جب اُس کا دائرہ اعمال نہایت تنگ ہوگا اور خدا تعالیٰ کی صفات کا انعکاس اُس نے اپنے آئینہ قلب میں پیدا نہیں کیا ہوگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیامت کے دن جب خدا تعالیٰ کی صفات ظاہر ہوں گی وہ اُن کو پہچان نہیں سکے گا بلکہ اندھوں کی طرح کھڑا رہے گا اور اُسے کچھ نظر نہیں آئے گا۔جب وہ اندھا ہونے کی حالت میں قیامت کے دن اٹھے گا تو چونکہ وہ اپنے ذہن میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ میں بڑا بصیر ہوں، مَیں بڑا فلاسفر اور مدبّر ہوں اس لئے وہ خدا تعالیٰ سے کہے گا رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا۔ کہ میں تو بڑا بصیر تھا، نفسیات کا علم رکھنے والا تھا، مشاہدات پر اپنے علوم کی بنیاد رکھتا تھا، فلسفہ اور سائنس کا ماہر تھا، کتابوں کا دن رات مطالعہ کیا کرتا تھا، کائناتِ عالم کے اسرار پر غور کیا کرتا تھا مجھے آج اندھا کیوں پیدا کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى تیرے سامنے اپنے نبی کے ذریعہ ہم نے نشانات و معجزات ظاہر کئے، ہم نے اپنے قادر ہونے کے نشانات ظاہر کئے، اپنے رب ہونے کے ثبوت دئے، اپنے رحیم ہونے کے دلائل دئے، اپنے مالک ہونے کے شواہد مہیّا کئے، اپنے مُحی اور ممیت ہونے کے ثبوت پیش کئے مگر تُو نے اُن کی طرف توجہ نہ کی۔تُو ہمارے نبی کو دیکھ کر یہی کہتا رہا کہ یہ لغو باتیں ہیں ایک مُلّا اِن باتوں کو کیا جانے، میں فلاسفر ہوں، میں کینٹ اور میں ہیگل ہوں، میں

ایسے لغو امور کی طرف توجہ کر کے اپنے وقت کو ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ جب تُو نے ہماری طرف توجہ نہ کی تو ہم نے بھی تیری طرف توجہ نہ کی آنکھیں چونکہ ہماری طرف سے ملتی ہیں اور وہ نور بھی ہم ہی دیتے ہیں جس سے انسان دیکھ سکتا ہے اس لئے یہ چیزیں تجھے اسی صورت میں مل سکتی تھیں جب تو ہماری طرف توجہ کرتا۔ جب تُو نے ہم سے منہ پھیر لیا تو ہم نے بھی اپنا نور تجھ سے واپس لے لیا اَور تُو اِس جہان میں اندھا پیدا ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معجزات و نشانات سے مومن کو ایک رویت نصیب ہوتی ہے جو اس سے محروم ہو وہ اس سے بڑی رویت سے بھی جو دنیا یا آخرت میں ہوگی محجوب ہوں گے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ کیا وہ اُس دن سے پہلے خدا تعالیٰ کو دیکھتے تھے کہ اُن کے متعلق فرمایا گیا ہے اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ اُس دن وہ خدا تعالیٰ سے محجوب ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دن محجوب ہونے کے یہ معنے ہیں کہ وہ تو رویت کا دن مقرر ہے اُس دن بھی انہیں رویت نصیب نہ ہوگی۔ یعنی عام قاعدہ یہ ہے کہ علم کے ساتھ چیز کی شناخت ہوتی ہے لیکن بعض دفعہ دل پر ایسا زنگ لگا ہوا ہوتا ہے کہ علم کے ساتھ عرفان نہیں آتا دنیا میں عام قانون یہ ہے کہ علم کے ساتھ ہی عرفان آجاتا ہے کسی کو کہہ دیں کہ یہ افیون ہے تو وہ اُس کے کھانے سے احتراز کرے گا اور سمجھے گا کہ اگر میں نے افیون کھائی تو میں بیمار ہو جاؤں گا یا میرے اعصاب کمزور ہو جائیں گے اس لئے وہ افیون کھانے سے ڈرتا ہے مگر ایک اور شخص ہوتا ہے جسے افیون کھانے کی عادت ہو چکی ہوتی ہے اُسے خواہ ڈاکٹر منع کریں، خواہ اس کے اخلاق خراب ہوں، خواہ اُس کی صحت برباد ہو اُس پر کوئی اثر ہوتا ہی نہیں اور وہ برابر افیون استعمال کرتا چلا جاتا ہے۔ گویا اُسے علم تو ہوتا ہے مگر عرفان نہیں ہوتا پُرانی عادت اور دل کے زنگ کی وجہ سے علم کے باوجود اسے معرفت حاصل نہیں ہوتی اور وہ افیون کا استعمال ترک نہیں کر سکتا۔ تو یہ دو حالتیں ہیں جو مختلف انسانوں پر وارد ہوتی ہیں۔ رویت درحقیقت عرفان کا نام ہے علم کا نام نہیں۔ وہ دن چونکہ رویت کے لئے مقرر ہوگا اور رویت عرفان سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ علم سے۔ اس لئے باوجود اس علم کے کہ وہ غلطی میں مبتلا تھے جب خدا تعالیٰ کی قدرتیں اور اُس کی طاقتیں ظاہر ہوں گی تو اُن کو عرفان حاصل نہیں ہوگا کیونکہ اُن کے دل گندے ہو چکے ہوں گے۔ گویا عرفان جو علم کا ایک طبعی نتیجہ ہے وہ ساتھ نہیں آئے گا جیسے افیون کھانیوالے کو خواہ کتنا ڈراؤ وہ اُسے چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ اسے افیون کھانے کی عادت پڑ چکی ہوتی ہے۔ فرماتا ہے چونکہ وہ دن انکشاف کا ہوگا اُنہیں علم تو حاصل ہو جائے گا مگر چونکہ اُن کے قلوب گندے ہو چکے ہوں گے اس لئے علم کے باوجود اُنہیں عرفان حاصل نہ ہوگا وہ کہیں گے کہ خدا قادر ہے، وہ سمجھیں گے کہ خدا رحیمؔ ہے، وہ سمجھیں گے کہ خدا عزیز ہے مگر باوجود اس کے اپنے ربؔ اور

رحیمؔ اور قادر اور کریم خدا سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوگا اور اس وجہ سے وہ جنّت کے مستحق نہیں ہوں گے بلکہ دوزخ کے ہی مستحق رہیں گے۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۹﴾

یُوں نہیں (جس طرح تم کہتے ہو بلکہ) ابرار (کی جزاء) کا حکم یقیناً عِلّیّین میں ہے۔

تفسیر۔فرماتا ہے خبردار! تم یہ سمجھتے ہو کہ مومن ترقی نہیں کریں گے! یہ بالکل غلط ہے مومنوں کی قسمت توعلّیّین میں لکھی ہوئی ہے۔ اگر اس کے معنے قرآن کریم کے کئے جائیں توعلّیّین سے مراد قرآن کریم کے وہ حصّے ہوں گے جن میں مومنوں کی ترقیات کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیشگوئیاں موجود ہیں۔ اور اگر علّیّین سے مراد اعلیٰ مقامات لے لو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ مومنوں کی قسمت تو اعلیٰ درجہ کے مقامات کے متعلق فیصل شدہ ہے۔

علّیّین کے متعلق حضرت ابن عباس کا ایک قول علّیّین کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس سے مراد جنّت ہے (ابن کثیر زیر آیت ھذا) اور مفردات والے لکھتے ہیں کہ بَلْ ذَالِكَ فِي الْحَقِيْقَةِ اِسْمُ سُكَّانِهَا درحقیقت یہ جنت میں رہنے والوں کا نام ہے اور وہ کہتے ہیں کہ هٰذَا اَقْرَبُ فِي الْعَرَبِيَّةِ اِذْ كَانَ هٰذَا الْجَمْعُ يَخْتَصُّ بِالنَّاطِقِيْنَ۔ عربی زبان کے لحاظ سے علّیّین کے یہ معنے بالکل درست ہیں کیونکہ یہ جمع ذوی العقول کے ساتھ ہی مختص ہے۔ پس اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ کے یہ معنے ہوئے کہ ابرار کا نام علّیّین میں لکھا ہوا ہے یا جہاں علّیّین کا ذکر ہے وہاں اِن کا بھی ہے۔ ابن ماجہ۔ طبرانی اور بیہقی میں عبداللہ بن کعب بن مالک کی ایک روایت آتی ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ علّیّین کیا چیز ہے حضرت عبداللہؓ کہتے ہیں کہ لَمَّا حَضَرَتْ كَعْبًا الْوَفَاةُ اَتَتْهُ اُمُّ بِشْرٍ بِنْتُ الْبَرَاءِ فَقَالَتْ اِنْ لَّقِيْتَ اِبْنِيْ فَاَقْرَءْهُ مِنِّي السَّلَامَ فَقَالَ غَفَرَ اللهُ لَكِ اُمَّ بِشْرٍ نَحْنُ اَشْغَلُ مِنْ ذَالِكَ فَقَالَتْ اَمَا سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ نَسَمَةَ الْمُؤْمِنِ تَسْرَحُ فِي الْجَنَّةِ حَيْثُ شَآءَتْ وَاِنَّ نَسَمَةَ الْكَافِرِ فِيْ سِجِّيْنٍ قَالَ بَلٰى قَالَتْ فَهُوَ ذَالِكَ۔ یعنی عبداللہ بن کعب بن مالک کہتے ہیں جب حضرت کعبؓ کی وفات قریب پہنچی تو ایک صحابیہ اُمّ بشر نام اُن کے پاس آئیں اور جب اُنہوں نے اُن کو حالتِ نزع میں دیکھا تو وہ کہنے لگیں میاں کعب تمہیں اگلے جہان میں اگر میرا بیٹا نظر آجائے تو اُسے میرا اسلام کہہ دینا۔ حضرت کعبؓ کہنے لگے غَفَرَ اللهُ لَكِ اُمَّ بِشْرٍ۔ اے اُمِّ بشر اللہ تعالیٰ تجھے معاف کرے۔ میری جان کندنی کا وقت ہے

اور تُو اپنے بیٹے کا سلام مجھے پہنچا رہی ہے مجھے تو اس وقت یہ فکر ہے کہ میں نے خدا کو کیا جواب دینا ہے تیرے بیٹے کو سلام پہنچانا کس کو یاد رہے گا۔ وہ کہنے لگیں کیا تم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ بات نہیں سنی کہ مومن کی روح جنّت میں جہاں چاہتی ہے چلی جاتی ہے لیکن کافر کی رُوح سجّین میں پڑی رہتی ہے؟ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علّیّین کے معنے آزادی اور حُرّیت کے ہیں کیونکہ بتایا گیا ہے کہ اِنَّ نَسَمَةَ الْمُؤْمِنِ تَسْرَحُ فِي الْجَنَّةِ حَيْثُ شَآءَتْ مومن کی روح جنت میں جہاں چاہے گی جا سکے گی۔ اس کے مقابلہ میں سجّین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور سجّین کے معنے مَیں اس سے پہلے بتا چکا ہوں کہ قید کے ہیں۔ پس علّیّین کے معنے آزادی اور حُرّیت کے ہوئے اور آیت کا مطلب یہ ہوا کہ کفّار نے جس طرح اپنے اعمال کا دائرہ بہت محدود رکھا تھا اور جس طرح اعمال صالحہ کی بجا آوری میں انہوں نے کوتاہی کی تھی اسی طرح اُنہیں سجّین یعنی ایک قید کی حالت میں رکھا جائے گا لیکن مومن نے چونکہ اپنے اعمال کا دائرہ غیر معمولی طور پر وسیع رکھا تھا اس لئے وہ علّیّین میں شامل ہوگا یعنی ایسی جماعت میں جس کی نیکی اور اتقاء کی کوئی حد ہی نہیں۔ یہ معنے تو دنیا کے لحاظ سے ہیں۔ لیکن آخرت کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جس طرح اس جہان میں اُس نے اپنے اعمال کا دائرہ وسیع کر رکھا تھا اسی طرح اگلے جہان میں خدا اس سے یہ سلوک کرے گا کہ وہ اس کی روح کو آزاد رکھے گا اور وہ جہاں چاہے گا جا سکے گا۔ میں نے اپنی کتاب ''احمدیت یعنی حقیقی اسلام'' میں اس امر پر بحث کی ہے کہ روحِ انسانی جنت میں ہر جگہ جا سکتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب جنّتیوں کا ایک درجہ ہو جائے گا۔ میں نے وہاں ثابت کیا ہے کہ ایک جنتی ہر جگہ جا بھی سکتا ہے اور درجوں میں بھی فرق رہ سکتا ہے۔ (انوار العلوم جلد ۸ ''احمدیت یعنی حقیقی اسلام صفحہ ۳۳۶)۔

الغرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ اے عیسائیو! یاد رکھو کہ تمہاری تباہی کے لئے تین زبردست جھٹکے لگیں گے اور تباہی کے ان تینوں دَوروں کے بعد جب آخری جھٹکا لگے گا تو یکدم مسلمانوں کو نیچے سے اُٹھا کر اعلیٰ درجہ کے مراتب پر پہنچا دیا جائے گا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝۲۰ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝۲۱

اور تجھے کس نے بتایا ہے کہ علّیون کیا ہے۔ایک لکھا ہوا حکم ہے جسے مقرب لوگ

يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۲۲

(خود اپنی آنکھوں سے) دیکھیں گے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔اے سننے والے! تجھے کیا پتہ کہ عِلِّيُّوْن کس کو کہتے ہیں كِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ یہ ایک دفتر ہے جو لکھا ہوا ہے یا كِتَابٌ مَّخْتُوْمٌ ایک ایسا فیصلہ ہے جس پر مہر لگ چکی ہے اور جو اٹل ہے یا یہ کہ یہ ایک لکھا ہوا فیصلہ ہے اس کے بھی وہی معنے ہیں جو پہلے کے ہیں کیونکہ اٹل اُسی فیصلہ کو کہتے ہیں جو لکھا ہوا ہو۔

يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ۔ یہ نتیجہ یا یہ انجام جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اس کو مقرب لوگ دیکھیں گے یا حاضر ہوں گے اس مقام پر مقرب۔

یہ فرق ہے جو مومن اور کافر میں ہے یعنی کافر کے لئے وہ دن ایسا ہوگا کہ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۔وہ آہیں بھرے گا۔افسوس کرے گا اور کوشش کرے گا کہ کِسی طرح میں اس انجام سے بھاگوں لیکن مقرب اس کی طرف دوڑ کر جائے گا اور اپنی مرضی سے جائے گا کیونکہ اس کے لحاظ سے وہ پسندیدہ انجام ہوگا۔گویا کفّار کی تباہی اور اس کے مقابلہ میں مومنوں کے اقتدار کی پیشگوئی یہاں آکر ختم کی اور بتایا کہ بے شک مطفّفین کا ایک لمبے عرصہ تک غلبہ چلا جائے گا مگر اللہ تعالیٰ اس غلبہ کو ضرور ختم کرے گا۔

عیسائیت کی تباہی کے بعد اسلام کے غلبہ کے لئے ایک جھٹکا چنانچہ ایک ہی سورۃ میں چار دفعہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد كَلَّا کے استعمال میں یہ مخفی اشارہ پایا جاتا ہے کہ مغربی اقوام کی تباہی کے لئے تین زبردست جھٹکے لگیں گے اس کے بعد چوتھا جھٹکا ایسا ہوگا جو اِن مطفّفین کا انجام اُن کی آنکھوں کے سامنے لے آئے گا۔اسلام غالب آجائے گا۔کفر تباہ ہوجائے گا اور ان عیسائیوں کا انجام ایسا خطرناک ہوگا کہ وہ اِس سے بھاگنے کی پوری کوشش کریں گے مگر وہ اس سے بھاگ نہیں سکیں گے لیکن مومن اپنے انجام کی طرف دوڑ کر جائیں گے اور کہیں گے کہ یہ کیسا اچھا انجام ہے۔

کفار کے لئے لفظ سجین مفرد لانے اور مومنوں کے لئے علیون جمع استعمال کرنے میں

حکمت یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سِجِّیْن کا لفظ جو کفّار کے لئے استعمال ہوا تھا مفرد تھا مگر عِلِّیِّیْن کا لفظ جو مومنوں کے لئے استعمال ہوا ہے وہ جمع کا لفظ ہے اس فرق سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کافر کی سزا کو اللہ تعالیٰ بڑھاتا نہیں مگر مومن کے انعام کو بڑھاتا چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے کافر تو ایک ہی قید خانہ میں پڑا رہتا ہے لیکن مومن گھر بدلتا جاتا ہے ایک گھر کے بعد اُس سے اعلیٰ گھر اُسے ملتا ہے اور اس کے بعد اس سے اعلیٰ گھر۔ اسی طرح خدا تعالیٰ اُسے کئی دنیاؤں کی سیر کرا دیتا ہے اس لئے مومن کے گھر کئی ہوں گے اور کافر کا گھر ایک۔ پس کافر کے گھر کے لئے مفرد لفظ استعمال ہوا اور مومن کے لئے چونکہ کئی گھر ہونے تھے اس کے بارہ میں جمع کا لفظ استعمال کیا۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ﴿۲۳﴾

نیکی میں بڑھے ہوئے لوگ یقیناً نعمت (کے مقام) میں رکھے جائیں گے۔

حَلّ لُغَات۔ نَعِیْمٍ نَعِیْم کے لئے دیکھو سورہ انفطار آیت نمبر ۱۴۔

تفسیر۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ نعمت اُن پر ہوگی بلکہ یہ فرمایا کہ وہ نعمت میں ہوں گے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تمام ماحول کو اُن کے لئے نعمت بنا دیا جائے گا۔ کسی چیز کو کسی انسان پر گرایا جائے تو وہ گر کر پھیل جاتی ہے۔ اس کی یُوں مثال سمجھ لو کہ ایک شخص پر پانی کا لوٹا گرایا جائے اور ایک شخص ایسا ہو جو تالاب میں کود جائے۔ پانی کو تو یہ دونوں چھوئیں گے مگر پانی سے اُس کا تعلق جس پر ایک لوٹا گرایا گیا ہے اور اس کا جو تالاب میں کُودا ہے ایک نمایاں فرق رکھتا ہوگا۔ پس اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ کا یہ مطلب ہے کہ اُن کے لئے تمام ماحول نعمت کا بنا دیا جائے اور وہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی تالاب میں کود جاتا ہے گویا خدا تعالیٰ کی نعمت ان کو چاروں طرف سے ڈھانپ لے گی۔

عَلَی الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ ﴿۲۴﴾

چھپر کھٹوں پر (بیٹھے سب حال) دیکھ رہے ہوں گے۔

حَلّ لُغَات۔ اَرَآئِكَ: اَرَآئِكُ اَرِیْكَةٌ کی جمع ہے اور اس کے معنے ہوتے ہیں سَرِیْرٌ مُنَجَّدٌ مُزَیَّنٌ فِیْ قُبَّةٍ اَوْ بَیْتٍ فَاِذَا لَمْ یَکُنْ فِیْهِ سَرِیْرٌ فَھُوَ حَجَلَةٌ (اقرب)۔ ایک ایسا تخت جو مزین ہو۔ نقش و نگار والا ہو۔ سونے کا کام اُس پر کیا گیا ہو۔ اور اُس کو ایک قُبّہ یا ایک کمرہ میں رکھا گیا ہو۔ مطلب یہ کہ اسے پردہ دار بنایا گیا ہو

جب جی چاہے پردے ڈالے جاسکیں اُردو میں اسے چھپر کھٹ کہتے ہیں۔

تفسیر ۔ یَنْظُرُوْنَ اَبْرَار کی صفت ہے کہ اَبْرَار اُس وقت دیکھتے ہوں گے یا یہ اُس کا حال ہے اور مطلب یہ ہے کہ بعض نعماء دنیا میں ملتی ہیں مگر انسان اُن کی حقیقت کو سمجھتا نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ مومنوں کو یہ نعمت دے گا تو اُن کی حالت ایسی ہوگی کہ وہ دیکھ رہے ہوں گے یعنی وہ سمجھتے ہوں گے کہ اس نعمت کی کیا قدر و قیمت ہے۔ اس کی موٹی مثال یہ دیکھ لو کہ اگر ایک بچے کو ہیرا دے دو تو وہ ہرگز یہ خیال نہیں کرے گا کہ اُسے کوئی قیمتی چیز دے دی گئی ہے۔ اسی طرح بعض قوموں کو دنیوی نعمتیں مل جائیں تو وہ اُن کی حقیقت کو نہیں سمجھتیں جیسے یورپ والوں کو مائدہ ملا اور وہ مائدہ ملا جس کے لئے حضرت عیسٰی علیہ السّلام نے دعا کی تھی مگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُنہیں جو کچھ حاصل ہوا اپنے زورِ بازو سے حاصل ہوا ہے گویا دیکھنے والی نظر ماری گئی ہے۔

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ کا مطلب لیکن مومنوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہم اُنہیں نعمتیں دیں گے تو ایسی حالت میں دیں گے کہ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ وہ آرائک پر بیٹھے ہوئے خوب سمجھ رہے ہوں گے کہ یہ نعمتیں اُنہیں اُن پیشگوئیوں کی وجہ سے ملی ہیں جو اُن کے متعلق کی گئی تھیں۔ گویا بصیرتِ روحانی اُن کے اندر موجود ہوگی۔ اس لئے بارِ امانت کو وہ صحیح طور پر اٹھائیں گے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ لو۔ حضرت عمرؓ کو دیکھ لو۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو دیکھ لو۔ انہوں نے ایک ایک قدم پر یہ سمجھا کہ یہ چیز ہماری نہیں بلکہ خدا تعالیٰ نے ہم کو دی ہے اور جب انہوں نے اس بات کو سمجھا تو انہوں نے اس چیز کی اسی طرح حفاظت کی جس طرح خدا تعالیٰ کی چیز کی حفاظت کی جانی چاہیے۔

يَنْظُرُوْنَ کو اگر ابرار کی صفت سمجھا جائے تو اس صورت میں مفسّرین یہ لکھتے ہیں کہ اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ (۱) اعلیٰ نظّارے مومنوں کے سامنے کئے جائیں گے یعنی دیکھنے کی عمدہ عمدہ چیزیں اُن کے سامنے ہوں گی (۲) دوسرے یہ کہ وہ کفّار کا عذاب دیکھیں گے۔ (روح المعانی زیر آیت ھٰذا)

درحقیقت مفسّرین کے سامنے یہی بات رہی ہے کہ وُہ اِن آیات کو قیامت کے متعلق مخصوص سمجھتے ہیں اور چونکہ وہ ان آیات کو قیامت کے متعلق سمجھتے ہیں اس لئے اسی ماحول کی چیزیں اُن کے ذہن میں آتی ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک گو یہ آیتیں قیامت پر بھی چسپاں ہوسکتی ہیں مگر قیامت کے آنے سے پہلے اس دنیا کی بھی نعمتیں مراد ہیں جن کے دیئے جانے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابرار کو وعدہ ہے اس لئے میرے نزدیک اوّل تو یہ جواب ہے پہلی چیز کا پہلے اللہ تعالیٰ نے کفار کے متعلق فرمایا تھا كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ خبردار ہو جاؤ اور سُنو! کہ

اُس دن کافر اپنے رب سے محجوب ہوں گے یعنی اپنے رب کی شکل اُن کو نظر نہیں آئے گی۔ جب فجّار کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا تھا کہ اِنَّھُمۡ عَنۡ رَّبِّھِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ تو ضروری تھا کہ اس کے بعد ابرار کا ذکر کر کے بتایا جاتا کہ اُن کا کیا حال ہوگا۔ سو اس کے مقابلہ میں فرمادیا کہ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ۔ عَلَی الۡاَرَآئِکِ اِلٰی رَبِّھِمۡ یَنۡظُرُوۡنَ پس یَنۡظُرُوۡنَ سے مراد وہی چیز لی جائے گی جس کے متعلق پہلی آیات میں قرینہ موجود ہے اسی وجہ سے جس چیز کو دیکھنا ہے اُس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر نہیں کیا اور مراد یہ ہے کہ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ۔ عَلَی الۡاَرَآئِکِ اِلٰی رَبِّھِمۡ یَنۡظُرُوۡنَ پس یَنۡظُرُوۡنَ کے ایک معنے یہ ہیں کہ مومن اپنے رب کو دیکھیں گے۔ محجوب نہیں ہوں گے۔ یہ دیکھنا دو طرح ہوتا ہے۔ ایک صفاتی نظری یعنی صفاتِ الٰہیہ کا ظہور بیرونی دنیا میں۔ جیسے ہمارے ملک میں کہتے ہیں کہ خدا یاد آ گیا۔ جب کوئی بڑی مصیبت ظاہر ہو یا کوئی بڑا تغیّر رونما ہو یا ایسے حالات پیدا ہوں جو غیر معمولی ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ خدا یاد آ گیا۔ یہ بھی محاورہ ہے کہ خدا نظر آ گیا۔ پس اِلٰی رَبِّھِمۡ یَنۡظُرُوۡنَ کے ایک معنے یہ ہوئے کہ جب وقت آئے گا تو ایسے عظیم الشان تغیّرات خدا تعالیٰ پیدا کر دے گا کہ جس شخص کے اندر ذرا بھی ایمان ہوگا وہ کہے گا کہ یہ تغیّر خدا تعالیٰ کے سوا اور کسی نے نہیں کیا۔ اس کی مثال موجود ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد مکّہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ مدینہ سے ایک شخص وہاں جا نکلا۔ انہوں نے اُس سے کہا کہ سناؤ مدینہ کا کیا حال ہے؟ اُس نے جواب میں کہا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے والد نے پوچھا پھر کیا ہوا؟ اُس نے کہا لوگوں نے ایک شخص کو خلیفہ منتخب کر لیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کس کو؟ اُس نے جواب دیا ابوبکر کو۔ اس پر انہوں نے پوچھا کون ابوبکر؟ اُس نے جواب دیا ابن ابی قحافہ۔ اس پر انہوں نے مختلف خاندانوں کا نام لیا کہ فلاں فلاں بڑے خاندانوں کے لوگوں نے مان لیا؟ اُس نے کہا ان قبائل نے بھی بیعت کر لی ہے۔ جب یہ ساری بات ہوگئی تو حضرت ابوبکرؓ کے والد بے اختیار کہہ اٹھے اَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَاَشۡھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ۔ (الطبقات الکبریٰ ذکر بیعۃ ابی بکر) میں گواہی دیتا ہوں کہ واقعہ میں خدا ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی تو مکّہ کے لوگ جو دوسرے کی اطاعت نہیں کر سکتے تھے۔ جو کسی کی بات تک نہیں مانتے تھے اور پھر بڑے بڑے قبائل اور خاندانوں کے لوگ ابوبکرؓ کو کس طرح اپنا خلیفہ مان لیتے۔ اسی طرح انصار اپنے شہر میں رہتے تھے اور ایسی حالت میں ان کو خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ حکومت ہمارے ہاتھ میں آنی چاہیے مگر مدینہ میں بیٹھے ہوئے انہوں نے مکہ کے ایک شخص ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ تو فرماتا ہے ایسے حالات پیدا ہوں گے کہ لوگ کہیں گے ہمیں خدا نظر آ گیا جس طرح ابو قحافہ کو ابوبکرؓ کی خلافت پر خدا

یاد آ گیا اور اُس نے کہا اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

دوسرا دیکھنا ایسا ہوتا ہے جیسے روحانی طور پر اللہ تعالیٰ بندے کے قلب پر اپنے آپ کو نازل کر کے یقین کامل کا مقام پیدا کر دیتا ہے۔ مگر یہ دیکھنا پہلے دیکھنے کے بعد ہوتا ہے کیونکہ قلبی رویت میں بعض دفعہ شبہ پیدا ہوا جاتا ہے کہ وہ خیالی یا وہمی تو نہیں۔ اس لئے جب اللہ تعالیٰ اردگرد نشانات دکھا لیتا ہے تو پھر انسانی قلب پر نازل ہوتا ہے اور چونکہ ایسا شخص پہلے صفات الٰہیہ کو اپنے اردگرد دیکھ چکا ہوتا ہے اس لئے جب یہ ظہور اس کے سامنے آتا ہے تو اُسے اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق یقین کامل پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بھی بیان فرمایا ہے کہ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات:۲۱، ۲۲) یہاں پہلے فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ فرمایا ہے اور پھر وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ کو بیان فرمایا ہے پس اللہ تعالیٰ کی یہی سنّت ہے کہ وہ پہلے اردگرد نشانات دکھاتا ہے اور پھر انسانی قلب پر اپنی تجلّی نازل کرتا ہے تاکہ وہ دھوکا میں نہ رہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی آتا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ پر وحی کا ابتداء رویاء صالحہ سے ہوا جو فلق الصبح کی طرح پوری ہوتی تھیں (صحیح بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ)۔ اس قسم کے حالات اللہ تعالیٰ خود ہی پیدا کرتا ہے تاکہ وحی والہام کا مورد بھی کوئی شُبہ نہ کرے اور لوگ بھی یہ نہ کہیں کہ یہ پاگل ہو گیا اس کے بعد قلب پر تجلّی نازل ہوتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اللہ تعالیٰ کی جو تجلّیات ہوئیں اُن میں بھی اسی تدریج کا پہلو نظر آتا ہے۔ پہلے اس قسم کے الہامات نازل ہونے شروع ہوئے کہ ''آج حاجی ارباب محمد لشکر خاں کے قرابتی کا روپیہ آتا ہے'' (براہین احمدیہ، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۶۵) یا ''ڈگری ہو گئی ہے مسلمان ہے'' (براہین احمدیہ روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۵۹) اور جب تواتر کے ساتھ اِن الہامات نے پورا ہو کر ادھر لوگوں کو آپ کی سچائی کی طرف متوجہ کر دیا اور اُدھر آپ کے دل میں یقین پیدا ہو گیا تو اس کے بعد آخری تجلّی ہوئی۔ غرض اللہ تعالیٰ پہلے سے ایسے حالات پیدا کر دیتا ہے کہ دُور بین نگاہ رکھنے والا سمجھنا شروع کر دیتا ہے کہ پردۂ قدرت سے اب کچھ ظاہر ہونے والا ہے۔ پس عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ کے یہ معنے ہوئے کہ جو ادنیٰ مومن ہیں وہ خدا تعالیٰ کی اس تجلّی کو دیکھیں گے جو اردگرد ہوتی ہے اور جو کامل مومن ہیں وہ خدا تعالیٰ کی اُس تجلّی کو دیکھیں گے جو اُن کے اپنے نفس میں ظاہر ہوگی۔

عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ میں صحابہ کے خصائص کی طرف اشارہ یہ تو پہلے معنوں کے الف اور باء دو حصے تھے مگر اس کے ایک اور معنے بھی ہیں اور وہ یہ کہ یَنْظُرُوْنَ کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ آرائک اور سُرُر تو سونے کا مقام ہوتے ہیں۔ انسان اُن پر لیٹتا ہے اس لئے کہ وہ آرام کرے یا اس لئے کہ وہ سو کر اپنی کوفت کو

دُور کرے۔ لیکن فرماتا ہے وہ ایسے دیندار لوگ ہوں گے کہ ایسے مقامات پر بھی کہ سونے اور آرام کرنے کے ہیں چُست اور ہوشیار رہوں گے اور اپنے مفوضہ کاموں کی کڑی نگرانی رکھیں گے گویا بتایا کہ اَور لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب انہیں نعمتیں ملتی ہیں۔ آرام و آسائش کے سامان حاصل ہوتے ہیں تو وہ سُست اور غافل ہو جاتے ہیں۔ اپنے فرائض کو عمدگی سے ادا نہیں کرتے۔ لوگوں کے حقوق کو ادا کرنے کا فکر نہیں کرتے۔ وہ دنیوی عیش کے سامانوں میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ تمام فرائض کو بھلا بیٹھتے ہیں مگر ابرار کی یہ حالت نہیں ہوگی۔ جب اللہ کی طرف سے انہیں دنیا کی حکومت ملے گی۔ جب انہیں عزت ملے گی، رتبہ ملے گا، مال ملے گا تو وہ سُست نہیں ہو جائیں گے بلکہ اپنے فرائض کو پوری خوش اسلوبی سے ادا کریں گے اور وہ ہر وقت ایسے رہیں گے جیسے دیکھ رہے ہیں کہ کیا نقص واقعہ ہونے والا ہے اور وہ اس کو کس طرح دور کر سکتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق مسلمانوں کو مال دیا، دولت دی، عزت دی، رُتبہ دیا مگر وہ اسلام سے غافل نہیں ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے متعلق آتا ہے کہ جب وہ فوت ہوئے تو کئی کروڑ روپیہ کی جائداد اُن کے ترکہ میں تقسیم ہوئی (الطبقات الکبریٰ ذکر وصیۃ عبدالرحمٰن بن عوف و ترکتہ)۔ اُن کی سالانہ آمد بھی لاکھوں دینار تھی مگر باوجود اس کے وہ رات اور دن اشاعتِ اسلام میں مشغول رہے اور مال و دولت کی فراوانی نے اُن کے اندر کسل یا غفلت پیدا نہیں کی۔ یہی حال حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا تھا وہ ساری دنیا کے بادشاہ ہو گئے مگر سُست اور غافل نہیں ہوئے بلکہ اپنے فرائض منصبی کو پوری تندہی سے ادا کرتے رہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ حضرت عثمانؓ بیان کرتے ہیں وہ کہتے ہیں مَیں ایک دفعہ باہر قبہ میں بیٹھا ہوا تھا اور اتنی شدید گرمی پڑ رہی تھی کہ دروازہ کھولنے کی بھی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اتنے میں میرے غلام نے مجھے کہا دیکھئے اس شدید دھوپ میں باہر ایک شخص پھر رہا ہے۔ میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا تو مجھے ایک شخص نظر آیا جس کا منہ شدّتِ گرمی کی وجہ سے جُھلسا ہوا تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ کوئی مسافر ہوگا مگر تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ وہ شخص میرے قبّہ کے قریب پہنچا اور میں نے دیکھا کہ وہ حضرت عمرؓ ہیں۔ اُن کو دیکھتے ہی میں گھبرا کر باہر نکل آیا اور میں نے کہا اس گرمی میں آپ کہاں؟ حضرت عمرؓ فرمانے لگے بیت المال کا ایک اُونٹ گم ہو گیا تھا جس کی تلاش میں مَیں باہر پھر رہا ہوں (اسد الغابۃ زیر عنوان عمر بن عبد الخطاب)۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ وہ ہوں گے تختوں پر مگر ہر وقت نگرانی اُن کا کام ہوگا۔ دنیا کی نعمتیں اور دنیا کے آرام اُن کو سست نہیں بنائیں گے وُہ اُن ارائک کے اندر سو نہ رہے ہوں گے بلکہ بیدار و ہوشیار رہوں گے۔ لوگوں کے حقوق کی دیکھ بھال کریں گے اور اپنے فرائض منصبی کو پوری خوش اسلوبی سے ادا کرتے چلے جائیں گے۔

تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ ﴿۲۵﴾

تُو (اگر اُنہیں دیکھے تو) اُن کے چہروں میں نعمت کی شادابی محسوس کرے گا۔

حَلّ لُغَات۔ نَضْرَةٌ نَضْرَةٌ کے معنے ہوتے ہیں (۱) نعمت (۲) عیش (۳) غنٰی (۴) وَقِیْلَ الْحُسْنُ وَالرَّوْنَقُ وَاللُّطْفُ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نَضْرَةٌ کے معنے حُسن، رونق اور لطف کے ہوتے ہیں (اقرب) اسی طرح جو ادیب ہیں انہوں نے تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ کے معنے کئے ہیں بَرِیْقُهٗ وَنَدَاهُ یعنی اس کی چمک اور اس کی تراوت (اقرب) پس تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ کے یہ معنے ہوئے کہ تُو پہچانے گا اُن کے مُونہوں سے خدا تعالیٰ کی نعمت کی تازگی یا نعمت کا غناء۔ یا نعمت کا حُسن یا نعمت کی رونق یا نعمت کا لُطف۔

تفسیر۔ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ کے تین معنے اس آیت کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ نعمتِ الٰہی اُن کے دلوں پر اس طرح نازل ہوگی کہ چہرہ سے خوشی پُھوٹ پُھوٹ پڑے گی۔ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ سے پتہ لگتا ہے کہ یہ نعمت اُن کے دل پر نازل ہوگی اور اس طرح نازل ہوگی کہ اُن کے چہروں سے ظاہر ہو جائے گی اور وہ اُسے چھپا نہیں سکیں گے دنیا میں دو قسم کی باتیں ہوتی ہیں ایک وہ جنہیں چھپایا جا سکتا ہے اور ایک وہ جنہیں انسان چھپا نہیں سکتا بلکہ خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں۔ صحابہؓ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ اُن کے چہروں سے پُھوٹ پُھوٹ پڑے گی اور وہ خدا تعالیٰ کی اس نعمت کو لوگوں سے چھپا نہیں سکیں گے۔ فیج اعوج کے زمانہ میں مسلمانوں میں بعض ایسے ایسے صوفیاء گزرے ہیں جو دس دس بارہ بارہ سال تک لوگوں سے خدمت لینے کے بعد اُنہیں دین کی کوئی ایک بات یا معرفت کا کوئی ایک نکتہ بتایا کرتے تھے اس کے مقابلہ میں صحابہؓ کی جو حالت تھی اُس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک صحابی کہتے ہیں اگر تلوار میری گردن پر رکھ دی جائے اور کوئی دشمن مجھے قتل کرنے لگے اور اُس وقت مجھے یاد آ جائے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات مجھے ایسی بھی یاد ہے جو ابھی تک میں نے بیان نہیں کی تو میں اُس کے تلوار چلانے سے پہلے پہلے اس بات کو بیان کر دُوں گا (صحیح بخاری کتاب العلم باب العلم قبل القول و العمل)۔ تو ان کو یہ شوق تھا کہ خدا تعالیٰ کی باتوں کو دنیا میں زیادہ پھیلائیں۔ لیکن اور لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں اگر ہم نے لوگوں کو اپنا علم بتا دیا تو پھر ہمارا علم ختم ہو جائے گا اور وہ بھی ہمارے برابر ہو جائیں گے۔

میں نے جب جلسہ سالانہ پر ذکر الٰہی کے متعلق تقریر کی تو ایک غیر احمدی صوفی جو باہر سے آئے ہوئے تھے

اور میری اُس تقریر میں شامل تھے انہوں نے مجھے ایک رقعہ لکھا جس کا مضمون قریباً یہ تھا کہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں کہ وہ نکتے جو صوفیاء دس دس بارہ بارہ سال تک لوگوں سے خدمت لینے کے بعد بتایا کرتے تھے اس طرح پے در پے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔تو لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کو چھپاتے ہیں لیکن ہمیں اس بات کی پروا بھی نہیں ہوتی کیونکہ ہمیں اللہ تعالیٰ ہر وقت نئی سے نئی باتیں سکھاتا رہتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ علوم کا چھپانا ایسا ہی ہے جیسے صاف پانی کو گدلہ کر دیا جائے اور خدا تعالیٰ کا حکم بھی یہی ہے کہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ:۱۲) خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو دنیا میں زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ۔پس فرمایا وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو چھپائیں گے نہیں بلکہ یوں معلوم ہوگا کہ وہ اُن کے چہروں سے پُھوٹ پُھوٹ کر ظاہر ہو رہی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ کوئی شخص ملے تو اس کے سامنے ان نعمتوں کو رکھ دیں۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ چونکہ اس آیت سے پہلے مادی ترقیات کا ذکر تھا اس لئے فرمایا کہ جب ان لوگوں کو مادی ترقیات ملیں گی تو اُن کا حال دوسرے لوگوں سے مختلف ہوگا۔بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو نعماء ظاہری تو ملتی ہیں مگر ان کا دل اندر سے جل رہا ہوتا ہے۔مثلاً کسی کو حکومت تو مل جاتی ہے مگر اس کے خاندان میں ایسا تفرقہ اور فساد ہوتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے اس حکومت نے میری زندگی کو وبالِ جان بنا دیا ہے یا امراء اور وزراء میں ایسی ایسی ریشہ دوانیاں ہوتی ہیں کہ حکومت ملنے کے باوجود انہیں دل کا اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔باورچی کھانا لاتا ہے تو وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں باورچی نے کھانے میں زہر نہ ملا دیا ہو۔طبیب آتا ہے تو وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ دوا میں زہر ملا کر مُجھے ہلاک نہ کر دے۔وزیر ملنے آتا ہے تو وہ ڈرتے ہیں کہ یہ کہیں مار نہ ڈالے۔اِسی وجہ سے بادشاہوں کی طرف سے عجیب عجیب قسم کی حفاظتیں اور نگرانیاں کی جاتی ہیں۔مگر فرماتا ہے ہم مومنوں کو وہ نعمتیں دیں گے جو نہ صرف اُن کے ظاہر پر ہوگی بلکہ اُن کے دل پر نازل ہوں گی اور اس وجہ سے یہ نہیں ہوگا کہ انہیں مادی کامیابی تو حاصل ہو جائے مگر ان کے دل خوش نہ ہوں بلکہ جہاں انہیں مادی ترقیات کے سامان ہماری طرف سے ملیں گے وہاں اُن کے دل بھی خوش ہوں گے اور مادی ترقی قلبی خوشی کے ساتھ ملی ہوئی ہوگی۔

کسبی اور نسبی غناء میں فرق تیسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ان کو غناء نعیم ملے گا یعنی حقیقی نعمت سے جو غناء پیدا ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے انسان غرباء پر رحم کرتا ہے وہ اُن کو حاصل ہوگا۔دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اخلاق کسبی طور پر اچھے ہوتے ہیں اور بعض اخلاق نسلی طور پر اچھے ہوتے ہیں۔مثلاً کسبی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ کسب والا اپنے مال کی اچھی طرح حفاظت کرتا ہے لیکن نسب والا اپنے مال کی اُس طرح حفاظت نہیں کرتا۔چنانچہ کسبی طور

پر مالدار ہو جانے والے کا نوکر اگر کچھ نقصان کر بیٹھے تو وہ اس سے بڑی سختی کا معاملہ کرتا ہے لیکن نسبی طور پر جن کے اندر غناء پایا جاتا ہے وُہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام عفو اور چشم پوشی کرنا ہے۔ نَضۡرَۃٌ کے ایک معنے چونکہ غناء کے بھی ہیں اس لئے اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ باوجود اس کے کہ اونٹ چراتے چراتے صحابہؓ کو حکومت کے تخت پر بٹھا دیا جائے گا وہ ویسے ہی وسیع الحوصلہ اور ویسے ہی با اخلاق ہوں گے جیسے نسلاً بعد نسلٍ وہ حکومت کرتے چلے آئے ہوں گویا وہ اخلاق جو کسب کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں وہ بھی ان کو حاصل ہوں گے اور جو نسلی طور پر حاصل ہوتے ہیں وہ بھی اُن میں اُسی دن پیدا ہو جائیں گے جس دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُنہیں حکومت کے تخت پر بٹھایا جائے گا۔ چنانچہ صحابہؓ کو دیکھ لو کوئی کمینگی ان کے فعل میں نظر نہیں آتی حالانکہ نَو دولتوں میں کچھ نہ کچھ وہ بات ضرور ہوتی ہے جسے انگریزی میں فاپشنیس Foppishness کہتے ہیں یعنی اُن کی طرف سے ایک قسم کا اظہار اس بات کا ہوتا ہے کہ ہم دولت مند ہیں اور اس طرح لوگوں کو پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ وہ ہیں جنہیں نئی نئی دولت ملی ہے مگر فرماتا ہے تم ان صحابہ کے چہروں کو دیکھو گے تو تمہیں ان پر غناء دولت نظر آئے گا تم ان کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہیں کر سکو گے کہ انہیں نئی نئی دولت ملی ہے بلکہ یوں سمجھو گے کہ یہ نسلاً بعد نسلٍ اسی طرح حکمران چلے آئے ہیں۔ کمینگی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر چڑنا اور اپنی دولت مندی کا اظہار کرنا اُن کے اندر نظر نہیں آئے گا۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ ایک شخص کے متعلق جو بعد میں عیسائی ہو گیا سُنایا کرتے تھے کہ اُسے اپنے باپ دادا سے ورثہ میں کچھ جائداد ملی جو اُس نے تباہ و برباد کر دی اور وہ کنگال ہو گیا مگر اس حالت میں بھی اس کی عادت یہ تھی کہ جب وہ لاہور اسٹیشن پر اُترتا تو قُلی کو بلا کر اپنا رُومال اُسے پکڑا دیتا اور کہتا کہ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ آپ فرماتے کہ میں نے اُس سے پوچھا کہ تم یہ کیا کرتے ہو کہ تمہارے پاس سامان تو کوئی ہوتا نہیں اور تم صرف رومال جیب سے نکال کر قلی کو پکڑا دیتے ہو اور کہتے ہو کہ وہ اسے ہاتھ میں لٹکائے ہوئے تمہارے پیچھے پیچھے چلا آئے۔ اس پر وہ کہنے لگا اس کے بغیر شان نہیں ہوتی۔

تو یکدم انسان کو دولت مل جائے تو اُس کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں مگر فرمایا یہ شتربان اونٹوں کو چراتے چراتے حکومت کے تخت پر جا بیٹھیں گے مگر نَو دولتوں والی کمینگی ان کے اخلاق میں نہیں پائی جائے گی بلکہ غناء نعیم اُن کے چہروں سے ظاہر ہوگا چنانچہ صحابہؓ جہاں بیٹھتے اس امر کا صاف صاف اقرار کرتے کہ ہم غریب ہوتے تھے، بھوکے رہتے تھے، کھانے اور پہننے کو کچھ نہیں ملتا تھا مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی برکت سے خدا نے ہمیں یہ نعمتیں عطا فرما دیں۔ ایران کے بادشاہ نے ایک دفعہ اُن سے کہہ دیا کہ تم ذلیل لوگ گوہ کھانے والے میرے

ملک پر حملہ کرنے کے لئے آئے ہو تمہاری حیثیت ہی کیا ہے کہ تم ایسا کر سکو۔ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ لڑ پڑتا کہ میری ہتک کی گئی ہے مگر صحابہؓ نے کہا آپ نے جو کچھ کہا بالکل درست ہے ہماری یہی حالت ہوا کرتی تھی مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آنے کے بعد ہماری یہ حالت نہیں رہی۔ اب ہم میں تغیّر پیدا ہو چکا ہے (تاریخ طبری زیر عنوان ثم دخلت سنة اربعة عشر ذکر ابتداء امر القادسیة)۔ غرض غناءِ نعمت اُن کا جزو بن گئی تھی یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی گزشتہ حالت کو چھپاتے ہوں اور سمجھتے ہوں کہ اگر لوگوں کو ہماری پہلی حالت کا پتہ لگ گیا تو ہماری ہتک ہوگی۔ وہ اس میں کوئی ہتک نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس حالت سے دوسری حالت کو پانے میں خدا تعالیٰ کا ایک نشان دیکھتے تھے اس لئے اُس کے اظہار میں مزہ حاصل کرتے تھے۔ پس تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ تو غناءِ نعمت اُن کے چہروں پر دیکھے گا نَو دولتوں والی حالت اُن میں نہیں دیکھے گا۔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۶﴾

اُنہیں خالص سر بمہر شراب پلائی جائے گی۔

حَلّ لُغَات۔ رَحِيْق رَحِيْق خالص چیز کو کہتے ہیں۔ اسی طرح رَحِيْق کے ایک معنے شراب کے ہیں۔ اور رَحِيْق ایک قسم کی خوشبو کو بھی کہتے ہیں۔ (تاج العروس)

مَخْتُوْم مَخْتُوْم خَتَمَ سے نکلا ہے اور خَتَمَ يَخْتُمُ خَتْمًا وَخِتَامًا کے معنے ہوتے ہیں طَبَعَهٗ وَ وَضَعَ عَلَيْهِ الْخَاتَمَ۔ اور عَلٰی کے ساتھ بھی یہ متعدی آتا ہے چنانچہ کہتے ہیں خَتَمَ الْكِتَابَ وَعَلَى الْكِتَابِ یعنی اُس نے کسی چیز پر مُہر لگائی۔ خَتَمَ الشَّيْءَ خَتْمًا کے معنے ہوتے ہیں بَلَغَ اٰخِرَهٗ کسی چیز کو ختم کر دیا اور اُس کے آخر تک پہنچ گیا۔ خَتَمَ الْكِتٰبَ کے معنے ہوتے ہیں قَرَأَهٗ كُلَّهٗ وَاَتَمَّهٗ۔ اُس نے تمام کتاب پڑھ لی اور اُسے تکمیل تک پہنچا دیا۔ خَتَمَ الصَّكَّ وَغَيْرَهٗ کے معنے ہوتے ہیں وَضَعَ عَلَيْهِ نَقْشَ خَاتَمِهٖ حَتّٰى لَا يَجْرِيْ عَلَيْهِ التَّزْوِيْرُ اُس نے چک یا ویسی ہی کسی چیز پر اپنی انگوٹھی سے مُہر لگا دی تا کہ کسی قسم کی دھوکا بازی نہ ہو۔ خَتَمَ الْعَمَلَ کے معنے ہوتے ہیں فَرَغَ مِنْهُ اس سے فارغ ہو گیا۔ اور خَتَمَ الْاِنَاءَ کے معنے ہوتے ہیں سَدَّهٗ بِالطِّيْنِ وَنَحْوَهٗ اس کا مٹی وغیرہ سے منہ بند کر دینا۔ وَفِي الْقُرْاٰنِ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتَامُهٗ مِسْكٌ اور قرآن میں جو آتا ہے کہ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ۔ اُس کے بھی یہی معنے ہیں کہ وہ شراب سر بمہر ہوگی۔ جیسے انگریزی دوائیوں کی جو شیشیاں آتی ہیں

اُن کے مونہوں پر لاکھ لگا کر اوپر کارخانہ کی مہر لگی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح وہ رحیقِ مختوم ہو گی یعنی اُس کا منہ بند ہو گا اور اُس پر مہر لگی ہوئی ہو گی۔ خَتَمَ الزَّرْعَ وَخَتَمَ عَلَيْهِ کے معنے ہوتے ہیں سَقَاهُ اَوَّلَ سَقْيَةٍ۔ اس کو پہلی دفعہ پانی پلایا اور خَتَمَ اللّٰهُ لَهُ الْخَيْرَ کے معنے ہوتے ہیں اَتَمَّهٗ۔ اللہ تعالیٰ نے اُس پر خیر کا اتمام کر دیا۔ اور خَتَمَ عَلٰى قَلْبِهٖ کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَهٗ لَا يَفْهَمُ شَيْئًا وَلَا يَخْرُجُ مِنْهُ شَيْءٌ۔ اُسے ایسا بنا دیا کہ نہ وہ کچھ سمجھتا ہے اور نہ اُس کے قلب میں سے کوئی چیز باہر آتی ہے یعنی نہ وہ خود سمجھتا ہے اور نہ دوسرے کو سمجھا سکتا ہے اور خَتَمَ اللّٰهُ لَهٗ بِالْخَيْرِ کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَ لَهٗ عَاقِبَةً حَسَنَةً۔ اس کا انجام اچھا کر دیا۔ اور کبھی خَتَمَ کی بجائے خَتَّمَ بھی بولتے ہیں جو مبالغہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر ۔ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ کے یہ معنے ہیں کہ انہیں ایسی خالص شراب پلائی جائے گی جو مختوم ہو گی۔ مختوم کے ایک معنے یہ ہیں کہ ایسی چیز جو ختم کر دی گئی ہو اور جس کے آخر تک انسان پہنچ جائے۔ پس رَحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ کے یہ معنے ہوئے کہ اُن کو ایسی لطیف اور اعلیٰ شراب ملے گی کہ جس کو ملے گی وُہ اُسے آخر تک ختم ہی کر جائے گا چھوڑے گا نہیں یعنی اپنے اپنے ظرف کے مطابق وہ ساری شراب پی جائے گا۔

ان معنوں سے ظاہر ہے کہ رحیقِ مختوم سے مراد عام شراب نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح خِتٰمُهٗ مِسْكٌ اور مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ کے الفاظ کا آنا بتا رہا ہے کہ اس سے دنیوی شراب مراد نہیں ہے بہر حال یہ کوئی ایسی چیز ہے کہ یا تو اُسے اگلے جہان کی طرف منسوب کرنا پڑے گا اور یا اگر اس جہان کی طرف اُسے منسوب کیا جائے تو اس سے مراد کوئی ایسی چیز لینی پڑے گی جو ساری کی ساری پی جائے گی اور جس کا اپنے اپنے ظرف کے مطابق ایک قطرہ تک انسان باقی نہیں چھوڑے۔

رحیق سے مراد محبت الٰہی کی شراب میرے نزدیک یہاں رَحِيْق سے مراد محبتِ الٰہی کا نشہ ہے جو قرآن پیدا کرتا ہے۔ جس طرح شراب انسان کو مدہوش بنا دیتی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کا عشق انسان میں ایک قسم کی وارفتگی پیدا کر دیتا ہے اور اُسے ہر وقت اللہ تعالیٰ کے آستانہ پر جھکائے رکھتا ہے۔ شاعروں کو دیکھ لو وہ بھی اپنے معشوق کی آنکھ کو میخانہ کہتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح شراب نشہ پیدا کرتی ہے اسی طرح محبوب کی آنکھ عاشق کو مدہوش بنا دیتی ہے۔ پس شعراء نے یہ محاورہ کثرت سے استعمال کر کے بتا دیا ہے کہ شراب سے مراد صرف مادی شراب نہیں ہوتی بلکہ محبت اور عشق کا نشہ بھی شراب کہلا سکتا ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ۔ انہیں شراب محبت پلائی جائے گی۔ اس سے مراد قرآن کریم کی تعلیم اور اس کے مضامین یا اُس کی روشنی میں محمد رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں کہ وہ اُن پر محبت کے نشہ میں مخمور ہو کر ایسا عمل کریں گے کہ اپنے عشق کو کمال تک پہنچا دیں گے۔

لفظ مختوم میں شراب کی خوبی کا اظہار مَّخْتُوْمٌ کا لفظ ایک طرف شراب کی خوبی ظاہر کرتا ہے تو دوسری طرف پینے والوں کی خوبی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اَور قوموں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیمیں تو دی گئیں مگر انہوں نے اُن پر اُدھورا عمل کیا۔ موسیٰؑ کو جو کچھ دیا گیا تھا اُس میں سے کچھ موسیٰؑ کی قوم نے لیا اور کچھ نہ لیا۔ عیسیٰؑ کو جو کچھ دیا گیا تھا اُس میں سے بھی کچھ عیسیٰؑ کی قوم نے لیا اور کچھ نہ لیا۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم وہ ہے کہ جب اُس نے خم کو منہ لگایا تو پھر اُس نے اُسے چھوڑا نہیں بلکہ وہ پیتی چلی گئی یہاں تک کہ اُسے ختم کر دیا یعنی اُس کی ایک ایک تعلیم کو اُس نے جامہ عمل پہنایا۔ اسی طرح مختومؔ کے لفظ سے قرآن کریم کی تعلیم کی خوبی بھی ظاہر ہے کیونکہ جس تعلیم کو چھوڑا نہ جائے اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔ ایسی نہیں جو برداشت نہ ہو سکے۔ جس تعلیم کو انسان برداشت نہ کر سکتا ہو اُسے چھوڑ دیتا ہے مگر قرآن کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (القمر: ۱۸) ہم نے قرآن کو عمل کے لئے بالکل آسان کر دیا ہے اس کی کوئی تعلیم ایسی نہیں جس کا فطرت صحیحہ انکار کر سکتی ہو یا جس پر عمل کرنا اُس کے لئے دشوار ہو۔ پس اس ایک لفظ کے استعمال سے دونوں خوبیوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ اِدھر قرآن کے متعلق بتا دیا کہ اس کی کوئی تعلیم ایسی نہیں جسے چھوڑا جا سکے انسان اس کی ایک ایک بات پر عمل کر سکتا ہے اور کسی کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس پر عمل کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ دوسری طرف صحابہؓ کی تعریف کر دی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو وہ خادم اور ساتھی ملے تھے کہ جنہوں نے خُم سے مُنہ لگایا تو وہ خُم کا خُم ہی چڑھا گئے۔

خَتَمَ کے دوسرے معنے مہر کے ہوتے ہیں اور جس چیز پر مُہر لگی ہوئی ہو اُس میں کسی اور چیز کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔ پس رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ کے یہ معنے ہوئے کہ وہ پاک اور منزّہ ہو گی اور اُس میں کسی اور شئے کی آمیزش نہ ہو گی۔ یہ بھی قرآن کریم کی صفت ہے اور دشمن سے دشمن بھی سوائے شیعوں کے اقرار کرتا ہے کہ قرآن کریم ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہے اور اس میں نہ کوئی چیز باہر سے داخل ہوئی ہے اور نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر نکلی ہے۔ جس چیز پر مُہر لگی ہوئی ہو اُس میں یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ نہ اُس کے اندر کی چیز باہر نکلتی ہے اور نہ باہر سے کوئی چیز اندر داخل ہوتی ہے اسی طرح قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو مختوم ہے۔ جب قرآن نازل ہوا تھا اس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم زندہ موجود تھے اور آپ کے ہوتے ہوئے کوئی شخص اس میں بگاڑ پیدا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ آپ

کی وفات کے بعد خطرہ ہوسکتا تھا کہ اس میں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہوجائے سو اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ بعد میں بھی یہ مختوم ہی رہے گا۔ یہاں چونکہ مسلمانوں کو بادشاہت عطا کئے جانے کا ذکر ہو رہا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب مسلمان ارائک پر بیٹھیں گے اِس لئے اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ جب مسلمان بادشاہ ہوجائیں گے۔ حکومت اُن کو حاصل ہوجائے گی۔ طاقت اُن کے پاس ہوگی اور وہ تمام قسم کے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتے ہوں گے اُس زمانہ میں بھی قرآن بالکل محفوظ رہے گا اور کسی بادشاہ کو بھی یہ طاقت نہیں ہوگی کہ وہ اس میں تصرّف کرسکے۔ دنیا میں عام طور پر جب بادشاہت کا زمانہ آتا ہے تو لوگ چاہتے ہیں کہ اب ہم عیش کریں اور لُطف اُٹھائیں اور چونکہ مذہبی تعلیمیں اُن کے عیش میں حائل ہوتی ہیں اس لئے وہ اُن تعلیموں کو بدلنا شروع کردیتے ہیں۔ مگر فرماتا ہے قرآن وہ ہے جو اسلامی ترقی کے زمانہ میں بھی بالکل خالص رہے گا نہ کوئی تعلیم اس میں سے خارج ہوسکے گی اور نہ کوئی نئی تعلیم اس میں داخل کی جاسکے گی۔ مسیحیوں میں اسی طرح خرابی پیدا ہوئی کہ جب روما کا بادشاہ عیسائیت میں داخل ہونے لگا تو اس نے کہا کہ مجھے عیسائیت قبول کرنے میں تو کوئی عذر نہیں مگر سبت کا دن جو ہفتہ کو منایا جاتا ہے وہ اتوار کے دن منالیا جایا کرے کیونکہ ہماری قوم اتوار کا دن مناتی ہے ہفتہ کا دن نہیں مناتی۔ عیسائیوں نے سبت کا دن بدل کر اتوار کردیا۔ پھر اُس نے کہا کہ ہماری قوم خالص توحید کا عقیدہ نہیں مان سکتی اس میں کچھ ایسے اشارے کنائے رکھ دیں جن کو دیکھ کر لوگوں کے لئے عیسائیت قبول کرنا آسان ہوجائے۔ انہوں نے یہ بات بھی مان لی اور کہا کہ ہم۔ باپ خدا بیٹا خدا اور روح القدس خدا کہنا شروع کردیتے ہیں۔ چنانچہ وہ بادشاہ مع اپنی قوم کے عیسائیت میں شامل ہوگیا۔ عیسائیوں نے پہلے تو صرف لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کرنے کے لئے یہ تین نام رکھے تھے مگر آہستہ آہستہ یہ حقیقت میں تبدیل ہوگئے اور عیسائیوں نے ایک کی بجائے تین خداؤں کا عقیدہ اختیار کرلیا۔ تو جب بادشاہت آتی ہے۔ ترفّہ آتا ہے۔ طاقت حاصل ہوتی ہے تو مذہب میں کئی قسم کی تبدیلیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مسلمان جب آرائک پر بیٹھیں گے۔ جب تختِ حکومت ان کو نصیب ہوگا۔ جب طاقت اُن کو حاصل ہوگی۔ جب اقتدار اُن کو میسّر آئے گا تو اُس وقت بھی یہ کلام رحیقِ مختوم رہے گا اور بادشاہوں کو بھی یہ جرأت نہیں ہوگی کہ وہ اس میں اپنے مطلب کی کوئی چیز بڑھادیں یا اس کی کسی تعلیم کو خارج کردیں۔ گویا اسلام کی ترقی کے زمانہ میں بھی قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس میں شیعوں کا ردّ بھی ہوگیا جو خیال کرتے ہیں کہ قرآن کریم کا کچھ حصہ غائب ہے کیونکہ ختم کے دونوں مفہوم ہوتے ہیں نہ اُس میں کوئی چیز پڑ سکتی ہے اور نہ اس میں سے کوئی چیز نکل سکتی ہے پس جو کتاب مختوم ہو اُس کے متعلق یہ کہنا کہ اُس کا ایک حصہ غائب ہوچکا ہے کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ

اُس کے آخر میں مُشک ہوگا۔

حَلِّ لُغَات ۔ خِتَام خِتَام خَتَمَ کا مصدر ہے اور اس کے معنے ہیں اَلْفَصُّ مِنْ مَفَاصِلِ الْخَيْلِ۔ وَالْمَقْطَعُ وَالطِّيْنُ يُخْتَمُ بِهٖ عَلَى الشَّيْءِ۔ (اقرب) یعنی خِتَام گھوڑے کے جوڑ کو کہتے ہیں۔ اسی طرح خِتَام نظم کے آخری شعر کو بھی کہتے ہیں اور ختام اُس مٹی کو بھی کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی دوسری چیز پر مہر لگائی جائے۔ پس خِتَامُهٗ مِسْكٌ کے یہ معنے ہوئے کہ (۱) وہ منہ بند کرنے والی چیز مشک کی ہوگی (۲) یا اُس کا آخری حصہ مشک ہوگا (۳) یا اس کے انتہاء تک مشک ہوگا۔

تفسیر ۔ **خِتٰمُهٗ مِسْكٌ کے تین معنے** اس آیت کے پہلے معنے یہ ہیں کہ اُس کی مُہر مُشک کی ہوگی یعنی جو اشیاء اُس کی حفاظت پر لگیں گی وہ بھی مُشک کی طرح ہوں گی۔ یہ امر ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی خدمت اور اُس کی حفاظتِ ظاہری کا کام حُفّاظ اور قراء کے سپرد ہے۔ وہ قرآن کریم کے خادم ہیں اور اس کی حفاظت کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ جس طرح مُہر کی یہ غرض ہوتی ہے کہ کوئی چیز باہر سے اندر داخل نہ ہو اور کوئی چیز اندر سے باہر خارج نہ ہو اسی طرح اس آیت میں یہ بتایا گیا تھا کہ قرآن کریم کی خدمت پر ایسے انسان مقرر کئے جائیں گے جو مشک کی طرح خوشبودار ہوں گے یعنی وہ اعلیٰ درجہ کے نیک۔ اپنی ذمہ داری کو سمجھنے والے اور قرآن کریم کی حفاظت کا حق ادا کرنے والے ہوں گے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں چودہ سو سال گزر چکے ہیں مگر کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوا جس میں حفّاظ کی ایک بڑی بھاری جماعت دنیا میں موجود نہ ہو اور وہ قرآن کریم کی خدمت نہ کر رہی ہو۔ پس خِتٰمُهٗ مِسْكٌ میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ اس کی حفاظت ظاہری کے لئے ہم ایسے لوگ کھڑے کر دیں گے جو نیکی اور تقویٰ میں اعلیٰ مقام رکھتے ہوں گے اور مشک کی طرح خوشبودار ہوں گے۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ اُس کا آخر مشک کا ہوگا شراب کے نیچے ہمیشہ ایک چیز بیٹھ جاتی ہے جسے گار کہتے ہیں۔ یورپ میں تو یہ قاعدہ ہے کہ وہ شراب کشید کرنے کے بعد اُسے سال سال دو دو سال تک پڑا رہنے دیتے ہیں اور اُس کے بعد اُسے شیشیوں میں بھرتے ہیں تا کہ جس قدر دُرد تہ نشین ہونی ہے وہ ہو جائے بلکہ بعض دفعہ تو دس دس پندرہ پندرہ سال تک شراب کو کشید کر کے رکھ دیتے ہیں۔ تا کہ انگور وغیرہ کے باریک ذرّے جو پانی میں ملے ہوئے ہوتے ہیں وہ آہستہ آہستہ تہ نشین ہو جائیں مگر پہلے زمانہ میں یہ رواج نہیں تھا اور شراب بنانے کے بعد جلد ہی

بیچ دیتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ شراب کی بوتل کے نیچے گار بیٹھ جاتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ شراب کی دُردتو گندی ہوتی ہے مگر قرآن وہ کتاب ہے جس کا دُرد بھی مشک کی طرح ہے۔ اب تم خود ہی سوچ لو کہ جس کا دُرد مشک کا ہوگا اس کا اصل کیسا ہوگا۔ دُرد کیا ہوتا ہے۔ دُرد ظاہری جسم کو کہتے ہیں مثلاً انگور یا کھجور وغیرہ سے شراب نکالی جائے تو انگور کے باریک باریک ذرّے یا کھجور وغیرہ کے ذرّات نیچے بیٹھ جاتے ہیں اور شراب اُن انگوروں یا کھجوروں کا سَت ہوتا ہے۔ پس چونکہ دُرد ظاہری جسم کو کہتے ہیں اور شراب ست ہوتا ہے اس لئے جب قرآن کے متعلق یہ کہا گیا کہ اس کی گار بھی مشک ہے تو اس گار سے مراد قرآن کریم کی ظاہری تعلیم ہوگی۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وہ کتاب ہے کہ اس کی ظاہری تعلیم بھی اچھی ہے اور اس کی باطنی تعلیم بھی اچھی ہے۔ اس کی موٹی سے موٹی تعلیم جو کسی معاملہ کے متعلق ہو لے لو وہ مشک ہی مشک ہوگی اس سے تم قرآن کریم کی اعلیٰ درجہ کی روحانی تعلیمات کا اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کیسی ہوں گی۔

تیسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ جس طرح اس قرآن کی ابتداء اعلیٰ ہے اسی طرح اس کی انتہاء بھی اعلیٰ ہو گی۔ ابتداء میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جیسا عظیم الشان انسان اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام لے کر آیا اور آخری زمانہ میں مسیح موعودؑ اس کی اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوگا۔ گویا یہ وہ گلاس ہے جسے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لوگ پینا شروع کریں گے اور پیتے چلے جائیں گے مگر آخر تک یہ مشک ہی مشک رہے گا یعنی ہمیشہ اللہ تعالیٰ ایسے آدمی مبعوث کرتا رہے گا جو قرآن کریم کی خدمت کریں گے اور اسلام کی اشاعت کا کام سرانجام دیں گے اور آخری زمانہ میں بھی ایسا آدمی پیدا ہوگا جو اس قرآن کی خوشبو کو ساری دنیا میں پھیلا دے گا۔

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ کا ظاہری الفاظ میں پورا ہونا یہاں ایک لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مشک بڑا پسند تھا اور آپ ہمیشہ اُسے استعمال فرمایا کرتے تھے پس فرمایا اس کا ختام بھی مشک پر ہوگا یعنی ایسے انسان پر جو کثرت سے مشک استعمال کرنے والا ہوگا خدا تعالیٰ کی سُنت ہے کہ وہ بالعموم ایک ظاہری علامت شناخت کی بھی مقرر فرما دیتا ہے۔ جیسے ختم نبوت کے حقیقی معنوں کے ساتھ ایک نشان بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پشت مبارک پر بنا ہوا تھا۔

وَ فِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور چاہیے کہ خواہش رکھنے والے (انسان) ایسی (ہی) چیز کی خواہش کریں۔

حَلّ لُغَات۔ تَنَافَسُوْا تَنَافَسُوْا فِی الشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں نَافَسُوْا اور نَافَسَ فِی الشَّیْءِ مُنَافَسَۃً وَنِفَاسًا کے معنے ہوتے ہیں رَغَبَ فِیْہِ عَلٰی وَجْہِ الْمُبَارَاۃِ فِی الْکَرَمِ۔ کہ مقابلہ کے جذبہ کے ساتھ نیک اور اچھے کاموں میں ایک دوسرے کے مقابل میں مشغول ہو گئے اور دوسرے معنے اس کے ہوتے ہیں بَالَغَ فِیْہِ وَغَالَ وَزَایَدَ۔ کسی کام کو حد سے زیادہ کرنا۔ اس میں غلُوّ سے کام لینا اور اس کام میں بڑھتے چلے جانا (اقرب)
پس فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ کے معنے یہ ہوئے کہ یہ وہ چیز ہے (یعنی رحیقِ مختوم کا ملنا) جس کے متعلق لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس کو لینے کے لئے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

تفسیر۔ اس بات کی دلیل کہ رحیق مختوم سے مراد کوئی مادی چیز نہیں اس آیت سے صاف پتہ لگتا ہے کہ رحیقِ مختوم کوئی مادی چیز نہیں بلکہ روحانی چیز ہے۔ کیونکہ اگر یہ مادی چیز ہوتی تو جو شخص ایک گلاس ہی پی سکتا ہے اُسے یہ کس طرح کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ تنافس وہاں ہی ہوتا ہے جہاں ایک شخص دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ پس یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ روحانی چیز ہے جس میں دوسروں سے مقابلہ ہو سکتا تھا کوئی مادی چیز نہیں کہ جو محدود طور پر ہی استعمال کی جا سکتی ہے اور جس میں دوسرے سے مقابلہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ روحانی نعمت تھی اور اس میں دوسروں سے مقابلہ کیا جا سکتا تھا اس لئے فرمایا کہ تم اگر اس معاملہ میں کسی دوسرے پر رشک کرو تو یہ بالکل جائز ہے۔ تم اگر کوشش کرتے ہو کہ دینی خدمات میں کوئی دوسرا تم سے بڑھ نہ سکے تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ تمہارے لئے ضروری ہے کہ ایسا کرو۔ تَنَافُس کے معنے روز بروز بڑھتے چلے جانے کے ہیں۔ پس جہاں اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ تم دوسروں کا مقابلہ کرو اور کوشش کرو کہ اپنے ساتھیوں سے بڑھ جاؤ وہاں اس کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ تم کوشش کرو کہ تمہارا آج کا دن کل کے دن سے بڑھ جائے گویا مُبَارَاۃ کے تو یہ معنے ہیں کہ تم دوسروں کا مقابلہ کرو اور تزایُد کے یہ معنے ہیں کہ تمہارا آج کا قدم تمہارے کل کے قدم سے آگے ہو یہ دو چیزیں اپنے سامنے رکھ لو پھر دیکھو کہ کس طرح تم جلد سے جلد ترقی حاصل کر لیتے ہو۔

وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۸﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۹﴾

اور اس میں تسنیم کی آمیزش ہوگی ۔ (ہماری مراد اس) چشمہ (سے ہے) جس سے مقرب لوگ پئیں گے۔

حَلّ لُغَات۔مِزَاجُهٗ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ مَزَجَ الشَّيْءَ مَزْجًا وَمِزَاجًا کے معنے ہوتے ہیں خَلَطَهٗ بِهٖ۔ کسی چیز سے اُس کو ملا دیا۔(اقرب)

تَسْنِيْم سَنَّمَ الْكَلَأُ الْبَعِيْرَ کے معنے ہوتے ہیں عَظَّمَ سَنَامَهٗ۔گھاس نے اونٹ کے کوہان کو بڑا کر دیا۔ سَنَّمَ فُلَانٌ الْاِنَاءَ کے معنے ہوتے ہیں مَلَأَهٗ اُس نے اس کا برتن بھر دیا۔ سَنَّمَ الْمِكْيَالَ کے معنے ہوتے ہیں مَلَأَهٗ ثُمَّ عَمِلَ فَوْقَهٗ مِثْلَ السَّنَامِ مِنَ الطَّعَامِ۔ اُس نے برتن کو بھرا اور پھر بھر کر چوٹی دار بنا دیا۔ سَنَّمَ الشَّيْءَ کے معنے ہوتے ہیں عَلَاهُ اُس کو اونچا کیا اور سَنَّمَ الْقَبْرَ کے معنے ہوتے ہیں ضِدُّ سَطَّحَهٗ اُس نے قبر کو اونچا کیا (اقرب) پس تسنیم کے معنے ہوئے اونچا کرنا یا بھر دینا یا ایسی چیز جو کہ اونچا کر دینے والی ہے یا بھر دینے والی ہے۔

تفسیر۔ **تسنیم سے مراد الہام الٰہی** اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شراب کے پیالوں کو الہامی پانی سے مدد دیتا رہے گا تا کہ ہر مزاج کا آدمی ہر زمانہ میں اس سے فائدہ اٹھاتا رہے۔یعنی قرآن گو رحیق ہے مگر رحیق بھی اس پانی سے بنتی ہے جو اُس کے مناسب حال ہو۔تھوڑے پانی کی ضرورت ہو تو اس میں تھوڑا پانی ملایا جاتا ہے۔اور زیادہ پانی کی ضرورت ہو تو اُس میں زیادہ پانی ملایا جاتا ہے۔گویا زمانہ اور ذوق کے لحاظ سے اُس میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اور گو چیز وہی رہے مگر اس کی شکل کو بدلنا ضروری ہوتا ہے تا کہ لوگ اس سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے رہیں۔ پس مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرما دیا کہ وہ ہر زمانہ کے لحاظ سے ایسے الہامات نازل کرتا رہے گا جو اس رحیق میں مناسب حال تمزیج کا باعث ہوں گے۔ پس تسنیم سے مراد الہام کا پانی ہے جو قرآن میں ہر زمانہ میں ملایا جاتا رہا ہے اور بتایا گیا ہے کہ بغیر تازہ کلامِ الٰہی کے قرآن کریم اونچا نہیں ہوتا اُس کی عظمت اور اُس کی شان اور اُس کی فوقیت اس وقت صحیح طور پر ظاہر ہوتی ہے جب تسنیم کا پانی اُس میں ملایا جائے۔ پس فرمایا قرآن بے شک رحیق مختوم ہے مگر ہر زمانہ میں ایسی ضرورتیں پیش آتی رہیں گی جن کے لئے تازہ کلامِ الٰہی کی ضرورت ہوگی۔اس وقت ہم اپنا کلام نازل کریں گے جو قرآن کے لئے تسنیم کا موجب ہوگا۔ یعنی اُس کو اونچا کرنے اور اس کی شان اور عظمت کو ظاہر کرنے کا باعث ہوگا۔آگے فرماتا ہے تمہیں کچھ پتہ ہے یہ تسنیم

کیا چیز ہے؟ عَیۡنًا یَّشۡرَبُ بِھَا الۡمُقَرَّبُوۡنَ۔ یہ ایک چشمہ ہے جس سے مقرب لوگ پانی پیتے ہیں۔ یَشۡرَبُ بِھَا کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس میں باء زائدہ ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں باء بمعنے مِنۡ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہاں باء حال کے لئے ہے یعنی عَیۡنًا یَّشۡرَبُ مَمۡزُوۡجًا بِھَا الۡمُقَرَّبُوۡنَ وہ ایک چشمہ ہے جس سے ملا کر رحیق پیتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں باء معنًا استعمال ہوئی ہے یعنے اصل میں یہ وہ جملے ہیں یَشۡرَبُ وَیَلۡتَذُّ بِھَا الۡمُقَرَّبُوۡنَ مقرب اس میں سے پیتے اور لذت حاصل کرتے ہیں۔ (تفسیر روح المعانی زیر آیت ھٰذا)

یَشۡرَبُ بِھَا الۡمُقَرَّبُوۡنَ نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ مِزَاجُہٗ مِنۡ تَسۡنِیۡمٍ میں الہام الٰہی کا ہی ذکر کیا گیا تھا کیونکہ اس آیت میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کو تازہ الہام کی روشنی میں پیش کیا جاتا رہے گا۔ اور یہ الہام مقرب لوگوں پر نازل ہو گا یعنی امت محمدیہ میں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جن کے دلوں میں تسنیم کا چشمہ پھوٹے گا اور وہ اس پانی کو پی کر قرآن کریم کی ایسی تشریحیں اور توضیحیں کریں گے جن سے ہر زمانہ کے لوگ فائدہ اُٹھا سکیں گے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا کَانُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَضۡحَکُوۡنَ ﴿۳۰﴾

وہ (لوگ) جو مجرم ہوئے یقیناً مومنوں سے ہنسی (ٹھٹھا) کیا کرتے تھے۔ اور جب اُن کے پاس سے گزرتے تھے

وَ اِذَا مَرُّوۡا بِھِمۡ یَتَغَامَزُوۡنَ ﴿۳۱﴾

تو ایک دوسرے کو آنکھ سے اشارے کیا کرتے تھے۔

حَلّ لُغَات۔ یَضۡحَکُوۡنَ یَضۡحَکُوۡنَ ضَحِکَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَلضِّحۡکُ (جو ضَحِکَ کا مصدر ہے) کے معنے ہیں اِنۡبِسَاطُ الۡوَجۡہِ وَتَکَشُّرُ الۡاَسۡنَانِ مِنۡ سُرُوۡرِ النَّفۡسِ یعنی ضحک کے اصل معنی ہیں چہرے پر کشادگی پیدا ہو جانا اور خوشی کے ساتھ دانت بجنے لگ جانا وَاسۡتُعِیۡرَ الضِّحۡکُ لِلسُّخۡرِیَّۃِ پھر استعارۃً اس کو تمسخر کے معنوں میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔ چنانچہ کہتے ہیں ضَحِکۡتُ مِنۡہُ میں نے اس سے تمسخر کیا۔ وَرَجُلٌ ضُحَکَۃٌ یَضۡحَکُ مِنَ النَّاسِ۔ وہ شخص جو لوگوں سے تمسخر کرے اُس کو ضُحَکَۃٌ کہتے ہیں۔ وَضُحۡکَۃٌ لِمَنۡ یُضۡحَکُ مِنۡہُ اور وہ شخص جس پر لوگ ہنسیں اس کو ضُحۡکَۃٌ کہتے ہیں۔

ضحک سے مراد تعجب قرآن مجید میں آتا ہے وَ کُنۡتُمۡ مِنۡھُمۡ تَضۡحَکُوۡنَ۔ اِذَا ھُمۡ مِنَّا یَضۡحَکُوۡنَ

تَعْجَبُوْنَ وَ تَضْحَكُوْنَ۔ اور معنے یہ ہیں کہ وہ تعجب کرتے ہیں۔ استعجاب کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اُن کی حالت پر تعجب کر کے مذاق کرتے ہیں گویا ضحك کے معنے ایسی ہنسی کے ہیں جس کے ساتھ تعجب بھی شامل ہوتا ہے۔ وَيُسْتَعْمَلُ فِي السُّرُوْرِ الْمُجَرَّدِ۔ اور کبھی یہ لفظ خالی خوشی کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے خواہ ظاہری طور پر ہنسی آئی ہو یا نہ آئی ہو۔ وَاسْتُعْمِلَ لِلتَّعَجُّبِ الْمُجَرَّدِ تَارَةً اور کبھی مجرّد تعجب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی خواہ صرف تعجب ہو۔ خوشی ہو یا نہ ہو۔ پھر مفردات کے مصنّف لکھتے ہیں وَمِنْ هٰذَا الْمَعْنٰى قَصَدَ مَنْ قَالَ اَلضِّحْكُ يَخْتَصُّ بِالْاِنْسَانِ وَلَيْسَ يُوْجَدُ فِيْ غَيْرِهٖ مِنَ الْحَيَوَانِ انہی معنوں کی رُو سے بعض نے کہا ہے کہ ضحك انسان کے ساتھ مختص ہے کسی حیوان میں ضحک نہیں پایا جاتا (مفردات) تعجب ہے کہ مفردات والوں نے یہ کس طرح لکھ دیا حالانکہ تعجب جانوروں میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے چنانچہ جانور کے سامنے کوئی نئی چیز رکھ دی جائے تو وہ اُس کے پاس جاتا ہے اُسے تھوتھنی مارتا ہے۔ سونگھتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ وُہ چیز اُس کے کھانے کے قابل نہیں تو پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ البتہ قہقہ مار کر ہنسنے والا کوئی جانور دکھائی نہیں دیتا۔ صرف ایک قلیل حد تک بندر میں ہنسی کا مادہ پایا جاتا ہے۔

پھر وہ کہتے ہیں وَلِهٰذَا الْمَعْنٰى قَالَ وَاِنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى۔ قرآن کریم میں یہ جو آتا ہے کہ اِنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَ اَبْكٰى ☆ اس کے معنے بھی تعجب کے ہی ہیں۔ اسی طرح مفردات والے قرآنی آیت اِمْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ میں ضَحِكَتْ کے معنے حَاضَتْ کرنے کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں جس مفسّر نے یہ لکھا ہے اُس نے پہلے مفسّر کے معنے غلط سمجھے اس کی یہ مراد نہ تھی کہ ضَحِكَتْ کے معنے حَاضَتْ کے ہیں بلکہ اُس نے یہ لکھا تھا کہ اُس وقت جبکہ وہ ہنسیں اُن کو حیض آ گیا۔ مفردات والوں کے نزدیک اس آیت میں بھی ضَحِكَتْ کا لفظ تعجب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں قرآن کریم کی دوسری آیتیں اِن معنوں کو ثابت کر دیتی ہیں۔ قرآن کریم میں آتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو جب لڑکے کی خوشخبری ملی تو انہوں نے کہا ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ (ھود: ۷۳) اسی طرح آتا ہے اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ (ھود: ۷۴) ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ضَحِكَتْ کے معنے تعجب کے ہی ہیں کیونکہ ضَحِكَتْ کے لفظ کی اَتَعْجَبِيْنَ سے تشریح کی گئی ہے۔ مفردات کے مصنف یہ بات بھی کہتے ہیں کہ کوئی چیز اگر واضح ہو اور اس

☆ نوٹ: مفردات کے مصنف نے هُوَ اَضْحَكُ وَ اَبْكٰى کی آیت ضَحِكَ سے مراد تعجب لیا ہے اور یہ معنے چسپاں ہوتے نظر نہیں آتے غالباً یہ آیت غلطی سے لکھی گئی ہے اصل آیت جس سے استنباط ہے وہ اس سے اگلی آیت ہے۔

میں چمک ہو تو وہ بھی استعارۃً ضاحک کہلاتی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے سُمِّیَ الْبَرْقُ الْعَارِضُ ضَاحِكًا وَالْحَجَرَ يَبْرُقُ ضَاحِكًا وَسُمِّيَ الْبَلَحُ حِيْنَ يَتَفَتَّقُ ضَاحِكًا وَطَرِيْقٌ ضَحُوْكٌ وَاضِحٌ وَضَحِكَ الْغَدِيْرُ: تَلَأْلَأَ مِنِ امْتِلَاءِهٖ (مفردات) یعنی بجلی کو جب وہ بادلوں میں چمک رہی ہو ضاحک کہتے ہیں۔ پتھر جو چمک رہا ہو اُس کو بھی ضاحک کہتے ہیں۔ کھجور جب پختہ ہونے پر آئے اُسے بھی ضاحک کہتے ہیں۔ کھلے راستہ کو بھی طَرِيْقٌ ضَحُوْكٌ کہتے ہیں۔ اور وہ تالاب جو پانی سے خوب بھرا ہوا ہو اور اس کی کثرت کی وجہ سے چمک رہا ہو اس کے متعلق بھی کہتے ہیں کہ ضَحِكَ الْغَدِيْرُ۔ تالاب پانی کی کثرت سے چمک پڑا۔

يَتَغَامَزُوْنَ يَتَغَامَزُوْنَ تَغَامَزَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور تَغَامَزَ الْقَوْمُ کے معنے ہوتے ہیں اَشَارَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ بِاَعْيُنِهِمْ۔ ایک دوسرے کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اسلام کی ترقی کی پیشگوئی پر کفار کا ہنسنا اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے۔ یقیناً وہ لوگ جنہوں نے جرم کیا اور جو خدا تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی وجہ سے کٹ چکے ہیں وہ اُن لوگوں سے جو کہ مومن ہیں تمسخر کرتے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ضُعف اور اُن کی کمزوری کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس زمانہ میں اُن کی حالت اس قدر کمزور ہوگی اور اُن کا دوبارہ ترقی اور عروج حاصل کرنا بظاہر اس قدر ناممکن ہوگا کہ کفّار اُن کو دیکھ دیکھ کر ہنسیں گے اور جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے یہ کہیں گے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ پھر ترقی عطا کرنے والا ہے تو وہ کہیں گے یہ تو پاگل ہو گئے ہیں۔ ان کے دماغ سلامت نہیں رہے۔ کہ یہ خیال کرتے ہیں انہیں حکومت مل جائے گی۔ دنیا میں ایک بہت بڑی تبدیلی ان کے ذریعہ ہوگی اور نظامِ نَو کو یہ لوگ قائم کریں گے۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ۔ اَور جب وُہ ان کے پاس سے گزرتے ہیں تو وُہ اُن کو دیکھ کر آنکھیں مارتے ہیں۔ آنکھیں اُس وقت ماری جاتی ہیں جب انسان کسی دوسرے کے متعلق یہ یقین رکھتا ہو کہ وہ پاگل ہے اور وہ اپنے جنون کی حالت میں سمجھتا ہے کہ میں کامیاب ہو جاؤں گا اور دنیا کا بادشاہ بن جاؤں گا ایسی حالت میں لوگ اُس کو دیکھ دیکھ کر اپنے ساتھیوں کو توجہ دلانے کے لئے آنکھیں مارتے ہیں۔ اس خیال سے کہ اگر ہم نے منہ سے کوئی بات کی تو یہ پیچھے پڑ جائے گا۔ پس فرماتا ہے یہ لوگ بھی جب مومنوں کو دیکھیں گے اور اُن کی زبان سے یہ باتیں سُنیں گے کہ دنیا میں وہ ایک بہت بڑا تغیّر پیدا کرنے والے ہیں تو وہ آپس میں آنکھیں ماریں گے کہ یہ لوگ تو پاگل ہو گئے ہیں۔ یہ بالکل وہی نقشہ ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی پر ہنسنے والوں کا تھا۔ جب حضرت نوح علیہ السلام

اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کشتی تیار کر رہے تھے تو کفار وہاں سے گزرتے اور اُن کو دیکھ دیکھ کر ہنستے تھے کہ یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے اُس زمانہ میں مومن بظاہر ایسے ہی بے کار کاموں میں مشغول نظر آئیں گے اور جب کفار اُن کو دیکھیں گے تو وہ ایک دوسرے کو آنکھیں ماریں گے کہ دیکھو جی یہ پاگل کیا کر رہے ہیں۔

اِس آیت سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ غالب قوم میں اُس وقت تسامح ہوگا اور اُن کے ظاہری اخلاق اور ہوں گے اور باطنی اَور۔ تغامز انسان اُسی جگہ کرتا ہے جہاں وہ سمجھتا ہے کہ میرا کچھ کہنا اخلاق کے خلاف ہے اور یہ بات یوروپین قوموں میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ اُن سے کوئی بات کرو وہ رسمی طور پر اُس وقت یہی کہیں گے کہ آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں مگر دل میں کہہ رہے ہوتے ہیں کہ یہ تو پاگل ہیں۔ پس یَتَغَامَزُوْنَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے یوروپین لوگوں کے اخلاق کا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ وہ ظاہر کچھ کریں گے اَور اُن کے دل میں کچھ ہوگا۔

وَ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ۟ۖ﴿۳۲﴾

اور جب گھر والوں کی طرف لوٹتے تھے تو (مسلمانوں کے خلاف) خوب باتیں بناتے ہوئے لوٹتے تھے۔

حَلّ لُغَات۔ فَكِهِيْنَ فَكِهِيْنَ فَكِهٌ کی جمع ہے۔ کہتے ہیں فَكِهَ الرَّجُلُ فَكْهًا وَفَكَاهَةً۔ كَانَ طَيِّبُ النَّفْسِ مَزَّاحًا ضَحُوْكًا۔ یعنی وہ بڑی اچھی طبیعت والا بامذاق اور ہنسنے والا ہے یا فَكِهَ الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں يُحَدِّثُ اَصْحَابَهٗ فَيُضْحِكُهُمْ۔ وہ اپنے ساتھیوں سے اس غرض کے لئے باتیں کرتا ہے تاکہ وہ ہنسیں۔ فَهُوَ فَاكِهٌ وَفَكِهٌ وَفَيْكَهَانُ۔ اسے فَاكِهٌ۔ فَكِهٌ اور فَيْكَهَانُ بھی کہتے ہیں اور فَكِهَ مِنْهُ کے معنے ہوتے ہیں تَعَجَّبَ۔ اُس نے تعجب کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جب یہ اپنی قوم یا اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر جاتے ہیں تو خوب قہقے لگاتے اور مذاق کرتے جاتے ہیں کہ یہ کیسے بے وقوف لوگ ہیں۔ چونکہ فَكِهَ مِنْهُ کے معنے تعجب کرنے کے بھی ہیں اس لئے اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ تعجب کریں گے کہ یہ لوگ کیسے بے ہودہ خیالات میں پڑے ہوئے ہیں اور کیسی حماقت میں مبتلا ہیں کہ خیال کرتے ہیں اُن کی تعلیم اس ترقی اور تعلیم کے زمانہ میں پھیل جائے گی۔

وَ اِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝۳۳

اور جب (بھی) انہیں دیکھتے تھے کہتے تھے کہ یہ لوگ تو (بالکل) گمراہ ہیں۔

تفسیر ۔ **رَاَوْهُمْ میں هُمْ کی ضمیر کا مرجع** رَاَوْهُمْ کی ضمیر دونوں طرف جاسکتی ہے یعنی اَھْل کی طرف بھی اور مومنین کی طرف بھی۔ یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ اِذَا رَاَوْ اَھْلَهُمْ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِذَا رَاَوُ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی بعض حالتوں میں تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ صرف تغامز کرتے ہیں۔لیکن بعض حالتوں میں وہ مومنوں کو دیکھ کر رُک نہیں سکتے بلکہ ایک دُوسرے کو کہتے ہیں کہ یہ لوگ بڑے گمراہ اور بے وقوف ہیں اور چونکہ رَاَوْهُمْ کی ضمیر اَھْل کی طرف بھی جاتی ہے اس لئے اس کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ جب وہ اپنی قوم کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اِن لوگوں کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے اِن سے ترقی کی امید کرنا بالکل غلط ہے۔ یہ لوگ آخر تباہ و برباد ہی ہوں گے۔ دنیا میں کوئی نیک تغیّر پیدا نہیں کرسکتے۔ اس صورت میں اُن کی یہ بات پہلی بات کی ضِد ہوگی۔ یعنی اُن کی حالت یہ ہے کہ وہ سامنے تو تغامز کرتے ہیں ایک پادری بھی آجائے تو وہ کہے گا کہ آپ لوگ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں لیکن جب اپنی قوم میں جاتے ہیں تو اسلام کے خلاف بڑی سخت کتابیں لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ تو بالکل گمراہ ہیں۔

وَ مَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَیْهِمْ حٰفِظِیْنَ ۝۳۴

حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔

تفسیر ۔ **مَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَیْهِمْ حٰفِظِیْنَ میں مغربی اقوام کے ایک خاصہ کی طرف اشارہ** یہ بھی مغربی اقوام کی ایک خصوصیت ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی حفاظت کے بہانہ سے اُن پر قبضہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور جب پوچھو کہ تم نے فلاں ملک پر کیوں قبضہ کیا؟ تو کہتے ہیں ہم نے تو اُس ملک کی حفاظت کے لئے یہ کام کیا ہے۔ انہوں نے اسی حفاظت کے بہانہ سے ہندوستان لے لیا اور اسی حفاظت کے بہانہ سے افریقہ اور دوسرے ممالک پر قبضہ کرلیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ لوگ دوسروں کے محافظ بنا کر تو نہیں بھیجے گئے تھے پھر یہ کیوں ایسا کرتے ہیں کہ ہر ملک میں دخل دینا شروع کردیتے ہیں اور اس کی حفاظت کا بہانہ بنا کر اس پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس آیت

میں درحقیقت سوال اور جواب دونوں آ گئے ہیں مگر قرآن کریم کا یہ ایک نہایت ہی لطیف طریق ہے کہ وہ بعض دفعہ سوال چھوڑ دیتا ہے اور جواب دے دیتا ہے اور بعض دفعہ ایک حصہ بات کا بیان کر دیتا ہے اور دوسرا چھوڑ دیتا ہے کیونکہ وہ حصہ بیان کردہ حصہ کی وجہ سے خود ہی سمجھ میں آ جاتا ہے۔

مَآ اُرۡسِلُوۡا عَلَیۡہِمۡ حٰفِظِیۡنَ میں مضمون کا پہلا حصہ حذف ہے مَآ اُرۡسِلُوۡا عَلَیۡہِمۡ حٰفِظِیۡنَ کی آیت سارے مضمون کا ایک حصّہ ہے۔ بقیّہ حصہ محذوف ہے جو یہ ہے کہ یہ لوگ کیوں دوسروں کے ملکوں پر قبضہ کئے بیٹھے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے سپُرد یہ کام نہ کیا تھا کہ یہ دوسرے ملکوں میں گُھس کر اُن پر قبضہ کریں اور عذر یہ کریں کہ ہم تو اس کی حفاظت کے لئے آئے ہیں گویا یہ خدا تعالیٰ کے مقرّر کردہ داروغہ ہیں۔

فَالۡیَوۡمَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنَ الۡکُفَّارِ یَضۡحَکُوۡنَ ﴿۳۵﴾

پس جو ایمان لائے (وہ) اس (جزاء سزا کے) دن کفار پر ہنسیں گے۔

تفسیر۔ یَضۡحَکُوۡنَ سے مراد ہنسی کا بدلہ لینے کے فرماتا ہے اُس دن یا اگر فرض کیا جائے کہ وہ دن ذہن میں مستحضر کر کے بات کی جاتی ہے تو یُوں کہا جائے گا کہ آج کے دن مومن کفار سے اُن کی ہنسی کا بدلہ لیں گے۔ مومن کی یہ شان نہیں ہوتی کہ وہ ہنسی اُڑائے یا تمسخر اور استہزاء سے کام لے۔ قرآن کریم نے اس کو جہالت کا کام قرار دیا ہے۔ پس یہاں یَضۡحَکُوۡنَ کے معنے ہنسی کرنے کے نہیں بلکہ ہنسی کا بدلہ لینے کے ہیں۔

عَلَی الۡاَرَآئِکِ ۙ یَنۡظُرُوۡنَ ﴿ؕ۳۶﴾

چھپر کھٹوں پر بیٹھے ہوئے (ان کا سب حال) دیکھ رہے ہوں گے۔

تفسیر۔ یہاں پھر گزشتہ مضمون کو دُہرا دیا ہے کہ وہ تختوں پر بیٹھے ہوئے کس رنگ میں اُن سے بدلہ لیں گے۔ بُرے رنگ میں نہیں بلکہ اس اچھے رنگ میں کہ انہوں نے تو تختوں پر بیٹھ کر ظلم کئے تھے مگر وہ تختوں پر بیٹھ کر انصاف کریں گے۔ اور دیکھیں گے کہ کسی سے ناانصافی تو نہیں ہو رہی۔

یَنۡظُرُوۡنَ سے مراد نگرانی کرنا یَنۡظُرُوۡنَ کے معنے اس جگہ نگرانی اور تعہد کے لئے جائیں گے کہ مومن اُس دن ہر معاملہ پر نظر رکھیں گے اور دیکھیں گے کہ کسی پر ظلم نہ ہو۔

هَلۡ ثُوِّبَ الۡکُفَّارُ مَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۷﴾ ع

ع ۱ ۳۷ ۸

(اور آپس میں کہیں گے کہ) کیا کافروں کو جو کچھ وہ کیا کرتے تھے پورا بدلہ مل گیا (یا نہیں)۔

تفسیر۔ ثُوِّبَ الۡکُفَّارُ یا تو یَنۡظُرُوۡنَ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے کہ وہ دیکھیں گے کہ بدلہ کفار کو پورا پورا مل گیا ہے یا نہیں اور یا پھر اس کے یہ معنے ہیں کہ یُقَالُ لَهُمۡ هَلۡ ثُوِّبَ۔ کفار سے کہا جائے گا کہ بتاؤ تمہارے اعمال کے نتائج نکل آئے ہیں یا نہیں تم سمجھتے تھے کہ اس تطفیف اور ظلم کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا اور تمہارا غلبہ قیامت تک چلتا چلا جائے گا اور عیسائی حکومتیں جو ظلم چاہیں گی لوگوں پر ڈھاتی رہیں گی۔ اب بتاؤ تمہیں اپنے مظالم کا بدلہ مل گیا ہے یا نہیں ملا؟

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ الانشقاق۔ یہ سورۃ مکی ہے

وَهِيَ خَمْسٌ وَّ عِشْرُوْنَ اٰيَةً دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ

اوراس کی بسم اللہ کے علاوہ پچیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۱

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

سورۃ الانشقاق مکی ہے سورۃ الانشقاق مکی ہے۔ مضمون اور عبارت اور روایات سے ابتدائی زمانہ کی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا مضمون سورۃ تکویر۔ انفطار۔ اور تطفیف کے ساتھ ملتا ہے۔

سورۃ انشقاق کا تعلق پہلی سورتوں سے اس سورۃ کا تعلق پہلی سورتوں سے ظاہر ہے اپنے ساتھ کی سورۃ سے اِس کا تعلق یہ ہے کہ اُس میں فرمایا تھا هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۔ یعنی کفار جو سمجھتے تھے کہ ان کی بے اعتدالیوں کا بدلہ نہ ملے گا۔ جب ان کی شان وشوکت خاک میں مل جائے گی۔ اور مسلمان عروج حاصل کریں گے۔ تو ان کفار کو کہا جائے گا۔ لو! دیکھ لو اپنی تباہی۔ کیا تمہیں اپنی بے اعتدالیوں کا بدلہ ملا یا نہیں۔ اس وقت کفر کی طاقت ٹوٹ جائے گی۔ اور کفر کی تباہی کے ساتھ یہ لازمی ہوتا ہے۔ کہ ایمان کی ترقی ہو۔ کیونکہ روحانی اور جسمانی دنیا میں کبھی خلائے کامل نہیں ہوتا۔ جب بھی ایک چیز جاتی ہے۔ اس کی جگہ دوسری چیز لے لیتی ہے۔ اگر کفر جائے گا تو اس کی جگہ ایمان لے لے گا۔ اور اگر ایمان جائے گا تو اس کی جگہ کفر لے لے گا۔ چونکہ پچھلی سورۃ میں کفر کی تباہی کا ذکر تھا۔ اس لئے اس کے بعد آنے والی سورۃ میں ایمان کی ترقی کا ذکر فرمایا ہے۔ گویا اپنے ساتھ کی تین سورتوں سے جو اس کے ہم معنٰی اور ہم سلسلہ ہیں۔ اس کا یہ تعلق ہے کہ ان میں بنیادی مسئلہ کفر کی ترقی اور پھر اس کا انجام تھا اور اس میں بنیادی مسئلہ ایمان کے ظہور کا ہے۔ یوں ان پہلی تین سورتوں میں جس طرح آخری زمانہ کا ذکر ہے۔ اس سورۃ میں بھی آخری زمانہ کا ہی ذکر ہے۔

سورۃ انشقاق اور سورۃ انفطار کا باہمی جوڑ سورۃ تطفیف کے متعلق میں نے بتایا تھا کہ درحقیقت وہ سورۂ انفطار کے تسلسل میں ہے پس اصل مضمون جو اس سورۃ سے پہلے ہم سمجھیں گے۔ وہ سورۂ انفطار کا ہی ہوگا۔

سورۂ انفطار کو بھی آسمان کے لفظ سے شروع کیا گیا تھا۔ اور اس سورۃ کو بھی آسمان کے لفظ سے شروع کیا گیا ہے۔ اس جگہ آسمان کے ایسے پھٹنے کا ذکر کیا گیا تھا۔ جو خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکا تا ہے اور اس سورۃ میں آسمان کے ایسے پھٹنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی رحمت کو جذب کرتا ہے۔ پس یہ سورۃ اپنی پہلی تین سورتوں سے مل کر اسلام کے دوسرے غلبہ اور اس سے پہلے کی خرابیوں اور تلخیوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اَور ہر سورۃ میں ایک نیا رنگ اختیار کیا گیا ہے۔ سورۂ انشقاق میں بھی آخری زمانہ کا ذکر ہے۔ مگر اس طرح کہ اس زمانہ میں خدا تعالیٰ آسمانی علوم کو ظاہر کرے گا اور زمین ان کو قبول کرے گی۔ گویا پہلی سورۃ میں آسمان پھٹنے سے مراد مسیحیت کے غلبہ کا ذکر تھا اور اِس سورۃ میں آسمان کے پھٹنے سے مراد علومِ آسمانیہ کا ظہور یا آسمانی بارش کا نزول ہے۔ اِسی وجہ سے اَذِنَتۡ لِرَبِّهَا کے لفظ بعد میں رکھے گئے ہیں۔ جس میں بتایا ہے۔ کہ اس جگہ آسمان کا پھٹنا اللہ تعالیٰ کی مخالفت میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ ۙ﴿۲﴾

جب آسمان پھٹ جائے گا۔

حَلّ لُغَات۔ اِنۡشَقَّتۡ اِنۡشَقَّتۡ اِنۡشَقَّ سے مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور اِنۡشَقَ شَقَّ سے باب انفعال ہے اور شَقَّ الشَّیۡءَ شَقًّا کے معنے ہوتے ہیں۔ صَدَعَهٗ وَفَرَّقَهٗ اس کے اندر شگاف کر دیا۔ اور اس کو الگ الگ کر دیا۔ چنانچہ اسی سے یہ محاورہ ہے۔ کہ شَقَّ عَصَا الۡمُسۡلِمِیۡنَ اَیۡ فَرَّقَ جَمۡعَهُمۡ وَكَلِمَتَهُمۡ اس نے مسلمانوں کے عصا کو پھاڑ دیا۔ یعنی ان کی جمعیت اور اتحاد کو پراگندہ کر دیا۔ اور شَقَّ نَابُ الۡبَعِیۡرِ اَوۡ نَابُ الصَّبِیِّ وَشَقَّ الصُّبۡحُ شُقُوۡقًا کے معنی ہوتے ہیں طَلَعَ دانت نکل آئے یا صبح ظاہر ہوگئی اور شَقَّ النَّبۡتُ شُقُوۡقًا اس وقت کہتے ہیں جب پہلی روئیدگی زمین میں سے پھوٹتی ہے۔ (اقرب) اور جب صرف شَقَّ الۡعَصَا کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں فَارَقَ الۡجَمَاعَةَ وہ جماعت سے الگ ہو گیا۔ اور شَقَّقَ بھی انہی معنوں میں آتا ہے۔ کہتے ہیں شَقَّقَ الۡحَطَبَ شَقَّهٗ اُس نے لکڑی چیری۔ اور اِنۡشَقَّ الشَّیۡءُ کے معنی ہوتے ہیں۔ اِنۡفَتَحَ فِیۡهِ فُرۡجَةٌ وَانۡصَدَعَ کسی چیز میں شگاف ہو گیا۔ اور اِنۡشَقَّ الۡاَمۡرُ کے معنی ہوتے ہیں۔ اِنۡفَرَقَ وَتَبَدَّدَ اِخۡتِلَافًا تفرقہ پیدا ہو گیا۔ اور افتراق کی وجہ سے اس میں پراگندگی پیدا ہوگئی۔ اور اِنۡشَقَّ الۡفَجۡرُ کے معنی ہوتے ہیں طَلَعَ فجر ہو گئی۔ اور اِنۡشَقَّ الۡبَرۡقُ کے

معنی ہوتے ہیں اِنْعَقَّ بجلی بادلوں میں کوندتی ہوئی نکل گئی (اقرب) پس اِنْشَقَّتْ کے معنے ہوں گے کوئی چیز پھٹ گئی۔ اوراس کے پھٹنے سے دوسری چیز جو اس کے پیچھے تھی نظر آنے لگی۔

تفسیر ۔ جیسا کہ حل لغات سے ظاہر ہے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ کے معنی یہ ہیں کہ آسمان پھٹ گیا۔ یا یہ کہ آسمان ظاہر ہو گیا۔ کیونکہ انشقاق کسی چیز کے باہر نکل آنے اور بجلی کے کوندنے اور فجر کے طلوع کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ درحقیقت انشقاق کے اصل میں دو ہی نتیجے ہوتے ہیں۔ یا تو کوئی چیز پھٹ کر ناکارہ ہو جاتی ہے یا پیچھے جو چیز رُکی ہوئی ہووہ باہر آجاتی ہے۔ بعض دفعہ کسی چیز کے باہر نکلنے میں کوئی روک حائل ہوتی ہے۔ جب سوراخ ہو جائے۔ تو وہ چیز باہر آجاتی ہے۔ اِس لحاظ سے آسمان پھٹنے سے عذاب اور رحمت دونوں کا نزول مراد لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ خدا کے پاس عذاب بھی ہے اوراس کے پاس رحمت بھی ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ میں آسمان کا پھٹنا بطور رحمت کے ہے اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ میں آسمان کا ایسا پھٹنا مراد تھا۔ جس کے پیچھے عذاب تھا۔ مگر اِس سورۃ میں ایسا پھٹنا مراد ہے جس کے پیچھے خدا تعالیٰ کا کلام یا الہام ہے یہ ایسی ہی بات ہے۔ جیسے قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے۔ اَوَ لَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء:۳۱) یعنی کفار اِس امر پر کیوں غور نہیں کرتے کہ آسمان اور زمین دونوں بالکل گیند سے بنے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے آسمان کو بھی پھاڑ دیا۔ اور زمین کو بھی۔ یہاں آسمان پھٹنے سے نزولِ عذاب مراد نہیں۔ کیونکہ آگے فرماتا ہے۔ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ اور ہم نے پانی سے ہر شے کو زندہ کیا ہے کیا وہ ایمان نہیں لاتے۔ پس یہاں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کا ذکر فرما رہا ہے۔ کہ آسمان اور زمین دونوں بالکل بند تھے۔ اور اُن میں کوئی سوراخ نہ تھا۔ نہ زمین اپنی روئیدگی نکالتی تھی۔ نہ آسمان پانی برساتا تھا۔ پھر ہم نے دونوں کو پھاڑ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آسمان سے پانی اترنا شروع ہو گیا۔ اور زمین میں سے روئیدگی نکلنی شروع ہو گئی۔ یہی مضمون یہاں دوسرے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے فرماتا ہے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ عذابِ الٰہی کے نزول کی وجہ سے اور کفر، شرک اور بدعت کے پھیلنے کی وجہ سے جن کا پہلی سورتوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ آسمان نے اپنی برکتیں روک لی تھیں۔ اور وہ بالکل سمٹ گیا تھا۔ اس میں کوئی سوراخ نہ تھا۔ جس میں سے زمین والوں پر رحمتیں نازل ہوتیں صرف وہی سوراخ کھلا تھا جس میں سے غضب اور عذاب نازل ہوتے ہیں۔ پھر خدا نے اپنے بندوں پر رحم کیا۔ اور اسے اس طرح پھاڑا۔ کہ اس میں سے رحم نازل ہونا شروع ہو گیا۔ چنانچہ آگے اس کی دلیل دے دی کہ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ یہ آسمان کا پھٹنا فرمانبرداری اور اطاعت کے لئے ہے جس طرح پہلا پھٹنا نافرمانی اور گناہ کی وجہ سے تھا یعنی اب وہ رحمت

کے لئے اور کلامِ الٰہی کے نزول کے لئے پھٹا ہے۔

وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّہَا وَ حُقَّتۡ ۙ﴿۳﴾

اور اپنے رب (کی بات سننے) کے لئے کان دھرے گا اور یہی (اس پر) فرض ہے۔

حَلّ لُغَات۔ اَذِنَتۡ اَذِنَتۡ اَذِنَ سے مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور اَذِنَ بِالشَّیْءِ اِذْنًا وَاَذَنًا وَاَذَانًا وَاَذَانَۃً کے معنی ہوتے ہیں عَلِمَ بِہٖ۔ یعنی اس کا علم حاصل کیا۔ اور اَذِنَ لَہٗ فِی الشَّیءِ اِذْنًا وَاَذِیْنًا کے معنی ہوتے ہیں اَبَاحَہٗ لَہٗ اس کو اجازت دی۔ اور اَذِنَ اِلَیْہِ اَذَنًا کے معنی ہوتے ہیں اِسْتَمَعَ اس کی بات کو سنا (اقرب) مفردات میں لکھا ہے۔ وَاَذِنَ اِسْتَمَعَ نَحْوَ قَوْلِہٖ وَاَذِنَتۡ لِرَبِّہَا وَحُقَّتۡ یعنی اَذِنَ کے معنی سننے کے بھی ہوتے ہیں۔ بخاری میں حدیث آتی ہے۔ کہ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَذِنَ اللّٰہُ لِشَیْءٍ مَا اَذِنَ لِنَبِیٍّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یَّتَغَنّٰی بِالْقُرْاٰنِ (بخاری کتاب فضائل القرآن باب من لم یتغنّ بالقرآن) یعنی اللہ تعالیٰ کسی بات کو اس طرح شوق سے نہیں سنتا جیسے اپنے نبی کی بات کو جب وہ قرآن پڑھ رہا ہو۔

حُقَّتۡ حُقَّتۡ حَقَّ سے ہے۔ اور حَقَّ عَلَیْكَ وَ یَحِقُّ عَلَیْكَ وَحُقَّ لَكَ اَنْ تَفْعَلَ کَذَا کے معنی ہوتے ہیں وَجَبَ عَلَیْكَ تجھ پر یہ بات واجب ہے (اقرب) پس اَذِنَتۡ لِرَبِّہَا وَ حُقَّتۡ کے معنی یہ ہوئے کہ حُقَّ لَھَا اَنْ تَفْعَلَ کَذَا۔ یعنی وہ اپنے رب کی بات پر کان دھرے گا۔ اور وہ اسی لائق ہے کہ اپنے رب کی بات کو اچھی طرح سنے۔ اس پر غور کرے اور اس کے حکم کی اطاعت کرے۔

تفسیر۔ اِس آیت میں بتایا گیا ہے۔ کہ آخری زمانہ میں جہاں خدا تعالیٰ کے غضب نازل ہوں گے۔ اور اس کی طرف سے کئی قسم کی آفات اتریں گی۔ وہاں یہ بھی سامان کئے جائیں گے کہ آسمان سے کلامِ الٰہی نازل ہو۔ انشقاقِ آسمان درحقیقت بارش پر دلالت کرتا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ایک قوم کے لئے آسمان پھٹے گا۔ تاکہ اس پر غضب کا مینہ برسے اور ایک اور قوم پر بھی آسمان پھٹے گا۔ مگر اس لئے کہ اس پر رحمت کی بارش نازل ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے کلام اور آسمانی علوم کا ظہور ہو۔ گویا قرآن مردہ ہو چکا ہوگا۔ مگر اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ پھر علومِ قرآنیہ کو آسمان سے نازل کرے گا۔ اور اپنے کلام اور الہام کی بارش برسائے گا۔

انشقاق سماء سے مراد پیدائش آدم اس آیت کے ایک اور معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ قرآن کریم

میں دوسری جگہ آتا ہے ۔وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۔وَّ الْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا (الحاقة:۱۷،۱۸) یعنی آسمان پھٹے گا۔اور فرشتے اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے اس کے کناروں پر آکر کھڑے ہو جائیں گے۔ اِس آیت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے زیرِ تفسیر آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جس طرح آدم اوّل کی پیدائش پر فرشتوں سے کہا گیا تھا کہ اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ اسی طرح آخری زمانہ میں آسمان پھٹے گا۔اور فرشتے اطاعت کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔یعنی ایک نیا روحانی آدم پیدا کیا جائے گا اور فرشتے احکامِ الٰہی کی بجا آوری کے لئے کمربستہ و تیار ہو جائیں گے۔

پس اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۔ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ کا ایک مطلب یہ ہوا کہ ایک نیا آدم پیدا ہوگا ایک نئی رُوح دنیا میں آئے گی۔آسمان کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور فرشتے بار بار آئیں گے تا کہ اس کی مدد اور نصرت کریں۔

اَذِنَتْ لِرَبِّهَا کے ساتھ لفظ حُقَّتْ لانے کی وجہ اس جگہ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حُقَّتْ بھی فرمایا ہے کہ آسمان اپنے رب کی بات پر کان دھرے گا اور وُہ اِسی بات کا اہل تھا۔ یہ حُقَّتْ کا لفظ انقیاد کی شدّت بتانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔یوں خالی انقیاد کا اظہار بھی کافی تھا۔مگر حقّت کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسی لائق تھا اور اسی غرض کے لئے اس کو بنایا گیا تھا اور جو چیز کسی خاص غرض کے لئے بنائی جاتی ہے اس کا فعل دوسروں سے زیادہ اعلیٰ ہوتا ہے۔ایک کام چھری کا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس چاقو ہو۔تو وہ بھی چھری کا کام دے دے گا۔مگر وہ کام ایسا اچھا نہیں ہوگا جیسے چھری سے کام ہوسکتا تھا۔ یا ایک کام تلوار کا ہے۔ ہمارے پاس تلوار نہ ہو۔تو گو چھری بھی کچھ کام دے جائے گی۔مگر ایسا اچھا کام نہیں دے گی۔ جیسے تلوار دے سکتی تھی۔تو جو چیز جس غرض کے لئے بنائی گئی ہو۔اُس کا فعل دُوسری چیزوں سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔پس حُقَّتْ کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اطاعت اور فرمانبرداری میں کمال دکھائیں گے۔کیونکہ ان کو خدا نے پیدا ہی اِس لئے کیا ہے۔اور ان کے اندر اس نے یہ قابلیت رکھی ہے۔کہ وہ خدا تعالیٰ کے احکام کو پورا کریں۔

وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝۴

اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔

حَلّ لُغَات ۔مُدَّتْ مُدَّتْ مَدَّ سے ہے۔اور مَدَّ اللّٰهُ الْاَرْضَ کے معنی ہوتے ہیں بَسَطَهَا زمین کو خدا نے پھیلایا۔مَدَّ اللّٰهُ عُمُرَهٗ کے معنی ہوتے ہیں اَطَالَهٗ اللہ نے اس کی عمر کو لمبا کر دیا۔اور مَدَّ الْمَدْيُوْنَ کے معنے

ہوتے ہیں اَمْهَلَهٗ مقروض کو اس نے مہلت دے دی۔ اور مَدَّ الْقَوْمُ کے معنی ہوتے ہیں صَارَلَهُمْ مَدَدًا وَاَغَاثَهُمْ بِنَفْسِہٖ اس نے لوگوں کی مدد کی۔ اوران کی فریاد کو سنا وَفِي اللِّسَانِ مَدَدْتَ الْاَرْضَ مَدًّا اِذَازِدْتَ فِيْهَا تُرَابًا اَوْسَمَادًا مِنْ غَيْرِهَا لِيَكُوْنَ اَعْمَرَلَهَا وَاَكْثَرَ رَيْعاً لِزَرْعِهَا۔ لسان میں لکھا ہے کہ مَدَدْتَ الْاَرْضَ اُس وقت کہتے ہیں جب زمین کے اندر اچھی مٹی جو تازہ ہو۔ یا مٹی میں ملی ہوئی کھاد ڈالی جائے۔ تا کہ کھیتی خوب ہو۔ اور مَدَّ السِّرَاجَ بِالسَّلِيْطِ کے معنی ہوتے ہیں صَبَّ فِيْهِ زَيْتاً اس نے دیئے میں تیل ڈالا (اقرب) پس مُدَّتْ کے معنے ہوں گے پھیلائی جائے گی۔ (۲) اس کی کمی پُوری کی جائے گی۔ اس کو مہلت دی جائے گی۔ (۳) اس کی فریاد سنی جائے گی۔

تفسیر ۔ <u>وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ کے چار معنے</u> اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مَدَّ اللّٰهُ الْاَرْضَ کے معنی ہوتے ہیں بَسَطَهَا۔ زمین کو خدا نے پھیلا دیا۔ اِس لحاظ سے وَاِذَاالْاَرْضُ مُدَّتْ کے معنی ہوں گے جب زمین پھیلائی جائے گی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے۔ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا (الحجر: ۲۰) کہ زمین کو ہم نے پھیلا دیا ہے پس جبکہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی پھیلا رکھا ہے۔ تو اس کے بعد یہ فرمانا کہ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ پھر ایک زمانہ میں زمین پھیلائی جائے گی۔ اس کے سوائے اس کے اور کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ کہ پہلی زمین کفر اور گناہ کی وجہ سے تباہ ہو چکی ہوگی۔ تب اللہ تعالیٰ ایک نئی زمین لوگوں کے لئے پیدا فرمائے گا۔ پس وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ کے الفاظ ایک نئی زمین کی پیدائش کے معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ اور بتایا گیا ہے کہ زمین اپنی پہلی قابلیتیں کفر اور گناہوں کی کثرت کی وجہ سے کھو چکی ہوگی۔ اس لئے آسمان کو پھاڑنے کے بعد خدا تعالیٰ زمین کو بھی اِس قابل بنائے گا۔ کہ اس کے انوار کو جذب کر سکے۔

مَدَّ کے دوسرے معنی اَطَالَ اللّٰهُ عُمُرَهٗ کے ہوتے ہیں۔ کہ اللہ نے اس کی عمر کو لمبا کر دیا۔ اِسی طرح کہتے ہیں مَدَّ الْمَدْيُوْنَ: اَمْهَلَهٗ۔ اس نے اپنے مقروض کو مہلت دے دی اِس لحاظ سے آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ جب کفر اور شرک کی کثرت کی وجہ سے آسمان پھٹ جائے گا۔ اس وقت زمین بھی اپنے گناہوں کی وجہ سے اس بات کی مستحق ہوگی کہ اسے تباہ کر دیا جائے۔ لیکن اس نئے آسمانی شگاف کی وجہ سے جس سے اللہ تعالیٰ کے انوار اور اس کی برکات نازل ہوں گی زمین اس بات کی مستحق ہوگی کہ اسے مہلت دی جائے۔ اور اُس کی عمر کو لمبا کر دیا جائے۔ اگر نبی کے آنے کے ساتھ ہی قیامت آجائے۔ تو اُس کی بعثت کا کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ ضروری ہوتا ہے کہ زمین والوں کو مہلت دی جائے۔ اور انہیں موقعہ دیا جائے۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کی باتوں پر غور کریں۔ پس وَاِذَاالْاَرْضُ مُدَّتْ کے یہ

معنی ہیں۔ کہ زمین کی عمر لمبی کر دی جائے گی۔ اور اسے مہلت دی جائے گی۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کی برکات سے فائدہ اٹھا سکے۔ اسی طرح مَدَّ الْقَوْمَ کے ایک معنی ہیں صَارَ لَهُمْ مَدَدًا وَاَغَاثَهُمْ بِنَفْسِهٖ ان معنوں کے لحاظ سے وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ کا یہ مطلب ہوگا کہ جب زمین کی فریاد کو خدا پہنچے گا۔ یعنی لوگوں کے گناہوں اور شرک کی وجہ سے زمین اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کرے گی۔ کہ الٰہی میں گندی ہوگئی ہوں خراب ہوگئی ہوں۔ اور لوگوں نے اپنے گناہوں کی وجہ سے مجھے بگاڑ دیا ہے۔ پس جب آسمان پھٹے گا تو فرشتے اُتریں گے۔ اور زمین کی مدد کریں گے۔ گویا زمین کی پکار اور اس کی فریاد سنی جائے گی۔

لسان العرب میں جو معنی مَدَّ کے کئے گئے ہیں۔ اور جو حل لغات میں لکھے جا چکے ہیں۔ کہ مَدَّ کے معنی کھاد ڈالنے کے بھی ہوتے ہیں۔ ان کے اعتبار سے وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ کے یہ معنی ہوں گے کہ زمین میں کھاد ڈالی جائے گی۔ اور خدا تعالیٰ روحانی ترقیات کے ابھرنے کے نئے سامان کرے گا۔ اسی طرح حل لغات میں لکھا گیا ہے کہ مَدَّ السِّرَاجَ بِالسَّلِیْطِ کے معنی ہوتے ہیں کہ صَبَّ فِیْهِ زَیْتًا اس نے دیئے میں تیل ڈالا۔ تیل ڈالنے کے معنی حیات کے بھی لئے جا سکتے ہیں۔ اور دوبارہ قابلیتوں کے پیدا کرنے کے بھی لئے جا سکتے ہیں۔ اِس لحاظ سے وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ کا یہ مطلب ہوگا کہ زمین میں نئی قابلیتیں پیدا کر دی جائیں گی۔ غرض اِس آیت کے معنی یہ ہیں کہ زمین کو نئی عمر دی جائے گی۔ اس کی ہلاکت کو اللہ تعالیٰ کے پیچھے ڈال دے گا۔ اور اس میں نئی کھاد ڈالے گا۔ تا کہ وُہ ترقی کرے۔

وَ اَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ ۝۵

اور جو کچھ اس میں ہے اس کو نکال پھینکے گی۔ اور خالی ہو جائے گی۔

حَلّ لُغَات۔ تَخَلَّتْ تَخَلَّتْ تَخَلّٰی سے مؤنث کا صیغہ ہے اور تَخَلّٰی مِنْهُ وَعَنْهُ کے معنی ہوتے ہیں تَرَکَهٗ اس کو چھوڑ دیا۔ اور تَخَلّٰی لَهٗ کے معنی ہوتے ہیں تَفَرَّغَ لَهٗ کسی کے لئے فارغ ہو گیا (اقرب)۔ پس تَخَلَّتْ کے معنی ہوں گے وہ چھوڑ دے گی یا الگ کر دے گی۔

تفسیر۔ وَ اَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ سے مراد مامور کی جماعت اِس آیت کے معنی ایک تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس مامور کو جس کے لئے آسمان پھٹے گا۔ اور فرشتے آسمان سے اُتریں گے۔ ایسی جماعت عطا

فرمائے گا جو قربانی کرنے والی ہوگی اور قربانی بھی معمولی نہیں بلکہ اَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ اپنے مال اور اپنی جان اور اپنی عزت اور اپنے وطن اور اپنے آرام اور اپنے جذبات غرض ہر چیز کی وہ انتہائی طور پر قربانی کرنے والی ہوگی۔ اور خدا تعالیٰ کی راہ میں کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جو جماعت عطا فرمائی وہ ایسی ہی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

''اِس زمانہ میں جس میں ہماری جماعت پیدا کی گئی ہے کئی وجوہ سے اس جماعت کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشابہت ہے۔ وہ معجزات اور نشانوں کو دیکھتے ہیں جیسا کہ صحابہؓ نے دیکھا۔ وہ خدا تعالیٰ کے نشانوں اور تازہ بتازہ تائیدات سے نور اور یقین پاتے ہیں۔ جیسا کہ صحابہؓ نے پایا۔ وُہ خدا کی راہ میں لوگوں کے ٹھٹھے اور ہنسی اور لعن طعن اور طرح طرح کی دل آزاری اور بدزبانی اور قطع رحم وغیرہ کا صدمہ اٹھا رہے ہیں جیسا کہ صحابہؓ نے اٹھایا۔ وُہ خدا کے کھلے کھلے نشانوں اور آسمانی مددوں اور حکمت کی تعلیم سے پاک زندگی حاصل کرتے جاتے ہیں۔ جیسا کہ صحابہؓ نے حاصل کی۔ بہتیرے ان میں سے ہیں کہ نماز میں روتے اور سجدہ گاہوں کو آنسوؤں سے تر کرتے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم روتے تھے۔ بہتیرے ان میں سے ایسے ہیں۔ جن کو سچی خوابیں آتی ہیں۔ اور الہام الٰہی سے مشرف ہوتے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہوتے تھے۔ بہتیرے ان میں سے ایسے ہیں۔ کہ اپنے محنت سے کمائے ہوئے مالوں کو محض خدا تعالیٰ کی مرضات کے لئے ہمارے سلسلہ میں خرچ کرتے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم خرچ کرتے تھے۔ ان میں ایسے لوگ کئی پاؤ گے کہ جو موت کو یاد رکھتے اور دلوں کے نرم اور سچی تقویٰ پر قدم مار رہے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت تھی۔ وہ خدا کا گروہ ہے جن کو خدا آپ سنبھال رہا ہے۔ اور دن بدن ان کے دلوں کو پاک کر رہا ہے۔ اور ان کے سینوں کو ایمانی حکمتوں سے بھر رہا ہے۔ اور آسمانی نشانوں سے ان کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ جیسا کہ صحابہؓ کو کھینچتا تھا غرض اِس جماعت میں وہ ساری علامتیں پائی جاتی ہیں جو اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ کے لفظ سے مفہوم ہو رہی ہیں۔ اور ضرور تھا کہ خدا تعالیٰ کا فرمودہ ایک دن پُورا ہوتا۔''

(ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۳۰۶، ۳۰۷)

اِسی طرح فرماتے ہیں۔

''مَیں دیکھتا ہوں کہ میری جماعت نے جس قدر نیکی اور صلاحیت میں ترقی کی ہے۔ یہ بھی ایک

معجزہ ہے۔ ہزارہا آدمی دل سے فدا ہیں۔ اگر آج ان کو کہا جائے کہ اپنے تمام اموال سے دست بردار ہوجاؤ۔ تو وہ دستبردار ہوجانے کے لئے مستعد ہیں۔ پھر بھی مَیں ہمیشہ ان کو اور ترقیات کے لئے ترغیب دیتا ہوں۔ اور ان کی نیکیاں ان کو نہیں سناتا۔ مگر دل میں خوش ہوں۔

(الذکر الحکیم نمبر ۴ صفحہ ۱۶، ۱۷۔ ۲۴ رمئی ۱۸۹۶)

اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ کے پانچ معانی غرض اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس زمانہ کے مامور کو ایسی جماعت عطا فرمائے گا۔ جو خدا اور اس کے رسول کے لئے ان تمام چیزوں کو پھینک دے گی جو اس کے پاس ہوں گی اور خالی ہوجائے گی۔

اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ لوگ اپنی اندرونی قابلیتوں سے پورا پورا کام لیں گے اسی طرح اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ سے یہ بھی مراد ہے کہ نفوس پاکیزہ اس دن کلامِ الٰہی کو سننے کے لئے تیار ہوجائیں گے۔ اور آسمانی بارش اس پر نازل ہوگی۔ اور دلوں کو اس طرح تیار کردیا جائے گا جس طرح زمین کو کھاد ڈال کر ہل چلا کر اور سہاگہ دے کر درست کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مُدَّتْ میں یہ سب امور شامل ہیں۔

اِسی طرح ان الفاظ میں اس امر کی طرف بھی اشارہ تھا کہ تمام روحانی اور جسمانی علوم کو زمین باہر نکال دے گی۔ اور کوئی چیز مخفی نہیں رہے گی۔ گویا اس زمانہ میں روحانی اور جسمانی علوم کا ایسا اجتماع ہوگا جس کی مثال پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملے گی۔ پس اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ کے معنی یہ ہوئے کہ زمین اس زمانہ میں اپنے سارے خزانے اگل دے گی۔ یعنی وُہ وقت علوم کی ترقی کا ہوگا۔ اور علومِ آسمانی اور علومِ زمینی دونوں کا اس زمانہ میں مکمل ظہور ہوگا۔ ظاہری لحاظ سے اس کے یہ معنی ہوں گے۔ کہ زمین میں ایسے تغیرات ہوں گے۔ کہ جو کچھ اس میں ہوگا۔ وُہ اسے باہر پھینکنا شروع کردے گی۔ چنانچہ پٹرول۔ مٹی کا تیل ہزاروں قسم کی دوائیں ویزیلین۔ گلیسرین۔ ریڈیم اور کئی قسم کی دھاتیں اور دوسری قابل استعمال اشیاء زمین میں سے ہی نکلی ہیں۔ گویا اِس آیت میں بتایا گیا ہے۔ کہ وہ زمانہ ایسا ہو گا۔ کہ اِدھر آسمان سب کچھ پھینک دے گا۔ اور اُدھر زمین جو کچھ اس میں ہوگا نکال کر باہر پھینک دے گی۔ یہی مضمون دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (الزلزال: ۲، ۳) یعنی ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب زمین کو خوب جھنجوڑا جائے گا اور وُہ اپنے تمام بوجھوں کو نکال کر خالی ہوجائے گی۔

اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ زمین اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرے گی یعنی جو کچھ گند اس

میں مخفی ہوگا وہ سب پھینک دے گی۔ نیکیوں میں ترقی کرے گی۔ گناہوں سے بیزار ہو جائے گی۔ اور آسمانی مدد اور نصرت کی وجہ سے اس کی ایسی اصلاح ہو جائے گی کہ زمین میں جس قدر نقائص پائے جاتے ہیں سب پھینک کر وہ خالی ہو جائے گی۔

وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ﴿۶﴾

اور اپنے رب (کی بات سننے) کے لئے کان دھرے گی۔ اور یہی (اس پر) فرض ہے۔

تفسیر ۔ یہ کفر والی زمین کا ذکر نہیں بلکہ ایمان والی زمین کا ذکر ہے کہ وہ اپنے رب کے لئے کان رکھے گی خالی استماع اور چیز ہے اور اس میں اتنی توجہ نہیں پائی جاتی جتنی توجہ اس شخص کے اندر ہوتی ہے جو کان لگا کر بیٹھا ہوا ہو کہ کوئی بات رہ نہ جائے۔ پس فرماتا ہے وہ زمین اپنے رب کی باتیں سننے کے لئے کان لگائے بیٹھی رہے گی وَحُقَّتْ اور یہ زمین ہے ہی اس قابل یعنی ہم زمین میں بھی ایسی قابلیت پیدا کر دیں گے کہ خدا تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور اطاعت کا مادہ اس میں پیدا ہو جائے گا۔

یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴿۷﴾

اے انسان تو اپنے رب کی طرف پورا زور لگا کر جانے والا ہے۔ (اور) پھر اس سے ملنے والا ہے۔

حَلِّ لُغَات۔ كَادِحٌ كَادِحٌ كَدَحَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور كَدَحَ کے معنی ہوتے ہیں پوری محنت کرنا۔ ایسی محنت کرنا جس کا جسم پر اثر پڑ جائے۔ کہتے ہیں كَدَحَ (يَكْدَحُ كَدْحًا) اَیْ سَعٰى وَعَمِلَ لِنَفْسِهٖ خَيْرًا اَوْ شَرًّا وَ كَدَّ۔ اس نے کام کرنے کی کوشش کی۔ چاہے وہ کوشش اچھی تھی یا بُری۔ اور خوب محنت سے کام لیا وَقِيْلَ اَلْكَدْحُ جُهْدُ النَّفْسِ فِی الْعَمَلِ وَالْكَدُّ فِيْهِ حَتّٰى يُؤَثِّرَ فِيْهَا۔ بعض لغوی کہتے ہیں کہ کدح اس کام کو کہتے ہیں۔ جو اتنی محنت سے کیا جائے کہ انسان کی صحت برباد ہو جائے۔ اس کی ہڈیاں گھل جائیں اور اس کے جسم کے اندر تک اثر پہونچ جائے۔ (اقرب) پس كَادِحٌ کے معنی ہوں گے۔ پوری محنت و مشقت کرنے والا۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے اے انسان تو پوری جدوجہد کرے گا۔ پوری محنت کرے گا اپنے رب کی طرف جانے کی فَمُلٰقِيْهِ اور آخر تو اس سے جا کر مل ہی جائے گا۔

خدا کو پانے کے لئے انتہائی محنت کی ضرورت یہاں یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ میں یا تو عام قاعدہ بیان کیا گیا ہے۔ اور یا اس سے مراد صرف وقت کا امام ہے یعنی یا تو اس سے یہ مراد ہے۔ کہ اے انسان تیرے لئے اپنے رب سے ملنے کا رستہ کھلا ہے۔ شرط یہ ہے کہ تیری طرف سے کدح ہونا چاہیے۔ اِن معنوں کے لحاظ سے ہر انسان اِس میں شامل ہے۔ اور یا پھر ہر انسان براہ راست اس میں شامل نہیں۔ بلکہ کامل انسان کے تابع ہو کر شامل ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ اے کامل انسان تُو اپنے رب کو پانے کے لئے بڑی قربانیاں کرے گا۔ اور آخر ایک دن اس کو پا ہی لے گا۔ اور جب کوئی کامل انسان اس کو پالیتا ہے۔ تو پھر سب کو حکم ہو جاتا ہے کہ تم بھی اِسی راستہ پر چلو۔ اور خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر لو۔

اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے رستے کا ملنا معمولی بات نہیں ہوتی۔ اِس غرض کے لئے انسان کو اتنی محنت کرنی پڑتی ہے کہ اس کی ہڈیوں تک اثر پہونچ جاتا ہے۔ یہی وُہ نکتہ ہے جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ لقاء الٰہی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب انہیں ایمان نصیب ہو گیا۔ تو کچھ دیر بیٹھ کر ایمان کی باتوں کا مزہ لے لینے اور نماز روزہ وغیرہ ادا کر لینے سے ہی ان کی روحانیت کامل ہو جائے گی۔ حالانکہ روحانیت کامل ہوتی ہے اس غم کی وجہ سے جو عشق سے پیدا ہوتا ہے جس کے اثر سے انسان کی ہڈیاں تک گھل جاتی ہیں۔ جب تک انسان کے دل میں خدا تعالیٰ کے متعلق یہ رغبت پیدا نہ ہو۔ یہ غم پیدا نہ ہو۔ یہ عشق اور محبت پیدا نہ ہو۔ اس وقت تک مُلٰقِیْهِ کا مقام اسے میسر نہیں آ سکتا۔ باقی نماز پڑھ لینا یا روزے رکھ کر یہ سمجھ لینا کہ میں نے بڑی مشقت برداشت کر لی ہے۔ ایسی باتیں نہیں ہیں۔ جو کدح میں شامل ہوں۔ اِس سے بہت زیادہ مشقت طلب کام لوگ کرتے ہیں۔ چوڑھوں کو دیکھ لو وہ کتنی محنت کرتے ہیں۔ دھوبیوں کو دیکھ لو وہ کس قدر مشقت کا کام کرتے ہیں۔ سقوں کو دیکھ لو۔ وہ کس قدر تکلیف برداشت کرتے ہیں مگر یہ نہیں ہوتا کہ اس کام سے ان کی ہڈیاں گھلنی شروع ہو جائیں۔ کام کا جتنا اثر ہوتا ہے صرف جسم پر ہوتا ہے جو کچھ دیر کے بعد زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ کَادِحٌ کا لفظ استعمال فرماتا ہے اور کدح اس بات کو کہتے ہیں کہ انسان ایسا عمل کرے کہ یوں معلوم ہو اس کی صحت بگڑ جائے گی۔ اس کی ہڈیاں گھل جائیں گی۔ اور اس کا جسم تباہ ہو جائے گا۔ جب انسان اس رنگ میں کام کرتا ہے۔ تب اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے اس کے بغیر اس کا اپنی کامیابی کے متعلق امید رکھنا غلطی ہوتی ہے۔ میں نے اپنی جماعت میں خدام الاحمدیہ اور انصار اللہ کو اِسی غرض کے لئے قائم کیا ہے کہ وہ محنت کریں اور مشقت طلب کاموں کی اپنے اندر عادت پیدا کریں جب تک انسان اپنے اوقات کو ضائع ہونے سے نہیں بچاتا اسے خدا نہیں مل سکتا۔ خدام الاحمدیہ اور انصار اللہ کے

قیام کا اصل مقصد یہ ہے کہ جماعت میں مشقت طلب کاموں کی عادت پیدا ہو۔اور ہر فرد کسی نہ کسی کام میں مشغول رہے۔پس یٰۤاَیُّھَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡہِ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک ہر انسان اپنے آپ کو کام کرتے کرتے فنا نہیں کر دیتا۔اس وقت تک قومی طور پر خدا نظر نہیں آ سکتا۔انفرادی طور پر بے شک کدح کے بعد انسان کو لقاء الٰہی حاصل ہو جاتا ہے۔مگر قومی طور پر اسی وقت لقاء الٰہی کی نعمت حاصل ہوتی ہے جب قوم کا ہر فرد اپنے آپ کو فنا کر دیتا ہے۔

دنیا میں لقاء الٰہی دو طرح حاصل ہوتا ہے۔ایک فردی طور پر اور ایک قومی طور پر۔اگر قوم تباہ بھی ہو چکی ہو تب بھی فردی طور پر انسان خدا تعالیٰ کا قُرب حاصل کر سکتا ہے۔جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے قبل باوجود اس کے کہ مسلمان قومی طور پر تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ان میں بعض بزرگ پائے جاتے تھے۔مثلاً حضرت عبداللہ غزنوی کے متعلق خود حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لکھا ہے کہ وہ بزرگ انسان تھے (حقیقۃ الوحی روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۲۵۰)۔اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے حضرت مجدد صاحب بریلوی یا حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب شہید اور اسی طرح بعض اور بزرگ گزرے ہیں۔مگر یہ چالیس کروڑ مسلمانوں میں سے چند نفوس تھے۔جو خدا تعالیٰ سے ملے اِن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے یہ دکھانے کے لئے بھیجا تھا کہ اسلام اب بھی اپنے اندر طاقت رکھتا ہے اور اب بھی وہ لوگوں کو زندہ کر سکتا ہے۔اب بھی وہ انہیں خدا تعالیٰ کے دربار تک پہنچا سکتا ہے۔مگر قومی طور پر ان کے وجود سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔پس حضرت سید احمد صاحب بریلوی کیا تھے۔وہ درحقیقت حُجّت تھے سستوں پر۔وہ حجّت تھے غافلوں پر اور وہ یہ بتانے کے لئے بھیجے گئے تھے کہ اسلام اب بھی اپنے اندر زندگی بخش اثرات رکھتا ہے۔اسی طرح حضرت سید اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کیا تھے وہ حجّت تھے سستوں پر۔وہ حجّت تھے غافلوں پر۔اور وہ یہ بتانے کے لئے بھیجے گئے تھے کہ اسلام اب بھی اپنے اندر زندگی بخش اثرات رکھتا ہے۔مگر بحیثیت قوم اسلام کو ان کے وجود سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔کیونکہ اسلام نام تھا چالیس کروڑ افراد کا جن میں سے کوئی چین میں رہتے تھے کوئی جاپان میں رہتے تھے۔کوئی سماٹرا اور جاوا میں رہتے تھے۔اور کوئی دوسرے ممالک میں رہتے تھے اور یہ وہ ممالک ہیں جہاں ان لوگوں کی کوئی آواز نہیں پہنچی۔یوں ہماری جماعت بھی ابھی چھوٹی سی ہے۔مگر ہماری جماعت وُہ ہے جو خدا تعالیٰ کے فضل سے مختلف ممالک میں پھیل رہی ہے پس وہ لوگ صرف غافلوں پر حجت تھے۔اور اس بات کی دلیل تھے کہ خدا اب بھی لوگوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ورنہ ان کے زمانہ میں قومی طور پر مسلمانوں نے خدا تعالیٰ کے چہرہ کو نہیں دیکھا۔

پس یٰۤاَیُّھَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡهِ اے جماعتِ مومنین کے ہر فرد تم میں سے ہر شخص کو اس راستہ میں اپنے آپ کو فنا کر دینا پڑے گا۔ تب تمہیں قومی طور پر خدا تعالیٰ کا چہرہ نظر آئے گا۔ اور اس کے لقاء کی نعمت تمہیں میسّر آئے گی۔ اور یہی نعمت حقیقی نعمت ہوتی ہے۔ ورنہ انفرادی طور پر تو ہر زمانہ میں لوگ خدا تعالیٰ کو پاتے رہتے ہیں۔ لیکن انفرادی طور پر خدا تعالیٰ کو پا لینے سے قوم کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ قومی طور پر اسی وقت خدا تعالیٰ کا جلال ظاہر ہوتا ہے اور قوم کا ہر فرد خدا تعالیٰ کا چہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ جب ہر فرد اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے قرب کے راستوں میں فنا کر دیتا ہے۔ اور اس وقت تک پیچھے نہیں ہٹتا۔ جب تک اس نعمتِ عظیمہ کو حاصل نہیں کر لیتا۔

مُلٰقِیۡهِ میں ضمیر جزاء کی طرف بھی جاسکتی ہے مُلٰقِیۡهِ کی ضمیر جزا کی طرف بھی جا سکتی ہے۔ مگر جو معنی اس وقت مَیں کر رہا ہوں۔ اس لحاظ سے خدا کا ملنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ گو جزا کی طرف بھی اس کی ضمیر جا سکتی ہے۔

فَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیۡنِهٖ ۙ﴿۸﴾ فَسَوۡفَ یُحَاسَبُ

پس جس کے داہنے ہاتھ میں اس کا اعمال نامہ دیا جائے گا۔ اس سے تو جلد ہی آسان حساب لے لیا جائے گا۔

حِسَابًا یَّسِیۡرًا ۙ﴿۹﴾ وَّ یَنۡقَلِبُ اِلٰۤی اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا ﴿ؕ۱۰﴾

اور وُہ اپنے اہل کی طرف خوش (بخوش) لوٹے گا۔

تفسیر۔ دائیں ہاتھ میں کتاب دیئے جانے سے مراد کام کرنے کے لئے ہمیشہ دایاں ہاتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ پچھلی آیت میں کدح کا لفظ استعمال فرمایا تھا۔ اس لئے یہاں یہ بتایا کہ ساری ترقی دائیں ہاتھ کے چلانے میں ہے۔ اگر تم دایاں ہاتھ چلاتے جاؤ گے تو جیت جاؤ گے۔ ان دو آیات میں ساری تحریک جدید کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ کہ محنت و مشقت برداشت کرنا اور ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہونا انسان کو اپنی زندگی میں کامیاب بنا دیتا ہے۔ فَسَوۡفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیۡرًا کے یہی معنی ہیں کہ اس شخص کا حساب آسان لیا جائے گا۔ یعنی مشکلات اور تکالیف کے آنے پر وہ کوئی گھبراہٹ محسوس نہیں کرے گا۔ کیونکہ مشقت برداشت کرتے کرتے وہ ان چیزوں کا عادی ہو چکا ہوگا اور اسے مشکلات بھی آسان معلوم ہوں گی۔ جو شخص نکمّا سست اور عیاش ہو وہ ذرا سی

مصیبت پر بھی گھبرا جاتا ہے لیکن جو شخص محنتی ہو اور مشقت برداشت کرنے کا عادی ہو۔ اس پر خواہ مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وُہ اس کو آسانی سے برداشت کر لیتا ہے۔ اس آیت کے یہ معنی بھی ہیں کہ خدا ایسے مومن سے آسان معاملہ کرے گا۔ مگر اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ وُہ خواہ کس مصیبت میں ڈالا جائے۔ وہ اسے آسان معلوم ہو گی۔ جن لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے اپنا وطن چھوڑا۔ اپنی عزت چھوڑی اپنا مال چھوڑا۔ اپنے بیوی بچے چھوڑے۔ ان کو بعد میں کون سی ایسی مصیبتیں پیش آئی تھیں۔ جنہوں نے ان کو دکھ میں ڈال دیا ہو۔ بعد میں جو بھی مصیبت آئی۔ وُہ انہیں بالکل آسان معلوم ہوئی۔ اور اسے انہوں نے ہنسی خوشی برداشت کر لیا۔ غالبؔ شرابی تھا۔ لیکن اس کی زبان پر حکمت کی بہت سی باتیں جاری ہوئیں ہیں معلوم ہوتا ہے اس کے دل میں ضرور نیکی تھی۔ وہ ایک مقام پر کہتا ہے ؏

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آسان ہو گئیں

(دیوان غالب صفحہ ۱۱۰)

جب انسان اپنے آپ کو تنعّم اور عیش کا عادی بنا لے تو جو حساب بھی آتا ہے۔ اسے سخت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر شدائد برداشت کرنے کا انسان عادی بن جائے تو پھر اسے حساب آسان نظر آتا ہے۔

دو قسم کے ابتلاء حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ دو قسم کے ابتلاء ہوتے ہیں۔ ایک ابتلاء وہ ہوتا ہے۔ جس میں بندے کو اختیار ہوتا ہے۔ کہ وہ اس کے متعلق اگر کوئی آرام اور سہولت کا پہلو تلاش کر سکتا ہو تو کر لے لیکن ایک ابتلاء وہ ہوتا ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے اور جس میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے۔ جیسے نماز کے لئے وضو کرنا پڑتا ہے۔ نماز کے لئے وضو کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اگر سردی کا موسم ہو۔ تو انسان کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اگر چاہے تو پانی کو گرم کر لے۔ یہ وہ ابتلاء ہے جس کے جاری کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے انسان کے اختیار میں دیا ہے۔ لیکن دوسری قسم کا ابتلاء جسے اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ اس کے صدمہ کو آسان کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ جیسے کہ کسی عزیز کی موت۔ ایسے صدمے تبھی برداشت ہو سکتے ہیں کہ انسان اپنے آپ کو تلخ زندگی کا عادی بنائے اور عیش و آرام کی زندگی کو چھوڑ دے۔ اور جب انسان ایسا کر لے تو اسے ہر چیز آسان معلوم ہوتی ہے۔ (ملفوظات جلد ۳ صفحہ ۶۳۸)

وَ يَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا۔ اور وہ اپنے اہل کی طرف خوش خوش واپس آئے گا۔ یہ آیت بھی صاف طور پر بتا رہی ہے کہ اس میں دنیا کے حساب کا ہی ذکر ہو رہا ہے۔ کیونکہ اگلے جہان میں جب حساب ہوگا۔ اس وقت تو کسی کو

اپنے اہل کا پتہ ہی نہیں ہوگا۔ کہ وہ کہاں ہے۔ پھر ضروری نہیں کہ اس کے اہل میں جتنے افراد ہوں وہ سارے جنتی ہوں۔ ہوسکتا ہے ان میں سے بعض دوزخی ہوں۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ حساب کے بعد وہ اسی وقت اپنے اہل کی طرف جائے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ مومن مرد کے اہل وعیال کو بھی اس کے ساتھ ہی رکھے گا۔ مگر یہ بعد میں ہوگا۔ یہ نہیں کہ ادھر حساب ہورہا ہو۔ اور ادھر اس کا اہل جنت میں اس کے ساتھ جانے کے لئے وہاں آن موجود ہو۔ وہاں تو ایسی کیفیت ہوگی۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر تم نے مجھے وہاں تلاش کرنا ہو۔ تو اس اس نشان کے ذریعہ سے کرنا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تلاش کے لئے علامتوں کی ضرورت ہوگی۔ تو ایک عام مومن کو اپنا اہل کس طرح فوراً مل سکے گا۔ پس یَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا کے الفاظ بتارہے ہیں کہ یہ اس دنیا کا واقعہ ہے یعنی دین کے لئے محنت کرنے والا محنت کرے گا۔ اور پھر اچھے نتائج حاصل کر کے اپنے اہل کے پاس خوش وخرم واپس آئے گا۔

وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴿۱۱﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا

اور جس کو اس کی پیٹھ کے پیچھے سے اس کا اعمال نامہ دیا جائے گا وہ جلد ہی (اپنے مونہہ سے اپنی) ہلاکت کو

ثُبُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَّ يَصْلٰى سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾

بلائے گا۔ اور بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔

حَلِّ لُغَات۔ اَلثُّبُوْرُ الثُّبُوْرُ اَلْهَلَاكُ وَالْفَسَادُ یعنی ثبور کے معنے ہلاکت اور فساد کے ہیں۔ (مفردات)

تفسیر۔ پیٹھ کے پیچھے سے کتاب دیئے جانے سے مراد وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے کام ہمیشہ پیچھے ڈالتا رہتا ہے کہتا ہے آج نہیں کل کروں گا۔ کل آتا ہے تو کہتا ہے پرسوں کروں گا۔ غرض وہ جو اپنی پیٹھ کے پیچھے کام کو پھینکتا چلا جائے گا۔ اسے پیٹھ کے پیچھے سے کتاب دی جائے گی۔۔ جس نے دائیں ہاتھ کو کام میں لگائے رکھا تھا۔ اس کے تو دائیں ہاتھ میں کتاب دی جائے گی۔ لیکن جو روز بروز اپنے کام کو پیچھے ڈالتا چلا جائے گا۔ اسے پیٹھ کے پیچھے سے کتاب دی جائے گی۔

فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا جس شخص کی پیٹھ کے پیچھے سے کتاب آئے گی۔ صاف بات ہے کہ اس کے لئے کوئی

خوشی کی بات نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ خوشی کی بات ظاہر کی جاتی ہے۔اور رنج والی چیز چھپائی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے لئے بھی یہ بات رنج کا موجب ہوگی۔ اِس لئے اسے پیٹھ کے پیچھے سے کتاب دی جائے گی۔ جسے دیکھ کر وہ جلدی ہی اپنے لئے ہلاکت طلب کرے گا۔ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا کے معنی ہیں يَدْعُوْا ثُبُوْرًا لِنَفْسِهٖ یعنی وہ اپنے نفس کے لئے ہلاکت طلب کرے گا۔

یہ بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ خدائی گرفت اتنی سخت ہوگی۔ کہ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا والا نظارہ نظر آجائے گا۔اور وہ کہے گا کاش میں مر جاؤں اور اس انجام کو نہ دیکھوں۔

یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ہلاکت خدا نہیں بھیجتا بلکہ بندہ اپنے اعمال کی وجہ سے اس کا خود مورد بنتا ہے۔ پس عذاب دینے والا خدا نہیں بلکہ بندہ اپنے اعمال سے اس عذاب کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ وَيَصْلٰى سَعِيْرًا اور وہ ایک بھڑکنے والی آگ میں داخل ہوگا۔ دنیا کے لحاظ سے اس کے یہ معنی ہوں گے۔ کہ وُہ جلن اور فکر اور غم میں مبتلا کیا جائے گا اور آخرت کے لحاظ سے معنی ظاہر ہی ہیں۔

اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۱۴﴾

وہ اپنے اہل وعیال میں خوب خوش رہا کرتا تھا۔

تفسیر۔فرماتا ہے یہ وُہ شخص ہے جو اپنے اہل میں بہت مسرور ہوا کرتا تھا۔پہلی آیات میں آیا تھا کہ يَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا یعنی محنت اور کوشش اور کدح کی وجہ سے چونکہ مومن کو اپنے گھر میں آرام اور چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے جب اسے بدلہ ملے گا۔تو يَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا وہ اپنے اہل کی طرف خوش خوش جائے گا۔ کہ میں کامیاب و بامراد واپس آ گیا۔لیکن کافر چونکہ اپنے گھر میں عیش وآرام سے بیٹھا رہتا تھا۔ خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اس لئے جب نتیجہ نکلے گا۔تو وہ سخت غمگین ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومن اپنے کام کو غم سے شروع کرتا اور خوشی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے اور کافر خوشی سے شروع کرتا اور غم پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۚ﴿۱۵﴾

(اور) یقین رکھتا تھا کہ فراخی کے بعد کبھی اسے تنگی نہ آئے گی۔

حَلِّ لُغَات۔ حَارَ حَارَ یَحُوْرُ (حَوْرًا وَحُؤُوْرًا) کے معنی ہوتے ہیں رَجَعَ واپس لوٹا۔ حَارَتِ الْغُصَّةُ حَوْرًا کے معنی ہوتے ہیں اِنْحَدَرَتْ كَاَنَّهَا رَجَعَتْ مِنْ مَوْضِعِهَا گلے میں پھنسنے والی چیز نیچے اتر گئی۔ گویا اپنی جگہ سے ہٹ گئی اور حَارَ فَلَانٌ حَوْرًا کے معنی ہوتے ہیں۔ تَحَيَّرَ وہ متحیر ہو گیا۔ اور عربی میں محاورہ ہے کہتے ہیں حَارَ بَعْدَمَا كَارَ اسی طرح ایک روایت میں ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ اَیْ مِنَ النُّقْصَانِ بَعْدَ الزِّيَادَةِ یعنی خوشی کے بعد غم۔ فائدہ کے بعد نقصان اور سکھ کے بعد دکھ سے ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں (اقرب) گویا حَوْرٌ کے معنی ہیں حالت کا بدلنا۔ پس اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ کے یہ معنے ہوئے کہ وہ یہ خیال کرتا تھا وہ ہماری طرف لوٹ کر نہیں آئے گا۔ یا اس کی اچھی حالت بُری حالت کی طرف نہیں لوٹے گی۔ یا یہ کہ وہ کبھی بھی ایسی مشکلات سے دو چار نہیں ہوگا۔ کہ وہ متحیر ہو کر رہ جائے۔ یا یہ کہ اسے نقصان کبھی نہیں پہنچے گا۔

تفسیر۔ اکثر تباہیاں دنیا میں اس خیال کے ماتحت آتی ہیں۔ کہ بہت لوگ جب ان کو کوئی کامیابی یا ترقی یا بلندی حاصل ہوتی ہے۔ تو سمجھ لیتے ہیں۔ کہ اب اس کے بعد تنزل کی حالت کبھی نہیں آئے گی۔ جس کی وجہ سے وہ تنزّل سے بچنے کے لئے تیاری نہیں کرتے۔ قومیں ترقی کر جاتی ہیں۔ تو وُہ آئیندہ کے لئے تنزل کے رستے مسدود کرنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تنزل کا وقت آتا ہے۔ تو پھر انہیں واپس لوٹنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ الٰہی قانون یہی ہے کہ جس جہت پر گاڑی چل رہی ہو سٹیم کے ختم ہونے کے بعد بھی کچھ دیر گاڑی اسی طرف چلتی رہتی ہے اور یہی چیز قوموں کے دھوکے کا موجب ہو جاتی ہے۔ اگر قومی سٹیم کے ختم ہوتے ہی یکدم ترقی کی گاڑی رک جائے۔ تو علاج کی طرف توجہ پیدا ہو جائے لیکن سٹیم بند ہو جاتی ہے اور گاڑی چلتی رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت قومی بربادی کا احساس ہوتا ہے۔ جب اس کا علاج ناممکن ہو جاتا ہے۔

بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿۱۶﴾ؕ

مگر ایسا تو (ضرور) ہونا تھا۔ کیونکہ اس کا رب اسے یقیناً دیکھ رہا تھا۔

تفسیر۔ فرماتا ہے ایسے انسان کا یہ خیال درست نہیں حقیقت تو اس کے خلاف ہے۔ یقیناً اس کا رب اس کو

اچھی طرح سے دیکھ رہا تھا۔ یعنی ہر عمل انسان کا اور ہر عمل قوم کا خدا کی نگاہ کے نیچے ہوتا ہے۔ جب وہ عمل اسے بھولا ہوا ہوتا ہے۔ خدا کو وہ یاد ہوتا ہے۔ اس لئے خواہ قومی اعمال پر کتنا ہی پردہ پڑا ہوا ہو۔ نتیجہ حقیقت کے مطابق نکلتا ہے۔ کبھی خلاف نہیں نکلتا۔ فرماتا ہے ان لوگوں کے لئے بھی ایک دن تنزل کے سامان پیدا ہو جائیں گے۔ یہاں وُہ لوگ مراد ہیں۔ جو اس زمانہ کے ظہور کے مقابل پر کھڑے ہوں گے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ بظاہر اس آسمانی اور زمینی تبدیلی کے وقت کفر طاقتور ہوگا۔ اور دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ کفر مغلوب نہیں ہوسکتا۔ مگر اندرونی طور پر اس میں ایسی تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہوں گی۔ کہ وُہ آسمانی نظام کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکے گا۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۷﴾

پس یوں نہیں (جو یہ سمجھتے ہیں بلکہ) میں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں سورج کے غروب ہونے کے بعد کی سرخی کو

وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۸﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۹﴾

اور رات کو بھی اور اسے بھی جسے وہ سمیٹ لیتی ہے۔ اور چاند کو (بھی) جب وُہ تیرھویں کا ہو جائے۔

حَلِّ لُغَات ۔ **لَآ اُقْسِمُ میں لفظ لا کے متعلق بحث** یہاں جو لا آیا ہے اس کے متعلق نحویوں میں اختلاف ہے۔ ابوعبیدہ اور ایک جماعت مفسرین کی کہتی ہے۔ کہ یہ لا زائدہ ہے۔ اور مراد یہی ہے کہ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ یعنی میں شفق کو بطور شہادت پیش کرتا ہوں لا کے استعمال کے متعلق ادیبوں میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ ایسے موقعہ پر زائد استعمال ہوتا ہے۔ اور زِيَادَتُهَا جَارِيَةٌ فِيْ كَلَامِ الْعَرَبِ۔ اس کی یہ زیادت کلام عرب میں عام رائج ہے۔ چنانچہ وہ مثال کے طور پر قرآن کریم کی ان دو آیات کو پیش کرتے ہیں۔ (۱) مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ (اعراف: ۱۳) تجھے کس نے منع کیا کہ سجدہ نہ کرے حالانکہ یہاں مراد یہ ہے کہ تو سجدہ کرے (۲) اسی طرح آتا ہے لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ (الحدید: ۳۰) تا کہ اہل کتاب کو معلوم نہ ہو حالانکہ مراد یہ ہے کہ اہل کتاب کو معلوم ہو ساتھ ہی یہ لوگ کہتے ہیں۔ اِنَّمَا تَزَّادُ فِيْ وَسْطِ الْكَلَامِ لَا فِيْ اَوَّلِهٖ یعنی لا درمیان کلام میں زائد آتا ہے۔ ابتدا کلام میں زائد نہیں آتا۔ مگر بعض مفسرین اس کے بارہ میں یہ کہتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کے کلام پر یہ قاعدہ لگتا ہے۔ قرآن کریم پر نہیں لگتا۔ کیونکہ سب قرآن ایک ہی سورۃ کے حکم میں ہے۔ اِس لئے جہاں بھی لا آئے گا وسط کلام ہی سمجھا جائے گا۔ اس پر معترضین نے یہ کہا ہے کہ مضمون کے لحاظ سے بیشک سارا قرآن کریم ایک ہی حکم میں ہے مگر عبارت

ظاہری کے لحاظ سے اس کی آیات الگ الگ ہیں۔ پس عبارت ظاہری کے لحاظ سے ایک سورۃ کو دوسری سورۃ کا حصہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر اس اعتراض کو درست تسلیم کر لیا جائے۔ تو لا کے اس استعمال پر جو سورتوں کے شروع میں ہوا ہے اعتراض پڑے گا۔ مگر ان قسموں پر اعتراض نہیں پڑ سکتا۔ جو درمیان میں آجاتی ہیں۔ جیسے یہاں ہے۔ (تفسیر فتح البیان زیر آیت لا اقسم بیوم القیامۃ)

اِس جگہ یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ اس خلش کی بنیاد ایک ذہنی وسوسہ پر ہے۔ اور وہ یہ کہ لا کو نافیہ سمجھا گیا ہے۔ لا نافیہ کی صورت میں ہمیں بے شک اس بات کی احتیاج ہے۔ کہ اس سے پہلے کوئی مضمون نکالیں جس کی نفی لا کرتا ہو۔ لیکن زائدہ کی صورت میں یہ سوال کہ ابتداء میں آیا ہے۔ عقلی طور پر درست معلوم نہیں ہوتا۔

کشاف میں لکھا ہے کہ لا نافیہ کا استعمال قسم سے پہلے عربوں کے کلام اور شعروں میں عام ہے اور اس کا مقصد مضمون قسم کی تاکید کرنا ہوتا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ هِیَ رَدٌّ لِكَلَامِهِمْ وَعَقِيْدَتِهِمْ كَاَنَّهُ قِيْلَ لَيْسَ الْاَمْرُ كَمَا ذَكَرْتُمْ اُقْسِمُ بِكَذَا وَ كَذَا (فتح القدیر للشوکانی سورۃ القیامۃ آیات ۱ تا ۱۵) یعنی لاء نفی کے معنوں میں ہی آیا ہے۔ اور مخالف کے کلام اور اس کے عقیدہ کی تردید میں آیا ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ جس طرح تم کہتے ہو اس طرح معاملہ نہیں۔ میں اپنی بات کی شہادت کے لئے فلاں بات پیش کرتا ہوں۔ چنانچہ فرّاء اور اکثر نحویوں کا قول ہے کہ یہ لا زائدہ نہیں بلکہ نافیہ ہے۔ اور وہ اس کی مثال بھی دیتے ہیں کہ عام عربی بول چال میں کہتے ہیں لَا وَاللّٰہِ اور جب وہ یہ الفاظ کہتے ہیں تو یہ معنی نہیں ہوتے۔ کہ میں اللہ کی قسم نہیں کھاتا بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مَیں تمہاری بات ردّ کرتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ میری بات سچی ہے بعض کہتے ہیں کہ ہوتا تو نفی کے لئے ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ مضمونِ قسم کی نفی کے لئے ہو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس چیز کی قسم کھا کر میں اس کا پورا حق ادا نہیں کرتا۔ اور اس کی پوری عظمت ظاہر نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ معنی خواہ کتنے بڑے آدمی نے کئے ہوں۔ بہرحال لغو اور غلط ہیں۔ کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ کی قسموں کا ذکر ہے۔ پس یہ معنی کرنے کہ خدا فرماتا ہے میں قسم تو کھاتا ہوں پر قسم کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ ایک کھلی ہوئی غلطی ہے۔ الحمدللہ کے مستحق وجود کے متعلق یہ کہنا کہ وہ حق ادا نہیں کر سکتا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ نفیِ قسم ہی مراد ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ مَیں اس چیز کی قسم نہیں کھاتا۔ اور مقدر یہ مضمون ہوتا ہے۔ کہ یہ امر ظاہر ہے۔ اور اس پر کسی قسم کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ معنی بالبداہت باطل ہیں۔ (فتح القدیر للشوکانی سورۃ القیامۃ آیات ۱ تا ۱۵) کیونکہ جس امر کو ظاہر کرنا ہے وہ مقسم علیہ ہے۔ اور وہی مطلوب ہے اور جس چیز کی قسم کھائی ہے۔ وہ تو گواہ ہے۔ اور یہ کہنا کہ مَیں تو اس کی قسم نہیں

کھاتا۔ اور مراد یہ لینا کہ میں تو اس کی گواہی نہیں دلاتا۔ کیونکہ اس کی گواہی ظاہر ہے۔ ایک بے معنی فقرہ ہو جاتا ہے۔ پس حقیقت یہی ہے کہ یہاں لَا زائدہ ہے۔ یعنی تاکید کے لئے آیا ہے اور محاورۂ عرب کے عین مطابق ہے اور اس بارہ میں کسی لمبے تردد کی ہمیں ضرورت نہیں۔ ہاں جب نافیہ ہو تو ضرور ہے کہ اس سے پہلے کوئی مضمون بیان ہوا ہو۔ خواہ اس سورۃ میں خواہ اس سے پہلے کی سورۃ میں جس کے تسلسل میں اگلی سورۃ کا مضمون بیان کیا گیا ہو۔

اَلشَّفَقُ شَفَقٌ مصدر بھی ہے اور شَفَقٌ کے معنی ہیں اَلْحُمْرَۃُ فِی الْاُفُقِ مِنَ الْغُرُوْبِ اِلَی الْعِشَاءِ الْاٰخِرَۃِ اَوْ اِلٰی قَرِیْبِہَا اَوْ اِلٰی قَرِیْبِ الْعَتَمَۃِ یعنی شفق اس سرخی کو کہتے ہیں جو افق میں ہوتی ہے۔ غروب شمس کے وقت سے لے کر عشا کے وقت تک یعنی وہ عشا جسے ہم اپنی زبان میں عشا کہتے ہیں (عربی زبان میں شام کو بھی عشا کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ عشاء کو عشاء الاخریٰ کہتے ہیں) اَوْ اِلٰی قَرِیْبِ الْعَتَمَۃِ یا عشاء کے قریب تک فَاِذَا ذَھَبَ قِیْلَ غَابَ الشَّفَقُ جب وہ سرخی جاتی رہے تو کہتے ہیں شفق غائب ہوگئی۔ اصمعی کہتے ہیں سَمِعْتُ بَعْضَ الْعَرَبِ یَقُوْلُ عَلَیْہِ ثَوْبٌ کَاَنَّہُ الشَّفَقُ وَکَانَ اَحْمَرَ یعنی میں نے بعض عربوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اس پر میں نے ایسا کپڑا دیکھا جو شفق کی مانند تھا اور وہ کپڑا جس کی نسبت انہوں نے یہ فقرہ کہا سرخ رنگ کا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ شفق سُرخی پر دلالت کرتا ہے اور صحاح میں علامہ جوہری لکھتے ہیں کہ اَلشَّفَقُ بَقِیَّۃُ ضَوْءِ الشَّمْسِ وَحُمْرَتُھَا فِیْ اَوَّلِ الَّیْلِ اِلٰی قَرِیْبٍ مِنَ الْعَتَمَۃِ شفق سورج کی بقیہ روشنی اور اس کے ساتھ اس کی سُرخی کو کہتے ہیں۔ جو ابتداء شام سے اندھیرا ہونے کے قریب تک چلی جاتی ہے۔ (اقرب)

بعض تفاسیر میں لکھا ہے رُوِیَ عَنْ عَلِیٍّ وَابْنِ عَبَّاسٍ وَعُبَادَۃَ ابْنِ الصَّامِتِ وَاَبِیْ ھُرَیْرَۃَ وَشَدَّادِ ابْنِ اَوْسٍ وَابْنِ عُمَرَ وَمُحَمَّدِ بْنِ عَلِیِّ بْنِ الْحُسَیْنِ وَمَکْحُوْلٍ وَبَکْرِ بْنِ عَبْدِ اللہِ الْمَزَانِیْ وَبُکَیْرِ بْنِ الْاَشَجِّ وَمَالِکٍ وَابْنِ اَبِیْ ذِئْبٍ وَعَبْدِ الْعَزِیْزِ بْنِ اَبِیْ سَلْمَۃَ الْمَاجِشُوْنِ اَنَّھُمْ قَالُوْا الشَّفَقُ اَلْحُمْرَۃُ۔ یعنی شفق اَلْحُمْرَۃُ کا نام ہے۔ اور مجاہد کہتے ہیں۔ کہ قَبْلَ طَلُوْعِ الشَّمْسِ شفق سورج چڑھنے سے پہلے وقت کا نام ہے۔ وَاَھْلُ اللُّغَۃِ بَعْدَ غُرُوْبِھَا اور اہل لغت کہتے ہیں کہ یہ بعد غروب الشمس کا نام ہے۔ اسی طرح مسلم میں یہ حدیث آتی ہے۔ عَنْ عَبْدِ اللہِ بْنِ عَمْرٍو وَعَنْ رَّسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّہُ قَالَ وَقْتُ الْمَغْرِبِ مَالَمْ یَغِبِ الشَّفَقَ کہ مغرب کا وقت اس وقت تک ہے۔ جب تک شفق غائب نہ ہو جائے یہ حدیث لکھ کر صاحب ابنِ کثیر لکھتے ہیں فَفِیْہِ دَلِیْلٌ اَنَّ مَا قَالَ اَصْحَابُ اللُّغَۃِ صَحِیْحٌ وَالشَّفَقُ حُمْرَۃٌ بَعْدَ غُرُوْبِ الشَّمْسِ۔ اس میں سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ اصحاب لغت کا یہ خیال کہ غروب شمس کے بعد افق میں جو سُرخی رہ جاتی ہے۔ اس کا نام شفق ہے

بالکل صحیح ہے۔(تفسیر ابن کثیر زیر آیت ۱۶۔۲۵ سورۃ الانشقاق)

مجاہد کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ آیت میں رات کا لفظ بعد میں ہے۔اس لئے شفق سے مراد دن ہے وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ چونکہ یہاں مقابلہ ہے رات سے۔اِس لئے شفق کا اشارہ دن کی طرف ہونا چاہیے۔مگر یہ دلیل محض عقلی ہے۔اور مجاہد نے واضح کر دیا ہے۔کہ وہ کسی لغت پر اس کی بنیاد نہیں رکھ رہے بلکہ ایک عقلی دلیل پیش کر رہے ہیں حالانکہ عقلاً رات کے معنی کرتے ہوئے بھی شفق کا لفظ درست ہے۔اس لئے کہ شفق کا وقت وہ ہوتا ہے۔جب دن کی روشنی کچھ باقی ہوتی ہے۔پس تقابل پھر بھی موجود ہے۔چنانچہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں اس وقت کو جب کہ دن جاتا رہے گا۔مگر اس کی روشنی کچھ کچھ باقی رہے گی۔اور میں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں رات کو جب اس کی تاریکی پھیل جائے گی۔پس یہاں تقابل موجود ہے۔اس لئے خلاف لغت شفق کے معنی دن کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

وَسَقَهٗ وَسَقَهٗ يَسِقَهٗ وَسَقاً کے معنی ہوتے ہیں جَمَعَهٗ وَحَمَلَهٗ کسی چیز کو جمع کیا۔اور اس کو اٹھا لیا وَسَقَ الْبَعِيْرَ کے معنی ہوتے ہیں حَمَّلَهُ الْوَسْقِ اس پر وسق لا د دیا (اقرب) وسق کے معنی کسی جانور کی طاقت کے مطابق بوجھ کے ہیں۔چنانچہ وَسْقُ الْبَعِيْرِ کے معنی ہوتے ہیں حِمْلُ الْبَعِيْرِ یعنی ایک اونٹ کا بوجھ (اقرب) بعض نے وسق کے وزن بھی بتائے ہیں۔چنانچہ عام طور پر ساٹھ صاع کا ایک وسق سمجھا جاتا ہے۔لیکن اہل حجاز ۳۲۰ رطل کا اور اہل عراق ۴۸۰ رطل کا ایک وسق قرار دیتے ہیں۔

وَسَقَ الْبَعِيْرَ وَسِيْقًا کے معنی ہوتے ہیں سَاقَهٗ اونٹ کو چلایا۔مفسرین لکھتے ہیں کہ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٍ وَالْحَسَنُ وَقَتَادَةُ وَمَا وَسَقَ وَمَا جَمَعَ یعنی ابن عباس مجاہد حسن اور قتادہ کہتے ہیں کہ وَمَا وَسَقَ کے معنی وَمَا جَمَعَ کے ہیں یعنی جو اس نے جمع کیا۔قتادہ اس کی تفسیر کرتے ہیں وَمَا جَمَعَ مِنْ نَجْمٍ وَدَابَّةٍ جو کچھ بوٹیاں اور جانور وغیرہ یا ستارے ہیں ان کو جمع کیا وَقَالَ عِكْرِمَةُ واللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ يَقُوْلُ مَاسَاقَ مِنْ ظُلْمَةٍ۔عکرمہ اس کے معنی چلانے کے لیتے ہیں۔یعنی جو ظلمت تھی اس کو وہ دھکیل کر لے آئی۔سائق وہ ہوتا ہے جو پیچھے سے دھکا دیتا ہے۔اور قائد وہ ہوتا ہے جو آگے سے کھینچتا ہے پس وَمَا وَسَقَ کے یہ معنی ہوں گے۔کہ جس اندھیرے کو وہ دھکا دے کر آگے لے آئے۔

اِتَّسَقَ اِتَّسَقَ لغوی طور پر وَسَقَ کا باب افتعال ہے۔اور اِتَّسَقَ الْاَمْرُ کے معنی ہوتے ہیں اِنْتَظَمَ وَاسْتَوٰى کام ٹھیک ہو گیا منظم ہو گیا اور درست ہو گیا۔(اقرب) مفردات میں لکھا ہے۔اَلْاِتِّسَاقُ اَلْاِجْتِمَاعُ

وَالْاِطِّرَادُ کہ اتسقاق کے معنی ہیں۔ اجتماع اور اطراد اور اطراد کے معنی ہیں کوئی چیز دوسری چیز کے پیچھے آئی۔ اور ٹھیک ہوگئی۔ چنانچہ کہتے ہیں اِطَّرَدَ الْاَمْرُ اَیْ تَبِعَ بَعْضُہٗ بَعْضاً وَاسْتَقَامَ۔ اِطراد کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے سارے حصے جمع ہوکر وہ کام ٹھیک ہوگیا۔ (المنجد) فرّاء اِتَّسَقَ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ اِتِّسَاقُہٗ اِمْتِلَاءُہٗ واجْتِمَاعُہٗ وَاسْتِوَاءُ ہٗ لَیْلَۃَ ثَلَاثَ عَشَرَۃَ وَرَابِعَ عَشَرَۃَ اِلٰی سِتِّ عَشَرَۃَ وَھُوَ اِفْتَعَلَ مِنَ الْوَسَقِ الَّذِیْ ھُوَ الْجَمْعُ (تفسیر القرطبی سورۃ انشقاق زیر آیت ۱۶ تا ۲۱) یعنی اتساق کے معنی چاند کے پورا روشن ہوجانے اور مکمل ہوجانے کے ہیں۔ جو تیرھویں رات سے سولہویں رات تک ہوتا ہے۔ وُہ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ یہ وَسَقَ کے لفظ سے باب افتعال ہے جس کے معنے جمع کرنے کے ہوتے ہیں۔ حسن بصری کہتے ہیں کہ اِتَّسَقَ کے معنی ہیں اِمْتَلَأَ وَاجْتَمَعَ بھر گیا۔ اور اکٹھا ہوگیا۔ قتادہ کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں اِسْتَدَارَ گول ہوگیا وَیُقَالُ اَمْرُ فُلَانٍ مُتَّسِقٌ اَیْ مُجْتَمِعٌ (فتح البیان زیر آیت ھٰذا) عرب کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا معاملہ متسق ہے۔ یعنی بالکل ٹھیک ہے۔ (فتح البیان) ابن کثیر میں ہے قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اِذَا اجْتَمَعَ وَاسْتَوٰی ابن عباس کہتے ہیں کہ اِتَّسَقَ کے معنے ہیں جمع ہوگیا اور درست ہوگیا۔ (تفسیر ابن کثیر زیر آیت ھٰذا) وَکَذَا قَالَ عِکْرَمَۃُ وَمُجَاھِدٌ وَسَعِیْدُ بْنُ جُبَیْرٍ وَمَسْرُوْقٌ وَاَبُوْصَالِحٍ وَالضَّحَاکُ وَابْنُ زَیْدٍ اِذَا اتَّسَقَ اِذَا اسْتَوٰی یعنی عکرمہ۔ مجاہد۔ سعید بن جُبیر۔ مسروق۔ ابو صالح۔ ضحاک اور ابن زید نے بھی اِذَا اتَّسَقَ کے یہ معنی کئے ہیں۔ کہ اِذَا اسْتَوٰی یعنی جب پورا پورا ہوگیا۔ اور ٹھیک ہوگیا وَ قَالَ الْحَسَنُ اِذَا اجْتَمَعَ اِذَا امْتَلَأَ حسن بصری سے یہ بھی معنی مروی ہیں کہ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کے معنے ہیں بھر گیا۔ اور روشنی مکمل ہوگئی وَقَالَ قَتَادَۃُ اِذَا اسْتَدَارَ۔ قتادہ کہتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اس کی گولائی پوری ہوگئی۔ وَمَعْنٰی کَلَامِہٖ اَنَّہٗ اِذَا تَکَامَلَ نُوْرُہٗ وَاَبْدَرَ۔ (ابن کثیر زیر آیت ھٰذا) ابن کثیر کہتے ہیں کہ قتادہ کا مطلب یہ ہے کہ اتساق کے معنی یہ ہیں۔ کہ جب چاند کا نور پورا ہوگیا۔ اور وہ بدر بن گیا۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ کے معنے پرانے مفسرین کے نزدیک اور اس کی تردید علامہ آلوسی اپنی تفسیر فتح البیان میں لکھتے ہیں کہ اِتَّسَقَ: اِجْتَمَعَ نُوْرُہٗ وَصَارَ بَدْرًا یعنی اِتَّسَقَ کے معنے یہ ہیں۔ کہ اس کا نور مکمل ہوگیا۔ اور وہ بدر بن گیا۔ (روح المعانی زیر آیت ھٰذا)

صاحب کشّاف اِتَّسَقَ کے معنوں میں لکھتے ہیں کہ اِجْتَمَعَ وَاسْتَوٰی لَیْلَۃَ اَرْبَعَۃَ عَشَرَ یعنی اِس کے معنی یہ ہیں کہ چاند نے اپنے نور کو مکمل کرلیا اور وہ چودھویں رات کا ہوگیا۔ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اِتَّسَقَ اِسْتَوٰی وَعَنْہٗ قَالَ لَیْلَۃَ ثَلَاثَ عَشَرَ (تفسیر کشاف زیر آیت ھذا) ابن عباس بھی اِتَّسَقَ کے معنی اِسْتَوٰی کے کرتے ہیں۔ اور

کہتے ہیں کہ اِس سے مراد یہ ہے کہ چاند تیرھویں رات کا ہوگیا۔

تفسیر ۔ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم مندرجہ بالا تین آیتوں کو دیکھتے ہیں۔تو ان میں تین حالتیں بیان کی گئی ہیں۔اول حالت یہ بتائی گئی ہے کہ ہم تمہارے سامنے شفق کی حالت کو پیش کرتے ہیں۔شفق جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے یقینی اور قطعی طور پر سورج کے ڈوب جانے کے بعد اتنے عرصہ کا نام ہے۔جب روشنی اور سُرخی ابھی باقی ہوتی ہے۔اور وَسَقَ کے معنی جمع کرنے کے بتائے جاچکے ہیں۔پس وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ کے یہ معنی ہوئے کہ رات جب وہ اپنی ساری کیفیتوں کو جمع کر لیتی ہے۔آخر رات لکڑیاں جمع نہیں کیا کرتی۔کہ یہ خیال کیا جائے کہ نہ معلوم رات کیا کچھ جمع کرلے گی۔ ہر چیز اپنے اندر بعض خاص صفات رکھتی ہے۔اور جب ساری صفات اس میں جمع ہو جائیں تو وہ مکمل ہو جاتی ہیں پس وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ کے یہ معنی ہوئے کہ رات جب اکٹھا کر لیتی ہے یعنی ان ساری صفات کو جو رات کو کامل رات بنانے والی ہیں اپنے اندر جمع کر لیتی ہے وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ اور ہم چاند کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جب وہ تیرھویں یا چودھویں رات کا ہو جائے گا۔جس طرح رات نے اپنی ساری چیزوں کو جمع کر لیا تھا۔یعنی اندھیرا اور خاموشی اور دوسری چیزیں جو رات سے وابستہ ہیں۔اسی طرح چاند اپنی ساری طاقتوں کو جمع کرلے گا اور چاند اپنی ساری طاقتوں کو چودھویں رات میں ہی جمع کیا کرتا ہے۔مفسرین نے اس جگہ یہ معنی کئے ہیں کہ یہاں اس کی تدریج بیان کی گئی ہے۔اور بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اِس طرح تدریجی طور پر ترقیات ہوا کرتی ہیں۔ اور بعضوں نے یہ معنی کئے ہیں کہ ان آیات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کی ترقی کا ذکر ہے۔لیکن یہ آیات بالبداہت اِس خیال کو ردّ کرتی ہیں۔اس لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو ظلمتِ شب میں نازل ہوئے تھے وہاں شفق کا سوال ہی کونسا تھا۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تو خدا تعالیٰ نے سورج قرار دیا ہے۔ اور یہاں قمر کا ذکر ہے۔اور قمر وہ ہوتا ہے جو دوسرے سے نور لیتا ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کب قمر تھے کہ اس کے بعد بدر بن گئے۔آپ تو سورج تھے۔پس یہ معنی قلّت تدبر کا نتیجہ ہیں۔بات یہ ہے کہ پہلی سورتوں میں بتایا گیا تھا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب کُفر دنیا پر چھا جائے گا۔جیسے سورۂ تکویر اور تطفیف وغیرہ میں ذکر تھا اور اِس سورۃ میں جیسا کہ مَیں نے بیان کیا ہے اسلام کی ترقی کا ذکر ہے کفر کا نہیں۔گو کفر کا ذکر ساتھ ہے مگر ان سورتوں میں کفر کا ذکر اصل تھا اور اسلام کا ذکر تابع تھا اور اس سورۃ میں اسلام کا ذکر اصل مقصد ہے اور کفر کا ذکر اس کے تابع ہے۔جیسے اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ سے استدلال کر کے بتایا جاچکا ہے پس جب اسلام کی دوبارہ ترقی کا ذکر کیا گیا۔تو لازماً یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔کہ اسلام کا تنزل کب ہوگا۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ ان سارے تغیرات کا ذکر کرتا ہے۔ جو

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد مسلمانوں پر آنے والے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سراج منیر کہا جا چکا ہے۔ اور سراج منیر جب غروب ہوگا۔ تو لازماً ایک شفق کی حالت پیدا ہوگی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ یعنی مَیں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں تمہارے سامنے اس زمانہ کو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جائے گا۔ شفق کا لفظ اس لئے استعمال فرمایا کہ شفق کے وقت بھی سورج موجود ہوتا ہے اور رات کے وقت بھی سورج موجود ہوتا ہے قمر کے وقت بھی سورج موجود ہوتا ہے۔ لیکن وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ جب اوپر کی سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے تنزل کی طرف اشارہ فرمایا۔ تو کسی انسان کا ذہن اس طرف بھی جا سکتا تھا۔ کہ شائد اس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ناکارہ ہو جائے گی فرماتا ہے ناکارہ نہیں ہوگی بلکہ وہ شفق اور لیل کا زمانہ ہوگا۔ اور شفق اور لیل کے وقت سورج مٹ نہیں جاتا وہ موجود ہوتا ہے۔ مگر لوگ اِس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ان الفاظ کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ تنزلِ اسلام تنزلِ محمدیت کی وجہ سے نہیں ہوگا بلکہ تنزل مسلمین کی وجہ سے ہوگا۔ کسی قوم کا تنزل دو سببوں میں سے کسی ایک سبب سے ہوا کرتا ہے۔ یا تو لیڈر بگڑ جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے قوم بگڑ جاتی ہے۔ اور یا لیڈر تو صحیح حالت پر قائم رہتا ہے۔ مگر قوم اس سے مونہہ پھیر لیتی ہے۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں جو تنزل کی خبریں دی گئی ہیں۔ وہ تنزل اور انحطاط محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بگڑنے کی وجہ سے نہیں ہوگا۔ بلکہ مسلمانوں کے بگڑنے کی وجہ سے ہوگا۔ اور وہ آپ سے دُور جا پڑیں گے۔ اور اس طرح نور ہدایت حاصل کرنے سے محروم رہیں گے۔ جیسے شفق اور لیل سورج کے مٹ جانے کی وجہ سے نہیں آتیں۔ بلکہ زمین کے سورج سے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے آتی ہیں۔

اِس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے۔ کہ زمین چکر کھاتی ہے۔ کیونکہ اگر سورج کو چکر والا سمجھا جاتا تو یہ مثال غلط ہو جاتی۔ تب یہ معنی بنتے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نعوذ باللہ بھاگ گئے۔ حالانکہ خدا یہ بتاتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں بھاگے۔ بلکہ تم بھاگے۔ پس یہ مثال اسی صورت میں صحیح طور پر چسپاں ہو سکتی ہے جب ہم یہ سمجھیں کہ زمین چکّر کھاتی ہے۔

شفق سے مراد یہ شفق کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوا جس کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا تھا خَیْرُکُمْ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ یَکُوْنُ بَعْدَهُمْ قَوْمٌ یَخُوْنُوْنَ وَلَا یُؤْتَمَنُوْنَ وَیَشْهَدُوْنَ وَلَا یُسْتَشْهَدُوْنَ وَیَنْذُرُوْنَ وَلَا یَفُوْنَ وَیَظْهَرُ فِیْهِمُ السِّمَنُ (بخاری

کتاب فضائل اصحاب النبی باب فضائل اصحاب النبی) یعنی میرے بعد تین صدیوں تک کا زمانہ تو اچھا ہے لیکن پھر خرابیاں پھیل جائیں گی۔ گویا آپ نے ابتدائی تین صدیوں کو خیر و برکت والا قرار دیا ہے۔ پس یہ تین صدیاں تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کے سورج کی۔ اِس کے بعد سورج غائب ہوا۔ اور شفق کا زمانہ شروع ہوا۔ یعنی وہ زمانہ جب نور اور ظلمت ابھی ملے ہوئے تھے۔ پھر وہ زمانہ آیا۔ جب رات نے اپنی ساری تاریکیوں کو جمع کر لیا۔

اس جگہ ایک اور لطیفہ بھی یاد رکھنے والا ہے۔ اور وہ یہ کہ جبکہ شفق کا وقت بہت کم ہوتا ہے۔ اور وہ عام طور پر رات کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے شفق کو الگ کیوں بیان کیا۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ اسلام میں شفق کے زمانہ کو ایک خصوصیت حاصل ہونے والی تھی۔ اور وُہ یہ کہ عام طور پر شفق کا وقت چھوٹا ہوتا ہے۔ اور رات کا لمبا۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی امت سے خدا تعالیٰ کا یہ معاملہ مقدر تھا۔ کہ ان کے لئے شفق کا زمانہ لمبا ہو اور رات کا چھوٹا اور اس طرح شفق کا وقت اپنی ذات میں ایک مستقل حیثیت اختیار کر لے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کے بعد ایسا ہی ہوا مسلمانوں میں ہمیشہ ایسے لوگ کھڑے ہوتے رہے جنہوں نے شفق کا کام کیا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نور کو دنیا سے غائب ہونے نہیں دیا۔ درحقیقت بارہویں اور تیرہویں صدی ہی اصل میں تاریک راتیں تھیں۔ اگرچہ غور کرنے سے ان میں بھی کچھ نہ کچھ شفق کا زمانہ نظر آجاتا ہے۔

وَالَّیۡلِ وَمَا وَسَقَ اور رات جب وہ وساق اختیار کر لے۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ شفق وسق تک چلی جائے گی۔ اِس میں جہاں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور نہیں مٹے گا بلکہ مسلمان اس نور سے مونہہ پھیر لیں گے۔ وہاں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ جب وہ رات آئے گی تو اتنی تاریک اور بھیانک ہوگی۔ کہ وہ تمام چیزیں جو رات کو مکمل بناتی ہیں۔ ان کو وہ اپنے اندر جمع کر لے گی۔ جب رات کامل طور پر دنیا میں چھا جاتی ہَے۔ تو اس میں چوریاں بھی ہوتی ہیں۔ ڈاکے بھی پڑتے ہیں۔ قتل بھی ہوتے ہیں سانپ بھی نکلتے ہیں۔ بچھو بھی باہر آجاتے ہیں۔ اور اندھیرا بھی اس طرح چھا جاتا ہے۔ کہ کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ پس وَالَّیۡلِ وَمَا وَسَقَ میں بتایا کہ وہ فتنہ بڑا شدید ہوگا۔ اور وُہ ساری چیزیں اس میں جمع ہو جائیں گی۔ جو رات کو مکمل رات بنانے والی ہوتی ہیں۔

شفق لیل اور قمر کو بطور شہادت پیش کرنے کا مطلب فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ وَالَّیۡلِ وَمَا وَسَقَ وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ یہ تین آیات اپنے مطلب کو اس قدر واضح کر دیتی ہیں کہ مفسرین کا یہ نتیجہ نکالنا ان میں تدریج بتائی گئی ہے۔ بالکل

باطل نتیجہ ثابت ہوتا ہے۔ پہلے شفق کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انتہائی تاریک رات کا اور اس کے بعد قمر کا جو اپنی منازل طے کر کے بدر بن جاتا ہے۔ اور یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جو کبھی اکٹھی نہیں ہوتیں نہ شفق کے بعد لازماً انتہائی تاریک رات آتی ہے۔

اور نہ انتہائی تاریک کے بعد بدر نکلا کرتا ہے۔ آخر کوئی مفسر مجھے بتائے کہ وہ کون سا بدر ہے۔ جو وَالَّیۡلِ وَمَا وَسَقَ کے بعد نکلتا ہے۔ مگر یہاں وَالَّیۡلِ وَمَا وَسَقَ کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ اور بدر کا بعد میں ذکر کیا گیا ہے پس یہاں تدریجی ترقی کا کوئی ذکر نہیں اور نہ جسمانیات کا کوئی قانون بیان ہو رہا ہے۔ بلکہ رُوحانی نقطۂ نگاہ سے اسلام کے تنزل اور اس کی ترقی کے مختلف ادوار کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ پس لیل سے یہاں کوئی دنیوی رات مراد نہیں۔ بلکہ روحانی رات مراد ہے۔ اور دنیوی اور روحانی راتوں میں یہ فرق ہوتا ہے کہ دنیوی راتوں میں بدر سے پہلی راتیں تاریک نہیں ہوتیں۔ بلکہ روشن ہوتی ہیں۔ مثلاً ۱۴ سے پہلے ۱۲ یا ۱۳ تاریخ کی راتیں تاریک نہیں ہوں گی۔ انتہائی تاریک راتیں ۲۹-۲۸ ہوں گی۔ لیکن روحانی دنیا میں بدرِ کامل اس وقت ظاہر ہوتا ہے۔ جب اس سے پہلے ایک سخت تاریک رات دنیا پر چھائی ہوئی ہوتی ہے پس وَالَّیۡلِ وَمَا وَسَقَ کے بعد وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ رکھ کر بتا دیا گیا ہے کہ یہاں جسمانی نہیں بلکہ روحانی شفق روحانی رات اور روحانی بدر کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اِس لئے تدریج کا یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرماتا ہے وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ہم شہادت کے طور پر چاند کو پیش کرتے ہیں۔ جب وہ بدر بن جاتا ہے۔ یہ مسیح موعود کی بعثت کے متعلق اتنی واضح پیشگوئی ہے کہ اس کے بعد کسی کا یہ کہنا کہ قرآن میں مسیح موعود کا ذکر نہیں خطرناک ظلم ہے۔ یہاں تین حالتیں بیان کی گئی ہیں۔ اور بتایا گیا ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد شفق کا زمانہ بہت لمبا ہوگا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا تاریک زمانہ آئے گا۔ مگر باوجود اس کے کہ وہ چھوٹا ہوگا اس قدر تاریک ہوگا کہ کس قدر تاریکی دنیا میں ممکن ہے۔ سب اس میں جمع ہو جائے گی۔ اس کے بعد یکدم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روشنی لینے والے وجودوں میں سے ایک بدر بن جائے گا۔ اور رات پر اس طرح چھا جائے گا۔ کہ اسے شروع سے لے کر آخر تک منور کر دے گا۔ بدر کا یہی کام ہوتا ہے کہ وہ رات کو شروع سے آخر تک روشن کر دیتا ہے۔ وہ روحانی بدرِ کامل بھی اپنے نور کو دنیا میں اس طرح پھیلا دے گا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا بُعد لوگوں کو محسوس نہیں ہوگا۔ یہ نہایت ہی واضح اور مکمل نقشہ ان تغیرات کا کھینچا گیا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر آخر تک رونما ہونے تھے۔ اور جنہوں نے اسلام پر اثر انداز ہونا تھا۔ (اقرب)

لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿۲۰﴾ؕ

تم ضرور درجہ بدرجہ ان حالتوں پر پہنچو گے۔

حَلّ لُغَات۔اَلطَّبَقُ اَلطَّبَقُ کے معنی ہیں اَلْقَرْنُ مِنَ الزَّمَانِ ایک صدی۔اَلنَّاسُ ایک زمانہ کے لوگ اَلْجَمَاعَۃُ جماعت۔اَلْحَالُ۔حال (اقرب) اَلطَّبَقُ۔اَلْمُطَابَقَۃُ (مفردات)

تفسیر۔فرماتا ہے ہم اپنی ذات ہی کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم ضرور ایک درجہ کے بعد دوسرے درجہ پر جاؤ گے۔ لَتَرۡکَبُنَّ میں لام اور نون مشدّ دلانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔اگر یہ آیات اپنے اندر کوئی اہم پیشگوئی نہیں رکھتی تھیں۔اس آیت کی بناوٹ ہی واضح کر رہی ہے۔کہ ان آیات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ پر چسپاں کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔بلکہ یہ واقعات آئندہ زمانہ کے متعلق بطور پیشگوئی بیان کئے گئے ہیں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ شفق کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا تھا۔نہ انتہائی تاریک رات کا اور نہ اس وقت کوئی قمر تھا جو اتساق اختیار کر کے بدر بن گیا ہو۔پس یہ آیات قطعی طور پر بعد کے زمانہ سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔

لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ میں عن کے معنے بعد کے عَنۡ کے عربی زبان میں بہت سے معنی ہوتے ہیں جن میں سے ایک یہ ہیں کہ عَنۡ علاوہ اور معنوں کے بعد کے معنی بھی دیتا ہے جیسے کہتے ہیں عَنۡ قَلِیۡلٍ اَزُوۡرُكَ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ بَعۡدَ قَلِیۡلٍ اَزُوۡرُكَ اس جگہ بھی عَنۡ کے معنی بعد کے ہی ہیں اور مراد یہ ہے کہ لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا بَعۡدَ طَبَقٍ یعنی تم ایک درجہ کے بعد دوسرے درجہ تک پہنچو گے۔جیسا کہ حل لغات میں لکھا جا چکا ہے طبق کے معنی مطابق کے بھی ہوتے ہیں۔اور اس کے معنی حال کے بھی ہوتے ہیں۔اسی طرح طبق کے ایک معنی جماعت کے بھی ہوتے ہیں۔یہاں حالت اور جماعت دونوں معنی لگ سکتے ہیں یعنی ہم اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتے ہیں۔کہ تم ضرور ان چاروں حالتوں میں سے ایک کے بعد دوسری پر گزرتے ہوئے چلے جاؤ گے۔اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔کہ تم ایک جماعت کے بعد دوسری جماعت پر سوار ہوتے جاؤ گے۔یعنی جس جس جماعت کے حالات بیان ہوئے ہیں۔اس جماعت کی حالت تم پر وارد ہوتی جائے گی۔

اب دیکھو کس طرح خدا تعالیٰ نے ان تمام باتوں کو پورا کیا۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مہر منور تین صدیوں تک دنیا کو روشن کرتا رہا۔اس کے بعد شفق کا زمانہ آیا۔جو بہت لمبا عرصہ رہا۔سید عبد القادر صاحب جیلانی۔حضرت معین الدین صاحب چشتی۔حضرت محی الدین صاحب ابن عربی اور دُوسرے کئی بزرگ اِس زمانہ

شفق میں آئے۔ اورانہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نور اور آپ کی تعلیم کو قائم رکھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت رات پڑ گئی تھی مگر پھر بھی کوئی شخص سورج کے وجود سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ شفق کی سُرخی موجود تھی۔ اِس کے بعد بارہویں اور تیرھویں صدی میں تاریکی آئی اور ایسی بھیانک اور خطرناک شکل میں کہ وَالَّیۡلِ وَمَا وَسَقَ کا نظارہ نظر آنے لگ گیا۔ رات اپنے اندر جس قدر بلائیں جمع کرسکتی ہے۔ وہ تمام بلائیں۔ اور تمام آفتیں اور تمام مصیبتیں اُس تاریک رات نے اپنے اندر جمع کرلی تھیں۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایسا تباہی کا زمانہ تھا کہ جس کی نظیر پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔ پھر اس انتہائی تاریک رات کے معاً بعد وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کے مطابق ایک قمر بدر کی صورت اختیار کرگیا۔ اور وُہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نُور دنیا تک پہنچانے لگ گیا۔

حضرت مسیح موعود کا نور سولویں صدی تک اِس پیشگوئی پر غور کرو اور دیکھو کہ یہ پیشگوئی نہ صرف معناً پوری ہوئی بلکہ لفظاً لفظاً پوری ہوئی ہے۔ چنانچہ اتساق کی تشریح کرتے ہوئے بتایا جاچکا ہے کہ تیرھویں رات سے سولہویں رات تک کے چاند کے لئے اتساق کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات بھی نمایاں طور پر پُوری ہوئی۔ کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تیرھویں صدی میں پیدا ہوئے۔ چودھویں صدی میں آپ نے دعویٰ فرمایا۔ اور پھر آپ نے بطور پیشگوئی اعلان فرمایا کہ مسیح موعود کا زمانہ تین سو سال تک ہے۔ یعنی سولہویں صدی کے آخر تک۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

> ''مسیح موعود کا زمانہ اس حد تک ہے۔ جس حد تک اس کے دیکھنے والے یا دیکھنے والوں کے دیکھنے والے اور یا پھر دیکھنے والوں کے دیکھنے والے دنیا میں پائے جائیں گے۔ اور اس کی تعلیم پر قائم ہوں گے۔ غرض قرونِ ثلاثہ کا ہونا برعائت منہاج نبوت ضروری ہے۔''

(تریاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۴۸۷ بقیہ حاشیہ)

اسی طرح فرمایا:

> ''ابھی تیسری صدی آج کے دن سے پُوری نہیں ہوگی کہ عیسیٰ کے انتظار کرنے والے کیا مسلمان اور کیا عیسائی سخت نومید اور بدظن ہوکر اس جھوٹے عقیدہ کو چھوڑیں گے۔ اور دنیا میں ایک ہی مذہب ہوگا۔ اور ایک ہی پیشوا۔ میں تو ایک تخم ریزی کرنے کے لئے آیا ہوں۔ سو میرے ہاتھ سے وہ تخم بویا گیا۔ اور اب وہ بڑھے گا۔ اور پھولے گا۔ اور کوئی نہیں جو اس کو روک سکے''۔

(تذکرۃ الشہادتین، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۶۷)

پھر آپ مخالفین کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

’’مقدر یوں ہے کہ وہ لوگ جو اس جماعت سے باہر ہیں وہ دن بدن کم ہوتے جائیں گے۔ اور تمام فرقے مسلمانوں کے جو اِس سلسلہ سے باہر ہیں۔ وہ دن بدن کم ہو کر اس سلسلہ میں داخل ہوتے جائیں گے یا نابود ہوتے جائیں گے جیسا کہ یہودی گھٹتے گھٹتے یہاں تک کم ہو گئے کہ بہت ہی تھوڑے رہ گئے۔ ایسا ہی اِس جماعت کے مخالفوں کا انجام ہوگا اور اِس جماعت کے لوگ اپنی تعداد اور قوتِ مذہب کے رو سے سب پر غالب ہو جائیں گے۔‘‘

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۹۵)

غرض مسیح موعود کا زمانہ تیرہویں صدی سے شروع ہو کر سولہویں صدی کے آخر تک پہونچے گا۔ اور یہی لغت والے کہتے ہیں کہ اتساق کے معنی یہ ہیں کہ وہ چاند جو تیرھویں سے سولہویں تک جاتا ہے۔

اگر یہاں صرف بدر کا لفظ رکھ دیا جاتا۔ تو مضمون میں وہ وسعت پیدا نہ ہوتی۔ جو وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کے الفاظ سے پیدا ہوئی۔ کیونکہ اتساق کا لفظ رکھ کر مسیح موعود کے زمانہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ تیرھویں صدی میں وہ پیدا ہوگا۔ چودھویں صدی میں اس کا ظہور ہوگا۔ اور سولہویں صدی کے آخر تک اس کا اثر ترقی کرتا جائے گا۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۱﴾

پھر ان (لوگوں) کو کیا ہوا ہے کہ ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر ۔ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ یعنی اس زمانہ کے لوگوں کو کیا ہو گیا۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ اتساق کے زمانہ کا ہم کو پتہ نہیں۔ کہ وہ کب ہوگا۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے تو بدر کامل کا ظہور نہیں دیکھا۔ مگر یہ لوگ شفق اور لیل کو تو دیکھ چکے تھے۔ اور اس پر قیاس کر کے سمجھ سکتے تھے۔ کہ جب شفق بھی آ چکی اور لیل بھی ظاہر ہو گئی۔ تو وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کی پیشگوئی کے پُورا ہونے کا وقت بھی آ جائے گا۔ مگر وہ تو لیل کو دیکھ کر بالکل مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ اور یہ خیال کرنے لگ گئے کہ اب اسلام کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ پس تعجب ہے کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا۔ انہوں نے شفق کو بھی دیکھا۔ انہوں نے لیل کو بھی دیکھا۔ مگر یہ نہ سمجھا۔ کہ بدر کامل کا ظہور بھی مقدر ہے۔

لَا يُؤْمِنُوْنَ ایمان نہیں لاتے۔ یعنی اِس بات پر ایمان نہیں لاتے کہ بدر اِس تاریک و تار راتوں پر چھا جائے

گا۔اور تمام ظلمات کو پھاڑ دے گا۔

السجدۃ ۱۳

وَ اِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جائے۔تو سجدہ نہیں کرتے۔

حَلِّ لُغَات۔ يَسْجُدُوْنَ يَسْجُدُوْنَ يَسْجُدُ سے جمع کا صیغہ ہے۔اور سَجَدَ يَسْجُدُ کے معنی ہوتے ہیں خَضَعَ وَ اَغْنٰى عاجزی کی اور عجز کا اظہار جھکنے سے کیا نیز کہتے ہیں سَجَدَتِ السَّفِيْنَةُ لِلرِّيَاحِ اور معنی ہوتے ہیں طَاعَتْهَا وَمَالَتْ بِمَيْلِهَا۔ کہ کشتی نے ہوا کی اطاعت کی۔اور جدھر ہوا کا رخ تھا۔ادھر چل پڑی (اقرب) پس يَسْجُدُوْنَ کے معنی ہوں گے۔وہ فرمانبرداری کرتے ہیں۔اور لَا يَسْجُدُوْنَ کے معنی ہوں گے فرمانبرداری نہیں کرتے۔

تفسیر۔ لَا يَسْجُدُوْنَ کے دو معنے یہاں سجدہ کے دو معنی ہیں اوّل یہ کہ وہ فرمانبرداری نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ جب قرآن کا دوبارہ نزول ہو رہا ہے۔تو وہ کیوں اس شکریہ میں سجدہ نہیں کرتے۔اس میں یہ پیشگوئی مخفی تھی۔کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا۔جب قرآن دنیا سے مٹ جائے گا۔اور ایمان ثریا پر چلا جائے گا۔اس وقت ایک بدری وجود پھر قرآن کریم کو دنیا میں واپس لائے گا۔پھر اس قرآن کو پڑھا جائے گا پھر اس قرآن پر عمل شروع ہوگا۔پھر اس کے احکام کو تازہ کیا جائے گا۔فرماتا ہے۔یہ ہماری اتنی بڑی نعمت ہے۔کہ چاہیے تھا خدا تعالیٰ کے اس عظیم الشان فضل پر وہ سجدوں میں گر جاتے۔کہ انہیں ان کی کتاب واپس مل گئی۔ان کا روحانی خزانہ جو مدتوں سے ضائع ہو چکا تھا۔پھر ان کے گھروں میں واپس آ گیا۔مگر یہ لوگ ایسے ناشکر گزار ہیں کہ الٹا اس پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ قرآن میں تحریف کر رہا ہے۔یا یہ معنی ہیں کہ وہ بدری وجود تو قرآن پیش کرے گا مگر یہ لوگ بجائے قرآن کی فرمانبرداری کرنے کے اس کے سامنے حدیثوں یا ائمہ سلف کے اقوال کو پیش کریں گے۔قرآن کی طرف نہیں جائیں گے۔

ہماری جماعت کے ایک دوست میاں نظام الدین صاحب کا ایک مشہور واقعہ ہے۔جو میں نے بارہا سنایا ہے۔کہ وہ ابھی بیعت میں شامل نہیں تھے۔کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اگر میں قرآن کریم کی سو آیتیں ایسی نکلوا کر لے آوٴں۔جن سے حیات مسیح ثابت ہوتی ہو۔تو کیا آپ مان جائیں گے کہ

حضرت عیسٰی زندہ ہیں۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا سوآیتوں کا کیا سوال ہے۔آپ ایک آیت ہی پیش کردیں۔تو میں ماننے کے لئے تیار ہوں۔انہوں نے کہا کہ میں دس آیتیں تو ضرور لا کر آپ کو دکھاؤں گا۔اور یہ کہہ کر خوش خوش مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کے پاس گئے۔تا کہ قرآن سے ایسی آیتیں نکلوا لائیں۔مولوی محمد حسین صاحب ان دنوں لاہور میں تھے۔حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ بھی جموں سے چھٹی پر وہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔اور وفات وحیات مسیح پر بحث کے لئے آپس میں شرائط کا تصفیہ ہو رہا تھا۔حضرت خلیفہ اولؓ فرماتے تھے۔کہ اس مسئلہ کا قرآن سے فیصلہ ہونا چاہیے۔اور مولوی محمد حسین صاحب یہ کہتے تھے کہ حدیثیں بھی شامل ہونی چاہئیں۔آخر بڑی بحث اور ردّ وکد کے بعد حضرت خلیفۂ اولؓ نے مان لیا کہ بخاری بھی شامل کر لی جائے۔مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کو فخر کرنے کی بہت عادت تھی۔حضرت خلیفۂ اولؓ نے جب ان کی اتنی بات مان لی۔کہ بخاری سے بھی تائیدی رنگ میں ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔مسجد میں بیٹھ کر انہوں نے لاف زنی شروع کردی کہ مولوی نورالدینؓ نے یوں دلیل دی۔اور مَیں نے اسے یوں پکڑا۔اس نے اس طرح کہا۔اور مَیں نے اسے اس طرح گرایا۔اتنے میں میاں نظام الدین صاحب بھی وہاں جا پہونچے۔اور کہنے لگے مولوی صاحب ان بحثوں کو چھوڑیئے مَیں مرزا صاحب کو منوا کر آرہا ہوں۔کہ اگر مَیں قرآن سے دس آیتیں ایسی نکال کر لے آؤں۔جن سے حیات مسیح ثابت ہوتی ہو۔تو وہ اپنے عقیدہ کو ترک کر دیں گے۔آپ مہربانی فرما کر مجھے جلدی سے ایسی دس آیتیں قرآن سے لکھ دیں۔تا کہ مَیں مرزا صاحب کے سامنے پیش کروں۔

مولوی صاحب جو فخر ومباہات سے کام لے رہے تھے۔اور بار بار کہہ رہے تھے۔کہ میں نے مولوی نورالدینؓ کو یوں رگیدا۔اسے اس طرح پکڑا۔اور اس طرح گرایا۔ان کے تو یہ بات سنتے ہی حواس اڑ گئے۔اور جوش میں کہنے لگے تجھے کس پاگل اور جاہل نے کہا تھا۔کہ تو اس معاملہ میں دخل دیتا۔مَیں دو مہینے بحث کر کے مولوی نورالدینؓ کو حدیث کی طرف لایا تھا۔تو پھر اس مسئلہ کو قرآن کی طرف لے گیا ہے۔یہ اتنا گندہ فقرہ تھا کہ میاں نظام الدین صاحب جو اپنے دل میں اسلام کی محبت رکھتے تھے۔اسے برداشت نہ کر سکے۔تھوڑی دیر تک حیرت سے ان کا مونہہ دیکھتے رہے۔اور پھر کہنے لگے مولوی صاحب اگر یہی بات ہے۔تو پھر جدھر قرآن ہے ادھر ہی میں ہوں۔چنانچہ وہ وہاں سے واپس آئے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیعت میں شامل ہو گئے (حیات احمد از یعقوب علی عرفانی صفحہ ۱۴۳ تا ۱۴۵) پس اس آیت کے ایک یہ بھی معنی ہیں کہ وہ بدری وجود قرآن پیش کرے گا۔مگر وہ اُسے ضعیف حدیثوں اور لوگوں کے اقوال کی طرف لانے کی کوشش کریں گے۔اسی طرح اس کے

یہ بھی معنے ہیں کہ اس وقت قرآن آسمان پر جاچکا ہوگا۔ تب ایک بدری وجود قرآن کو پھر واپس لائے گا۔ مگر یہ لوگ ایسے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا اس عظیم الشان نعمت کے واپس ملنے پر بھی کوئی شکر ادانہیں کریں گے۔ کہ اس نے ان پر کتنا بڑا رحم کیا۔ کتنا بڑا انعام کیا۔ کہ ان کے مذہب کو اس نے بچا لیا۔ اور انہیں ہلاکت کے گڑھے میں گرتے گرتے تھام لیا۔

اگر یہ معنی نہ کئے جائیں تو قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ کا وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کے ساتھ کوئی جوڑ ہی نہیں بنتا لیکن ہم حدیث صحیح سے اس کا جوڑ بتا سکتے ہیں۔ جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ بیان فرمایا ہے کہ آخری زمانہ میں قرآن کی تعلیم مٹ جائے گی۔ ایمان ثریا پر چلا جائے گا لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم) اسلام کا صرف نام اور قرآن کا صرف رسم الخط باقی رہ جائے گا۔ معارف اور حقائق اور علوم سب آسمان پر اٹھ جائیں گے تب ایک فارسی الاصل انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوگا جو ایمان کو ثریا سے واپس لائے گا۔ اور قرآنی علوم کو زندہ کر دے گا۔ پس ہم اس آیت کے جو معنے کرتے ہیں وہ پورے طور پر یہاں چسپاں ہو جاتے ہیں۔ لیکن اور لوگ اس کے کیا معنی کر سکتے ہیں۔ وہ شفق اور لیل اور قمر کے ساتھ قرآن کا کوئی جوڑ بتا ہی نہیں سکتے۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۳﴾

بلکہ (بات اتنی بڑھ گئی ہے کہ) جنہوں نے اس قرآن کا کفر کیا ہے۔ وہ تو (اسے) جھٹلاتے ہیں۔

تفسیر ۔ بَلْ کے معنی زیادتی کے ہیں یعنی صرف یہی بات نہیں کہ وہ قرآن کے دوبارہ نزول پر خدا تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر ادانہیں کرتے۔ اور اس کی فرمانبرداری نہیں کرتے۔ بلکہ الٹے تکذیب کرنے لگ جاتے ہیں۔ یعنی بجائے اطاعت شعاری سے کام لینے کے وہ اس موعود کی تکذیب کریں گے۔ وہ قرآن کی آیتیں پیش کرے گا۔ مگر یہ لوگ کہیں گے ہم ان آیتوں کو نہیں مانتے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿۲۴﴾

اور اللہ اسے جسے وہ (اپنے دلوں میں) چھپائے ہوئے ہیں۔ خوب جانتا ہے۔

حَلّ لُغَات۔ يُوْعُوْنَ يُوْعُوْنَ اَوْعٰى سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور اَوْعَى الشَّيْءَ وَالْكَلَامَ کے معنی ہوتے ہیں حَفِظَهٗ وَجَمَعَهٗ کسی کلام کو یاد کیا۔ اور اکٹھا کیا۔ اور جب اَوْعَى الزَّادَ وَالْمَتَاعَ کہیں تو معنی ہوتے ہیں جَعَلَهٗ فِي الْوِعَاءِ وَجَمَعَهٗ فِيْهِ کہ سامان کو تھیلے میں رکھا اور محفوظ کیا۔ (اقرب) پس يُوْعُوْنَ کے معنی ہوں گے (۱) حفظ کرتے ہیں اور جمع کرتے ہیں (۲) محفوظ کرتے ہیں۔

تفسیر۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا کچھ بھرا ہوا ہے۔ قرآن ان کے دلوں سے نکل جائے گا۔ اور یہی باقی رہ جائے گا کہ فلاں نے یہ کہا ہے فلاں نے یہ لکھا ہے۔ يُوْعُوْنَ کے ایک معنی حفظ کے بھی ہیں۔ چنانچہ اَوْعَى الشَّيْءَ اَوِ الْكَلَامَ کے معنی ہوتے ہیں حَفِظَهٗ وَجَمَعَهٗ اس نے حفظ کیا۔ اور جمع کیا۔ پس وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے دوسروں کے اقوال جو حفظ کر رکھے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو خوب جانتا ہے۔ یا ان کے دلوں میں جو کچھ بھرا ہے اسے وہ خوب جانتا ہے۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۵﴾

پس (ان کے مخفی خیالات اور ظاہر اعمال کی وجہ سے) انہیں دردناک عذاب کی خبر دے دے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے ہم نے تو ان کو فائدہ پہنچانے کے لئے یہ سب انتظام کیا تھا ہم چاہتے تھے کہ نور سے ان کو حصہ ملے۔ اور خدا تعالیٰ کے قرب کی راہوں پر چلنا ان کے لئے آسان ہو۔ مگر وہ تاریکی کے کونوں میں بیٹھے رہے۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کے نور سے مونہہ پھیر لیا۔ اس کی برکات کو رد کر دیا۔ اور خدا تعالیٰ کے احسان پر سجدۂ شکر ادا کرنے کی بجائے اس کی آیات کی تکذیب کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بہت بڑے دکھ میں مبتلا کئے جائیں گے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ

مگر وہ (لوگ) جو ایمان لائے۔ اور انہوں نے مناسب حال عمل کئے۔ انہیں ایک نہ ختم ہونے والا (نیک)

غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ ع

اجر ملنے والا ہے۔

حَلِّ لُغَات۔ **اَلْمَمْنُوْنُ** اَلْمَمْنُوْنُ کے معنی ہیں اَلْمَقْطُوْعُ کٹا ہوا (اقرب) پس غَيْرُ مَمْنُوْنٍ کے معنی ہوں گے غیر مقطوع۔

تفسیر۔ **حضرت مسیح موعود کی ماتحتی کے بغیر کوئی روحانی ترقی نہیں کر سکتا** اس آیت کے وہی معنی ہیں جن کی طرف حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی کتب میں اشارہ فرمایا ہے کہ آیندہ کوئی شخص خدا تعالیٰ کے قرب اور اس کی ولایت کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ مگر وہی جو میری جماعت میں شامل ہوگا۔ اور میری اقتدا اور متابعت کا دم بھرے گا۔ آیندہ زمانہ میں اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نبی بھی مبعوث ہوگا۔ تو اس کے لئے ضروری ہوگا۔ کہ وہ مسیح موعود کے دروازہ میں سے گزرے۔ بے شک شکل میں تبدیلی آ جائے گی۔ مگر اس کا تعلق مسیح موعود سے منقطع نہیں ہوگا۔ جس طرح محمدی نور کبھی منقطع نہیں ہو سکتا اسی طرح اس نور کا سلسلہ اب قیامت تک منقطع نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں یہاں مومنوں کی جماعت کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر جماعت درحقیقت نبی کے تابع ہوتی ہے۔ اور چونکہ مسیح موعود اب قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لئے مسیح موعود اور خدا کے رسول ہیں۔ اس لئے اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ آیندہ جو بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرب ہونا چاہے گا۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ مسیح موعود کے واسطہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے۔ اور مسیح موعود کے واسطہ سے ہی خدا تعالیٰ تک پہنچے۔ اس کے بغیر کوئی انسان الٰہی برکات کو حاصل نہیں کر سکتا۔

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ بروج۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وَهِيَ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ اِثْنَتَانِ وَ عِشْرُوْنَ اٰيَةً

اور اِس کی بسم اللہ کے سوا بائیس آیات ہیں۔

سورۃ بروج مکی ہے یہ سورۃ بھی پہلی چند سورتوں کے تسلسل میں ہے اور مکّی سورۃ ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ لَا خِلَافَ فِيْ مَكِّيَّتِهَا اس کے مکّی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن انگریز مصنفین نے اس میں ایک شبہ پیدا کیا ہے۔ نولڈکے جرمن مستشرق اِسے زمانۂ اوّل کے پہلے دَور یعنی ابتدائی اَڑھائی سال کے اندر کی قرار دیتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مَا نَقَمُوْا سے لے کر ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ تک بعد کی ہیں۔ بعد کی آیات سے یہ مراد نہیں کہ کسی اور نے ملا دی ہیں۔ بلکہ اس کے نزدیک مدنی زندگی میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ملائی ہیں۔ وہ کہتا ہے اِن آیتوں کی عبارت مکّی عبارتوں سے مختلف ہے۔ کیونکہ یہ آیتیں باقی آیتوں سے لمبی ہیں اور مدنی سورتوں سے ملتی ہیں۔

مستشرقین کا مکی اور مدنی آیات میں تمیز کرنے کا ایک بے ہودہ طریق وہیری اس پر ایک اور بات زائد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اِس سورۃ میں مومنات کا لفظ آیا ہے۔ جیسا کہ آتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ اور مومنات کا لفظ مدنی سورتوں میں ہی مروّج ہوا ہے مکّی سورتوں میں نہیں۔ اس طرح نولڈکے کے خیالات کی وہ تصدیق کرتا ہے۔ نولڈکے کا خیال ہے کہ آٹھویں آیت سے لے کر گیارھویں آیت تک مدنی زمانہ کی آیات ہیں۔ جہاں تک مکّی اور مدنی آیتوں کا سوال ہے ہمیں اِس بحث سے کوئی تعلق نہیں کہ کوئی آیت مکّی ہے یا مدنی۔ ہمارے نزدیک ہر آیت خدا تعالیٰ کی نازل کی ہوئی ہے اور ہر آیت ہمارے لئے قابلِ عمل ہے خواہ وہ مکّہ میں نازل ہوئی ہو یا مدینہ میں۔ اس لئے ان کے مکی یا مدنی ہونے سے ہمارے نزدیک کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اور اگر منکرین اسلام کے نظریہ کو لو تو اُن کے نزدیک ہر آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ اس لئے اُنہیں بھی اِس بحث سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کہ کوئی آیت مکّی ہے یا مدنی۔ لیکن یہ بتانے کے لئے کہ مستشرقینِ یورپ اسلام کے متعلق بعض دفعہ کیسی رکیک اور بے بنیاد باتیں بیان کرتے ہیں۔ مَیں اس اعتراض پر بحث کرتا ہوں۔

جہاں تک مَیں سمجھتا ہوں نولڈکے کا یہ دعویٰ خلافِ عقل ہے۔ کیونکہ چند آیات کے ذرا لمبا ہو جانے سے اُن کے بعد میں نازل ہونے کا کوئی ثبوت نہیں نکل سکتا۔ آخر قرآن کریم کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ سارے کا سارا اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ اور نولڈکے اور اُس کے ساتھیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ سارا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا ہے۔ بہرحال کسی تیسرے شخص کا تو یہاں سوال ہی نہیں۔ اب اگر یہ بات مان لی جائے کہ قرآن سارے کا سارا خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے تو یہ کہنا کہ مدینہ میں خدا تعالیٰ لمبی آیتیں نازل کر سکتا تھا لیکن مکّہ میں نہیں حماقت ہے اور اگر اس نظریہ کو لے لیا جائے کہ تمام سورتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی بنائی ہوئی ہیں تب بھی نولڈکے اور دوسرے مستشرقین کا یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں لمبی آیتیں نہیں بنا سکتے تھے لیکن مدینہ میں بنا سکتے تھے بے ہودہ بات ہے۔ کسی حکمت کے ماتحت اگر عام طور پر مکّی آیتیں چھوٹی ہیں تو اس کے یہ معنے نہیں کہ اِن آیات کو بنانے والا لمبی آیتیں ضرورت کے موقع پر نہیں بنا سکتا تھا۔ پس عقلی طور پر یہ دعویٰ بالکل باطل ہے۔

واقعات کے لحاظ سے بھی یہ بات درست ثابت نہیں ہوتی اس لئے کہ مومنات کا لفظ جس پر وہیری نے بنیاد رکھی ہے اور کہا ہے کہ یہ صرف مدنی سورتوں میں آیا ہے مکّی سورتوں میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ سورۂ نوح کی آیت ہے رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا (نوح:۲۹) یہاں مومنات کا لفظ بھی آیا ہے اور یہ آیت بھی لمبی ہے۔ گویا دونوں باتیں اِس آیت میں پائی جاتی ہیں۔ اور سورۂ نوح وہ سورۃ ہے جس کے مکی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ فتح البیان کا مصنّف لکھتا ہے۔ اِنَّهَا مَكِّيَّةٌ قَالَ الزُّبَيْرُ نَزَلَتْ بِمَكَّةَ یعنی سورۂ نوح مکّی ہے اور حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ یہ مکّہ میں نازل ہوئی تھی۔ روح المعانی کے مصنف لکھتے ہیں مَكِّيَّةٌ بِالْاِتِّفَاقِ اِس پر سب اتفاق کرتے ہیں کہ سورۂ نوح مکّی ہے۔ نولڈکے جو سورۂ بروج کی بعض آیتوں کے لمبا ہونے سے یہ استدلال کرتا ہے کہ وہ مدنی ہیں وہ بھی سورۂ نوح کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ پہلے پانچ سال کی سورتوں میں سے ہے۔ اور وہیری جو مومنات کے لفظ کی وجہ سے سورۂ بروج کی آیات کو مدنی قرار دیتا ہے وہ بھی سورۂ نوح کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ ساتویں سال نبوّت کی ہے۔ پس نولڈکے اور وہیری کی اپنی شہادتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ مکّی سورتوں میں مومنات کا لفظ بھی آتا ہے اور اس کی بعض آیات لمبی بھی ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ سورۂ بروج کے متعلق جو انہوں نے استدلال کیا تھا وہ محض ایک ڈھکونسلہ تھا اور ڈھکونسلہ چونکہ یاد نہیں رہتا اِس لئے کسی موقع پر کچھ نتیجہ نکال لیا اور کسی موقع پر کچھ۔

بات یہ ہے کہ قرآن کریم کے متعلق مستشرقینِ یورپ جس چیز کو دلیل قرار دیتے ہیں وہ محض ظنّ اور تخمین ہوتی

ہے۔ اور ہمارے ہندوستانی نَوتعلیم یافتہ جب کوئی بات اُن کے مُنہ سے سُنتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ وہ وحی الٰہی سے بھی زیادہ مقدّس ہے۔ حالانکہ اگر غور سے کام لیا جائے تو ایک ڈھکو نسلے سے زیادہ اُس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ①

(مَیں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ② وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ③

(مجھے) قسم ہے بُرجوں والے آسمان کی۔ اور اُس دن کی بھی جس کا وعدہ ہے۔

حَلّ لُغَات ۔ بُرُوْجٌ بُرُوْجٌ بُرْجٌ کی جمع ہے۔ اور بُرْجٌ کے معنے عربی زبان میں اَلرُّکْنُ وَالْحِصْنُ وَالْقَصْرُ کے ہیں۔ یعنی عمارت کے مضبوط حصّہ یا قلعہ یا محل کو بُرج کہتے ہیں۔ نیز ستاروں کی گردش کی جگہ کو بھی بُرج کہتے ہیں (اقرب) اسی طرح کہتے ہیں بَرِجَتْ عَيْنُهٗ بَرَجًا كَانَ بَيَاضُهَا مُحْدِقًا بِالسَّوَادِ كُلِّهٖ لَا يَغِيْبُ مِنْ سَوَادِهَا شَيْءٌ فَهِيَ بَرْجَاءُ وَجَمْعُهَا بُرْجٌ۔ یعنی جب آنکھ کے متعلق بَرِجَتْ کا لفظ استعمال کریں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ آنکھ کی سیاہی کا اس کی سفیدی نے چاروں طرف سے خوب گھیرا کیا ہوا ہے اور وہ عورت جس کی آنکھ اِس قسم کی ہو اس کو بَرْجَاءُ کہتے ہیں۔ اور بہت سی عورتوں کو بُرْجٌ کہتے ہیں۔ اِسی سے یہ محاورہ ہے کہ رَأَيْتُ بُرْجًا فِيْ بُرْجٍ یعنی مَیں نے ایک قلعہ میں بہت سی خوبصورت عورتیں دیکھیں جن کی آنکھوں کی سفیدی نے اُن کی آنکھوں کی سیاہی کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ (اقرب) گو یا بُرْجٌ مفرد بھی ہے اور اِس کے معنے رُکْنٌ ۔ حِصْنٌ ۔ اور قصرٌ کے ہیں اور بُرْجٌ جمع بھی ہے جس کا مفرد بَرْجَاءُ ہے۔ اور اِس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ عورت جس کی آنکھوں کی سفیدی سیاہی کے چاروں طرف ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بعض عورتوں کی آنکھوں کی سیاہی ساری آنکھ میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُس کی آنکھیں بڑی ہیں پُتلی خوب کھلتی ہے اور سفیدی نظر آجاتی ہے۔

تفسیر ۔ **بروج سے مراد بارہ ستاروں کے بارہ مقامات** فرماتا ہے ہم شہادت کے طور پر آسمان کو پیش کرتے ہیں جو بروج والا ہے۔ یہ بروج کیا ہے؟ مفسرین نے اِس سے مراد علمِ ہیئت کے بروج لئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں بارہ ستاروں کے لئے بارہ بُرج ہوتے ہیں جن کے نام یہ ہیں (۱) اَلْحَمَلُ (۲) اَلثَّوْرُ (۳) اَلْجَوْزَاءُ (۴) اَلسَّرَطَانُ (۵) اَلْاَسَدُ (۶) السُّنْبَلَةُ (۷) اَلْمِيْزَانُ (۸) اَلْعَقْرَبُ (۹) اَلْقَوْسُ

(۱۰) اَلْجِدِّیُّ (۱۱) اَلدَّلْوُ (۱۲) اَلْحُوْتُ۔

بعض کہتے ہیں کہ سات سیّارے اِن بارہ بُرجوں میں چکّر کھاتے ہیں۔ اور گو بروج بارہ ہی ہیں مگر خصوصیت کے لحاظ سے وہ سات سیّاروں سے مخصوص ہیں۔ چنانچہ (۱) مریخ کے لئے حمل اور عقرب (۲) زہرؔہ کے لئے ثور اور میزان (۳) عطاردؔ کے لئے ہیں جوزاء اور سُنبلہ (۴) قمر کے لئے سرطان (۵) شمسؔ کے لئے اسد (۶) مشتریؔ کے لئے قوس اور حُوت (۷) زحلؔ کے لئے جدّی اور دَلْو مخصوص ہیں۔

ابن مردویہ جابر بن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ بروج کیا چیز ہیں تو آپؐ نے فرمایا اَلْکَوَاکِبُ (روح المعانی زیر آیت ھذا) یعنی اُن سے مراد کواکب ہیں۔ غرض بُرج کا لفظ لُغت کے لحاظ سے ایسے مقام کے لئے بولا جاتا ہے جہاں بادشاہ یا اُمراء ٹھہرتے ہوں۔ اور علم ہیئت والوں کی اصطلاح میں جو رائج ہو چکی ہے بُرج یا تو ستاروں کو اور یا پھر سیّاروں کی گردش کے دائرہ کو کہتے ہیں جہاں وہ گردش کرتے ہیں۔ بہرحال پرانی ہیئت اِس بات پر متفق ہے کہ بُرج بارہ ہیں۔ اِس بناء پر آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم شہادت کے طور پر آسمان کو پیش کرتے ہیں جس میں بارہ بُرج ہیں۔ یعنی بارہ ایسے مقام ہیں جہاں ستارے ٹھہرتے ہیں۔

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ اور پھر ہم شہادت کے طور پر یومِ موعود کو پیش کرتے ہیں۔ اگر بُرج کے معنے بارہ مقامات کے لئے جائیں تو یہ یومِ موعود تیرھواں مقام ہوا۔ گویا بارہ مقاموں کو بھی اور یوم موعود کو بھی اللہ تعالیٰ شہادت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اور بارہ اور یومِ موعود مل کر تیرہ ہو گئے۔ جب ہم اس کو وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ والی آیت سے ملاتے ہیں تو پہلی سورت سے اس کی ترتیب بالکل واضح ہو جاتی ہے وہاں فرمایا تھا ہم شہادت کے طور پر چاند کو پیش کرتے ہیں جب وہ تیرہویں رات میں داخل ہوتا ہے۔ اور یہاں فرمایا گیا ہے ہم بارہ بروج اور یومِ موعود کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ پس یہاں بھی تیرہ زمانوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرما دیا۔ اور اس طرح اس کا ایک گہرا تعلق پچھلی سورۃ سے ثابت ہو گیا۔

سورۂ بروج کا پہلی سورۃ سے تعلق یہاں درحقیقت اُس مضمون کو بیان کیا گیا ہے جو پچھلی سورۃ میں بیان کیا گیا تھا۔ مگر شکل اور ہے۔ اور جو کچھ پچھلی سورۃ میں بیان کیا گیا تھا اُس کی صداقت کی ایک دلیل بھی اِس سورۃ میں بیان کی گئی ہے۔ پچھلی سورۃ میں فرمایا تھا فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ایمان نہیں لاتے۔ جو چیز اپنی ابتدائی حالت میں ہوتی ہے اُس پر ایمان لانا لوگوں کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اِس سورۃ کو شروع ہی اِس رنگ میں کیا ہے کہ ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اُن بارہ مقامات کو جہاں ستارے آکر

ٹھہرتے ہیں۔ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بارہ صدیوں میں مختلف مجددین ظاہر ہوئے اور وہ الٰہی منشاء کے مطابق تجدیدِ دین کا کام کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ اُن مجددین کی بعثت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ اگر ہم اُمّتِ محمدیہ کے تھوڑے سے اختلاف اور اسلام اور مسلمانوں کی تھوڑی سی مصیبت کو دُور کرنے کے لئے مجددین مبعوث کرتے رہے ہیں تو یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ اسلام پر ایک بھاری مصیبت آجائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کو دُور کرنے کا کوئی سامان نہ ہو۔

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ میں آخری زمانہ میں بارہ مجددین کے بعد ایک مامور کے مبعوث کئے جانے کی پیشگوئی

پس وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ کو فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کے جواب میں مخالفین کے سامنے ایک دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم آسمان کو اور اُس کے بارہ مقامات کو تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جن میں ستاروں نے قیام کیا یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے مختلف مجدد مبعوث ہوتے رہے۔ مجددین کے اِس متواتر اور پے درپے ظہور کے بعد تیرہویں مقام پر آ کر تمہیں کیوں مایوسی پیدا ہوگئی اور کیوں تم نے یہ خیال کر لیا کہ اللہ تعالیٰ اب لوگوں کی ہدایت کے لئے اپنے کسی مامور کو مبعوث نہیں کرے گا۔ تمہارے پاس شہادت موجود ہے کہ پہلی صدی آئی اور اُس میں خدا تعالیٰ نے ایسے آدمی کھڑے کئے جو تجدیدِ دین کا کام کرتے رہے۔ دوسری صدی آئی اور اُس میں خدا تعالیٰ نے ایسے آدمی کھڑے کئے۔ تیسری صدی آئی تو پھر یہی واقعہ ہوا۔ چوتھی صدی آئی تو پھر بھی ایسا ہی ہوا اور یہ سلسلہ چلتا چلا گیا یہاں تک کہ بارہ صدیوں میں بارہ دفعہ تمہارے لئے خدا تعالیٰ نے یہ ثبوت مہیّا کیا کہ وہ اپنے دین کی مدد اور اُس کی نصرت کے لئے ہمیشہ ایسے آدمی کھڑے کیا کرتا ہے جو اُس کی طرف سے مظفّر و منصور ہوتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم دنیا میں پھیلاتے ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ بارہ جو غیر موعود تھے اُن کو تو تم نے مان لیا مگر تیرہواں جو موعود تھا اُس کی بعثت کو تسلیم کرنے سے تم نے انکار کر دیا۔ حالانکہ باقی وہ ہیں جن کے متعلق محض مبہم الفاظ میں خبر دی گئی تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے متعلق صرف اتنا فرمایا تھا کہ اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا (سنن ابی داؤد کتاب الملاحم باب مایذکر فی قرن المائة) مگر تیرہویں کا نام لے کر بتایا گیا تھا کہ وہ ایسا ایسا ہوگا اِس اِس طرح کے کام کرے گا اِن اِن علامات کے ساتھ آئے گا۔ یہ یہ نشانات اُس کی صداقت میں ظاہر ہوں گے۔ پس وہ غیر موعود جو ایک مبہم خبر کے نتیجہ میں ظاہر ہوئے تھے تم نے اُن کو تو مان لیا مگر وہ جس کا نام لے کر خدا نے خبر دی تھی۔ جس کی بعثت کے اُس نے نشانات بتائے تھے۔ جس کی تعیین کے کئی شواہد

بتائے گئے تھے۔ جس کا وقت اور جس کا زمانہ تک پیشگوئیوں میں معیّن کر دیا گیا تھا تم نے اُس کا انکار کر دیا۔ بلکہ مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت کے بعد انہوں نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کے لئے کسی مصلح کی ضرورت ہی نہیں۔ فرماتا ہے تم کو آج بارہ صدیوں کے بعد یہ بات سُوجھی ہے۔ بارہ صدیوں تک تم مانتے چلے آئے کہ احیاءِ اسلام کے لئے مجدّد دین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام کی ترقی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی انسان کے مبعوث ہونے کی احتیاج ہوتی ہے۔ مگر جب تیرہویں صدی آئی اور اُس میں ہم نے اپنا موعود مامور بھیج دیا تو تم نے اس کا انکار کر دیا۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ ہمیں کسی مصلح کی ضرورت ہی نہیں۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ اُن کو کیا ہو گیا کہ جو ہمارا موعود مامور تھا جس کی تفصیلات ہم نے پہلے سے بتا دی تھیں جس پر ایمان لانے کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر تاکید فرمائی تھی۔ جس کے درجہ اور شان کی تفخیم بڑی کثرت سے بیان کی گئی تھی اُس پر ایمان لانے سے اِن لوگوں نے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ یہ بات ہی غلط ہے کہ اسلام اپنی ترقی کے لئے آسمانی وجودوں کی بعثت کا محتاج ہے۔ فرماتا ہے ہم اسلام کی ترقی کے لئے بارہ بروج کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ غور کرو اور دیکھو کہ کس طرح ایک ایک قدم پر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی مدد فرمائی اور کفر کے حملوں کو نابود کرنے کے لئے اپنے مقدس لوگ کھڑے کرتا رہا۔ پھر جب تیرہویں صدی آئی تو ہم نے اُس زمانہ میں بھی اپنا وہ موعود بھیج دیا جس کی ہم خبر دیتے چلے آئے تھے۔ خدا تعالیٰ کی قدرت ہے ہم پر قرآن کریم کی آیات کے یہ مطالب تو بعد میں کُھلے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام ہی ہماری جماعت میں مسیح موعودؑ پڑ گیا ہے۔ جس کے معنے یہی ہیں کہ یومِ موعود میں ظاہر ہونے والا مسیحؑ۔ جس احمدیؐ سے بھی سنو۔ خواہ وہ عالم ہو یا جاہل۔ پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ۔ اُسے یہی کہتے پاؤ گے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یوں کہا۔ یا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کی یہ دلیل ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آپؑ کا نام ہی مسیح موعود رکھ دیا۔ اور یہ لفظ اتنی کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ کہ مہدی کا لفظ بھی غائب ہو گیا ہے۔ حالانکہ مہدی کا لفظ حدیثوں میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ مگر چونکہ قرآن کریم میں اس کو موعود قرار دیا گیا تھا اس لئے خدا نے اپنے تصرّف سے مسیح موعودؑ کے الفاظ دنیا میں رائج فرما دیئے۔

یوم موعود سے مراد حدیثوں میں آتا ہے عَنِ ابْنِ اَبِیْ حَاتِمٍ وَابْنِ جَرِیْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْیَوْمُ الْمَوْعُوْدُ یَوْمُ الْقِیَامَۃِ وَشَاھِدٌ یَوْمُ الْجُمُعَۃِ وَمَشْھُوْدٌ یَوْمُ الْعَرَفَۃِ

وَشَاهِدٌ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَشْهُوْدٌ يَوْمُ الْقِيَامَةِ۔ (ابن کثیر زیر آیت شاھد و مشھود) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوم موعود یوم قیامت ہے۔ شاہد یوم جمعہ ہے۔ مشہود یوم عرفہ ہے۔ اسی طرح شاہد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مشہود قیامت کا دن ہے۔ اِس حدیث کی صحت سے ہم کو انکار نہیں۔ درحقیقت یوم موعود بہت سے ہیں۔ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ جنگ بدر کا دن بھی یوم موعود تھا کیونکہ اس جنگ کی قرآن کریم میں پیشگوئی موجود ہے۔ اِسی طرح جنگِ احزاب بھی موعود تھی کیونکہ اس کی پیشگوئی کی گئی تھی۔ فتح مکہ کا دن بھی یوم موعود تھا کیونکہ اِس فتح کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیشگوئی کی گئی تھی (القمر: ۴۶، الفتح: ۲، الاحزاب: ۱۲)۔ پس ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اور بھی کئی یوم موعود ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہاں جس یوم موعود کا ذکر ہے وہ ایسا موعود ہے جس نے اس واقعہ کے بعد آنا ہے جس کا ذکر ''ذات البروج'' میں ہے اور ''ذات البروج'' کے بعد آنے والا یوم موعود نہ قیامت کا دن ہوسکتا ہے اور نہ کوئی اور ہوسکتا ہے۔ بلکہ اِس جگہ وہی موعود مراد ہوسکتا ہے جس نے بارہ بروج کے بعد تیرہویں صدی میں ظاہر ہونا تھا۔ کسی لفظ میں اشتراک کے یہ معنے نہیں ہوا کرتے کہ اس لفظ کے ہر جگہ ایک ہی معنے لئے جائیں بلکہ وہ لفظ اپنے موقع اور محل کے مطابق الگ الگ معنے دے گا۔ پس بے شک بدر یوم موعود ہے۔ احزاب یوم موعود ہے۔ فتح مکّہ یوم موعود ہے۔ اور ہمیں اِس سے ہرگز انکار نہیں۔ مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ کے بعد جس موعود کا ذکر ہے وہ سوائے مسیح موعودؑ کے اور کوئی نہیں۔ اور وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ میں بھی اسی موعود کی خبر دی گئی تھی۔ اگر اِس جگہ یوم موعود سے مراد مسیح موعود نہیں تو سوال یہ ہے کہ وہ کون سی طاقت تھی جس نے اگلی اور پچھلی آیات میں ایسا جوڑ پیدا کر دیا کہ اُن سے جو بات بھی ثابت ہوتی ہے مسیح موعود پر چسپاں ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کا ایک طرف وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کہنا پھر وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ کہہ کر شہادت میں بُروج کو پیش کرنا اور پھر علمِ ہیئت کی طرف سے اِس تحقیق کا ہونا کہ بُروج بارہ ہیں یہ سب کچھ بتا رہا ہے کہ جو کچھ ہوا الٰہی تصرف کے ماتحت ہوا۔ اِسی طرح اگلی آیت میں شاہد اور مشہود کا ذکر آتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہد ہزاروں ہوئے ہیں بلکہ ہر نبی شاہد ہوتا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی بھی نبی ایسا ہوا ہے جس نے دلائل اور معجزات اور بیّنات سے اللہ تعالیٰ کے وجود کی گواہی پیش نہ کی ہو۔ یقیناً ہر نبی ایسا کرتا رہا۔ پس ہر نبی شاہد ہے۔ اِن معنوں میں کہ وہ خدا تعالیٰ کی ہستی اور اُس کی قدرت اور اُس کے جلال کا ایک زندہ گواہ ہوتا ہے۔ اور ہر نبی مشہود ہوتا ہے کیونکہ جب وہ دنیا میں آتا ہے خدا تعالیٰ اُس کی صداقت کے ثبوت مہیّا کرتا ہے۔ پس وہ خدا تعالیٰ کے لئے شاہد ہوتا ہے۔ اور چونکہ خدا اُس کی صداقت کے لئے نشانات و معجزات ظاہر کرتا ہے اس لئے وہ مشہود بھی ہوتا ہے۔ اِسی طرح ہر نبی کے زمانہ میں خدا شاہد ہوتا ہے

کیونکہ وہ نبی کی صداقت پر گواہ ہوتا ہے اور خدا مشہود بھی ہوتا ہے کیونکہ نبی کے ذریعہ اُس کا وجود دُنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس الہام میں اشارہ کیا گیا کہ یَاقَمَرُ یَاشَمْسُ اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَامِنْكَ (تذکرہ صفحہ ۵۵۳،ایڈیشن ۲۰۲۲ء) اے قمر اور اے شمس تُو مجھ سے ہے اور مَیں تجھ سے ہوں یعنی تُو قمر ہے ان معنوں میں کہ تُو نے جو کچھ نُور لیا مجھ سے لیا اور تُو شمس ہے اِن معنوں میں کہ تیرے وجود سے میرا وجود روشن ہوا۔ اِسی طرح مَیں شمس ہوں کیونکہ اگر مَیں تیری مدد نہ کرتا تو دُنیا میں تُو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکتا۔ اور مَیں قمر بھی ہوں کیونکہ مجھے تُو نے دنیا میں روشناس کرایا۔

پس جس طرح خدا شمس بھی ہوتا ہے اور قمر بھی اسی طرح نبی ایک حیثیت سے شمس ہوتا ہے اور دوسری حیثیت سے قمر ہوتا ہے۔ یہی حال شاہد اور مشہود کا ہے۔ ہر نبی شاہد ہوتا ہے اور خدا مشہود ہوتا ہے مگر دوسری طرف اِس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خدا شاہد ہوتا ہے اور نبی مشہود ہوتا ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ شاہد اور مشہود ہم کسی اور چیز کو نہیں قرار دے سکتے۔ خود اس حدیث میں جس کا مَیں نے ابھی ذکر کیا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم جمعہ کو شاہد اور یوم عرفہ کو مشہود قرار دیا ہے۔ دوسری طرف آپؐ نے قیامت کے دن کو مشہود قرار دے دیا ہے۔ پس تمام حدیثیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ ہم یوم القیامۃ کے یومِ موعود ہونے سے انکار نہیں کرتے۔ اسی طرح شاہد اور مشہود کے متعلق حدیثوں میں جو کچھ آتا ہے اُسے بھی تسلیم کرتے ہیں مگر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ یہاں کون سی بات چسپاں ہوتی ہے۔ یہاں یومِ موعود سے مراد زمانہ مسیح موعودؑ ہے یا قیامت کا دن ہے۔ صاف بات ہے کہ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ میں یہ بتایا گیا تھا کہ ایک سخت تاریک وتار راتـ کے بعد جو روحانی طور پر تمام دُنیا پر چھا جائے گی اللہ تعالیٰ ظہورِ قمر کو اتّساق کا مقام بخشے گا۔ اور لغتاً یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ قمر کے لئے اتّساق کا لفظ اُس وقت استعمال کرتے ہیں جب وہ تیرہویں رات کا ہو۔ گویا تیرہویں رات کے چاند کو شہادت کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سورۂ بروج میں پھر یہی ذکر فرمایا مگر اس رنگ میں کہ پہلے بارہ بروج کا ذکر فرمایا اور پھر تیرہویں نمبر پر یوم موعود کا۔ اِس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اِس جگہ یومِ موعود سے مراد وہی مسیح موعودؑ ہے جس کے لئے یہ مقدر کیا جا چکا تھا کہ وہ بارہ بروج کے بعد دُنیا میں مبعوث ہوگا۔

یوم کے معنے وقت کے ہوتے ہیں۔ اگر یہ معنے مراد لئے جائیں تو یوم موعود سے مراد وقت موعود ہوگا اسی طرح یومِ نہار یعنی معروف دن کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اِس صورت میں والیوم الموعود کے یہ معنے ہوں گے کہ گو مثال ہم رات کی دیتے چلے آئے ہیں مگر اپنی ذات میں وہ وقت دن کی طرح روشن ہوگا اس لئے ہم اُسے

یومِ موعود کہہ رہے ہیں کیونکہ اُس دن خدا تعالیٰ کا نور اور جلال ظاہر ہوگا۔

وَ شَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ ۝۴

اور (آسمانی) گواہ کی۔ نیز جس پر گواہی دی گئی ہے اُس (آسمانی وجود) کی بھی۔

تفسیر۔ شاہد کی تشریح قرآن مجید میں میرے نزدیک قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ شاہد کی جو تعریف فرما دی ہے وہی اِس جگہ چسپاں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ ہود میں فرماتا ہے اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۗ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (ھود:۱۸) یعنی کیا جو شخص اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر قائم ہے اور اُس کی صداقت کا ایک گواہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آ کر اس کی پیروی کرے گا اور اُس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب تھی جو لوگوں کے لئے امام و رحمت تھی ایک جھوٹے مدعی جیسا ہو سکتا ہے؟ اور موسیٰ کے سچے پیرو اس پر بھی ضرور ایمان لاتے ہیں۔ اور ان مخالف گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے گا تو دوزخ کی آگ اُس کے لئے وعدہ کی جگہ ہے۔ پس اے مخاطب تو اس کے متعلق کسی قسم کے شک میں نہ پڑ وہ یقیناً بالکل حق ہے اور تیرے رب کی طرف سے ہے۔ لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لایا کرتے۔

شاہد سے مراد مسیح موعودؑ اِس آیت میں شَاهِدٌ مِّنْهُ کے ذریعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کی خبر دی گئی ہے۔ پس شاہد مسیح موعود ہیں اور مشہود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اِس جگہ بیان فرمائی ہے کہ ہم شہادت کے طور پر اُس شاہد کو پیش کرتے ہیں جس کا دوسری جگہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اسی طرح ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو پیش کرتے ہیں۔ پس شاہد سے مراد یہ ہے کہ اُس زمانہ میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت لوگوں کے قلوب سے مٹ چکی ہوگی وہ اِس بات کی گواہی دے گا کہ آپؐ سچے ہیں اور قرآن کریم کی صداقت لوگوں پر واضح کرے گا۔

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ﴿۵﴾ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ﴿۶﴾

خندقوں والے ہلاک ہو گئے۔ یعنی (خندقوں میں) آگ (بھڑکانے والے) جس میں (خوب) ایندھن (جھونکا

اِذۡ هُمۡ عَلَیۡهَا قُعُوۡدٌ ۙ﴿۷﴾ وَّ هُمۡ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ

گیا) تھا۔ جب وہ اس (آگ) پر (دھرنا مار کر) بیٹھے ہوئے تھے۔ اور وہ مومنوں سے جو کچھ (معاملہ)

بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ شُهُوۡدٌ ؕ﴿۸﴾

کر رہے تھے آنکھیں کھولے کر رہے تھے۔

حَلّ لُغَات۔ اَلۡاُخۡدُوۡدُ اَلۡاُخۡدُوۡدُ کے معنے ہیں۔ اَلۡحُفۡرَۃُ الۡمُسۡتَطِیۡلَۃُ فِی الۡاَرۡضِ۔ زمین میں لمبا کھدا ہوا گڑھا۔ (اقرب) اِس کی جمع اَخَادِیۡد آتی ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے ہلاک ہو گئے یا ہلاک کئے جائیں گے اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ یعنی خندقوں والے۔ النَّارِ۔ وہ خندقیں جو نار پر مشتمل ہوں گی ایسی نار پر جو ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ہوگی۔ ایندھن والی ہوگی۔ یعنی ہماری مراد اِس اُخدود سے وہ آگ ہے جو اُخدود میں جلائی جائے گی۔ گویا ہلاکت کا اصل سبب خندق کھودنا نہیں بلکہ خندق میں آگ جلا کر لوگوں کو مبتلائے تعذیب کرنا ہوگا۔ اِذۡ هُمۡ عَلَیۡهَا قُعُوۡدٌ جبکہ وہ اُس پر بیٹھیں گے۔ وَ هُمۡ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ شُهُوۡدٌ اور وہ جو کچھ مومنوں کے ساتھ کر رہے ہوں گے اُس پر وہ حاضر اور نگران ہوں گے۔

اصحاب الاخدود کے متعلق سابق مفسرین کے خیالات اور ان کی تردید اِن آیات کے متعلق مفسرین نے دو باتیں بیان کی ہیں۔ اوّل یہ کہ ایسے سینیاء کا ایک بادشاہ تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے بعض لوگوں کو جو توحید پر قائم تھے عذاب دیا اور بعض نے لکھا ہے کہ یہ دانیال اور اُس کے دو ساتھیوں کے متعلق ہے جن کو بخت نصر نے عذاب دیا تھا۔ (روح المعانی زیر آیت ھذا) مَیں حیران ہوں کہ مفسّرین نے یہ کس طرح لکھ دیا۔ اصل میں یہ بائیبل کا بیان کردہ واقعہ ہے اور وہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ دانیال کی کتاب میں اس کا ذکر موجود ہے۔ دانیال باب ۳ میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے۔

''اور نبوکدنضر بادشاہ نے ایک سونے کی مُورت بنوائی جس کی لمبائی ساٹھ ہاتھ اور چوڑائی چھ

ہاتھ کی تھی۔ اور اُسے دُورا کے میدان صوبہ بابل میں نصب کیا۔ تب نبوکدنضر بادشاہ نے لوگوں کو بھیجا کہ امیروں اور حاکموں اور سرلشکروں اور منصفوں اور خزانچیوں اور مشیروں اور مجتہدوں اور سارے صوبوں کے منصب داروں کو جمع کریں تا کہ وَے اُس مورت کی جسے نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا تھا تقدیس کرنے کو آویں۔ تب امیر اور حاکم اور سرلشکر اور منصف اور خزانچی اور مشیر اور مجتہد اور صوبوں کے سارے منصب دار اُس مورت کی تقدیس کے لئے جسے نبوکدنضر نے نصب کیا تھا جمع ہوئے اور وَے اُس مُورت کے آگے جسے نبوکدنظر نے نصب کیا تھا کھڑے ہوئے۔ تب ایک منّاد نے بلند آواز سے پکارا کہ اے قومو! اے گروہو! اور اے مختلف لغتیں بولنے والو! تمہارے لئے یہ حکم ہے کہ جس وقت قرنائے اور نَے اور ستار اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے باجے کی آواز سنو تو اِس سونے کی مُورت کے آگے جسے نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا ہے اوندھے مُنہ گرو اور سجدہ کرو۔ اور جو کوئی اوندھے منہ نہ گرے اور سجدہ نہ کرے تو اسی گھڑی جلتی بھٹی کے بیچ میں ڈالا جائے گا۔ سو اُسی دم جس وقت ساری قوموں نے قرنائے اور نَے اور ستار اور رباب اور بربط اور ہر طرح کے باجے کی آواز سنی اُسی وقت ساری قومیں اور گروہیں اور زبان بولنے والے اُس مورت کے آگے جسے نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا تھا اوندھے منہ گرے اور انہوں نے سجدہ کیا۔ سو اُس وقت کئی ایک کسدی نزدیک آئے اور انہوں نے یہودیوں پر نالش کی۔ انہوں نے نبوکدنضر بادشاہ کے آگے عرض کی۔ اے بادشاہ! تا ابد جیتا رہ۔ اے بادشاہ تُو نے حکم کیا ہے کہ جو قرنائے اور نَے اور ستار اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے باجے کی آواز سُنے سو اُس سونے کی مُورت کے آگے زمین تک جھکے اور سجدہ کرے۔ اور جو کوئی زمین تک نہ جُھکے اور سجدہ نہ کرے سو ایک جلتی بھٹی کے بیچ میں ڈالا جائے گا۔ اب چند یہودی جنہیں تُو نے بابل کے صوبے کی کارپردازی پر متعین کیا ہے۔ یعنی سدرک اور میسک اور عبید نجُو۔ اِن آدمیوں نے تیری تعظیم نہیں کی ہے۔ وَے تیرے معبودوں کی عبادت نہیں کرتے ہیں اور اُس سونے کی مُورت کو جسے تُو نے نصب کیا سجدہ نہیں کرتے۔ تب نبوکدنضر نے قہر اور غضب سے حُکم کیا کہ سدرک اور میسک اور عبید نجُو کو حاضر کریں۔ سو اُنہوں نے اُن آدمیوں کو بادشاہ کے حضور حاضر کیا۔ نبوکدنضر نے ارشاد کیا اور اُنہیں کہا کہ اے سدرک اور میسک اور عبید نجُو! کیا یہ سچ ہے کہ تم لوگ میرے معبودوں کی عبادت نہیں کرتے ہو اور اُس سونے کی مُورت کو جسے مَیں نے نصب کیا سجدہ

نہیں کرتے۔ تس پر بھی اگر مستعدر ہو کہ جس دم کرنائے اور نئے اور ستار اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے باجے کی آواز سُنو تو اُسی دم اُس مورت کے آگے جسے مَیں نے کھڑا کیا اوندھے مُنہ گر پڑو اور سجدہ کرو تو بہتر۔ پر اگر سجدہ نہ کرو گے تو اُسی گھڑی ایک آگ کی جلتی بھٹی کے بیچ ڈالے جاؤ گے اور وہ خدا کون ہے جو تمہیں میرے ہاتھ سے چھڑاوے گا۔ سدرک اور میسک اور عبید نجُو نے جواب میں بادشاہ سے کہا کہ اے نبوکدنضر اِس مقدمے میں تجھے جواب دینا ہم ضرور نہیں جانتے۔ دیکھو تو۔ ہمارا خدا ہے جس کی عبادت ہم کرتے ہیں وہ ہمیں آگ کی جلتی بھٹی سے چھڑانے کی قدرت رکھتا ہے اور وہ اے بادشاہ تیرے ہاتھ سے ہم کو چھڑا دے گا اور نہیں تو اے بادشاہ! تجھے معلوم ہو کہ ہم تیرے معبودوں کی عبادت نہیں کریں گے اور اُس سونے کی مورت کو جسے تُو نے نصب کیا ہے سجدہ نہ کریں گے۔ تب نبوکدنضر غصّہ سے بھر گیا اور اُس کے چہرے کا رنگ سدرک اور میسک اور عبید نجُو پر مبدّل ہوا اور اُس نے حکم دیا کہ بھٹی کی آنچ اُس معمول سے جو اُس کا تھا ہفت چند زیادہ کریں۔ اور لشکر کے زور آور پہلوانوں کو حکم کیا کہ سدرک اور میسک اور عبید نجُو کو باندھیں اور جلتی بھٹی میں ڈال دیں۔ تب وَے اشخاص اپنی قبا اور زیر جامہ اور ٹوپی اور پوشاک سمیت باندھے گئے اور جلتی بھٹی کے بیچوں بیچ میں ڈالے گئے اس لئے کہ بادشاہ کا حکم تاکیدی تھا اور بھٹی کی آنچ نہایت زیادہ ہوئی۔ آگ کی لَو نے اُن لوگوں کو جنھوں نے سدرک اور میسک اور عبید نجُو کو اُٹھایا تھا ہلاک کیا اور یہ تین شخص یعنی سدرک اور میسک اور عبید نجُو باندھے ہوئے جلتی بھٹی کے درمیان گر پڑے۔ اُس وقت نبوکدنضر بادشاہ سراسیمہ ہوا اور اُس نے جلد اُٹھ کر ارکانِ دولت سے مخاطب ہو کر کہا۔ کیا ہم نے تین شخصوں کو بندھوا کر جلتی بھٹی میں نہیں ڈلوایا۔ انہوں نے جواب میں کہا۔ اے بادشاہ! سچ ہے۔ اُس نے جواب میں کہا۔ دیکھو چار شخص کھلے ہوئے آگ کے بیچ پھرتے دیکھتا ہوں اور اُنہیں کچھ ضرر نہ ہوا۔ اور چوتھے کی صورت خدا کے بیٹے سی ہے۔

تب نبوکدنضر نے آگ کی جلتی بھٹی کے دروازے پر آ کر پکارا کہ اے سدرک اور میسک اور عبید نجُو خدا تعالیٰ کے بندو باہر نکلو اور اِدھر آؤ تو سدرک اور میسک اور عبید نجُو آگ کے درمیان سے نکل آئے اور سارے امیروں اور حاکموں اور سرلشکروں اور بادشاہ کے مشیروں نے فراہم ہو کر اُن شخصوں پر نظر کی کہ آگ کی اُن کے بدنوں پر تاثیر نہ ہوئی تھی اور نہ اُن کے سر کا ایک بال جُھلس گیا اور نہ

اُن کی پوشاک میں مطلق کچھ فرق ہوا اور نہ آگ سے جلاہٹ کی بُو اُن پر سے معلوم ہوتی تھی۔ تب بنوکدنضر نے پکار کے کہا کہ سدرک اور میسک اور عبید نجُو کا خدا مبارک ہو جس نے اپنے فرشتے کو بھیجا اور اپنے بندوں کو جنہوں نے اُس پر توکل کر کے بادشاہ کے حکم کو ٹال دیا ہے اور اپنے بدنوں کو نثار کیا کہ سوا اپنے خدا کے دوسرے معبود کی عبادت اور بندگی نہ کریں چھڑایا ہے اس لئے مَیں حکم کرتا ہوں کہ جو قوم یا گروہ یا اہل لغت سدرک اور میسک اور عبید نجُو کے خدا کے حق میں کوئی نالائق سخن بولیں گے تو اُن کے ٹکڑے ٹکرے کئے جائیں گے۔ اور اُن کے گھر گھورے بن جائیں گے۔ کیونکہ کوئی دوسرا خدا نہیں جو اِس طرح چھڑا سکے۔ تب بادشاہ نے سدرک اور میسک اور عبید نجُو کو صوبہ بابل میں سرفراز کیا۔'' (دانی ایل باب ۳)

یہ ایک واقعہ ہے جو گزشتہ زمانہ میں ہوا۔ اور جس کو مفسرین نے بھی بیان کیا ہے وہ اس میں دانیال کو بھی شامل کر دیتے ہیں مگر یہ اُن کی غلطی ہے۔ اور اِس غلطی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُس وقت بائیبلیں کثرت سے نہیں تھیں اس لئے غلطی سے انہوں نے دانیال کو بھی اس میں شامل سمجھ لیا۔ بہر حال یہ ایک واقعہ ہے جو گزشتہ زمانہ میں ہوا۔ اُس میں ایک بھٹی کا بھی ذکر آتا ہے۔ یہ بھی آتا ہے کہ اس میں آگ جلائی گئی۔ یہ بھی آتا ہے کہ اُس میں تین آدمی پھینکے گئے۔ اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ اور اُس کے ساتھی اِس نظارہ کو دیکھتے رہے۔ اس حد تک تو درست ہے لیکن اِس کے واقعات پورے طور پر قرآنی واقعات سے نہیں تھے۔ کیونکہ قرآن کریم نے اُن کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ وہ آگ میں سے زندہ نکل آئے تھے۔ بائبل میں چونکہ مبالغہ بھی ہے اس لئے ممکن ہے اتنا حصہ بعد میں بڑھا لیا گیا ہو۔ اور اِس حد تک بات درست ہو کہ کچھ لوگوں کو محض اس لئے آگ کی بھٹی میں جلا دیا گیا ہو کہ وہ کیوں خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں۔

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ میں آئندہ زمانہ میں ہونے والے واقعات کی پیشگوئی ایسا ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے۔ اور ہر نبی کے وقت دشمنانِ دین کی طرف سے خدا تعالیٰ پر ایمان لانے والوں کو قِسم قِسم کے عذابوں میں مبتلا کیا گیا ہے۔ لیکن میرا یہ یقین ہے کہ جب اِس سورۃ کو وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ وَ الۡیَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ وَ شَاہِدٍ وَّ مَشۡہُوۡدٍ کے الفاظ سے شروع کیا گیا ہے تو شہادت کسی ایسے واقعہ کے متعلق ہی ہوتی ہے جو آئندہ زمانہ میں ہونے والا ہو۔ قرآن کریم میں تم یہ کہیں نہیں دیکھو گے کہ خدا نے کہا ہو میں سورج اور چاند کو اِس بات کی شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں کہ مَیں نے آدم ؑ بھیجا تھا۔ یا نوح ؑ بھیجا تھا۔ یا ابراہیم ؑ اور موسیٰ ؑ کو مبعوث کیا تھا۔ شہادت ایسے ہی امور کے متعلق

پیش کی جاتی ہے جو غیبی ہوں یا آئندہ زمانہ میں رُونما ہونے والے ہوں۔ پس جبکہ قرآن کریم میں کوئی قسم ایسی نہیں جو ماضی کے واقعات پر کھائی گئی ہو تو بائیبل کے اِس واقعہ کو قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ والی آیت پر چسپاں کرنا قرآنی طریق کے خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے۔

ایک تاریخی واقعہ جو گزر چکا ہے اُس پر اللہ تعالیٰ کو قَسم کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہو سکتی تھی۔ مَیں اِس کا مُنکر نہیں کہ گزشتہ زمانہ میں بھی کوئی ایسا واقعہ ہوا ہو۔ مَیں صرف یہ کہتا ہوں کہ اگر گزشتہ زمانہ میں کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے تو یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ ایسا ہی واقعہ پھر کوئی ہونے والا ہے۔ پس میرے نزدیک قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ۔ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ۔ اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ کے ذریعہ ایک دوسری پیشگوئی شروع کی گئی ہے۔ پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ مسیح موعودؑ ظاہر ہو گا اور اسلام کو غالب کرے گا۔ چنانچہ اِس کی دلیل یہ دی گئی تھی کہ ماضی شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ احیاءِ اسلام کے لئے ہمیشہ مجددین مبعوث کرتا رہا ہے۔ پس ضروری ہے کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے بالخصوص اس لئے کہ ہم ایک موعود کی بعثت کی خبر دے چکے ہیں۔ اب یہ بتاتا ہے کہ یومِ موعود آسانی سے نہیں آئے گا بلکہ اِس کے لئے مومنوں کو بڑی بھاری قُربانیاں کرنی پڑیں گی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یومِ موعود کے متعلق بڑا زور دیا گیا تھا اس لئے ممکن تھا جماعتِ موعود یہ خیال کر لیتی کہ یہ یومِ موعود خود بخود آ جائے گا ہمیں اِس کے لئے کسی خاص جدوجہد سے کام نہیں لینا پڑے گا۔ سو خدا تعالیٰ نے قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ۔ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ کے ذریعہ اِس خیال کا ازالہ کر دیا اور بتایا کہ یہ یومِ موعود آئے گا تو سہی مگر تمہیں اپنی جانوں کو اِس راہ میں قربان کرنا پڑے گا اور مخالفین کے جور و ستم اور اُن کے بھیانک مظالم کا ایک عرصہ تک تختۂ مشق بننا پڑے گا۔

اسلام کے زندہ کرنے کے لئے مصائب کا برداشت کرنا ضروری ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی جماعت کو بارہا اِس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اسلام اور احمدیت کی ترقی ہم سے موت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگر ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ بغیر اُن قربانیوں کے جو صحابہؓ نے کیں یا بغیر اُن قربانیوں کے جو سابق انبیاءؑ کی اُمتیں بجا لائیں ہم اپنے مقصود کو حاصل کر لیں گے تو ہم سے زیادہ احمق اور غلطی خوردہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسلام اور احمدیت کی ترقی ہماری قربانیوں کے ساتھ وابستہ ہے اور یہی وہ موت ہے جس میں حقیقی زندگی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ آپؑ اسلام اور احمدیت کی ترقی کی پیشگوئی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”سچائی کی فتح ہوگی اور اسلام کے لئے پھر اُس تازگی اور روشنی کا دن آئے گا جو پہلے وقتوں میں آ چکا ہے اور وہ آفتاب اپنے پورے کمال کے ساتھ پھر چڑھے گا جیسا کہ پہلے چڑھ چکا ہے۔ لیکن ابھی

ایسا نہیں۔ضرور ہے کہ آسمان اُسے چڑھنے سے روکے رہے جب تک کہ محنت اور جانفشانی سے ہمارے جگر خون نہ ہوجائیں۔اور ہم سارے آراموں کو اُس کے ظہور کے لئے نہ کھودیں اور اعزازِ اسلام کے لئے ساری ذلّتیں قبول نہ کرلیں۔اسلام کا زندہ ہونا ہم سے ایک فدیہ مانگتا ہے۔وہ کیا ہے؟ ہمارا اِسی راہ میں مرنا۔یہی مَوت ہے جس پر اسلام کی زندگی مسلمانوں کی زندگی اور زندہ خدا کی تجلّی موقوف ہے۔'' (فتح اسلام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۱۰ تا ۱۱)

اِسی طرح فرماتے ہیں۔

''دُنیا کی لذتوں پر فریفتہ مت ہو کہ وہ خدا سے جُدا کرتی ہیں۔اور خدا کے لئے تلخی کی زندگی اختیار کرو۔وہ درد جس سے خدا راضی ہو اُس لذت سے بہتر ہے جس سے خُدا ناراض ہوجائے۔اور وہ شکست جس سے خدا راضی ہو اُس فتح سے بہتر ہے جو موجبِ غضبِ الٰہی ہو۔اُس محبت کو چھوڑ دو جو خدا کے غضب کے قریب کرے۔اگر تم صاف دل ہو کر اُس کی طرف آجاؤ تو ہر ایک راہ میں وہ تمہاری مدد کرے گا اور کوئی دشمن تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔خدا کی رضا کو تم کِسی طرح پا ہی نہیں سکتے جب تک تم اپنی رضا چھوڑ کر اپنی لذات چھوڑ کر۔اپنی عزت چھوڑ کر اپنا مال چھوڑ کر۔اپنی جان چھوڑ کر اُس کی راہ میں وہ تلخی نہ اٹھاؤ جو مَوت کا نظارہ تمہارے سامنے پیش کرتی ہے۔لیکن اگر تم تلخی اٹھالو گے تو ایک پیارے بچے کی طرح خدا کی گود میں آجاؤ گے اور تم اُن راستبازوں کے وارث کئے جاؤ گے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔'' (الوصیت، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۰۷)

''یہ مت خیال کرو کہ خدا تمہیں ضائع کردے گا تم خدا کے ہاتھ کا ایک بیج ہو جو زمین میں بویا گیا۔خدا فرماتا ہے کہ یہ بیج بڑھے گا اور پُھولے گا اور ہر ایک طرف سے اس کی شاخیں نکلیں گی اور ایک بڑا درخت ہوجائے گا۔پس مبارک وہ جو خدا کی بات پر ایمان رکھے۔اور درمیان میں آنے والے ابتلاؤں سے نہ ڈرے۔کیونکہ ابتلاؤں کا آنا بھی ضروری ہے تا خدا تمہاری آزمائش کرے کہ کون اپنے دعوئ بیعت میں صادق اور کون کاذب ہے۔وہ جو کسی ابتلا سے لغزش کھائے گا وہ کچھ بھی خدا کا نقصان نہیں کرے گا اور بدبختی اُس کو جہنم تک پہنچائے گی۔اگر وہ پیدا نہ ہوتا تو اُس کے لئے اچھا تھا۔مگر وہ سب لوگ جو اخیر تک صبر کریں گے اور اُن پر مصائب کے زلزلے آئیں گے اور حوادث کی آندھیاں چلیں گی اور قومیں ہنسی اور ٹھٹھا کریں گی اور دُنیا اُن سے سخت کراہت کے ساتھ پیش آئے

گی وہ آخر فتحیاب ہوں گے اور برکتوں کے دروازے اُن پر کھولے جائیں گے۔ خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ مَیں اپنی جماعت کو اطلاع دوں کہ جو لوگ ایمان لائے ایسا ایمان جو اُس کے ساتھ دُنیا کی ملونی نہیں اور وہ ایمان نفاق یا بزدلی سے آلودہ نہیں اور وہ ایمان اطاعت کے کسی درجہ سے محروم نہیں ایسے لوگ خدا کے پسندیدہ لوگ ہیں۔ اور خدا فرماتا ہے کہ وہی ہیں جن کا قدم صدق کا قدم ہے۔''

(الوصیت، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۰۹)

آپؑ نے لوگوں کی ایسی غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا کہ اسلام اور احمدیت کو آپ ہی آپ ترقی حاصل ہوجائے گی۔ اِس کے لئے کسی قربانی یا جدّوجہد کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ چنانچہ آپؑ نے فرمایا۔

''یادرکھو! ہمارے پاس کوئی ایسی پھونک نہیں جس سے کوئی شخص یک دفعہ ابدال میں داخل ہو جائے سب انبیاءؑ کا اِس پر اتفاق ہے کہ ترقیٔ مدارج کے لئے آزمائش ضروری ہے۔ اور جب تک کوئی شخص آزمائش اور امتحان کی منازل طے نہیں کرتا دیندار نہیں بن سکتا۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ دکھ کے بعد ہی ہمیشہ راحت ہوا کرتی ہے۔ یادرکھو جو شخص خدا کی راہ میں دُکھ اور مصیبت برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں وہ کاٹا جائے گا۔''

''صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ پر غور کرو کہ انہوں نے دین کی خاطر کیسے کیسے مصائب اُٹھائے۔ اور کن کن دُکھوں میں وہ مبتلاء ہوئے۔ نہ دن کو آرام کیا نہ رات کو۔ خدا کی راہ میں ہر ایک مصیبت کو قبول کیا اور جان تک قربان کر دی۔''

''یادرکھو! جب تک اخلاص اور صدق سے کوشش نہیں کرو گے کچھ نہیں بنے گا۔ بہت آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ یہاں سے تو بیعت کر جاتے ہیں مگر گھر میں جا کر جب تھوڑی سی بھی تکلیف آئی یا کسی نے دھمکایا یا حقہ پانی بند کرنا چاہا تو جھٹ مُرتد ہو گئے۔ ایسے لوگ ایمان فروش ہوتے ہیں۔ صحابہؓ کو دیکھو کہ انہوں نے تو دین کی خاطر اپنے سر کٹوا دیئے تھے اور جان و مال سب خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ کِسی دشمن کی دُشمنی کی اُنہیں پرواہ تک بھی نہ تھی۔ وہ تو خدا کی راہ میں سب طرح کی تکالیف اُٹھاتے اور ہر طرح کے دُکھ برداشت کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اور انہوں نے اپنے دلوں میں فیصلہ کیا ہوا تھا۔ ایمان وہ ہے کہ سارا جہان مخالف ہوجائے۔ ہر

طرف سے سانپ اور بچھّو کاٹیں۔ ہر گوشہ سے بجلی گرے۔ ہر جگہ سے دُکھ ہو مگر ایمان متزلزل نہ ہو۔‘‘

(بدر ۱۷/۱۰/۱۹۰۷ صفحہ ۸و۹)

یہ وہ قربانی کی روح ہے جو جماعت احمدیہ میں پیدا ہونی چاہیے۔ اور یہی وہ روح ہے جس کے قیام کے ساتھ قوموں کی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اِس سورۃ میں ایک طرف تو منکرین کو توجہ دلائی ہے کہ تم بارہ صدیوں تک خدا تعالیٰ کے مجددین کو مانتے چلے آئے تھے اب تیرہویں مقام پر آکر تمہیں کیا ہو گیا کہ جب وہ موعود ظاہر ہوا جس کی خبر ہم دیتے چلے آئے تھے تو تم نے اُس کا انکار کر دیا اور دوسری طرف مومنوں سے کہا ہے کہ یاد رکھو تمہیں بھڑکتی ہوئی آگ میں جلنا پڑے گا تب اسلام کی شان و شوکت کا دن طلوع کرے گا۔

احمدیت کی سخت مخالفت کی پیشگوئی پس اِن آیات میں اُس مخالفت کی شدّت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو احمدیت کی آئندہ زمانہ میں ہونے والی ہے۔

اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومنوں کو عذاب دے دے کر دشمن مزہ اٹھائیں گے۔

دو قسم کی تعذیبیں تعذیبیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تعذیب وہ ہوتی ہے جس کے بعد دل میں رحم کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ مجرموں کو پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے تو مجسٹریٹ اور سپاہی وغیرہ افسوس بھی کرتے جاتے ہیں مگر ایک تعذیب وہ ہوتی ہے جس کے بعد عذاب دینے والا خوشی محسوس کرتا ہے کہ مَیں نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا۔ فرماتا ہے یہ معذّب تو ہوں گے مگر ساتھ ہی خوش ہوں گے کہ ہم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ گویا جلوس نکلیں گے اور اپنے اِس فعل پر بڑی خوشی منائی جائے گی جیسے حضرت صاحبزادہ عبداللطیف صاحب شہیدؓ پر پتھراؤ کیا گیا مگر کسی کو رحم نہ آیا۔ بادشاہ اور اُس کے درباری سب اکٹھے تھے اور کہتے تھے کہ اِسے خوب پتھر مارو۔ گویا عذاب دینے کے لئے وہ اِس طرح خوش خوش اکٹھے ہوئے جیسے کوئی میلہ ہو رہا ہے۔

وَ هُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ۔ شُهُوْدٌ شَاهِدٌ کی جمع ہے اور شَهِدَ يَشْهَدُ شُهُوْدًا کے معنے ہوتے ہیں حَضَرَ وہاں حاضر ہوا۔ دوسرے معنے ہوتے ہیں اِطَّلَعَ عَلَيْهِ کسی امر سے واقف اور آگاہ ہوا۔ یہاں شُهُوْدٌ کے معنے واقفوں کے بھی ہیں اور حاضر ہونے والوں کے بھی۔ اور مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے ہوئے کہ مومن بے گناہ ہیں اُنہیں عذاب اور دکھ دیں گے۔ اسی طرح یہ معنے بھی ہیں کہ وہ عذاب دینے کے وقت خود بھی سامنے کھڑے ہوں گے اور اُن کے عذاب کا تماشہ دیکھیں گے اور اُن پر انہیں رحم نہ آئے گا۔

اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ سے عذاب دینے والوں کے متعلق دو باتوں کا اظہار اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ میلہ لگائیں گے۔ لوگوں کا اجتماع کریں گے اور سب کی موجودگی میں اُن کو عذاب دیں گے۔ دوسرےؔ یہ کہ یہ تعذیب متواتر چلے گی۔ کیونکہ کسی چیز پر بیٹھ جانا یہ ایک محاورہ ہے جس کے معنے اس کام کو متواتر کرتے چلے جانے کے ہوتے ہیں۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں کہ تم تو دھرنا مار کر بیٹھ رہے ہو۔ مطلب یہ کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ اِسی طرح فرماتا ہے جہاں اِن کی مخالفتیں دیدہ دانستہ ہوں گی اور یہ سمجھتے ہوئے ہوں گی کہ وہ جھوٹ اور فریب سے کام لے رہے ہیں وہاں ان مخالفتوں کا ایک لمبا سلسلہ ہوگا اور متواتر اُن کی طرف سے دُکھ دینے والے واقعات کا اعادہ ہوتا رہے گا۔

اِس زمانہ میں ہم احمدیت کے مخالفین کو دیکھتے ہیں تو اُن کی عملی حالت ہمیں یہی نظر آتی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ بات اسی طرح ہے جس طرح احمدیت پیش کرتی ہے مگر محض اس لئے کہ جماعت احمدیہ کی طرف سے پیش کی جاتی ہے اس کی مخالفت کرنا وہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر آج ہم کہہ دیتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مقام بلند حاصل کیا وہ اپنے زورِ عمل سے حاصل کیا تو تمام غیر احمدی شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ احمدی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہتک کرتے ہیں حالانکہ اس میں ہتک کی کوئی بات نہیں بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور عظمت اِسی عقیدہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ پہلے مَیں نے سمجھا تھا کہ شاید لوگ ہمارے لٹریچر کو نہیں دیکھتے اور سنی سنائی باتوں کی وجہ سے شور مچا دیتے ہیں۔ مگر تھوڑے ہی دن ہوئے ایک دوست نے مجھے ایک اخبار کا کٹنگ بھیجا جس میں میرے خطبہ کا حوالہ درج تھا اور پھر لکھا تھا کہ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیسی سخت ہتک ہے کہ کہا جاتا ہے آپؐ نے زورِ عمل سے اپنا مقام حاصل کیا صرف خدا تعالیٰ کی موہبت سے ایسا نہیں ہوا۔ گویا بات سمجھ لی مگر پھر بھی مخالفت کرنا ضروری سمجھا تا کہ لوگوں میں ہمارے خلاف جوش اور اشتعال پیدا ہو تو فرماتا ہے وَهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ وہ اپنے افعال کے ناروا ہونے پر خود گواہ ہوں گے۔ وہ ظلم کر رہے ہوں گے اور جانتے ہوں گے کہ ظلم کر رہے ہیں وہ جھوٹ اور فریب سے کام لے رہے ہوں گے اور اُن کے نفوس جانتے ہوں گے کہ وہ دھوکا اور فریب کر رہے ہیں مگر پھر بھی مخالفت کریں گے۔

وَ مَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ

اور وہ ان سے صرف اس لئے دشمنی کرتے تھے کہ وہ غالب (اور سب تعریفوں کے مالک) اللہ پر کیوں

الْحَمِيْدِ ۙ۝۹ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى

ایمان لائے۔ وہ (اللہ) جس کے قبضہ میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور (یہ نہیں سوچتے کہ) اللہ

كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ؕ۝۱۰

ہر چیز (کے احوال سے) واقف ہے۔

حَلِّ لُغَات۔ نَقَمُوْا نَقَمُوْا نَقَمَ سے جمع کا صیغہ ہے۔ اور نَقَمَ مِنْہُ کے معنے ہوتے ہیں۔ اَنْکَرَہٗ عَلَیْہِ وَعَابَہٗ وَ کَرِھَہٗ اَشَدَّ الْکَرَاھَۃِ لِسُوْءِ فِعْلِہٖ۔ اُس کی بات کو ناپسند کیا۔ اُس پر عیب لگایا اور اُس کے بُرے فعل کی وجہ سے اُس سے شدید کراہت اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ نیز کہتے ہیں نَقَمَ مِنْہُ اور معنے ہوتے ہیں عَاقَبَہٗ اُس کو سزا دی۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے اُن کی کوئی بات اُن کو حقیقتاً ناپسند نہیں ہوگی اور نہ اُن پر وہ کوئی حقیقی عیب لگا سکیں گے۔ سوائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر کیوں ایمان لائے۔ یوں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوں گے مگر فرق یہ ہوگا کہ یہ لوگ عزیز اور حمید خدا پر ایمان رکھتے ہوں گے۔ ایک زندہ اور قادر خدا کو مانتے ہوں گے مگر وُہ لوگ ایک مُردہ خدا کو ماننے والے ہوں گے۔ پس چونکہ موعود کے اتباع اُن کے مردہ خدا کو نہیں مانتے ہوں گے بلکہ ایک عزیز اور حمید خدا کے قائل ہوں گے۔ اس لئے وہ لوگ اُن کی مخالفت کریں گے۔ اُن کو طرح طرح کے دُکھ دینے کی کوشش کریں گے اور کہیں گے کہ اُن لوگوں نے ایک نیا دین بنالیا ہے۔ حالانکہ وہ خدائے حمید کو پیش کر رہے ہوں گے اور یہ لوگ خدائے حمید پر طرح طرح کے عیوب لگا رہے ہوں گے۔ مثلاً یہی کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں یا یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے یونہی افضل الرسل بنا دیا۔ ورنہ اگر اعمال کا سوال ہوتا تو ممکن تھا کہ کوئی اور شخص آپؐ سے آگے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو وہ تمام عقائد جن کی وجہ سے جماعت احمدیہ پر اعتراض کیا جاتا ہے ان میں سے ایک ایک عقیدہ وہ ہے جو خدا کی حمد ثابت کرنے والا ہے مگر ان لوگوں کے سارے عقیدے وہ ہیں

جو خدا تعالیٰ کی ہتک کا موجب ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں صرف اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا نہیں فرمایا۔ بلکہ اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو وہ لوگ بھی مانتے ہوں گے فرق صرف یہ ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو غیر عزیز اور غیر حمید مانتے ہوں گے۔اور یہ لوگ خدا تعالیٰ کو العزیز اور الحمید قرار دیتے ہوں گے۔اور یہی اختلاف تمام عداوت کی بنیاد ہوگا۔

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فرماتا ہے اُن کو یہ بھی ڈر نہیں آئے گا کہ یہ لوگ اُس خدا پر ایمان اور یقین رکھنے والے ہیں جو آسمانوں اور زمینوں کا خدا ہے۔جو لوگ آسمانوں اور زمینوں کے خدا کی عزت کو قائم کرنے کیلئے کوشش کریں گے۔جو لوگ آسمانوں اور زمینوں کے خدا کی حمد کو قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ خُدا اُن پر لوگوں کو ظلم کرتے دیکھے اور وہ خاموش رہے۔دُنیا میں ذلیل سے ذلیل اور حقیر سے حقیر انسان بھی اپنی عزت کرنے والے کا احترام کرتا ہے پھر کس طرح ہوسکتا ہے کہ یہ آسمان اور زمین کے مالک خدا کی عزت قائم کر رہے ہوں۔اُس کی حمد قائم کر رہے ہوں۔اور پھر دُشمن اُن کو تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔وہ لوگ غور کریں کہ کیا اُن کے ظلموں کو دیکھ کر آسمانوں اور زمینوں کے خدا کی غیرت نہیں بھڑکے گی۔اور کیا وہ اپنے غضب کی چکّی میں اُن کو پیس نہیں ڈالے گا۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۔ فرماتا ہے یہ بات ٹھیک ہے کہ یہ لوگ جانتے بُوجھتے ہوئے ظلم کرتے ہیں۔مگر اِن کو یہ گھمنڈ ہے کہ پبلک ہمارے ساتھ ہے یہ لوگ ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں اُن کو پتہ نہیں کہ ہم بھی ان کے نگران اور محافظ موجود ہیں۔اگر ان کو یہ گھمنڈ ہے کہ ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھنے والے دُنیا میں بہت لوگ موجود ہیں جو ہمارے مظالم کو بھی اچھا قرار دیں گے تو کیا وہ اتنی بات نہیں سوچتے کہ وہ لوگ جو میری عزت کو قائم کرنے والے ہیں۔میری حمد کو قائم کرنے والے ہیں وہ میری آنکھوں کے سامنے اِس طرح مظالم کا نشانہ بنائے گئے تو کیا مَیں خاموش رہوں گا۔مَیں یقیناً اُن کی مدد کے لئے اُتروں گا اور مظالم کرنے والوں کو اپنے غضب کا نشانہ بنا دوں گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا

وہ لوگ جنہوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو عذاب میں مبتلا کیا پھر (اپنے فعل سے) توبہ بھی نہ کی اُنہیں

فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمْ عَذَابُ الْحَرِیْقِ ﴿۱۱﴾

یقیناً جہنّم کا عذاب ملے گا اور (اِس دُنیا میں بھی) اُنہیں (دل کو) جلا دینے والا عذاب ملے گا۔

حلّ لُغات۔ فَتَنُوْا فَتَنُوْا فَتَنَ سے جمع کا صیغہ ہے۔ اور فَتَنَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں۔ اَحْرَقَهٗ۔ اُس کو جلا دیا۔ (اقرب) پس اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ کے معنے ہوئے وہ لوگ جنہوں نے مومنوں کو آگ میں جلایا۔

تفسیر۔ الٰہی جماعتوں کو دکھ دینے کا نتیجہ چونکہ کفار نے مومنوں کے لئے ایک بھڑکتی ہوئی آگ تیار کی تھی جس میں اُن کو ڈالا گیا تھا اس لئے فرماتا ہے۔ یقیناً وہ لوگ جو مومن مَردوں اور عورتوں کو عذاب دیتے ہیں اُن کے لئے جہنم کا عذاب ہوگا۔ یہاں ظاہری اور باطنی دونوں قِسم کی آگ مراد ہوسکتی ہے۔ ظاہری اِس لحاظ سے کہ وُہ اُن کے جسموں کو دُکھ دیں گے۔ اور باطنی اِس لحاظ سے کہ وہ ایسے ایسے جھوٹے الزام لگائیں گے جن کو سُن کر اُن کے دل جل جائیں گے۔ اور وہ حیران ہوں گے کہ ہم کیا کریں۔ فرماتا ہے وہ لوگ جو مومن مَردوں اور عورتوں کو جلاتے ہیں۔ اُن کی طرف طرح طرح کی جھوٹی باتیں منسوب کرتے ہیں۔ اُن کا دل دکھانے کے لئے ہر قسم کی تدابیر اختیار کرتے ہیں وہ مت سمجھیں کہ ہماری گرفت سے وہ بچ سکیں گے۔ چنانچہ آج کل ہماری جماعت کے خلاف جس رنگ میں فتنہ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اس کا ایک کھلا اور واضح ثبوت ہے۔ غیر احمدی ہمارا دل یہ کہہ کر زخمی کرتے ہیں کہ ہم نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے (تحفہ قادیانیت جلد اول صفحہ ۱۷۶ از محمد یوسف لدھیانوی)۔ اور پیغامی یہ کہہ کر ہمیں دُکھ دیتے ہیں کہ ہم کلمہ طیبہ کو نعوذ باللہ منسوخ سمجھتے ہیں۔ (ہفت روزہ پیغام صلح ۲۹ اگست ۱۹۷۳ء صفحہ ۳) حالانکہ ہم جو کچھ کہتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اور آپؐ کے جلال کے اظہار کے لئے کہتے ہیں۔ کوئی ایسی بات اپنی زبان سے نہیں نکالتے جو آپؐ کی شان کو کم کرنے والی اور آپؐ کی عزت کو بٹہ لگانے والی ہو۔ پس فرماتا ہے وہ لوگ جو مومن مَردوں اور مومن عورتوں کے بدنوں کو یا ان کے دلوں کو یا اُن کے گھروں کو جلاتے ہیں اور پھر اپنے اس فعل سے توبہ نہیں کرتے ہم ان کو عذاب میں مبتلا کریں گے۔ ہاں اگر کوئی شخص

توبہ کرے تو پھر خواہ کتنا بڑا گناہ کر چکا ہو اُس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اُسے معاف فرما دیتا ہے۔ پس فرمایا گو اُنہوں نے بڑا گناہ کیا ہے لیکن اگر پھر بھی وہ توبہ کر لیں تو خواہ کوئی گناہ اُن سے سرزد ہو چکا ہو ہم اُن کو معاف کر دیں گے۔ لیکن اگر وہ توبہ نہیں کریں گے۔ تو یاد رکھیں کہ فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ جس طرح انہوں نے مومنوں کے دلوں کو بھی جلایا تھا اور اُن کے جسموں کو بھی جلایا تھا اُسی طرح اُن کو بھی دو قسم کا عذاب دیا جائے گا۔ ظاہری بھی اور باطنی بھی۔ عذابِ جہنّم ظاہری ہے اور عذاب الحریق باطنی ہے۔ یا عذاب الحریق ظاہری ہے اور عذاب جہنّم باطنی ہے۔ بہر حال ان دو قسم کے عذابوں کے مقابلہ میں جو انہوں نے مومنوں کو دیئے اُن کو بھی دو قسم کے عذاب دیئے جائیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ

(اور وہ) جو ایمان لائے اور (اس کے ساتھ اس کے) مناسبِ حال عمل بھی کئے اُنہیں باغات ملیں گے جن کے نیچے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ؕ﴿۱۲﴾

نہریں بہتی ہوں گی۔ (اور) یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

حَلّ لُغَات۔ اَلْفَوْزُ اَلْفَوْزُ اَلظَّفَرُ بِالْخَيْرِ بہترین مقصود پا کر کامیاب ہونا۔ نیز اِس کے معنے ہیں اَلنَّجَاةُ۔ نجات۔ (اقرب)

تفسیر۔ عمل صالح کا مطلب یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ بجا لائے۔ عمل صالح کے معنے ایسے اعمال کے ہیں جو مطابقِ حالات ہو۔ یہ معنے اتنے اہم اور اس قدر ضروری ہیں کہ ان پر جس قدر بھی زور دیا جائے کم ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی تمام کامیابی اور ترقی کا دار و مدار انہی معنوں پر ہے۔ اگر حالات کے مطابق عمل کیا جائے گا تو وہ یقیناً عمل صالح ہوگا۔ اور اگر حالات کی مطابقت کا خیال نہیں رکھا جائے گا تو وہ عمل غیر صالح ہوگا۔ مثلاً شراب اسلام سے پہلے حرام نہیں تھی۔ صرف اسلام نے اس کو قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے۔ اِس صورت میں صلاحیت کے محض اتنے معنے نہیں ہوں گے کہ انسان شراب نہ پیئے بلکہ صلاحیت کے یہ معنے ہوں گے کہ جس زمانہ میں خدا نے کِسی فعل سے روکا ہے اُس زمانہ میں اُس فعل سے رُک جائے اگر شراب سے روکا ہے تو رک جائے اور اگر نہیں روکا تو بیشک نہ رُکے۔ اِسی وجہ سے گو اسلام کو پہلی شرائع سے کئی امور میں اختلاف ہے مگر چونکہ اُن شریعتوں

میں شراب قطعی طور پر حرام نہیں تھی اِس لئے اُن اُمتوں میں جن لوگوں نے شراب استعمال کی تھی انہوں نے عملِ غیر صالح نہیں کیا تھا۔ بلکہ اُس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے وہ عملِ صالح ہی تھا۔ پس ایمان لانے اور عملِ صالح کرنے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُن کو جنّات ملیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ جس طرح کفار کے متعلق ذکر کیا گیا تھا کہ اُن کو دو قسم کے عذاب دیئے جائیں گے اسی طرح یہاں مومنوں کے متعلق فرماتا ہے کہ اُن کو دو قسم کے انعامات دیئے جائیں گے۔ اوّل باغات ملیں گے جو اوپر سے سایہ کرنے والی چیز ہیں۔ دوم۔ اُن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔ گویا اوپر سے بھی ٹھنڈک ہوگی اور نیچے سے بھی ٹھنڈک ہوگی۔ ظاہر میں بھی راحت ہوگی اور باطن میں بھی راحت ہوگی۔ لوگوں میں بھی عزت ہوگی اور خدا کے حضور بھی عزت ہوگی۔

جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کے دو معنی لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کے دو معنے ہیں۔ اوّل یہ کہ باغوں کا سایہ ایسا ہوگا جو کسی جگہ سے ٹوٹے گا نہیں۔ اُن کی شاخیں آپس میں ملتی چلی جائیں گی۔ دو درختوں میں ایسا فاصلہ نہیں ہوگا کہ سایہ الگ الگ ہو جائے بلکہ اُس سائے کا ایک سلسلہ ہوگا جس میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہو گا۔ اسی طرح ان کے نیچے جو نہریں بہتی ہوں گی ان کے کسی حصّہ پر بھی دُھوپ نہیں پڑے گی بلکہ سایہ کے مسلسل ہونے کی وجہ سے وہ نہریں بھی اوّل سے آخر تک سایہ کے نیچے ہوں گی۔ گویا رحمت کے کمال کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

دوسرے لَهُمْ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ باغات ان کی ملکیّت ہوں گے اور وہ نہریں اُن باغات سے وابستہ ہوں گی۔ یوں تو سرگودھا اور لائلپور وغیرہ میں بھی نہریں ہیں مگر وہ مالکانِ اراضی کی نہیں بلکہ گورنمنٹ کی ہیں۔ لیکن وہاں جو نہریں ملیں گی وہ جنت کے ساتھ ہوں گی۔ مِنْ تَحْتِهَا کا یہی مطلب ہے کہ اِس جنت کی نعمتوں کے ضمن میں یہ نہریں ہوں گی۔ یعنی جس کے باغات ہوں گے اُسی کی نہریں ہوں گی۔ اس لئے ایک معنے تو یہ ہیں کہ اُس جنّت کی تمام نعمتیں مالک کے اپنے اختیار میں ہوں گی۔ دوسرے یہ کہ وہ بڑی وسیع جنّت ہوگی کیونکہ نہر دو دو چار گھماؤں میں نہیں چلتی بلکہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ بلکہ دو دو ہزار میل تک نہریں چلتی چلی جاتی ہیں۔ پس مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کہہ کر بتا دیا کہ جنّت کا بدلہ بڑا وسیع ہوگا۔

غرض اِن آیات میں ایک طرف تو اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جنّتیوں کو ظاہری نعمت بھی ملے گی اور قلبی نعمت بھی ملے گی۔ دوسرے یہ بتایا کہ اُن کی ترقی کے جو سامان ہوں گے وہ اُن کے قبضہ اور اختیار میں ہوں گے۔ تیسرے یہ کہ وہ سامان نہایت وسیع ہوں گے۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿۱۳﴾

یقیناً تیرے رب کی گرفت سخت ہوا کرتی ہے۔

حَلّ لُغَات۔ بَطْشٌ بَطَش بِہٖ بَطْشًا کے معنے ہوتے ہیں اَخَذَہٗ بِالْعُنْفِ۔ اِس کو سختی سے گرفت کی۔ نیز اس کے معنے ہیں تَنَاوَلَہٗ بِالشِّدَّۃِ عِنْدَ الصَّوْلَۃِ حملہ کرتے وقت سختی سے اُسے پکڑا۔ اَخَذَ اَخْذًا شَدِيْدًا فِيْ كُلِّ شَيْءٍ۔ کسی چیز کو سختی سے پکڑا (اقرب) پس اَلْبَطْشُ کے معنے ہوں گے۔ سختی سے گرفت کرنا۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ مومنوں کو دُکھ تو دیئے جائیں گے مگر خدا کی پکڑ بھی بڑی سخت ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی الہام ہے کہ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (تذکرہ صفحہ ۶۳۴ ایڈیشن ۲۰۲۲ء) یعنی جب تم گرفت کرو گے تو سختی سے کرو گے۔ پس بے شک وہ مومنوں کو بڑا دُکھ دیں گے۔ مگر یاد رکھیں خدا کی گرفت بھی بڑی سخت ہے۔

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ ﴿۱۴﴾

(کیونکہ) وہ وہی تو ہے (جو عذاب دینا) شروع کرتا ہے اور پھر اسے بار بار چکر دیتا ہے۔

تفسیر۔ **يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ کا مطلب** خدا پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے۔ اور دوبارہ بھی وہی لوٹاتا ہے۔ مطلب یہ کہ خدا ہی ہے جو اِس دنیا میں بھی اُن کو عذاب دے گا اور آخرت میں بھی ان کو عذاب دے گا۔ گویا يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ کے یہ معنے ہیں کہ يُبْدِئُ الْعَذَابَ فِي الدُّنْيَا وَ يُعِيْدُهَا فِي الْاٰخِرَةِ۔

وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ﴿۱۵﴾

اور (اس کے ساتھ ہی) وہ بے انتہاء بخشنے والا اور بے انتہاء محبت کرنے والا بھی ہے۔

تفسیر۔ **غفور اور ودود دو صفات اکٹھی لا کر عیسائیت کی تردید** اور وہ بہت بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے۔ یہاں چونکہ عیسائیت کا ذکر ہے اور عیسائی خدا کو بخشنے والا قرار نہیں دیتے لیکن خدا کو محبت کرنے والا وجود ضرور قرار دیتے ہیں۔ اس لئے خدا نے غفور اور وَدُود دونوں الفاظ کو اس جگہ اکٹھا کر دیا ہے۔ کہ یہ

عجیب بات ہے کہ اِدھر وہ لوگوں کے گناہوں کو بخشتا نہیں اور اُدھر یہ کہا جاتا ہے کہ خدا محبت ہے۔ حالانکہ غفور اور وُدُود ہمیشہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ جو غفور ہو گا ضرور ہے کہ وہ وَدُود ہو اور جو وُدُود ہو گا ضرور ہے کہ وہ غفور ہو۔ یہاں یہ دونوں صفات اکٹھی کر کے عیسائیت کے اِس عقیدہ کی خدا تعالیٰ نے تردید کر دی ہے کہ لوگوں کے گناہوں کو بخشنا اُس کے عدل کے خلاف ہے۔

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۝۱۶

(وہ) بزرگ عرش کا مالک (ہے)۔

تفسیر۔ فرماتا ہے وہ عرش والا ہے۔ اور بڑی بزرگی والا ہے۔ یہاں ذوالعرش اس لئے کہا گیا ہے کہ عیسائی دُنیا نے ایک وقت یہ دُعا شروع کی جو اپنی غلط فہمی سے اب تک کرتے چلے آتے ہیں۔ کہ ’’اے خدا تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو‘‘ (متی باب ۶ آیت ۱۰) اُنیس سو سال اُن کو یہ دُعا کرتے ہوئے گذر گئے مگر اُن کے نزدیک اب تک خدا کی بادشاہت آسمان سے زمین پر نہیں آئی۔ فرماتا ہے اے عیسائیو! تم یہ کیا کر رہے ہو وہ خدا تو عرش والا ہے اور مجد والا ہے اُنّیس سو سال پہلے اگر اُس نے تمہیں یہ دُعا سکھائی تھی اور پھر اُنیس سو سال تک اُس نے اِس دعا کو نہ سنا اور زمین پر خدا کی بادشاہت نہ آئی تو وہ ذوالعرش المجید کس طرح رہا۔ حالانکہ وہ ذوالعرش ہے۔ وہ بڑی بزرگی کا مالک ہے۔ وہ جب کہتا ہے کہ اُس کی بادشاہت زمین پر آجائے تو پھر وہ آنے سے رُکا نہیں کرتی۔ چنانچہ خدا کی بادشاہت آسمان سے زمین پر پہلے مسیح ناصریؑ کے ذریعہ آئی پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آئی اور اب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ خدا کی بادشاہت تیسری بار آسمان سے زمین پر آگئی ہے مگر وہ ابھی تک یہی دُعا مانگتے چلے جا رہے ہیں کہ اے خدا جس طرح تیری بادشاہت آسمان پر ہے اسی طرح زمین پر آوے۔

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝۱۷

جس بات کا ارادہ کرے اُسے کر کے رہنے والا ہے۔

تفسیر۔ وہ جس کام کا ارادہ کر لے اُسے کر کے رہتا ہے مگر تم یہ کہتے ہو اُس نے اپنی بادشاہت آسمان سے

زمین پر لانے کا ارادہ تو کیا تھا مگر اب تک وہ اپنے اِس ارادہ کو پُورا نہیں کرسکا حالانکہ پہلا مسیحؑ آیا اور اُس کے ذریعہ خدا کی بادشاہت زمین پر آ گئی پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور اُن کے ذریعہ خدا کی بادشاہت زمین پر آ گئی اور اب تیسری دفعہ پھر مسیح موعودؑ کے ذریعہ خدا کی بادشاہت آسمان سے زمین پر آ گئی ہے مگر تم ابھی وہیں بیٹھے یہ دعا کر رہے ہو کہ اے خدا تیری بادشاہت جس طرح آسمان پر ہے اُسی طرح زمین پر بھی آئے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ﴿۱۸﴾ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ﴿۱۹﴾

کیا تمہیں (دشمنانِ صداقت کے) لشکروں کی خبر نہیں ملی۔ (یعنی) فرعون اور ثمود کے لشکروں کی۔

تفسیر ۔ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ۔ جُنُوْد کا بدل ہے۔ کہ کیا تمہیں لشکروں کی خبر پہنچی ہے۔ اِس کے بعد اُن جنود کے سرداروں کا نام لے لیا کہ وہ لشکر جو فرعون اور ثمود کے تھے۔ مطلب یہ کہ یہ کوئی چُھپی ہوئی بات نہیں کہ ہم نے اُن دشمنوں سے کیا کیا تھا بلکہ یہ بالکل ظاہر بات ہے۔ پھر اگر تمہیں فرعون اور ثمود کے لشکروں کی بربادی کی خبریں معلوم ہیں تو کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے اور کیوں مخالفت میں بڑھتے جا رہے ہو۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿۲۰﴾

حقیقت تو یہ ہے کہ کافر (شدید) انکار (کی مرض) میں (مبتلا) ہیں۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے اِن کفار کے قلب کی حالت ایسی ہوگئی ہے جو تکذیب والی ہے۔ کتنی ہی مثالیں اُن کے سامنے موجود ہوں یہ انکار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اور جب کسی کے قلب کی حالت ایسی ہو جائے کہ وہ ہر بات کی مخالفت کرنا اپنے لئے ضروری قرار دے لے تو پھر اُسے ہدایت نصیب نہیں ہوسکتی کیونکہ ہدایت اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان غور سے کام لے اور جب اُس نے غور ہی نہ کرنا ہو تو ہدایت کس طرح حاصل ہوسکتی ہے۔

حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ ہمیشہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مخالفین کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک نٹ بڑے لمبے بانس پر چڑھ جاتا اور رسّے پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح کبھی پتلے بانس پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ کرتب دکھا دیتا ہے تو کہتا ہے کیوں دکھایا نا کرتب۔ اِس پر اُنہی میں سے ایک شخص جو نیچے کھڑا ہوتا ہے سر ہلا کر کہہ دیتا ہے کہ مَیں نہ مانوں۔ اِس پر وہ دوسرا کرتب دکھاتا ہے اور

پھر جب پُوچھتا ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ مَیں نہ مانوں۔ تو مَیں نہ مانوں کا توکوئی علاج ہی نہیں ہوسکتا۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اِس جگہ بیان فرمائی ہے کہ بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ تَکْذِیْبٍ مخالفت میں بڑھتے بڑھتے ان لوگوں کی قلبی حالت ایسی ہوگئی ہے کہ ان کے سامنے کوئی بھی نشان ظاہر ہو۔کوئی بھی معجزہ ظاہر ہو اِن کو اس بات سے کوئی غرض ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس پر غور کریں۔صرف ایک ہی مقصد اُن کے سامنے ہوتا ہے کہ ہم اِس نشان کی تکذیب کریں۔ پس یہ لوگ تو وہ ہیں جو تکذیب کے سمندر میں غرق ہو چکے ہیں۔

وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿۲۱﴾

حالانکہ اللہ (اُنہیں) اُن کے پیچھے سے (آکر) گھیرنے والا ہے۔

حَلِّ لُغَات۔ مُحِیْطٌ مُحِیْطٌ اَحَاطَ کا اسم فاعل ہے اور اَحَاطَ بِالْاَمْرِ کے معنے ہیں اَحْدَقَ بِهٖ مِنْ جَوَانِبِهٖ۔ کسی معاملہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا (اقرب) اور آیت مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِیْطٌ کے معنے ہیں لَا یَعْجِزُهٗ اَحَدٌ قُدْرَتُهٗ مُشْتَمِلَةٌ عَلَیْهِمْ یعنی خدا تعالیٰ کو کوئی عاجز نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس کی قدرت وطاقت اُن پر حاوی ہے۔ نیز کہتے ہیں اُحِیْطَ بِهٖ اور معنے ہوتے ہیں۔ اُس کی ہلاکت قریب آ گئی۔ (اقرب) پس مُحِیْطٌ کے معنے ہوں گے چاروں طرف سے گھیرنے والا۔

تفسیر۔ یہ تمسخر میں مشغول ہیں اور جب صداقت کے نشانات ظاہر کئے جاتے ہیں تو کہتے ہیں مَیں نہ مانوں۔لیکن وہ اس بات سے ناواقف ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں ایک خطرناک عذاب مقدّر ہے۔ مُحِیْط کے لفظی معنے احاطہ کرنے والے کے ہوتے ہیں لیکن محاورہ کے رو سے اسے عذاب کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اُن کے پیچھے سے اُن کا احاطہ کرنے والا ہے۔ احاطہ کا لفظ عذابِ تام پر دلالت کرتا ہے۔ رستہ کُھلا ہو تو انسان بھاگ سکتا ہے لیکن جب چاروں طرف سے احاطہ ہو تو بھاگنے کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔

وَرَآىِٕهِمْ کے لفظ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جب وہ عذاب آئے گا تو اُنہیں پتہ بھی نہیں لگے گا۔ کیونکہ پیچھے سے جو چیز آتی ہے وہ اچانک آتی ہے۔ پس فرمایا جب وہ عذاب اچانک طور پر آ جائے گا تو چاروں طرف سے اُن کا احاطہ کر لیا جائے گا اور اُنہیں اُس عذاب سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ

الصلوٰۃ والسلام کو بھی بار بار یہ الہام ہوا ہے کہ اِنِّیْ مَعَ الْاَفْوَاجِ اٰتِیْکَ بَغْتَۃً (تذکرہ صفحہ ۲۶۱ ایڈیشن ۲۰۲۲ء) یعنی مَیں اپنی افواج کے ساتھ اچانک آؤں گا۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۲﴾

(اس کے علاوہ) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ (کلام جو ان امور کی خبر دے رہا ہے) ایک بزرگ (ہر جگہ اور ہر زمانہ

فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۳﴾

میں) پڑھا جانے والا کلام ہے اور (مزید کمال یہ ہے کہ) وہ لوحِ محفوظ میں ہے۔

حَلِّ لُغَات۔ لَوْحٌ لَوْحٌ کے معنے ہیں کُلُّ صَحِیْفَۃٍ عَرِیْضَۃٍ خَشْبًا اَوْ عَظْمًا۔ لکڑی یا لوہے کی چوڑی تختی۔ اور لوح کو لوح اس واسطے کہتے ہیں کہ اس پر لکھنے کی وجہ سے معانی ظاہر ہوتے ہیں (اقرب) (چونکہ لَاحَ یَلُوْحُ کے معنے جس سے لوح بنا ہے۔ ظاہر ہونے کے تھے اس لئے مصنّف نے وجۂ مناسبت اصل مادہ سے بیان کر دی)۔

تفسیر۔ فرماتا ہے یہ لوگ تو پُرانے مکذّبین سے بھی اپنے عناد اور مخالفت میں بڑھ رہے ہیں مگر ہم کہتے ہیں یہ وہ کلام ہے جو بڑا بزرگ ہے۔ یہ تکذیب میں زیادتی کرنی شروع کر دیں ہم اس کی تصدیق میں زیادتی کرنی شروع کر دیں گے۔ گویا خدا صرف اتنی ہی غیرت نہیں دکھائے گا کہ دشمنوں کو تباہ و برباد کر دے بلکہ وہ یہ بھی کرے گا کہ اِس قرآن کو عزت کے مقام پر فائز کر دے گا اور دُنیا کی گردنیں اُس کے آگے جھکا دے گا۔ بیشک یہ لوگ مخالفت کریں اور جتنی چاہیں کریں مگر خدا یہ ارادہ کر چکا ہے کہ وہ اس قرآن کو عزّت کے مقام پر کھڑا کرے گا کیونکہ یہ قرآن بڑی مجد والا ہے۔

فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ محفوظ کی قرأت ظاء کی زیر سے بھی آئی ہے اور ظ کی پیش سے بھی۔ یعنی مَحْفُوْظٌ بھی ہے اور مَحْفُوْظٍ بھی۔ زیر کی صورت میں اِس جُملہ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ قرآن کریم ایک محفوظ لوح میں ہے اور پیش کی صورت میں محفوظٌ قرآن کریم کی صفت بنتا ہے اور جُملہ کے معنے یہ ہوئے کہ قرآن مجید لوح میں ہے اور محفوظ ہے۔

ابو الفضل اور ابن خالویہ کہتے ہیں کہ لَوْحٌ لفظ نہیں بلکہ لُوْح لام کی پیش سے ہے اور اس کے معنے ساتویں

آسمان کے اوپر کی فضاء کے ہیں (فتح القدیر للشوکانی زیرآیت ھٰذا)۔ یہ معنے بالبداہت باطل ہیں کیونکہ ساتویں آسمان پر گیا کون تھا کہ اُس نے وہاں کی فضاء دیکھی اور اُس کا ایک خاص نام رکھا۔ صحاح جوہری کہتے ہیں کہ لُوح لام کی پیش سے ہو تو اُس کے معنے آسمان اور زمین کے درمیان کی ہوا کے ہیں (فتح القدیر للشوکانی زیرآیت ھٰذا) یعنی جَوّ اور فضاء کے یہ معنے لغت کے ہیں اور اوپر کی تفسیر کے غلط ہونے پر شاہد ہیں۔ ابن المنذر نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف ایک روایت منسوب کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ لَوح ذکر ایک ہی لوح ہے (یعنی جس قدر ذکر خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں سب اس میں درج ہیں) اور یہ لوح نور کی ہے اور تین سو سال میں ختم ہونے والے سفر کے برابر لمبی ہے۔ (فتح القدیر للشوکانی زیرآیت ھٰذا) ابوالشیخ کہتے ہیں کہ انسؓ سے مروی ہے کہ قرآن کریم میں جس لوح محفوظ کا ذکر ہے وہ اسرافیل کے ماتھے میں ہے (فتح القدیر للشوکانی زیرآیت ھٰذا) اور امام سیوطیؒ حضرت عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ لوح محفوظ سو سال کے سفر کے برابر لمبی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قلم سے دُنیا کے پیدا کرنے سے پہلے کہا میری مخلوق کے بارہ میں میرا علم لکھ اس پر اُس نے لکھا اور جو کچھ قیامت تک ہونا تھا وہ اس میں لکھا گیا۔ مقاتل کہتے ہیں کہ لَوح محفوظ عرش کے دائیں طرف رکھی ہے۔ (ابن کثیر سورۃ الطارق) حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اسرائیلیات ہیں اور یہود نے بھولے بھالے مسلمانوں سے بدلہ لیا ہے۔

جیسا کہ حل لغات سے ظاہر ہے لوح ایک لکڑی یا ہڈی کی چوڑی سطح کو کہتے ہیں جس پر لکھا ہوا بہت واضح ہو جائے۔ چنانچہ اسی مادہ کا فعل لَاحَ یَلُوْحُ ہے جس کے معنے ظاہر ہونے کے ہیں۔ چونکہ کاغذ کا صفحہ لپیٹا جاتا ہے لیکن لکڑی لوہے یا ہڈی پر لکھی ہوئی کتاب لپیٹی نہیں جاسکتی اسے لوح کہتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز لپیٹی نہ جائے گی اس میں ایک خوبی ہوگی اور ایک نقص۔ خوبی تو یہ کہ ہر ایک اس کو پڑھے گا اور اس کی خوب اشاعت ہوگی اور نقص یہ کہ بوجہ کُھلی ہونے کے اس کے مٹانے یا اس میں تصرّف کرنے کا لوگوں کو زیادہ موقع مل سکے گا۔ اسی مضمون کو بیان کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس جگہ قرآن کریم کی نسبت بیان فرمایا ہے کہ وہ لوح محفوظ میں ہے یعنی قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ کثرت سے لوگوں کے ہاتھ میں جائے گا اور خوب پھیلے گا مگر ساتھ ہی وہ لوگوں کی دست بُرد سے محفوظ بھی رہے گا۔ گویا لوح پر لکھے ہوئے کلام کی خوبی تو اس کو ملے گی مگر اس کے نقص سے وہ محفوظ رہے گا۔

۞۞۞۞

انڈیکس

جلد گیارہ

✡✡✡✡✡✡

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اشاریہ کلید مضامین

اسماء

مقامات

حل اللغات

☆☆☆☆☆

کلیدِ مضامین

مرتبہ : سید عبدالحئی ایم۔اے

آ

آخرت

آداب

آسمان

آیت/آیات

ا

ابتلاء

احمدیت۔ نیز دیکھئے جماعتِ احمدیہ

اِحیاء

اخلاق/خلق

اسلام

انقلاب

صداقت

تعلیم

غلبہ کے بارے میں پیشگوئیاں

غلبہ دَورِ اوّل

پ

غ

ف

☆☆☆☆☆

اسماء

ب

☆☆☆☆☆

مقامات

ن

ہ

☆☆☆☆☆

حلّ اللّغات

ا

ب

ت

ث

ج

ح

خ

د

ذ

ر

☆☆☆☆☆

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

تفسیر

الاتقان للسیوطی
تفسیر ابن کثیر
تفسیر روح البیان
تفسیر روح المعانی
تفسیر فتح البیان
تفسیر الکشاف للزمخشری
کمنٹری آن دی قرآن ریورنڈ وہیری
مآخذِ قرآن مصنفہ پادری ٹسڈل

حدیث

صحیح البخاری
صحیح مسلم
سنن الترمذی
شمائل الترمذی
سنن ابی دائود
سنن النسائی
مشکاۃ المصابیح
مسند احمد بن حنبل
الدارقطنی

مجمع البحار علامہ محمد طاہر سندھی
تشیید المبانی

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام وخلفاء سلسلہ وعلماء جماعت

اسلامی اصول کی فلاسفی
ایام الصلح
براہین احمدیہ
تذکرۃ الشہادتین
تریاق القلوب
فتح اسلام
الوصیت
تذکرہ مجموعہ الہامات حضرت مسیح موعود علیہ السلام
احمدیت یعنی حقیقی اسلام
دعوۃ الامیر
الذکر الحکیم

سیرت وتاریخ

السیرۃ النبویۃ لابن ھشام
الروض الانف شرح سیرۃ ابن ھشام
السیرۃ الحلبیۃ
السیرۃ النبویۃ لاحمد زینی
شرح العلامۃ الزرقانی علی المواھب اللدنیۃ

- Life of Muhammad by Sir William Muir

تاریخ الخلفاء (للسیوطی)
الاصابۃ
اُسد الغابۃ
طبقات ابن سعد
تاریخ الخمیس
الکامل فی التاریخ ابن اثیر
فتوح الشام

اسلامیات

شرح اسماء اللہ الحسنیٰ للامام قشیری
تذکرۃ الاولیاء

کتب اہلِ کتاب

"دعائے عام" شائع کردہ کرسچین نالج سوسائٹی

اخبارات ورسائل

بدر ۱۷/ اکتوبر ۱۹۰۷ء
زمیندار ۹/ اکتوبر ۱۹۳۲ء

لغت۔ نحو ودائرۃ المعارف

اقرب الموارد
تاج العروس
لسان العرب
المفردات فی غریب القرآن للامام راغب الاصفہانی
الصحاح للجوہری
الاساس للزمخشری
مغنی اللبیب
کلیات لابی البقاء

☆☆☆☆☆